بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری کا تحقیقی اور تنقیدی تجزیہ

(مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی)

مقالہ نگار:

ممتاز عمر

نگران:

پروفیسر ڈاکٹر یونس حسنی

شعبۂ اردو جامعہ کراچی۔کراچی

DR. UNUS HASANY
Chief Editor
Urdu Dictionary Board
ST-18/A, Block -5, Gulshan-e-Iqbal, Karachi.
Phone: Office 4988887 , 469561.

ڈاکٹر یونس حسنی
مدیر اعلیٰ اُردو لغت بورڈ
ایس ٹی ۱۸/اے، گلشن اقبال، بلاک نمبر ۵ کراچی
فون دفتر: ۴۹۸۸۸۸۷، ۴۶۹۵۶۱

صداقت نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ زیر نظر مقالہ "نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری تحقیقی و تنقیدی تجزیہ" ممتاز عمر صاحب کی اپنی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے۔

یہ مقالہ ترتیب مواد، اخذ نتائج اور زبان و بیان کے اعتبار سے اس لائق ہے کہ پی ایچ۔ ڈی کی سند کے حصول کے لئے پیش کیا جا سکے

یونس حسنی
نگران مقالہ

۳ فروری ۲۰۰۳ء

فلیٹ بی، "اے ون ٹیرس" دہلی کالونی نمبر ۲، گزری روڈ، کراچی، ۷۵۶۰۰، فون نمبر ۵۳۷۴۹۶۱

نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری کا تحقیقی اور تنقیدی تجزیہ

خلاصہ

اُردو کی ناول نگاری کا سرمایہ بہت کم ہے کیونکہ اُردو کی ناول نگاری انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ابتدائی خدوخال کے ساتھ نظر آتی ہے۔ نذیر احمد کی مراۃ العروس ناول نگاری کی ابتدائی شکل کہی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد ناول کے فنی تقاضوں پر پورا اترنے والی پہلی کہانی رسوا کی امراؤ جان ادا ہے۔ تاریخ عالم میں ناول نگاری کا آغاز اسپین سے ہوالیکن ہم تک اس کی روایت انگریزی زبان کے توسط سے پہنچی کیونکہ ہم برطانیہ کی نو آبادی تھے اس لیے انگریزی ادب سے متاثر ہوئے۔ اگر انگریزی ادب میں ناول نگاری کی صنف کا جائزہ لیں تو رچرڈسن اور اسکاٹ ہم عصر ناول نگار دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی اُردو ادب میں بھی ہوا کہ ناول نگاری کا آغاز ہوتے ہی تاریخی ناول نگاری بھی شروع ہوگئی۔ یوں تاریخی ناول نگاری اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی جب نسیم حجازی تک پہنچی تو انہوں نے اس روایت پر قناعت کرنے کے بجائے تاریخ کو افسانوی رنگ میں پیش کرنے کے انداز کو یکسر رد کرتے ہوئے حقیقت پسندی کا اسلوب اختیار کیا۔ انہوں نے ناول کے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تاریخی واقعات کو ناولیت کے روپ میں ڈھالا اس طرح فن اور فکر کی صداقتوں کے درمیان ایسا کوئی تضاد رونما نہیں ہوا جو ذہنی کشمکش کو فنی بحران تک پہنچا دے۔ اصل میں حقائق افسانے سے زیادہ دلچسپ اور پُر اثر ہوتے ہیں۔ فنکار اور اک وفہم کی پیش کش کی صلاحیت بھی رکھتا ہو تو ناقابلِ یقین حد تک تاریخ کے ہو بہو انداز میں پیش کرسکتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مورخ بادشاہوں اور ناموروں کو قرطاس کی زینت بناتا ہے۔ بے شمار گم نام کردار بین السطور موجود ہوتے ہیں جنہیں زندہ وجاوید اور جیتے جاگتے انداز میں پیش کرنا ایک کامیاب لکھاری کی ذمے داری ہے۔ نسیم حجازی نے اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

اس مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب کے آغاز میں ناول کی ہیئت پر بحث کرتے ہوئے اس کے لفظی اور اصطلاحی معنوں کو پیش کیا گیا ہے پھر ناول کی ابتدا کے بارے میں انسان کا وہ شعوری ادراک ہے جس نے داستانوں کے مافوق الفطرت کرداروں سے فرار اختیار کرتے ہوئے جیتی جاگتی دنیا کے زندہ وجاوید کرداروں کو پسند کیا۔ اردو ادب میں ناول نگاری کی ابتدا انگریزی کی مرہون منت ہے۔ سب سے پہلے نذیر احمد کی مراۃ العروس ناول کی بنیادی اینٹ کہی جاسکتی ہے جس کی مقبولیت نے نذیر احمد کو ایسے ہی اصلاحی اور مقصدیت سے بھرپور قصے لکھنے پر ابھارا ہوگا۔ یوں اس صنف کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے رتن ناتھ سرشار اور منشی سجاد حسین نے بھی طبع آزمائی کی مگر یہ ابتدائی کوششیں کسی خاص ڈھب تک نہ پہنچ سکیں۔ اسی دوران مولانا عبدالحلیم شرر نے تاریخی ناول نگاری کی صنف کو بھی روشناس کرایا اور پھر تہذیبی اقدار کی عکاسی رسوا کی امراؤ جان ادا کی شکل میں سامنے آئی۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے یہ ضرور طے ہوا کہ ناول بننے کے لیے کہانی اور قصے میں حقیقت نگاری ہونی چاہیے۔ کوئی نہ کوئی اخلاقی درس یا نقطۂ نظر موجود ہو اور مختلف

معاشروں کی ضرورت کے مطابق عمرانی ومعاشرتی موضوعات پیش کیے جائیں۔ اگر فکر وفلسفہ کی ضرورت ہو تو اپنے کرداروں کے افعال کے ذریعے پیش کیا جانا چاہیے اور اپنی تہذیب وثقافت پیش کرنی مقصود ہو تو اتنے ستھرے طریقے سے پیش کی جائے کہ قاری کی دلچسپی متاثر نہ ہو۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو واقعات ناول نگار پیش کرتا ہے وہ اسکے اپنے مشاہدے اور تجربے سے تعلق رکھتے ہیں یا ماضی کے کسی عہد کی تصویر بنا کر پیش کیے جائیں۔ اس تعریف کی وضاحت کے لیے دنیائے ادب کے مختلف ناول نگاروں کے ناولوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول کے بنیادی خدوخال متعین کرنے کے بعد انگریزی میں ناول نگاری کے آغاز کو پیش کیا گیا ہے، انگلستان میں اٹھارویں صدی کی چوتھی دہائی میں رچرڈسن کی ''پامیلا'' ناول کے طور پر سامنے آنے والی ابتدائی تخلیق تھی مگر بہت جلد فیلڈنگ کی ''جوزف اینڈ ریوز'' نے تاریخی ناول نگاری کا آغاز کر دیا۔ پھر اسکاٹ کے بے شمار ناول تاریخی موضوعات پر ناول بینوں کی دلچسپی کا سامان پیدا کرتے رہے تو نقادانِ ادب نے ناول کی تیکنیک، فن اور ضروریات کے لیے اصول وضوابط مرتب کیے۔ اس طرح یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ انگریزی ادب میں ناول نگاری کے آغاز کے ساتھ ہی تاریخی ناول نگاری بھی فروغ پانے لگی تھی۔ اس باب میں اُردو ناول نگاری کی ابتدا کو تفصیل سے پیش کرتے ہوئے اس کے عناصر ترکیبی، پلاٹ، کردار، مکالمہ اور منظر نگاری کی تشکیل، نوعیت اور اہمیت پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ جس کی وضاحت کے لیے ناولوں کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ چوں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان براہِ راست برطانوی حکومت کے تسلط میں آ گیا تھا اس لیے ہر طبقہ ہائے زندگی میں انگریزوں کی اثر پذیری ہونے لگی۔ اُردو نثر میں انشائیہ نگاری فروغ پا رہی تھی تو شاعری میں موضوعاتی نظموں کو جلا دی جانے لگی۔ اس لیے ناول کی صنف کو بھی کم جاننے کے باوجود برتا جانے لگا۔ جس طرح عام ناول نگاری منظر عام پر آ رہی تھی بالکل اسی طرح بعض مصلحتوں کے تحت ہی سہی تاریخی ناول نگاری بھی پسند کی جانے لگی ابتدائی طور پر مولانا عبدالحلیم شررؔ اس میدان کے سب سے پہلے شہسوار کے روپ میں سامنے آتے ہیں جن کی ناول نگاری کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے، ملک العزیز ورجینا، فردوس بریں اور فتح اندلس پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ آخر میں ان عوامل کا جائزہ لیا گیا ہے جن کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے شرر نے تاریخی ناول نگاری شروع کی یعنی ایک طرف مسلمان حاکم سے محکوم بنا دیے گئے تو دوسری طرف ان کا تشخص بھی ان سے چھینا جا رہا تھا۔ اقتدار کے ایوانوں تک انکی پہنچ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور بنا دی گئی تھی۔ مسلمانوں میں ان کا ایقان بیدار کرنے کے لیے ماضی کے ان قصوں کو پیش کیا گیا جو عددی اور حربی برتری نہ ہونے کے باوجود کامیابی حاصل کر چکے تھے۔

دوسرے باب میں نسیم حجازی کے حالاتِ زندگی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے آبا ؤ اجداد حجاز سے تعلق رکھتے تھے اور مشرقی پنجاب کے علاقے گورداس پور میں آباد تھے جہاں کے ایک گاؤں سوجان پور میں ۱۹ مئی ۱۹۱۴ء میں انکی ولادت چودھری محمد ابراہیم کے گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد محکمۂ انہار میں ملازم تھے۔ اوائل عمری ہی میں والدہ ماجدہ کی شفقت سے محروم ہونا پڑا۔ ابتدائی تعلیم نواحی گاؤں میں حاصل کی جبکہ بی۔ اے اسلامیہ کالج لاہور سے ۱۹۳۸ء میں پاس کیا۔ اسی دوران قرطاس وقلم سے اپنا رشتہ مربوط کر چکے تھے۔ پہلا افسانہ ''شودر'' کے نام سے قلمبند کیا۔ اس وقت تک اپنا اصل نام محمد شریف ضبط تحریر میں لائے مگر اپنے ایک

استاد کے مشورے سے نسیم حجازی کے قلمی نام کو اختیار کیا جو تادمِ مرگ انکی شناخت رہا۔ اس حصے میں ان کی تعلیم و تربیت، اساتذہ اور خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ انکے روابط کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی عملی زندگی کا آغاز کراچی میں بحیثیت ایڈیٹر اور معلمانہ خدمات کے حالات تحریر کرتے ہوئے بلوچستان میں میر جعفر جمالی سے تعلقات اور ہفت روزہ ''تنظیم'' کوئٹہ سے انکی وابستگی، روزنامہ تعمیر میں ان کی ملازمت اور ''کوہستان'' کے اجراء کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے پہلے ناول ''داستان مجاہد'' سے آخری ناول ''گم شدہ قافلے'' تک کے مدارج تک اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی ناول نگاری کو سمجھنے کے لیے اس عہد کے معاشرتی، سیاسی اور تمدنی حالات کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے قیامِ بلوچستان کے دوران تحریکِ پاکستان میں نسیم حجازی کے کردار کو واضح کیا گیا ہے۔ انہوں نے ایک صحافی اور سیاسی کارکن ہر دو حیثیتوں میں بلوچستان کے قبائلی سرداروں کو تحریکِ پاکستان میں ثابت قدمی کے ساتھ گامزن کیا اور بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت کو یقینی بنانے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا۔

تیسرے باب میں نسیم حجازی کی صحافتی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے مختلف اخبارات سے انکی وابستگی پیش کی گئی ہے۔ انہوں نے بحیثیت صحافی کراچی کے روزنامہ ''حیات'' اور ''زمانہ'' سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا جو بہت جلد کوئٹہ کے ہفت روزہ ''تنظیم'' سے منسلک ہوئے جہاں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے ہوئے تحریکِ پاکستان کے عظیم کارکن بن گئے ہفت روزہ ''تنظیم'' سے انکی رفاقت پاکستان کی آزادی اور پھر بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت پر منتج ہوئی۔ اس مشن کی تکمیل کے بعد راولپنڈی چلے گئے جہاں روزنامہ ''تعمیر'' سے وابستہ رہے مگر کچھ ہی عرصے بعد اختلافات کی بنا پر اس سے الگ ہو گئے اور چودھری عنایت اللہ کے ساتھ مل کر روزنامہ ''کوہستان'' نکالا جو اشاعت و جدتوں کے اعتبار سے ملک کا سب سے بڑا اخبار بن گیا۔ یہ بیک وقت تین شہروں سے شائع ہونے لگا مگر عنایت اللہ کی علیحدگی نے اس اخبار کو تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ عنایت اللہ کی علیحدگی کے علاوہ بھی کچھ دیگر وجوہات اس اخبار کی تباہی کا باعث بنیں جن میں حکومت کی پالیسیاں پیش پیش تھیں۔ کنونشن مسلم لیگ نے اس اخبار کو خرید لیا مگر ایوب خان کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی یہ اخبار جماعت اسلامی کا نظریاتی علمبردار بنا۔ نسیم حجازی ایک بار پھر اس سے وابستہ ہوئے مگر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جماعت اسلامی کی شکست اس اخبار کی مکمل بندش کا باعث بنی۔ صحافت کے اثرات ناول نگاری پر خاصے گہرے پڑے۔ انہوں نے سچ لکھنے اور حقیقت پسندی سے خبریں پیش کرنے کی روایت کو پروان چڑھایا، ساتھ ہی انہوں نے اخباری کارکنوں کی فلاح و بہبود کو بھی مقدم رکھا مگر افسوس یہ سب کچھ ساتھ نہ چل سکا اور بظاہر اخبار سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ ان کے بعض یادگار اداریوں کے حوالے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ''کوہستان'' کی طباعت میں جدتوں کا حال اور اخبار کے مختلف کالموں کی عوامی طبقات میں مقبولیت کو بھی اس موضوع میں پیش کیا گیا ہے۔ نسیم حجازی نے جن صحافتی روایات کو پروان چڑھایا وہ آج بھی صحافتی حلقوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں البتہ صحافت کے اثرات ناول نگاری پر خاصے گہرے پڑے۔

چوتھا باب ناول اور تاریخ کی ہم آہنگی کا احاطہ کرتے ہوئے نسیم حجازی کے ساتھ ناولوں میں موجود مختلف تاریخی واقعات کا تحقیقی جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں قارئین کی سہولت کے لیے پہلے ناول کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے پھر ناول میں موجود تاریخی حقائق کو مختلف مورخین کی آراء کی روشنی میں سامنے لایا گیا ہے۔ ''داستان مجاہد'' میں تاریخِ اسلام کے تین اہم جرنیلوں کا ذکر ہے جن میں طارق بن زیاد، قتیبہ بن مسلم باہلی اور محمد بن قاسم شامل ہیں۔ مختلف جنگوں میں سپاہیوں کی تعداد اور طریقۂ جنگ وغیرہ کو تاریخی حوالوں کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔ اسی طرح نسیم حجازی کے ناول ''محمد بن قاسم'' میں موجود تاریخی حقائق کا انکشاف اور خود محمد بن قاسم کے رقت انگیز انجام کو تاریخی حوالوں کی روشنی میں مستند انداز میں رقم کیا ہے۔ اسی طرح ''آخری چٹان'' میں موجود جنگوں کا حال، خلیفہ کے دربار کی سازشیں اور جلال الدین خوارزم شاہ اور خلیفۂ بغداد کے انجام کو تاریخی حقائق کے مطابق قرار دینے کے لیے ثبوت کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ اسی طرح ''یوسف بن تاشفین'' میں موجود اسپین کی طوائف الملوکی، امراء کی عیش پسندی اور یوسف بن تاشفین کی مداخلت کے حال کو مختلف مورخین کی آراء سے ثابت کیا ہے۔ جبکہ ''معظم علی'' کے ماضی قریب کے تاریخی واقعات بالخصوص علی وردی خان، نواب سراج الدولہ، احمد شاہ ابدالی اور حیدر علی کے حالات زندگی، انہیں پیش آنے والی مہمات اور سازشوں کا حال تاریخ کے اوراق سے ثابت کیا ہے۔ اسی طرح ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' کے موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے ٹیپو سلطان کی شجاعت، بعض فرانسیسیوں سے اس کی عقیدت، اپنوں کی بے وفائی اور سازشیں اور آخری جنگ میں ٹیپو سلطان کا مردانہ وار میدان جنگ میں ٹوٹ پڑنا ایسی حقیقتیں ہیں جن کی ناول میں پیش کش تاریخ کے عین مطابق ہے۔ بالکل اسی طرح ''خاک اور خون'' یعنی تقسیم برصغیر کے فسادات کو تاریخی حوالوں سے ثابت کرنے کے علاوہ ایسے افراد کی آراء سے بھی تقویت دی ہے جو ان واقعات کے چشم دید گواہ تھے۔ اس باب کو پیش کرنے کا مقصد ان اعتراضات کو فرو کرنا تھا کہ تاریخی ناول نگار اپنے من پسند ہیرو کو شجاعت و بہادری کا نمونہ پیش کرتے ہیں اور جنگوں میں فوج کی تعداد کو صحیح طور پر پیش نہیں کرتے۔ یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ جغرافیائی اور معاشرتی اعتبار سے ناواقفیت اس عہد کو زندہ و جاوید کرنے میں ناکام رہتی ہے جس عہد کا یہ قصہ ہوتا ہے۔ چونکہ نسیم حجازی نے ہر چھوٹے بڑے معاملے، جغرافیائی و موسمی حالات، رہن سہن اور معاشرتی اقدار کا بغور جائزہ لے کر اپنے ناولوں کو صداقتوں کو پیکر بنا دیا۔ انہوں نے ''قافلۂ حجاز'' اور ''قیصر و کسریٰ'' کو اُس وقت تک قلمبند نہیں کیا جب تک خود سفرِ حجاز نہ کر لیا۔

پانچواں باب ناول نگاری کے فنی تقاضوں پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ چوتھے باب میں جن سات ناولوں کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے اس کے فنی پہلوؤں کو مختلف ناقدین کی آراء کے زیرِ اثر فن کی کسوٹی پر پرکھنے اور جائزہ لیتے ہوئے پلاٹ، کردار، مکالمہ اور منظر نگاری کو مثالوں کے ذریعے اجاگر کیا گیا کہ تاریخی موضوع کی موجودگی کے باوجود پلاٹ کو ربط و تسلسل اور حیرت و استعجاب سے اس قدر دلچسپ بنایا کہ قاری کا انہماک اور لگن ناول کا مکمل مطالعہ کیے بغیر اس کے دل کو ناول میں اسطرح اٹکائے رکھتی ہے کہ وہ کسی محفل میں بیٹھ کر بھی گم صم اور ناول کے بارے میں سوچ بچار میں مصروف رہتا ہے۔ پھر واقعات کی ترتیب میں تمہید و تجسس ناول کو مزید دلچسپ بنا

دیتا ہے۔اسی طرح کرداروں کی پیش کش میں معاشرے، تہذیب وتمدن، لباس اورنشست و برخاست کے ذریعے اپنے کردار کو اجاگر کرتے ہیں۔مثال کے طور پر ٹیپو سلطان کی ابتدائی تربیت اور شیر کے ساتھ اس کی پرورش، اس کے انداز اور شیر جیسی بہادرانہ خصلتوں کا موجب بنتی ہے تو یوسف بن تاشفین کی درویشی وقناعت، اس کا کھردرا لباس اور عام سے خیمے میں چٹائیوں پر لگا اس کا دربار کرداروں کو ذہن کی گہرائیوں میں موجزن کر دیتا ہے۔ساتھ ہی کرداروں کی گفتگو جسے مکالمہ کہتے ہیں حسب مراتب، تعلقات کی نوعیت معاشرے میں کرداروں کا مقام متعین کرتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ منظر نگاری کو ابھارنے کے لیے جو کیفیت بیدار کی ہے وہ طویل سہی مگر انتہائی پُراثر اور اس قدر تفصیل سے ہے کہ قاری خود کو اس کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔اس طرح نسیم حجازی نے فنی ضرورتوں کو پوری طرح برتا ہے کہ نقادانِ ادب مہر بہ لب ہو گئے ہیں۔

چھٹے باب میں اُردو کی تاریخی ناول نگاری میں نسیم حجازی کا مقام متعین کرتے ہوئے پیش روؤں کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

نسیم حجازی نے اوائل عمری ہی میں علامہ شبلی نعمانی کی (الفاروق) کا مطالعہ کیا تھا جس کی بدولت تاریخ اور تاریخی حقائق سے ان کی دلچسپی بڑھتی گئی۔جس کے بعد انہوں نے دنیائے ادب کے تقریباً تمام بڑے ناول نگاروں کی کاوشوں کا عمیق مطالعہ کیا۔یہی وجہ ہے کہ اپنے پیش روؤں مولانا عبدالحلیم شرر، محمد علی طبیب، صادق سردھنوی اور علامہ راشد الخیری کی خامیوں کو بغور محسوس کیا اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے ہوئے ان اغلاط سے دامن بچایا۔یہی نہیں بلکہ اپنے ہم عصر تاریخی ناول نگاروں کے چند بڑے نام بالخصوص رئیس احمد جعفری، رشید اختر ندوی اور ایم۔اسلم کے درمیان رہ کر اپنی انفرادیت کو کچھ اس طرح برقرار رکھا کہ تاریخی ناول بینوں کے لیے ماضی کے بالکل سچے واقعات تمام تر فنی خوبیوں کے ساتھ پیش کیے۔اس کے لیے ان کا گہرا مطالعہ، موضوعات کا بہتر انتخاب اور قلم پر ان کی گرفت قارئین کے ایک بڑے حلقے میں ان کی پذیرائی کا باعث بنی اور یوں تاریخی ناول نگاری عوام الناس کے ایک بڑے طبقہ کی پسندیدہ صنف بن گئی۔جس کی بدولت اُن کی زندگی ہی میں نوجوان ناول نگاروں کا ایک بڑا حلقہ اُن کے اثرات کو قبول کرنے لگا۔خاص طور پر ہفت روزہ اخبارِ جہاں اور اخبارِ خواتین میں خان آصف کے تاریخی ناول سلسلے وار شائع ہوتے رہے۔عوام کی پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے ان کا ایک ناول کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ الیاس سیتاپوری کے تاریخی مضامین ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ میں باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں۔عوام میں ان کی مقبولیت اس قدر ہے کہ الیاس سیتاپوری کے تاریخی مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ہندوستان میں بے شمار تاریخی ناول ماضی قریب میں نہ صرف شائع ہوئے بلکہ عوام کے ایک بڑے حلقے میں پسند کیے گئے۔اس لیے نسیم حجازی کے اثرات ایک طرف تاریخ کے موضوعات پر قلم اُٹھانے والوں پر ہیں تو دوسری طرف ان موضوعات کو دلچسپی کے ساتھ پڑھنے والوں پر بھی ہیں۔

اس باب کے اختتام میں نسیم حجازی کی ناول نگاری کے فنی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے تاریخی ناول نگاری میں ان کی عظمت کو

پیش کیا گیا ہے۔نسیم حجازی ہمارے مطالعے کے نتیجے میں ایک ایسے ناول نگار قرار پاتے ہیں جو تاریخی حقائق کو برقرار رکھتے ہوئے اسے ایسی افسانوی فضا فراہم کرتے ہیں کہ تاریخ ناول کی طرح دلچسپ اور ناول تاریخ کی طرح حقائق کا آئینہ دار ہو جاتا ہے۔تاریخی ناول نگاری میں تاریخ اور فن کا یہ امتزاج نسیم حجازی کا وہ منصب ہے جو کسی اور تاریخی ناول نگار کے حصے میں نہ آسکا۔اس امتیاز میں وہ اپنے پیش رووں اور معاصرین دونوں میں یکہ وتنہا ہیں وہ فن کے تقاضوں کو تاریخ میں سمونے کا انداز جانتے ہیں اور اسے فنکاری سے برت سکتے ہیں۔نہ تو وہ تاریخ کی خاطر فن سے دست بردار ہوتے ہیں اور نہ فن کی خاطر تاریخ کا خون کر سکتے ہیں۔

A Research And Critical Review of the Historical Novels of Naseem Hijazi.

Summary

Novel writing is not plentiful in Urdu literature because it merely appears in the seventh decade of nineteenth Century. Mirat-al-Uroos of Deputy Nazir Ahmqd can be called an elementary phase of novel writing. There after Ruswas's umrao-Jane-Ada is the first story which fulfils the technical requirements of novel where we see the world history with reference to novel writing we come to know that novel writing starts from Spain but we got it through English literature because we were the colony of the Britishers so English literature had a deep effect upon urdu literature and we were impressed by that. When we take a bird's eye view on English literature with reference to novel writing we see Richardson and Scott as contemporary novel writers in English literature. In the same way, we see that in urdu literature the historical novel writing began with the simple novels. When the historical novel writing through the ages came to Naseem Hijazi he gave it a different realistic colour. He treated it realistically. Whereas the tradition was that the historical novels were written fictionally but Naseem Hijazi gave it a realistic colour. It is only Naseem Hijazi who presents historical novels in a realistic style. But he retains all the technical aspects of novel. He keeps the novel intact. He has given new orientation to historical novels. There is no difference between the techniques and truth of

novelistic presentation which may create crisis in the mind of reader. Really truthful facts are more interesting and more effective. An intellectual artist can present the history as it is without distorting the facts and figures. A good artist is witty and he is replete with literary spirit. A historian speaks of kings and well-known persons but the uncountable ordinary characters are given the true place by a good and successful writer. Naseem Hijazi has done this at the best.

This thesis has been divided into six chapters. The first Chapter deals with the form of novel itself. It discusses its dictionary meaning and terminological meaning. Then I have written about evolution of novel in which I have expressed about human consciousness that got escape from super natural stories, characters and adopted living characters of living world. Novel writing in Urdu literature has taken place by virtue of English Literature. First of all, Nazir Ahmad's Mirat-al-Uroos can be called the foundation stone of novel writing which became so popular that it might have given Nazir Ahmad an incentive for reformation and purposeful writing. So having taken into account this successful kind of writing Ratan Nath Sarshaar and Munshi Sajjad Hussain have also tried their best in this field but all these efforts were elementary and could not come to the mark. In the meanwhile Maulana Abdul Haleem Sharar also introduced the historical novel writing and then the cultural values are depicted in Ruswa's Umrao Jann. By this stage it was decided that a story must have realism in it if it is narrated in novel form. It must have some ethics or viewpoints according to different societies. The novel must present social themes according to social needs of human beings. If it needs philosophical and thought provoking things then it should

deal with the same simultaneously with the help of its character's actions and if the novel intends to present its own culture then it should be aimed at so vividly and nicely that the reader's interest is not distorted at all. Now the problem arises that the incidents the novelist presents are his own experiences and observations or they are the picture and portrait of the past age. For the sake of this I have presented different novels of different novelists of the literary world. After talking about the basis of novel I have presented something about novel writing in English literature. With reference to 18th century England I would like to say that Richardson's Pamela came out as a creative novel in the fourth decade of the same century but very soon Fielding's Joseph Andrews appeared as historical novel. Then so many novels of Scott gave vent to historical topics and roused the interest of the readers. Then the critics of literature formed rules and regulations, techniques and requirements for novel writing. Now it is clear before us that the historical novel writing in English literature started in the wake of ordinary novels. This chapter when it deals with novel writing in Urdu literature I have discussed in detail about the elements, plot, character, dialogue, the formation and organization of acts and scenes, its nature and importance. I have given references of novels for the classification of the same. As we know that after 1857 the Britishers were ruling over the whole India, each and every walk of life underwent the British influence. Urdu prose emerged with new orientation and poetry began with certain topics. Though the novel was less popular yet it had its roots in public and people had started taking interest in it. Simultaneously the historical novels were also liked by people. At primary level we see Abdul Haleem Sharar as the first man who

came out as successful person in this field. Briefly taking into account his novels I have commented over Malik-ul-Aziz, Virginia, Firdous-e-Bareen and Fathe Undlus. In the end I have taken into account the factors due to which Sharar began with historical novels. On the one hand Muslims were dethroned. They were made slaves from their position of being a master. On the other hand their entity was damaged. They were injured culturally. They were deprived of their power and they had no reach to the government. Their identity was being distorted. Their figure was being disfigured and deshaped. Therefore, the stories of the past age were presented. Those stories which bring out triumph and victory of Muslims over non Muslims despite of the facts that Muslims were less than non Muslims and they had less quantity of arms and ammunition. They were written with a view to generate and renovate and restore the faith and Islamic spirit among the Muslims. Naseem Hijazi did this work at the best. He presented historical events, facts and figure in the form of novel. So his novels emerged as historical novels.

The second chapter deals with the biography of Naseem Hijazi in detail. His ancestors belonged to Hijaz and they lived in Gurdaspur, East Punjab. Naseem Hijazi was born in a village named SojaanPur. His date of birth is 19th May 1914. He was born in the family of Choudhry Jaan Muhammad. His father was a government servant in Canal department. He was deprived of his mother in his childhood period very soon. He got primary education in his native village but he did his BA from Islamia College Lahore in 1938. In the meanwhile he had hold pen in his hand and had started writing. First of all he pen crafted "Shoder" as a fiction. By that time he used his original name Muhammad

Sharif but later on he adopted the name of Naseem Hijazi on the advice of his teacher which he retained till death. He is known as Naseem Hijazi in the world of literature and in the world of human beings but his real name is Muhammad Sharif. This chapter i.e. Chapter No. 2 tells about the education and family background of Naseem Hijazi and his relations with his teachers and his family members. Simultaneously he began his career as an editor in Karachi and as a teacher he performed services to the nation. In the meanwhile I have discussed his relation which he maintained during his practical life with Mir Jafer Jamali in Balochistan and his attachment with weekly Paper "Tanzeem" and his service in the daily "Tameer" and I have spoken about his "Kohistan". In the meanwhile I have described all the stages which took place one after the other from the first novel, "Dastan-e-Mujahid" to his last novel "Gum Shuda Qaafle" in nutshell. Taking into account the social, political and cultural circumstances towards understanding his novel writing his role in the Pakistan movement has been discussed while he stayed in Balochistan. Being a journalist and as a political worker he won over all the tribal chiefs and made them stand firmly for the cause of Pakistan and did a lot for the inclusion of Balochistan into Pakistan.

The third chapter of this thesis deals with the journalistic services he performed in which I have described all of his attachments which he had with different news papers. He as a journalist began with daily "Hayaat" and "Zamaana", Karachi. Very soon he joined Quetta's weekly periodical "Tanzeem" where he showed his capabilities, at the best and became a great worker of Pakistan Movement. His attachment with "Tanzeem" resulted into the freedom of Pakistan and the inclusion of Balochistan into

Pakistan. Having completed this mission he went to Rawalpindi where he joined daily "Tameer" but after sometime he left it as there was some differences of opinion and then he started "Kohistan" with the co-operation of Choudhry Inayatullah which came out as the largest daily paper of the country. It was because of its innovative style and it appeared from the three major cities of the country but the separation of Inayatullah made it a part f history. Besides, there are some other reasons as well which made the fall of the paper absolutely which include the government policies ahead. The political affairs were such that the convention Muslim league purchased this paper but at the end of Ayyub Khan's rule this paper became the sole paper of Jamaat-e-Islami, Naseem Hijazi again joined this paper but the defeat of Jamaat in the general elections of 1970 was the main cause that the paper was completely closed. His novel writing was deeply affected by his journalism. He was devoted to truth and realism. He gave an incentive to truthful and realistic writing. Rather he cemented this tradition of truthful and realistic writing. He always gave importance to the welfare of the workers of newspapers but all was in vain as he had to keep himself separate and aloof from the paper apparently. In this chapter I have also presented some of his memorable editorials and Kohistan's innovations and the popularity of different columns of the papers among the people. The journalistic traditions, which Naseem Hijazi had brought forward, are still a source of light in the field of journalism. Eventually novel writing has been deeply affected by journalism. In the fourth chapter I have discussed the co-ordination between novel and history and simultaneously I have presented a research review of the different historical facts available in the novels of

Naseem Hijazi. In this connection in order to facilitate my readers first of all I have given the summary of the novel and then I have brought out the different historical facts available in the novel with reference to different historians. "Dastaan –e- Mujahid" of Naseem Hijazi deals with three important generals of Islamic History and they are Tariq Bin Ziyad, Qateeba bin Muslim Bahli and Muhammad Bin Qasim. The number of soldiers in different wars and warfare and the mode of war have been detailed with proofs available in the books of history. In the same way the historical facts available in the novel of "Muhammad Bin Qasim" and the terrible end of Muhammad Bin Qasim have been proved with authentic references from history. Thus the historical events as presented in "Aakhri Chatan" for example the detail of present wars, the plots and conspiracies of court of Caliph and the logical end of Jalaluddin Khwarzam Shah and the worst of all the end of the Caliph of Baghdad have been proved in the light of history. As such the majestic state of affairs in Spain, the enjoyment and earthly and wordly pleasures of the aristocracy and the interference of Yousuf Bin Tashfeen in the novel "Yousuf Bin Tashfeen" have been proved historically whereas the historical incidents occurred in the immediate past as told in "Moazzum Ali" which specially brings out Ali Ward Khan, Nawab Sirajuddola, Ahmad Shah Abdali, and Haider Ali and their expeditions and conspiracies have been detailed from the pages of history itself. In the same way "Aur Talwaar Toot Gai" has been discussed with special reference to Tipu Sultan's gallantry and bravery and his soft corner for the French, insincerity of his own men and their role as a black sheep, conspiracies and the bravery and heroism of Tipu Sultan in the last war are such facts which are presented in

the novel according to history. In the same way "Khaak Aur Khoon" presents partition of the Subcontinent and the riots that took place at that time have been proved in the light of history. Besides, the detail presented in this chapter covers the opinions of those people who were the eyewitnesses of such bloody riots at the time of partition of the subcontinent. All these references and proofs have been given with the view to avoid the objections which are raised against the novel writers. The common story is that the novel writer over estimates his heroes and under estimate the number of soldiers in the war in order to make the events more interesting to get the sympathies of the readers. Another objection is also raised from the commonplace people that novel writer is ignorant of geographical and social aspects or he presents in such a way that it is invalid and unreliable but I have tried to reject this view and this is not true with reference to Naseem Hijazi for he believes in facts and realism. First of all he himself takes an account of the things involved and then he pen crafts those things. He thinks over each and every matter objectively, he takes into account the geographical and social conditions and values, environment and way of living and then he writes and he has written novels truthfully because he believes in utmost truth. He did not write "Qafla-e-Hijaz" and "Qaiser-o-Kisra" until and unless he himself had made a journey to Hijaz.

The fifth chapter is consisted of the technical requirements of a novel. Apart from this, the fourth chapter has presented a research review of seven novels, which have been discussed technically and in the light of practical criticism. Their plot, character, dialogue and the presentation of scenes have been elucidated with examples that inspite of the fact of historical topic

the plot is so interlinked that it became a thing of wonder and thunder and very interesting for the reader. The reader is uplifted and enjoys ecstasy so much that even in his sitting anywhere he is involved in the novel and then the arrangement of events is very beautiful. They are very well organized. They make novel interesting with curiosity which is always available in all incidents. The presentation of characterization brings out their characters through their dress, culture, social values and their movements of incoming and outgoing. These things manifest the entity of characters. For example the elementary training of Tipu Sultan in the company of lion create in him the brave nature of lion. Tipu Sultan was just like a lion because he was brought up with lion. In the same way Yousuf Bin Tashfeen is like a saint whose contentment and piety and his rough dress and his court in an ordinary tent upon the mats affect the characters very deeply. Simultaneously the dialogue, the speeches of the characters tell us the place of characters in the society. The language used by the characters brings out their figure. They are revealed through their language. In the same way the depiction of scenes is thought provoking though it is lengthy yet it is very effective and impressive that reader thinks himself a part of the scene. As such Naseem Hijazi has utilized all the techniques and has fulfilled all the requirements so nicely that the critics of literature feel wonder.

The sixth chapter while dealing with the place of Naseem Hijazi in the historical novel writing has taken into account the effects of the predecessors in this regard.

Naseem Hijazi had studied "Al-Farooq" of Allama Shiblee Nomani in the beginning of his age. By virtue of that his interest in history and historical facts kept increasing. It went on and on.

Afterwards he read all the great novels of the literary world. He made a deep study. It is because of this fact that he left the shortcomings of his predecessors like Maulana Abdul Haleem Sharer, Muhammad Ali Tabeeb, Sadiq Sardhanvi and Allama Rashi-ul-Kheri and avoided their technical errors and short comings in his writings not only this but also he while keeping himself away such great contemporary historical novel writers especially Rais Ahmad Jafri, Rasheed Akhter Nadvi and M Aslam he maintained his idiosyncrasy and his individual quality quite intact and presented the factual past events truthfully without distorting the technical aspects of novel. His deep study, good selection of topics, and his strong grip over the art of pen crafting are the things which make him popular among the readers and as such the historical novel writing became the choice of a major group of reading world. It is by virtue of that majority group that young novel writers were impressed by Naseem Hijazi in his life time. A majority of young writers was influenced by his style and they adopted it. It is worth mentioning here that a well known weekly magazine Akhbar-Jahan and Akhbar-e-Khwateen brought about historic novel series of Khan Asif in installments. Later on these were compiled in the form of a novel for being popular among the people. Besides, the historical incidents and events of Ilyas Sitapoori are being published in the monthly Suspense Digest and they are so popular in the masses that they have been collected and published together in the form of a book. Apart from this, numerous historical novels emerged in India in the immediate past and they were liked by people. Naseem Hijazi has done double duty. On one hand he has influenced the historical writers and on the other hand he influences the readers.

In the end taking a view of the technical aspect of his novels I have presented and discussed the glorified dignity of Naseem Hijazi. He is such a novel writer according to our study who keeps historical facts intact and creates such a fiction that history appears like a novel and novel becomes the mirror of facts. This combination of facts and fiction in historical novel writing is a great credit, which goes to Naseem Hijazi, and he is unsurpassed in this field. He is distinct and distinguished and stands alone both in his predecessors and contemporaries. He knows the art of influencing novel into history and very artfully he can use it. Neither he surrenders from novel for the sake of history nor does he murder history for the sake of novel.

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ○

فہرست

مقدمہ

نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری پر گفتگو کہاں سے شروع کی جائے؟ یہ ایک اہم اور قابلِ غور سوال تھا مگر اس کے لیے مجھے ڈاکٹر یاور عباس کی طرح یہ نہیں کہنا پڑا کہ

خدا کرے کہ وہ مل جائے تو فسانہ کہوں
جو لفظ ڈھونڈ رہا ہوں میں ابتدا کے لیے

اس لیے کہ میں کوئی افسانہ لکھنے نہیں جا رہا تھا بلکہ میں تو ایک ایسی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا تھا جس کا اظہار بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ میرے خیال میں کسی بھی ناول نگار پر گفتگو کرنے سے قبل یہ جاننا بجائے خود بہت اہم ہے کہ تاریخی ناول نگاری کیا ہے اور اس کی اپنی تاریخ کیا ہے یہ کہاں سے شروع ہوتی ہے اور ہمارے ہاں کن کن مراحل سے گزر کر اُس خاص ناول نگار تک پہنچتی ہے جس پر گفتگو مقصود ہے۔

ہم چوں کہ انگریزی نو آبادیات کا حصہ رہے ہیں اس لیے ہمارے سامنے قریب ترین حوالہ انگریزی ادب ہی ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی باہر کی دنیا بالخصوص یورپ وغیرہ کو ہم بہ زبان انگریزی ہی جانتے رہے ہیں اس لیے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ناول نگاری کے آغاز ہی میں رچرڈسن کے دو اک سال بعد، فیلڈنگ کے ناول جوزف اینڈریوز ہی سے تاریخی ناول نگاری کا آغاز ہو گیا تھا ۔اردو میں ہمارے ہاں ایسی تحریریں جن میں تاریخیت دیکھی جا سکتی ہے وہ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور منشی سجاد حسن وغیرہ کے ناول تھے۔ مگر وہ ناول جن سے ہمارے ہاں باقاعدہ اس صنف کا آغاز ہوا وہ مولانا عبدالحلیم شرر کے قلم سے نکلے جن سے معاصرانہ چشمک اور مقابلے میں محمد علی طبیب کے ناول اور کچھ بعد میں علامہ راشد الخیری اور صادق حسین سردھنوی کے ناول ایسی روایت کو بڑھاتے اور پروان چڑھاتے نظر آتے ہیں۔

میرے خیال میں اس صنف کی آبیاری کا مقصد محض ایک چلتے ہوئے فیشن کی پیروی اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ہی نہیں تھا بلکہ یہ وقت کی ایک ضرورت بھی تھی۔ جسے ایک خاص مقصدیت (Objectivity) سے ہم آہنگ کر کے ان اہلِ قلم نے پورا کرنے کی حتی المقدور سعی کی۔

میں جب یہ کہتا ہوں تو میرے ذہن میں تاریخ کا وہ ورق کھلا ہوتا ہے جس میں یورپ کا صنعتی انقلاب، اور سائنسی انکشافات اور اس کے نتیجے میں استعمار پسندی کی روایت پلی بڑھی۔ اس کے نتیجے میں تیسری دنیا کی شکست و ریخت، افریشیائی ممالک کی غلامی، محکومی، ملتِ اسلامیہ کا زوال، مسلم حکومتوں کے اقتدار اور خلافت کا خاتمہ صاف پڑھا جا سکتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے ۷۰۰ سالہ اقتدار کا سورج بہادر شاہ ظفر کی مغل حکومت کے خاتمے کے ساتھ غروب ہو چکا تھا اور حال یہ تھا کہ ع

مُلک اپنا تھا مگر غیر کے ہاتھوں میں تھی شاہی

مُسلمانوں بالخصوص اسلامیانِ ہند کا مورال پست ہو چکا تھا، وہ اپنے حال سے بیزار اور مستقبل سے مایوس تھے۔ ایسا لگتا تھا گویا زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہ گیا تھا۔ کوئی ایسی جامع شخصیت یا بڑی تحریک بظاہر نظر نہیں آتی تھی جس کی آواز پر وہ لبیک کہہ کر انھیں اور اپنے ٹھہرے ہوئے قافلے کو پھر سے رواں دواں کر لیں۔

ان حالات میں پھر سے جی اٹھنے کی جو بھی اور جیسی تیسی بے بضاعت کوششیں زندگی کے مختلف میدانوں اور محاذوں پر ہو رہی تھیں، میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے مذکورہ ادیبوں اور نثر نگاروں نے انہیں تقویت دینے اور اس نیک کام میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے لیے چنا اور استعمال کیا۔ اس لیے کہ حال سے بیزار اور مستقبل سے مایوس لوگوں کے لیے اُن کا شاندار ماضی اور اُس کی یاد جہاں حوصلہ اور (Inspiration) کا سبب بنتی ہے وہیں پھر سے جی اٹھنے اور اپنے مستقبل کی خاطر کچھ کر گزرنے کے لیے اُن کے جذبات کو کچھ اور جنوں خیز کرتی ہے گویا راہوارِ حریّت کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے۔

یہی وہ بات تھی جس کا میں نے اوپر ذکر کیا کہ ان اہلِ قلم نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دانستہ تاریخی ناول نگاری کا سہارا لیا۔

بات کچھ بھی رہی ہو، یہ ایک فطری امر ہے کہ ہر چیز وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ Thin سے Thick ہوتی ہے۔ یہی کچھ ہمارے ہاں تاریخی ناول نگاری کے ساتھ ہوا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسکاٹ کے ناول کے منصۂ شہود پر آنے کے بعد تاریخی ناول نگاری کے جو اصول مُرتب ہوئے تھے اور اُس کے لیے جو تلازمے طے پائے تھے اُن کی روشنی میں عبدالحلیم شررؔ وہ پہلے آدمی ہیں جنھیں ہم اردو کا پہلا باقاعدہ ناول نگار شمار کر سکتے ہیں۔ گویا وہ اُردو میں تاریخی ناول نگاری کے اسکاٹ ہیں۔

محمد علی طبیب اگرچہ اُن کے ہم عصر ہیں اور معاصرانہ چشمک رکھتے ہیں مگر اچھے شمار، اور تاریخی ناول نگاری کے ابتدائی دور کے بڑے فنکار ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کا ایک الگ حلقہ اور اثر رکھتے ہیں۔ تاہم جو مقام شررؔ کو حاصل ہوا وہ انہیں حاصل نہ ہو سکا۔

کچھ آگے چل کر اسی دشت کی سیاحت میں راشد الخیری مصروف نظر آتے ہیں جن کے ہاں زبان و بیان میں تو ارتقا نظر آتا ہے لیکن اُن کی غم پسندی کبھی کبھی کہانی میں جھول پیدا کر دیتی ہے اور کردار بھی کبھی کبھی واضح نہیں ہو پاتے جس پر میں نے آگے چل کر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

صادق حسین سردھنوی اس آسمان کے ایک اور درخشاں ستارے ہیں جو اپنے وقت کے بڑے پڑھے جانے والے مقبول ادیب ہیں جن کے ہاں اور زیادہ ارتقا نظر آتا ہے تاہم منظر نگاری یکسانیت کا شکار ہو گئی ہے کیونکہ تاریخی واقعات انتہائی اختصار سے بیان ہوتے ہیں جبکہ رومانیت کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اُن کے پلاٹ اچھے ہیں، کہانی مستحکم ہے کردار نگاری بھی خاصی واضح ہے۔ گویا تاریخی ناول نگاری کی روایت پختگی نظر آتی ہے۔

مگر یہی روایت جب ایم۔ اسلم تک پہنچتی ہے تو مقدار میں اضافہ اور معیار میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔ اُس کی ایک وجہ تو ایم۔ اسلم کی بسیار نویسی ہے۔ دوسرے چونکہ وہ فلموں کے لیے بھی لکھتے رہے تو اُن کے ہاں ناول میں ڈرامے کا اسلوب دکھائی دیتا

ہے۔ ہیجان انگیز کیفیت کا اظہار بھی ملتا ہے جس سے ادبیت متاثر ہوتی ہے۔

اُنہی کے پہلو بہ پہلو رئیس احمد جعفری بھی ہیں جنھیں رئیس التحریر کا خطاب بھی ملا اور جو تاریخ اور تاریخی ناول نگاری کا ایک بڑا نام بھی سمجھے گئے لیکن ابتدا میں جو معیار انہوں نے قائم کیا تھا اُسے آگے چل کر وہ برقرار نہ رکھ سکے۔ اُس کی وجہ قاری کی طلب اور ناشر کی وہ ضرورت ہے جس نے انہیں بسیار نویسی پر مجبور کر دیا تھا لیکن ظاہری ادبیت پیدا کرنے کی دھن میں جا و بے جا اشعار کا استعمال کرتے ہیں۔ مشاہدے کی کمی نے ان کے ناولوں کی حیثیت کو متاثر کیا ہے۔

اس کے برعکس رشید اختر ندوی کے تاریخی ناولوں میں زبان و بیان، پلاٹ اور کردار سب میں ہمیں ایک ارتقائی کیفیت نظر آتی ہے۔

یہ سب کچھ میں بہت اختصار کے ساتھ بیان کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ کسی تحریر کا مقدمہ، اصل تحریر میں ضبط کی جانے والی تفصیلی بحث یا طوالت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اُردو میں تاریخی ناول نگاری جب ان تمام مدارج اور نشیب و فراز سے ہوتی ہوئی نسیم حجازی تک پہنچی تو جہاں ایک طرف اس کے خدوخال واضح ہو چکے تھے اور ایک علیحٰدہ اور معتبر صنف کے طور پر ادب کے قاری سے اپنا رشتہ استوار کر چکی تھی تو وہیں نسیم حجازی کے لیے اگر ماضی میں دیکھنے اور سیکھنے کے لیے بہت کچھ تھا تو مستقبل میں بڑے Challenges اور اصلاح کے بڑے امکانات تھے۔ انہوں نے دونوں طرف اپنی نگاہ رکھی اور اپنے پیش رووں کی غلطیوں سے بچ بچا کر اس سفر کو آگے بڑھایا اور کامیابی کی اُس منزل سے ہمکنار ہوئے جو کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔

وہ ایک وسیع المطالعہ آدمی تھے۔ بے شمار انگریزی، روسی اور فرانسیسی ناولوں کا مطالعہ کیے ہوئے تھے۔ تاریخ پر نگاہ تھی، قلم پر گرفت تھی اور طباعی اور تخلیقی جوہر کے حامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ناولوں میں ہم پہلی بار درست سنین کا استعمال دیکھتے ہیں۔ کسی بھی واقعے کے بیان میں تاریخی نامور شخصیات کے ساتھ جو گمنام افراد کی ایک تعداد تاریخ میں ملتی ہے اُسے اپنے تخیل (Visualization) سے مختلف نام دے کر جیتے جاگتے کردار بنا کر پیش کر دیتے ہیں جس سے ناول کی ناولیت میں اضافہ ہوتا ہے، محض تاریخی بیان کی تکرار محسوس نہیں ہوتی اور یوں لگتا ہے کہ ہم محض تاریخ نہیں پڑھ رہے بلکہ ادبی فن پارہ پڑھ رہے ہیں۔

مگر مجھے تعجب ہوتا ہے اور افسوس بھی! کہ ایک ایسا ادیب جس نے نہ صرف اُردو ادب کے قارئین اور گزشتہ کئی دہائیوں کے ناول بینوں کے لیے خونِ جگر سے کیسے کیسے فسانے تحریر کیے۔

بلکہ جس کی چھاپ بعد کے آنے والے بہت سے ادیبوں اور فنکاروں پر بھی بہت واضح نظر آتی ہے، اس کو اور اس کے کام کو نقد و نظر کے حوالے سے ہمارے ادب کے بیشتر ناقدین نے درخور اعتناء ہی نہیں سمجھا۔ میرے نزدیک اس لحاظ سے نسیم حجازی ایک محروم اور مظلوم شخصیت ہیں۔ اُن کا قصور شاید یہ تھا کہ وہ اُس دور میں یہ سب کچھ لکھ رہے تھے جب بائیں بازو سے تعلق رکھنے کا فیشن عام تھا اور شاعر و ادیب ہونا، کفر و الحاد کا اختیار کرنا، اپنے دین اور روایات پر شرمسار و معذرت خواہ رہنا اور اپنے شاندار ماضی اور تاریخ کا انکار کرنا، یہ سب باتیں ہم معنی تھیں۔

حال کی ہرنا کامی کا ذمے دار اپنے ماضی کو سمجھا جا رہا تھا اور اُس ماضی سے پیچھا چھڑانے کی ایسی ہی سعی لا حاصل کی جا رہی تھی جیسی کسی درویش نے کمبل سے اپنی جان چھڑانے کے لیے کی تھی مگر جیسے ، کمبل درویش کی جان نہیں چھوڑتا تھا بالکل ایسے ہی یہ ماضی، یہ دین اور یہ روایات ان کی جان چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔

یہ اپنا نام بدلنے کے لیے اچھے بھلے نام کو حروف تک میں بدل لیتے تھے مگر۔۔ یہ حروفوں کے بنے ہوئے اندر سے پھر وہی نکل آتے تھے۔ سچ ہے کہ ؎

قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا!

راقم الحروف نے جو اُردو ادب کا ایک بے بصارت طالب علم ہے، اس کمی کو (جو نسیم حجازی مرحوم کے ساتھ کسی زیادتی سے کم نہیں) ہمیشہ شدت سے محسوس کیا اور شاید یہی شدتِ احساس تھی جس نے مجھے غور و فکر اور تحقیق و تفتیش کی ان کٹھنائیوں میں اُترنے پر مجبور کیا جن سے گزرنے کی ہمت آنکھ والے بھی کم کم ہی پاتے ہیں۔

تحقیق و تفتیش کے اس سفر میں میری معذوری جہاں بے شمار مسائل اور رکاوٹوں کا باعث بنی وہیں میرے محسن، دوست اور احباب کا بیش بہا تعاون مجھ پر یہ بات کھولتا اور ثابت کرتا رہا کہ ؎

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے

ان احباب کی یہ فہرست اس قدر طویل ہے کہ اس کے لیے ضمیمہ کا استعمال ناگزیر ہو گیا ہے۔

نسیم حجازی صاحب کے بارے میں معلومات کے لیے مجھے دو مرتبہ راولپنڈی تک کا سفر کرنا پڑا پہلی بار ۱۹۹۲ء میں جب وہ حیات تھے۔ اُن سے ملاقاتوں کا ایک سہ روزہ سلسلہ رہا۔ اس دوران نسیم حجازی صاحب سے ہونے والی گفتگو میں نے ریکارڈ کر لی۔ مگر جب تحقیقی کام شروع ہوا تو پتا چلا کہ یہ معلومات تو ناکافی ہیں۔ چناں چہ ایک مرتبہ پھر راولپنڈی گیا۔ یہ مئی ۲۰۰۲ء کی بات ہے مگر اب وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ چناں چہ اُن کے بڑے بیٹے خالد نسیم اور بیگم شہناز خالد سے ملاقاتیں کر کے خاصی معلومات حاصل کیں۔

اسی سفر میں اُن کے بھتیجے ظفر حجازی اور بھانجے غلام اکبر نے بھی کچھ معلومات فراہم کیں۔ پھر واپسی میں قیام لاہور کے دوران میں پروفیسر ظفر حجازی (واضح رہے یہ اوپر مذکورہ ظفر حجازی سے جدا، ایک اور مشہور علمی اور ادبی شخصیت ہیں) اور ڈاکٹر مسکین حجازی سے معلومات اکٹھی کرنے کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے اور شعبۂ صحافت کی لائبریری سے بھی اس سلسلے میں استفادہ کیا۔

چونکہ میں بصارت سے محروم ہوں اس لیے اس سلسلے میں لکھنے پڑھنے کا جو بھی عمل ہے، اُس کے لیے جن کرم فرماؤں کا بطورِ خاص تعاون حاصل رہا، اُن میں شازیہ محمود خان (میری ایک شاگرد جو اب خیر سے M.A in Special Education بھی ہیں) سرِ فہرست ہیں، جن کی تین سالہ خدمات میرے لیے ایک عظیم احسان سے کم نہیں۔ آخری سال صبا کوثر (میری ایک اور شاگرد جو اردو

ادب میں ماسٹرز کر رہی ہیں) نے بھی بھرپور تعاون کیا۔

اس پورے عرصے میں میری اہلیہ اسما کا کردار قابلِ فخر رہا جس کا ذکر نہ کرنا بعید از انصاف ہوگا۔ میری کتابوں کا غذات کی ترتیب اور میرے اور میرے معاونین کے لیے گاہے بگاہے چائے اور طعام کا انتظام اُنہی کا حصہ تھا۔ اگر وہ میرے علمی کاموں میں میری معاونت نہ کرتیں تو یہ کام کبھی مکمل نہ ہوتا۔

مگر ان سب کرم فرمائیوں اور تعاون و اشتراکِ عمل کے باوجود میں اُس رہنمائی اور تعاون کے بغیر اس سفر میں ایک گام بھی آگے نہ جا سکتا تھا جو اپنے انتہائی قابل، شفیق اور نہایت مہربان استاد جناب پروفیسر ڈاکٹر سید محمد یونس حسنی صاحب سے قدم قدم پر مجھے حاصل رہا۔

قحط الرّجال کے اس عہدِ پُر آشوب میں حسنی صاحب کا دم بڑا غنیمت ہے۔ اُن سے مل کر آج بھی میرؔ والی بات کہنی پڑتی ہے کہ

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

میرے اس مقالے میں جو بھی خامی اور کوتاہی بالعموم اور زبان و بیان کی کمزوری بالخصوص آپ کو نظر آئے گی، وہ میری اپنی ہے۔ اس لیے کہ اس مقالے کو میں نے اپنی معذوری کے باعث بول کر قلمبند کرایا ہے۔ اس لیے اس میں ارتجالاً بول چال کی زبان آ گئی ہے۔

ان تمام خرابیوں سے ہٹ کر، میرے پڑھنے والوں کو اِس میں کوئی اچھی اور کام کی بات نظر آئے تو اس کا کریڈٹ میرے، استادِ محترم جناب حسنی صاحب کو دیا جائے کہ یہ اُنہی کا حق ہے!۔۔۔۔اور احقاقِ حق تو یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

ممتاز عمر

لیکچرار (شعبۂ اُردو)

گورنمنٹ ڈگری سائنس اینڈ کامرس کالج

لانڈھی کورنگی کراچی

یکم جنوری ۲۰۰۳ء

پہلا باب

اردو میں تاریخی ناول نگاری کی ابتدا

ناول کیا ہے؟

ناول (Novel) کے لفظی معنی نئی قسم سے متعلق یا پہلے سے سنی دیکھی چیز سے مختلف، انوکھا، نادر، غیر معمولی، نیا، نرالا خصوصاً نمایاں یا دلچسپ پیرائے میں ہیں جبکہ اسکے موضوع کی نوعیت کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقمطراز ہیں:

''نثری قصہ جس میں کم وبیش پیچیدہ پلاٹ کے ساتھ حقیقی زندگی کے کردار، افعال اور مناظر پیش کیے جائیں۔'' [۱]

اور مولانا حامد علی نے لکھا ہے:

''ناول (Novel) ایک مکمل اور طویل خیالی نثری داستان۔'' [۲]

جبکہ ناول کے موضوع کی مزید وضاحت پروفیسر فضل الرحمٰن نے ان الفاظ میں کی:

''ناول (Novel) نثر میں کہانی، جو خیالی اشخاص کے کارناموں یا خدمات سے متعلق ہو اور ان کے فعل اور تصور کو پیش کر کے انسانی زندگی اور کردار کو واضح کرے۔ ابتدائی کلاسیکی اور دورِ متوسط نثری کہانیاں بیشتر رومانی تھیں اور وضاحتِ کردار کی جانب ان کا رجحان کم تھا۔ ناول نام کی ابتدا بوکاشیو (BOCACCIO) کی کتاب (NOVALLASTORIA) سے ہوئی اور اردو میں ناول نویسی کی روایت انگریزی سے آئی۔'' [۳]

اور یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ یورپ اور ہندوستان یا دنیا کے دوسرے علاقوں میں ناول کا آغاز دلچسپ طریقے پر ہوا اور اس کے پس پردہ انسان کی وہ خواہش تھی جسے حقیقت کی تلاش کہہ سکتے ہیں۔ انسان داستانوں کے فرضی واقعات اور اسکے مافوق الفطرت کرداروں سے لطف اور سرور لے رہا تھا مگر دل کی تسلی اور دماغ کی تسکین اسے حاصل نہ تھی پھر سائنسی ترقی نے ہر شئے کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنے کا شعور بخشا اور انسان جنوں، بھوتوں، اڑتے قالین اور اڑن طشتری وغیرہ پڑھ کر اور سن کر ہنستا تھا اور یوں اس کی دلچسپی اسطرح کم ہوتی گئی اور پھر ناول کی صنف کا آغاز ہوتا ہے کہ جس میں انسانی معاشرے کے واقعات اور کرداروں کو ہمارے سامنے پیش کیا گیا یہ الگ بات ہے کہ ان قصوں میں کس قدر جھول تھا، پلاٹ کس قدر کمزور تھے، کردار نگاری کس قدر بے محل اور کہانی میں ربط وتسلسل کی کمی نظر آئی مگر ان سب کے باوجود یہ کہانیاں ہمارے اردگرد پھیلی تہذیب ومعاشرت کی عکاس تھیں۔ اس کے کردار جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ انگریزی کے ناول نگار رچرڈسن نے اپنی تصنیف میں:

---

[۱] قومی انگریزی اور اردو لغت؛ ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۱۳۲۸۔

[۲] اردو جامع انسائکلوپیڈیا؛ مولانا حامد علی، ص ۱۷۰۳۔

[۳] اردو انسائکلوپیڈیا؛ پروفیسر فضل الرحمٰن، ص ۱۲۴۔

''شعور کے رازوں، جذبات کے رنگ اور محرکات کی کشمکش کو نیکی اور بدی کی جنگ میں تبدیل ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔''[۱]

لیکن اگر رچرڈسن کو فن کی کسوٹی پر پرکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے یہاں خطوں کے ذریعے قصہ بیان کرنے کا طریقہ جو اس نے استعمال کیا ہے بہت بھونڈا ہے اس میں بے جا تکرار اور ایک ہی کردار کے نقطۂ نظر کا یکساں وجود بہت تکلیف دہ ہے۔ فن تعمیر یا طرز ادا میں رچرڈسن کوئی اضافہ نہیں کرتا۔

لیکن ہنری فیلڈنگ اپنے ناول ''جوزف اینڈریوز'' کے دیباچے میں اپنے لئے فن پر اہم تنقید پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے ناول کو COMIC EPIC POEM IN PROSE کہتا ہے:

''یہ صنف ایپک اور کمیڈی کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔ بیان تعمیر اور اخلاقی مقصود ایپک سے لئے گئے ہیں۔ عام زندگی کے مکالمے اور مزاج کمیڈی سے لئے گئے ہیں۔ اور اس طرح ایک صنف وجود میں آئی ہے جس میں کوئی چیز ایسی نہیں جو خود مصنف کے تجربے سے باہر ہو۔''[۲]

یہی وجہ ہے کہ ہنری فیلڈنگ کا ناول رچرڈسن کے ناول کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہے۔ اسے کہانی کہنے کا فن آتا ہے گو کہ کردار نگاری میں دونوں کے یہاں مماثلت خاص حد تک موجود ہے مگر دلچسپی اور اخلاقی رموز فیلڈنگ کے یہاں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئے۔

اب اگر ہم اردو ناول کے ارتقاء پر غور کریں تو ہمیں رچرڈسن جیسی ضروریات ناول کے وجود سے مماثل نظر آئیں گی۔ رچرڈسن کو پُر لطف محبت نامے لکھنے کا شوق تھا اور اپنی کاروباری ضرورت کے مطابق اس نے خطوط کے مجموعے کو مرتب کر کے شائع کیا۔ بالکل اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد کو اپنی بیٹیوں کی تربیت اور اصلاح کی خاطر ''مراۃ العروس'' مرتب کرنا پڑی اور جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ داستانوی ادب اور ڈپٹی نذیر احمد نے ناول نگاری کے درمیان پلاٹ سازی، معاشرتی مسائل اور زندگی کے مسائل کو افسانوی انداز دیا ہے۔ قصہ گوئی یا کہانی لکھنے کا فن کچھ معدوم سا ہے اور پھر یہ دور سیاسی انتشار کا بھی ہے اور بعد ازاں انگریزوں کی باقاعدہ حکمرانی اور ہندوستانیوں میں اس خوف کا رچ بس جانا کہ سامراجی قوت کے ساتھ مغربی تہذیب بھی ہم پر حکمران نہ ہو جائے غالب تھا۔ اسی خوف کو مدنظر رکھ کر اور انگریزوں کی مرعوبیت کا شکار ہو کر کچھ ڈرے ڈرے سہمے سہمے انداز میں اپنے زورِ قلم کا سہارا لے کر مولوی صاحب نے ''مراۃ العروس'' سے ''ابن الوقت'' تک مرتب کی۔ ان کے افسانے تمثیلی ہیں۔ کردار اسم بامسمٰی ہیں اور پلاٹ نہایت کمزور ہیں۔

ڈاکٹر احسن فاروقی انہیں سرے سے ناول نگار ہی تسلیم نہیں کرتے اور اگر کوئی انہیں ناول نگار کہے تو ڈاکٹر صاحب اسکے نقاد ہونے پر بھی

---

[۱] تاریخ ادب انگریزی: ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص ۳۲۷۔

[۲] ایضاً، ص ۳۲۸۔

شبہ کرتے ہیں۔شاید اسی رائے کو مدِ نظر رکھ کر پروفیسر احتشام یہ رائے دیتے ہیں:

''بہت سے نقاد نذیر احمد کو ناول نگار نہیں مانتے لیکن یہ محض اصطلاح کا چکر ہے۔ان کی سماجی بصیرت اور تاریخی شعور پر نظر رکھ کر میں انہیں اردو کا پہلا اور بہت اہم ناول نگار تسلیم کرتا ہوں۔''مراۃ العروس''،''توبۃ النصوح''،''فسانۂ مبتلا'' اور ''ابن الوقت'' ہر ایک میں گہرے سماجی حقائق پیش کئے گئے ہیں۔ہر ایک میں مشابہت کے باوجود حقیقت پسندی اپنی جگہ رکھتی ہے۔''[1]

عزیز احمد بھی انہیں کچھ اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

''نذیر احمد اُردو کے پہلے کامیاب ناول نگار ہیں انہیں کہانیاں کہنا آتا ہے اور ان کی کہانیاں زندگی سے براہ راست چنی گئی ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ پند و موعظت کے پہاڑ ان کے قصوں میں ایسے کھڑے ہیں جنھیں نفس قصہ سے کوئی سروکار نہیں اور جو قصے کی دلچسپی میں بُری طرح مزاحم ہیں لیکن اگر بالفرض اس پند و موعظت کی بھرمار کو کتاب سے نکال دیا جائے تو ایک صاف سیدھا سا قصہ باقی رہ جاتا ہے جس میں انتہائی ظاہری خارجی تفصیل کے ساتھ زندگی کی سچی تصویر نظر کے سامنے پھر جاتی ہے۔یہ تصویر محدود ہے۔اس کا تعلق اُس زمانے کے متوسط شریف طبقے کی گھریلو زندگی سے ہے۔اس میں بہت زیادہ گہرائی بھی نہیں۔پھر بھی خارجی حقیقت نگاری کا یہ کمال آج تک کسی اور ناول نگار کو نصیب نہ ہو سکا۔''[2]

نذیر احمد کی کردار نگاری خاصی کمزور ہے۔وہ اپنے کرداروں کو انگلی پکڑ کر چلاتے ہیں اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرتے ہیں۔یہ تو ممکن ہے کہ ناموں سے ہٹ کر وہ خصوصیات آج بھی مل جاتی ہیں جو اُن کے کرداروں میں پائی جاتی ہیں۔مثال کے طور پر ''حجتہ الاسلام'' اور ''ظاہر دار بیگ'' وغیرہ مگر چند ایسے کردار بھی ہیں جو متنازع ہیں۔مثال کے طور پر ڈاکٹر احسن فاروقی اکبری کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

''ایسی پھوہڑ عورت تو ناممکن ہے۔مگر پھوہڑپن کی جو باتیں الگ الگ لڑکیوں میں مولانا نے بہ چشم دید دیکھی ہوں گی وہ سب یکجا کر کے انھوں نے نہایت دلچسپ اور جیتا جاگتا نمونہ اکبری کی صورت میں پیش کیا ہے۔''[3]

ان سب اعتراضات کے باوجود فضل الرحمٰن، نذیر احمد کی اہمیت کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''مگر اُردو ادب میں اُن کی اہمیت اِن مقصدی قصوں کی وجہ سے ہے جو ناول نگاری کے اوّلین نمونے ہیں اور اپنے تمثیلی رنگ کے باوجود معاشرے کی مصوری، حقیقت نگاری، جاندار اور بامحاورہ زبان کی وجہ سے بے مثل ہیں۔''[4]

تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے باوجود یہ بات تو طے ہے کہ نذیر احمد اُردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ان کے افسانے ناول کے

---

[1] ذوق ادب اور شعور؛ آل احمد سرور، ص ۳۵۔

[2] ترقی پسند ادب؛ نذیر احمد، ص ۲۳۰۔

[3] نذیر احمد کے تمثیلی افسانے؛ مشمولہ جدید اردو نثر، ص ۳۶۶

[4] اُردو انسائیکلو پیڈیا؛ پروفیسر فضل الرحمٰن، ص ۶۱۔

فنی معیار پر کسی نہ کسی حد تک پورے اترتے ہیں اور یوں بھی اس پہلے شخص کے کام کو خامیوں سے مبرا نہیں سمجھنا چاہیے جو اس صنف کا بانی ہو۔ مولوی نذیر احمد کے سامنے ناول نگاری کی کوئی مثال موجود نہ تھی مگر آنے والوں کے لئے انھوں نے بہت کچھ چھوڑا ہے۔ انہیں کہانی کہنے کا فن آتا تھا۔ وہ قاری کو محظوظ کرنا جانتے تھے لیکن ہم ان تعریفوں کو بھی مدنظر رکھیں گے جو ناول کے حوالے سے ہمارے سامنے آئیں گی۔

صنفِ ناول سے متعلق کچھ نہ کچھ کہانی اور قصے ہمارے سامنے آئے۔ ان میں اور داستانوں میں نمایاں فرق تھا۔ فرضی اور خیالی کردار موجود نہ تھے۔ زندگی کی حقیقی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی یہ الگ بات ہے کہ حقیقت انتہا پسندی یا نظر انداز کرنے کی حد تک جا پہنچی تھی اور یہی وجہ ہے کہ مختلف ناول نگاروں نے اپنے انداز اور اپنے ناول لکھنے کے فن کا مختلف الفاظ میں دفاع کیا ہے۔

مثال کے طور پر رابن سن کروسو کے غیر فانی مصنف ڈینیل ڈفو نے اس فن کی بنیاد ڈالتے ہوئے دو چیزوں کا خاص طور سے لحاظ کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ قصہ گو کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اسے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دینا چاہیے اس لئے کہ اگر قصہ حقیقت پر مبنی نہ ہوگا تو جھوٹ ہوگا اور اس کی تصنیف کے ذریعے مصنف جھوٹ بولنے کا عادی ہو جائے گا۔ وہ کہتا ہے:

''قصہ گھڑ کر پیش کرنا بہت ہی بڑا جرم ہے یہ اس طرح کی دروغ گوئی ہے جو دل میں ایک بہت بڑا سوراخ کر دیتی ہے جس کے ذریعے سے جھوٹ آہستہ آہستہ داخل ہو کر ایک عادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے وہ اس کی تخلیق نہیں ہے بلکہ سچے واقعات کا بیان ہے اور ان کی تحریر سے اس کی غرض سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ وہ گمراہوں کو راہ راست پر لائے اور ناکردہ گناہ گاروں کو برائیوں سے بچائے۔

فیلڈنگ جو انگریزی ناول کے عناصر اربع میں سے دوسرا ہے اس فن کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہے:

''ناول نثر میں ایک طربیہ کہانی ہے۔''

یعنی اس کے نزدیک المیہ کہانی ناول کے موضوع سے باہر ہے۔ وہ اس طرح رچرڈسن کے اس نقطۂ نظر کو رد کرتا ہے کہ کہانی کی غرض نیکی اور اخلاق کا سدھارنا ہے۔ فیلڈنگ اسے تفریح کا آلہ سمجھتا ہے اور ہنسنے ہنسانے کا ذریعہ۔ اسی لئے وہ اس سے طربیہ کی شرط لگا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعریف جامع ہے اور نہ مانع۔ اس لئے نامکمل ہے۔ اس کا ہم عصر اسمولٹ اس نئے فن کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''ناول ایک پھیلی ہوئی بڑی تصویر ہے جس میں ایک مقررہ پلاٹ کے واضح کرنے کے لئے زندگی کے کردار مختلف جماعتوں کے ساتھ رکھ کر مختلف پہلوؤں سے دکھائے جاتے ہے۔''

یہ تعریف بھی فیلڈنگ کی تعریف کی طرح ناقص ہے۔ اس لئے کہ اس میں سارا زور پلاٹ پر ہے نہ کہ کردار پر۔ ہم کردار کو واضح کرنے کے لئے پلاٹ بناتے ہیں نہ کہ پلاٹ بنانے کے لئے کردار مگر اسمولٹ اُس زمانے کا مصنف ہے جب صرف رزمیہ اور رومانی ناول وجود میں آئے تھے اور جب کرداری ناول نے جنم لیا تھا۔ اس لئے وہ قابلِ حرف گیری نہیں البتہ تعجب ہوتا ہے اسٹونسن پر کہ وہ عہد

وکٹوریہ کا مصنف ہونے کے باوجود ناول کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:

''ناول ایک ایسی نقل نہیں کہ اسکا فیصلہ اصل پر رکھ کر کیا جائے بلکہ وہ زندگی کے کسی خاص پہلو یا نقطۂ نظر کی وضاحت ہے اور اس کی فنا و بقا اسی وضاحت کی اہمیت پر مبنی ہے۔ ایک اچھا لکھا ہوا ناول اپنے مقصد و غرض کو اپنے ہر باب، ہر صفحے اور جملے سے پکارتا اور دہراتا ہے۔''

یہ تعریف ناول کی ہر جگہ موجود مختصر افسانے پر زیادہ واضح طور پر صادق آتی ہے۔ جہاں اعجاز کے ہاتھوں میں اطناب کی باگ ہوتی ہے اور مختصر نویسی کو مرکزی خیال سے بال برابر بھی ہٹنے نہیں دیتی۔ اسٹونسن کی اس تعریف کا اطلاق نہ تو ٹالسٹائی کی معرکۃ الآرا تصنیف ''جنگ و صلح'' (WAR AND PEACE) پر ہو سکتا ہے اور نہ سرشار کے ''فسانۂ آزاد'' پر نہ شالوخوف کے ''سلسلہ ڈان'' (DON SERIES) پر اور نہ مارگریٹ میچل (Margraet Michel) کی گان وتھ دی ونڈ (GONE WITH THE WIND) پر اور ظاہر ہے کہ جو تعریف ان مسلمہ کتابوں کے لئے مانع ہو وہ جامع نہیں ہو سکتی لیکن یہ اُس زمانے کی تعریفیں ہیں جب اس فن کی حدود واضح طور پر متعین نہ تھیں۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب ناول کے مطلع پر رومان کا ابر تاریک سایہ فگن تھا مگر جب سائنس اور فلسفہ کے آفتاب عالم نے رومانی گھٹاؤں کے سیاہ پردے چاک کر دیے تو ناقدین اور معاصرین کی آنکھیں زیادہ صاف طور پر ایک نگار آتشیں کے خدوخال سے آشنا ہو گئیں اور انھوں نے اس کی تعریفوں میں طرح طرح کی موشگافیوں سے کام لینا شروع کیا۔

انگلستان کی ایک ادیبہ کلہ داریوز اس فن کی یوں تعریف کرتی ہیں:

''ناول اُس زمانے کی زندگی اور معاشرت کی سچی تصویر ہے جس زمانے میں وہ لکھا جائے۔''

پولینڈ کا رہنے والا اور انگریزی ناول لکھنے والا کامریڈ کہتا ہے:

''ایک ناول اسکے سوا اور کیا ہے کہ ہمیں اسکے ذریعے دوسرے انسانوں کے وجود کا یقین آ جاتا ہے اور اس یقین میں اتنی شدت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم اسے تخیلی جامہ دے کر حقیقت سے بھی زیادہ واضح بنا دیتے ہیں۔''

جبکہ فرانس کا فطرت نگار زولا کہتا ہے:

''ناول خیالاتِ انسانی کا تجربہ ہے اور ان کے مظاہر کا ایک ریکارڈ ہے۔''

چنانچہ وہ اپنے ملک کے اُستادانِ فن ''بالزک'' اور ''اسٹینڈہل'' کی مدح سرائی یوں کرتا ہے:

''ناول کی دنیا میں یہ دونوں اسی قسم کی تحقیق کی نمائندگی کرتے ہیں جس قسم کی تحقیق حکماء سائنس کی دنیا میں کرتے ہیں۔ وہ تخیلی چیزیں نہیں پیش کرتے اور وہ محض قصے بیان کرتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور اس کے جسم و دماغ کا تجربہ کر ڈالیں۔''

ایک اور فرانسیسی مصنف لورٹیز ناول کی ہیئت و صورت سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''یہ ضروری ہے کہ قصوں کا مواد اور اُن کے کرداروں کی سیرتیں ہماری سیرتوں سے اس قدر مشابہ ہوں کہ ہم اُن میں اپنے روزانہ کے ملنے والوں کو شناخت کرسکیں۔''

نقل کو اصل کے مطابق بنانے اور ناول کو حقیقت نگاری تک محدود رکھنے کے اسی خیال نے انگلستان کے مایہ ناز ادیب ایچ جی ویلز کو یہ کہنے پر مجبور کیا ہے:

''ہر اچھے ناول کی پہچان اسکی حقیقت نگاری ہے۔اس کی غرض زندگی کی نمائش ہے۔اس لئے اِسے تجربہ، مشاہدہ، صحیح افواہ اور نئے خیال کے علاوہ کچھ نہ ہونا چاہیے جنھیں دوسرے الفاظ میں دہرایا جائے اور دوسرے موقعوں پر لگا دیا جائے۔''

اس خیال کی تائید ناول نویس اور ڈراما نگار آرنلڈ بنٹ اِن الفاظ میں کرتا ہے:

''ناول نگار وہ ہے جو زندگی کا غائر مطالعہ کرے اور اس سے اس قدر متاثر ہو کہ وہ اپنے مشاہدے کا حال دوسروں سے بیان کئے بغیر نہ رہ سکے اور اپنے جذبات کے اظہار کے لئے قصہ گوئی کو سب سے زیادہ موزوں و مناسب ذریعہ وآلہ سمجھے۔''

اور تقریباً یہی خیال مرزا ہادی رسؔوا کا بھی تھا۔ وہ فرماتے ہیں:

''ناول نویس اُن واقعات کو علی العموم تحریر کر دیتا ہے جو اس زمانے میں دیکھے ہیں۔یا اسے دوسری عبارت میں یوں کہتے ہیں کہ اُن ہی کی نقل اُتار اُتار کر ناظرین کو دکھاتا ہے۔مگر یہ ان ناول نویسوں کا ذکر ہے جنھوں نے اس فنِ خاص میں فطرت کو اپنا معلم بنایا ہے۔جو ناول نویس اس باریکی کو نہیں جانتے وہ دھوکا کھاتے ہیں۔کسی قصّے کو دلچسپ بنانے کے لئے اصل حقیقت سے دور ہو جانا ایسی غلطی ہے جس سے لکھنے والے کی قلعی کھل جاتی ہے۔فطرت میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں ان سے بہتر مثالیں ہم کو نہیں مل سکتیں وہ اپنے ہم عصر تاریخی ناول نگاروں پر طنز کرتے ہوئے اپنے اس نظریہ کی مزید وضاحت یوں کرتے ہیں ہمارا تخیل اس قدر وسیع نہیں کہ ہزاروں برس پہلے کے نقشے دکھا سکیں۔اس کے ساتھ ہم اس کو بھی معیوب جانتے ہیں کہ اگلے پچھلے واقعات میں غلط بحث کر کے ایسی نئی چیز پیدا کریں جو نہ اس زمانے کے مطابق ہو اور نہ پچھلے زمانے کے۔''[۱]

بالکل اسی طرح اہلِ جرمن اور خاص طور پر ٹامس مان کے نزدیک:

''کرداروں کے بجائے ناول میں بنیادی چیز فکر و فلسفہ ہوتی ہے اور کسی کردار کے اعمال کو کہانی کی بنیاد نہیں بنایا جاتا بلکہ اسکے افکار کی نشو و نما ناول نگار کا اصل فریضہ ہوتا ہے۔''[۲]

یہ تو وہ آراء تھیں جو مختلف ناول نگاروں نے قائم کی ہیں اور جن کے مطابق انھوں نے اپنے ناول مرتب کئے لیکن ایک اور گروہ وہ ہے جو تخلیق کے اِس عمل کو نہایت تعمیری انداز میں مرتب کرنے کا خواہشمند ہے اور وہ ہیں ناقدین جو کچھ اس طرح سے اپنے خیالات

۱؎ اُردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی عباس حسینی، ص ۳۸، ۳۹۔

۲؎ پروگرام رنگِ سخن، بی بی سی لندن ۱۵ جون ۱۹۹۸ء مملوکہ راقم الحروف۔

کا اظہار کرتے ہیں۔

پروفیسر دھارٹن کا ارشاد ہے:

''ناول ایک ایسے قصے کا بیان ہے جس میں ایک پلاٹ ہو، گویا ایسا بھی کوئی قصہ ہوتا ہے جس میں کوئی پلاٹ نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اس کی تعریف میں رزمیہ نظمیں بھی آجائیں گی نثری رومان بھی، لمبی حکایتیں بھی اور طویل کہانیاں بھی۔''

سر والٹر ریلے کی تعریف اس سے کہیں زیادہ درست ہے اس کے نزدیک:

''ناول وہ ہے جس کا موضوع روزانہ زندگی ہے اور جس کا ذریعہ حقیقت نگاری ہے۔''

لیکن اس تعریف میں وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ وہ کس جامے میں ملبوس ہوگا آیا نظم کی ساڑی میں یا نثر کے سوٹ میں۔ اس لئے پروفیسر بیکر کی تعریف زیادہ جامع ہے انگریزی زبان کا یہ مؤرخ و ناقد اس موضوع سے بحث کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے:

''ناول کسی نثری قصے کے ذریعے انسانی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔''

وہ بجائے ایک شاعرانہ و جذباتی نظریۂ حیات کے ایک فلسفیانہ سائنٹیفک یا کم از کم ایک ذہنی تنقید حیات پیش کرتا ہے۔ قصے کی کوئی کتاب اس وقت تک ناول نہ کہلائے گی جب تک کہ وہ نثر میں نہ ہو، حقیقی زندگی کی ہو بہو تصویر یا اسکے مانند کوئی چیز نہ ہو اور ایک خاص ذہنی رجحان (نقطۂ نظر) کے زیر اثر اس میں ایک طرح کی یک رنگی و ربط موجود نہ ہو۔

پروفیسر بیکر کی تعریف نے ناول کے لئے چار شرطیں لازم کر دیں۔ قصہ ہو، زندگی کی تصویر ہو اور اس میں ربط و یک رنگی ہو یعنی قصہ صرف نثر ہی میں لکھا ہوا نہ ہو بلکہ حقیقت پر مبنی ہو اور کسی خاص غرض، مقصد یا نقطۂ نظر کو بھی پیش کرتا ہو۔ ظاہر ہے کہ انسان کے لئے اہم ترین مطالعہ خود انسانی زندگی ہے یہ تمام عناصر ڈپٹی نذیر احمد کے یہاں پائے جاتے ہیں بقول ڈپٹی نذیر احمد:

''جو دنیا کے حالات پر کبھی غور نہیں کرتا اس سے زیادہ کوئی بے وقوف نہیں اور غور کرنے کے واسطے دنیا میں ہزاروں طرح کی باتیں ہیں لیکن سب سے عمدہ اور ضروری آدمی کا حال ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ جس روز سے آدمی پیدا ہوتا ہے زندگی میں مرنے تک اس کو کیا کیا باتیں پیش آتی ہیں اور کیونکر اس کی حالت بدلا کرتی ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ زندگی کا کوئی اہم پہلو ناول نگار کے قلم کی جولانیوں سے نہ بچ سکا اور آرنلڈ بنٹ صحیح طور پر دعویٰ کرتا ہے کہ:

''بری مناظر کی مصوری سے لے کر عمرانیات تک (بلکہ وہ بھی جن کا ذکر نہ آنا چاہیے) زندگی کی دلچسپیوں کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو سکتا ہے جسے اب نثری قصے کے پیکر میں نہ ڈھال دیا گیا ہو'' اسی بنا پر وہ فخریہ انداز سے کہتا ہے:

''ذرائع بیان اور فنون کی ترتیب میں ناول جس درجے کا بھی مستحق ٹھہرے لیکن فی الحال تو حیات کی تعمیر میں پُر زور سے پُر زور انداز میں پیش کرنے میں کوئی حریف اور مد مقابل نہیں۔''[۱]

---

[۱] اردو ناول کی تاریخ و تنقید: علی عباس حسینی، ص ۳۹، ۴۱۔

ناول کی تعریف سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ کہانی اور قصے میں حقیقت نگاری ہونی چاہیے، کوئی نہ کوئی اخلاقی درس یا نقطۂ نظر موجود ہو اور مختلف معاشروں کی ضرورت کے مطابق عمرانی اور معاشرتی موضوعات پیش کئے جائیں اگر فکر و فلسفہ کی ضرورت ہو تو اپنے کرداروں کے افعال کے ذریعے پیش کیا جانا چاہیے اور اپنی تہذیب و ثقافت پیش کرنی مقصود ہو تو اتنے صاف ستھرے طریقے سے پیش کی جائے کہ قاری کی دلچسپی متاثر نہ ہو۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو واقعات ناول نگار پیش کرتا ہے وہ اسکے اپنے مشاہدے اور تجربے سے تعلق رکھتے ہیں یا ماضی کے کسی عہد کی تصویر بن کر پیش ہوئے ہیں یا مستقبل کے بارے میں تصور کے ذریعے اپنے خیالات پیش کئے گئے ہیں مثال کے طور پر ٹامس مان کا ناول ڈیتھ ان وینس "DEATH IN VENUS" یہ ناول جنگ عظیم اوّل سے دو سال قبل ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا اس ناول میں وینس کے شہر کی تباہی کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ جہاں بظاہر ہیضہ کی وباء نے اس شہر کو تباہی کے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے مگر دو سال بعد پورا یورپ جنگ عظیم اوّل کی آگ میں جل رہا تھا جبکہ انہی کا دوسرا ناول ۱۹۲۴ء میں دی میجک ماؤنٹین "THE MAGIC MOUNTAIN" منظرِ عام پر آیا یہ ناول صحیح معنوں میں تاریخ و فلسفے کی ایک دستاویز ہے۔

''اس کہانی میں پہاڑوں پر ایک سینی ٹوریم کا منظر پیش کیا گیا ہے جہاں ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے مریض جمع ہو گئے ہیں اور اپنا اپنا نقطۂ نظر ایک دوسرے کے سامنے پیش کر رہے ہیں ان کا رابطہ تمام دنیا سے کٹا ہوا ہے اور وقت گویا اس سینی ٹوریم میں منجمد ہو گیا۔ اس طرح مصنف نے بیمار یورپ کا نقشہ کھینچا ہے اور جدید فکر کے تمام مکتبوں کو مختلف کرداروں کی شکل میں اس طلسمی پہاڑ پر جمع کیا ہے اس طرح انہوں نے کرداروں سے نظریات کا کام لیا ہے۔''[۱]

اور دوسری جنگ عظیم کے بعد دی میجک ماؤنٹین کی کہانی اقوام متحدہ کی تشکیل سے مربوط کی جاسکتی ہے جو ناول نگار اپنے عہد کے تجربات اور مشاہدات پیش کرتے ہیں اُن پر رائے دینا زیادہ آسان ہے کیونکہ وہ عہد سب کے سامنے ہوگا اس کا ہر پہلو ہماری نظر کے سامنے موجود ہونے کی وجہ سے ناول نگار کے تجربات اور مشاہدات سے اتفاق اور اختلافات زیادہ آسان ہو جاتے ہیں مثال کے طور پر مشہور مصری ناول نگار نجیب محفوظ:

''دو عظیم جنگوں کے درمیانی عرصے میں مصری سیاست میں ملوث شخصیات سے سخت نالاں دکھائی دیتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ ان تاریخی تجربات کا عام آدمی پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ وہ عام آدمی گمنام شہری جنھیں کوئی نہیں جانتا جن کا نام کسی اخبار کی شہ سرخیوں میں نہیں آتا۔ جن کی باتیں کبھی تاریخ کی کتابوں میں درج نہیں ہوں گی اُن تمام آدمیوں کے واقعات نجیب محفوظ کے ناولوں میں لافانی کردار بن کر شامل ہو گئے ہیں۔''[۲]

اس طرح نجیب محفوظ اور دیگر ناول نگار جو اپنے عہد کی عکاسی پیش کرتے ہیں اپنے عمل کا ثمر بہت جلد دیکھ لیتے ہیں مگر

۱۔ اردو سروس پروگرام رنگ سخن: بی بی سی لندن، ۱۵ جون ۱۹۹۸ء۔

۲۔ ایضاً

مسئلہ ان ناول نگاروں کا ہے جو ماضی کے واقعات منضبط کرتے ہیں ممکن ہے وہ بڑی احتیاط سے کام لیتے ہوں مگر ناول کے تقاضوں اور قاری کی دلچسپی کے پیش نظر کچھ رنگ آمیزی کر لیتے ہوں اور یوں مجرم کے کٹہرے میں لا کھڑا کر دیے جاتے ہیں اور پھر ان کی تصانیف کو ناول اور اُن کو ناول نگار ماننے سے انکار کر دیا جاتا ہے، بڑی بڑی دلیلیں اور توضیحات پیش کر کے اُن کے کام پر شک وشبہ کا اظہار کیا جاتا ہے اور تاریخی حقائق میں اُن کی رنگ آمیزی کو خیانت تصور کیا جاتا ہے اگر نرم گوشہ رکھ کے تاریخی ناول نگاروں کے معاملے پر غور کیا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ انھیں معاف کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ نہیں ہیں اور نہ اپنے عہد کے حقیقت نگار۔ ان کو ایک کہانی لکھنی ہے جس کا تانا بانا وہ تاریخ کے واقعات کو بنا کر بنتے ہیں اور کچھ ایسے موضوعات شامل کر دیتے ہیں جو تاریخی حقائق پر اثر انداز نہ ہوں اس میں حقیقت نگاری بھی ہو اور کچھ نہ کچھ اخلاقی پہلو اور مقصدیت بھی موجود ہو اس لیے اُنھیں بھی ناول نگاروں کے دائرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

انگریزی میں ناول نگاری کا آغاز

اگر ہم انگریزی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ناول کا باقاعدہ آغاز اٹھارویں صدی میں ہوا لیکن دنیائے ادب میں ناول نگاری کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا۔

مولانا حامد علی نے مرقوم کیا ہے:

''یورپ میں اسکی ابتدا دوسری صدی قبل مسیح میں ہوئی۔ اس وقت اس کا دستیاب نمونہ لاطینی زبان کا ناول ہے جس کا نام (Golden Ass of Apuleius) ہے لیکن اسکا موجودہ نام اطالوی لفظ ناویلا (Novella) سے مشتق ہے۔ بوکاشیو نے (Novella Storia) لکھ کر ناول کی ابتداء کی۔ اسپین میں ڈان کویکزٹ نے ناول کو ترقی دینے میں غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ سترھویں صدی میں فرانس میں رومانی ناول لکھے جانے لگے۔''[۱]

جبکہ ڈاکٹر احسن فاروقی کی رائے ہے کہ:

''دنیا کا سب سے پہلا ناول سروانٹس (Cervantes) کا ''ڈان کوئکزٹ'' ہے۔ یہ ناول اسپین میں ۱۶۰۵ء میں شائع ہوا، اس کو سروانٹس نے پرانی داستانوں کا مذاق اڑانے کے لئے لکھا تھا۔''[۲]

اگر ہم انگلستان اور یورپ میں ناول نگاری کے آغاز سے قبل اس کے مفہوم کو سمجھ لیں تو ہمارے لئے ناول کی نوعیت اور صنف کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ قومی انگریزی اُردو لغت میں ناول کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''Novel، (ادب) ناول؛ خاصا طویل افسانوی نثری قصہ جس میں کم و بیش پیچیدہ پلاٹ کے ساتھ حقیقی زندگی کے کردار، افعال اور مناظر پیش کئے جائیں۔ (صفت) نئی قسم سے متعلق یا پہلے سے نہ دیکھی چیز سے مختلف؛ انوکھا؛ نادر؛ غیر معمولی، نیا، نرالا، خصوصاً نمایاں یا دلچسپ پیرائے میں۔''[۳]

اس تعریف کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہم اٹھارویں صدی کے انگلستان پر نظر کریں تو وہاں لوگ جنوں، بھوتوں اور پریوں کے مافوق الفطرت عناصر، بھرپور کرداروں کی شاہکار داستانیں پڑھ رہے تھے اور ان میں نہ صرف منہمک تھے بلکہ لطف اندوز بھی ہو رہے تھے کیونکہ ان کرداروں کے ذریعے ان کی خواہشات حقیقی طور پر نہ سہی تصوراتی طور سے پوری ہو رہی تھیں اور اگر ہم اس کا موازنہ بیسویں صدی میں سائنس کی حیرت انگیز ایجادات سے کریں تو یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ فاصلے کو جلد طے کرنے کے لئے اڑن طشتری اور اُڑن قالین وغیرہ کا سہارا انسانی شعور میں ڈھل کر ہوائی جہاز اور راکٹ کی ایجاد پر منتج ہوتا ہے۔

انہی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جس شخص نے ناول کی داغ بیل ڈالی اس میں:

---

[۱] اردو جامع انسائیکلوپیڈیا: مولانا حامد علی، ص ۱۳۰۴۔

[۲] ناول کیا ہے؟: ڈاکٹر احسن فاروقی، ص ۱۱۔

[۳] قومی انگریزی اُردو لغت: ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۱۳۲۸۔

''سب سے پہلا نام Deniel Defoe کا ہے جس کا مشہور ترین ناول "Robinson Crousoe 1719" ہے اس کے دو اور ناول "Moll Flanders 1732" اور "Roxans 1734" ہیں۔''[۱]

لیکن درحقیقت انسان کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کرنے والا پہلا شخص ''سیموئیل رچرڈسن'' تھا کہ جس نے فرضی داستان کو نظر انداز کر کے ایک دوشیزہ کے خطوط کا سہارا لے کر ایک ایسا قصہ تخلیق کیا جو فن اور تکنیک کے اعتبار سے ناول کہلایا اس قصے کا مرکزی کردار پامیلا ہے:

''ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور بغرض ملازمت ایک رئیس خاتون کی خدمت پر مامور تھی جس کے جوان بیٹے کی پامیلا پر نظر تھی۔ خاتون کے مرنے کے بعد بیٹے نے اس کی عصمت پر جو حملے کیے اور جن سے وہ ہمیشہ بچتی رہی ان سب کے حالات ان خطوط میں درج ہیں۔ ۱۷۴۰ء میں رچرڈسن نے ان خطوں کو ''پامیلا اور ورچو ریوارڈڈ'' (PAMELA OR VITUE REWARDED) کے عنوان سے چھاپ دیا۔ یہ کتاب حد سے زیادہ مقبول ہوئی اور واقعاتی قصہ گوئی کی پہلی مثال مانی گئی۔''[۲]

ابھی رچرڈسن کی مدح سرائی کا آغاز بھی نہ ہوا تھا اور بھرپور انداز میں اسکے تخلیق کردہ قصے کو سراہا بھی نہ جا سکا تھا کہ اس کا مد مقابل آ گیا۔ یہ ہنری فیلڈنگ تھا۔

''ہنری فیلڈنگ جدید تعلیم میں رچرڈسن سے کہیں آگے تھا۔ شاعری، مضمون نگاری اور خاص طور پر ڈرامہ نگاری میں مشہور تھا۔ مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھا۔ وہ پامیلا کو پڑھ کر ہنسا اور ۱۷۴۲ء میں اس نے ایک تصنیف ''جوزف اینڈریوز'' پیش کی جو پامیلا ہی کے انداز سے شروع ہوتی ہے اور اسی ناول کی پیروڈی ہے۔ اگرچہ پہلی کتاب ناول نگاری کے فن کی تعریف کرتی ہے اور پہلی مثال تھی۔ اس میں پامیلا کے بھائی ''جوزف'' کے قصے کے ذریعے یہ دکھایا گیا کہ واقعیت کیا ہوتی ہے اور پامیلا اخلاقی معیارات و جذبات کی نمائندہ ہے۔ ''پامیلا'' میں رچرڈسن نے یہ دکھایا ہے کہ لڑکی ''لارڈ'' سے محبت کرتی ہے مگر عصمت لٹانے پر تیار نہیں اس سلسلے میں اسے بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑی ہیں یہاں تک کہ وہ ایک رات کوٹھے سے کود جاتی ہے اور چوٹ کھاتی ہے مگر آخر میں جب ''لارڈ'' شادی پر تیار ہو جاتا ہے تو اپنی محبت کا اظہار کر دیتی ہے۔ فیلڈنگ نے یہ دیکھا کہ یہ ساری اخلاقی ہاہمی محض بناوٹ ہے۔ کوئی محبت کرنے والی لڑکی محض لفظ عصمت کی بنا پر وہ سب کچھ نہیں کر سکتی جو ''پامیلا'' نے کیا۔ ''پامیلا'' کی اخلاقی قدروں کو فیلڈنگ نے ریاکاری جانا برخلاف اس کے اس نے جوزف کو پیش کیا جسکی عصمت کو ایک رئیس خاتون چھین لینا چاہتی ہے مگر کامیاب نہیں ہوتی کیونکہ جوزف ایک اور لڑکی سے محبت کرتا ہے جو نیکی اور حسن میں بالکل جوزف کی طرح ہے۔''[۳]

یہ زندگی کے وہ جیتے جاگتے واقعات تھے جو قارئین میں مقبول ہوئے اور عوام الناس فرضی اور داستانوی اکتا دینے والے

۱۔ اردو انسائیکلوپیڈیا، پروفیسر فضل الرحمٰن، ص ۲۳۴۔

۲۔ تاریخ ادب انگریزی، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص ۲۳۴، ۲۳۵۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۳۵، ۲۳۶۔

قصوں کو ترک کر کے ناول کی طرف راغب ہونے لگے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ فیلڈنگ نے اپنے ناول جوزف اینڈریوز کا پورا پلاٹ اسلامی تاریخ کے اس مشہور واقعے سے اخذ کیا ہے جو قرآن کریم میں سورۂ یوسف کے مطالعے سے سامنے آتا ہے کہ محبت میں اپنی خواہشات کو شامل کر کے دوسرے کے جذبات وخواہشات کا احترام نہ کرے اور بعد میں سوائے ذلت وشرمندگی کے کچھ ہاتھ نہ آئے۔

''عزیز مصر کی بیوی یوسف علیہ السلام کو قید خانے بھجوا کر اپنے نزدیک تو اُن سے انتقام لے رہی تھی مگر فی الواقع اس نے ان کے تختِ سلطنت پر پہنچنے کا راستہ صاف کیا اور اپنی اس تدبیر سے خود اپنے لئے اس کے سوا کچھ نہ کمایا کہ وقت آنے پر فرمانروائے ملک کی مربیہ کہلانے کے بجائے اسکو علی الاعلان اپنی خیانت کے اعتراف کی شرمندگی اٹھانا پڑی۔''[۱]

یہ بائبل کا بھی ایک اہم واقعہ ہے۔ ناول نگاری رچرڈسن اور فیلڈنگ کے بعد فروغ پانے لگی یوں تو فیلڈنگ کے کئی شاہکار ناول ہیں مگر اس کے پلاٹ اور کردار نگاری ایک خاص نہج تک پہنچ سکی۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ فیلڈنگ فطری طور پر ناول نگار ہونے کے بجائے رچرڈسن کی دیکھا دیکھی اس صنف میں قدم رکھنے کی وجہ تھا یہ الگ بات ہے کہ فیلڈنگ اسپین کے ناول نگار ڈان کوئکزٹ کے فن کو فروغ دینے میں ضرور کامیاب ہوا کیونکہ احسن فاروقی نے لکھا ہے:

''جو شخص ڈان کوئکزٹ کے فن کو پورے طور پر سمجھا اور پوری کامیابی کے ساتھ عمل میں لا سکا وہ ہنری فیلڈنگ تھا۔ انگریزی کا سب سے پہلا ناول رچرڈسن کا ''پامیلا'' (PAMELA) کہا جاتا ہے مگر فیلڈنگ نے یہ دیکھا کہ اس ناول میں زندگی ایک جذباتی فلسفہ کے ماتحت اس طرح بیان ہوتی ہے کہ حقیقت سے دور جا پڑی ہے لہٰذا اس ناول کا مذاق اڑانے کے لئے اس نے جوزف اینڈریوز (JOSEPH ANDREWS) نامی ناول لکھا جو ہر طرح ڈان کوئکزٹ کے فن کا نمونہ ہے۔ فیلڈنگ نے اپنے فن کی ایک ایسی جامع تعریف بھی پیش کی جو ہر سچے ناول نگار کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہے۔ نثر میں ایک طربناک رزمیہ (Comic Epic in Prose) کہا۔ یعنی ناول کا فن کامیڈی اور ایپک کے فن کا مجموعہ ہے۔ طربیہ کی طرح یہ عام زندگی کا نقشہ ہے یعنی اس کے کردار معمولی لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے معمولی جن کو ناظر اپنے درجہ سے پست سمجھتا ہے اور اس لئے ان کے حرکات اور واقعات پر ہنستا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس میں ایپک کی طرح ایک اعلیٰ فلسفۂ حیات اور طویل نقشۂ زندگی بھی ہوتا ہے یعنی تفسیر حیات، مزاح اور واقعیت اسکی خاص صفات ہیں۔ فیلڈنگ کے ناولوں میں یہ تمام صفات موجود ہیں۔''[۲]

پھر اس صنف ادب میں ٹوبیاز جارج اسمالٹ نے اپنی صلاحیتوں کو منوایا۔

''اس کا مشہور ناول ''روڈرک رینڈم'' جس میں انگلستان کی بحریہ کے جہازوں پر زندگی کے حالات بڑے واقعاتی انداز سے درج ہیں۔ اس ناول سے بحریہ پر ناول لکھنے اور ملاحوں اور خصوصاً جہازوں کے کپتانوں کی کردار نگاری کا رواج انگریزی میں شروع ہوا۔''[۳]

---

[۱] تفہیم القرآن؛ ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۳۸۰۔

[۲] ناول کیا ہے؟؛ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص ۱۱۲تا۱۱۴۔

[۳] تاریخ ادب انگریزی؛ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص ۲۲۱۔

انگریزی ادب میں ناول نگاری کا فن بہتر سے بہتر کی جانب گامزن رہا اس بارے میں فضل الرحمٰن رقمطراز ہیں:

"Laurence Stern کا نام اہمیت کا حامل ہے اس کے مشہور ناول Life & Opinions of Tristram Shandy(1763-67) میں پہلے پہل اس "طربیہ مزاج" (Cosmic Indiscipline) کے مظاہر ملتے ہیں جو خود زندگی کی سرشت میں داخل ہے۔ اس میں جس لامرکزیت اور غیر سلسلہ واری کو کردار نگاری اور واقعات کے پیش کرنے میں برتا گیا ہے اس میں بیسویں صدی میں ناول نگاری میں مستقل شعور کے بہاؤ (Stream of Consciousness) کی تکنیک کی اوّلین جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہاں ناول کی اس صنف کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا جس میں پراسرار سراسیمگی (Horror) کے عناصر ملتے ہیں اس کی مثال ہورلیس وال پول (Horace Walpole) کا ناول The Castle of Otranto ہے۔ Willian Backford نے بھی "Vetbeck-1789" میں مشرقی داستان کے اس پہلو کو انتہائی مبالغے کے ساتھ پیش کیا۔ عام سطح پر اس مذاق کو پیش کرنے والوں میں Mrs. Ann Radcliffe بھی ہے اس کا نام (Mystries of Vdolpho) ۱۷۹۴ء میں شائع ہوا۔"[۱]

ناول نگاری کے فن میں ایک نام گولڈ اسمتھ کا ہے جس کا ناول دی ویکر آف ویکفیلڈ "The Vicar of Wakefield" ہے۔ انگریزی ادب میں بڑی مقبول حیثیت کا مالک بنا۔ اس ناول کے جادوئی اثر میں کوئی شک نہیں۔ گھریلو زندگی کا نقشہ، دیہات کے مناظر گولڈ اسمتھ کے شاعرانہ رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ انگریزی ادب کی صنف ناول نگاری کے ارتقا میں بقول فضل الرحمٰن:

"دو ناول نگار خاص طور پر ہماری توجہ اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ جین آسٹن (Jane Austin) نے اپنے ناول "نارد ینجر ایبے" (Northanger Abbay-1811) میں گاتھک (Gothic) کی ناول کی روایت کو اپنے لطیف طنز کا ہدف بنایا۔ اس نے ایک مخصوص خطے اور سماج میں ایک اہم طبقے کی زندگی کی تصویر کشی کی ہے اس کے دو بار بار پڑھے جانے والے ناولوں میں "شعور اور حسن" (Sense & Sensibility-1811) اور "غرور اور بدگمانی" (Pride & Prejudice-1813) ہیں۔ اس کا آرٹ صیقل شدہ ہے اور وہ اپنے محدود کینوس پر ماہرانہ مینا کاری، ڈرامائی احساس کے پیش کرنے پر قدرت رکھتی ہے۔ یہ دونوں خصوصیات "مینسفیلڈ پارک" (Mansfield Park-1814) اور "پرسوئشن" (Persuasion-1818) میں بخوبی جھلکتی ہیں۔"[۲]

اس طرح انگریزی ادب صنف ناول سے روشناس ہوا اور ادب کی دنیا میں اپنا ایک مقام بنانے لگا۔ لوگوں کی دلچسپی اور قارئین کا شوق اس راہ میں گامزن مصنفین کے لئے کامیابی کی نوید لایا اور پھر نئے نئے موضوعات کی تلاش شروع ہوئی۔ جب انسان اپنے اردگرد کے واقعات ترتیب دے دیتا ہے تو اسکی جستجو اپنے ماضی کی ورق گردانی میں لگ جاتی ہے اور یوں تاریخی موضوعات ناول کے قالب میں ڈھالے جانے لگے اور صنف ناول میں تاریخی ناول کا آغاز ہوا۔

۱۔ اردو دائرۃ المعارف انسائیکلو پیڈیا؛ پروفیسر فضل الرحمٰن، ص ۱۲۴۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔

انگریزی میں تاریخی ناول نگاری کا آغاز

انیسوی صدی کے آغاز میں صنفِ ناول نگاری نے ایک اور کروٹ لی۔ زندگی کے حقیقی واقعات اور معاشرے کی عکاسی ٹریجیڈی اور کامیڈی کے روپ میں سامنے آرہی تھی مگر ضرورت اس بات کی تھی کہ تاریخ کے واقعات کو ناول کے قالب میں ڈھالا جائے۔ اس سلسلے میں اسکاٹ نے پہلے پہل ''ویورلے'' شائع کیا جس میں اسکاٹ لینڈ کی ساٹھ سالہ تاریخ پیش کی گئی تھی مگر یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ تاریخی ناول کا آغاز اٹھارویں صدی کی چوتھی دہائی میں ناول کے ساتھ ہی ہوگیا تھا کیونکہ اگر ہنری فیلڈنگ کے ناول ''جوزف اینڈ ریوز'' کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ یہ کہانی ماضی کی مشہور ترین تاریخی حقیقت ہے کہ جس کا ذکر قرآن مجید اور انجیل مقدس میں حضرت یوسفؑ اور عزیز مصر کی بیوی کے حوالے سے موجود ہے جس سے یہ ناول ماخوذ ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی رائے میں ہم دیکھتے ہیں:

''تاریخ ماضی اور حال کے درمیان ایک مکالمہ ہے۔ اس مکالمے میں حال عملی طور پر زیادہ حصہ لیتا ہے کیونکہ زمانہ حال میں مورخ ماضی کے واقعات بیان کر کے اُن کے اُن رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے جو اب تک محققین کو معلوم نہ تھے اور ماضی میں خود اس معاشرے کو بھی معلوم نہ تھے اور اس لئے مورخ سب سے اہم کام یہ کرتا ہے کہ وہ تاریخ کی تشکیل کر کے ماضی اور حال کو آپس میں ملا دیتا ہے۔''[۱]

اور بالکل اسی طرح ہنری فیلڈنگ "Henry Fielding" کا ناول ہے جو کہ جوزف کے کردار کو حضرت یوسفؑ کے کردار سے ملانے کی کوشش کرتا ہے:

''جس کی عصمت کو ایک رئیس خاتون چھین لینا چاہتی ہے مگر کامیاب نہیں ہوتی کیونکہ جوزف ایک اور لڑکی سے محبت کرتا ہے جو نیکی اور حسن میں بالکل جوزف کی طرح ہے۔ اصل میں عصمت قائم رکھنے کے لئے سچی محبت اور توجہ کام آتی ہے۔''[۲]

یہاں یہ واقعہ، قرآنی واقعے سے اس حد تک مختلف ہے کہ حضرت یوسفؑ ایک پیغمبر تھے اور پیغمبر ہر غلطی سے مبرّا ہوتا ہے اور اسی لئے عزیزِ مصر کی بیوی کے بچھائے ہوئے جال سے وہ بچ نکلتے ہیں۔ ہم اپنی اسی رائے پر زور دیں گے کہ انگریزی تاریخی ناول کے ارتقا کو اسکاٹ کے بجائے ہنری فیلڈنگ کے ناول جوزف اینڈ ریوز کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اسکاٹ کی تحریروں میں حد درجہ دلچسپی تھی اور وہ قارئین کے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اس کی شہرہ آفاق تصنیف کو بڑی شہرت ملی اور یوں اس نے اپنی تمام تر توجہ ناول نگاری کے لئے وقف کر دی۔

''بیس برس تک وہ اوسطاً ایک ناول سالانہ کے حساب سے تاریخی ناول لکھتا رہا جو ''آتھر آف ویورلے'' (Author of Waverley) کے نام سے چھپتی رہی۔ ان میں بیش تر اسکاٹ لینڈ کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں مگر کچھ ناولوں میں اسکاٹ نے انگلستان

---

[۱] تاریخ کے بدلتے نظریات، ڈاکٹر مبارک علی، ص ۳۰۔

[۲] تاریخ ادب انگریزی، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص ۲۳۶،۲۳۵۔

کے ماضی کو بھی پھر سے زندہ کیا اور کچھ میں فرانس اور یورپ کی تاریخ کو بھی پیش کیا آخر میں وہ یورپ کو چھوڑ کر ایشیا میں آیا اور ایک ناول میں عربوں کی زندگی پیش کی اور ایک میں ہندوستان کے کچھ تاثرات جمع کئے اس طرح اس کی تاریخی ناولیں تمام دنیا پر محیط ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ کامیاب ناول وہی ہیں جو اسکاٹ لینڈ کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔''[1]

اسکاٹ کے ناولوں میں اسکاٹ لینڈ کا ماضی اپنے تمام حسن کے ساتھ زندہ ہو جاتا ہے اسکاٹ کو اپنے وطن سے، اسکی زندگی سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ اس کے ہر ہر پہلو سے اچھی طرح واقف تھا:

''تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے کوئی اسکاٹ سے آگے نہ بڑھ سکا اسکی ناولیں اس صنف کی مثال قائم کرتی ہیں اس نے تاریخ کے ساتھ بڑی زیادتیاں کیں اور اس کا عہد الزبتھ کے حالات پر مبنی ناول ''کینل ورتھ''(KENIL WORTH) واقعات کو خلط ملط کرنے مختلف عمروں اور مختلف وقتوں کے تاریخی کرداروں کو ایک واقعے سے وابستہ کر دینے کی مثال ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اُس دور کی فضا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے لانے کے لئے یہ ہر تاریخ سے زیادہ اہم ہے پھر ملکہ الزبتھ کا صحیح تاریخی کردار جیسے اس ناول میں زندہ ہوتا ہے ویسا کسی تاریخ میں نہیں ہوتا۔ تاریخی فضا قائم کرنے، تاریخی کردار کو کاغذی حیاتِ نو بخشنے اور اہم تاریخی حالات کو بیان کرنے میں اسکاٹ سے آگے کوئی نہ جا سکا۔ تاریخی ناول کی کامیابی ان ہی فنی امور میں ہے اسکاٹ کے ناولوں کو اسطرح ترتیب دیا جا سکتا ہے کہ نارمنوں کے زمانے سے لے کر اٹھارویں صدی تک کی پوری برطانوی تاریخ کا مسلسل نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ ہر دور کا بادشاہ اور ہر دور کی تاریخی ہستیاں جیتی جاگتی سامنے آجاتی ہیں۔ فرانس کی تاریخ پر مبنی ناول ''کوئنٹن ڈروارڈ''(Quentin Durward) میں شاہ لوئی یازدھم اور اس کا زمانہ زندہ ہوتا ہے۔ ''دی ٹیلسمان''(The Talisman) میں عربوں کی زندگی بہت غلط انداز میں پیش کی گئی ہے اور اسکاٹ کی مسلمانوں سے نفرت تکلیف دہ ہے۔ مگر سلطان صلاح الدین ایوبی کے نقوش اور شاہ رچرڈ کے کردار تاریخی ہیں۔ تاریخی حیثیت سے اسکاٹ کی کامیاب ترین ناولیں وہ ہیں جن میں اُس نے اپنے دور سے قریب کے ادوار کی خاص طور پر اپنے ملک کی تاریخ پیش کی ہے۔ ادب وہی بہترین ہوتا ہے جو ادیب کے ذاتی تجربے پر مبنی ہو اور تاریخ تجربے سے بڑی دور کی چیز ہے۔ ان دونوں متضاد باتوں کے درمیان راہ یہ نکلتی ہے کہ تاریخی ناول نگار ایسے تاریخی ماحول کو زندہ کرے جو اس کے تجربے سے زیادہ دور نہ ہو۔ اسکاٹ کی دور دراز ممالک اور بہت پرانے زمانے سے متعلق ناولوں میں بھی اس کے تاریخی تخیل نے کرشمے دکھائے ہیں مگر اس کے شاہکار اور تاریخی ناول نگاری کے شاہکار ''ویورلے''، ''اولڈ مارٹیلیٹی''، ''دی گونٹلٹ''، ''ہارٹ آف مڈلوتھین'' اور ''برائڈ آف لیمر مور'' ہیں۔

ناول کے فنکار کی حیثیت سے اسکاٹ ہمیں بڑے تذبذب میں ڈال دیتا ہے اس کا کوئی قصہ ایسا نہیں ہے جو نمایاں طور پر استقام سے پر نہ ہو لیکن جس میں بڑی بڑی کامیابیاں بھی نمایاں نہ ہوں کہیں شروع، کہیں خاتمہ، کہیں وسط، کہیں ارتقا کہیں ترتیب کی بڑی اغلاط نظر آتی ہیں۔ پھر کردار نگاری کا سقم اس کے یہاں موجود ہے اسکا کوئی کردار ایسا نہیں ہے جسے اہم نفسیاتی مطالعہ کہہ سکیں اس کے ہیرو

---

[1] تاریخ ادب انگریزی: ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص ۲۱۱، ۲۱۲۔

سب پوچ ہیں البتہ ہیروئنوں میں کچھ زیادہ جان ہے مگر فنی لحاظ سے کوئی کردار مکمل نہیں ہے۔ اکثر کرداروں کی حرکات میں اتنی یکسانیت اور تکرار ہے کہ یہ تکلیف دہ حد تک غیر دلچسپ ہو جاتے ہیں مگر پھر بھی اسکاٹ بہت بڑا ناول نگار ہے۔ اصل میں اس کی تمام لا پرواہی اور جلد بازی کے باوجود اسکی پیدائشی قصہ گوئی کی قوت اپنا کرشمہ دکھا کر رہتی ہے۔ اسکی تخلیقی قوت واقعات کو ایک ایسی ڈور میں پروتی جاتی ہے کہ ہر قدم پر تجسس پیدا ہوتا رہے۔ کردار کو زندہ کرنا اور واقعات کے ساتھ چلانا یہ قابلیت اسکاٹ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔''[۱]

لیکن احسن فاروقی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ اسکاٹ نے قصہ و کردار کے درمیان ایک سمجھوتہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا کیونکہ اس کے ناولوں میں کردار، قصے میں توازن کے ساتھ شیر و شکر ہوتے ہوئے نہیں ملتے جیسے کہ اسکے ہم عصر جین آسٹن کے ناولوں میں ہیں۔''[۲]

حقیقت یہ ہے کہ تاریخی ناول میں بھی تخیل کے پیدا کئے ہوئے دائمی نقوش ہی کی اہمیت ہوتی ہے۔

اس کے بعد بھی انگریزی ناول نگاری عروج کی منزل کی طرف گامزن نظر آتی ہے مگر ہم اپنے موضوع کی مناسبت سے اسی بات پر اکتفا کریں گے کہ اسکاٹ انگریزی کی تاریخی ناول نگاری میں اہم مقام کا مالک ہے۔

۱۔ تاریخ ادب انگریزی؛ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص۲۱۴، ۲۱۶۔

۲۔ ناول کیا ہے؟؛ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص۸۳۔

اردو ناول نگاری کی ابتدا

عہد تغیر پذیر ہے اور انہی مد و جزر پر چلتے ہوئے انسان زندگی گزارتا ہے۔ وقت حاکم کو محکوم اور مہمان کو مالک بنا دیتا ہے اور جب انسان کفِ افسوس مل رہا ہو تو ماضی کے جھروکوں میں اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ مستقبل کی کامیاب منازل پر رواں دواں رہنے کے لئے اپنی زندگی کا نصب العین متعین کرتا ہے۔ اردو ادب میں بھی ناول یا اردو کی دیگر اصناف میں جدت کا ایک دور ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتا ہے یہ بحث کہ اسے جنگ آزادی قرار دیا جائے یا غدر ایک الگ موضوع ہے مگر ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی اہمیت مُسلّم ہے۔ مغلیہ اقتدار کا سورج غروب ہوا اور انگریزوں کی عملداری مکمل اور باقاعدہ طور پر شروع ہوگئی۔ اس طرح سیاسی انقلاب ہی برپا نہیں ہوا بلکہ اسکی وجہ سے سماجی اور اخلاقی قدروں کے معیار میں بھی زلزلہ آ گیا، ادب کیوں نہ متاثر ہوتا ۔ادب کی بنیادیں ہمارے طریقِ معاشرت یعنی تہذیب ہی میں استوار ہوتی ہیں۔ ہمارا کلچر یا ہماری زندگی ہی وہ زمین ہے جس میں نخل ادبیات اگتا اور نشو و نما پاتا ہے جب زمین بدل جائے تو آسمان کیوں کر نہ بدلے۔

غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے ہمارے اردو ادب میں قصے، کہانیاں، حکایتیں، تمثیلیں اور داستانیں عام تھیں جو نظم کی صورت میں مثنویاں کہلاتی تھیں۔ فورٹ ولیم کالج کے قصے اور حکایتیں خصوصاً حیدر بخش حیدری کی ''طوطا کہانی'' اور ''آرائش محفل'' اور میر امن کا ''قصہ چہار درویش''، کس نے نہ پڑھا ہوگا۔ ان سے پہلے نثر میں محمد حسین عطا کی ''نوطرز مرصع'' بہت اچھی داستان سمجھی جاتی تھی اور اب ان سب سے پہلے دکن میں مُلّا وجہی کی ''سب رس'' تمثیل نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ مانی جاتی تھی، فورٹ ولیم کالج کے بعد انشاء کی ''رانی کیتکی کی کہانی''، سرور کی ''فسانہ عجائب'' اور پھر فسانہ عجائب کے جواب میں نہیں معلوم کتنے فسانے، پھر فقیر محمد خان گویا کی ''دبستان حکمت'' اور منشی عبدالکریم کی ''الف لیلہ'' یا طویل داستانوں میں ''طلسم ہوشربا''، ''طلسم نورافشاں''، ''داستان امیر حمزہ'' وغیرہ سب جامد کلچر کے زمانے کی بہت مشہور خیال آرائیاں ہیں جو نثر میں لکھی گئی ہیں اور جن کا مقصد محض تفریح یا تنویم یا اخلاقیات کا درس تھا، جیسی روح ہوگی ویسے ہی فرشتے۔ اس عہد کی بوسیدہ سامراجیت، سطحی تہذیب اس قسم کے خیالی طلسموں کے علاوہ اور کیا پیش کر سکتی تھی جن کے لکھنے کا ڈھنگ بھی فقط ملمع کاری ہے محض ظاہری اور بناوٹی انشا پردازی معنی اور بیان دونوں کے لحاظ سے۔

داستانوں کا یہ رنگ اپنے تصوراتی اور تخیلاتی موضوعات اور مافوق الفطرت کرداروں کے باوجود قارئین اور سامعین میں بے حد مقبول تھا اور عوام و خواص کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کر رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ مافوق الفطرت کرداروں کی وجہ سے اکتاہٹ اور عدم دلچسپی ضرور پیدا ہوتی تھی اور انسان حقیقت سے قریب تر موضوعات اور کردار نگاری کا خواہش مند تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مرزا اسداللہ غالب نے خطوط نگاری کے نئے انداز کو متعارف کروایا اور ان کا انداز مکتوب نگاری مراسلہ سے مکالمہ بن گیا۔ ویسے بھی زمانے کی تیز رفتاری نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ سائنس کی تیز رفتار ترقی کے سامنے ہماری تدبیریں ریت کی دیوار ثابت ہوئیں۔ توپوں اور بندوقوں کی لڑائی میں تلوار، نیزے اور تیر کمان دھرے رہ گئے اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید احمد خان نے بھی اپنی تصنیف ''آثار الصنادید'' کو نئے

ڈھنگ سے مرتب کیا۔ طلسماتی خیال آرائیوں کی بجائے سلاست اور سادگی نے رواج پایا۔ انسان حقیقت پسندی کی طرف راغب ہوا مشاہدات، تجربات اس کے یقین کا جزو بنے۔ الہ دین کا چراغ گل ہو گیا اور ہر گھر میں بجلی کے بلب روشن ہوئے۔ آسمان پر اڑنے والا قالین اب زمین سے آسمان کی طرف اڑتے ہوئے جہاز کے روپ میں پیش کیا جانے لگا اور انسانی ترقی اپنی منازل طے کرتی ہوئی ٹیلی فون اور کمپیوٹر تک آن پہنچی اور الیکٹرانک دروازے "کھل جا سم سم" کا منظر پیش کرنے لگے لیکن اس ترقی یافتہ دور کے باوجود داستانوں کی اہمیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا اور بالخصوص اردو ناول کے ارتقا میں تو داستانوں کی اہمیت مُسلّم ہے۔ فرق یہ ہے کہ ناول میں حقیقت پسندی کے ساتھ کچھ تخیل پیش کیا جاتا ہے اور زندگی جیتی جاگتی نظر آتی ہے جبکہ داستانوں کا پلاٹ بھی کچھ نہ کچھ حقیقی واقعات پر مشتمل ہوتا ہے مگر تخیلات کی زیادتی اور ما فوق الفطرت کرداروں کی موجودگی اسے ناول سے دور کرتی ہے۔ ہاں البتہ میرامن کی "باغ و بہار" کا جائزہ لیں تو ہمیں اس میں ناول کے بنیادی تصوّرات نظر آتے ہیں:

"ہر داستان کی طرح باغ و بہار میں ناول کے پیچیدہ قصہ کی ابتدائی سیدھی اور سپاٹ حالت، ناول کی باترتیب پلاٹ کا ابتدائی بے تکا پن، ناول کے حقیقی اور دلچسپ کردار کی ابتدائی مبالغہ آمیز اور بے ڈھنگی صورت اور ناول کے گہرے فلسفی اور جذباتی اثر کی ابتدائی معصومیت نظر آتی ہے۔ اگر عالم فن کے لئے کسی ترقی یافتہ فن کو اس کے مخرج پر دیکھنا مشاہدہ ہے اور اگر عاملِ فن کو اپنے فن کی بنیادوں پر نظر رکھتے ہوئے آگے قدم بڑھانا مفید عمل ہے تو باغ و بہار کی قیمت دائمی ہے۔"[۱]

جیسا کہ ہم اوپر رقم کر چکے ہیں کہ غدر ۱۸۵۷ء اہل برصغیر کے لئے ہر باب زندگی کے دریچے وا کر گیا تھا۔ انہی میں اردو کے نثری ادب کا جدید دور بھی شامل ہے۔ ایک طرف سرسید اور ان کے رفقاء تہذیب الاخلاق میں ایڈیسن اور اسٹیل کی تقلید میں رفاہی اور فلاحی موضوعات قلمبند کر رہے تھے تو دوسری طرف ایک اور قابل ذکر شخصیت مولوی نذیر احمد جو انگریزی سے بہت زیادہ واقف تو نہ تھے اور ناول کے فن سے باخبر بھی نہ تھے اپنی گھریلو ضرورتوں کے پیش نظر ایک قصہ تحریر کر رہے تھے:

"اصلاح موعظت اُن کی گھٹی میں پڑی تھی ان کی بچیاں جب لکھنے پڑھنے کے قابل ہو گئیں تو کوئی کتاب اردو میں ایسی نہ ملی جو انھیں امور خانہ داری اور عام اخلاقیات کا درس اسطرح دے سکتی جس میں ان کم عمر بچیوں کو بھی دلچسپی ہوتی چنانچہ مولوی نذیر احمد نے خود ایک قصہ گھڑا جسکے اجزاء وہ روزانہ لکھ کر بچیوں کے پڑھنے کے لئے دے دیتے تھے یہی اجزاء مکمل ہو کر مراۃ العروس کے نام سے طبع ہوئے۔"[۲]

اس ناول سے عشرت اور دولت نذیر احمد کے حصے میں آئیں اور یوں ان کا قلم نئے قصوں کی جانب رواں دواں ہو گیا اور پھر اردو ادب میں "فسانہ مبتلا"، "بنات النعش"، "توبۃ النصوح"، "ابن الوقت" اور "محصنات" جیسے قصوں کا اضافہ ہوا یہ الگ بات کہ انہیں پڑھ کر ناول کہنے کو تو ہرگز جی نہیں چاہتا مگر اس امر سے انکار نہیں کہ:

۱۔ جدید قصہ نگاری کا ارتقاء: پروفیسر محمد ارشد کیانی، ص ۳۰۔

۲۔ ناول کیا ہے؟: ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص ۱۴۲۔

''ان کا زورِ بیاں ہے، زبان و محاورہ پر قدرت اور کہیں کہیں مزیدار فقرے جوان کے وعظ کو صبر سے پڑھ لینے دیتے ہیں ورنہ ان کا پڑھنا ہی دوبھر ہو جاتا۔''[۱]

مولوی صاحب کے ناول ان کی ذات اور شخصیت اور مطلوبہ معاشرت کے عکاس ہیں وہ جس قسم کا معاشرہ تخلیق کرنا چاہتے تھے وہی کچھ ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے نہ ہجر و وصال کے قصے، نہ عشق کی گرمی اور نہ سنسنی خیزی، مقصدیت اور وعظ زورِ خطابت کا سہارا لے کر ناول کے سیدھے سادے پلاٹ پر چھا گئے ہیں۔ قاری کرداروں میں بہن بھائی اور باپ بیٹی کے روپ دیکھتا ہے۔ اسے محبوبہ اور معشوقہ کہیں دور دور نظر نہیں آتی۔ شاید یہی وجہ آج کے دور میں ان کی مقبولیت کی راہ میں رکاوٹ ہے مگر اس کے باوجود ہم انہیں ناول کہنے پر مجبور ہیں کیونکہ ان میں زندگی کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ گو اصلاح اور نصیحت کے پتلے ہی کیوں نہ ہوں یا بدی کے پیکر بن کر سامنے آئے ہیں مولوی صاحب کی مکالمہ نگاری قابلِ داد ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:

''جب وہ مسلمانوں کے متوسط طبقے کی عورتوں کی گفتگو خاص انہی کے مخصوص محاورہ اور انداز میں لکھتے ہیں تو وہ اپنے کمال پر ہوتے ہیں۔ مولانا کو اپنی زبان دانی پر ناز تھا اور اس میں شک نہیں کہ بے جا نہ تھا۔ حالانکہ بعض اوقات ان کی عربیت ان کی روانی بیان میں روڑے اٹکا دیتی ہے خصوصاً جب وہ کسی مذہبی یا معاشرتی مسئلہ پر بحث کرتے نظر آتے ہیں پھر بھی عام طور پر ان کی مکالمہ نگاری ان کے ناولوں کی سب سے مستحکم خصوصیت ہے اور یہی خاص صفت ہمیں ان کے جذباتِ لطیف سے معرا اور نصیحت و عقلیت سے مملو قصوں کو ناول کہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔''[۲]

کم از کم یہ بات تو طے ہے کہ نذیر احمد کے ناول تعریف کے اعتبار سے مکمل طور پر ناول نہ بھی ہوں تو بھی انھیں اردو ناول کے ارتقاء میں ابتدائی ناول کی حیثیت سے تسلیم کرنا پڑتا ہے کیونکہ اگر ہم نذیر احمد سے ذرا آگے پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانۂ آزاد'' کا جائزہ لیں تو اسکی ضخامت اور بہت سی خامیوں کے باوجود وہ نذیر احمد سے کچھ بہتر ناول نگار کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ بنیادی طور پر سرشار صحافت کے راستے ناول نگار بنے اُن کے خاکے لکھنو کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتے کرتے آزاد اور حسن آراء کی عشقیہ داستان کا سہارا لے کر کہانی کو جاندار بناتے ہیں۔ آزاد کی مہم جوئی دلچسپی سے بھرپور ہے دوسری طرف خوجی کا مزاحیہ کردار ہے جو تمام تر رنگینیاں اور آزاد خیالیاں ساتھ لئے موجود ہے۔ نذیر احمد کے کردار مرزا ظاہر دار بیگ کے مقابلے میں یہ خاصا جاندار کردار ہے۔ دوسری طرف ''فسانۂ آزاد'' میں موجود نقائص اور خامیاں سرشار کی شخصی لاپرواہی کے آئینے میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اگر ''فسانۂ آزاد'' میں کچھ خامیاں موجود بھی ہیں تو انھیں ختم کیا جا سکتا ہے ورنہ کم تو ضرور کیا جا سکتا تھا۔ ویسے ناول کے ارتقاء میں ''فسانۂ آزاد''، ''سیرِ کہسار''، ''جامِ سرشار'' اور ''کامنی'' بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

عبدالحلیم شرر نے ناول کے مفہوم کو خوب اچھی طرح سمجھا اور بہترین موضوعات کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے یہاں

۱۔ ناول کیا ہے؟، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص ۱۴۳۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۴۴۔

قصہ گوئی کی قابلیت کے ساتھ ایک ترتیب، لگاؤ اور تعمیر کی اچھی قابلیت موجود ہے۔ وہ مسلمانوں اور اردو ادب میں اس صنف کے صحیح معنوں میں بانی کہے جا سکتے ہیں کیونکہ انھوں نے سرسید کی اس تحریک جسکی بدولت:

''مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہو چکی تھی اور اردو ادب ٹیکنک کے لحاظ سے یورپ کی تقلید اور مواد کے لحاظ سے مسلمانوں کی پرانی عظمت کی طرف مائل ہو چکا تھا شرر نے مسلمانوں کی پرانی تاریخ کو پھر سے زندہ کرنے اور اسلام کو عیسائیت سے بہتر ثابت کرنے کا ذریعہ اسکاٹ کے ناولوں سے پایا۔ اسکاٹ کے ٹیلسمان (Talisman) کے جواب میں ''غازی صلاح الدین'' کے علاوہ اکثر و بیشتر ناولوں میں اسکاٹ کے طریقوں پر عمل ملتا ہے مگر مولانا مرحوم اسکاٹ کے فن کی گہرائی تک نہ پہنچ سکے۔''[۱]

کیونکہ مولانا نے جس تہذیب و معاشرت کو پیش کیا وہ صدیوں پرانی تھی۔ ایک خیالی اور تصوراتی دنیا تھی جسے لفظوں کا سہارا دے کر ناول کے قالب میں ڈھالا گیا تھا۔ کردار، لباس کے اعتبار سے تو عربی ہوتے تھے لیکن عادات و اطوار اور دیگر خوبیوں سے خالص ہندوستانی معلوم ہوتے ہیں۔ اصل میں تاریخی ناول نگار کے لئے اس تہذیب و معاشرت کا قریب سے مطالعہ کرنا اشد ضروری ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اسکاٹ کے کامیاب ترین ناول وہی ہیں جو اسکاٹ لینڈ کی تاریخ اور اپنے زمانہ سے ساٹھ ستر برس قبل کے ہیں:

''تاریخی ناول نگار کا فن مشکل اس لئے ہو جاتا ہے کہ اسے واقعیت کو ہر طرح قائم رکھتے ہوئے اس زمانے اور ایسے لوگوں کے حالات بیان کرنا ہوتے ہیں جو اس نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ اس مشکل کام کو انجام دینے میں وہی لوگ خاص طور سے کامیاب ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے ذاتی مشاہدات کو تاریخی واقعات سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اسکاٹ کے ناولوں میں تمام افراد ایسے ہیں جیسے لوگوں سے اسکاٹ خود کہیں نہ کہیں مل چکا تھا اور انہی کو تاریخی رنگ دے کر اس نے اپنے زمانے سے قریب ایک صدی پیشتر کی دنیا میں جیتا جاگتا دکھا دیا ہے۔''[۲]

اس کے برعکس شرر نے آٹھویں صدی کے عرب کو پیش کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ ناکام ہم اس لئے کہتے ہیں کہ وہ خود عرب کی معاشرت، تہذیب و رسم و رواج سے واقف نہ تھے اور یہی کمزوری نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے۔ وہ دلچسپی کی خاطر سطحیت اور شدت کے انداز کو بروئے کار لا کر ناول تخلیق کرتے ہیں انھوں نے تاریخ کے ماخذ کا خیال تک نہیں رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے وہ ناول جو ہندوستانی معاشرت کا نمونہ ہیں حقیقت پسندی سے خالی نظر آتے ہیں مثلاً ''مینا بازار''، ''دربارِ حرا مپور'' وغیرہ ان سب خامیوں کے باوجود ان کی ہمارے ادب میں تاریخی حیثیت مسلّم ہے اگر اس پہلو کو مدّ نظر رکھا جائے کہ شرر عیسائی ناولوں کے جواب میں اسلام کی عظمت زندہ کرنا چاہتے تھے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس مقصد میں ضرور کامیاب ہوئے اور ناول کے فن اور ارتقا میں اضافے کا باعث بنے۔

مرزا محمد ہادی رسوا کی شخصیت اردو ناول کے ارتقاء اور تاریخ میں ایک اہم موڑ کہی جا سکتی ہے۔ سائنسی ذہن رکھتے اور ریاضی

۱۔ ناول کیا ہے؟: ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص ۱۲۶۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۲۸۔

کے قواعد سے دلچسپی رکھنے والا یہ شخص اپنی نجی زندگی میں کسی قدر بے پروار ہا ہو ادبی زندگی میں قواعد، اصول اور عملی ریاضی کے قاعدوں کا ایسا پابند نظر آتا ہے کہ لگا بندھا انداز اس کی تخلیق کے روپ میں سامنے آیا۔ خاص طور پر شریف زادہ میں جو ایک فارمولہ نظر آتا ہے اگر اسکے قصے یا واقعات پر غور کیا جائے تو ریاضی کے تھیورم کی مناسبت ذہن میں آتی ہے کیونکہ اس ناول کے کردار مرزا صاحب کے ایسے خیالی کردار ہیں جیسے وہ چاہتے تھے حقیقت پسندی اور جذبات نگاری کے فقدان نے اسے غیر دلچسپ بنا دیا ہے:

''مرزا صاحب مرحوم کے رجحان طبع کا اثر ان کے شاہکار ''امراؤ جان ادا'' پر بھی پڑا ہے۔ یہ ناول ہمارے ادب کا نادر شاہکار ہے۔ پلاٹ کی ترتیب کی اس سے بہتر مثال کسی دوسری جگہ مشکل ہی سے ملے گی مگر اس میں زندگی کے تمام نقوش، خواہ وہ خانم صاحبہ کے منظم چکلے کے حالات ہوں یا محفل ہائے رقص و سرود ہوں یا سڑک اور سراؤں کے واقعات ہوں یا رنڈیوں کے کمروں کے اذکار ہوں سب اس قدر جکڑے ہوئے ہیں کہ زندگی کی نبض ان میں اپنی صحیح اور پوری رفتار سے چلتی ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔''[۱]

امراؤ جان ادا میں اعلیٰ فن کارانہ کیفیت پیش کی گئی ہے مگر یہ فن کاری زندگی کے اس مقام تک نہیں پہنچتی جہاں زندگی اور فن ایک ہو جاتے ہیں۔ امراؤ ایک بہترین کردار ہے ذہنی اور صلاحیت کے اعتبار سے وہ اپنے جیسوں میں بلند تر ہے۔ جذبات کے اعتبار سے وہ فنکاری کی بلندی پر ہے لیکن اس کے باوجود زندگی کی وہ حقیقت جو اصل زندگی کا سرمایہ ہے ناپید ہے کیونکہ احساس اور جذبات کی وہ روحانی کیفیت جو رسوا پیش کرنا چاہتے ہیں کم کم ہی سامنے آئی ہے:

''چار جگہ مکمل طور پر زندہ ہوتے ہوتے رہ جاتی ہے ایک اس وقت جبکہ وہ خانم صاحبہ کی حویلی سے فیضو کے ساتھ بھاگی ہے دوسرے جب فیض آباد میں پہنچ کر ایک مسجد کے ملا سے ہم کلام ہوتی ہے تیسرے جب وہ اپنے موروثی مکان میں ناچنے گئی ہے اور عزیزوں سے ملی ہے اور چوتھے جب وہ باغ میں سیر کرتے ہوئے ایک ڈاکو کو دیکھ کر ڈر گئی ہے اور تینوں موقعوں پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا اختصار اور قاعدے کی طرف رجوع اس کا گلا ہی گھونٹ دیتا ہے۔''[۲]

اس سب کے باوجود رسوا کے کردار بہت جاندار ہیں اور خاص طور پر امراؤ کا کردار ہارڈی کی ٹیس سے مماثل ہے۔ دونوں خود تباہ نہیں ہونا چاہتے مگر زمانہ انھیں تباہی کے دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اگر رسوا کوشش کرتے تو ان کا فن مزید نکھار کے ساتھ سامنے آسکتا تھا کیونکہ وہ اس کی صلاحیت رکھتے تھے۔

ہم فی الحال اردو ناول کے ارتقا کی بحث کو سمیٹتے ہوئے یہی کہہ سکتے ہیں کہ انگریزوں کی آمد اور فورٹ ولیم کالج کے قیام نے جہاں طباعت اور اشاعت کے کام کو فروغ دیا وہیں مغربی علوم کو واقف کرانے کی ایک دانستہ کوشش بھی کی۔ یہ الگ بات ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا قیام ان غیر ملکی افسروں کی تربیت کی غرض سے عمل میں آیا تھا جو یہاں انتظام حکومت چلانے کے لئے آتے تھے لیکن انھی ادبی شاہکاروں کو درسی نصاب میں شامل کر کے موازنے اور مسابقت کی ایک روش ضرور پیدا کی گئی یہی وجہ ہے کہ ''باغ و بہار'' کو اردو

۱۔ ناول کیا ہے؟: ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص ۱۵۱، ۱۵۲۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۵۲۔

ناول کے ارتقا میں شامل کیا جاتا ہے پھر ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید اوران کے رفقاء جدید علوم سے واقفیت کی تحریک میں سرگرداں تھے انہی میں ایک مولوی نذیر احمد نے اپنی ذاتی ضرورت کے تحت جو قصہ تخلیق کیا وہ بنیادی طور پر ناول کہلوانے کا مستحق ہے یہی وجہ ہے کہ ہم نذیر احمد کو اردو ناول نگاری کا بانی بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے پلاٹ سیدھے سادے سپاٹ ضرور تھے مگر مقصدیت اور اصلاح کی زیادتی اور انگریزی علوم سے ان کی عدم واقفیت کو نظر انداز کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کے لئے ان میں بہت کچھ تھا اور ہے پھر مستقبل میں ناول کی ہیت متعین کرنے میں ان کا بلند مقام ہے۔ کردار نگاری اسم بامسمیٰ صحیح مگر مکالمہ نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے اور اسی وجہ سے نذیر احمد کے اکثر ناول درسی نصاب میں شامل رہے اور ہیں۔ دوسری جانب سرشار ہیں عمداً ناول نہیں لکھ رہے تھے مگر ان کا قصہ پھیل کر ناول بن گیا اس لئے اس میں موجود نقائص اور خامیاں قابلِ گرفت نہیں پھر سرشار نے اس پر نظر ثانی بھی نہیں کی اور شاید وہ ناول کی ٹیکنیک سے اس قدر واقف بھی نہ تھے جتنی ضرورت تھی۔ قصے کی طوالت اور اخبار کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر ان خامیوں کو معاف کیا جاسکتا ہے لیکن اردو ناول کے ارتقا میں سرشار کی اہمیت کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تیسرا بڑا نام شرر کا ہے جو تاریخی موضوعات کو قلمبند کر رہے تھے۔ پلاٹ اور دلچسپی کے اعتبار سے ان کے ناول خاصے کامیاب ہیں اور ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے ''فردوس بریں'' ایک زندہ حقیقت ہے وہ ناول کی تعریف سے بخوبی واقف تھے مگر ضرورت اور موضوعات کے انتخاب کی بدولت وہ انصاف نہ کر سکے۔ شرر کا شمار اردو کے بنیادی ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ اردو کے تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے بھی مُسلّم ہے۔ جہاں آ کر ناول کا فن ایک خاص حد تک آ گیا ہے وہ مرزا رسوا کا دور کہا جا سکتا ہے اُن کا ناول ''اُمراؤ جان ادا'' اردو ناول کی تاریخ میں ایک نادر اضافہ ہے۔ وہ زندگی اور فن کو ایک ساتھ پیش کرنے میں بہت حد تک کامیاب رہے۔ انہوں نے زندگی کو اس کے حقیقی رنگ میں پیش کیا اور کامیاب ناول نگار کی حیثیت سے اپنا نام تاریخ میں رقم کرا لیا۔

اردو ناول ۔ انگریزی سے اثر پذیری

جدید اردو نثر کی تاریخ پر نظر کریں اور خاص طور پر ۱۷۵۷ء کے بعد پر توجہ دیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے قیام اور پھر انگریزوں کی بد نیتی نے تجارت کو حکومت کے انداز میں بدلا ۔ جہاں ملک میں طوائف الملو کی بڑھتی گئی وہیں انگریزوں کا اقتدار مضبوط ہوتا گیا اور پھر ۱۸۵۷ء آتے آتے پورے ہندوستان پر انگریزوں کی عملداری قائم ہو گئی اور مغلیہ حکومت کا سورج غروب ہو گیا۔ سات سمندر پار سے آنے والے انگریز اپنے ساتھ اپنی تہذیب و ثقافت بھی لائے تھے جب ہندوستانی معاشرے میں ان کا عمل دخل بڑھا تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ ان کی ادبی تحریکات اثر انداز نہ ہوتیں ۔ زندگی کے دیگر بہت سے شعبوں میں مغرب سے آنے والی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی بہت سی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں ۔ ایک طرف سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے اُردو نثر کے نئے انداز کو متعارف کرایا جہاں مضامین لکھنے کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جو مضمون نگاری کے فن میں ایک اضافے کے ساتھ ساتھ عوامی اور معاشرتی خامیوں کے لئے ان کا حل بھی ثابت ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ سر سید کے بعض مضامین انگریزی کے ''چربِ نظر'' آتے ہیں دوسری طرف اردو تنقید نے بھی نئی کروٹ لی اور مغرب کے تنقیدی اصول ہمارے معاشرے میں فروغ پانے لگے ۔ شاید اسی وجہ سے مولانا الطاف حسین حالی نے اردو غزل کے موضوعات پر سخت تنقید کی اور اپنی غزل کو ترک کیا اور اس انداز کو ترک کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ اسکی وجوہات بیان کرنے کے لئے انھوں نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' عوام الناس کے سامنے پیش کیا ساتھ ہی ''مسدس مد و جزر اسلام'' لکھ کر اپنے خیالات کو عملی شکل دی ۔ ہمارے ادب کا ایک اہم باب داستانوں پر مشتمل ہے ۔ طویل اور اکتا دینے والے موضوعات مافوق الفطرت کردار اور پیچ دار پلاٹ شاید ان مجلسی محافل میں تو کامیاب رہے ہوں جہاں دن بھر کے تھکے ہارے لوگ شام کو اپنا وقت گزارنے اور تفریح طبع کی غرض سے جمع ہوتے تھے لیکن سائنس کی جدید ترقی نے جہاں انسان کا بہت سا وقت بچایا وہیں نئی نئی ایجادات نے اسے زندگی کی حقیقتوں سے قریب تر کر دیا یہی وجہ تھی کہ اردو ادب میں نذیر احمد کے قصے ناول کی ابتدائی شکل میں پیش ہوتے ہیں اور یہ صنف مزید مقبول ہوتے ہوئے رتن ناتھ سرشار کے زورِ قلم کا سہارا لے کر ''فسانۂ آزاد'' کی تخلیق پر منتج ہوتی ہے اور پھر یہ وہ سلسلہ ہے جو آج تک جاری ہے ۔ اس سلسلے میں ہم تاریخی ناول کا تذکرہ کرتے ہیں ۔ تاریخی ناول شاید ناول کی نمایاں ترین قسم ہے ۔ یورپ میں سر والٹر اسکاٹ (Sir Walter Scot) نے اس کو کمال تک پہنچایا اور اس کی پیروی میں ڈوما (Duma) اور ہیوگو (Hugo) نے اس کمال کو قائم رکھا ۔ اس قسم کے ناول کا کمال یہ ہے کہ کسی پرانے دور کا نقشہ اس حسن و خوبی سے کھینچا جائے کہ وہ دور بالکل جیتا جاگتا ہمارے سامنے آ جائے ۔ اردو ادب میں انگریزی کے تاریخی ناول نگاروں کی تقلید تو کی مگر ابتداً وہ اس میں کامیاب نظر نہیں آتے ۔ مثال کے طور پر سرشار کا کردار آزاد ترکی کی فوجوں کے ساتھ مہم جو نظر آتا ہے مگر پنڈت صاحب کا ان علاقوں سے ناواقف ہونا ناول کو بے جان بنا گیا ہے ۔ دوسری طرف عبدالحلیم شرر نے تاریخ اسلام کو زندہ کرنے کے لئے ناول لکھے ۔ ان کے بیانات کامیاب ہیں مگر ان کے کردار کی فطرتیں بالکل بناوٹی معلوم ہوتی ہیں اور اس لئے ان کے ناول بے اثر ہو گئے اور وہ کامیابی سے

تاریخی ماحول کی تخلیق نہ کر سکے، انھوں نے تاریخی حصے تو بیان کئے مگر اسکاٹ کے فن کو بالکل نہ سمجھ سکے۔ اسی دور میں مرزا محمد ہادی رسوا نے ''امراؤ جان'' ادا تخلیق کیا چونکہ رسوا لکھنؤ کی تہذیب وثقافت اور رہن سہن سے بہت حد تک واقف تھے اس لئے ان کا ناول کامیاب نظر آتا ہے اور دوسری طرف رسوا کا انگریزی ادب کا مطالعہ بھی کارفرما ہے کہ انہوں نے شاید ہارڈی کے کردار ''ٹیس'' کا مطالعہ کیا ہو اور شاید یہی وجہ ہو:

''امراؤ جان اور ٹیس'' میں بہت زیادہ مناسبت اس معنی میں ملتی ہے کہ دونوں کی خانہ خرابی محض بدقسمتی کی وجہ سے ہوئی یعنی دونوں گناہ گار بذات خود نہیں بلکہ دنیا زبردستی ان کو گناہ گار بناتی ہے۔''[۱]

ان دونوں کرداروں کی مشابہت محض اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ اسے انگریزی ادب سے اثر پذیری سمجھنا چاہیے۔ سر والٹر اسکاٹ کی اصل تقلید نسیم حجازی کرتے نظر آتے ہیں پہلے تو انھوں نے اپنے عہد کی معرکۃ الآرا تاریخی کتب کا مطالعہ کیا پھر نقشوں اور جغرافیے کی مدد سے ان ممالک کے موسموں اور سطح زمین کے بارے میں معلومات جمع کیں بعد ازاں ان علاقوں کا ذاتی مشاہدہ کیا جسکے بعد ان کے ناول منظر عام پر آنے شروع ہوئے۔ مثال کے طور پر ''محمد بن قاسم'' میں زیادہ تر حالات سیلون، پاکستان کے علاقوں بلوچستان، دیبل، سکھر اور ملتان وغیرہ کے ہیں اور وہ خود ان علاقوں سے بخوبی واقف تھے اس لئے یہاں کے رہن سہن اور معاشرے کو کامیاب رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

دنیائے ادب میں دوسری زبانوں میں بہترین ناول تخلیق ہوئے لیکن ہم اگر اپنے ملک میں خواندگی کی شرح پر غور کریں جو سرکاری جائزے میں ۲۶% اور غیر جانب دار جائزوں میں ۲۰% سے کم ہے۔ سرکاری جائزوں میں جو تعداد بیان کی جاتی ہے اس میں ایسے افراد بھی شامل ہیں جو بمشکل اخبار پڑھ لینا، دستخط کر لینا اور قرآن کریم میں موجود عربی کو پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جس ملک میں خواندگی کی شرح شرمناک حد تک اتنی کم ہو وہاں قارئین کی تلاش ایک مسئلہ ہے اور پھر ہم اپنی بات یعنی دوسری زبانوں کے حوالے اور اپنے موضوع کو زیر بحث لائیں تو یہ ہماری مجبوری ہے کہ ہم اردو ناولوں پر انگریزی کے اثرات تلاش کر رہے ہیں۔ انگریزی ادب نے نہ تو ناول نگاری کو جنم دیا اور نہ ناول نگاری کے خدوخال انگلستان میں مرتب ہوئے۔ یہاں جو بات ہمارے موضوع سے مطابقت رکھتی ہے وہ ہماری سیاسی اور تاریخی کیفیت ہے چونکہ انگریز ہماری سیاست میں داخل ہو کر ریاست کے انتظام حکومت تک چلے گئے اس لئے ان کی تہذیب وتمدن اور دیگر روایات سے ہماری روشناسی ایک لازمی امر بن گئی لیکن ہم اپنی اقدار و روایات اور تہذیب وثقافت سے آنکھیں چرانے کے قائل بھی نہیں یہی وجہ ہے کہ ناول کے حوالے سے ہمارے ادب میں ایک تو گہرائی کی بڑی کمی ہے دوسرے توازن کی۔ لوگ زیادہ دور تک جانے کی، زیادہ کاوش کرنے کی، زیادہ گہرائی میں اترنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے دوسرے وہ بہت جلد انتہا پسند ہو جاتے ہیں۔ پریم چند کے یہاں عشق بچوں جیسا ہے اس میں وہ گرمی، لذت اور رس نہیں جو مرد و عورت کے فطری

---

[۱] ناول کیا ہے؟: ڈاکٹر احسن فاروقی، ص ۱۵۲،۱۵۳۔

تاریخ اور ناول کا ربط

ماضی کے واقعات کو پیش کرنا تاریخ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ کس عہد کو تاریخ کہیں کیونکہ ہر گذرتا ہوا لمحہ ماضی بنتا جا رہا ہے یعنی ماضی کی کئی تعریفیں ہو سکتی ہیں قریب تر ماضی، بعید تر ماضی۔ اس سلسلے میں مورخین متفق نہیں کہ کس عہد کو تاریخ کہیں۔ کم از کم سب اس بات پر متفق ہیں کہ وہ دور یا عہد جو اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا ہو اسے مرتب کرنا یا رقم کرنا تاریخ ہے۔ تاریخ کا فن ان حقیقی واقعات کا ذکر ہے جو گزر چکے ہیں لیکن اکثر مورخین جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ ناموروں اور فاتحین کے قصے ہوتے ہیں عظیم خاندانوں، بادشاہوں اور تہذیبوں کی داستان ہوتی ہیں اگر یہ کہا جائے کہ تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں ہر چیز اپنی اصل صورت میں دیکھی جا سکتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ میں تاریخ کی اصطلاح کو اس طرح واضح کیا گیا:

''تاریخ کی اصطلاح دو صورتوں میں مستعمل ہے۔ اول، ان افعال و واقعات کا بیان جو نوع انسان یا کسی قوم یا ملک کے زمانہ ماضی کو مشخص کرتے ہیں؛ دوم، مذکورہ افعال و واقعات کا تجزیہ نیز یہ کہ یہ افعال و واقعات کیوں اور کیسے وقوع پذیر ہوئے اور نتیجہ کیا ہوا؟ تاریخ میں سیاسی، معاشرتی اور فکری زندگی کے ماحول کا انعکاس بھی ہوتا ہے اور روزمرہ زندگی کے ماحول پر تنقید و تبصرہ بھی۔ اس میں وہ جغرافیائی حالات بھی آ جاتے ہیں جو عوام یا حکومت کے کاروبار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔''[1]

چونکہ ہمارا موضوع تاریخ اور ناول کا ربط ہے اس لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم تاریخ اور ناول کی تعریف کو سمجھ لیں اور پھر دنیائے ادب میں تاریخی ناول کے امکانات تلاش کریں۔ کینتھ برک (Kenth Burk) کے نزدیک:

''تاریخ سے ہماری مراد افراد کی ابتدائی معاشرتی زندگی کی سیاسی سرگرمیوں کی کہانی ہے۔''[2]

برٹر ینڈ رسل کے بقول:

''تاریخ صرف اس بات کا جواب ہے کہ اس کائنات میں واقعات کیسے رونما ہوئے۔''[3]

جی ہوزنگ (G. Huizing) یوں رقمطراز ہیں:

''تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ماضی کی تعریف کا عکس نظر آتا ہے۔''[4]

اب ہم ناول کی تعریف پر غور کرتے ہیں۔

''فیلڈنگ نے ناول کی کہانی کو طربیہ قرار دیا ہے جبکہ رچرڈسن نے کہانی (ناول) کو نیکی اور اخلاق سدھارنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اسمولٹ اسے ایک پھیلی ہوئی بڑی تصویر قرار دیتا ہے جس میں ایک مقرر پلاٹ کو واضح کرنے کے لئے زندگی کے کردار مختلف

۱۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ص ۱۸۹۔

۲۔ اردو میں تاریخی ناول؛ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۱۱۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۲،۱۱۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۲۔

جماعتوں کے ساتھ رکھ کر مختلف پہلوؤں سے دکھائے جاتے ہیں۔''[1]

بیکر (Baker) کے مطابق:

''ناول نثری قصے کے ذریعے انسانی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے وہ بجائے ایک شاعرانہ اور جذباتی نظریۂ حیات کے ایک فلسفیانہ، سائنٹیفک یا کم از کم ایک ذہنی تنقید حیات پیش کرتا ہے۔ قصے کی کوئی کتاب اس وقت تک ناول نہ کہلائے گی جب تک کہ وہ نثر میں نہ ہو حقیقی زندگی کی ہو بہو تصویر یا سکے مانند کوئی چیز نہ ہو اور ایک خاص ذہنی رجحان، نقطۂ نظر کے زیر اثر اس میں ایک طرح کی یک رنگی اور ربط موجود ہو۔''[2]

ڈپٹی نذیر احمد نے:

''ناول کو تعلیمی مقاصد اور تبلیغی نقطۂ نظر سے ایک عمدہ پیرایۂ بیان قرار دیا اور شرر نے زندگی کی وسعتوں کو کہانی میں سمیٹنا ناول کا منتہائے مقصود قرار دیا جبکہ رسوا نے ناول سے تنقید حیات کا کام لیا۔''[3]

بعض نقادوں نے ناول کی تعریف ذرا مختلف انداز میں کی ہے یہ تعریفیں حقیقت سے قریب قریب ہیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا حوالہ یورپی نقادوں سے پہلے ضروری ہے وہ کہتے ہیں کہ:

''ناول کا لفظ ہمارے یہاں مغربی ادب بالخصوص انگریزی کے اثر سے آیا۔ اس کا اطلاق نثر میں ایسے قصوں پر ہوتا ہے جن میں ایک واضح اور منظم پلاٹ ہو اور جس میں خیالی کہانیوں کی بجائے زندگی کے مسائل، معاملات اور واقعات بیان کئے جائیں جو نہ تو قدیم داستانوں کی طرح اتنا طویل ہو کہ ایک داستان لکھنے کے لئے کئی کئی مصنفین کی ضرورت ہو اور نہ اتنا مختصر کہ چائے کی ایک پیالی پر لکھا اور پڑھا جا سکے۔ موضوع اور پلاٹ کے علاوہ جدید ناول میں بعض اور امتیازی عناصر بھی شامل کئے جاتے ہیں۔ ان سب میں سب سے اہم کردار نگاری ہے جسے زندگی کے مطابق ہونا چاہیے اس طرح واقعات اور کرداروں کے لئے مناظر کا پس منظر بھی ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس میں بھی نہ بے حد طول ہوتا ہے نہ انتہائی اختصار۔ اسلوب میں ایک اور عنصر اس کا بیانیہ انداز ہوتا ہے۔ ناول اور ڈرامہ کا بنیادی فرق ہی یہ بتایا جاتا ہے کہ ناول میں کہانی بیان پر اور ڈرامہ میں عمل پر منحصر ہوتی ہے۔''[4]

ناول کی ایک اور تعریف ناول نگاروں کی آراء کی روشنی میں والٹر ایلن نے متعین کی ہے:

"We know, too what the Novelist sets out to do when he writes a novel.

Like any other artist the Novelist is a maker. He is making an imitation of the life of man

---

[1] اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص۲۲۔

[2] ایضاً، ص۲۳۔

[3] ایضاً، ص۲۵۔

[4] آج کا اردو ادب، جدید اردو ناول: ابواللیث صدیقی، ص۱۹۷، ۱۹۸۔

on earth. He is making; it might be said, a working model of life, as he sees & feels it, his conclusions about it being expressed in the characters he invents , the situations in which he places & in the very words he chases for those purposes . The word "conclusion" is inescapable, through it does not follow that conclusions are concisely arrived at. They may indeed be at odds with the novelist avoid intentions. Novelist has given many reasons for writing novels; Richardson believed he did so to inculcate right conduct Fielding to reform the manners of the age. Dickens to expose social evils. Trollop to make money by providing acceptable entertainment." [1]

جبکہ احسن فاروقی ناول کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

''ناول نہ تو زندگی کی ہو بہو تصویر ہوتی ہے نہ محض تنقید حیات اور تجدید حیات کیونکہ یہ بات طے ہے کہ ناول کیسی ہی حقیقی کیوں نہ ہو وہ ہرگز دلچسپ نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس میں تخیل کی آمیزش نہ ہو اور کوئی بھی داستان ایسی نہیں دکھائی جاسکتی جس میں تخیل کی فراوانی کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ حقیقت نہ ملی ہوئی ہو۔[2]

ان تعریفوں کی روشنی میں تاریخ اور ناول کا مفہوم واضح ہو کر سامنے آتا ہے اور اگر ہم تاریخ اور ناول کی مشترک تعریف کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ''انسانی زندگی میں پیش آنے والے ایسے واقعات جن سے ان کی ابتدائی معاشرتی زندگی کی سیاسی سرگرمیاں کیسے رونما ہوئیں کو تخیل کے ساتھ قلمبند کیا جائے کیونکہ ناول نہ تو زندگی کی ہو بہو تصویر ہوتی ہے نہ محض تنقید حیات و تجدید حیات اس لئے تاریخ اور ناول کے موضوع کو مشترک کیا جاسکتا ہے۔'' جن ناقدین کی رائے یہ ہے کہ تاریخ محض ماضی کے سچے واقعات کی عکاسی ہے تو ماضی کے ان کرداروں کو جو تاریخ کا حصہ ہیں جوں کا توں پیش کیا جائے اور اسی معاشرے میں تہذیب و معاشرت کی سہولت سے چند ایسے تخیلاتی کردار بھی پیش کیے جائیں جو ناول کی ضرورت کو پورا کرسکیں۔ جب عام زندگی کے واقعات ناول میں پیش کیے جاسکتے ہیں تو تاریخی واقعات کو کیوں نہیں پیش کیا جاسکتا۔ اس بارے میں ادارہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ میں مرقوم ہے:

''دلچسپ تاریخی و معاشرتی مواد بطور واقعہ مہیا کرنا اس کا مقصود ہے؛ لہٰذا اس سلسلے کی کتابیں خود تاریخ نہیں، اگرچہ تاریخ کا ایک ماخذ ضرور ہیں انھیں آسانی سے قصص یا حکایات میں بھی شامل کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ ایسے قصے ہیں جو محض تخیل کی تخلیق نہیں بلکہ جن کے لئے واقعاتی مواد موجود ہوتا ہے۔''[3]

---

[1] اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۲۷۔

[2] اردو میں تنقیدی تاریخ: ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص ۱۰۔

[3] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ص ۱۸۷۔

جبکہ آرنالڈ کے الفاظ میں:

"The first thing about an historical novel is that the author recreates in it an age in which did not live."[1]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان ناولوں میں کسی پرانے دور کا نقشہ اس حسن وخوبی سے کھینچا جائے کہ وہ بالکل جیتا جاگتا ہمارے سامنے آ جائے۔ اس امر میں کامیاب ہونے کے لئے ناول نگار کو اوّل تو تاریخ کا بہت ہی گہرا علم ہونا ضروری ہے دوسرے تاریخی زمانے کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے اس میں ایک خاص قسم کی قوت تخیل بھی ہونا چاہیے۔ تیسرے ناول نگار کو اپنے تاریخی ماحول سے کسی نہ کسی طرح کا ذاتی تعلق ہونا ضروری ہے:

''اسکاٹ کے سب سے زیادہ کامیاب ناول وہ ہیں جو اٹھارویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن میں اسکاٹ لینڈ کے بیانات ہیں۔ اپنے زمانے کے قریب کے اور خاص اپنے ملک کے اس حصے کو تاریخی ناول نگار سب سے اچھا دکھا سکتا ہے جس میں وہ زندگی بسر کر رہا ہو یہی وجہ ہے کہ اسکاٹ کا ناول طلسمان (Talsiman) جس کا سین عرب میں ہے کامیاب نہیں ہے۔''[2]

صحیح تاریخ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی دور کے صرف سیاسی واقعات ہی کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ وہ اس دور کے سماجی شعور کا مجموعہ ہوتی ہے چنانچہ آج ہم تاریخ کے کسی عہد کے سماجی رجحانات اور ہیئتِ اجتماعیہ کے وجدان و شعور کا بھی ٹھیک اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تاریخ کا مقصد محض ماضی کے واقعات کو دہرانا نہیں بلکہ مستقبل کی فکر پیدا کرنا ہے یہیں سے وہ زندگی کی ساتھی ہو جاتی ہے اگر اسی بات کو یوں کہا جائے کہ مورخین کی ذمہ داری صرف یہ نہیں کہ وہ محض بادشاہوں اور سپہ سالاروں کے کارنامے اور سیاسی زندگی کے واقعات ہی بیان کریں بلکہ سماجی زندگی کے اُن واقعات کو بھی بیان کریں جس نے کسی تاریخی عہد کو زندگی بخشی ہے کیونکہ کسی بھی تاریخی عہد کے انسان محض سیاسی کارناموں کی بنا پر نہیں پہچانے جاتے بلکہ ان کی معاشرتی زندگی اور تہذیبی وثقافتی روایات بھی اسے زندہ رکھتی ہیں۔ مورخ کی نسبت تاریخی ناول نگار کی یہ زیادہ ذمہ داری ہے کہ وہ محض تاریخی حقائق نہ بیان کرے بلکہ اس دور کی سماجی وثقافتی زندگی کا بھی نقشہ کھینچے ممکن ہے ایسا کرتے ہوئے اسے تاریخ میں کچھ تصرف بھی کرنا پڑے جسے نقاد اور مورخ تو شاید پسند نہ کریں لیکن ایک قاری یقیناً پسند کرے گا۔ تاریخ حقیقت پسندی کی ترغیب دیتی ہے۔ ناول حقیقت کو افسانے کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ کامیاب ناول نگار وہی ہے جو ان دونوں میں توازن قائم کرے۔ حقیقت پرستی تاریخ کے حق میں ضرور ہے لیکن ناول کے لئے نہیں۔ اس کے برخلاف افسانویت نفس افسانہ کے لئے تو بہتر ہے لیکن بحیثیت مجموعی تاریخی ناول کے خلاف ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ درمیانہ راستہ اختیار کیا جائے بعض اوقات تاریخی ناول نگار کے لئے مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تاریخی حقائق کو کم سے کم مسخ کرے لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تاریخ کے بعض

---

[1] The Arabs, Their History; Arnold , Hottinger: Culture & place in the modern world, page, 15.

[2] ناول کیا ہے؟: ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص ۹۷۔

مُسلمات کو چھیڑے بغیر ناول کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ تاریخی شخصیات کے ضمن میں محتاط رہنا چاہیے لیکن بعض تاریخی واقعات، شہروں کے درمیان فاصلے، جغرافیائی ماحول میں کسی نہ کسی جگہ فروگذاشت کی جاسکتی ہے۔ اس طرح تاریخی ناول کے امکانات پیدا ہوتے ہیں اور یوں ہم کہ سکتے ہیں کہ تاریخ اور ناول کے درمیان ربط پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ضرورت تاریخی ناول نگار کے اسلوب کی ہے کہ وہ اپنے موضوع کو کس طرح پیش کرتا ہے چونکہ ناول میں تخیل کی گنجائش موجود ہے اور تاریخی واقعات کو حقیقت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے تخیل کی کارفرمائی سے رنگینیٔ بیان اور موضوع میں دلچسپی پیدا کی جانی چاہیے اسطرح تاریخ اور ناول کے درمیان ربط پیدا ہوجائے گا۔

اردو میں تاریخی ناول نگاری

اردو ادب میں ناول نگاری انگریزی کے توسط سے آئی۔ یہ الگ بات ہے کہ دنیائے ادب کا پہلا ناول کب اور کہاں لکھا گیا البتہ باقاعدہ اور مربوط انداز میں ناول نگاری انگلستان میں فروغ پاسکی تھی اور یہیں تاریخی ناول نگاری کا آغاز بھی ہوا چونکہ ہمارا موضوع اردو کی تاریخی ناول نگاری ہے تو ہم اُردو میں باقاعدہ تاریخی ناول نگاری سے قبل اِن امور کو زیرِ بحث لاتے ہیں جنکی بنیاد تاریخ یا تاریخی موضوعات سے مطابقت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر داستانوی ادب میں بعض تاریخی شخصیات اور مقالات کا حوالہ تو ملتا ہے مگر تاریخی حقائق اور واقعات نگاری ناپید ہے لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب سرسید احمد خان نے اردو ادب کو علمی اعتبار سے بلند مقام دلانے کی جدوجہد کی تو کئی اصنافِ ادب بھی متعارف ہوئیں چونکہ یہ اصنافِ ادب ابھی ترقی کے ابتدائی دور میں تھیں اس لئے ان میں بعض خامیاں بھی تھیں۔ مثال کے طور پر اودھ اخبار میں رتن ناتھ سرشار کا قسط وار ناول فسانۂ آزاد شائع ہورہا تھا اور اس میں حسن آرا کی فرمائش پر آزاد ترکی، روس اور جرمنی وغیرہ کی جنگوں میں شرکت کے لئے جاتا ہے تاریخی اعتبار سے جو ــــ دئے گئے ہیں وہ متضاد ہیں دوسری طرف سرشار نے لکھنو کا جو تہذیبی مرقع پیش کیا وہ حقیقت نگاری کا شاہکار ہے۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرشار سے یہ غلطی قصداً ہوئی یا اتفاقاً۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ سرشار چونکہ تاریخی ناول نہیں لکھ رہے تھے اس لئے ان سے یہ غلطیاں سرزد ہوئیں مگر تہذیبی اور معاشرتی طور پر ان کا ناول ایسی تصویر پیش کرتا ہے کہ شاید مورخ بھی اس طرح رقم نہ کر پاتا پھر ہم اس سلسلے کو رواں دواں دیکھتے ہیں ایک طرف عبدالحلیم شررؔ کا ناول ''ملک العزیز ورجینا'' قسط وار شائع ہورہا تھا تو دوسری طرف مولوی نذیر احمد کا ناول ''ابن الوقت'' منظرِ عام پر آیا یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ انگریزی ادب میں رچرڈسن کے ناول ''پامیلا'' کی اشاعت کے دو سال بعد ہی ہنری فیلڈنگ کا ناول ''جوزف اینڈ ریوز'' منصۂ شہود پر آیا جو اپنے موضوع کے اعتبار سے تاریخی ناول کہا جاسکتا ہے۔ اُردو کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ۱۸۶۹ء میں منظرِ عام پر آیا اور فسانۂ آزاد ۱۸۸۰ء میں ناول کی شکل میں شائع ہوا لیکن اگر کچھ دیر کے لئے عبدالحلیم شررؔ کو فراموش کردیا جائے تو مولوی نذیر احمد کا ناول ابن الوقت تاریخی حقائق کا آئینہ دار بن کر آیا گو کہ اس کی کردار نگاری فرضی تھی مگر اس قسم کے کردار اس معاشرے میں ضرور موجود تھے۔

''نذیر احمد نے اس سیاسی انقلاب کو ''ابن الوقت'' کے پلاٹ کے لئے منتخب کیا تو ان کے پیشِ نظر یہ حقیقت موجود تھی کہ آج کے سیاسی واقعات ہی مستقبل میں تاریخ قرار پاتے ہیں بلکہ سیاسی واقعات کی کروٹیں ہی تاریخ کو جنم دیتی ہیں۔''[1]

نذیر احمد دیکھ رہے تھے کہ نوجوان طبقہ بڑی تیزی سے مغربی وضع قطع اختیار کرتا جارہا ہے اس سے وہ اپنے ہم وطنوں سے بھی دور ہوتے جارہے تھے۔ دوسری طرف انگریز بھی یورپین وضع قطع اختیار کرنے پر اِن سے زیادہ خوش نہ تھے۔

تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہورہا تھا کہ نذیر احمد نے ۱۸۸۸ء میں ''ابن الوقت'' تحریر کیا۔ نذیر احمد نے ملکی سیاست اور تاریخ

---

[1] اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۱۴۳۔

کو اس ناول کے پسِ منظر کے طور پر استعمال کیا اس ناول کی فضا تاریخی نوعیت کی ہے لیکن نذیر احمد اس عظیم تاریخی حوالے کو سلیقے سے استعمال کرنے میں بہت زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ انہوں نے مذہبی فکر کے ذریعے تاریخ کے بدلتے ہوئے رجحانات کی نفی کرنے کی کوشش کی ہے۔ نذیر احمد نے اس ناول میں اپنے عہد کی تاریخ قلمبند کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین ابن الوقت کو صرف سیاسی ناول قرار دیتے ہیں جبکہ چند ایک اسے نذیر احمد کا دلی غبار نکالنے کا حربہ قرار دیتے ہیں مگر حقیقت ان دونوں کے برعکس ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ سیاسی ناول کہا جا سکتا ہے جبکہ کردار نگاری اور واقعات دلی غبار نکالنے کا حربہ پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ایک تہذیب کا بیان بھی اس میں موجود ہے اور یہ وہ تہذیب ہے جسکا مشاہدہ خود نذیر احمد نے کیا تھا:

۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد جنھیں نذیر احمد نے ابن الوقت میں پیش کیا اردو کے افسانوی ادب کا حصہ بھی بنے اور بہت سے افسانے ۱۸۵۷ء کے واقعات سے متعلق لکھے گئے لیکن مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ باقاعدہ طور پر تاریخی ناول نگاری کی صنف کیوں وجود میں آئی اور ناول کے نام سے لے کر کرداروں اور واقعات نگاری تک اور پھر تہذیب و ثقافت کو بھی اپنایا گیا اور باضابطہ طور پر مولانا عبدالحلیم شرر نے اس صنف ادب میں خود کو بحیثیت بانی منوایا۔ مختلف طبقہ ہائے زندگی کے افراد اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق قوم کو غلامی سے نکالنے کے لئے اپنا کردار ادا کرنے میں مصروف تھے اس موقع پر شرر نے محسوس کیا کہ تاریخ میں موجود کارناموں کو پیش کر کے قوم کو آزادی کے لئے ابھارا جائے اور اپنی تاریخ کے کارناموں اور کامیابیوں سے متاثر ہو کر لوگ مستقبل کے خوش گمان دور میں قدم رکھ سکیں گے۔

اگر ان محرکات پر غور کیا جائے کہ جنکی بدولت شرر نے تاریخی ناول نگاری کو اختیار کیا حالانکہ علامہ شبلی نعمانی تاریخ نویسی کر رہے تھے تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ بقول ڈاکٹر ممتاز منگلوری:

''ناول کی صنف ان دنوں نئی نئی مغرب سے آئی تھی اور لوگ اسکے فن کو نہ سمجھنے کے باوجود اس میں گہری دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ شرر نے اپنے امور خانہ، ذوقِ افتادِ طبع اور تقاضائے حالات کے تحت احیائے قوم کے لئے ایک مناسب ذریعہ تصور کرتے ہوئے اپنایا اور اس طرح اردو میں تاریخی ناول نگاری کی صنف کی بناپڑی۔''[۱]

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے علی عباس حسینی رقمطراز ہیں کہ:

''مولانا عبدالحلیم شرر عربی، فارسی کے عالم تھے اور تاریخ سے آپ کو خاص ذوق تھا۔ آپ نے انگلستان اور یورپی ممالک کی سیاحت بھی کی تھی۔ اس سفر کے سلسلے میں آپ نے وہ آثار الصنادید بھی دیکھے تھے جن سے اُن ایام گذشتہ کی یاد تازہ ہوتی تھی جب عرب کا پرچم صیقلہ واندلس میں لہرا رہا تھا۔ آپ نے اسی دوران سر والٹر اسکاٹ کے وہ نام نہاد تاریخی ناول بھی دیکھے جن میں اسلام کا مضحکہ اڑایا گیا ہے اور عیسائیت کا فروغ دکھایا گیا ہے۔ غرض مورخانہ ذوق، قبولیتِ عام کی خواہش، مذہبی جوش اور مسلمانوں کے احیا کا

۱۔ شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ص ۴۴۔

خیال تاریخی ناول لکھنے کا محرک بنا۔''[۱]

لیکن علی عباس حسینی کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے ڈاکٹر احسن فاروقی کہتے ہیں کہ:

''ناول کی طرف ان کی توجہ شاید سرشار کی کامیابی نے مبذول کی ہو مگر یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا جس بات کا یقین ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ انگلستان اور یورپی ممالک کی سیاحت کر رہے تھے تو ان کے ہاتھ اسکاٹ کا تاریخی ناول ٹیلسمان لگا جس میں اسکاٹ نے کچھ سطحی نقوش عرب کی اسلامی زندگی کے نمایاں کئے۔ مولانا کو یہ کتاب پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ اس میں اسلام کا مذاق اڑایا گیا ہے مذہبی جوش میں آ کر انھوں نے اس ناول کی رد میں ایسے ناول لکھنے کی ٹھان لی جس میں اسلام کی تاریخ کو زندہ کیا جائے اور عیسائیت کی برائیاں دکھائی جائیں چنانچہ یہ جذبہ مذہبی ناول نگار ہونے کا محرک بنا۔''[۲]

ہمارا خیال ہے کہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری اس سلسلے میں معتدل اور مناسب رائے رکھتے ہیں کیونکہ شرر کے کئی تاریخی ناول ان کے غیر ممالک کے سفر سے قبل ہی شائع ہو چکے تھے اور بحیثیت تاریخی ناول نگار وہ اپنا مقام بنا چکے تھے۔ درحقیقت یہی رائے زیادہ مستند معلوم ہوتی ہے کہ اُس زمانے کے حالات کے مطابق مسلمانوں میں جذبۂ جہاد، جوش اور ولولہ پیدا کرنے اور انھیں غلامی کی زنجیریں توڑ دینے کی طرف راغب کرنے کے لئے اس قسم کی تحریروں کی ضرورت تھی۔ ایک ادیب معاشرے کا حصہ ہوتا ہے اور معاشرے کی ضرورتوں کو محسوس بھی کرتا ہے اور وہ جو ادب تخلیق کر رہا ہوتا ہے وہ اسی معاشرے کے لئے ہوتا ہے اس لئے وہی مسائل اور مباحث ضبط تحریر میں لائے جاتے ہیں جو وہاں کے ہوں۔

ناول لکھنا شاید ایک آسان کام ہو لیکن تاریخی ناول لکھنا بے حد مشکل کام ہے کیونکہ سماجی اور معاشرتی موضوعات میں ناول کی ضرورت کے مطابق رد و بدل کر کے پیش کیا جا سکتا ہے مگر تاریخی ناول نگار یہ حربہ استعمال نہیں کر سکتا اس سلسلے میں ایک رائے الفریڈ ٹریسڈر شیپرڈ کی یہ ہے:

"There is no great historical Novel without obvious & even glaring faults. There have been very great historical Novels. The perfect historical Novel has never yet been written and may never be.[۳]

ہمارے خیال میں یہ درست نہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ناول نگار اور مورخ کا فرق سمجھ لیا جائے اس سلسلے میں جوناتھن نیلڈ (Jonathan Nield) نے کہا ہے کہ:

"A novel is rendered historical by the introduction of dates, personages, or

---

[۱] اردو ناول کی تاریخ اور تنقید: علی عباس حسینی، ص ۲۳۱۔

[۲] اردو ناول کی تنقیدی تاریخ: ڈاکٹر احسن فاروقی، ص ۱۲۷، ۱۲۸۔

[۳] The Art & Practice of Historical Fiction, Alfred Tresidder Sheppard, Page 82.

events to which identification can be readily given" [1]

مگر ان سے مکمل اختلاف کرنا اور انھیں ناول نگار نہ ماننا کچھ مناسب عمل معلوم نہیں ہوتا کیونکہ بعض نقادوں کے اس خیال کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا بقول علی عباس حسینی:

''تاریخی ناول کی اصطلاح ہی سرے سے غلط ہے یا تاریخی ناول صنف ناول کی کوئی قسم ہی نہیں ہے۔'' [2]

یہ رائے قائم کرنے میں بعض ناقدین کو اس لئے دشواری پیش آئی ہوگی کہ وہ تاریخی ناول نگاری کی تعریف کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہ سکے تھے ۔ یہ مسئلہ صرف اردو زبان تک محدود نہیں بلکہ اکثر مغربی نقاد بھی اسی الجھن کا شکار نظر آتے ہیں۔ شپرڈ کی رائے میں:

"It is not difficult to define; the definition of historical fiction, on the other hand, presents innumerable, and at first unsuspected, difficulties. [3]

جس طرح تاریخی ناول کی تعریف کو سمجھنا مشکل امر ہے بالکل اسی طرح تاریخی ناول کو سمجھنا یا لکھنا اس سے بھی زیادہ مشکل کام معلوم ہوتا ہے۔

تاریخ گزشتہ زندگی کے واقعات کا بیان ہے جس میں عموماً اس متعلقہ زمانے کے ماحول اور اِن واقعات کے اصل محرکات کا ذکر بہت کم ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر تاریخ میں صرف زندگی کے خارجی واقعات سے بحث ہوتی ہے اور یہ محض ناموروں اور فاتحین کے کارناموں کی داستان ہے اگرچہ آگسٹائن برل (Augustine Birrell) نے اِسے بحوالہ شپرڈ لکھا ہے:

"History is the story of man upon earth, and the historian is he who tells us any chapter or fragment of that story." [4]

شپرڈ نے آگسٹائن برل کی بیان کردہ اس تعریف میں اضافہ کرتے ہوئے تاریخی ناول نگار کے لئے ہی ایک سادہ سی تعریف وضع کی ہے شپرڈ کہتا ہے:

"To my mind, the moment any chapter of fragment of that story wanders by a hair's bredth from exact and established fact, the historian ceases to be historian and becomes an historical novelist." [5]

اِن آراء کی روشنی میں شپرڈ کی یہ رائے ہے:

---

[1] The Art & Practice of Historical Fiction, Alfred Tresidder Sheppard, Page 15.

[2] ناول کی تاریخ و تنقید، علی عباس حسینی، ص ۳۰۳۔

[3] The Art & Practice of Historical Fiction, Alfred Tresidder Sheppard, Page 12.

[4] Same as above, Page 12.

[5] Same as above, Page 12.

"An historical novel must of necessity be a story of past in which imagination comes to the aid of fact." ۱

جبکہ ایسی تعریف کی مزید وضاحت اناطول فرانس(ANATOL FRANCE) نے یوں کی:

"History is an art and should be written with imagination." ۲

یہ رائے تاریخ کی تعریف کے معیار پر پوری نہیں اترتی کیونکہ اسطرح صحیح تاریخی واقعات ہمارے سامنے نہیں آسکتے اور ہم حقائق سے بہت دور ہو جائیں گے مگر شیپرڈ نے اس رائے میں تصرف کرتے ہوئے اور اس تعریف کو قصہ گوئی کے لئے موزوں قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

''تاریخی قصہ گوئی ایک فن ہے جو تخیل کی رہنمائی میں تخلیق ہوتا ہے۔'' ۳

یعنی تاریخی ناول نگار ماضی کے واقعات میں اپنے کارفرما زورِ تخیل کی بدولت ایسی رنگ آمیزی کرتا ہے کہ وہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کی چلتی پھرتی زندگی کے روپ میں ہمارے سامنے آموجود ہوتی ہے۔

یعنی جان بوچان(John Buchan) کے بقول:

"An historical novel is simply a novel which attempts to reconstruct the life and recapture the atmosphere of an age other than that of the writer." ۴

آرنلڈ بنٹ(ARNOLD BENNETT) کے الفاظ میں:

"The first thing about an historical Novel is that the author recreats in it an age in which he did not live." ۵

ان آراء کی روشنی میں یہ بات تو طے ہو جاتی ہے کہ تاریخی ناول کی گنجائش موجود ہے اور کسی نہ کسی حد تک تاریخی ناول کی تعریف بھی متعین ہو گئی ہے جو یہ ہے کہ ''تاریخی واقعات میں تو کسی قسم کا ردوبدل نہ کیا جائے مگر قاری کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے تخیل کا سہارا لے کر ماضی کے ایک معاشرے یا اسکے واقعات کو ترتیب دیا جائے۔'' اسطرح وہ اعتراض بھی غیر ضروری ہو جاتا ہے کہ تاریخی ناول نگاری اور تاریخ ایک ساتھ چل ہی نہیں سکتے۔

بات دراصل یہ ہے کہ تاریخ اور تاریخی ناول نگاری کا دائرہ بالکل مختلف ہے تاریخ ماضی کے واقعات کو جوں کا توں بیان کر

۱ The Art & Practice of Historical Fiction, Alfred Tresidder Sheppard, Page 15.

۲ Same as above, Page 15.

۳ Same as above, Page 15.

۴ Same as above, Page 15.

۵ Same as above, Page 15.

دینے کا نام ہے۔خواہ یہ انداز سپاٹ ہی کیوں نہ ہو گیا ہو جبکہ تاریخی ناول نگاری تخیل کی کارفرمائی کی بدولت دلچسپ اور رنگین انداز میں مرتب کی جاتی ہے اور اس طرح ماضی کے سیدھے سادے واقعات کو رومان پرور اور سحر آفرین انداز میں پیش کیا جاتا ہے اس بات کی صداقت میں جرمن ناول نگار فریڈرک سپلیگن (FRIEDRICH SPIELHAGAN) کا یہ قول ہے کہ:

"Historical novel is one that portrays a time on which the light of the living generations memory does not fall any longer in its full force." ۱

جان بوچان نے تاریخی ناول نگار کے منصب کی نشاندہی اسطرح کی ہے کہ وہ ماضی کی زندگی کی از سرِ نو تعمیر کرتا ہے جو مورخ کے منصب، دائرۂ کار اور شاید اختیار سے بھی باہر ہے۔

شیپرڈ نے تاریخی ناول اور تاریخ کے اس فرق پر مفصل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''موت، انقلاب اور حوادث نے ماضی کی زندگی پر دبیز پردے ڈال کر اسے انسان کی نظر سے اوجھل کر دیا ہے اور جو چیز نظر سے اوجھل ہے انسانی فطرت کی آرزومندی اسے حد درجہ حسین اور پرکشش بنا دیتی ہے حسنِ مستور کو بے حجاب دیکھنے کی یہی تمنا اسے تاریخ اور اسی کے ماخذوں کی طرف لے جاتی ہے لیکن تمنا ناکام و نامراد لوٹتی ہے کیونکہ تاریخ ماضی کی جو تصویر دکھاتی ہے وہ حسین ہوتی ہے نہ دلکش۔ تاریخ کا دکھایا ہوا ماضی پرشکوہ اور مہیب تو ہوتا ہے لیکن پُر حیات ہرگز نہیں ہوتا۔ اسکی مثال پوست و استخوان کے اس ڈھانچے کی سی ہے جس میں گوشت کی نرمی اور خون کی گرمی نہیں ہوتی جن نظر افروز نظاروں کو دیکھنے اور دلنشین صداؤں کو سننے کی آرزو ان کو ماضی کی طرف دوڑاتی ہے، تاریخ اسے محروم لوٹاتی ہے۔'' ۲

مورخ ان ہی واقعات کو رقم کرتا ہے جو اہم ہوں یا اہم لوگوں کے ہوں یعنی بادشاہوں، امیروں وغیرہ کے۔ اسکے برعکس عام آدمی کے واقعات یا معمولات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ واقعات کے انتخاب میں اسکی سوچ نفسیاتی یا جذباتی ہونے کے بجائے علمی، منطقی اور خشک ہوتی ہے۔ مورخ کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ زندگی کی بظاہر بے حقیقت اور بے معنی چیزیں انسانی زندگی پر کتنا گہرا اور دیرپا اثر ڈالتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی بنائی ہوئی تصویریں ادھوری اور نامکمل ہوتی ہیں۔

ایم۔ پی۔ شیل (M.P.Shiell) نے تاریخ کی اسی خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے مشہور ناول کولڈ سٹیل کا آغاز ان الفاظ سے کیا:

''علمی مورخ اکثر تاریخ کے دلچسپ ترین اور اہم ترین واقعات کی طرف سے اغماض کرتا ہے۔'' ۳

یہاں شیل کے نزدیک اہم ترین واقعات سے وہ واقعات مراد ہیں جو مورخ کو اہم معلوم نہیں ہوتے لیکن اپنے اثر کے اعتبار سے وہ

---

۱ The Art & Practice of Historical Fiction; Alfred Tresidder Sheppard, Page 17.

۲ شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ: ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ص ۲۱۔

۳ The Art & Practice of Historical Fiction; Alfred Tresidder Sheppard, Page 155.

دلچسپ بھی ہوتے ہیں اور اہم بھی غرض ایسے واقعات سے ہے تو جبھی تاریخ کو غیر دلچسپ بھی بنا دیتی ہے اور وہ ماضی کی از سر نو تعمیر اور اسکی حقیقی تصویر کشی سے بھی قاصر رہتی ہے۔

ڈوماز اور ہیوگو نے بھی مختلف پیرایوں میں یہی بات واضح کی ہے کہ مورخ ایک بنی بنائی فرسودہ ڈگر پر چل کر حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے اس لئے اسکی آنکھوں میں زندگی کا بہت محدود حصہ آتا ہے اور وہ تمام تفصیلات اور جزئیات رواداری میں اسکی نظر سے گزر جاتی ہیں جو زندگی کو صحیح معنوں میں زندگی بناتی ہے اسی لئے مورخ جو کچھ لکھتا ہے وہ نہ مکمل حقیقت ہوتی ہے اور نہ ہی قارئین کے لئے مؤثر دلچسپ اور جاذب توجہ ہوتی ہے۔

مورخ کے تحریر کردہ واقعات ماضی کے سچے واقعات ضرور ہوتے ہیں مگر انھیں ماضی کی مکمل تصویر کہنا درست نہیں کیونکہ اکثر مواقع پر دیکھا گیا ہے کہ مورخ اپنی ذاتی دلچسپی اور خواہش کے مطابق واقعات رقم کرتا ہے جو زندگی کی حقیقتوں کے صحیح آئینہ دار نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس تاریخی ناول نگار زندگی کے دھندلے نقوش کو اپنے رنگین بیان سے جیتی جاگتی زندگی کے طور پر پیش کرتا ہے اس بات کی مزید وضاحت علی عباس حسینی کے اس قول سے ہو جاتی ہے:

''ناول کی جگہ وہاں ہوتی ہے جہاں تاریخ کے صفحے سادہ اور خاموش ہوں یا امتدادِ زمانہ کی وجہ سے جو واقعات صاف دکھائی نہیں دیتے یا جو شخصیتیں دھندلی پڑ گئی ہیں۔ انھیں قصے اور افسانے واضح کر کے دکھاتے ہیں لیکن جہاں تاریخ کا آفتاب عالمتاب خود ہی نصف النہار پر چمک رہا ہو وہاں ناول کی شمع جلانا حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔''[۱]

علی عباس حسینی کی یہ رائے ناول کی ادبیت، اثر آفرینی، مقبولیت اور جاذبیت کی صفات سے انکار کے مترادف ہے اور کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں قرار دی جا سکتی نیز اس رائے میں تاریخ اور تاریخی ناول کے مختلف دائرہ ہائے عمل کے لطیف فرق کو سمجھنے میں سہل نگاری دکھائی دیتی ہے۔ تاریخ ماضی کو چند انسانوں کے کارناموں کی رہین منت دکھاتی ہے اور تاریخی ناول یہ دکھاتا ہے کہ اگر ماضی میں واقعی زندگی تھی تو وہ صرف بادشاہوں اور کج کلاہوں کے دم سے نہیں تھی بلکہ اس میں عام انسان بھی برابر کے شریک تھے البتہ یہ کہا جا سکتا ہے:

جہاں تاریخ کا آفتاب نصف النہار پر ہو وہاں تاریخی ناول نگار کی ذمہ داریاں اور فنی دشواریاں عام حالات سے زیادہ ہوتی ہیں لیکن یہ کہنا کہ ان حالات میں ناول نگاری مضحکہ خیز ہے انسانی فطرت کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے کیونکہ ناول یا قصہ بہر طور تاریخ سے زیادہ پُرکشش اور بجا طور پر زیادہ پُر اثر بھی ہے۔ بقول ڈین انگ (Dean Inge):

"The motives for falsifying history are in exact proportion to the interest of poterity in knowing the truth. Falsified history has perhaps had more influence than true

---

۱۔ اردو ناول کی تاریخ و تنقید، علی عباس حسینی، ص ۲۳۲۔

history." ۱

تاریخی ناول ہی بنیادی طور پر ناول کے ذیل میں آتا ہے اور قارئین اس میں وہی کچھ تلاش کرتے ہیں جو عام ناولوں میں ہوتا ہے۔صرف تاریخی واقعات یا محض تخیل کے ملاپ سے تاریخی ناول مکمل نہیں ہو سکتا اس کے لئے تاریخی واقعات اور تخیل کا حسین امتزاج ضروری ہے۔شیپرڈ کا خیال ہے:

"Historical fiction deals imaginatively with the past and can follow the paths where tresspass boards confront the pedestrian historian. The novelist has a wider range; He may set the foot in the preserves of history. But on one condition; He may not make his habitation there, or may only build if part of his house stand with the demense of the imaginations." ۲

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ تاریخی ناول نگار کس حد تک تاریخی واقعات رقم کرتا ہے اور کہاں تک تخیل کی کارفرمائی کا سہارا لے سکتا ہے یعنی وہ ایک ایسی شاہراہ پر گامزن ہے جہاں مسائل بھی ہیں اور سمجھ بوجھ سے کام بھی لینا ہے اور کامیابی کے لئے ہر لمحہ ہوشیار رہنا بھی ضروری ہے تاکہ تاریخ بھی خلط ملط نہ ہو اور تاریخی ناول بھی مرتب ہو جائیں۔

تاریخی ناول نگار کی ذمہ داریاں:

موجودہ حالات پر ناول رقم کرنے والے اکثر ناول نگاروں کے پاس معاشرے کے وہی بکھرے ہوئے موضوعات ہوتے ہیں جنھیں ہم محسوس کرتے ہیں یا دیکھتے ہیں لیکن ایک کامیاب ناول نگار انہی محسوسات اور مشاہدات میں تخیل اور جذبات کی آمیزش سے ایسی دلچسپی پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے عہد کا عکاس بن جاتا ہے۔بالکل اسی طرح تاریخی ناول نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ موضوع اور عہد کا انتخاب کرتے وقت خوب سوچ بچار کرے کہ وہ جس دور کے واقعات ضبطِ تحریر میں لائے گا ان میں اسقدر دلچسپی اور تخیل آفرینی پیدا کرے گا کہ قارئین کو ماضی کی چلتی پھرتی زندگی دکھا سکے:

"But it is important above all that the period is one in which the writer himself takes an interest. A wide sympathy with humanity is an other essential." ۳

جبکہ عہد کے انتخاب کے بارے میں دو آراء زیادہ واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہیں کہ اگر تہذیبی و تمدنی موضوع کو اختیار کیا جائے جو کہ زیادہ پُر شکوہ اور معروف ہو کیونکہ اس میں فنونِ لطیفہ اور زندگی کے عام میل ملاپ کے واقعات بھی اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ انھیں بنا

۱The Art & Practice of Historical Fiction; Alfred Tresidder Sheppard, Page 13.

۲Same as above, Page 15.

۳Same as above, Page 27.

کسی ردّ و بدل کے پیش کیا جا سکتا ہے اور اس طرح ناول نگار کو تاریخی حقائق میں کسی قسم کے تصرف یا ان سے انحراف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ تاریخی ناول نگار اس موقع پر اپنے قلم کی کارفرمائی پیش کرے جہاں تاریخی واقعہ میں خلا موجود ہو مگر اسے پُر کرنے کے لئے اپنی ہوشیاری ضرور دکھائی جائے کہ تخیلی واقعہ حقیقی واقعہ کے ساتھ مل کر ایک ہی کہانی معلوم ہو یہ قاری کے لئے دلچسپ بھی ہو اور جاذبِ نظر بھی مگر اس تاریخی واقعہ میں تصرف یا بے ہنگم محسوس نہ ہو۔ درحقیقت یہی وہ مقام ہے جہاں تاریخی ناول نگار کا امتحان مقصود ہے مگر ایسے معروف اور پُر شکوہ واقعات میں تخیل کی کارفرمائی سے ایک متوازی کہانی یا قصہ پیش کرنا ازحد مشکل کام ہے۔

جارج سینٹبری (George Saintbury) کے خیال میں:

"All who have studied the philosophy of novel writing at all closely know that great historical events are bad subjects, or are only good subjects one condition. A condition the steady observance of which constitutes one of the great merits of Sir Walter Scott. The central interest in all such cases must be connected with a wholly fictitious personage, or one of whom sufficiently little is known to give the romancer free play. When the condition is complied with the actual historical events may be , and constantly have been. Used with effect as aids in developing the story and working out the fortunes of the characters." ۱

کیونکہ اس ضمن میں مورخین کے شواہد ہر راہ پر اس کی آزمائش کے لئے موجود ہوتے ہیں اس کے برعکس تاریخی واقعات کے درمیان خلا کو پُر کرنا اور قصہ گوئی کا سہارا لینا شیپرڈ کے نزدیک مناسب ہے کیونکہ:

"The choice of period before recorded history can pretend to a certain standard of accuracy, or even exist at all. There are more opportunity. You have not centuries only. But thousands and possible hundreds of thousands of years to choose from. ۲

"'The historical novelist who goes back to the actual cave man for his hero is almost as free from competition as a polar exporer. He is not crowded as man exporing London or New York, Paris or Berlin or Rome is crowded and he is not likely to be

---

۱ The Art & Practice of Historical Fiction; Alfred Tresidder Sheppard, Page 124.

۲ Same as above, Page 115.

challanged about his facts where the few scenty facts on which he works are by no means established. Some one has said that it is easiest thing in the world to write a notable book about a land which no one has visited but yourself." [۱]

"The choice of period very long ago makes the work of a novelist easier in some respects, as where knowledge is incomplete or interact, he has more latitude and wider scope for the free play of imagination. But there is the danger of dulness, of lack of versimilitude, and almost always of being found out ultimately when human knowledge is more complete." [۲]

اس لئے شیپرڈ کا خیال ہے کہ کسی فنکار کا یہ اقدام دانشمندانہ قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ کسی ایسے دور کا انتخاب کرے جس کے بارے میں اسے یقین ہو کہ اس کے سوا اور کوئی اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا کیونکہ ممکن ہے اس بھری دنیا میں ایک یا دو اشخاص ایسے بھی نکل آئیں جو اس کی معلومات کا پول کھول کر اس کے سارے وقار کی دھجیاں اُڑا دیں۔

تاریخی ناول نگار کو چاہیے کہ کسی تاریخی دور کا تذکرہ کرتے ہوئے ایسے خلا کو تلاش کرے جہاں اس کا تصور اور تخیل سما جائے اور یہ تاریخ میں تصرف بھی محسوس نہ ہو۔ شیپرڈ کا خیال ہے کہ:

"We may write about an age, in which we have lived when it becomes shrouded in blue haze of distance, entering it, we tread softly in the enchanted garden of youth our own dead youth and the world's." [۳]

تاریخی ناول نگار کے لئے ایک مشکل مرحلہ اس وقت آتا ہے جب وہ کسی عہد کا انتخاب کرتا ہے۔ صرف مطالعہ سے خارجی واقعات کا تعین کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس معاشرے یا عہد کو اس نے دیکھا نہیں اس لئے مشاہدہ موجود نہیں ہوتا۔ ان حالات میں تصوراتی تصور میں تخیل کا سہارا لے کر پلاٹ کا تانا بانا بُنا جاتا ہے یہ ایک نہایت مشکل مرحلہ ہے کیونکہ تصورات کسی غلط ڈگر پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ اور اس طرح کہانی میں بڑا جھول پیدا ہو جاتا ہے شاید اسی وجہ سے ہمارے اکثر تاریخی ناول نگاروں کے کردار لباس سے تو عربی النسل نظر آتے ہیں لیکن اپنے رہن سہن اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے خالص ہندوستانی دکھائی دیتے ہیں بعض مواقع پر تو یہاں تک ہوتا ہے کہ ناول کا کردار جو کھانا تناول کر رہا ہے وہ اس علاقے میں پایا ہی نہیں جاتا جہاں سے اس کردار کی وابستگی دکھائی گئی

۱۔ The Art & Practice of Historical Fiction; Alfred Tresidder Sheppard, Page 115.

۲۔ Same as above, Page 143,144.

۳۔ Same as above, Page 17.

ہے شاید اسی وجہ کو مدنظر رکھتے ہوئے شیپرڈ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے:

"With most fiction it is a sound rule for the writer to deal only with what he knows in his personal experience, but the historical novelist has to go beyond personal experience, and enter another world and another age, like the writer of a present-day novel, he must know something of human nature, but he must also know something of innumerable subjects which can only be learnt from other books."whatever men do", comes with in his range; he should know something of past politics, of war, of law, of medicine, of botany, of heraridry, of theologies, of genealogies, of bygone geography and topography, of dress and at every step, unless he is cautious, There is a danger of stumble." ۱

اس لئے معلومات کے حصول کے لئے زیادہ فاصلے طے کرنے پڑتے ہیں کیونکہ:

"Historical novel is one that portrays a time on which the light of the living generations memory does not fall any longer in its full force." ۲

معلومات کی فراہمی کے سلسلے میں شیپرڈ مطالعہ کی اہمیت پر بہت زور دیتا ہے اس کا خیال ہے کہ:

"The historical novelist must study books on costumes, on coinage, on the contemporary history of other states; he must read contemporary letters, diaries, despatches, even legal documents and medical works. Nothing dealing with his period and locality should be foreign to him. He may have to go to works on heraldry, on botany, on etymology, on orboriculture, on agriculture. Picture galleries and museums, cathedrals and churches and castles, all yield their, spoils." ۳

اس ضمن میں ناول نگار کو چاہیے کہ ان علاقوں کے جغرافیائی حالات کے بارے میں مکمل معلومات رکھے اور بہتر یہ ہے کہ نقشہ جات کو اپنے سامنے رکھ کر اپنی کہانی اور کردار کی حرکات و سکنات متعین کرے۔ تاریخی ناول نگار کی ایک اہم ذمہ داری یہ بھی ہے کہ تاریخ

---

۱ The Art & Practice of Historical Fiction; Alfred Tresidder Sheppard, Page 16.

۲ شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ: ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ص ۳۰۔

۳ ایضاً، ص ۳۶۔

کے ہر پہلو اور ہر راوی کی بات کا بغور جائزہ لے اور جہاں تضادات سامنے آنے لگیں تو اِن سے کنارہ ہی کر لے تو بہتر ہے لیکن اگر کسی اختلافی موضوع کو زیر بحث لانا ضروری ہو تو پھر اس عہد کے واقعات کی روشنی میں کسی ایسی روایت پر یقین کرے جو قرین قیاس ہو اور اس بات سے خبردار رہے کہ کسی واقعہ، عہد یا شخصیت میں کسی قسم کا رڈوبدل کرے۔

شیپرڈ رائے دیتا ہے:

"I think, whatever license may be given to an imaginative writer who takes history as his background, no unnecessary departures from fact should be permitted; the more closely facts are followed the better is the book. An historical novelist should not play tricks with chronology except when it is absolutely necessary to his plot and then only in the matter of days or hours where historian himself may often be inaccurate or uncertain. He may not alter the great events of history." [1]

اسے یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کسی لمحے تجسس کم نہ ہو قاری کی دلچسپی، اسکے جذبات واحساسات کا ہر لمحہ خیال رکھتا ہے اور کہانی کا اختتام اس کے منتہی پہلوؤں کے عین مطابق کرتا ہے۔ رچرڈ اسٹیل نے ناول کے اختتام کے اس پہلو پر بہت زور دیا ہے اور ناول نگار کو متنبہ کیا ہے کہ قاری کے تجسس کو زیادہ ابھار کر اچانک ناول کو ختم کر دینے سے ناول کا مجموعی اثر زائل ہو جاتا ہے۔

عام طور پر تاریخی ناولوں کے کردار کے لئے تاریخ کی اُن مشہور شخصیات کو چُنا جاتا ہے جنکے بارے میں ایک عام قاری اپنا ایک موقف رکھتا ہے اس موقع پر ناول نگار ایک مشکل میں پڑ جاتا ہے کہ اگر وہ روایتی واقعات سے ہٹ کر کچھ بھی بیان کرنا چاہتا ہے تو قاری اسے تاریخ میں تصرف گردانتا ہے اس لئے ایک خیال یہ ہے کہ تاریخی ناولوں میں تاریخ کی اہم شخصیات کو بحیثیت کردار پیش کرنے سے بچا جائے لیکن بعض مواقع پر تاریخی شخصیات کو بحیثیت کردار پیش کرنا ناول کو جاندار بنا دیتا ہے۔ لیزلی سٹیفن اور شیپرڈ بھی اس نظریے کے حامل ہیں ان کا خیال ہے کہ:

"I think that an historical character in a novel is almost always a nuisance , but I like to have bit of history in the background, so to speak,to find that George the third is just round the corner though he does not present himself in full front." But if (The young novelist) brings the big folks on the scene against the background of the epical events and forgets the little folks, he is , in a thousand cases to one, inviting disaster."

---

[1] شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ص ۴۷۔

یقیناً تاریخی ناول نگار ایک مشکل ڈگر پر گامزن رہ کر اپنے قاری کو محظوظ کرتا ہے جبکہ ناقدین اس کی ہر ہر ادا پر گرفت کے لئے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔ رہا بعض زمانی اور جغرافیائی معاملات کا مسئلہ تو اگر تشدد کے ساتھ ناقدانہ نگاہ نہ ڈالی جائے اور ناول نگار خود بھی احتیاط سے چلتا رہا ہو تو قابلِ معافی ٹھہرے گا کیونکہ معاشرتی ناولوں میں بھی اس قسم کی اغلاط ہوتی رہتی ہیں اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخی ناول ایک کہانی پر مشتمل ہے جہاں حقیقت اور تخیل کا امتزاج اسکی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے یہ کوئی صحیفہ تو ہے نہیں جو کسی غلطی سے مبرا ہو اس لئے اسے اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

عبدالحلیم شرر کے ناول۔ایک مختصر جائزہ

مولانا عبدالحلیم شرر کے ناولوں کا جائزہ لینے سے قبل ہم ان کے حالاتِ زندگی اُس زمانے کے سیاسی اور معاشرتی حالات اور شرر کا علمی اور ادبی پسِ منظر پیش کرتے ہیں۔

عبدالحلیم شرر ۲۰ جمادی الثانی ۱۲۷۶ھ بمطابق ۱۸۶۰ء کو بروز جمعہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔شرر کے والد حکیم تفضل حسین عربی اور فارسی میں کامل بصیرت رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک پختہ مغز طبیب بھی تھے۔نواب واجد علی شاہ کی بحیثیت حاکم اودھ معزولی کے بعد مٹیا برج منتقلی کے دوران شرر بھی اپنے آباءواجداد کے ہمراہ کلکتہ منتقل ہو گئے۔ان کی ابتدائی تعلیم کلکتہ میں ہوئی جہاں انھوں نے عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی میں شُد بُد حاصل کرنے کی کوشش کی۔اپنے علمی و ادبی مذاق کی بدولت اودھ اخبار کے نامہ نگار مقیم کلکتہ مقرر ہوئے۔لکھنؤ واپسی پر ان کی شادی کر دی گئی مگر جلد ہی اپنی علمی استعداد میں اضافہ کے احساس نے انھیں دہلی کی طرف روانہ کیا جہاں علمِ حدیث کے حصول کے علاوہ انگریزی سے کافی حد تک واقفیت بھی حاصل کی۔بعدازاں لکھنؤ واپسی پر اودھ اخبار کے ادارتی شعبے میں شامل ہوئے اسی زمانے میں شرر نے اپنے ایک دوست مولوی عبدالباسط کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ ''محشر'' نکالا اور اس میں ایسے مضامین لکھے جو اپنی دلکشی اور عبارت کی رنگینی میں انفرادی حیثیت کے حامل تھے۔اسی رسالے میں شرر نے اٹھارہ انیس شماروں میں صبح کے منظر پر ایک مسلسل مضمون لکھا جس میں صبح کا سماں اس حسین پیرائے میں بیان کیا گیا تھا کہ صاحبانِ ذوق ورطۂ حیرت میں پڑ گئے۔اس مضمون میں عبارت آرائی کے روایتی ڈھنگ کو بالائے طاق رکھ کر عربی، فارسی اور انگریزی کی ایسی بندشیں پیش کی گئیں کہ موضوع نہایت پُرلطف ہو گیا۔''محشر'' کی مقبولیت روز بروز بڑھ رہی تھی اس لئے منشی نول کشور نے ۱۸۸۴ء میں انھیں اودھ اخبار کا نمائندۂ خصوصی بنا کر حیدرآباد دکن بھیج دیا۔شرر نے چھ ماہ تک حیدرآباد میں رہنے کے بعد لکھنؤ واپس آنے کی خواہش ظاہر کی لیکن انھیں اس کی اجازت نہ ملی چنانچہ وہ اودھ اخبار کی ملازمت سے مستعفی ہو کر لکھنؤ واپس چلے آئے۔

حیدرآباد سے واپسی کے بعد لکھنؤ میں قیام کا زمانہ شرر کی ادبی زندگی کے آغاز کا دور ہے۔اس زمانے میں انھوں نے اپنا پہلا ناول ''دلچسپ'' لکھا جس کا پہلا حصہ ۱۸۸۵ء میں اور دوسرا ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۸۶ء ہی میں شرر نے بنکم چندر چٹرجی کے ناول ''درگیش نندنی'' کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرایا۔اس ترجمے میں ایک اچھے انشاءپرداز کی شخصیت صاف نمایاں ہے جس نے ترجمہ کو ادبی خوبیوں اور حسن سے متصف کر دیا ہے اس طرح شرر عوام و خواص میں مقبول ہونے لگے اور پھر احباب کے مشورے پر اپنا مشہور رسالہ ''دلگداز'' جاری کیا اسی ادبی شاہکار کی بدولت اقساط میں اپنا ناول ''ملک العزیز ورجینا'' تحریر کیا جو مقبولیت کی بلندیوں کو چھونے لگا یوں بھی ناول کا موضوع اور پھر تاریخی ناول کے موضوع نے اسے مزید عام کیا اسی انداز کو اختیار کرتے ہوئے انہوں نے مزید تین ناول تحریر کئے پھر دلگداز کی اشاعت رک گئی۔اس کے بعد انہوں نے ملازمت کر لی اور حیدرآباد منتقل ہو گئے اسی دوران کبھی انگلستان جانے اور کبھی نہ جانے کے دوران ایک بار پھر ''دلگداز'' لکھنؤ سے جاری کیا اور خود حیدرآباد میں مقیم رہے یہاں

تک کہ انگلستان روانگی عمل میں آئی اوران کا رسالہ ''دلگداز'' بیچ بھنور میں لہروں کی تاب نہ لاکر بظاہر ڈوب گیا۔ انگلستان اور یورپ کے سفر میں جہاں ان کے مطالعے اور علم میں اضافہ ہوا وہیں مشاہدات بھی وسیع ہوتے گئے۔ برصغیر واپسی پر انہوں نے اپنے رسالے ''دلگداز'' کو ایک بار پھر جلا بخشی اور اس رسالے کے گیارہ حصے حیدرآباد سے شائع کیئے مگر ایک مذہبی تنازعے کی وجہ سے ''دلگداز'' کی اشاعت حیدرآباد سے روکنا پڑی جسے لکھنؤ آنے پر جاری کیا اسی دوران مزید تاریخی ناول لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۱۹۱۲ء میں اپنے فرزند کی موت پر بہت افسردہ رہے مگر بہت جلد جیتی جاگتی دنیا کے ساتھ چلنے کا عزم کیا اور دہلی سے نکلنے والے اخبار ہمدرد کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے ذمے داریاں قبول کیں مگر دہلی کا قیام سودمند نہ ہوا اور لکھنؤ لوٹ آئے۔ ''دلگداز'' کی اشاعت میں تاریخی اور معاشرتی ناولوں کا سلسلہ جاری رہا اسی دوران نظام حیدرآباد نے ''تاریخ اسلام'' مرتب کرنے کی ذمے داری بھی سونپی۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۶ء تک کا دوران کی ادیبانہ صلاحیتوں کا کامیاب ترین دور ہے۔ اردو صحافت اور اردو تاریخ کے ساتھ ساتھ اردو کی تاریخی ناول نگاری کا یہ بنیادی ستون ۱۹۲۶ء میں اپنے آخری سفر پر روانہ ہوا۔

تاریخی، معاشرتی اور سیاسی حالات:

اگر کسی ادیب کی تحریروں کا جائزہ لینے کے لیئے اس کے حالات زندگی سے واقفیت ضروری ہے تو وہیں ان معاشرتی اور سیاسی حالات کا تجزیہ تاریخ کے آئینے میں کرنا اشد ضروری ہے جو ان کی تحریروں کا باعث بنے ہوں گے۔ جب ہم عبدالحلیم شرؔر کے تاریخی و معاشرتی ناولوں کا تجزیہ کرنے لگتے ہیں تو ہمیں اُن تاریخی عوامل کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے جو سولہویں صدی میں ہندوستان میں رونما ہو رہے تھے۔ انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے ہندوستان میں قدم جما رہے تھے کہ سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارویں صدی کے اوائل میں مغلیہ حکومت کی کمزوری اور ملک میں طوائف الملوکی نے انگریزوں کو اس بات کا موقع فراہم کیا کہ وہ تجارتی کمپنیوں کی آڑ میں قلعے تعمیر اور تاجروں کے بھیس میں فوجی سرگرمیاں شروع کریں نیز یہ کہ سازشوں کا جال بھی پھیلایا جائے تاکہ تقسیم کے عمل کو شروع کیا جائے۔ اصل میں انگریزوں نے تجارت کے میدان کو چھوڑ کر سیاست کے میدان کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جہاں ان کی حریف دو قوتیں فرانس اور پرتگال کی صورت میں موجود تھیں اسی دوران اورنگ زیب کی موت اور اُن کے نالائق بیٹوں کی عیش پرستی حکومت کی بربادی کا باعث بنی۔ مزید کام سید برادران کے بادشاہ گری کے تجربے نے پورا کیا۔ اُن کے قتل کے باوجود حکمرانوں کی آنکھیں نہ کھلیں اسی دوران سکھوں اور مرہٹوں کی باغیانہ سرگرمیاں بڑھتی گئیں اودھ اور بنگال میں آزاد حکومتیں اپنے قیام کے اعلان کیا چاہتی تھیں کہ ملک سے باہر بھی کئی نظریں تخت طاؤس پر لگی تھیں اور پھر:

''۱۷۳۹ء میں نادرشاہ نے دہلی پر حملہ کیا اور قتل و غارت گری کا ایسا بازار گرم کیا کہ تاریخ میں اس کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ ہزاروں آدمی مارے گئے، ہزاروں عورتوں نے اپنی آبرو بچانے کے لئے کنوؤں میں کود کر جان دے دی، نادرشاہ بے اندازہ دولت اور

تخت طاؤس لے کر واپس گیا اور سلطنتِ مغلیہ کو آخری سانسیں لینے کے لئے چھوڑ گیا۔''[1]

۱۷۵۷ء میں بنگال میں نواب سراج الدولہ کو شکست ہوئی دوسری جانب ابدالی نے پانی پت کی تیسری جنگ میں مغلوں کو شکست دی۔ غلام قادر روہیلہ دہلی پر چڑھ دوڑا اور لال قلعہ میں داخل ہو کر شاہ عالم کے سینے پر سوار ہو گیا اور نوک خنجر سے اس کی آنکھیں نکال لیں۔ مرہٹوں کی آمد نے غلام قادر کا خاتمہ کیا اور یوں مرہٹہ راج قائم ہو گیا۔ شاہ عالم کی موت کے بعد عالمگیر ثانی کی تخت نشینی پر انگریز لارڈ ہیمنگر نے خود کو آدابِ شاہی سے مستثنیٰ کرالیا۔ معیشت میں انگریزوں کا عمل دخل ۱۸۳۵ء میں سکوں کے اجراء پر منتج ہوا۔ ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی رسمِ تاج پوشی پر انگریز کہنے لگے کہ اس تکلف کی کیا ضرورت ہے کہ لال قلعے میں بھی حکمران رہیں انہیں قلعے خالی کر دینے چاہئیں۔ ہر جانب سازشوں کے جال بچھائے گئے کہ اچانک انگریزی کمان میں موجود دیسی فوجیوں نے بغاوت کر دی، شمالی ہندوستان اس کی لپیٹ میں آ گیا لیکن انگریزی فوج کی چالبازیاں کارگر ہوئیں۔ غدر ۱۸۵۷ء کو کچل دیا گیا۔ قتلِ عام کا ایک بازار گرم ہوا۔ بہادر شاہ ظفر اس سازش کے بڑے مجرم قرار دے کر رنگون جلاوطن کر دیئے گئے جہاں وہ زندگی کا ماتم کرنے کے لئے ۱۸۶۲ء تک زندہ رہے۔ بعض روشن خیال مسلمانوں کی تحریروں نے مسلمانوں کے بہتے ہوئے خون پر بند باندھا۔ ان روشن تحریروں میں سرسید احمد خان کی ''اسباب بغاوتِ ہند'' قابلِ ذکر ہے۔

۱۸۷۰ء آتے آتے ہندو لیڈروں کی انگریزوں پر نکتہ چینی نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور پھر ڈاکٹر ہنٹر کی رپورٹ نے وائسرائے کے ذریعے ہندوستان کے تمام صوبوں میں مسلمانوں کی ملازمت اور ان کی دیسی زبانوں کی سرپرستی کا حکم جاری کیا۔ سرسید نے ڈاکٹر ہنٹر کی اس رپورٹ پر تبصرہ لکھ کر انگریزوں کی بہت سی بدگمانیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۷۰ء سے سرسید کی علی گڑھ تحریک شروع ہوئی اگرچہ اس سے قبل سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آ چکا تھا لیکن درحقیقت ''تہذیب الاخلاق'' کے اجراء سے ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا۔ ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ کالج قائم ہوا جس کا افتتاح خود وائسرائے نے کیا۔ اس تحریک نے آگے چل کر مسلمانوں کی فکری، سیاسی، سماجی اور معاشی حالت کو بہت حد تک سدھارا اور مسلمانوں کو اپنی پستی کا احساس ماضی کے وقار کی یاد دلا کر ان کے موجودہ مسائل سے انھیں آگاہ کرتے ہوئے ایک ایسی بیداری بخشی جس کے تاثرات بیسویں صدی میں سامنے آئے۔

ایک طرف ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزوں کی حکمرانی نے مسلمانوں کو اپنی بقا کی جنگ لڑنے پر مجبور کیا تو دوسری طرف ملت اسلامیہ کے مرکز ترکی کو بھی یورپ کے سیاسی، فوجی اور نظریاتی طوفانوں کی زد میں آنا پڑا۔ ۱۸۷۸ء کی جنگ میں ترکی کی شکست اور اس کی پاداش میں معاہدے کی صورت میں ادا کردہ بھاری قیمت اور ۱۸۸۷ء کی گریشو ترکش جنگ کے بعد ترکوں کو اپنے اندازِ فکر میں خاص طور پر تبدیلی پیدا کرنا پڑی اور حالات سے تطابق کے علاوہ عمل کی نئی راہیں تلاش کرنی پڑیں اگر ہم بیسویں صدی کے دیگر بین الاقوامی واقعات پر نظر کریں تو:

---

[1] اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ: ادریس صدیقی، ص ۳۸۔

’’روس میں انقلاب کے آثار ۱۹۰۵ء میں نمایاں ہوئے لیکن بے دردی سے دبا دئے گئے پھر ایک اور انقلاب ۱۹۱۷ء میں شروع ہوا۔ بالشوک جماعت آگے بڑھی اسکی قیادت لینن کر رہا تھا۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں لینن کو کامیابی ہوئی اور اس نے اقتدار سنبھال لیا۔ اس انقلاب کے وقت اسٹالن ۴۴ سال کا انتہا پسند کارکن تھا۔ اس وقت وہ سائبریا میں نظر بند تھا۔ اس بندۂ خدا کے والدین تو اسے پادری بنانا چاہتے تھے لیکن یہ کافر کھلم کھلا مارکس کے نظریات کا پرچار کرتا تھا۔‘‘ [1]

بیسویں صدی کے ابتدا ہی میں جرمنی بھی ایک بڑی قوت بن کا ابھرا۔ اس کی صنعتی ترقی اس بات کی متقاضی تھی کہ بیرونی منڈیاں تلاش کی جائیں۔ ایک بحری بیڑہ اور جرمنی کا جھنڈا مقبوضات پر لہرائے دوسری طرف برطانیہ کی سامراجی قوت اپنے تمام تر مقبوضات کے ساتھ ۱۹۱۴ء میں جرمنی سے برسرِ پیکار ہوئی۔ جنگ عظیم اول میں ترکی جرمنی کا حلیف تھا۔ ان دو بڑوں کی لڑائی کا نقصان انھیں کم سلطنتِ عثمانیہ کو زیادہ ہوا۔

سلطنتِ عثمانیہ کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر اٹلی طرابلس پر حملہ آور ہوا اور وحشت و بربریت کی ایک نئی داستان رقم کی مگر مجاہدین اس کے دانت کھٹے کرتے رہے اور پھر اٹلی نے دھمکی دی کہ وہ جدہ کی بندرگاہوں کا محاصرہ کرے گا اور (نعوذ باللہ) خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ پر گولہ باری کرے گا۔ اس پر تمام عالم اسلام بالخصوص مسلمانانِ ہند تلملا اٹھے۔ ترکی کو بلقان کے محاذ پر بھی شکست ہوئی۔

اب تک ہم نے برصغیر کے انیسویں صدی کے آخر تک کے حالات اور بیسویں صدی کے ربع اول کا منظر نامہ مختصراً پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں بیسویں صدی کے ابتدائی حالات بھی رقم کئے جائیں۔ انگریزوں نے تجرباتی طور پر تقسیم بنگال کی جو سخت مخالفت کے بعد منسوخ کرنی پڑی۔ خلافت عثمانیہ کے ساتھ انگریزوں کا بظاہر غیر جانبدارانہ رویہ اور ہندوستانی مسلمانوں کی جذباتی وابستگی نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ملتِ اسلامیہ کی خاطر مسلمانوں کے دل ایک ساتھ دھڑ کتے ہیں۔ تحریک خلافت کے موقع پر مسلم لیگ اور کانگریس ایک ہی پلیٹ فارم پر نظر آتے ہیں اور پھر میثاق لکھنؤ نے اس امکان کو مزید تقویت بخشی لیکن انگریزوں کا ظالمانہ اور جابرانہ طرز حکومت جمہوری آزادیاں دینے کے حق میں نہ تھا۔ امرتسر، جلیانوالہ باغ کا واقعہ اور پھر پورے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات نے ان خام خیالیوں کو بہت جلد بحر ہند میں غرق کر دیا جو ہندو مسلم اتحاد کی بدولت پروان چڑھی تھیں۔

ہم نے برصغیر پاک و ہند سمیت بین الاقوامی حالات کے مختصر جائزے سے کم از کم یہ بات ضرور سمجھی ہے کہ اٹھارویں صدی کے اوائل سے دنیا بھر میں مسلم قوتوں کا انحطاط شروع ہوتا ہے اگر ان حالات کا تجزیہ کیا جائے جو مسلمانوں کے اقتدار کے سکڑنے کا باعث بنے تو مسلم حکمرانوں کی بے راہ روی، اقتدار پر ان کی ڈھیلی گرفت، دفاعی اعتبار سے ناقص منصوبہ بندی، عوام کی فلاح و بہبود کو نظر انداز کرنا اور عوام میں عدم تحفظ ہونا نظر آتا ہے ان عوامل نے نہ صرف مغلیہ سلطنت کے زوال کا راستہ استوار کیا بلکہ سلطنتِ عثمانیہ کے

---

[1] برگ گل (قائد اعظم کی صدی)، محمد محی الدین بدایونی، ص ۳۰۸۔

خاتمے کا باعث بھی بنے اور اس طرح ملت اسلامیہ حاکم سے محکوم بنتی گئی۔ کسی اسلامی ملک پر برطانیہ کا پرچم لہرا رہا تھا تو کہیں فرانسیسی، روسی اور پرتگالی فوجیں مسلم ممالک پر قبضہ جمائے ہوئے تھیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ امتِ مسلمہ کو اس کا ماضی یاد دلا کر نہ صرف جھنجوڑا جائے بلکہ دشمنوں کے مقابل لا کھڑا کیا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ماؤں کی گود میں سونے والے شیر خوار بچے ان ہی لوریوں کی مدد سے ولولہ اور امنگ حاصل کرتے ہیں جو ان کے خون میں شامل رہی تھی اور ان کے تابناک ماضی کا حصہ تھی۔ آخر وہ کون سے خواب آور نغمے تھے جو ان کے عزم و استقلال اور حمیت کو جگانے میں ناکام تھے اور وہ کون سی کیفیت تھی جو ان کی غیرت اور حریت کے راستوں کی رکاوٹ بن گئی تھی شاید کہ جہاد کا وہ راستہ جو بظاہر موت کی نیند سلا دیتا ہے لیکن جس کا اسلامی تصور خون کا قطرہ گرنے سے قبل حوضِ کوثر پر جام لینے اور حضور ﷺ سے ملاقات کا وہ سہانہ تصور ہے جو امت کے دل میں پیدا کرنا اور اسے جاگزیں کرنا عبدالحلیم شرر کا نصب العین رہا ہو۔

شرر کے چند تاریخی ناولوں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

ملک العزیز ورجینا:

شرر کا یہ ناول ۱۸۸۸ء میں دلگداز میں قسط وار شائع ہوا اور ۱۸۸۹ء میں پہلی بار کتابی صورت میں چھاپا گیا۔ اس ناول کے دیباچے میں انھوں نے سر والٹر اسکاٹ کو بحیثیت تاریخی ناول نگار خراج تحسین پیش کرتے ہوئے تاریخ اور ناول کے موضوع پر ان کی گرفت پر ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اردو ناول کے تمام فنی مبادیات کو اس ناول میں بڑے سلیقے سے برتا گیا ہے۔ اس ناول کے موضوع کا انتخاب کرتے وقت تیسری صلیبی جنگ میں صلاح الدین ایوبی اور شاہ رچرڈ کی شہرت، دانشمندی اور جنگی حکمت عملی شرر کے مدِ نظر رہی ہوگی اسی وجہ سے انہوں نے ''دلگداز'' کے بارھویں شمارے ۱۸۸۸ء میں مؤرخ کی ذمے داریاں علامہ شبلی نعمانی کو تفویض کرتے ہوئے خود کو محض ناول نگار کے طور پر پیش کیا ہے ان کا موقف ہے کہ اب تک لکھے گئے دیگر ناولوں کے مقابلے میں ''ملک العزیز ورجینا'' کی کہانی تاریخی حقیقت کے قریب تر ہے تمام تاریخی شخصیات خاص حد تک تاریخ کے عین مطابق پیش کی گئی ہیں یعنی انہوں نے تخیل اور رومان کی گنجائش اپنے لئے پیدا کر لی تھی اس ناول کا زمانہ ۵۸۷ھ تا ۵۸۹ھ / ۱۱۹۱ء تا ۱۱۹۲ء کے واقعات پر پھیلا ہوا ہے، اگر چہ کہیں کہیں ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء سے پہلے کے واقعات کا حوالہ بھی آ جاتا ہے۔ اس ناول میں بیان کردہ تاریخی واقعات مختصراً یہ ہیں۔

اس ناول کے اکثر واقعات صلاح الدین کے بیٹے عزیز نورالدین، شاہ رچرڈ کی بھانجی ورجینا اور شاہ رچرڈ کے درمیان گھومتے ہیں۔ یہاں عشق اور میدانِ جنگ ایک کشمکش کی صورت میں متوازی چلتے ہیں۔ کہانی کے آغاز ہی میں شہزادہ عزیز کو ورجینا ملتی ہے، جس کے بعد اس کا نکاح ہو جاتا ہے شہزادہ شادی کے بعد کے ایام عیش و آرام سے گزارنے کے بجائے جہاد کی ذمے داریوں کو فوقیت دیتا ہے۔ کامیاب ترکیبوں اور بہترین صلاحیتوں کے ساتھ شاہ رچرڈ کو نقصانات پہنچاتا ہے مگر اس کی منکوحہ ورجینا شاہ رچرڈ کے قبضے میں زیرِ عتاب ہو جاتی ہے شہزادہ عزیز عیسائی مبلغ کی حیثیت سے ورجینا کی صعوبتوں میں کمی کرانے کا باعث بنتا ہے۔ ناول کے اختتام پر شاہ رچرڈ اور صلاح الدین ایوبی کی فوجوں میں ایک صلح نامہ ہوتا ہے اور اس دوران یہ دکھایا جاتا ہے کہ ورجینا عیسائی مذہب اختیار کر چکی ہے اس لئے اس کا نکاح یوشع کے ساتھ کر دیا جاتا ہے لیکن حیرت انگیز طور پر یوشع اپنی اصل حیثیت ملک العزیز میں ظاہر ہو جاتا ہے اور یوں ورجینا بھی کفر سے توبہ کر کے کلمۂ توحید پڑھتی ہے اور اس طرح صلاح الدین ایوبی کے فوجی واپسی کا سفر اختیار کرتے ہیں اور شاہ رچرڈ اور ان کے فوجی اس تمام کاروائی پر حیران رہ جاتے ہیں۔

اگر ہم ناول کا تنقیدی جائزہ لیں اور ان تاریخی حقائق کا موازنہ کریں جو ناول اور تاریخ میں مرقوم ہیں تو ہمیں بعض خامیاں نظر آئیں گی۔ مثال کے طور پر:

''شرر نے مقتولین کی جو تعداد بتائی ہے وہ دراصل مقتولین عکہ کی تعداد ہے اکثر مؤرخین اور خصوصاً معاصر مورخین اس امر پر

متفق ہیں کہ عکہ پر جب عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا تو اس کے ایک ماہ بعد رچرڈ کے حکم سے ۲۷۰۰ ترکوں کو قلعے سے باہر لا کر قتل کر دیا گیا، سلطان کی فوج کے سپاہی اس ہجوم کو دیکھ رہے تھے، جب انھیں اس بات کا علم ہوا تو وہ اپنے ہم مذہب بھائیوں کی جان بچانے کے لئے دیوانہ وار عیسائیوں پر ٹوٹ پڑے۔ رات گئے تک معرکہ خیز لڑائی ہوتی رہی لیکن وہ اُن بے گناہوں کو اس ظلم کا شکار ہونے سے بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ شرر نے مقتولین کی یہ تعداد جون ۱۱۹۱ء کے آخری ہفتے سے منسوب کر کے تاریخ میں ایسا زمانی تصرف کیا ہے جو نہ تاریخ روا رکھ سکتی ہے اور نہ تاریخی ناول نگاری کا فن ایسے تصرف کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ واقعہ دراصل ۱۶ اگست ۱۱۹۱ء کا ہے اور اس تاریخ پر اکثر مورخین کا اتفاق ہے، اگرچہ بہاالدین ابن شداد نے ۲۰ اگست ۱۱۹۱ء لکھا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ابن شداد بھی جمعہ کا دن بتاتا ہے اور جمعہ ۲۰ اگست کو نہیں بلکہ ۱۶ اگست کو تھا بہر کیف یہ ڈیڑھ ماہ کا زمانی تصرف موزوں نہیں کیونکہ شرر نے اس کے بعد عکہ کی شکست کے بیان تک تین ابواب اور بھی لکھے ہیں اور اس طرح وہ سب بعد از وقت ہو جاتے ہیں۔''[1]

لیکن ناول کے ابتدا میں جو چند باتیں پیش کی گئی ہیں ان میں آغاز قصہ کے علاوہ کہ جس میں جمعہ کا دن بتایا گیا ہے جبکہ ہفتے کا دن تھا اکثر باتیں درست ہیں، صلاح الدین کے بیٹوں کی عمر، جغرافیائی اعتبار سے فاصلے وغیرہ۔ مگر ناول کی پوری کہانی عزیز نورالدین کے گرد گھومتی ہے۔ تاریخ میں صلاح الدین ایوبی کے کسی بیٹے کا نام یہ نہیں بلکہ:

''ناول کا ہیرو ملک العزیز نورالدین سلطان صلاح الدین کا بڑا بیٹا اور ملک الافضل سلطان کا چھوٹا بیٹا بیان کیا گیا ہے حالانکہ سلطان کے کسی بیٹے کا نام ملک العزیز نورالدین نہیں تھا۔ سلطان کے بڑے بیٹے کا نام ملک الافضل نورالدین ابوالحسن تھا جو ۵۶۵ھ (۱۱۷۰ء) میں پیدا ہوا اور صلیبی جنگوں میں اپنے باپ اور چچا کے ہمراہ پر جوش حصہ لیتا ہے۔ تیسری صلیبی جنگ کے وقت اسکی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی اس کا انتقال ۱۲۲۵ء میں دمشق میں ہوا۔''[2]

جبکہ چھوٹے بیٹے کا نام ملک العزیز تھا جو مصر میں مقیم رہا اور انتظام حکومت سنبھالتا رہا وہ جنگوں میں شریک نہیں ہوا۔ شرر نے چھوٹے اور بڑے بیٹے کے ناموں کا کچھ حصہ لے کر جو کردار پیش کیا ہے وہ ملک العزیز نورالدین بن گیا۔

اس ناول کا دوسرا اہم کردار ورجینا ہے جو شاہ رچرڈ کی بھتیجی تھی۔ بنیادی طور پر تو رچرڈ اپنی بیوہ بہن کی شادی عادل کے ساتھ کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے مذہب تبدیل کرنے سے انکار پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شرر نے اپنے ناول میں ورجینا کو شاہ رچرڈ کی بھانجی قرار دیا ہے:

''یہاں یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رچرڈ نے اپنی بھانجی نہیں بھتیجی کا رشتہ پیش کیا تھا جس سے بقول ابن شداد صلاح الدین نے انکار کر دیا تھا۔ شرر کے ماخذ انگریز مورخین ہیں اور انگریزی میں بھانجی اور بھتیجی کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے اس لئے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ رچرڈ نے اس دوسری پیش کش کے لئے یہ جواز نکالا تھا کہ اسکی بھتیجی چونکہ کنواری ہے اس لئے اس کی شادی کے

---

[1] شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ: ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ص ۵۵۔

[2] ایضاً ص ۵۶۔

سلسلے میں وہ خود مختار ہے جبکہ بیوہ بہن کے لئے وہ پوپ کی اجازت کا محتاج ہے۔"[۱]

اس طرح ایک اور تصرف عکہ کے اس معرکہ کا ہے جس میں شرر نے عیسائی مقتولین کی تعداد ساٹھ ہزار اور مسلمان شہداء کی تعداد پندرہ ہزار بتائی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی بھی ایک معرکے میں اتنی اموات نہیں ہوئیں البتہ عکہ کے تمام معرکوں میں کل مرنے والوں کی تعداد اتنی ہو سکتی ہے جو ایک ہی معرکے میں بیان ہوئی یہ تصرف جنگ کی کیفیت کے بیان اور گھمسان پڑنے کی بنا پر قارئین کو محظوظ کرنے کے لئے رقم کیا گیا ہوگا اس طرح کی بہت سی زمانی تاریخی کارفرمائیوں کی بدولت کچھ خامی موجود ہے لیکن یہ حقیقت ضرور ہے کہ کسی بھی واقعہ کی بنا کو کہانی کا روپ دیا گیا یہ الگ بات ہے کہ رائی کا پہاڑ بنایا گیا ہو اِن سب باتوں کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ناول کا پلاٹ نہایت دلچسپ اور مربوط ہے حالانکہ یہ بیس اقساط میں شائع ہوا تھا۔ شرر نے قدم قدم پر حیرت واستعجاب، امید و بیم، تجسس اور تذبذب کی کیفیتوں کو ابھارا ہے۔

فردوسِ بریں

شرر کا ناول فردوسِ بریں ایک شاہکار ناول ہے۔ جسکا قصہ رومانوی اور داستانوی ہے عشق ومحبت اور اس پر یقین کامل اس کا بنیادی حصہ ہے اس کہانی کا موضوع فرقہ باطنیہ کے عروج کا آخری دور ہے۔ ان کا ظلم وستم اور استیصال دکھایا گیا ہے۔ کہانی کے اصل کردار حسین اور زمرد ہیں جو شہر آمل کے رہنے والے ہیں اور قزوین پہنچ کر عقد کرلیں گے۔ دوران سفر زمرد اپنے مقتول بھائی موسیٰ کی قبر پر فاتحہ خوانی کرنا چاہتی ہے جسے پریوں نے قتل کیا تھا۔ موسیٰ کے ساتھیوں نے جبال طالقان میں اسکی قبر بنادی تھی اس مقام پہ یہ دونوں فاتحہ خوانی میں مصروف تھے کہ اچانک پریوں کا ایک غول آموجود ہوا۔ دونوں بے ہوش ہو گئے جب حسین کو ہوش آیا تو زمرد کو وہاں نہ پایا۔ البتہ موسیٰ کے ساتھ زمرد کی قبر کا کتبہ بھی نظر پڑا، طے کیا کہ کہیں نہیں جائے گا قبر کا مجاور بن کے اس زندگی سے گزر کر قبر میں موجود والی کی زندگی میں پہنچ جائے گا اسی عالم میں اسے زمرد کے خطوط ملتے ہیں جس میں وہ چاقہ کاٹنے کا مشورہ دیتی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر حسین باطنیوں کی جنت میں زمرد سے ملاقات کرلیتا ہے مگر دوسری ملاقات نہیں ہوپاتی اور پھر وہ زمرد کے خط کی تعمیل میں تاتاریوں کی شہزادی بلغان کے پاس جاتا ہے جسکے تعاون اور ہلاکو خان کی فوجی مدد کے طفیل باطنیوں کی جنت پر پہنچ جاتا ہے اور یوں حسین اور زمرد کی شادی ہوجاتی ہے۔

اگر فردوس بریں کی کہانی کا تحقیقی جائزہ لیا جائے تو ابتدا ہی سے بعض صداقتیں سامنے آتی ہیں مثلاً جس سڑک کا ذکر ہے، موجود تھی، اور جن پہاڑوں، سبزہ زاروں اور برفانی چوٹیوں کا تذکرہ ہے وہ بالکل حقیقی ہیں یعنی جغرافیائی اعتبار سے موسموں اور علاقوں کا تعین بالکل حقیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے یہ الگ بات کہ آمل سے ارض مقدس جانے کے لئے دیگر دو راستے بھی تھے۔ مگر شرر کا مرقوم راستہ سب سے قریبی تھا:

---

[۱] شرر کے تاریخی ناول العزیز مآثر کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ از ڈاکٹر محمد ممتاز منگلوری ص ۹۰۔

''دوسرے باب میں شرؔر نے کوہ البرز کی گھاٹی سے شہر تبریز اور کوہ جودی تک حسین کے سفر کا جو راستہ اور وقت بیان کیا ہے وہ جغرافیائی نقطۂ نظر سے اور مسافت کے اعتبار سے درست ہے۔''[1]

جبکہ جبرون میں حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ اور اُن کی ازواج کی قبروں کی جو منظر کشی کی ہے اور جہاں حسین کو ان انبیاء کے جسد خاکی کے درمیان چلّہ کرتے پیش کیا ہے یہ تخیل چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں دوران تعمیر مرمت کرنے والے اور بعض محافظین کے اِن جسد خاکی کو دیکھ لینے کے پیش نظر ہوسکتا ہے لیکن زمانی اعتبار سے یہ غلط ہے کیونکہ چھٹی صدی کے پہلے نصف کے بعد اِن اجساد خاکی کو دیکھنے کا کوئی ثبوت موجود نہیں جبکہ شرؔر کا کردار حسین ۶۵۴ھ میں اِن مقامات پر پہنچتا ہے۔

حسن بن صباح کی جنت اور جنت میں حسین اور زمرد کی موجودگی اور اس جنت کی پُرکشش اور دلفریب منظر آرائی حقیقت سے قریب تر ہے کیونکہ مارکو پولو اور پیٹرولی نے اپنی تحریروں میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے کہ کس طرح فدائین کو حشیش پلا کر نشے میں مبہوت کر کے جنت میں پہنچایا جاتا اور پھر شیخ الجبال کے دربار میں پیش کیا جاتا اور یوں وہ فدائی خطرناک سے خطرناک کام کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے جسکے عوض اس جنت میں اس کا قیام یقینی بتایا جاتا تھا۔

قلعہ الموت کی مسماری اور فتح کی منظر کشی میں شرؔر نے ڈرامائی انداز سے کام لیا ہے حقیقت میں ہلاکو خان نے ایک طویل اور صبر آزما کیفیت سے دوچار ہونے کے بعد قلعہ الموت پر قبضہ کیا اور اس میں موجود فدائین کو تین روز کی مہلت دی جسکے بعد اس قلعہ کو مسمار کر دیا گیا۔

''ایک امر یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ زمرد (آٹھویں باب میں) حسین سے جب اپنی روداد الم بیان کرتی ہے تو بتاتی ہے کہ جب وہ وہاں لائی گئی تھی تو رکن الدین خورشاہ کے سامنے پیش کی گئی، گویا ۶۵۱ھ میں خورشاہ فرمانروائے الموت تھا۔ ساڑھے تین برس بعد جب حسین فردوس بریں میں پہنچا تو بھی رکن الدین خورشاہ ہی بادشاہ تھا اور پھر اس کے ڈیڑھ برس بعد جب تاتاری لشکر الموت پر حملہ آور ہوا تو بھی خورشاہ ہی بادشاہ تھا اس اعتبار سے تاریخی واقعات پر گرفت ڈھیلی نظر آتی ہے اور پلاٹ میں بنیادی تاریخی نقص پیدا ہو گیا ہے کیونکہ رکن الدین خورشاہ بمشکل ایک برس الموت کا فرمانروا رہا وہ شوال ۶۵۳ھ میں اپنے باپ علاؤالدین کی موت پر سربراہ بنا اور شوال ۶۵۴ھ میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں اس کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔''[2]

ان تاریخی حقائق سے بعض تخیلاتی کارفرمائیوں کے ساتھ ساتھ زمانی تصرف کا بھی اظہار ہوتا ہے لیکن ناول کی دلچسپی اور قارئین میں ذوق وشوق برقرار رکھنے کے لئے ناول نگار کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہوتا۔

اب ہم اس ناول کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس کا پلاٹ نہایت منظم اور مربوط نظر آتا ہے۔ شرؔر نے نہایت چابکدستی سے کہانی کے ربط کو پیش کیا ہے۔ کہانی کے آغاز سے ایک تجسس پایا جاتا ہے جو قاری کے لئے ناول کی اگلی سطور کو پڑھنے کا باعث بنتا

---

[1] شرر کے تاریخی ناول اور اُن کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ؛ ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ص ۱۱۰۔

[2] ایضاً، ص ۱۳۹۔

ہے ممتاز منگلوری نے لکھا ہے:

''فردوسِ بریں کا پلاٹ اس قدر مربوط، منظّم، چست اور دلکش ہے کہ شررؔ کے فن کو کمتر سمجھنے والے نقاد بھی اس پلاٹ کی فنی عظمت اور اِن کے سلیقے کے معترف ہیں۔ شروع سے آخر تک اس پلاٹ میں تجسس اور شوق کا یہ عالم ہے کہ قاری مکمل طور پر ناول نگار کی گرفت میں رہتا ہے۔ ہر واقعے کا دوسرے واقعے سے گہرا منطقی ربط موجود ہے اور سارے پلاٹ کا تانا بانا بڑی ہنرمندی سے تیار کیا گیا ہے پلاٹ میں تعمیر کا حسن بھی ہے جزئیات کی غیرضروری بھرمار اور تکرار سے اجتناب بھی۔''[۱]

جبکہ کردار نگاری بھی مکمل ہے۔ حسین میں جو انسانی اوصاف پائے جاتے ہیں وہی اسکی شخصیت کے ارتقاء میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی زمرد سے بےلوث محبت لیکن ڈرپوک اور خوفزدہ ہونا آگے چل کر ناول میں درست ثابت ہوتے ہیں۔ علی وجودی کا کردار جو چالاکی اور عیاری کے ساتھ ساتھ سفاکی کا بھی نمونہ ہے ناول کے آخر تک اپنی اسی کیفیت پر قائم رہتا ہے اس تمام تناظر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شررؔ اپنے ناول نگاری کے سفر میں اس ناول تک آتے آتے ایک پختہ کار اور کامیاب فن کار بن چکے تھے۔

فتح اندلس

مولانا عبدالحلیم شررؔ کا ناول فتح اندلس ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا یہ ناول تاریخ اسلام کے اس عظیم الشان دور کے ابتدائی حصے کا احاطہ کرتا ہے جو یورپ اور بالخصوص اسپین میں مسلمانوں کی آمد کا باعث بنا۔ آبنائے جبرالٹر کے دوسری جانب جولین نامی سردار کی حکومت تھی جو دو مرتبہ مسلمان حملہ آوروں کو شکست دے چکا تھا لیکن اسکے ایک ساتھی نے مسلمانوں کی پیش قدمی کی بابت اسے مطلع کیا تو وہ اس حملے کو بظاہر خاطر میں نہ لایا مگر اپنی بیٹی فلورنڈا کو طلیطلہ بھیج دیا۔ مسلمان ایک جانب موسیٰ بن نصیر کی قیادت میں اور دوسری جانب عیسیٰ کی زیرسرپرستی جولین کے علاقے کا محاصرہ کرتے ہیں جولین معاہدہ کر لیتا ہے اور مسلمان فوج کو اسپین پر حملہ آور ہونے میں اپنی مدد کا یقین دلاتا ہے جسکی وجہ راڈرک کا فلورنڈا اور مریم کے ساتھ سلوک تھا۔ موسیٰ خلیفہ سے حملے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ ابتدائی حکمت عملی کے بعد طارق بن زیاد اپنی فوجوں کے ہمراہ موسیٰ کی فوجوں سے آملتا ہے۔ ایک گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ تقریباً تیس ہزار عیسائی فوجی قتل ہوتے ہیں۔ مسلمان فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اسی دوران فلورنڈا اور عیسیٰ کے درمیان محبت کا رشتہ ناپائیداری کی بنا پر ٹوٹ جاتا ہے اور عیسیٰ کا نکاح مریم سے ہو جاتا ہے اسی دوران خلافت تبدیل ہوتی ہے۔ طارق، قتیبہ اور محمد بن قاسم معزول کر کے دربارِ خلافت میں طلب کیے جاتے ہیں عیسیٰ اور مریم شاہی مہمانوں کی حیثیت سے دمشق پہنچتے ہیں وہاں سے دونوں مکہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ اسلامی اقدار اور روایات سے متاثر ہو کر مریم اسلام قبول کر لیتی ہے۔ واپسی پر دربارِ خلافت سے مریم کے باپ کو اسپین کی اہم ترین شخصیت اور جولین کو دوسرے درجہ کی شخصیت کا فرمان نامہ لے کر یہ دونوں اسپین کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔

اگر ہم تحقیقی اعتبار سے ''فتح اندلس'' کا جائزہ لیں تو اکثر واقعات سچے اور حقیقت کے قریب تر معلوم ہوتے ہیں۔ سوائے

---

[۱] شررؔ کے تاریخی ناول اور اُن کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ: ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ص ۳۸۵۔

مسلمانوں کے حملے کے پیشِ نظر فلورنڈا کا راڈرک کے محل میں جانا یا موسیٰ کا اپنی حیثیت میں حملہ آور ہونا ممتاز منگلوری رقمطراز ہیں:

''اخبار اندلس کے اس اقتباس اور دیگر کتبِ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شررؔ نے چوتھے باب تک بیان کردہ واقعات میں یہ تصرف کیا ہے کہ موسیٰ بن نصیر کا دارالامارت قیروان کی بجائے طنجہ بیان کیا ہے۔ عیسیٰ بن مزاحم کو موسیٰ کی کمک پر آتا دکھایا ہے اور جولین نے نہ چاہنے کے باوجود موسیٰ کے خوف سے فلورنڈا کو مجبوراً راڈرک کے پاس بھیجا۔ فلورنڈا کے روانہ ہو جانے کے بعد جلد ہی موسیٰ بن نصیر نے سبتہ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے کے دوران ہی جولین کو راڈرک کے ہاتھوں فلورنڈا کے رسوا ہو جانے کی خبر ملی اور اس نے موسیٰ سے صلح کر لی جسکے بعد فلورنڈا واپس سبتہ پہنچ گئی۔ تاریخی حقائق کے مطابق فلورنڈا سلطنت کے دستور کے مطابق راڈرک کے پاس تھی، اس پر راڈرک کی دست درازی کی خبر سن کر جولین خود طلیطلہ گیا اور بہانے سے فلورنڈا کو اپنے ساتھ لے آیا اس کے بعد وہ موسیٰ سے ملنے کے لئے ایک وفد کے ہمراہ قیروان گیا، حالانکہ سبتہ سے طنجہ قریب تھا اور وہاں موسیٰ کی طرف سے طارق بن زیاد حاکم تھا، لیکن جولین نے براہِ راست موسیٰ سے تبادلۂ خیال کرنے کے لئے قیروان کا رخ کیا اس وضاحت کے بعد تیسرے باب میں بیان کردہ محاصرے کے واقعات اور جنگی تفصیلات کی بحث کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ وہ سب شررؔ کے تخیل کی مرہونِ منت ہیں۔''[۱]

عیسیٰ کی فلورنڈا سے محبت ایک تخیل ہے اور یہ انداز شررؔ کے کم و بیش ہر ناول میں پایا جاتا ہے کہ ایک غیر مسلم دوشیزہ کسی مسلمان جرنیل سے محبت کرتی ہے یا اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ناول میں موسیٰ کو جولین کے علاقے کے محاصرے کی کیفیت میں دکھایا گیا ہے، حالانکہ جولین نے قیروان جا کر موسیٰ کو اسپین پر حملہ کرنے کی دعوت کے ساتھ اس کے حلیف کی حیثیت سے ساتھی بننے پر بھی رضامندی ظاہر کی تھی۔

بعد ازاں طارق بن زیاد بھی جبرالٹر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ موجود فوج کی تعداد شررؔ کے بیان اور اکثر تاریخی واقعات کے مطابق درست معلوم ہوتی ہے جبکہ کشتیوں کو آگ لگا دینا اور آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھ کر جنگ میں فتح کی بشارت والا معاملہ بھی اکثر تواریخ میں ملتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ زمانی اعتبار سے کچھ فرق موجود ہے اسی طرح مسلمانوں کے مقابلے میں راڈرک کی فوج کا شکست سے دوچار ہونا اور راڈرک کا فرار ہونا اور یہ قیاس کہ وہ ڈوب گیا تھا حقیقت کے عین مطابق ہے اسی طرح قلعہ قلطرادہ کے محاصرے میں مسلمانوں کو یہ دھوکہ دینا کہ قلعے میں چالیس پچاس ہزار فوج ہے حالانکہ صرف عورتیں، بچے اور غلام تھے جنھیں خود اور زرہ پہنا کر فصیلوں پر کھڑا کیا گیا۔ مسلمانوں نے اس حقیقت کا علم ہونے کے بعد بھی اس معاہدے کا پاس کیا حالانکہ یہ قلعہ مسلمانوں کے لئے وبالِ جان بنا رہا۔ ناول کے ہیرو عیسیٰ بن مزاحم اور ہیروئین مریم کا کردار اور ان سے منسوب واقعات مکمل طور پر تصرف کی پیداوار ہیں اور شاید ناول کا سب سے کمزور پہلو انہی دونوں کرداروں کی موجودگی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

شررؔ کے ناول فتح اندلس کا تنقیدی پہلو سے جائزہ لیں تو اس کا پلاٹ ابتدا تجسس اور قاری کے لئے دلچسپی سے بھرپور ہے لیکن

---

[۱] شررؔ کے تاریخی ناول اور اُن کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ: ڈاکٹر ممتاز منگلوری ص ۱۸۳، ۱۸۴۔

آگے چل کر جب عیسیٰ اور مریم کی شادی ہو جاتی ہے تو قاری کے لئے دلچسپی کا سامان نہیں رہتا لیکن شرر اپنے مربوط واقعات کو پیش کرنے کے لئے اسے بلا وجہ طول دیتے ہیں جسکی وجہ سے پلاٹ کی یہ خامی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ کردار نگاری کے حوالے سے شرر خاصے کامیاب نظر آتے ہیں جبکہ منظر کشی، روایتی انداز میں اور قاری کی دلچسپی کے مد نظر معقول ہے۔

ہم اس مضمون کی ابتدا میں تحریر کر چکے ہیں کہ ناول معاشرتی ضرورتوں کے پیش نظر بھی لکھے جاتے ہیں اور پھر ہم نے جس سیاسی و معاشرتی نظام کا خاکہ اپنے قارئین کے لئے پیش کیا کہ مسلمان ہندوستان میں مقتدر قوت تھے گوکہ مسلمانوں کا آبادی میں تناسب اقلیت کے برابر تھا لیکن جب بیرونی ملکوں سے آنے والے بحری بیڑے تجارت کے بہانے ساحلوں پر لنگر انداز ہوئے تو انھوں نے تجارتی کمپنیوں کے روپ میں فوجی قلعے تعمیر کئے اور پھر اس منافع بخش تجارت کو اپنا لیا جو ملک پر قبضے کی صورت میں تھی دوسری جانب برطانیہ ہندوستان کے علاوہ تقریباً آدھی دنیا پر قابض تھا۔ روس اور جرمنی بھی فاتح کی حیثیت سے پر تول رہے تھے۔ ہندوستان کے مسلمان سیاسی، معاشرتی اور معاشی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی بھی میں مبتلا ہو چکے تھے حمیت سو چکی تھی لیکن اسی دور میں ہندوستانی قلمکاروں نے اپنی قوم کو خواب غفلت سے جگانے اور اس میں عزم و حوصلہ اور امنگ و ولولہ پیدا کرنے کے لئے ایک تحریک چلائی۔ ادیبوں کا ایک گروہ شاعری کے ذریعے تو دوسرا نثر کے سہارے دلوں میں اتر جانا چاہتا تھا اور اس نئے سفر کی داغ بیل ڈالنے کے لئے کوشاں تھا جو برطانیہ کے ہندوستان چھوڑ دینے کا باعث بنے یہ الگ بات ہے کہ ہمارے بہت سے ادیبوں کے سامنے منزل موجود نہ تھی) مگر وہ حریت اور یگانگت کا سبق دے کر قوم کو ساتھ چلنے کے لئے آمادہ کر رہے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی تاریخ اسلام کے گہرے مطالعے کے بعد ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جو جذبۂ جہاد اور طاقتور کے خلاف ڈٹ جانے کا حوصلہ دیتے تھے تعداد اور قوت کی کمی ان کے آڑے نہ آتی تھی ہاں البتہ جذبۂ جہاد اور ایمان کی پختگی لازمی شرط تھی یہ اعتراض کہ تاریخی ناول اور وہ بھی اسلامی تاریخی ناول کا موضوع اختیار کرنا کوئی شجرِ ممنوعہ نہیں کیونکہ ہمارے یہاں ناول انگریزی ادب سے آیا تھا اور وہاں والٹر اسکاٹ تاریخی ناول نگار کے حوالے سے اپنی حیثیت مُسلّم کروا چکے تھے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شرر نے اس وقت کی ضرورت کے پیشِ نظر جس تخیل کا استعمال کیا اور جس تصرف کو کارفرما رکھا وہ درست تھا اور آج بھی کسی ایسی ضرورت کے پیشِ نظر تاریخی ناول نگار کے لئے اس قسم کے تخیل اور تصرف کی گنجائش موجود ہے۔

دوسرا باب
نسیم حجازی۔ تشکیلی دور

نسیم حجازی۔ خاندانی پس منظر

والدین:

کسی انسان کے بارے میں جاننے کے لیے اس کے خاندانی حالات یعنی حسب ونسب کا جاننا ساتھ ہی اس معاشرے کے بارے میں جاننا جہاں اس کی ولادت ہوئی ہو اور اوائل عمری کا دور اس نے گزارا ہو اس کے علاوہ اس علاقے کے جغرافیائی اور موسمی حالات سے واقفیت اور وہاں کے رہنے والوں کی تہذیبی روایات اور رسم ورواج سے آشنائی ضروری ہوتی ہے کیونکہ انسانی شخصیت کی تعمیر وترقی میں ان تمام کا بڑا حصہ ہے اس کے علاوہ اس کا مذہبی تشخص بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ حسب ونسب کی اہمیت اسلام میں بظاہر لوگوں میں پہچان کی وجہ سے رکھی گئی ہے اس کا مقصد ہرگز کسی گروہ کو کسی پر فوقیت دینے کے حوالے سے نہیں ہے مختلف نام ونسب کے مالک خاندان الگ الگ قسم کے کاموں اور معاشرے میں اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے اپنی اہمیت واضح کرتے ہیں یہی اجتماعی رویہ معاشرے کی ترقی میں معاون اور مددگار ہوتا ہے اس کے باوجود ہر فرد کو اپنے آباء واجداد کے بارے میں جاننا اور ان کے حسب ونسب سے واقفیت رکھنا چاہیے نسیم حجازی آرائیوں کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے جس کے مختلف افراد مختلف قسم کے کاموں میں زندگی گزار رہے تھے یوں تو آرائیوں کا پیشہ کاشتکاری ہے اور زمین سے ان کی محبت کے بہت سے افسانوی قصے بھی مشہور ہیں مگر ان کے والد چوہدری محمد ابراہیم زراعت کے شعبے میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنے کے بجائے محکمہ انہار میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہو گئے ان کے پہلے بیٹے محمد شریف (نسیم حجازی) کی ولادت ۱۹ مئی ۱۹۱۴ء کو ہوئی۔[1] جب نسیم حجازی کو اسکول میں داخل کروایا گیا تو ان کے عربی کے استاد نے ان کے نام کے ساتھ حجازی لکھ دیا اور انہیں بتایا کہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ آرائیں حجاز سے آئے تھے اس سلسلے میں چوہدری غلام رضا نے تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ:

''آرائیں قوم پشت بہ پشت آغاز ہی سے اپنے آپ کے متعلق عربی النسل ہونے کا دعویٰ کرتی چلی آئی ہے اور آرائیں محققین نے اس کے متعلق کتابیں بھی لکھی ہیں۔

مثال کے طور پر مولوی محمد ابراہیم کرنالی نے ۱۹۰۳ء میں ایک کتاب ''تفریح الاخوان در ثبوت اہل عرب بودن قوم رائیاں'' لکھی جس میں انہوں نے واضح کیا کہ آرائیں اہل عرب ہیں صوفی محمد اکبر علی نے مشہور ومعروف کتاب ''سلیم التواریخ'' ۱۹۱۹ء میں لکھی جس میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ آرائیں عربی النسل ہیں اور شیخ سلیم الراعی کی اولاد سے ہیں اور عمادالدین محمد بن قاسم کے ساتھ

---

[1] میں نے ذاتی طور پر انٹرویو میں نسیم حجازی صاحب سے تاریخ ولادت پوچھی تو انہوں نے یہی بتائی تھی ڈاکٹر تصدق راجا نے بھی اپنی کتاب نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ میں صفحہ نمبر ۲۱ پر یہی تاریخ لکھی ہے۔

سندھ میں وارد ہوئے۔منشی محمد ابراہیم محشر انبالوی نے ۱۹۲۲ء میں ایک کتاب بنام ''آل ذورعین'' لکھی جس میں انہوں نے ثابت کیا کہ آرائیں قحطانی عرب ہیں اور پریم ذورعین کی اولاد سے ہیں۔اسی طرح مؤرخ اسلام مولانا اکبرشاہ خان نجیب آبادی نے اپنی کتاب ''آئینہ حقیقت نما'' میں آرائیں قوم کی تاریخ کی نشاندہی کی اور یہ دعویٰ کیا کہ آرائیں محمد بن قاسم کے ساتھ اریحا(شام) سے آئے اور پہلے یہ اریحائی کہلاتے تھے اور بعد میں آرائیں بن گئے۔''[۱]

اس روایت کے باوجود یہ مسئلہ اپنی جگہ برقرار رہتا ہے کہ شام سے آنے والے لوگ تو آرائیں ہو گئے لیکن حجازی کیونکر ہوئے اس کا جواب بھی چودھری غلام رضا نے یوں دیا:

''آرائیوں کا سرفخر سے بلند ہے کیونکہ وہ

۱۔ سابقون الاولون کی اولاد ہیں

۲۔ (غلامان نبی اکرم حضرت محمد ﷺ) حضرت یسارالراعی اسلم اسودالراعی کی اولاد ہیں

۳۔ شہید احد حضرت یسارالراعی کی اولاد ہیں

۴۔ مہاجرین حبشہ کی اولاد ہیں

۵۔ فاتح قلعہ نطاۃ(خیبر) حضرت اسلم اسودالراعی کی اولاد ہیں

۶۔ فاتح سندھ عمادالدین محمد بن قاسم کے ہمراہیوں کی اولاد ہیں۔''[۲]

اس رائے کے مطابق آرائیں نسلی طور پر حجاز سے تعلق رکھتے ہیں ان کے آباءواجداد مجاہدین اسلام کے ساتھ ہندوستان کی زمین پر آئے اور یہیں بس رہے۔اس لیے علی اصغر چوہدری رقمطراز ہیں:

''اریحا میں آباد ہونے والے حجازی بزرگوں کی یاد میں حجازی بھی لکھتے ہیں۔جیسے پاکستان کے مشہور ناول نگار جناب نسیم حجازی صاحب۔''[۳]

خود نسیم حجازی نے بھی انٹرویو دیتے ہوئے اس کی وضاحت یوں کی تھی:

''جب میں نے لکھنے کا آغاز کیا تھا تو ان دنوں میں سرجان پور ''ضلع گورداسپور'' میں رہتا تھا اور وہاں کے مولوی غلام مصطفیٰ سے اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی۔ایک روز وہ بولے کہ تمھیں پڑھنے لکھنے کا شوق تو ہے لیکن تم اپنا تخلص نہیں کرتے،اس وقت میں محمد شریف ہی لکھا کرتا تھا۔میں نے ان سے پوچھا کہ کیا نام رکھوں،تو وہ کہنے لگے کہ تم سرزمین حجاز سے تعلق رکھتے ہو،اس لیے سرزمین حجاز سے ہی کوئی نہ کوئی تخلص رکھ لو۔لہٰذا میں نے اس بات پر غور کیا اور محمد شریف کی بجائے ''نسیم حجازی'' لکھنا شروع کر دیا جو بعد میں

۱۔ آرائیں:چودھری غلام رضا،ص ۱۳،۱۴۔

۲۔ آرائیں:چوہدری غلام رضا،ص ب۔

۳۔ تاریخ آرائیاں:علی اصغر چوہدری،ص ۱۹۲۔

میری پہچان بن گیا۔''[۱]

یہاں ایک مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ آرائیں حجازی ہی کیوں تسلیم کیے جائیں ہندوؤں سے ان کا تعلق تھا یا نہیں اس کی وضاحت بڑی تفصیل سے علی اصغر چوہدری یوں کرتے ہیں:

''اگر ہندو رائی ہیں اور مسلمان آرائیں تو یہ کہاں کی شرافت ہے کہ خواہ مخواہ دونوں کو ایک ہی قوم کے افراد قرار دے دیا جائے؟

۱۔ دکن میں برہمنی سلطنت بہت مشہور تھی جس کا پایہ تخت گلبرگہ گولکنڈہ کے قریب تھا بہمنی یا برہمنی کے نام سے ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ برہمنوں کا خاندان ہوگا۔ مگر تمام مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ وہ خاندان افغان تھا اور اس نام کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ظفر خان افغان اصل میں گنگو نامی ایک برہمن کا غلام تھا۔ گنگو اس پر بڑی مہربانی کرتا تھا اور اس نے پیش گوئی کی تھی کہ تو بڑا صاحب نصیب ہوگا۔ غرض جب ظفر خان نے عروج پکڑا تو اس نے اپنے مہربان آقا کی یاد میں اپنا لقب سلطان علاؤالدین گنگو بہمنی رکھا اور اسی وجہ سے اس کا خاندان تاریخ کی کتابوں میں برہمنی یا بہمنی کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۵۲۶ء میں ڈیڑھ سو برس کی اس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

۲۔ شیر شاہ افغان شاہِ ہند سوری تھا مگر کرتار پور ضلع جالندھر میں کھتریوں کا ایک خاندان سُوری کہلاتا تھا۔ ماہوار رسالہ 'جوگی' لاہور (پاکستان سے پہلے) کا ایڈیٹر صوفی لچھمن پرشاد تھا اور سلیم التواریخ کے مصنف صوفی محمد اکبر جالندھری تھے۔

۳۔ پٹھان اکثر لودھی بھی ہیں اور گوجرانوالہ کے علاقہ میں بھاٹوں کے ایک گوت بھی لودھی ہے اور سی۔ پی میں لودھی ہندو قوم بھی ہے۔

۴۔ ۱۸۸۱ء والی مردم شماری کی رپورٹ میں علاقہ راولپنڈی کے کئی مغلوں نے اپنی گوت سینی لکھوائی تھی اور سینی ضلع ہوشیار پور میں ایک ہندو زمیندار قوم بھی ہے۔ اکثر سکھ بھی سینی ہیں اور بقول لارڈ ڈینیل البسٹن ان کا مغلوں سے کچھ بھی واسطہ نہیں۔''[۲]

تمام تر تفصیلی بحث کے بعد یہ بات طے ہوئی کہ نسیم حجازی کے آباؤ اجداد حجاز کے رہنے والے تھے اس لیے ان کا اپنے نام کے ساتھ حجازی لکھنا اپنے پُرکھوں کی نسبت سے درست ہے لیکن شخصیت سازی کے لیے بے بس ہونا یا قدرت پر تکیہ کر کے بیٹھ رہنا مناسب نہیں یہ انداز فرسودہ اور پُرانا ہے لیکن بعض حضرات اس کو آج بھی قبول کرتے ہیں اور اپنی قسمت پر شاکر ہیں۔ ان میں نہ آگے بڑھنے کی امنگ ہے اور نہ کسی کوشش کا جذبہ موجود ہے۔ جدید دور میں شخصیت کوئی قدرت کا عطیہ نہیں کہی جا سکتی شخصیت تمام فطری و اکتسابی رجحانات اور صلاحیتوں کی متوازن تنظیم کا نام ہے جو فرد کی کوشش اور ماحول کے اثرات کے تحت بنتی ہے یعنی فرد کی جسمانی، ذہنی، جذباتی اور معاشرتی صلاحیتوں کی بہتر متوازن نشوونما کو اچھی شخصیت کا نام دیا جاتا ہے۔ کسی انسان کی شخصیت کی تعمیر میں اس کی معاشرتی اقدار کا احساس ہے اور معاشرتی تقاضوں کے تحت اپنی زندگی بسر کر رہا ہے تو اس کی شخصیت مؤثر کہی جا سکتی ہے ساتھ ہی خاندان سے ملنے والی

۱۔ روزنامہ پاکستان لاہور ادبی ایڈیشن، نوید انور، پرویز ملک۔

۲۔ تاریخ آرائیاں، علی اصغر چودھری، ص ۱۶۳۔

نسلی خصوصیات مثلاً جسمانی قد و قامت، چہرے کی ساخت اور نقوش کا ابھرا یا تیکھا پن، آنکھوں کی رنگت اور بالوں کا انداز لیکن شخصیت کی تعمیر ماحول کے اثرات کی محتاج بھی ہے کیونکہ دولت، ثروت، تعلیم، اچھے وسائل، معاشی بہتری، بہتر کتب خانے، اچھی کتابیں، بہتر تعلیمی ادارے اور سہولتیں وغیرہ یعنی اگر ماحول بہتر ہے تو شخصیت بھی بہتر ہوگی اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ فرد کی شخصیت اور زندگی پر تمام خارجی عناصر اثر انداز ہوتے ہیں مثلاً آب و ہوا، معاشی و اقتصادی حالت، ملکی سیاسی اثرات، خاندان اور ثقافت وغیرہ ہمارا موضوع نسیم حجازی کی شخصیت سازی میں کارفرما عناصر کا مطالعہ ہے ساتھ ہی خاندانی پس منظر کا احاطہ بھی کر رہے ہیں یہ تمام سطور اس خاندانی پس منظر کے سیاق و سباق میں لکھی جا رہی ہیں جہاں دیگر امور زیر بحث ہیں وہیں اس عہد کے سیاسی حالات بھی متاثر کن ہیں کیونکہ یہ زمانہ پہلی جنگ عظیم سے شروع ہوتا ہے جس کے دوران بعض بڑی طاقتیں چھوٹی ہوگئیں بعض نظریہ کی بنیاد پر مستحکم ہوئیں۔ گراں خواب چینی سنبھلنے لگے تو برصغیر کے غلام آزادی کے لیے بر قراری دکھانے لگے۔

اب اگر ہم ان شخصیات کا تذکرہ کریں جن کے کردار، قول و عمل اور شبانہ روز محنت کے نتیجے میں نسیم حجازی کی شخصیت نکھری اور سنوری تو سب سے پہلے چوہدری ابراہیم ہمارے سامنے آئیں گے یہ بزرگ اپنے خاندانی مزاج اور برادری کی روایات کے برعکس محکمہ انہار میں ملازمت کرتے تھے اپنی ملازمت کی ضروریات کے پیش نظر اکثر و بیشتر اپنے گھر سے دور رہتے تھے شریف النفس روایتی مذہبی انسان تھے سادگی اور بے تکلفی ان کے مزاج میں شامل تھی کوئی خاص سیاسی شعور اور نقطہ نظر ان کے ذہن میں نہ تھا البتہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتے تھے پہلی بیوی عمر بی بی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی ان کے یہاں پہلی بیوی سے چھ اولادیں تھیں جن میں نسیم حجازی سب سے بڑے ان کے بعد محمد یعقوب، عبدالحکیم، فاطمہ، عمر بی بی اور لطیفہ بی بی شامل ہیں جبکہ دوسری بیوی سے بھی ایک بیٹی محمودہ کی ولادت ہوئی انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیمی ضروریات کا خاص خیال رکھا یہی وجہ ہے کہ نسیم حجازی کو اوائل عمری میں اپنے گاؤں سے ڈیڑھ میل دور ایک اسکول میں داخل کروا دیا گیا دیگر بچوں کی تعلیمی ضروریات کے سلسلے میں محمد ابراہیم صاحب کی مدد ان کے بڑے فرزند محمد شریف نے کی البتہ بعض امور ان کی خواہش کے مطابق پورے نہ ہو سکے مثلاً یہ کہ چوہدری صاحب اپنے بڑے بیٹے کو فوج میں بھرتی کروانا چاہتے تھے لیکن بیٹا فوج سے اور سرکاری ملازمت سے دور بھاگتا تھا اور یہ وجہ ہے کہ نسیم حجازی نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بحیثیت صحافی اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا مگر ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی جذباتیت اور بے باکی مصلحت کے تقاضوں پر غالب آئی اور انہیں وقتی طور پر صحافت کو خیرباد کہنا پڑا اور پھر جب انہیں اتالیقی اور صحافت دونوں ذمہ داریاں بیک وقت کوئٹہ لے گئیں تو وہاں قیام کے دوران ان کے اندر شعور کی گہرائیوں میں امانت اور دیانت کے جس شعور نے بیداری پائی وہ باپ اور بیٹے کے ذہنی فرق کو واضح کرتا ہے جب تجارت کے ایسے طریقے پر کہ جس میں تعلقات کے ذریعے فوائد حاصل کیے جا سکتے تھے ایک موقع آیا تو نسیم حجازی نے اپنے مزاج اور معیار کا عملی ثبوت فراہم کیا اس واقعہ کو ڈاکٹر تصدق راجا نے یوں بیان کیا ہے:

''بلوچستان میں قیام کے دوران ایک بار چوہدری ابراہیم کا اپنے بیٹے کے نام خط آیا کہ گورداسپور میں اچھے بیلوں کی کمی

ہے۔ بلوچستان سے بیلوں کی ایک دو جوڑیاں بھیج دو۔ بلوچستان سے بذریعہ ریل بیل بھیجنے کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا تھا مگر جمالی صاحب کو خبر ہوئی تو انہوں نے کہا کہ بیل ضرور جائیں گے۔ نسیم حجازی ایک انگریز اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ مسٹر برج (Mr. Bridge) کو جانتے تھے مگر اس سے مراسم صرف اس حد تک تھے کہ اسے اور اس کی بیگم کو اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کو دیا کرتے تھے۔ بیلوں کے لیے پرمٹ کی بات ہوئی تو مسٹر برج نے کہا دو ویگنیں بیلوں کی بک کروا دو لیکن ایسا اس لیے بہت مشکل تھا کہ ریلوے والے ۵۰۰/- روپے رشوت لیتے تھے، اول تو ان کے پاس اتنے روپے ہی نہ تھے اور اگر ہوتے بھی تو یہ دینے کے لیے رضامند نہ تھے۔ اس انگریز افسر کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور دوسرے ہی روز ایک ہندو اسٹیشن ماسٹر ہانپتا کانپتا نسیم حجازی کی تلاش میں آن پہنچا اور کہا ''صاحب! ہم نے کب انکار کیا ہے کہ ویگنیں بک نہیں کریں گے آپ ہمارے پاس تشریف تو لاتے اب بھگوان کے لیے فوراً کل دو ویگنیں بک کرائیے ورنہ میری نوکری خطرہ میں ہے۔'' چنانچہ بیلوں کی دو ویگنیں بک ہو گئیں اور اس تجارت میں نسیم حجازی نے ۱۷۵۰/- روپے منافع کمایا۔ اس دور میں یہ ایک خطیر رقم تھی۔ یہ درویش خدا مست جس نے روپے سے زندگی بھر کبھی پیار نہیں کیا اس رقم میں سے آدھے پیسے میر جعفر خان جمالی کے پاس لے آیا کہ انہیں کسی کارِ خیر میں لگا دیجیے جمالی بہت ہنسے اور کئی دوستوں سے ذکر کیا اور کہا ''لو بھئی! نسیم حجازی بہت بڑا آدمی بن گیا ہے، خیرات کے لیے اتنے روپے دے رہا ہے۔'' یہ روپے انہوں نے اپنے والد بزرگوار کو منی آرڈر کر دیے ایک بار پھر اسی پولیٹیکل ایجنٹ نے بیلوں کے لیے ایک بڑا پرمٹ دیا جس میں ایک محتاط اندازے کے مطابق چھ لاکھ روپے کے منافع کی توقع تھی۔۔۔ اس تجارت میں شراکت کے لیے کئی ہندو مہاجن آئے اور ایک عزیز بھی اس سلسلے میں تشریف لے آئے تھے۔

نسیم حجازی فرماتے ہیں: '' کہ چاندنی رات تھی اور صحن میں ایک چارپائی پر وہ بھاری بھرکم مہمان خراٹے لے رہا تھا اور دوسری چارپائی پر یہ خود سونے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ ان کے دل و دماغ میں ایک عجیب جنگ جاری تھی۔۔۔ اس جنگ کے فریقین میں ایک طرف مستقبل کا عظیم ناول نگار نسیم حجازی تھا اور دوسری طرف بیلوں کا تاجر محمد شریف جسے بیلوں کی اس تجارت میں پورے چھ لاکھ روپے کے منافع کی پوری امید تھی! اس رقم میں کئی کوٹھیاں بن سکتی تھیں اور زرعی زمین خرید کر ذیرا بننا نہایت آسان نظر آ رہا تھا۔

رات بھر نسیم حجازی اس کشمکش میں بستر پر کروٹیں بدلتے رہے کہ پھر فجر سے کچھ دیر پہلے وہ اٹھے، غسل خانہ میں جا کر غسل کیا اور بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہو کر بچوں کی طرح روئے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے! مالک و خالق سے راز و نیاز کے بعد چودہ ایسے ناولوں کا مصنف جو رہتی دنیا تک ورلڈ کلاسک (World Classic) کی حیثیت سے زندہ رہیں گے اور ان کا مصنف بھی زندہ رہے گا سو گیا۔۔۔ اس کے دل و دماغ کو وہی سکون میسر آ گیا تھا جو کافی دیر تک طوفانی لہروں سے لڑنے کے بعد اس کشتی کے مسافروں کو ملتا ہے جو ساحل پر پہنچ چکی ہو۔

سورج نکل آیا تھا میر جعفر خان جمالی نے نوکروں سے پوچھا کیا نسیم حجازی نے ناشتہ کر لیا ہے؟ اور پھر ناشتہ کی میز پر نسیم حجازی نے بتایا کہ "انہوں نے بیلوں کی تجارت کا ارادہ ترک کر دیا ہے تاہم وہ پولیٹیکل ایجنٹ سے ملنے جا رہے ہیں۔"[۱]

اس طرح نسیم حجازی نے اپنے ناولوں کے ذریعے جس شخصی خوبی کے کردار پیش کیے ہیں ان کی جھلک اپنی زندگی میں بھی دکھانے کی کوشش کی ہے ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والے پروگراموں کے سلسلے "کاروانِ آزادی کے راہ رو" میں انٹرویو دیتے ہوئے نسیم حجازی نے بتایا تھا کہ ان کے ناول "خاک اور خون" کے کردار سلیم کو ان کا آئیڈیل سمجھنا چاہیے اگر خاک اور خون کے کردار سلیم اور گمشدہ قافلے کے کردار یوسف پر یہ قیاس کیا جائے کہ ان میں نسیم حجازی کی شخصیت کا عکس موجود ہے تو ان کے والد کی شخصیت کا خاکہ کچھ اس طرح ترتیب پائے گا کہ متوسط گھرانے کے ایک فرد چوہدری محمد ابراہیم نے سرکاری محکمے میں ملازمت اختیار کی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی سوتیلی ماں کے ساتھ نسیم حجازی کا ذہنی ملاپ کبھی نہ ہو سکا جب کہ ان باپ بیٹوں میں بے حد محبت تھی اسلامی تعلیمات اور زندگی میں انہیں اختیار کرنے کے حوالے سے نسیم حجازی کا معیار اور مزاج خاصا سخت تھا وہ اپنے والد کی خوشیوں کا خیال تو رکھنا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے اپنی خواہشات کی قربانی دینے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے البتہ والد کو ان کی دوسری بیوی سے بدگمان کرنے کے بجائے اپنی سوتیلی ماں کو اصلاح کا موقع دینا چاہتے تھے میں نے جولائی ۱۹۹۲ء میں نسیم حجازی صاحب سے ملاقات کی تو اس زمانے میں وہ صاحبِ فراش تھے اپنی اہلیہ کا غم ان کے مسائل و تکالیف میں مزید اضافے کا باعث تھا اس کے باوجود انہوں نے مجھے اپنے دوستوں محمد شفیع اور لیاقت علی کے ہمراہ ملاقات کا شرف بخشا ہم نے اس موقع پر کئی تفصیلی ملاقاتوں میں تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا اس انٹرویو کے دوران میں نے بار ہا والد کے بارے میں جاننا چاہا تو محض اس جواب پر اکتفا کرتے رہے کہ شریف انسان، سچے مسلمان اور اچھے باپ تھے میرے خاصے استفسار کے باوجود ان کا کوئی واقعہ نہ بتایا۔

دوسری اہم شخصیت جس نے نسیم حجازی کی زندگی اور ان کی شخصیت کو بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا وہ ان کی والدہ محترمہ عمر بی بی تھیں انہوں نے بتایا کہ ان کی محبت و شفقت کے سایہ عاطفت میں محض چودہ پندرہ برس کی عمر گزارنا نصیب ہوئی تھی کہ قادرِ مطلق کے بلاوے نے جہاں انہیں جنت کی مسحور کن فضاؤں میں بلا لیا وہیں ان کی جدائی ہمارے لیے بہار کی رنگین فضاؤں میں چلنے والی اس آگ برساتی آندھی کی مانند ثابت ہوئی جس نے ہر پھول و بوٹے کو جھلسا کر دمکتی چمکتی دھوپ میں ہمیں بے سایہ کر دیا والد صاحب اپنی ملازمت کی وجہ سے مجبور تھے کہ گھر پر اس قدر توجہ نہ دے سکتے تھے کہ ہم چھ بہن بھائیوں کی پرورش کر سکیں مجبوراً عزیز و اقارب کے مشورے پر انہوں نے دوسری شادی کر لی سوتیلی ماں کا تصور اور رویہ اس خزاں رسیدہ گرم موسم میں آگ برساتی گرمی کی مانند زندگی کا ایک حصہ بن گیا اپنی ماں کو یاد کر کے ایک ٹھنڈی سانس لیتے اور آہ بھرتے تھے ان کی عظمت اور بڑائی کا اعتراف کرتے ہوئے کہنے لگے:

"میرے ننھیال اور گھر کے علاقے کے درمیان عام طور پر کھجور کا کوئی درخت نہیں اگتا مگر اس درمیان میں کھجور کا ایک درخت

---

[۱] نسیم حجازی ------ ایک مطالعہ؛ ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۲۴، ۲۶۔

اگا اور اس قدر طویل قامت ہوا کہ بس میں سفر کے دوران کئی میل دور سے نظر آنے لگتا تھا میں سمجھتا ہوں کہ میری ماں اپنے اخلاق، محبت وشفقت کی بدولت اس درخت کی مانند بلند قامت تھیں میں جب بھی اس درخت کو دیکھتا اپنی ماں کی حیثیت اور مرتبے کے متعلق دوبارہ غور کرتا۔''[۱]

اپنی ماں کی محبت کا ایک واقعہ بیان کرنے لگے تو بولے:

''میں بچپن میں دودھ نہیں پیتا تھا چونکہ ضدی تھا اس لیے نہیں نہیں کرتا رہتا۔ ایک رات میری ماں میرے سرہانے دودھ لیے کھڑی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ تم دودھ نہیں پیو گے تو مجھے نیند نہیں آئے گی اس لیے پی لو ورنہ میں تمھارے اوپر گرا دوں گی۔ میں نے کہا گرا دیجیے اور انہوں نے گرا دیا۔ پھر ہم دونوں ہنس پڑے اور انہوں نے کہا اب نہا کر آؤ۔''[۲]

ڈاکٹر تصدق حسین راجا نے اس سلسلے میں ایک واقعہ یوں رقم کیا ہے:

''انہیں ماں سے بے حد محبت تھی چاندنی راتوں میں کھیل کود میں لگا رہنے کی وجہ سے باپ نے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا تھا مگر اس کے باوجود وہ صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا ماں کا پکا ہوا کھانے کے لیے گھر آ جاتے تھے جہاں ماں منتظر ملتی تھیں، ماں کے انتقال پر انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ''ایک روشنی چھن گئی ہے'' پھر وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ ایسا ہونا ہی تھا اور یہ کہ ماں کو خالقِ حقیقی کے پاس جانے سے کون روک سکتا تھا۔''[۳]

ماں کا احساس زندگی کے ہر موقع پر ان کے قلب کو حزیں کرنے کا باعث تھا انہیں عمر رفتہ کے وہ چند سال ہمیشہ یاد رہے جو ماں کی آغوش میں گزارے تھے اور ماں سے جدا ہونے کے بعد زندگی کی بے کیفی و بے رنگی ان کے ذہن وشعور پر غالب رہی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں کے اکثر کرداروں کو ماں کی محبت سے اس قدر متاثر کن دکھایا ہے کہ ان سے ڈوب کر محبت کی جائے یا پھر ان کے بتائے ہوئے ارشادات کی تعمیل میں زندگی گزار دی جائے یا پھر وہ کردار ہیں جو محرومی کے بعد ممتا کی گود کی گرمی کے متلاشی نظر آتے ہیں مثلاً ان کے ناول ''داستان مجاہد'' کے اہم ترین کردار عبداللہ اور نعیم ماں کی تربیت کا نمونہ ہیں تو عذرا ممتا کی متلاشی نظر آتی ہے۔ ''محمد بن قاسم'' کے کردار ناہید کو دیکھیے جو ماں کی محبت سے اسی قدر استفادہ کر سکی جتنا خود نسیم حجازی نے کیا ہوگا آخری چٹان کا کردار طاہر بن یوسف اور رضیہ کی مماثلت بھی ماں کی عدم موجودگی کا نوحہ ہے غرض یہ کہ ہر ہر ناول میں کوئی نہ کوئی کردار ضرور ایسا مل جائے گا جس کے ذریعے نسیم حجازی کو جذبات اور احساسات کی ترجمانی کا حقدار کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کردار میں جہاں ماں کی محبت کی وابستگی کے ساتھ ماضی سے رشتہ اٹوٹ ہے تو وہیں سوتیلی ماں کی ستم ظریفی مستقبل کی راہوں کو بوجھل بنا دیتی ہے تو دوسری طرف حوصلہ مندی، ہمت و جرأت اور بے باکی بے رحم موجوں کے درمیان تیراک کے بازوؤں کا امتحان لے کر ساحل کی جانب کا راستہ دکھاتی ہیں ان سب

۱۔ انٹرویو نسیم حجازی: جولائی ۱۹۹۳ء مملوکہ راقم۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ نسیم حجازی۔۔۔ ایک مطالعہ: ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۲۹۔

باتوں کے باوجود خود میرے پوچھنے پر نسیم حجازی اور ان کے بڑے بیٹے خالد نسیم حجازی نے اس بات سے انکار کیا کہ یوسف کا کردار ان کی شخصیت آئینہ دار ہے۔

انسانی فطرت میں ماں سے محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور پھر جب کم عمری میں یہ سہارا چھن جائے تو پھر یادوں کے سوا کیا باقی رہ جاتا ہے یہی یادیں نسیم حجازی کی زندگی کا سرمایہ تھیں اور جنہیں وہ ہر لمحے یاد کرتے تھے۔اب اگر ہم بچے کی شخصیت پر خاندان کے اثرات کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی شخصیت پر گھریلو ماحول کا اثر گہرا پڑتا ہے کیونکہ وہ خاندانی ماحول میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں پرورش پاتا ہے۔والدین کی خوبیاں اور نقائص اس کی شخصیت کو متاثر کرتے ہیں کیونکہ بچہ اپنی تقلیدی جبلت کے تحت ان کے کردار اور عادات واطوار کی نقل کرتا ہے جو کچھ بھی وہ ابتدائی دور میں سیکھتا ہے وہ تقلیدی جبلت کے تحت سیکھتا ہے اس میں کوئی سنجیدہ شعور نہیں ہوتا لہٰذا وہ بغیر سوچے سمجھے اپنے والدین کی حرکات وسکنات کو قبول کرتا ہے اس کا گھر جو اُس کے خاندان کا عکاس ہوتا ہے، اس کی تربیت کا پہلا مرکز ہوتا ہے اگر اس کے خاندان کے افراد جس میں اُس کے والدین اور بھائی بہن شامل ہیں نیک اور اچھی عادات کے حامل ہیں، اگر وہ خوش مزاج تعلیم یافتہ ،ملنسار، مہذب اور بہتر نصب العین کے حامل ہیں تو اس کے اثرات اس کی شخصیت پر بھی اچھے پڑیں گے اور اگر اس کے خاندان کے افراد بری عادتوں کے حامل ہیں تو اس کا اثر بچے پر بھی پڑے گا اور اس میں منفی خصوصیات پیدا ہوں گی خاندان کے معاشی حالات کے اثرات بھی انسانی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اگر گھر میں خوشحالی ہو تو جہاں کھانے پہننے کے معاملات میں فراوانی ہوتی ہے وہیں بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے سہولت بہم پہنچتی ہے اس کے بچوں کی خواہشات کی تکمیل بھی ہو جاتی ہے اس طرح معاشرے میں فرد معاشی خوشحالی کی بدولت مناسب مقام بھی حاصل کر لیتا ہے اور کچھ نہ کچھ رکھ رکھاؤ بھی آجاتا ہے ایک اہم اور نمایاں وصف جو کسی شخصیت کی تیاری کے لیے اشد ضروری ہے خاندان کے افراد میں تعلیم کا ذوق وشوق ہونا ہے اس کی بدولت وسعت نظری اور شعور کی بلندی پیدا ہوتی ہے تعلیم کی بدولت اپنے اردگرد کے ماحول کا مشاہدا تی تجزیہ اور ملک کے سیاسی حالات سے واقفیت ہونے کے علاوہ صحت وصفائی کے معاملات میں بھی خصوصی توجہ رہتی ہے جو انسانی شخصیت کی تعمیر کے ساتھ ساتھ تندرستی اور صحت مندی کا باعث بھی بنتی ہے۔

اگر ایسے تمام امور جو انسانی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے میں معاون اور مددگار ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیتے ہوئے نسیم حجازی کے خاندانی پس منظر کے ساتھ رکھ کر دیکھیں تو جو بات سب سے پہلے ہمارے سامنے آتی ہے وہ خاندانی حسب ونسب ہے جب اوائل عمری میں ان کے شفیق استاد نے انکے نام کے ساتھ حجازی کا لاحقہ لگایا تو محض یہ نام میں اضافہ کی بنیاد نہ تھا بلکہ حجاز سے نسبت اور حجازی فتوحات کے تصور میں ان کے ذہنی شعور کو اس قدر وسعت بخشی کہ انہوں نے آباؤ اجداد کی روایات کا امین بن کر ان کارہائے نمایاں کو اپنی اور آنے والی نسلوں کے لیے ناولوں کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا۔یوں تو ان کے ناول کے موضوعات انحطاط پذیر مسلم معاشروں کا مرثیہ ہیں لیکن ناولوں کی ابتداء میں ثابت قدمی اور پامردی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے جو ان کے عروج کا باعث رہی ہو

گی پھر ان کوتاہیوں اور لغزشوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو عروج وزوال کی طرف لانے کا باعث بنیں دوسرا پہلو خاندانی پس منظر کے حوالے سے ایک پکے سچے مسلمان کا ہے کہ جس نے اطاعت وفرمان برداری کو اپنا شعار بنایا اور سورۃ بنی اسرائیل کی ان آیات کے مصداق بنے کہ والدین کی اطاعت کرو انہیں جھڑکنا تو دور کی بات ان کے سامنے جھکے رہو جب والد نے خاندانی ضرورت کے پیش نظر دوسری شادی کر لی تو اس تکلیف دہ فیصلے پر سر تسلیم خم کیا دل کی گہرائیوں کے ساتھ قبول کرتے ہوئے نہ صرف اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ بہترین تعلقات رکھے بلکہ ان کے بطن سے پیدا ہونے والی سوتیلی بہن کو اپنی دوسری بہنوں کی طرح سمجھتے ہوئے اس کی شادی بیاہ کے امور کو بڑے بھائی کی حیثیت سے دیگر بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کیا جو بات ان کی شخصیت میں اعتراض کی ہے وہ والد کی خواہش کے مطابق فوج یا سرکاری ملازمت سے دوری کی ہے۔ اسے کچھ لوگ نافرمانی پر محمول کریں گے مگر میں ڈاکٹر سیموئل سمائلز کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں ’’درحقیقت یہ جاننے کے لیے کہ کس قسم کے کام کے لیے کوئی موزوں ہے اسے اپنے متعلق ان باتوں کا واضح علم ہونا چاہیے۔

۱۔ جسمانی خصوصیات (صورت، شکل، صحت)

۲۔ شخصی خصوصیات (امنگیں، میلانات، مقاصد، کرداری وصف)

۳۔ ذہنی خصوصیات

۴۔ دلچسپیاں

۵۔ فطری رجحانات

۶۔ گزشتہ کامیابیاں اور ناکامیاں (اسکول میں، فالتو وقت کی ملازمتوں میں، غیر نصابی سرگرمیوں میں، دوسروں سے تعلقات رکھنے میں)۔‘‘[۱]

اس تفصیلی تجزیے کے بعد یہ بات بھی بنیادی نوعیت کی ہے کہ جب کوئی شخص اپنے ارادوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہے تو خوب اچھی طرح جانچ پرکھ کر دیکھ لے کہ وہ کہاں تک کامیاب ہوگا کیونکہ محمد شبیر جمعہ ایک عجیب وغریب تمثیل نقل کرتے ہیں:

’’تالاب میں پتھر گرا، پانی میں لہریں اٹھیں اور دور چاروں طرف کناروں سے ملنے لگیں۔ ساتھ ہی ایک درخت تھا، اسے بھی جوش آیا۔ اس نے بھی تالاب میں ایک پتا گرا دیا لیکن نہ شور ہوا اور نہ تالاب میں لہریں پیدا ہوئیں۔ میں اسے دیکھ رہا تھا، میں نے کہا ’’اے بے وقوف! دنیا میں وہی ہلچل مچا سکتے ہیں جو اپنے اندر وزن رکھتے ہیں۔‘‘[۲]

حقیقت یہ ہے کہ یہ مثال نسیم حجازی پر صادق آتی ہے انہوں نے اپنے خاندانی تعلق کے نسبت سے میدان جنگ میں تو وہ جوہر نہ دکھائے جو آباؤ اجداد کا طرۂ رہا ہے لیکن جہاد کی دوسری راہ اختیار کرتے ہوئے نوک قلم سے وہ تاریخ رقم کی جس میں تحریک پاکستان

۱۔ خوشحال زندگی، ڈاکٹر سیموئل سمائلز، الطہر پبلشرز، ص ۱۶، ۱۷۔

۲۔ شاہراہ زندگی پر کامیابی کا سفر، محمد بشیر جمعہ، ص ۱۰۲۔

کے لاتعداد سپاہی پیدا کیے انہوں نے جذبہ جہاد کے فروغ اور ملتِ اسلامیہ کے اتحاد کی خاطر اپنی تحریریں وقف کر دیں اگر یہ سب کچھ خاندانی پس منظر اور خاندانی حالت کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ کسی انسان کی شخصیت کی تیاری میں ماحول، تہذیب و تمدن، معاشی و سیاسی حالات سب ہی کا عمل دخل ہوتا ہے اور انہی عوامل کے امتزاج سے ایسی شخصیتیں منظر عام پر آتی ہیں جو شہرت عام اور بقائے دوام کی مصداق ہوتی ہیں۔

حالات زندگی

نسیم حجازی جن کا اصل نام محمد شریف ہے ۱۹مئی ۱۹۱۴ء کو سوجان پور نزد دھار یوال ضلع گورداسپور غیر منقسم ہندوستان کے صوبۂ پنجاب موجودہ ہندوستان کے صوبہ مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے ان کے والد چودھری محمد ابراہیم محکمہ انہار میں ملازمت کرتے تھے آباؤ اجداد کی ذات آرائیں تھی جس کی بابت تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ محمد بن قاسم فاتح سندھ کے ساتھ آنے والے افراد میں آرائیں بھی شامل تھے جن کا حسب ونسب شہید احد حضرت یسار الراعی اور حضرت اسلم اسود الراعی سے جا کر ملتا ہے۔ آرائیوں کی حیثیت واہمیت کو بیان کرتے ہوئے چوہدری غلام رضا رقمطراز ہیں:

''اریحائی (آرائیں) قبائل جب سرزمین سندھ میں وارد ہوئے تو ان میں کئی تابعین اور تبع تابعین شامل تھے۔ ان میں قوت ایمانی کوٹ کوٹ کر بھری تھی انہیں یہ درس اچھی طرح یاد تھا کہ اسلام نسبی امتیاز کو ختم کرتا ہے اور تمام انسانوں کو مساوی حقوق دیتا ہے۔''[1]

اس تصور اور مقصد کو سامنے رکھ کر جب مفتوحہ سندھ میں آرائیوں نے اپنی کارگزاری دکھائی تو خود کو اپنے آباؤ اجداد کی تعلیمات کے مطابق ثابت کیا اس بارے میں چوہدری غلام رضا لکھتے ہیں:

''اریحائیوں (ارائیوں) نے سندھ میں جابجا ہندوؤں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر دی تھیں۔ اس طرح ملک کا تقریباً تمام حصہ راجاؤں کے ماتحت تھا۔ ان راجاؤں سے جو مالگزاری یا خراج وصول کیا جاتا تھا وہ بہت ہی قلیل بلکہ برائے نام تھا۔ زمین کی پیداوار اور آمدنی کی باقاعدہ تشخیص نہیں کی گئی تھی۔ زرگان اور خراج کے لیے عام طور پر مراسم قدیم کو معلوم کر کے اس سے بھی کم روپیہ وصول کیا جاتا تھا۔ اس روپیہ کا بہت بڑا حصہ رفاہ عامہ کے لیے خرچ ہوتا تھا۔ رعایا میں کوئی طبقات نہیں تھے تہذیب ومتانت اور عدل و انصاف کے ساتھ عام انسانی مساوات کا جو نقشہ مسلمانوں نے اہلِ سندھ کے آگے پیش کیا اس نے سب کو متاثر ومدہوش کر دیا تھا۔ اریحائیوں (ارائیوں) نے اس بات کا حد سے زیادہ خیال رکھا کہ ہماری حکومت سے سندھ کے کسی طبقہ اور کسی قوم کو بھی اذیت نہ پہنچے انہوں نے پست لوگوں کو ابھارا تو سہی لیکن بلند رتبہ لوگوں کو پست کرنا نہیں چاہا۔''[2]

اس تشریح کے باوجود کہ خاندانی حسب ونسب غلامانِ نبیؐ سے جا کر ملتا ہے وہ اپنے نام کے ساتھ سوجان پوری کا لاحقہ لگاتے تھے جب ان کے عربی کے استاد نے ان کی توجہ اس جانب مبذول کروائی کہ وہ اپنا کوئی قلمی نام اختیار کریں اور ساتھ ہی حجازی کا لاحقہ لگائیں کیونکہ اس کی سند موجود ہے تو تب کہیں جا کر انہوں نے نسیم حجازی لکھنا شروع کیا یقیناً اسی موقع پر انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کی نسبت سے حجاز سے اپنی نسبت کو مستحکم اور لازم کیا ہوگا اپنے پرکھوں کے خون کی اس گرمی وحرارت کو محسوس کرتے ہوئے کہ جس نے جہالت کے

---

[1] ارائیں، چوہدری غلام رضا، ص ۸۵۔

[2] ایضاً، ص ۹۱۔

اندھیروں میں نور کی روشنی پھیلانے میں اپنے سردھڑ کی بازی لگادی جو حدود و قیود سے آزاد ہر مظلوم کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے نکل پڑے اور جن کی بدولت سرزمین ہندوستان میں اسلام کا نور پھیلا کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے امت مسلمہ کے لیے اپنا حصہ ادا کرنے کی سعی کرنے نکلتے اخوت و مساوات کا جو درس ان کی گھٹی میں پڑا تھا اور جس کی آبیاری ان کے آباؤ اجداد نے کی تھی ہر لحہ ذہن و شعور میں جاگزیں رہا آرائیوں کے کردار کو چودھری غلام رضا ایک دور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے واضح کرتے ہیں:

''غزنوی اور غوری دور میں بھی انہوں نے ہندو دھرم سے ٹکر لی۔ قانون منو کی رو سے شودر غلام سمجھے جاتے تھے۔ غلامی ان کا طبعی خاصہ تھا۔ مالک کے آزاد کر دینے کے باوجود بھی وہ آزاد نہیں کہلا سکتے تھے۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لیے ان کا سایہ باعث ناپاکی تھا۔ برہمنوں کی عورتیں دیویاں اور برہمن دیوتا کہلاتے تھے۔ شودر اگر پکی ہوئی روٹی کو چھو لیتا تو روٹی پلید ہو جاتی تھی۔ منو شاستر کے پانچویں باب میں صاف مذکور تھا کہ شودر کو جھوٹی خوراک کھانی چاہیے اور پرانے کپڑے پہننے چاہییں کوئی شودر اگر برہمن یا کھشتری کی نسبت کوئی برالفظ زبان سے نکالے تو اس کی زبان کاٹ لی جانی چاہیے کیونکہ وہ نیچی ذات کا آدمی ہے۔

آہ شودر کے لیے ہندوستان غم خانہ ہے

دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

اریحائیوں (ارائیوں) نے محمود غزنوی کی سرکردگی میں ان قوانین کو ختم کیا اور بت فروشی کے بجائے بت شکنی اختیار کی اور اسلامی مساوات کو قائم کیا۔''[۱]

اس تصورِ انسانیت کو پیدا کرنے اور نافذ کرنے کے باوجود ہندوستانی معاشرہ ذات پات کے نظام سے چھٹکارا نہ پاسکا اونچ نیچ کے اس فرق نے طبقات کو جنم دیا اور یہی طبقات طفلانہ ذہنوں کو بظاہر مجروح کرنے کا سبب بنے لیکن یہ وقتی صدمہ تھا اسلام کا تصور پاکیزگی اور طہارت جب ذہنی شعور میں اجاگر ہو جاتا ہے تو انسان امت اور ملت کے تصور سے سرشار ہو کر نادیدہ خیالات کی تمنا لیے اپنے چھوٹے سے ذہن سے بہت کچھ سوچنے کی کوشش کرتا ہے خواب کب حقیقت کا روپ پاتے ہیں اس کا فیصلہ تو وقت کے تند و تیز دھارے پر چھوڑ دینا چاہیے لیکن اس تمام تر تناظر میں مجھے نسیم حجازی کا بتایا ہوا وہ واقعہ یاد آ گیا جو انہوں نے مجھے انٹرویو دیتے ہوئے سنایا:

''میں بچپن ہی سے پاکستانی تھا جب پاکستان کا نام یا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا وقفے کے دوران ایک ہندو بچہ اپنا کھانا کھا رہا تھا میں نے اس سے کہا کہ آؤ کھیلتے ہیں میرا ہاتھ اس کے کھانے کو چھو گیا وہ بگڑ بیٹھا کہ میرا کھانا خراب کر دیا اس نے ایک ہندو ماسٹر سے شکایت کی جس نے مجھے دو چھڑیاں ماریں میرے چھوٹے سے ذہن میں یہ نہ آیا کہ میں ایک صاف ستھرے گھرانے کا بچہ ہوں نہاتا دھوتا ہوں پاک صاف رہتا ہوں میرا ہاتھ لگنے سے اس کا کھانا کیسے خراب ہو گیا اس واقعہ نے میرے ذہن میں بھی ہندوؤں سے نفرت پیدا کر دی اور میں اس چھوت چھات کو ناپسند کرنے لگا اس تصور نے میرے ذہن کو اس قدر پختہ کیا

---

[۱] آرائیں: چودھری غلام رضا، ص ۹۳۔

کہ میں ایک ادیب بن گیا اور میرے پڑھنے والوں میں ایک گروہ ایسا تیار ہو گیا ہے جو ہندوؤں سے نہ مرعوب ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔[۱]

نسیم حجازی نے اپنے آباؤ اجداد کی اقدار و روایات کی پاسداری کی انہوں نے معاشرے میں موجود ذات پات کے نظام کو بچپن ہی سے دیکھا اور خوب محسوس کیا کہ یہ نظام مستقل بنیادوں پر نہیں چل سکتا مذہب کی بنیاد پر ہونے والی تقسیم معاشرے اور مملکت کی تعمیر میں کیونکر متحد رہ کر کام کرنے کا درس دے سکتی ہے ہمارے نظریات و مقاصد جدا جدا ہیں جن کی بنیاد بھی مختلف ہے اسلام بھائی چارے اور برابری کا درس دیتا ہے تو ہندوانہ تہذیب انسانوں کو طبقات میں تقسیم کرتی ہے اسلام اتحاد اور محبت کا داعی ہے تو ہندو تہذیب عداوت و نفرت کے اصولوں پر قائم ہے۔

محمد شریف نے جس خاندان میں آنکھ کھولی تو وہاں ہر جانب محبت کرنے والے موجود تھے سب سے زیادہ جس شخصیت کے نقوش ان کے ذہن و دل پر انمٹ ہو کر رہ گئے ان کی ماں عمر بی بی کی تھی وہ گھنی چھاؤں کی مانند بھرپور شخصیت کی مالک اپنے خاندان کی منفرد مزاج کی خاتون تھیں جن کی حلیمانہ طبعیت ان کی تربیت میں شامل ہو کر انہیں ایک حساس انسان بنا گئی مگر افسوس یہ چھاؤں کچھ زیادہ دیر تک سایہ فگن نہ رہ سکی قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ جو ماں ان کی نگہداشت اور نگرانی میں اپنا دن کا چین اور رات کی نیند برباد کرے اس کے احسانات کا بدلہ دینے کی نوبت بھی آ سکے ابھی تو کھیل کود کے دن پوری طرح موجود تھے شرارتوں سے فرصت نہ ملتی تھی کہ زندگی میں اس سانحہ عظیم سے گزرنا پڑا محض چودہ برس کی عمر میں والدہ ماجدہ کا سایہ عاطفت چھن گیا اس وقت تک ان کے بہن بھائیوں کی تعداد چھ تھی جن میں محمد شریف سب سے بڑے، ان کے بعد محمد یعقوب، عبدالحکیم، فاطمہ، محمد بی بی اور لطیفہ بی بی شامل ہیں ابھی بہن بھائی دور طفلی سے گزر رہے تھے گھرانے کو ایک سمجھ دار اور سلیقہ شعار خاتون کی سرپرستی مطلوب تھی اس لیے ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں کے ساتھ ان کے تعلقات خوشگوار نہ رہے تھے اس کا اندازہ انٹرویو کے دوران میرے بار بار کے سوالات اور انہیں ٹال دینے کے انداز سے یقین میں بدل گئے اس سلسلے میں مئی ۲۰۰۲ء میں ان کے بڑے بیٹے خالد نسیم سے ملاقات کے موقع پر بھی بار بار سوال کیا تو انہوں نے بھی خاموشی اختیار کی اس کے علاوہ جو بات تعلقات میں کشیدگی کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ ان کے ناول ''پردیسی درخت'' اور ''گمشدہ قافلے'' میں یوسف کی سوتیلی ماں کا کردار ہے کیونکہ وہ اپنے انٹرویو میں اپنے ان ناولوں اور ''خاک اور خون'' کے کردار سلیم کی طرف بار بار اشارہ کر کے اپنی نسبت سے ان کرداروں کے تعلق پر مسرت کا اظہار کر چکے تھے ان باتوں کے باوجود اس سوال پر کہ سوتیلی ماں کے بطن سے پیدا ہونے والی بہن محمودہ کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا تھی تو کہنے لگے:

''میں ۱۴، ۱۵ برس کی عمر میں ماں کی شفقت سے محروم ہو گیا اس کے بعد سوتیلی ماں کے ساتھ رہا اور خوب خوب مشاہدہ کیا کہ سوتیلی ماں اور سوتیلی اولاد کا تعلق کیا ہوتا ہے۔ اس موقع پر اپنے اعتماد کے سہارے میں آگے بڑھتا رہا چونکہ ادیب ذکی الحسن اور انتہائی حساس ہوتا ہے اس لیے ان واقعات کو زیادہ محسوس کرتا ہے۔ وہ ایک خراش کو بھی ایک گہرے زخم کی مانند سمجھتا ہے دوسری ماں سے ایک بہن تھی جس کے ساتھ ہمارا رویہ بہت اچھا تھا ہم تینوں بھائیوں نے مل کر اس کی شادی کے تمام اخراجات برداشت کیے۔''[۲]

۱۔ انٹرویو نسیم حجازی: جولائی ۱۹۹۳ء مملوکہ راقم۔

۲۔ ایضاً۔

زندگی میں سوتیلی ماں کے آنے سے جو تلخی آئی اسے مٹھاس کے طور نگلنے کی ہمیشہ کوشش کی یہ الگ بات ہے کہ زخم اگر بھر جائیں تو داغ موجود رہ جاتے ہیں جو ہر لمحہ خزاں کے ان دنوں کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔

نسیم حجازی کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ گورداسپور سے ان کی نسبت ہے اس علاقہ کی جغرافیائی حیثیت کا جائزہ لیں تو بظاہر یہ ایک چھوٹا سا علاقہ ہے مگر مشرقی پنجاب کے قلب میں واقع ہونے راوی اور بیاس کی قربت لہلہاتے اور زرخیز علاقے کی بدولت اس کی بڑی اہمیت ہے پھر مسلمانوں کی آبادی کا تناسب تقسیم برصغیر کے وقت پاکستان میں اس کی شمولیت کا جواز پیش کرتا ہے مگر اس کی ایک اور جغرافیائی حیثیت ۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان کو تبدیل کرنے کا باعث ہوئی وہ حیثیت ہے گورداسپور کے ذریعے براستہ پٹھان کوٹ جموں کشمیر تک کا زمینی راستہ جسے عطا کرنے کے لیے راتوں رات ریڈکلف ایوارڈ کا سہارا لے کر اسے ہندوستان میں شامل کر دیا گیا نسیم حجازی کو کبھی ہضم نہ ہو سکا یہ وہ زخم تھا جو تاریخ کا ناسور بن گیا جغرافیائی حدود کے اس ردوبدل سے جہاں مہاجرین کے قافلوں کو پاک سرزمین تک پہنچنے کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی وہیں جموں کشمیر کی حیثیت کا تعین نہ ہو سکا یہ مسئلہ آج تک دونوں ملکوں کے درمیان موجود ہے اور اسی تنازعہ کی وجہ سے تین جنگیں لڑی جا چکیں اگر ہم ناول خاک اور خون کے آخری حصے کا جائزہ لیں تو نسیم حجازی کا پیغام اے قوم! با آواز بلند ہم سے یہ کہتا سنائی دے گا کہ اس مسئلے کا حل گفت وشنید اور کانفرنسوں کے ذریعے ہرگز حاصل نہیں کیا جا سکتا اس کے حصول کا ایک ہی راستہ ہے وہ ہے جہاد گورداسپور سے نسیم حجازی کی سرشاری کا اندازہ خاک اور خون کے پلاٹ سے کیا جا سکتا ہے اس کا تمام تر تانا بانا اس علاقے کی معاشرت، تہذیب وتمدن اور جغرافیائی اہمیت کے بارے میں ہے اس کے علاوہ ان کے ناولوں پردیسی درخت اور گمشدہ قافلے کی کہانی کا بیشتر حصہ بھی گورداسپور کی نوحہ خوانی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

نسیم حجازی نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے کچھ فاصلے پر قریبی گاؤں میں حاصل کی اس کے بعد مزید تعلیم مشن ہائی اسکول دھاریوال (ضلع گورداسپور) سے حاصل کی میٹرک کا امتحان ۱۹۳۲ء میں پاس کیا بعد ازاں ۱۹۳۸ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے بی۔اے کیا۔ اس دوران لکھنے لکھانے کا شوق پیدا ہو چکا تھا اپنا پہلا افسانہ ''شودر'' تحریر کیا جو ماہنامہ ''حکایت الاسلام'' میں جنوری ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا اس افسانے کے مصنف کا نام محمد شریف نسیم چھپا تھا اگلے ماہ کے شمارے میں ان کا ایک اور افسانہ ''جستجو'' شائع ہوا جس کے مصنف کے طور پر ''محمد شریف نسیم سوجان پوری متعلم اسلامیہ کالج لاہور'' درج تھا۔ یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تدریجی عمل تھا اس لیے انہوں نے اپنی شناخت کے لیے پہلے نسیم کا لاحقہ لگایا اس کے بعد سوجان پور کی شناخت اپنانا چاہی اپنے پہلے اور دوسرے افسانے میں جس موضوع کو پیش کیا وہ ہندو معاشرے میں عدم مساوات کا تھا جہاں ایک جیسا جسم وجان رکھنے کے باوجود ذات پات کی بنیاد انسانوں کو اونچی نیچی ذات میں تقسیم کرتی ہے۔ انسانی ذہن اور دلی جذبات اس تقسیم کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہیں ابتدأ، انجام کار، زبان بندی اور موت کی نیند سلا دینے پر منتج ہوا مگر ذہنوں میں پروان چڑھنے والی یہ چنگاری شعلہ بن کر رہی شودر ان کا افسانہ ہے جو نامکمل خیالی کا عکاس کہا جا سکتا ہے اس کی وجہ واضح اور بلند خیالات کی عکاسی کے لیے ان کا ناول نگاری کا

شعور ہوسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے ناول انسان اور دیوتا کو شودر کے بنیادی تصورات کا پھیلاؤ قرار دیا ان کا یہ اعتراف کہ شودران کے اس ناول کی تمہید تھا درست معلوم ہوتا ہے اپنے اس افسانے کے انجام میں جس نور کی روشنی کی جھلک دکھائی گئی ہے، میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت ان کے ناول انسان اور دیوتا میں بھی تھی میں نے جولائی ۱۹۹۲ء میں انٹرویو کے دوران اس جانب اشارہ کیا تھا کہ آپ کا ناول انسان اور دیوتا کچھ نامکمل سا معلوم ہوتا ہے اگر آپ اس کے اختتام پر ہندوستان میں محمد بن قاسم کی آمد کی گونج دکھا کر حق کی تلاش میں سرگرداں کرداروں کی رہنمائی کر دیتے تو کیا یہ بہتر نہ تھا فرمانے لگے ہوتو یوں بھی سکتا تھا لیکن اگر آپ انسان اور دیوتا کے بعد آخری معرکہ کا مطالعہ کریں تو آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔

اسلامیہ کالج میں دور طالب علمی ان کے مزاج میں اس قدر فہم وفراست پیدا ہو چکی تھی کہ سخت سے سخت حالات کا بڑی خندہ پیشانی سے سامنا کر لیتے تھے اس سلسلے میں ڈاکٹر تصدق راجا نے ایک دلچسپ واقعہ تحریر کیا ہے:

''ایک بار کالج سے چھٹی ہونے پر بذریعہ ریل گاڑی جب اپنے آبائی گاؤں پہنچا تو گاؤں خالی نظر آیا، معلوم ہوا کہ گاؤں والے اپنے ہمسایہ گاؤں کے لوگوں سے لڑنے کے لیے لاٹھیوں سے لیس وہاں جمع ہیں اس نے فوراً گھوڑے کو لگام ڈالی اور اس کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر اس جانب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں گاؤں کے لوگ آمنے سامنے صف آرا ہیں اس نے دور سے ہی للکارا۔ ''خبردار!'' لاٹھیاں فضا میں بلند کی بلند ہی رہ گئیں دو ایک کو تھپڑ مارے اور انہیں ایسا رام کر لیا کہ اب دونوں طرف سے لوگ کشتی لڑنے کے لیے اکھاڑے میں اتر رہے تھے۔ کبڈی بھی کھیلی گئی اور یہ نوجوان مخالف گاؤں کے لوگوں کی طرف سے کھیلا کیونکہ وہ کمزور تھے اور اس طرح یہ لڑائی ٹل گئی۔''[۱]

ان کی ہمت وشجاعت اور مردانگی کا ایک اور واقعہ جس میں نام ونمود کی خواہش سے بالاتر ہو کر بڑے سے بڑا کام کر جانے والے نسیم حجازی کا تذکرہ ڈاکٹر تصدق راجا نے اس واقعہ میں کیا ہے:

''یہی نوجوان (نسیم حجازی) ایک روز لاہور کے چڑیا گھر میں گھوم رہا تھا کہ چیتوں کے ایک پنجرے کے سامنے ایک بچہ اپنا ہاتھ بار بار سلاخوں کے اندر لے جا کر چیتے کے بچے کو کچھ کھلا رہا تھا کہ اچانک اس چیتے کے بچے نے اس لڑکے کے ہاتھ میں منہ ڈال لیا۔ اس نوجوان نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور پھر پاس ہی کھڑے ہوئے ایک تماشائی کی چھتری لے کر لڑکے کے قریب پہنچ گیا اور چھتری کا مضبوط لوہے کا بنا ہوا ڈنڈا اس زور سے چیتے کے بچے کو مارا کہ اس نے گھبرا کر اس لڑکے کا ہاتھ چھوڑ دیا جو لہولہان ہو چکا تھا، لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں کسی نے کہا ''اخباری نمائندے کو بلاؤ اس کی تصویر لے لو'' مگر یہ نوجوان جو ایسے کاموں کے لیے اشتہاری مجرم بننا پسند نہیں کرتا تھا وہاں سے سائیکل پر سوار ہو کر ایسا بھاگا کہ گھر آ کر دم لیا۔''[۲]

ان واقعات کو یہاں رقم کرنے کا مقصد ان کی دانش مندی اور حوصلہ مندی کا اظہار کرنا ہے جو کچھ ہم ان کے ناولوں میں دیکھتے ہیں اسی

۱۔ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۳۰،۳۱۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۱۔

کی جھلک ان کی زندگی میں نظر آتی ہے اگر ہم داستانِ مجاہد کے نعیم کو یاد کریں جو چیتے کے مقابلے میں ڈٹ گیا اور اس کے ٹکڑے کر ڈالے تو اسی شجاعت و دلیری کا ثبوت ان کی زندگی میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ادیب محض قلم کے ذریعے اپنی طاقت اور مردانہ وار مقابلے کی کیفیت کو پیش نہیں کرتا بلکہ ذہنی طور پر اس قدر تیار بھی ہوتا ہے کہ جب ایسا کوئی موقع درپیش ہو تو اپنے رویے کی بدولت کامیاب و کامران ہو جاتا ہے۔

دوران طالب علمی نسیم حجازی کی شادی ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو مولانا غیاث الدین کی صاحبزادی نجابت النساء سے انجام پائی۔ مولانا غیاث الدین شریف النفس، حلیم الطبع، بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے ان کی عالمانہ اور فاضلانہ حیثیت مسلّم تھی کیونکہ وہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے حلقہ احباب میں شامل رہے تھے۔ نسیم حجازی کے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد پہلی بار اپنی اہلیہ سے ملے تو عجیب کیفیت۔ لوگ تحفے تحائف دیتے ہیں ایک دوسرے کے حسن کی تعریف کرتے ہیں یا خاندانی حسب و نسب کا تذکرہ کرتے ہیں مگر شب عروسی کا واقعہ سناتے ہوئے کہنے لگے:

''بیاہ کر دلہن بن کر جب وہ میرے گھر آئیں تو میں نے ان سے کہا کہ اب تک زندگی کے بوجھ کو اکیلے اٹھایا تھا۔ اب چاہتا ہوں کہ مل کر چلیں۔ میں نے ایک کاغذ اور قلم انہیں دیا اور املا کرایا جو کچھ انہوں نے لکھا اسے میں نے دیکھا اس میں کوئی غلطی نہ تھی میں نے کہا یہ میرے چھپنے والے پہلے ناول کی وہ سطور ہوں گی جنھیں کبھی تبدیل نہ کروں گا۔''[۱]

اپنی بیگم سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے مزید بتایا:

''اُن کی رفاقت کے بعد زندگی مکمل ہوگئی۔ جب کبھی ملک سے باہر جاتا تو اپنے گھر آنے میں جلدی کرتا۔''[۲]

ان سے ملاقات اور اس موقع پر رفیقۂ حیات سے جدائی کے صدمے کو دیکھ کر مجھے گمشدہ قافلے کی ہیروئین فہمیدہ یاد آگئی میں اس ناول کا بار بار تذکرہ اس لیے کر رہا ہوں کہ اس کے واقعات نسیم حجازی کی زندگی سے خاصے مشابہ ہیں بلوچستان میں قیام، کراچی میں قیام، سوتیلی ماں اور ایسے ہی بہت سے دیگر مماثل حالات اُن کی زندگی اور اس ناول میں موجود ہیں انہوں نے جس قدر فہمیدہ کی سمجھداری اور مونس دم ساز کی حیثیت سے تذکرہ کیا ہے یقیناً اُن خوبیوں کا اظہار ہوگا جو ان کی اہلیہ میں موجود رہی ہوں گی اس کے علاوہ خاک اور خون کی عصمت میں موجود خوبیوں کو بھی شامل کر لیا جائے کہ جس نے محبت کے تقدس کی عظمت کی خاطر بعض ظاہری مصلحتوں کو نظر انداز کر کے سلیم کو اپنی زندگی کا ساتھی بنالیا اور جو اپنے شوہر کے مشن کی تکمیل کے لیے اپنا تن من دھن لگا دینے پر راضی تھی اگر یہ کہا جائے کہ فہمیدہ اور عصمت کی خوبیاں اور صفات جمع کی جائیں تو یقیناً نجابت النساء بیگم کی شخصیت بن جائے گی یہی وجہ ہے کہ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور یہ الفاظ ادا کیے:

''ان کی موجودگی میرے لیے سکون کا باعث تھی۔ گھر میں مہمانوں کی آمد ہو یا دعوتیں مجھے کوئی فکر نہیں ہوتی تھی لیکن میری

---

[۱] انٹرویو نسیم حجازی، جولائی ۱۹۹۳ء مملوکہ راقم الحروف۔

[۲] ایضاً۔

محبت کا بھی یہ عالم تھا کہ اگر ان کی طبیعت ذرا بھی ناساز ہوتو میں بے چین ہو جاتا تھا اور میرے لیے کام کرنا ممکن نہ رہتا تھا۔ میں سمجھتا تھا جب تک رفاقت ہے کام چل رہا ہے اور اب دیکھیے کہ نومبر ۹۱ سے جولائی ۹۲ آ گیا میں اپنے آپ کو ان کے بغیر ایڈجسٹ نہیں کر پایا۔''[۱]

اُن کی اہلیہ ۵۵ سال تک رفاقت کا حق ادا کرتی رہیں یہاں تک کہ ۲۹ نومبر ۱۹۹۱ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں یہ صدمہ نسیم حجازی کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ رفیقۂ حیات کی جدائی نے ان کے لمحوں اور دکھوں کو مزید بڑھا دیا یوں تو ساڑھے چار سال تک زندہ رہے مگر ناول نگاری یا ادبی تخلیقات کے سلسلے میں یہ دور مفلوج ثابت ہوا اُن کا یہ بیان کہ اہلیہ کی بیماری اور جدائی میرے لیے ناممکن اور ناقابلِ برداشت ہے درست ہی ثابت ہوا اور وہ ان کی عدم موجودگی کو زیادہ عرصہ برداشت نہ کر سکے۔

نسیم حجازی نے دورِ طالب علمی کے اختتام سے قبل ہی شادی کر لی تھی اور شادی کے ابتدائی سالوں میں اپنے اہل خانہ کے ہمراہ رہے اس دوران اپنے احباب خاص طور پر سلیم پانی پتی کے بے حد اصرار پر ناول نگاری کا آغاز کر چکے تھے ابتداً اپنے افسانے شودر کے موضوع کو پھیلا کر ایک ناول پیش کرنا چاہتے تھے مگر بعض وقتی ضرورتوں کے پیش نظر ارادہ ترک کر کے داستانِ مجاہد ضبطِ تحریر میں لانا شروع کیا یہ ناول پایۂ تکمیل کو پہنچا مگر زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا کیونکہ دوسری جنگ عظیم کے آغاز نے پبلشروں کو محتاط اور کاغذ کی قلت کو عام کر دیا تھا مسودہ مختلف پبلشروں کی نظرِ انتخاب کو نہ پا سکا کیونکہ موضوع کی نوعیت ہی سے اکثر لوگ چڑ جایا کرتے تھے اس زمانے کا حال اور اس دور کی کیفیت کو نسیم اپنے ایک انٹرویو میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''میرے بزرگ خالد بن ولید، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد اور محمود غزنوی کی ایمان افروز داستانیں سنایا کرتے تھے چنانچہ میں نے ایک طویل افسانہ ''مجاہد'' کے عنوان سے لکھا۔ ان دنوں میرا بیشتر وقت کلاسیکی ادب پڑھنے میں گزرتا تھا اور مسلسل پڑھتے رہنا میری عادت ثانیہ بن گیا تھا اور شاید اسی شوق مطالعہ کا ثمرہ تھا کہ داستان مجاہد لکھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس کہانی کے اندر ایک پورے ناول کا پلاٹ موجود ہے اور اسی طرح ''شودر'' افسانے میں بھی ایک پورے ناول کا پلاٹ موجود تھا۔

۱۹۳۷ء میں میں نے ''داستانِ مجاہد'' کے عنوان سے اپنا پہلا ناول لکھنے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۳۸ء میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا! اسے حُسنِ اتفاق کہیے کہ مرحوم حمید نظامی اور مولانا عبدالستار خان نیازی اور میں ایک ہی مکان میں رہا کرتے تھے اور مولانا عبدالستار خان نیازی پہلے شخص تھے جو میرے تصنیفی کام میں بے حد دلچسپی لیتے تھے اور میری حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔

وہ پریشانیاں جو اکثر مصنفین کے حصے میں آتی ہیں وہ میرے مقدر میں بھی تھیں لیکن دنیا کے کلاسیکی ادب کے مطالعہ سے مجھ میں یہ خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی کہ ''اس ناول کے ساتھ میرے مسائل حل ہو جائیں گے'' لیکن بدقسمتی سے یہ پریشانیاں اس ناول کی تکمیل کے بعد بڑھ گئیں یہ نام نہاد ''ترقی پسند ادب'' کا دور تھا اور میں جس بھی مشہور ناشر کے پاس اپنے ناول کا مسودہ لے کر گیا وہ ''داستانِ مجاہد'' کا عنوان دیکھ کر ہی تلملا اٹھتا اور کہتا: ''نسیم صاحب! آپ کس زمانے کی باتیں کرتے ہیں؟ یہ ترقی پسند ادب کا دور ہے!

---

[۱] انٹرویو نسیم حجازی: جولائی ۱۹۹۲ء مملوکہ راقم الحروف۔

اور ہم صرف ترقی پسند مصنفوں کی کتابیں شائع کرتے ہیں۔'' ان کی یہ باتیں سُن کر میں اپنے دل میں اسی قسم کی ہنسی محسوس کرتا جو کبھی گاؤں کے دوکاندر کی بے ربط کہانیاں سن کر محسوس ہوتی تھی! بہرحال میں اپنے ناول کا مسودہ اٹھاتے ہوئے انہیں یہ بات ضرور کہتا:

''جناب وہ دن زیادہ دور نہیں جب یہ ناول ملک بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والی کتاب ہوگا اور انشا اللہ میری آنے والی ہر نئی تصنیف میری پچھلی تصنیف سے کہیں زیادہ مقبولیت حاصل کرے گی اور اس دن آپ اپنی اس گفتگو پر ضرور ندامت محسوس کریں گے۔''

لیکن میرے ان تصورات کے باوجود ''داستان مجاہد'' کا مسودہ قریباً چھ سال میرے گلے کا ہار بنا رہا! ۱۹۳۹ء میں جنگ شروع ہوگئی تو اس کے شائع ہونے کے امکانات اور بھی معدوم ہوگئے۔''[۱]

بالآخر ۱۹۴۳ء میں میر جعفر خان جمالی کی ذاتی دلچسپی کی بدولت کوئٹہ سے شائع ہوکر منصۂ شہود پر آیا انہی حالات کا تذکرہ ان کے ناول گم شدہ قافلے میں بھی ملتا ہے اسی بناء پر ہم بار بار اس بات پر مصر رہے ہیں کہ ناول ''پردیسی درخت'' اور ''گم شدہ قافلے'' ان کی زندگی کے ترجمان ہیں اس ناول کی بدولت نسیم حجازی کے تصورات اور رجحانات عوام الناس کے سامنے آئے جو لوگ شودر کے مصنف کو فراموش کر چکے تھے ان کے لیے امنگ وولولے کے ساتھ ایک پیغام سامنے آیا اس سے قبل نسیم حجازی اپنی عملی زندگی کے آغاز کے لیے کراچی تشریف لائے جہاں پہلے روزنامہ ''حیات'' سے تین ماہ تک منسلک رہنے کے بعد روزنامہ ''زمانہ'' سے وابستگی اختیار کی اگر یہ وابستگی زندگی کی ضروریات اور بہتر زندگی کے حصول کی خاطر ہوتی تو شاید طویل عرصے تک برقرار رہ پاتی مگر مصلحتوں کو پس پشت ڈالنے والا نسیم حجازی زیادہ دیر تک گھٹی گھٹی فضا میں سانسیں نہ لے سکا انہوں نے وار فنڈ سے ملنے والے دو ہزار روپے کے وقتی فائدے کو پس پشت ڈال کر اس موضوع پر قلم اٹھایا جو اُن کی حوصلہ مندی اور دلیری کا منہ بولتا ثبوت تھا یہ ایک نوجوان کی محض جذباتی کیفیت نہ تھی انہوں نے اداریہ لکھا اور ساتھ ہی اپنا استعفیٰ بھی یوں وقتی طور پر صحافت سے ان کا رشتہ منقطع ہوگیا روزنامہ حیات سے ان کی وابستگی مارچ ۱۹۴۱ء تا مئی ۱۹۴۱ء رہی جبکہ روزنامہ زمانہ کراچی سے ان کا تعلق جون ۱۹۴۱ء تا دسمبر ۱۹۴۱ء باقی رہا۔

نسیم حجازی صحافت کے شعبے سے وقتی طور پر علیحدہ ہوکر درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوئے کہنے کو تو یہ دور محض تین ماہ کے قلیل عرصے پر مشتمل ہے مگر اس قلیل وقت میں بھی طالب علموں کی رہنمائی اور ان میں بہترین انسانی اوصاف پیدا کرنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اس کی ایک بہترین مثال ایک طالب علم کی تربیت کا وہ واقعہ ہے جو ڈاکٹر تصدق حسین راجا نے بیان کیا ہے:

''(نسیم حجازی نے مجھ سے) ایک سکھ لڑکے کا ذکر کیا جو ڈرگ روڈ اسکول میں نسیم حجازی کا شاگرد تھا اور بہت میلا کچیلا رہتا تھا انہوں نے ایک دھوبی کے لڑکے کو بلایا اور پوچھا کہ تمھارا باپ کپڑے کس طرح دھوتا ہے اور پھر اس سے مخاطب ہوکر کہا۔'' اس لڑکے کو (سکھ لڑکے کو) ساتھ لے جاؤ باپ سے کہنا اس کا سارا میل نکال دے مگر اسے استری نہ کرے'' دھوبی کا بیٹا اسے ساتھ لے گیا اور جب

---

[۱] نسیم حجازی ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا ص۲۹۲،۲۹۳۔

وہ واپس گھر گیا تو دوسرے روز سردار جی اسکول آئے اور نسیم حجازی کا شکریہ ادا کیا ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ''کل جب ہمارا بیٹا گھر پہنچا تو میں اور اس کی ماں اُسے نہ پہچان سکے۔'' رُوح کی آلائشوں کی صفائی کے ساتھ ساتھ انہیں جسم کی آلائشوں کا بھی کس قدر خیال تھا میں اکثر سوچتا ہوں۔''[۱]

اگر نسیم حجازی کو درس و تدریس کا طویل موقع نصیب ہوتا تو یقیناً ان شاہینوں کی تربیت کرتے جن کا خواب اقبال نے دیکھا تھا اور جن کی بلند پروازی کے قصے ان کے ناولوں کو عظیم تخلیقی خیال کا مرقع بناتے ہیں مگر حالات کو یہ گوارا ہو نہ سکا اور ماضی کی تحریروں کو بنیاد بنا کر انہیں اسکول کی ملازمت سے الگ کر دیا گیا اس کرب انگیز منظر کو کہ جب انہیں ملازمت سے سبکدوش کیا گیا ڈاکٹر تصدق حسین راجا نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''ڈرگ روڈ (کراچی) میں ایک انجمن کے زیر نگرانی ایک مڈل اسکول چل رہا تھا۔ ہیت حاکمہ (BOARD OF GOVERNORS) کی درخواست پر نسیم حجازی نے اس اسکول میں بحیثیت اُستادِ انگریزی کام کرنا شروع کیا۔ انہوں نے اس شرط پر یہاں تدریسی فرائض قبول کیے تھے کہ جہاں تک نظم و ضبط (DISCIPLINE) تعلق ہے انہیں اس سلسلے میں بھی کُلی اختیارات حاصل ہوں گے، یہاں وہ تین ماہ تک بچوں کو پڑھاتے رہے اور ان کی تربیت کا جو سنہری موقع ہاتھ آیا تھا اس سے بھی پُورا پُورا فائدہ اٹھایا ابھی تین ماہ کا مختصر سا عرصہ ہی گزرا تھا کہ ایک صبح جب وہ اسکول پہنچے تو اسکول کا گیٹ ان کے لیے بند تھا، انہیں یہیں کھڑے کھڑے اسکول کی ملازمت سے علیحدگی کا پروانہ تھما دیا گیا تھا۔ اس کا سبب انکا ایک ایسا اداریہ بنا تھا جو انہوں نے کچھ عرصہ ہوا ایران کے بارے میں لکھا تھا۔

نسیم حجازی صاحب نے اس واقعہ کا ذکر کرتے وقت جب ان بچوں کا تذکرہ کیا جو اسکول کے گیٹ کی سلاخوں میں سے ہاتھ باہر نکال نکال کر اُن سے مصافحہ کر رہے تھے تو ان کی آنکھیں آج اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی پُرنم تھیں انہیں وہ بچے بہت یاد آ رہے تھے جنہیں ان کی علیحدگی کا اس قدر رنج تھا کہ وہ رو رہے تھے مجھے خیال گزرا: ''اس شخص نے ویسے بھی تو بیک وقت کئی محاذوں پر جنگ لڑی ہے۔ اخبار نکالے، ناول لکھے، تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا کاش ایک چھوٹا سا اسکول بھی ساتھ ساتھ چلایا ہوتا تاکہ وہ شاہین تیار ہو سکتے جو ان کے ناولوں کے زندہ کردار بن سکتے تھے۔''[۲]

زندگی کی غیر متوازن ڈگر پر چلنے کی کوشش نے نسیم حجازی کو مشاہدات اور تجربات کی اس تجربہ گاہ سے گزارا جو شعوری طور پر انسان کو بلند خیالات اور عظیم مقاصد کے لیے تیار کر دیتی ہے اس زمانے میں انہیں معلوم ہوا کہ میر جعفر خان جمالی کو اپنے بچوں کی تربیت کے لیے ایک اتالیق کی ضرورت ہے جمالی صاحب نے نسیم حجازی کو پہلی نظر میں بھانپ لیا اور اسرار محمد خان کو انہیں کوئٹہ لانے کے لیے بھیجا نسیم صاحب نے بھی محسوس کیا کہ زندگی کے مقاصد کے حصول کے لیے کام کرنا ہے اور کام کرنے کے لیے اللہ کی وسیع زمین موجود ہے

۱۔ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۴۰۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۲، ۲۳۔

جہاں اور جن حالات میں موقع ملے اُسے استعمال کرنا چاہیے یوں انہوں نے بلوچستان جانے کا فیصلہ کیا اپنے مزاج کی بدولت دوران سفر ایک نئے تجربے سے سابقہ پڑا جس کا اظہار کرتے ہوئے مجھے بتانے لگے:

''اس زمانے میں سندھ سے بلوچستان داخل ہونے کے لیے جھٹ پٹ کے سرحدی علاقے سے گزرنا ہوتا تھا جہاں بس روک کر ایک کانسٹیبل تفصیلی پوچھ گچھ میں مصروف تھا شدید گرمی، لوگ پریشان، مجھ سے رہا نہ گیا یہ پتھر کے زمانے کا انسان کہاں کھڑا ہے میں فوراً سامنے دفتر گیا اعلیٰ افسر سے، ملا تو وہ خود ساتھ آیا اور کانسٹیبل کو ڈانٹ کر کہا کہ یہ کام جلدی نہیں کر سکتے۔''[۱]

کوئٹہ پہنچ کر نسیم حجازی نے اپنے بنیادی شعبے صحافت کو ایک بار پھر اختیار کیا اور کوئٹہ سے نکلنے والے ہفت روزہ ''تنظیم'' کی ذمہ داریاں سنبھالیں انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ تحریک پاکستان میں ایک فعال کردار ادا کرنے کے لیے بلوچستان میں رہ کر یہاں کے سرداروں کو ذہنی اور شعوری طور پر ملت اسلامیہ سے یکجہتی کا تصور بیدار کرنا ہوگا اس سلسلے میں انہیں میر جعفر خان جمالی کی سرپرستی اور محمد خان جوگیزئی کی حمایت حاصل تھی جس کا بھرپور ثبوت دیتے ہوئے انہوں نے اپنے زورِ قلم کا سہارا لے کر تنظیم کے لیے بیش بہا مضامین مرتب کیے جن کا مقصد ہندو فاشزم کا چہرہ بے نقاب کرنا اُن انگریزی سازشوں کو منظر عام پر لانا جن کا مطمع نظر تقسیم برصغیر کو روکنا اور مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی کا طوق پہنانا تھا انہوں نے صحافتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے قبائلی سرداروں کے ساتھ دیرینہ روابط پیدا کیے جو ۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلانِ آزادی کے بعد شاہی جرگے کے موقع پر منکشف ہوئے اس دوران محمد خان جوگزئی بلوچستان کے نمائندہ حیثیت سے اسمبلی میں ایک اشارہ دے چکے تھے یہ وہ دور ہے کہ جب ہندو بنیے نے اپنی دولت بے حساب لٹانا شروع کر دی تھی تاکہ بلوچستان پر ہندوستان کی اجارہ داری قائم رہ سکے ایک اور خدشہ یہ بھی تھا کہ انگریز بلوچستان پر اپنا قبضہ باقی رکھے تاکہ ایران، افغانستان اور وسط ایشیا کی ریاستوں کے علاوہ مشرق وسطیٰ پر بھی نظر رکھ سکے ایک صحافی کی حیثیت سے ان گھناؤنے عزائم کو نسیم حجازی نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ مناسب انداز میں اس کا فہم و ادراک بھی پیدا کیا جب اے۔جی۔جی نے وائسرائے ہند کا پیغام آزادی اور اس بارے میں ریفرنڈم کی تجویز شاہی جرگے کے سامنے رکھی تو نسیم حجازی کی شبانہ روز محنت رنگ لائی اور محمد خان جوگزئی نے کھڑے ہو کر کہا کہ کسی ریفرنڈم کی ضرورت نہیں یہ فیصلہ ابھی ہوا جاتا ہے جو لوگ پاکستان کے حق میں ہیں وہ ایک طرف ہو جائیں مخالفت میں محض تین افراد تھے اس موقع پر اے۔جی۔جی نے بذریعہ ٹیلی گرام وائسرائے کو اس فیصلے سے آگاہ کیا۔ قیام بلوچستان کے دوران نسیم حجازی بیک وقت تین میدانوں میں سرگرداں تھے ایک طرف تنظیم کی ادارت سنبھالے ہوئے تھے تو دوسری طرف مسلم لیگ اور قیام پاکستان کے لیے عملی طور پر کوشاں رہے اور تیسری جانب ناول نگاری کا فریضہ بھی جاری رہا میر جعفر خان جمالی کی ذاتی دلچسپی کی بدولت داستانِ مجاہد کا وہ مسودہ جو گزشتہ چھ سال سے اُن کی دکھتی رگ بنا ہوا تھا شائع ہوا۔ اس کے بعد نسیم حجازی نے اپنے ابتدائی تصوراتی خاکے کو در کے تخیل کو وسعت دے کر ناول کے قالب میں ڈھالا اور یوں انسان اور دیوتا منظر عام پر آ سکا اس ناول کا مرکزی خیال ذات پات کی

---

[۱] انٹرویو نسیم حجازی، جولائی ۱۹۹۳ء مملوکہ راقم الحروف۔

بدولت معاشرے میں اونچ نیچ کا قیام ہے بنیادی طور پر یہ ناول ہندو معاشرے کی عکاسی کرتا ہے لیکن اس کے ذریعے نسیم حجازی اُن بھولے بھالے مسلمانوں کو باہوش اور پرجوش بنانا چاہتے ہیں جو ہندوؤں کی آستین میں چھپے خنجر کو نہیں دیکھ پائے یہی وجہ ہے کہ سقوط ڈھاکہ کے بعد نسیم حجازی نے اس ناول کے دیباچے میں مزید اضافہ کر کے اُن حقائق کو پیش کیا جو ۱۹۷۳ء میں طباعت کے موقع پر پیش کیے گیے اس سلسلے میں انہوں نے مجھے انٹرویو دیتے ہوئے بتایا:

''انسان اور دیوتا لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندو فاشزم اور معصبیت سامنے تھی ہندو کا اصلی چہرہ میں نے دیکھ لیا تھا چونکہ ہندو کے نزدیک دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے اچھوت کا گلا کاٹ دینا ایک عام بات تھی ہندو کی اس فطرت سے اپنی قوم کو باخبر کرنا میری ذمہ داری تھی تم پر بھی یہ وقت آسکتا ہے ہوشیار ہو جاؤ کہیں شودر کی طرح تمھیں ذبح نہ کر دیا جائے میں نے صرف یہ ناول ہی نہیں لکھا تھا بلکہ عملی طور پر ہندو کے ان مقاصد کو ناکام بنانے کی کوشش بھی کی تھی میں نے حسرت موہانی صاحب سے بھی ملاقات کی تھی اور ان سے کہا کہ مسلمان بے خبر سوئے ہوئے ہیں ہندو اسلحہ کی فیکٹری لگا رہے ہیں اگر کوئی وقت آیا تو ہم مارے جائیں گے لیکن پنجاب کے لوگوں میں یہ احساس پیدا نہ ہو سکا میں نے افتخار ممدوٹ سے بھی یہ کہا تھا تو وہ کہنے لگے کہ ہمیں کوئی جنگ تھوڑی کرنی ہے حالانکہ جنگ سے بچنے کے لیے جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''[1]

نسیم حجازی کا یہ نقطۂ نظر خام خیالی پر مبنی نہ تھا بلکہ حقیقت پسندی کا پیغمبرانہ شعور تھا جو اکثر ادیبوں کے یہاں پایا جاتا ہے حالات نے یہ ثابت کیا کہ یہ خدشات مفروضے کی پیداوار نہ تھے بلکہ تقسیم کے وقت مسلمان مہاجرین کی لاکھوں کی تعداد میں شہادت اس کا بین ثبوت ہے کہ اگر معاملے کی نزاکت کا ادراک کر لیا جاتا تو اتنے بڑے انسانی المیے سے بچا جا سکتا تھا۔

نسیم حجازی نے تحریک پاکستان کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنا اہم ترین ناول محمد بن قاسم پیش کیا۔ جس میں اولوالعزمی ہمت و شجاعت کی تاریخ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اطاعت و فرماں برداری کو کسی تحریک کی کامیابی کا بنیادی وصف قرار دیا ہے یہ ناول داستان مجاہد کے بنیادی تصور کا اظہر من الشمس بڑا خیال ہے مگر اس ناول کی دلچسپی اور رقت انگیزی قاری کو اپنے دائرہ اثر میں لے لیتی ہے۔ موضوع پر اُن کی گرفت بظاہر تاریخ کے جھروکوں سے پردہ اٹھاتی ہے تو وہیں مستقبل کی راہوں کے لئے حب الوطنی اور اطاعت امیر فرض عین بتاتی ہے ناول محمد بن قاسم ۱۹۴۵ء میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا یوں گزشتہ تین سالوں میں لگا تار تین ناولوں کی اشاعت نسیم حجازی کی اہمیت کو مسلّم بنانے کا باعث بنی تو وہیں تحریک پاکستان میں ان کا کردار اور اسلامی نظریے کے تحفظ کے لیے اُن کے مقاصد زبان زدِ عام ہونے لگے ۱۹۴۵ء کے بعد نسیم حجازی کا ناول آخری چٹان منظر عام پر آیا یہ زمانہ ۱۹۴۷ء کا ہے درمیانی ایک سال کا عرصہ تحریک پاکستان میں ان کی مصروفیات کا ہے اس زمانے میں انہوں نے تمام تر توجہ ہفت روزہ تنظیم پر مبذول کی یوں تو تنظیم ہفت روزہ تھا مگر ضمیمے کی صورت میں اس کی اشاعت بعض مواقع پر روزانہ ہونے لگی یہ انتہائی اہم دور تھا جب دشمنان اسلام اور پاکستان کے

---

[1] انٹرویو نسیم حجازی، جولائی ۱۹۹۲ء مملوکہ راقم الحروف۔

مخالفین کھل کر سامنے آگئے بار ہا ایسی افواہیں اڑائی جاتیں کہ قبائلی ذہنیت کے سردار اُن سے چراغ پا ہو جائیں یہاں اتحاد برقرار رکھنے کی اشد ضرورت تھی فروعی اختلافات کو بھلا کر ملت اسلامیہ کے عظیم تر مفاد کی خاطر مسلمانوں کو متحد رکھنے کے لئے ان کا قلم تیزی سے رواں دواں رہا اسی نفاق کی کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے جو مسلمانوں میں پیدا کی جارہی تھی نسیم حجازی نے آخری چٹان کا مسودہ ترتیب دیا جس کا مقصد سخت سے سخت حالات میں چٹان کی طرح مصمم ارادے کے تحت سامنے آجانا تھا اس ناول کا مرکزی خیال جلال الدین خوارزم شاہ کے ولولہ انگیز خیالات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اس قوت ایمانی اور جذبۂ جہاد سے سرشاری تھا جو اپنے سے کئی گنا بڑی قوت کے سامنے ڈٹ جانے سے پیدا ہوا مگر امت مسلمہ کے اتحاد کا منبع خلیفہ کا محض ذاتی مصلحتوں کے پیش نظر غیر جانب دار ہو جانا امت مسلمہ کے لئے تباہی کا پیام لایا بظاہر اس ناول کا مقصد مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی قیادت کے درمیان موجود اختلاف کو یہ پیغام دینا تھا کہ فیصلے کے وقت عظیم مقاصد کو مدنظر رکھا جائے یہ الگ بات کہ وہ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ آخری چٹان اس دور کی اہم ضرورت تھا اور یقیناً اس کی اشاعت نے زخم پر مرہم رکھنے کا کام انجام دیا تھا۔

تحریک پاکستان اپنے آخری مراحل میں تھی اور مسلمانوں میں اتحاد کا فقدان تھا رہنما کانگریس کے زیر سایہ رہ کر مسلمانوں کی آزاد وطن کی خواہش کو ناکام بنانے میں مصروف تھے تو دیگر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے یہ نعرہ لگا رہے تھے کہ ''کٹ کر رہے گا ہندوستان بن کر رہے گا پاکستان'' اول الذکر گروہ اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ ہندوؤں سے وفا کی امید بامعنی ثابت ہوگی تو آخر الذکر افراد منزل کی طرف تو گامزن تھے مگر راہ میں آنے والی دشواریوں سے بے خبر معلوم ہوتے تھے انہوں نے رخت سفر تو باندھا تھا مگر راہ کے پیچ وخم سے ناواقف تھے ان حالات کو محسوس کرتے ہوئے نسیم حجازی نے ایک بار پھر اپنے قلم کی روانی کا سہارا لے کر شاہین کو ضبط تحریر میں لانے کا کام شروع کیا اس ناول کا اکثر حصہ ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء تک مکمل ہو چکا تھا مگر تقسیم کے ناقابل فراموش تلخ دور نے ناول کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کر دی نسیم حجازی نے اس کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''اُندلس کی وہ داستان جسے بیان کر کے میں قوم کو مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا ہندوستان کے طول وعرض میں دہرائی جا چکی ہے، میرے نزدیک اندلس کی طرح ہندوستان میں قتل عام بھی ایک حادثہ نہیں۔ ہم دشمن کے عزائم سے ناواقف نہ تھے۔ اس کی گزشتہ تاریخ ہمارے سامنے تھی۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ متحد اور منظم ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود ہم خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ ہو سکے ہم میں وہ غدار موجود تھے جو مساجد میں کھڑے ہو کر ہندو کی اسلام دوستی کا ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے وہ شکست خوردہ ذہنیت کے لوگ موجود تھے جو یہ تبلیغ کیا کرتے تھے کہ اکثریت اگر آدم خوروں کی ہو تو بھی وہ انسانوں پر حکومت کا حق رکھتی ہے۔''[۱]

یہ خدشات عملی صورت اختیار کر گئے اور خاص طور پر اُن ریاستوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں تھے یا والئی ریاست تھے اس کے علاوہ مشرقی پنجاب میں بہنے والا بے گناہ مسلمانوں کا خون اور اس موقع پر مسلمان حکومت کی بے بسی پھر کشمیر میں ہندوستان کی فوجی مداخلت اور حکومت پاکستان کا واویلہ ان تمام امور کو نسیم نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ ناول کی تکمیل پر دیباچے میں بھی شامل کیا جو یہ ہے:

۱۔ شاہین، نسیم حجازی، ص ۹،۸۔

''مشرقی پنجاب، دہلی، جونا گڑھ اور حیدر آباد دکن کے واقعات کے بعد پاکستان کے مسلمانوں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ پاکستان کے متعلق ہندوستان کے عزائم کیا ہیں۔ کشمیر پر حملہ پاکستان کے خلاف اس کا عملی اقدام ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ برس میں ہندو فسطائیت نے جو مدارج طے کئے ہیں وہ ہمیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کافی ہیں کہ ہندوستان کو ایک فوجی شکست ہی راہِ راست پر لا سکتی ہے۔

کشمیر کی جنگ میں مجاہدین یہ ثابت کر چکے ہیں کہ مسلمان کا لوہا آج بھی ہر لوہے کو کاٹ سکتا ہے۔ محمد بن قاسم محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی کے جانشینوں کا خون ابھی تک سرخ ہے لیکن وہ بڑی جنگ جس کی یہ ایک تمہید ہو سکتی ہے ایک گروہ، ایک فوج اور ایک حکومت کا، دوسری فوج یا حکومت کے ساتھ تصادم نہیں ہوگا بلکہ یہ دو قوموں، دو تہذیبوں اور دو نظریوں کا ایک فیصلہ کن معرکہ ہوگا۔ یہ وہ جنگ ہوگی جس میں کفر اس براعظم سے اسلام کا نام مٹانے کے لئے اپنی قوت کے ساتھ میدان میں آئے گا اور پاکستان کے مسلمان اگر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو اُنہیں اپنے عزم کا ثبوت دینا ہوگا۔

پاکستان کا دفاع سات کروڑ انسانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ یہ قوم کی عورتوں اور بچوں کو اس وحشت و بربریت سے بچانے کا مسئلہ ہے جس کا نمونہ ہم مشرقی پنجاب میں دیکھ چکے ہیں۔ یہ اس دین کے ناموس کا مسئلہ ہے جس کے لیے بدر و حنین، یرموک اور قادسیہ کی جنگیں لڑی گئیں جس کے لئے کربلا کی خاک شہیدوں کے خون سے لالہ زار ہوئی۔ یہ اُس وطن کے تحفظ کا مسئلہ ہے جس کے لئے دس لاکھ سے زیادہ انسان قربان ہو چکے ہیں اگر ہم پاکستان کے کسی حصے پر مشرقی پنجاب کی تاریخ نہیں دہرانا چاہتے تو ہمارے لیے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ عمل کی دنیا میں قوت کا جواب منطق کے ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔ بھیڑیا فقط شیر کے فولادی پنجے کا احترام کرتا ہے بھیڑوں کی منطق سے مرعوب نہیں ہوتا۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری صلح جوئی اور امن پسندی سے ہندوستان اپنی جارحانہ پالیسی ترک کر دے گا لیکن یہ خود فریبی ہے۔ اسی قسم کی خود فریبی جس کا شکار غرناطہ کے مسلمان ہوئے تھے ہمیں یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ فتنہ عظیم جس سے سارے عالم اسلام اور انسانیت کو خطرہ ہے امن کی اپیلوں، صلح کی کانفرنسوں اور بین الاقوامی عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے سے نہیں روکا جا سکتا۔ دنیا میں تلوار کا جواب صرف تلوار ہی دے سکتی ہے۔ ہندوستان پاکستان کے خلاف یکے بعد دیگرے اپنے ترکش کا ہر تیر آزمائے گا اور اس کے جارحانہ ارادوں میں اس وقت تک تبدیلی نہیں آئے گی جب تک اُسے یقین نہیں ہو جاتا کہ پاکستان ایک ایسی چٹان ہے جس سے ٹکرا کر اُسے سر پھوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''[۱]

یہ محض خام خیالی نہ تھی حالات نے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان تقسیم برصغیر کو دل سے قبول کرنے کے حق میں نہ تھا اس کے جارحانہ عزائم برقرار رہے پہلے پہل تو اس نے سلامتی کونسل کی یہ قرارداد منظور کر لی کہ امن و امان ہوتے ہی کشمیر میں استصواب رائے کروایا جائے گا

---

[۱] شاہین، نسیم حجازی، ص ۹، ۱۰۔

مگر دلی بغض اور کینہ کھل کر سامنے آیا ایک طرف ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے خلاف اعلان جنگ کیا تو دوسری طرف مشرقی پاکستان کے غداروں کو عصبیت کی آگ میں جھونک کر بغاوت کی راہ پر گامزن کر دیا ۱۹۶۵ء میں تو پاکستان ڈٹ کر مقابلے پر جما رہا مگر ۱۹۷۱ء آتے آتے مشرقی بازو میں پکنے والا لاوا پھٹ پڑا اور یوں پاکستان دولخت ہو گیا۔ بات یہیں تک ہوتی تو بھی گوارا تھی مگر جارحانہ عزائم کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ سیاچین گلیشیر پر ہندوستان نے فوجی چوکیاں قائم کر دیں اور یوں دنیا کا بلند ترین محاذ جنگ وجود میں آیا پاکستان نے طاقت کے توازن کو درست کرنے کے لیے ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کو ایٹمی دھماکے کیے بین الاقوامی برادری ہندوستانی عزائم اور ایٹمی دھماکوں کو بھول کر ہم پر برس پڑی۔ دسمبر ۲۰۰۱ء سے ہندوستان نے ایک بار پھر سرحدوں پر فوجیں جمع کر دیں اور پاکستان کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرنے لگا نسیم حجازی کے وہ خیالات جنہیں انہوں نے ۱۵ نومبر ۱۹۴۸ء کو ناول شاہین کے دیباچے میں شامل کیا تھا حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہے ہیں۔

اس دوران نسیم حجازی نے محسوس کیا کہ بلوچستان میں ان کا کام مکمل ہو گیا ہے اس لیے انہیں استحکام پاکستان کے لیے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی چاہییں اور یوں انہوں نے تحریک پاکستان کے ساتھیوں سے اجازت حاصل کی ملتان اور لاہور ہوتے ہوئے راولپنڈی پہنچے مگر یہ ان کی منزل تو نہ تھی اُن کے خوابوں کی تعبیر سرسبز و شاداب بلند قامت پہاڑوں کے درمیان ایبٹ آباد کا علاقہ تھا اور تقدیر انہیں یہاں لے آئی جہاں آ کر انہوں نے خوبصورت اور حسین قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ عربی النسل گھوڑے کی سواری کے شوق کو بھی پورا کیا یہ حیران کن بات ہے کہ اس تیز رفتاری کے دور میں کہ جب لوگ سبک رفتار گاڑیوں کے متمنی ہوتے ہیں وہ اکثر و بیشتر کاکول روڈ پر پھولوں کی دو طرفہ قطار کے درمیان گھڑ سواری میں مصروف رہے اس سلسلے میں ''پروفیسر ظفر حجازی نے مجھے بتایا کہ انہیں گھوڑے پالنے کا شوق ناولوں میں اپنے کرداروں کو گھڑ سواری کے لیے مصروف دکھانے کی غرض سے اس کی نسل، چال ڈھال وفاداری سے الغرض ہر حیثیت سے تھا۔''[1]

یہی وجہ ہے کہ نسیم حجازی نے اپنے ناولوں میں گھوڑوں کی شناخت اور اصلیت پر بڑی توجہ دی ہے ساتھ ہی زندگی کے اُن تجربات اور مشاہدات کو ناول میں پیش کیا ہے جو چٹیل میدانوں، خشک پہاڑوں، ریگستانوں سرسبز وادیوں اور بلند پہاڑوں سے متعلق ہیں اتنے خوبصورت اور حسین ماحول کی دلفریبیاں اُن انمٹ دلخراشیوں کو فراموش نہ کر سکیں جو ۱۹۴۷ء میں فسادات کی بدولت رونما ہوئی تھیں نسیم حجازی کے لیے مشرقی پنجاب میں ہونے والے قتل عام کو بھلا دینا زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں چرانے کے مترادف تھا پھر جو آزادی نصیب ہوئی تھی وہ بھی کچھ ادھوری سی معلوم ہوتی تھی اہل کشمیر غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے ان حالات میں کچھ انفرادی کوششوں کی بدولت محدود علاقے پر آزاد کشمیر کا پرچم لہرانے والے آگے بڑھنے کے لیے تیار تھے مگر اقوام متحدہ کی قرار دادیں ان کا راستہ روکنے کا باعث بنیں ان حالات کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اپنا ناول خاک اور خون مرتب کیا جو اپنے اندر ناقابلِ بیان

---

[1] انٹرویو ظفر حجازی مئی ۲۰۰۲ء مملوکہ راقم الحروف۔

حقیقتوں کا وہ طوفان لیے ہوئے تھا جس میں دس لاکھ انسانوں کی قربانیاں اور لا تعداد بے آبرو ہونے والی خواتین کی چیخ و پکار اور اُن بچوں کی آہ و بکا شامل تھی جنہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ انہیں کرپانوں اور بلموں کے ذریعے کیوں قتل کیا گیا کشمیر کے مجاہدین کی وہ کارفرمائی تھی جنہوں نے جنگ بدر کی یاد تازہ کر دی تھی یہ ناول ۱۲ مئی ۱۹۴۹ء کو پایہ تکمیل کو پہنچا اس دوران نسیم حجازی اپنا ناطہ راولپنڈی کے روزنامہ تعمیر سے جوڑ چکے تھے جو ۱۹۵۲ء تک برقرار رہا اس اخبار میں رہ کر انہوں نے بحیثیت صحافی تو مقبولیت حاصل کی مگر جو مقاصد ان کے پیش نظر تھے یعنی اہلِ پاکستان کو پاکستان سے محبت کا درس دینا، ملکی استحکام کے لیے تیار کرنا، دشمن کی سازشوں کو بے نقاب کرنا مختصر یہ کہ لوگوں میں اپنے وطن کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ بیدار کرنا۔ اس شعور کو اجاگر کرنے کے لیے بعض پابندیاں محسوس ہوئیں اس لیے انہوں نے اس اخبار سے علیحدگی اختیار کی اور عنایت اللہ کے ساتھ مل کر روزنامہ کوہستان جاری کیا۔ پہلے پہل یہ اخبار راولپنڈی سے جاری ہوتا تھا مگر بعد میں اس کا دائرہ اثر لاہور اور ملتان سے بڑھا اس اخبار کی شہرت بے باکی اور آزاد صحافت کی بنیاد پر تھی اس لیے نسیم حجازی کے قلم سے لکھے جانے والے بے شمار یادگار اداریے اخبار کی شہرت کا باعث بنے جن میں سندھ طاس معاہدہ، معاہدہ تاشقند اور پاک بھارت جنگ کے موضوعات قابلِ ذکر ہیں اس کے علاوہ مسئلہ ختم نبوت پر بھی عوامی شعور بیدار کرنے میں کوشاں رہے وہ محض اخبار سے اپنی صحافتی حیثیت مسلم کرنے میں مصروف نہ تھے بلکہ صحافت سے وابستہ کارکنوں کے مسائل کو بھی حل کرنا چاہتے تھے اس سلسلے میں انہوں نے اخباری ملازمین کے لیے رہائشی اسکیم شروع کرنا چاہی جو شرمندہ تعبیر نہ ہو سکی ساتھ ہی اخبار کو اس کی خبریت و دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ طباعت کی جدتوں سے بھی روشناس کروایا اس اخبار نے پہلے پہل آفسٹ طباعت کا طریقہ اختیار کیا اس کے ساتھ ساتھ ایڈیشن مذہبی کالم، خواتین اور بچوں کے صفحات، کارٹون کی طنز و مزاح سے بھرپور روایت شروع کی نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار اشاعت کے اعتبار سے ملک کے صف اول کے روزناموں میں شمار کیا جانے لگا سازشی عناصر کو یہ صورت ہرگز نہ بھائی ایک ملازم کو ساتھ ملا کر اخبار میں ایک غلط خبر شائع کروا دی نتیجہ اخبار کی بندش اور جیل جانے کی صورت میں سامنے آیا۔ اس دوران ان کے قلم کی بے باکی کو قابو کرنے کی مختلف کوششیں ہوئیں نسیم حجازی نے مجھے بتایا:

"ایک مرتبہ نواب کالا باغ نے چھ مربع زمین قومی خدمات کے صلے میں دینے کی پیشکش کی میں نے کہا کہ مجھے نہیں چاہیے اور مجھے لگتا ہے کہ آپ زمینیں دے کر مجھے الجھانا چاہتے ہیں میرے لکھنے پڑھنے کے کام سے آپ مطمئن نہیں وہ حیران اور ہکا بکا رہ گئے اور کہنے لگے کہ تم اپنے آباء و اجداد کے پیشے سے محبت نہیں کرتے (اس موقع پر میں نے سوال کیا کہ آپ کو زمین نہ لینے کا افسوس ہوا ہوگا) کہنے لگے ہرگز نہیں۔ مجھے اپنے پبلشر کی طرف سے اتنی معقول رقم آج بھی ملتی ہے کہ زندگی کے دن بڑے آرام سے گزار رہا ہوں"[۱]

جب لالچ اور تحائف کے ذریعے نسیم حجازی کو نہ روکا جا سکا تو حکومت نے چہار جانب سے شکنجہ کسنا شروع کیا کہ ہماری پالیسی پر عمل کرو ہمارے خلاف کچھ نہ لکھو یہ وہ حالات تھے کہ جن کا سامنا یہ باہمت اور نڈر شخص نہ کر سکا اور ۱۹۶۶ء میں کوہستان سے علیحدگی اختیار کر لی

۱۔ انٹرویو نسیم حجازی: جولائی ۱۹۹۲ء بمقام کرم قلم الحروف

بظاہر یہ علیحدگی تھی لیکن قلم سے اٹوٹ رشتہ تادم مرگ جاری رہا کنونشن مسلم لیگ نے اخبار خرید لیا اور وہ اس واقعے کو کبھی فراموش نہ کر سکے ڈاکٹر تصدق حسین راجہ نے اس واقعے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں یہ اخبار نسیم حجازی سے گورنمنٹ نے لے لیا تھا جس کی داستان آج بھی بیان کرتے وقت ایک عجیب درد و کرب کی کیفیت اُن پر طاری ہو جاتی ہے! انہیں بعد میں یہ پیشکش ہوئی کہ آپ کوہستان کی ادارت قبول کر لیں لیکن انہوں نے اسے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ 'صدر محترم اب اخبار آپ کا ہو گا پالیسی آپ کی چلے گی اس کے لیے نسیم حجازی کا قلم استعمال نہیں ہو سکتا اسے معاف فرمایئے اور یہ اعزاز کسی اور کو بخشیے۔''[1]

البتہ اس بات پر مطمئن تھے کہ صلاح الدین صحافت کے شعبے میں اُن کی خواہشات اور تمناؤں کی تکمیل کے فریضے کو مقصد حیات بنائے ہوئے ہیں مگر اس کا کیا کیجیے کہ ان کا یہ محبوب وارث اُن کی زندگی ہی میں قتل کر دیا گیا۔

ایک طرف نسیم حجازی کوہستان سے وابستہ رہے تو دوسری طرف ناول نگاری سے ان کا رشتہ جڑا رہا ۱۹۵۱ء میں اُن کا ناول یوسف بن تاشفین شائع ہوا اس ناول میں انہوں نے اُندلس کے مسلمانوں کی طوائف الملوکی کا تفصیلی حال بیان کر کے افریقہ کے ریگزاروں سے یوسف بن تاشفین ایسے رجل عظیم کو ان کے نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا ہے جس نے اسپین میں ایک بار پھر مسلمانوں کی حکومت کو قیام اور استحکام بخشا تقریباً ایک صدی تک اس کے اثرات اجتماعیت اور اتحاد کی علامت کے طور پر برقرار رہے مگر نفاق کے بیج نے ایک بار پھر جڑ پکڑی اور پروان چڑھنے لگا یہ ناول بظاہر انحطاط پذیر مسلم معاشروں کا مرثیہ ہیں مگر اہل پاکستان کے لیے ایک پیغام بھی تھے کہ اتحاد و یگانگت اور اخوت و مساوات ان کی بقا کی ضامن ہیں اس کے بعد نسیم حجازی نے محمود غزنوی کی ولولہ انگیز شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے اپنا ناول آخری معرکہ تحریر کیا جو ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول موضوع کے اعتبار سے ہندو سماج کے نظام پر ایک کاری ضرب اور اسلام کے تصورِ اخوت و مساوات کا مظہر کہا جا سکتا ہے میرے خیال میں یہ ناول ان کے ابتدائی ناول انسان اور دیوتا کا دوسرا حصہ کہلائے جانے کا مستحق ہے کیونکہ جو سوالات اس ناول میں پیدا ہوئے تھے جن کی تلاش میں انسانیت بھٹک رہی تھی اُن کا جواب اور حل اس ناول کے ذریعے پیش کیا گیا ہے میں نے انٹرویو کے موقع پر یہی سوال کیا تھا کہ اگر انسان اور دیوتا کا اختتام محمد بن قاسم یا محمود غزنوی کی آمد پر کیا جاتا تو ناول اپنے منطقی انجام کو جا پہنچتا جس پر وہ کہنے لگے:

''انسان اور دیوتا لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندو فاشزم اور معصیت سامنے تھی ہندو کا اصلی چہرہ میں نے دیکھ لیا تھا چونکہ ہندو کے نزدیک دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے اچھوت کا گلا کاٹ دینا ایک عام بات تھی ہندو کی اس فطرت سے اپنی قوم کا باخبر کرنا میری ذمہ داری تھی تم پر بھی یہ وقت آ سکتا ہے ہوشیار ہو جاؤ کہیں شودر کی طرح تمھیں ذبح نہ کر دیا جائے۔''[2]

بات کسی حد تک درست تھی اور چونکہ اس کا جواب آخری معرکہ میں موجود تھا اس لیے انہوں نے بوجہ مصلحت خاموشی اختیار کی ہو گی۔

---

[1] نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۲۲۔

[2] انٹرویو نسیم حجازی، جولائی ۱۹۹۲ء، مملوکہ راقم الحروف۔

نسیم حجازی نے ناول نگاری کا آغاز حجاز کی وادیوں سے اٹھنے والے اس طوفان کو پیش کر کے کیا تھا جس کے سامنے دریاؤں کی گہرائیاں اور پہاڑوں کی وسعت حائل نہ ہوتی تھی جس کے گھوڑے ریگستانوں کی گرم ریت پر منہ نہ موڑتے تھے وہ آگے اور آگے کی جانب بڑھنے کا حوصلہ لیے اپنی پھٹی پرانی عباؤں کے ساتھ بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار میں جانے سے نہ شرماتے تھے جن کی فتح اقبال کا طوطی وسط ایشیا تک ہندوستان کے میدانوں اور اندلس کی وادیوں کو روندتا ہوا فرانس کی سرحدوں پر دستک دے رہا تھا لیکن جلد ہی نسیم حجازی نے ہندوستانی معاشرے اور ہندو تہذیب کا پردہ فاش کر کے ذات پات کی اونچ نیچ پر کاری ضرب لگائی۔ گونگے بہرے دیوتاؤں کو اس سرزمین پر بت شکن مسلمانوں کی روانی کو سومنات تک نہ روکا جا سکا ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور اقتدار کا خاتمہ کس طرح ہوا یہ بات اپنی نوجوان نسل کے سامنے لائی جائے وہی تاریخ جو ہسپانیہ کا حصہ ہے ہندوستان میں بھی دہرائی گئی مسلمانوں کو ان کی فرقہ بندی، عصبیت اور مرکز سے ناطہ توڑنے کی سزا ملی۔ انفرادی کوشش اجتماعی مقاصد کو نہیں پا سکتیں اور یہی کچھ ہندوستان میں ہوا۔ اس تاریخ کو ناول ''معظم علی'' کے ذریعے پیش کرنے کی ابتدائی کوشش ناول ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' کے ذریعے تکمیل کو پہنچی ہے ان دونوں ناولوں کی اشاعت ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء میں ہوئی یہ ناول بنگال سے دہلی تک کی تاریخ کا ایسا اظہار ہیں کہ جہاں اپنوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا اقتدار جاتا رہا اور مفاد پرست مسلمان حکمران کٹھ پتلی بن کر مسند حکومت حاصل کرتے رہے۔ مسلمان علماء کی کوششوں سے احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے مقام پر مرہٹوں کے ٹڈی دل کو عبرت ناک شکست دی مگر میسور میں مسلمانوں کا ایک مضبوط قلعہ ٹیپو سلطان جیسی شخصیت کی بدولت انگریزوں کی آنکھ میں کھٹک رہا تھا بیرونی سازشوں میں نواب حیدر آباد کی شرکت اور پھر میسور کے غداروں نے اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو بجھانے میں اپنے ناپاک عزائم منظم کیے ان ناولوں کا مقصد ہندوستان کے اُن حکمرانوں کی جوانمردی، دلیری اور ہوش مندی سے نوجوان نسل کو باخبر کرنا ہے جو بزدلی کی بجائے شجاعت وعزیمت کے راستے پر گامزن رہے شہادت ان کا مقدر بن کر رہی یہی وجہ ہے کہ ان کی دھاک دشمنوں کے دلوں کو طویل عرصے تک دہلاتی رہی اور اسی مٹی نے جس پر ان کا خون گرا تھا وہ سپوت پروان چڑھائے جو غلامی کی زنجیروں کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے۔ حجاز کی نسبت سے خود کو متعارف کروانے والے کو یہ خیال آیا کہ اب تک لکھے جانے والے تمام ناولوں کی بناء اسلام کے دورِ زریں سے شروع کر کے دورِ زوال پر ہوئی ہے ان خامیوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جو انحطاط کا باعث بنیں کیوں نہ عرب کے معاشرے کو اس کے دورِ جاہلیت کے ساتھ پیش کیا جائے پھر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں نور کی کرنیں بکھیرنے نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کے مثالی دور اور ان کی تربیت میں کندن بنے ہوئے صحابہ کے زمانے کا ذکر کیا جائے اس خیال کی تکمیل کے لیے قیصر و کسریٰ کو لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا ابھی یہ ناول اپنے ابتدائی مدارج طے کر رہا تھا کہ ایک خیال نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا جس کی تفصیل مجھے اس طرح بتائی:

''حجاز جانے کا اتفاق اس وقت ہوا کہ جب میں قیصر و کسریٰ کا ایک حصہ لکھ چکا تھا مجھے خیال آیا کہ اے بدبخت تو نے وہ جگہ تو دیکھی نہیں لکھتا کیوں ہے؟ میں نے قلم پھینک دیا اور کوشش شروع کی پتہ چلا کہ ایوب خان کے ساتھ سرکاری وفد میں شامل ہو کر جانے

کی ایک سبیل بن سکتی ہے اور یوں میں حجاز جا پہنچا میں سوچا کرتا تھا کہ روضۂ رسول پر میری کیا حالت ہوگی لیکن ہوا یوں کہ ہم مدینہ پہنچے تو اندھیرا ہو چکا تھا عشاء کا وقت تھا گاڑی سے اتر کر مسجد کی طرف چلے مجھے معلوم نہ تھا لیکن پیر آگے کو نہ اٹھتے تھے جسم تھکا تھکا جب میں نے نماز ختم کی تو معلوم کیا کہ یہ کیا جگہ ہے تو ساتھیوں نے بتایا کہ آپ کا کاندھا روضۂ رسول کے ساتھ لگا ہے یہ جان کر میرا پورا جسم کانپ اٹھا۔''[1]

واپسی پر اسے مکمل کیا یہ تو وہ انٹرویو ہے جو انہوں نے مجھے دیا تھا لیکن ایک اور موقع پر قیصر و کسریٰ لکھنے کے بارے میں اپنے تاثرات اس طرح بیان کیے:

''قیصر و کسریٰ'' میرا ایک ایسا ناول ہے جس کا مواد کئی برس قبل میرے ذہن میں موجود تھا لیکن مجھے قلم اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی کیونکہ اس کے لیے تین براعظموں کی تاریخ کا وسیع مطالعہ کرنے کی ضرورت تھی! میں نے عمرہ سے واپس آ کر یہ کام جسے میں اپنی زندگی کا اہم ترین کام سمجھتا ہوں شروع کیا اور ۶۳-۱۹۶۲ء کے دوران یہ ناول مکمل کر لیا۔ اس کے لیے میں نے بیروت سے ایک نیا قلم خرید احرم مکہ میں داخل ہوتے ہی اسے آبِ زم زم میں ڈبویا پھر جب میزاب رحمت کے نیچے نماز پڑھ رہا تھا تو بارش ہو رہی تھی میں نے قلم نکال کر میزاب رحمت کے نیچے رکھ دیا۔

میں ''قیصر و کسریٰ'' کے عنوان سے اس دور کی منظر کشی کرنا چاہتا تھا جب یہ دنیا آفتاب رسالت مآب کی ضیا پاشیوں سے منور ہونے والی تھی اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میرے قلم سے کوئی لغزش نہ ہو جائے میں تین دن مکہ مکرمہ میں رہا اور کئی بار تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہ بارش جاری رہی میں میزاب رحمت کی دھار کے نیچے بیٹھ کر نوافل پڑھا کرتا تھا ایک دن ایک افریقی نوجوان چادر بچھا کر میرے ساتھ کھڑا ہو گیا اور اس کی چادر کے کئی رنگ میرے کپڑوں میں پھیل گئے۔

آج میں جب اپنے ماضی پر غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری زندگی کے بہترین لمحات وہی تھے جو میں نے ''قیصر و کسریٰ'' لکھنے میں صرف کیے تھے اور میں اُسے اللہ جل شانہ کا خاص انعام سمجھتا ہوں کہ میں تین براعظموں کے وہ اہم مقامات دیکھ چکا تھا جن کے پس منظر میں یہ ناول لکھا گیا ہے۔''[2]

اس ناول کی تکمیل سے جہاں ایک بوجھ کم ہوتا محسوس ہوا وہیں اس خیال نے دل میں گھر کر لیا کہ موضوع کی وسعت مزید کچھ لکھنے کی متقاضی ہے یہ خیال ابھی ذہن کے گوشوں میں صدائیں دے رہا تھا کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں محب وطن جیالوں نے ہر میدان میں دشمن کے دانت کھٹے کیے اور اپنے اتحاد و یگانگت سے یہ ثابت کیا کہ مدینہ کی طرح پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اس کی حفاظت جان کی قربانی دے کر بھی کی جائے گی نسیم حجازی نے اس موقع پر اس ضرورت کو محسوس کیا کہ وطن سے محبت اور نظریے سے لگن پیدا کرنے کے لیے صحابہ کرام بالخصوص خلفائے راشدین کے واقعات اور اس عہد کی جنگوں کا حال پیش کیا جائے جو باعث تقلید ہی نہیں کامیابیوں

---

[1] انٹرویو نسیم حجازی: جولائی ۱۹۹۲ء مملوکہ راقم الحروف۔

[2] نسیم حجازی اپنے بارے میں کیا فرماتے ہیں مشمولہ نسیم حجازی۔۔ ایک مطالعہ ص ۳۰۶، ۳۰۷۔

کی راہوں پر گامزن رہنے کے لیے صراط مستقیم ثابت ہوں گی اور یوں ۱۹۶۸ء میں ''قافلہ حجاز'' مکمل ہو کر شائع ہوا لیکن یہ دور ملکی سیاست میں انتشار اور نسیم حجازی کی ذاتی زندگی میں ہیجانی کیفیت کا تھا اس تلخ و ترش دور میں جہاں سابقون اور اولون کے کارہائے نمایاں قرطاس پر منتقل ہو رہے تھے وہیں صحافتی حیثیت سے نسیم حجازی کو کوہستان سے علیحدگی پر مجبور کیا جا رہا تھا ایک طرف صحابہ کرام کی زندگی میں ثابت قدمی اور صبر کی عظیم داستانیں جہاد کی راہ پر گامزن واقعات کو قلمبند کرنے کا باعث ہو رہی تھیں وہیں عملی زندگی میں حق کی راہوں کو چھوڑ کر مصلحت کی راہوں پر گامزن رہنے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں نسیم حجازی نے ماضی کے دھندلکوں میں جھانکا اور عزیمت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے دنیاوی منفعتوں کو خیر باد کہتے ہوئے کوہستان سے علیحدگی اختیار کر لی ملکی سیاست انتشار کا شکار تھی صدر ایوب خان کے اقتدار کا سورج غروب ہو رہا تھا لیکن آمریت کی پٹڑی پر چلنے والی گاڑی کے محض ڈرائیوروں کی تبدیلی کا عمل دہرایا جا رہا تھا آغا محمد یحییٰ خان اس وعدے کے ساتھ مسندِ اقتدار پر متمکن ہوئے کہ جلد ہی آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کروائیں گے۔

انتخابات دسمبر ۱۹۷۰ء میں منعقد ہوئے جس سے قبل طویل انتخابی مہم چلائی گئی نتائج کے مطابق عوامی لیگ نے سادہ اکثریت حاصل کی مگر ارباب اقتدار نے اقتدار عوامی نمائندوں کے حوالے کرنے کے بجائے انتشار کی سیاست کو فروغ دیا مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی پیدا ہو گئی جسے بڑھانے میں ہندوستانی حکومت کی کلی حمایت موجود تھی محض چوبیس سال بعد عالمی منظر نامے پر ابھرنے والی سب سے بڑی اسلامی ریاست دولخت کر دی گئی ادیب انتہائی حساس ہوتا ہے نسیم حجازی ۱۶۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی اس تاریخی حقیقت کو جسم و جان پر اس قدر غالب کر گئے کہ کچھ کرنے کی ہمت باقی نہ رہی جس کا اظہار انہوں نے اپنے ناول ''اندھیری رات کے مسافر'' کے پیش لفظ میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''جب میں نصف سے زیادہ کام ختم کر چکا تو ڈھاکہ کے سقوط کا عظیم المیہ پیش آیا اور اس کے بعد تقریباً تین مہینے کسی پُرسان حال کو اتنا بھی نہ لکھ سکا کہ میں زندہ ہوں میں اپنے دل سے بار بار یہ پوچھا کرتا تھا کیا سقوط بغداد اور سقوط غرناطہ کی داستانیں مسلمانوں کی عبرت کے لیے کافی نہ تھیں؟ کیا ڈھاکہ کے سقوط کے نتائج صرف مشرقی پاکستان تک ہی محدود رہ سکیں گے۔۔۔۔؟

۱۹۷۲ء کی گرمیوں کے آغاز میں ذرا سنبھلتے ہی میں نے اپنے دل میں یہ عہد کیا تھا کہ اگلے سال مارچ تک یہ کتاب ختم کر لوں گا لیکن میرے ذہن پر سقوط ڈھاکہ کے شدید اثرات ابھی تک باقی تھے چنانچہ نومبر میں اعصاب کی تھکن نے ایک مستقل بیماری کی صورت اختیار کر لی اور قریباً چھ ماہ تک میں چند صفحات سے زیادہ نہ لکھ سکا۔''[1]

یہی وجہ ہے کہ ناول اندھیری رات کے مسافر ۱۹۷۹ء کو پایہ تکمیل کو پہنچا اس ناول میں نسیم حجازی نے تفرقات کے سبب اسپین سے مسلمانوں کی بے دخلی کو پیش کیا ہے اجتماعیت کے فقدان اور جذبۂ جہاد سے دوری نے مسلمانوں کو محکوم بنا دیا اس ناول کا موضوع اس وقت تک نامکمل رہا جب تک اس سلسلے کا دوسرا ناول ''کلیسا اور آگ'' کے نام سے ۱۹۸۷ء میں شائع نہ ہو گیا جس نے تاریخ سے پردہ

---

[1] اندھیری رات کے مسافر، نسیم حجازی، ص ۷،۶۔

اٹھا کر مسلم قوم کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مذاکرات اور صلح کی راہوں پر گامزن رہنے والے پہلے حاکم سے محکوم بنائے جاتے ہیں اور پھر ان کا مذہبی تشخص بھی ان سے چھین لیا جاتا ہے محض بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جب وہ اپنے ان آقاؤں کی خواہش پر اپنے دین کو تبدیل بھی کرلیں تو بھی انہیں معاشرے میں جذب ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی بلکہ اذیتیں دے کر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔

نسیم حجازی ۱۹۷۸ء کے بعد افغانستان میں روسی مداخلت کا مشاہدہ کرتے رہے اس سلسلے میں وہ جنرل حمید گل کے کردار سے انتہائی متاثر تھے وہ اس عظیم مجاہد اور افغانستان کے حریت پسندوں سے عقیدت کے اظہار میں ایک ناول رقم کرنا چاہتے تھے لیکن اس سے قبل انہیں ماضی کی وہ یادیں ستا رہی تھیں جن کا کچھ اظہار وہ اپنے ناول ''خاک اور خون'' میں کر چکے تھے لیکن ان کا خیال یہ تھا کہ تقسیم برصغیر کے نتیجے میں ہجرت کے تجربات سے گزرنے والے خاندانوں کی منزل مقصود توقعات کے مطابق رہی یا خواب چکنا چور ہو گئے وہ کون سے مسائل تھے جو اس مسرت اور شادمانی کو دوبالا کرنے کی بجائے افسردگی کا باعث بنے اس خیال کو لفظی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے ایک معاشرتی ناول ''پردیسی درخت'' کے نام سے قلم بند کرنا شروع کیا اس زمانے میں عمر کی طوالت اور بیماریوں نے ضعف میں مبتلا کر دیا معالجین کی رائے یہ تھی کہ مکمل آرام کیا جائے مگر آرام طلبی اور یکسوئی نے ماضی کی یادوں کو دوبارہ سامنے لا کھڑا کیا قدرت مہربان تھی انہیں ایک معاون مل گئی جس نے اُن کی یادداشتوں کو مسودے کی شکل دینے میں بہت مدد کی ناول موضوع کا احاطہ توڑ کر پھیلتا چلا گیا۔ ۱۹۸۹ء میں ''پردیسی درخت'' شائع ہو گیا مگر موضوع کی وسعت ایک دوسرے ناول کی متقاضی تھی جسے گم شدہ قافلے کے نام سے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا گیا ان ناولوں میں انہوں نے ذاتی تجربات اور مشاہدات بیان کیے ہیں گو وہ اسے اپنی آپ بیتی کہنے کے لیے کبھی تیار نہ ہوئے لیکن ان کے ذاتی حالات کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان ناولوں کے موضوعات اور ان کی زندگی میں اتنی مماثلت ضرور رہی ہوگی کہ یا تو یہ واقعات حقیقی ہیں ورنہ ان کی خواہش یا مشاہدے میں ضرور رہے ہوں گے۔

نسیم حجازی افغانستان سے بہت متاثر تھے کیونکہ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کو مضبوط اور مستحکم بنانے میں افغانوں کا ایک بڑا کردار رہا ہے پھر اس کی سرحدیں موجودہ پاکستان کے بڑے حصے سے ملتی ہیں سوویت یونین کی مداخلت اور اس کے خلاف افغان مجاہدین کا مقابلے پر آ جانا در حقیقت پاکستان کی بقاء و سلامتی کے لیے جہاد تھا نسیم حجازی افغانستان جانا چاہتے تھے مگر قسمت ان پر مہربان نہ ہو سکی وہ افغانستان اور وہاں کار فرما شخصیات سے اس قدر متاثر تھے کہ اپنے ناول گمشدہ قافلے کو حمید گل کے نام کرتے ہیں اس کے علاوہ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ:

''میں چاہتا ہوں کہ افغانستان کے حوالے سے ایک ناول لکھوں جسے حمید گل کے نام کر دوں مجھے اس شخص میں بڑی خوبیاں دکھائی دیتی ہیں اس کی آنکھیں شاہین کی طرح ہیں اور شخصیت عقاب کی مانند ہے وہ ہمارا ایک خزانہ ہے انتہائی بیدار مغز شخص ہے میں اسے افغان جہاد کا بانی سمجھتا ہوں انتہائی تیز و طرار آدمی ہے۔''[۱]

---

[۱] انٹرویو نسیم حجازی: جولائی ۱۹۹۲ء مملوکہ راقم الحروف۔

اس بارے میں اُن کے بھتیجے نے اپنے خط میں مجھے لکھا کہ:

''جن دنوں افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جہاد ہو رہا تھا اکثر افغان مجاہدین اور کمانڈر نسیم حجازی سے ملنے آئے وہ انہیں مل کر بہت خوش ہوتے اور کہا کرتے تھے کہ آپ کا جذبہ ایمان ہر امتحان میں پورا اتر رہا ہے مگر آپ کے تدبر کا امتحان بھی ہوگا جو تب شروع ہوگا جب افغانستان سے روسی نکل رہے ہوں گے خدا کرے آپ اس امتحان میں بھی پورے اتریں ان کے اندیشے سچ ثابت ہوئے بعد میں افغانیوں کے درمیان ہونے والی جھڑپوں کی خبریں سن کو وہ بہت پریشان ہوتے تھے اور اسی پریشانی میں شاید افغانستان کی جنگ کے موضوع پر لکھی جانے والی کتاب جس کا نام ''زندہ پہاڑ'' تھا انہوں نے تلف کردی ان کی وفات کے بعد میں نے ان کے سارے کاغذات الٹ پلٹ کر دیے مگر اس کتاب کے مسودہ کا کوئی حصہ مجھے نہیں ملا۔''[۱]

اس کے علاوہ انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا:

''جہاں تک مستقبل کے پروگرام کا معاملہ ہے اس کا تعلق میری صحت سے ہے اب احباب مسلسل اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ میں اپنی یادداشتیں قلمبند کرتا جاؤں اور میری خواہش یہ ہے کہ اس سے پہلے میں افغانستان میں آگ و خون کے طوفانوں کے پس منظر میں ایک ناول لکھ ڈالوں لیکن کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے جیسے آدمیوں کی زندگی کے کام قریباً ادھورے رہ جاتے ہیں۔''[۲]

افسوس یہ خدشہ سچ ثابت ہوا خواہش نا تمام رہ گئی زندگی طویل راہوں پر چلتے چلتے تھک سی گئی تمام کاموں کو ادھورا چھوڑ کر راہی عدم ہونا پڑا۔ اہلیہ کی موت ایک ایسا صدمہ تھی جس سے وہ کبھی جانبر نہ ہو سکے جھوٹی تسلیاں اور دل کو بہلانے کے تمام تر حیلے بہانے تھک سے گئے ہمت ٹوٹ گئی وہ شخص جو سب کو حوصلہ دیتا تھا خود ہمت ہار بیٹھا بستر پر لیٹے رہنا، سہارے کی مدد سے اٹھ بیٹھنا، پھر لیٹ جانا شب و روز کی مسافت رواں دواں رہی یادداشت نے بھی ساتھ چھوڑ دیا صرف بڑی بہو شہناز کا نام یاد رہ گیا جسے وہ نازو کہہ کر پکارتے تھے شدید بیماری کی اطلاع بڑے بیٹے خالد نسیم کو دی گئی جو اس زمانے میں کوئٹہ میں مقیم تھے فروری کے اواخر میں اُن کی آمد بھی موت کے فرشتے کی قربت کو نہ ٹال سکی۔ شدید بیماری اور مسلسل نقاہت کے پیش نظر یکم مارچ ۱۹۹۶ء بمطابق ۱۰ شوال المکرم ۱۴۱۶ھ جمعۃ المبارک بروز پیر ۸۲ سال کی عمر میں رات گیارہ بج کر پنتالیس منٹ پر اردو کی تاریخی ناول نگاری کے قد آور مصنف نسیم حجازی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن انہیں اگلے روز سپرد خاک کیا گیا ان کی نماز جنازہ دو مرتبہ ادا کی گئی۔ ان کی موت پر ملک کے ادبی و سیاسی حلقوں نے شدید رنج و غم کا اظہار کیا ایک خبر کے مطابق:

''ملک کے ممتاز ادیب و دانشور نسیم حجازی کے انتقال پر مختلف سیاسی اور سماجی تنظیموں کے رہنماؤں نے گہرے دکھ کا اظہار کیا امیر جماعت اسلامی مولانا جان محمد عباسی، امیر جماعت اسلامی کراچی نعمت اللہ خان ایڈووکیٹ، قومی اسمبلی کے رکن مظفر احمد ہاشمی

۱۔ مکتوب ظفر حجازی بنام راقم، ۳۰ جون ۲۰۰۲ء، ص ۲۔

۲۔ نسیم حجازی۔۔۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۳۱۰۔

جماعت اسلامی کراچی کے سیکریٹری اطلاعات شاہد احمد شمسی وزیر اعلیٰ سندھ کے مشیر اقبال یوسف، قائد اعظم رائٹر گلڈ پاکستان کے سپریم کونسل کے اراکین جلیس سلاسل، ملک افروز روہیلہ شامل ہیں۔"[۱]

ایک اور اخباری اطلاع کے مطابق:

"ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین نے ناول نگار اور متعدد تاریخی ناولوں کے مصنف نسیم حجازی کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا انہوں نے کہا کہ نسیم حجازی نے تاریخی ناول نگار کے شعبہ میں جو خدمات انجام دیں وہ اُردو ادب کا سرمایہ ہیں اور ان کی خدمات کے حوالے سے نسیم حجازی کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ الطاف حسین نے مرحوم نسیم حجازی کی مغفرت اور آپ کے بلند درجات کی دعا بھی کی۔"[۲]

ادارتی نوٹ میں انہیں ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا گیا:

"ممتاز صحافی" صاحب طرز ادیب اور مشہور ناول نگار جناب نسیم حجازی ۸۴ سال کی عمر میں گزشتہ روز راولپنڈی میں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن مرحوم نسیم حجازی گزشتہ دو سال سے صاحب فراش چلے آ رہے تھے اس کے باوجود انہوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ مرحوم نے اپنے دورِ شباب میں تحریک پاکستان میں سرگرمی سے حصہ لیا اور قیام پاکستان کے بعد گورداسپور سے ترک وطن کر کے پاکستان چلے آئے مرحوم کا شمار ان ممتاز افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے بلوچستان میں تحریک پاکستان کو مقبول بنانے اور اسے پاکستان میں شامل کرنے کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا۔ مرحوم نے کئی شہرہ آفاق ناول لکھے ان کے ناول اسلامی تاریخی ادب کا شاہکار سمجھے جاتے ہیں انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ ملت اسلامیہ کی عظمتِ رفتہ کو نہایت سبق آموز انداز میں پیش کیا وہ ایک ممتاز صحافی بھی تھے اور روزنامہ زمانہ اور تعمیر میں خدمات انجام دینے کے بعد کوہستان کا اجراء کیا۔ جس نے صحافت کی دنیا میں نہایت بلند مقام حاصل کیا مرحوم کم و بیش نصف صدی تک صحافت اور علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ روزنامہ کوہستان میں انہوں نے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ان کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کے حوالے سے انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔"[۳]

اس کے علاوہ ڈاکٹر انور سدید نے ان الفاظ میں نسیم حجازی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے:

"نسیم حجازی اگرچہ ۸۴ برس کی پختہ عمر میں فوت ہوئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نوعمری میں موت آ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیرانہ سالی ہونے کے باوجود ان کا قلم جوان تھا اور وہ اسلامی تاریخ کے ان اولوالعزم فاتحین کی زندگی کے تاریخی حالات ناول کے وسیلے سے پیش کر رہے تھے جن کا اسوۂ عمل و ایثار آج کی نوجوان نسل کے لیے نشانِ راہ ہے۔"[۴]

---

۱ ۳ مارچ ۱۹۹۶ء روزنامہ جنگ کراچی۔

۲ ایضاً۔

۳ روزنامہ جنگ کراچی: نسیم حجازی کی رحلت ۴ مارچ ۱۹۹۶ء۔

۴ نسیم حجازی اسلامی تاریخ کا شیدائی: ڈاکٹر انور سدید روزنامہ جسارت کراچی ص ۵، ۹ ب۔

نسیم حجازی کی زندگی کا وہ رخ جسے اکثر اخبارات نے پیش کیا تاریخی ناول کی حیثیت پر مبنی ہے جبکہ بعض دیگر دانشوروں نے انہیں تحریک پاکستان کا کارکن اور اُردو صحافت کا ایک درخشندہ ستارہ قرار دیا ویسے تو ہمارے موضوع کا تعلق بھی اُن کی تاریخی ناول نگاری تک محدود ہے لیکن ان کے مزاحیہ ناولوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا اس کے علاوہ اُن کا ایک سفر نامہ بھی موجود ہے۔ سب سے پہلے جس مزاحیہ ناول کا ذکر کریں گے وہ ''سو سال بعد'' ہے جو ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا اس کے بعد ''سفید جزیرہ'' ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا جس میں ملک میں آنے والے مارشل لاء پر طنز کیا گیا ہے اور حکومت کرنے کے رائج حیلے بہانے رائج ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں جبکہ ''ثقافت کی تلاش'' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں ہندوستان کی ناکامی اور پاکستان کی جواں مردی، ہمت و استقلال کو طنز و مزاح کے ساتھ ''پورس کے ہاتھی'' کے نام سے ۱۹۶۵ء میں پیش کیا یہاں ہندوستانی ٹینکوں کو تمثیلی طور پر پورس کے اُن ہاتھیوں سے تشبیہ دی ہے جو سکندر کی افواج کے سامنے نہ ٹھہر سکے تھے کیونکہ ہندوستانی فوج تمام تر چالاکی و عیاری کے باوجود اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکی اگر ان چاروں تخلیقات کا تجزیہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ طنز و مزاح نسیم حجازی کا میدان نہ تھا ہلکی سی مسکراہٹ اور ذہنی طور پر مسرور کرنے کی کیفیت تو پیدا کرتے ہیں مگر پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی جیسا طنز و مزاح اُن کے یہاں موجود نہیں ایک سفر نامہ ''پاکستان سے دیار حرم تک'' ۱۹۶۰ء میں کتابی شکل میں مرتب کیا جسے اپنے اخبار کوہستان میں اقساط کی صورت میں شائع کر چکے تھے یہ ایک سفر نامہ نہیں تاثرات اور محسوسات کی وہ کیفیت ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ ان کے سفر نامے میں جہاں بہت سی معلومات موجود ہیں وہیں تشنگی کا احساس محسوس ہوتا ہے کیونکہ جو لوگ ممتاز مفتی کا سفر نامہ ''لبیک'' پڑھ چکے ہیں اُن کے لیے اس سفر نامے کی معلومات کچھ نئی اور کچھ پرانی محسوس ہوں گی سیر و سیاحت کا شوق نسیم حجازی کی زندگی کا ایک ایسا باب ہے جو اُن کے ناولوں کو حقیقت کے قریب تر لے گیا ہے انہوں نے بے شمار ممالک کا سفر کیا اور بہت سے ایسے مناظر قدرت اور مقامات بہ چشم خود دیکھے جن کا تذکرہ اپنی تحریروں میں کر رہے تھے یہی وجہ ہے کہ اُن کی تحریروں میں انتہائی باریک بینی اور مشاہدہ کی نزاکت محسوس کی جا سکتی ہے۔

نسیم حجازی نے اپنے ناولوں کے ذریعے ایک نہیں دو نسلوں کو اپنا گرویدہ بنایا اُن کے منتخب کردہ موضوعات اس قدر متاثر کن ہوا کرتے تھے کہ بعض تفصیلی تقاریر کے باوجود قاری کی دلچسپی اور انہماک باقی رہتا تھا انہوں نے وہ سب کچھ کہاں سے سیکھا وہ خود علامہ اقبال، مولانا مودودی اور دیگر بہت سے اکابرین کے نام لیتے ہیں اس سلسلے میں آنسہ عارفہ عباس جو ان کی مددگار تھیں اور ان سے املا لیا کرتی تھیں رقمطراز ہیں کہ:

''میں نے ایک روز تیسری نسل کی نمائندہ بن کر جب نسیم حجازی صاحب سے یہ سوال پوچھا کہ وہ اپنی زندگی میں کس سے متاثر ہیں تو انہوں نے جواب دیا:

''بہتی ہوئی ندیوں کی قوت اور دلکشی کناروں کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی جو موجیں ٹوٹے ہوئے کناروں سے باہر نکل جاتی ہیں

انہیں جوہڑ اور دلدل جذب کر لیتے ہیں اگر میں اپنے ادب کو شفاف پانی کی ایک ندی سے تشبیہ دینے کی جسارت کر سکتا ہوں تو مجھے اس حقیقت کا اعتراف بھی کرنا پڑے گا کہ علامہ اقبال اور مولانا مودودی میرے وہ مضبوط کنارے تھے جنھوں نے مجھے آلودگیوں سے، پاک رکھا اور میرے بہاؤ کا رخ متعین کر دیا اور مولانا شبلی نعمانی نے مجھے تاریخ اسلام کی وہ دلکش جھلکیاں دکھائیں جن سے میری داستانیں رنگین ہوئیں۔''[1]

اُن کے عقیدت مندوں کے بارے میں اُن کے بھتیجے ظفر حجازی نے مجھے لکھا:

''نسیم حجازی تین شخصیات سے بہت متاثر تھے ایک علامہ اقبال دوسرے قائدِ اعظم اور تیسرے مولانا مودودی ایک دفعہ میں نے نسیم حجازی سے پوچھا کہ نوجوانی میں بہت اچھی شاعری کرنے کے باوجود آپ نے شاعری کو قوم کی فکری رہنمائی کا ذریعے کیوں نہ بنایا تو ان کا جواب تھا کہ علامہ اقبال نے میرے لیے کچھ مزید کرنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی مجھے مجبوراً نثر کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ قائدِ اعظم سے ان کی عقیدت انتہا کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی ایک دفعہ کہنے لگے کہ میرا لکھنے والا ہاتھ دو دفعہ شل ہوا جب قائد اعظم کی وفات کی خبر سنی دوسری دفعہ جب سقوط ڈھاکہ کی خبر ملی قائدِ اعظم کی وفات کا صدمہ اس لیے برداشت کر گیا کہ اس وقت میرے اندر ایک جوان انسان کی ہمت موجود تھی سقوط ڈھاکہ پر میں تین ماہ نہ سنبھل سکا اور میرا وہ ہاتھ جس سے میں لکھا کرتا تھا کئی ماہ تک مفلوج رہا۔ مولانا مودودی کے متعلق بات کرتے وقت مولانا کی ایک خوبی کا ذکر کیا کرتے تھے کہتے تھے کہ کتنی عجب بات ہے کہ ساری دنیا نے اس شخص کو حسب توفیق گالیاں دیں مگر اس شخص کی توجہ اپنے مقصد پر مرکوز رہتی اور اس نے کبھی پرواہ نہ کی کہ مذہب کے ٹھیکیداران کے متعلق کیا بولیاں بول رہے ہیں۔

ایک دفعہ میری موجودگی میں اسلامی جمعت طلباء کے چند نوجوان لاہور سے انہیں ملنے آئے ایک نوجوان نے نسیم حجازی صاحب کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا حجازی صاحب ہماری شیرازہ بندی ضرور مولانا مودودی کے ہاتھوں ہوئی ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری رگوں میں دوڑنے والا خون گرم صرف آپ کی تحریریں کرتی ہیں نسیم حجازی مسکرائے اور کہا برخوردار ایک فرق ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا مولانا مودودی کی تحریریں پڑھ کے نسیم حجازی تو پیدا ہو سکتا ہے مگر نسیم حجازی کی تحریریں پڑھ کر شاید کوئی مولانا مودودی پیدا نہیں ہو سکتا۔''[2]

اس کے علاوہ بھی بہت سی شخصیات سے متاثر رہے جن میں میر جعفر خان جمالی بالخصوص قابلِ ذکر ہیں کہ ان کی دولت، ایثار اور حب الوطنی نے تقریباً ایک عشرے تک انہیں بلوچستان میں رہنے پر مجبور کیا جمالی صاحب نظریہ پاکستان کے اس قدر حامی تھے کہ انہوں نے اپنے اخبار تنظیم کی ۵۰۰ کاپیاں مفت اُن اصحاب کو دیں جو بعد میں قیام پاکستان کے لیے اپنی گراں قدر خدمات کے ساتھ پیش پیش نظر آتے ہیں اُن کی دور اندیشی نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ آج کا ایثار مستقبل میں استحکام پاکستان کا پیش خیمہ ہوگا جمالی صاحب کے علاوہ نسیم حجازی محمد خان جوگیزئی کو اپنا رفیقِ کار اور بلوچستان کے عوام کا صحیح نمائندہ مانتے تھے کہ جس کی بروقت کارکردگی نے انگریزوں

---

[1] شجر سایہ دار: آنسہ عارفہ عباس مشمولہ نسیم حجازی ـــــ ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۳۲۹۔

[2] مکتوب ظفر حجازی بنام راقم ۳ جون ۲۰۰۲ء۔

کے مذموم مقاصد کو نا کام بنا دیا محمد خان جوگیزئی نے شاہی جرگہ کے اجلاس میں تقسیم برصغیر کے اعلان پر جرأت مندانہ فیصلہ کر کے انگریز حکومت کے نمائندے کو حیران و ششدر کر دیا نسیم حجازی خان قلات سے بھی بڑی ہمدردی رکھتے تھے جب حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا تو انہوں نے ایوب خان سے ملاقات کر کے ان کی رہائی کی راہیں ہموار کیں وہ خان قلات کے بارے میں مجھے بتانے لگے:

''جو شخص دو کشتیوں میں سوار ہوتا ہے وہ نہ تو منزل تک پہنچ سکتا ہے اور نہ اس کے سامنے منزل ہوتی ہے ویسے میں اُن کی بڑی عزت کرتا ہوں اگر بلوچستان میں سب سے بہترین فرد کا انتخاب کروں گا تو وہ خان قلات ہوں گے کیونکہ انہوں جو جو کچھ کیا اس سے کسی اور کا نہیں اپنا ہی نقصان کیا جب ایوب خان کے دور میں انہیں گرفتار کیا گیا تو میں نے ایوب صاحب سے ملاقات کر کے کہا کہ خان قلات بے گناہ ہیں انہیں رہا کر دیجیے۔ قائداعظم کا خیال تھا کہ نہیں مستقل طور پر تاحیات گورنر بلوچستان بنا دیا جائے اور بی میں ملاقات کے دوران یہی تجاویز زیر غور آتا تھیں۔''[1]

نواب کالاباغ کی شخصیت اور ان کے طریقہ حکومت سے خاصی حد تک متفق تھے حالانکہ نواب صاحب نے ایک ذرا سی غلطی پر انہیں گرفتار کر لیا تھا اس کے باوجود مجھے بتایا:

''نواب صاحب بڑی خوبیوں کے مالک تھے ان کی دشمنی اور دوستی دونوں انتہائی ہوا کرتی تھی۔''[2]

اس کے علاوہ ذوالفقار علی بھٹو نے بھی نسیم حجازی کو ایک لالچ دے کر ملک سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی اس بارے میں نسیم حجازی کے بیٹے خالد نسیم حجازی نے مجھے بتایا:

''بھٹو صاحب نے کہا کہ میں آپ کو سعودی عرب میں سفیر بنا کر بھیجنا چاہتا ہوں والد صاحب نے کہا میں بوڑھا ہو چکا ہوں اس لیے اپنے گھر پر ہی رہنا چاہتا ہوں بھٹو صاحب نے کہا: تو آپ کو اعزازی سفیر بنائے دیتے ہیں مگر والد صاحب نے معذرت کر لی۔''[3]

نسیم حجازی کی زندگی نشیب و فراز سے گزری بے شمار لوگوں سے انہوں نے محبت کی دوستیاں کیں تعلقات نبھائے اور لاتعداد ایسے لوگ ہوں گے جو نسیم حجازی کے گرویدہ اور پسند کرنے والے رہے ہوں گے کیونکہ ان کے ناولوں کی اشاعت اور بار بار ایڈیشنوں کا چھپنا اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

نسیم حجازی کا گھرانا ان کی اہلیہ اور دو بیٹوں پر مشتمل تھا جن میں بڑے بیٹے خالد نسیم کی ولادت ۲ اگست ۱۹۳۸ء کو ہوئی نسیم حجازی انہیں ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے مگر انہوں نے سائنس کی تعلیم میں دلچسپی نہ لی حالانکہ بعد میں مختلف قسم کے ڈپلوما کورسز کے ذریعے سے بعض سائنسی موضوعات کو سمجھنے کے ساتھ اپنایا بھی انہوں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی پہلے پہل کوہستان اخبار کے شعبہ طباعت سے وابستہ رہے جہاں آفسٹ طباعت کی مشینوں کی آمد میں عنایت اللہ کے ساتھ تعاون کیا بعد میں روزنامہ جنگ سے منسلک ہو گئے

---

[1] انٹرویو نسیم حجازی، جولائی ۱۹۹۳ء مملوکہ راقم الحروف۔

[2] ایضاً۔

[3] انٹرویو نسیم حجازی، جولائی ۱۹۹۳ء مملوکہ راقم الحروف۔

وہاں رنگین طباعت اور اُردو کمپوزنگ کے شعبوں کی پاکستان منتقلی اور جنگ اخبار کی طباعت میں ان جدید طریقوں کے استعمال کو فروغ دیا آج کل ملک میں سولار (شمسی توانائی) کے فروغ کے لئے کوشاں ہیں سگریٹ نوشی کا بے حد شوق رکھتے ہیں جس قدر سگریٹ نوشی کرتے ہیں اس سے یہ اندازہ لگانا بے جانہ ہوگا کہ نسیم حجازی صاحب نے ان کے اس فعل کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہوگا ورنہ ان کی اس قدر سگریٹ نوشی ان سے کیسی چھپی رہ سکتی تھی ان کا پسندیدہ ناول ''انسان اور دیوتا'' ہے وہ پاکستان کے موجودہ سیاسی نظام پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ کسی الیکشن میں کبھی ووٹ نہیں دیا کشمیر کے حصول کے لیے جہاد کے راستے پر گامزن رہنے کو کامیابی کی علامت سمجھتے ہیں ان کی اہلیہ شہناز خالد ان کی خالہ زاد ہیں وہ شادی کے بعد نسیم حجازی کے ہمراہ بہت زیادہ رہیں نسیم حجازی انہیں بیٹی یا نازی کہہ کر پکارتے تھے بیٹی کی عدم موجودگی میں اپنی بہو پر تمام تر محبتیں اور چاہتیں نچھاور کرتے تھے ''محترمہ شہناز خالد نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ میں اپنے شوہر کے ہمراہ ملتان جانے کے لیے جدا ہوئی تو نسیم حجازی آبدیدہ ہوگئے ان کی موت کے بعد کافی عرصے گمان ہوتا رہا کہ ابھی وہ اندر آئیں گے اور مجھ سے کچھ کہیں گے وہ انتہائی ملنسار اور محبت کرنے والے شخص تھے مجھے ان کا ناول خاک اور خون بہت پسند ہے۔''[1]

خالد نسیم کی تین اولادیں جن میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں بڑے بیٹے غیاث الدین جبکہ چھوٹے کا نام صلاح الدین ہے جو فوج میں ملازم ہے بقول خالد نسیم ان کے دونوں بیٹوں کے نام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے رکھے تھے نسیم حجازی کے دوسرے بیٹے احسن نسیم حجازی کی بھی تین اولادیں جن میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا شامل ہے احسن نسیم کی ولادت ۱۱ ستمبر ۱۹۴۳ء کو ہوئی تھی نسیم حجازی کو زندگی بھر بیٹی کی خواہش رہی جسے وہ اپنی بڑی بہو شہناز کی مدد سے پوری کرتے رہے البتہ منجھلا بیٹا جو نوجوانی میں حادثاتی طور پر جاں بحق ہوگیا اس کے بارے میں تفصیلات ان کی اہلیہ نے اس طرح بتائیں:

''منجھلے بیٹے جاوید نسیم کی وفات ہماری زندگی کا سب سے المناک حادثہ ہے یہ عجیب بات ہے کہ نسیم صاحب اس کے بارے میں بے حد فکر مند رہا کرتے تھے۔ جب جاوید نسیم غرق آب ہوا تو اس کی عمر ۱۹ برس تھی پہلے دن اس کی لاش نہیں مل سکی تھی رات بھر سینکڑوں آدمی جوہڑ کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے کئی لوگوں نے اس کی لاش ڈھونڈنے کے لیے غوطے بھی لگائے تھے۔۔۔نسیم صاحب کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ ان میں سے کوئی اس جوہڑ میں ڈوب نہ جائے اگلے دن فوج کی طرف سے ٹرک پر لد کر ایک کشتی پہنچ گئی اور کمانڈر ان چیف جنرل محمد موسیٰ نے حکم دیا کہ اگر لاش جلدی نہ ملے تو پمپ لگا کر جوہڑ خالی کر دیا جائے۔ فوجیوں نے کشتی اتار کر کنارے پر رکھ دی اور کشتی کھینچنے والے کا انتظار کرنے لگے۔ نسیم صاحب آگے بڑھے اور کشتی کے چپو سنبھالتے ہوئے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے تم میں سے دو اچھے تیراک میرے ساتھ آجائیں۔ دو کی بجائے چار افراد آگے بڑھے اور نسیم حجازی صاحب کے ساتھ کشتی میں بیٹھ گئے یہ واقعہ بڑا رقت انگیز تھا جو خواتین وہاں موجود تھیں ان کی چیخیں نکل گئیں نسیم صاحب نے دو تین مقامات پر کشتی روکی اور پھر ایک جگہ گہرے پانی میں غوطہ خور کود پڑے تھوڑی دیر بعد بچے کی لاش مل گئی اور جب تک وہ اسے سپرد خاک کر کے واپس

---

[1] انٹرویو شہناز خالد، مئی ۲۰۰۲ء مملوکہ راقم الحروف۔

نہیں آ گئے کسی نے انہیں روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کے دوست احباب تسلی دے رہے تھے کہ اچانک ان کا حوصلہ ٹوٹ گیا اور وہ سسکیاں لیتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کھولا تو وہ جانماز پر بیٹھے ہوئے تھے۔''[1]

ان کے خاندان میں ان کے بھتیجے ظفر حجازی نے نسیم حجازی کی تقلید کرتے ہوئے صحافت کے شعبے کو اختیار کیا خود انہوں نے مجھے لکھا کہ ان کے چچا نے یہ نصیحت کی تھی:

''بیٹا زندگی کے آخری مرحلہ پر انسان ماضی میں جھانک کر دیکھتا ہے تو گزرا ہوا وقت ایک وسیع سمندر کی طرح نظر آتا ہے اور انسان کے کیے ہوئے برے اور اچھے کام اس سمندر میں ابھری ہوئی چٹان کی طرح نظر آتے ہیں کوشش کرنا کہ جب تم زندگی کے آخری حصہ میں پہنچو تو تمھیں بھی کچھ چٹانیں نظر آئیں ورنہ زندگی بے مقصد گزر جانے کا احساس ایک عذاب بن جاتا ہے اور یہ بڑا تکلیف دہ عذاب ہوتا ہے۔''[2]

نسیم حجازی کے بھانجے غلام اکبر بھی صحافت کے شعبے سے وابستہ ہیں اور اسلام آباد سے الاخبار نامی ایک روزنامہ نکالتے ہیں اس کے علاوہ چند ناول بھی لکھ چکے ہیں جن میں نسیم حجازی کے انداز کو اختیار کرنے کی کوشش میں نظر آتے ہیں خاندان کے دیگر افراد میں نسیم حجازی کی بڑی بہو شہناز خالد نے ان سے املائی ہے جبکہ نسیم حجازی کے پوتے صلاح الدین جو فوج میں ملازم ہیں ولولہ انگیز اور جوشیلی تقاریر کرنے میں خاصی شہرت کے مالک ہیں۔

نسیم حجازی نے زندگی کو انتہائی سادگی سے گزارا وہ اپنی عام زندگی میں سفید رنگ کے شلوار قمیض پہننا پسند کرتے تھے جبکہ پینٹ کوٹ بھی اکثر تقاریب میں پہن کر جایا کرتے تھے جو اکثر گہرے رنگ کے ہوا کرتے تھے تقاریب میں جاتے ہوئے اکثر اپنی بڑی بہو کو ساتھ لے جاتے اور انہیں ہدایت کرتے کہ بڑی چادر اوڑھ کر پردے کی پابندی کا اہتمام کریں۔ کھانے پینے میں مچھلی انتہائی مرغوب تھی اس کے علاوہ بکرے کا گوشت بھنا ہوا شوق سے کھاتے اور کھانے میں دہی کے استعمال کو لازمی رکھتے تھے ڈاکٹر کی ہدایت پر آخری عمر میں دودھ بھی پابندی سے پینے لگے تھے کھانے پینے کی چیزوں میں بلاوجہ عیب نہیں نکالتے تھے اگر کوئی چیز پسند نہ ہو تو خاموشی کے ساتھ اٹھ جایا کرتے تھے گھر میں مہمانوں کی آمد کو باعث برکت جانتے یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر ان کے دسترخوان پر کوئی نہ کوئی مہمان ضرور ہوتا تھا میں نے ذاتی طور پر جولائی ۱۹۹۲ء میں اپنے دوستوں محمد شفیع اور لیاقت علی کے ہمراہ کئی ملاقاتیں کر کے موصوف کا طویل ترین انٹرویو ریکارڈ کیا تھا لیکن اس موضوع کو قلمبند کرتے ہوئے بڑی تشنگی محسوس ہوئی جسے دور کرنے کے لیے مئی ۲۰۰۲ء میں پروفیسر سلیم کے ہمراہ ایک بار پھر اُن کے گھر واقع راولپنڈی گیا جہاں ان کے بڑے بیٹے خالد نسیم حجازی اور ان کی اہلیہ شہناز خالد سے ملاقات کی جسکے نتیجے میں ان کے حالاتِ زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱؎ کچھ یادیں کچھ باتیں مشمولہ نسیم حجازی ایک مطالعہ، بیگم نسیم حجازی صاحبہ، ص ۳۸۲

۲؎ مکتوب ظفر حجازی بنام راقم، ۳ جون ۲۰۰۲ء۔

تعلیم وتربیت اور اساتذہ کرام

بچے کی زندگی بالعموم والدین کی زندگیوں کا مرقع ہوتی ہے اور اس کو اپنی زندگی کے ابتدائی تجربات والدین اور خصوصاً ماں ہی سے حاصل ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ماں کی گود ہی کو بچے کی پہلی تربیت گاہ کہا جاتا ہے یہیں سے وہ مختلف عادات، اطوار، اوصاف اور اقدار حاصل کرتا ہے اور یہیں سے اس کے بنیادی کرداری نمونوں کا تعین ہوتا ہے بچہ رہن سہن، نشست و برخاست کھانا پینا اور لباس پہننے کے بارے میں والدین کی تقلید کرتا ہے یا پھر معاشرے میں ہونے والے واقعات کو مشاہداتی طور پر محسوس کر کے ماں کے سامنے اپنے احساسات پیش کرتا ہے وہ اردگرد کے ماحول کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اس کے مطابق ڈھالنا بھی چاہتا ہے اس کا چھوٹا سا ذہن ان رویّوں اور مجبوریوں کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے جو اس کے خاندان کی حدود کا تعین کرتی ہیں اس لیے بعض اوقات بھوک و افلاس کی وجہ سے بعض بچے احساس کمتری کا شکار ہو کر چوری چکاری کی جانب راغب ہو جاتے ہیں تو ایک دوسرا گروہ والدین کی اچھی تربیت کی بدولت صبر وقناعت کو فروغ دیتا ہے۔ ماں کی گود کے بعد بچے کی توجہ جس دوسری شخصیت پر مرکوز ہوتی ہے وہ باپ کی ہے اوائل عمری میں وہ یہ سمجھنے سے تو قاصر رہتا ہے کہ باپ کا کردار کیا ہے لیکن ماں باپ کے تعلقات گھر سے جاتے اور آتے وقت بچے کی جانب باپ کی توجہ اور محبت بھرا انداز اس کے ذہن وشعور میں یہ تصور بیدار کرتا ہے کہ اس کی زندگی انہی دو کے درمیان ہے جیسے جیسے وقت گزرتا ہے خاندان کے دیگر افراد اور محلے پڑوس کے لوگوں سے واقفیت بڑھتی جاتی ہے۔

اوائل عمری کا ہر دور مختلف معاشروں میں مختلف ہوتا ہے، جس زمانے میں نسیم حجازی پیدا ہوئے اس زمانے میں پانچ چھ برس کی عمر میں بچے کی ابتدائی تربیت گاہ گھر اور خاندان ہوا کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ محمد شریف نے بھی اپنی زندگی کا یہ حصہ والدین اور خاندان کے دوسرے افراد کے درمیان گزارا ۲۲-۱۹۲۱ء میں ان کے آبائی گاؤں سوجان پور سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر کھنڈا گاؤں کے ہائی اسکول میں ابتدائی تعلیم کے لیے داخل کروایا گیا اس سلسلے میں نسیم حجازی ریڈیو پروگرام ''کاروانِ آزادی کے راہ رو''[1] میں انٹرویو کے دوران اعتراف کرتے ہیں میرا بچپن خاک اور خون کے سلیم کا بچپن ہے کیونکہ اس ناول میں بھی مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں میں سلیم کو زندگی گزارتے دکھایا گیا ہے جسکے مطابق وہ گھڑ سواری کا شوقین، ایک اچھا تیراک اور بہترین طالب علم تھا اسے کہانیاں سنانے کا شوق تھا اس لیے اس کے ہم عمر بچے اس کے گرد گھیرا ڈالے رکھتے تھے دورانِ طالب علمی بہت سے اساتذہ نے محمد شریف کو متاثر کیا جن میں دو اساتذہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''جب میں نے لکھنے کا آغاز کیا تھا تو ان دنوں میں سوجان پور ''ضلع گورداس پور'' میں رہتا تھا اور وہاں مولوی غلام مصطفیٰ سے اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ایک روز وہ بولے کہ تمہیں پڑھنے لکھنے کا شوق تو بہت ہے لیکن تم اپنا تخلص نہیں کرتے، اس وقت تک میں محمد شریف ہی لکھا کرتا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا نام رکھوں، تو وہ کہنے لگے کہ تم سرزمین حجاز سے ہی کوئی نہ کوئی تخلص رکھ لو۔

---

[1] پروگرام کاروانِ آزادی کے راہ رو، ریڈیو پاکستان، میزبان اختر ۔۔۔

لہٰذا میں نے اس بات پر غور کیا اور محمد شریف کی بجائے "نسیم حجازی" لکھنا شروع کر دیا جو بعد میں میری پہچان بن گیا۔ اس کے علاوہ میرے ایک استاد محترم مولوی فاضل جو نہ صرف میرے پسندیدہ استاد تھے بلکہ ایک بہترین دوست بھی تھے، میری تعلیم و تربیت میں ان کا بہت ہاتھ ہے۔ انہوں نے مجھے کسی بھی مقام پر اکیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیا، آج میں علم و ادب کے میدان میں جو کچھ بھی ہوں وہ مولوی فاضل کی وجہ سے ہوں۔"[1]

اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ محمد شریف دور طالب علمی ہی میں نسیم حجازی بن چکے تھے اور ان میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا شوق بھی بیدار ہو چکا تھا یہ صلاحیت ان میں بچپن ہی سے تھی وہ طول و طویل کہانیاں سنانے کا ہنر جانتے تھے اس سلسلے میں مجھے بتانے لگے کہ:

"خاک اور خون" کے سلیم کے کردار والی کہانی سنانے والی خوبی ان میں موجود تھی اُن کے محلے کے لڑکے سکھ، عیسائی یا ہندو ان کے انتظار میں گھر کے باہر بیٹھ جاتے اور وہ کہانی سنانا شروع کر دیتے بعد میں آنے والے اس بات پر جھگڑتے کہ آپ نے کہانی پہلے کیوں شروع کی اس جھگڑے سے بچنے کے لیے میں انہیں مناتا اور کہانی دوبارہ سے شروع کرتا۔"[2]

اسکول کے واقعات کا معاملہ ذہنی شعور کے ساتھ پروان چڑھتا ہے بعض چیزیں انسانی فطرت میں ایسی ہوتی ہیں جنھیں ختم نہیں کیا جا سکتا وقتی ضرورتوں کے پیش نظر وہ دبی رہتی ہیں جب شعور بیدار ہوتا ہے تو خوف کی فضا ختم ہو کر انتہائی اقدام اٹھانے پر انسان کو مجبور کر دیتی ہے ایک ایسا ہی واقعہ اسکول سے متعلق ہے جسے ڈاکٹر تصدق راجا نے اس طرح پیش کیا ہے:

"بشیر الدین مشن ہائی اسکول کے کرسچین ہیڈ ماسٹر تھے، ذہین، بااصول اور شفیق نسیم حجازی ان سے متاثر ہوئے اس اسکول میں انگریزی کے استاد امریکی تھے بورڈنگ میں شام کو اسمبلی ہوتی تھی جس میں زبُور پنجابی زبان میں گائی جاتی تھی۔ نسیم حجازی نے ایک شام چند دوستوں سے مشورے کے بعد چھت پر چڑھ کر عین اس وقت اذان دے دی جب اسمبلی ہو رہی تھی پادری بہت برہم ہوا اور کہا "He is a dangerous boy" (یہ بہت خطرناک لڑکا ہے) مگر ہیڈ ماسٹر نے معاف کر دیا۔"[3]

یہ معاملہ سنجیدگی کی حد تک ذہنی شعور کی پختگی کا ہے لیکن دور طالب علمی تو بہت سی شرارتوں سے بھرپور رہتا ہے ایک موقع پر اپنے ایک استاد کے ساتھ شرارت کی جس کا تذکرہ ڈاکٹر تصدق راجا نے اس طرح کیا ہے:

"ایک دفعہ ماسٹر بوہڑ مسیح کے بستر کی چادر کے نیچے شدید سردی کے موسم میں یخ بستہ پانی کی سل رکھ دی وہ سونے کے لیے لیٹا تو چیخ اُٹھا، فرماتے ہیں مجھے (نسیم حجازی) اس پر رحم آیا اور میں نے پھر اُسے اپنا کمبل پیش کیا تا کہ آرام کی نیند سو سکے۔"[4]

انسانی زندگی محض کھیل کود، شرارتوں اور کہانیاں سنانے تک محدود نہیں ہوتی درس گاہوں میں طالب علم کے شوقین محض پڑھنے نہیں جاتے

---

[1] روزنامہ پاکستان لاہور، ادبی ایڈیشن، نوید انور، پرویز ملک۔

[2] انٹرویو نسیم حجازی، جولائی ۱۹۹۳ء مملوکہ راقم الحروف۔

[3] نسیم حجازی ایک مطالعہ۔ ڈاکٹر تصدق حسین راجا ص ۲۹، ۳۰۔

[4] ایضاً ص ۳۰۔

بلکہ اپنے اساتذہ کی خصوصی توجہ کی بدولت مستقبل کی راہیں بھی متعین کرتے ہیں ان کے استاد محترم مولوی محمد فاضل نے ان کے ذوق عملی کو جانچنے کے لیے الفاروق پڑھنے کو دی اس بارے میں مجھے بتانے لگے:

''میں نے اسکول سے گھر تک آنے جانے کے دو میل کے فاصلے پر صبح شام کے اوقات میں ایک ہی دن میں اسے مکمل کر ڈالا جب انہیں واپس کرنے لگا تو استاد محترم نے کہا اسے دوبارہ پڑھو تاریخ کا جو شعور اور دلچسپی ہے وہ اسی کتاب کی بدولت پیدا ہوئی۔''[1]

اور یوں ان میں تاریخ کے مطالعے کا ذوق و شوق بیدار ہوا وہ کتابوں کا مطالعہ کرتے چلے گئے تاریخ کی کتابوں کے بعد انہیں ناولوں کے مطالعے کا شوق رہا اور جب تک بی۔ اے کا امتحان پاس کیا تو وہ دنیا کے بہترین ناولوں کا مطالعہ کر چکے تھے نسیم حجازی نے میٹرک کا امتحان ۱۹۳۲ء میں مشن ہائی اسکول دہار یوال (ضلع گورداسپور) سے پاس کیا اسکول سے فارغ ہونے کے بعد مزید تعلیمی استطاعت کو بڑھانے کے لیے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا کالج کا یہ زمانہ تحریر و تقریر اور مطالعے کی کشادگی کے حوالے سے مستقبل کی راہوں کو متعین کرنے میں بڑا معاون و مددگار رہا اسی زمانے میں ان کا افسانہ ''شودر'' ماہنامہ ''حکایت الاسلام'' لاہور میں شائع ہوا۔ جس سے ان کے ذوق علمی اور شعور آدمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے انہوں نے معاشرے میں پھیلی ہوئی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کی کیونکہ یہی ذہنیت مسلمانوں کو غلام بنا کر رکھنا چاہتی تھی اس کا ادراک ہوتے ہی انہوں نے مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کا آغاز کیا اور یہ افسانہ اسی سلسلے کا حرف آغاز کہا جا سکتا ہے۔ دورانِ طالب علمی کالج کے تعلیمی ماحول سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اپنے جن اساتذہ سے وہ خاص طور پر متاثر تھے ان کا ذکر کرتے ہوئے بتانے لگے:

''میں جن اساتذہ سے متاثر رہا ان میں امیر احمد خان، پروفیسر مرزا یوسف جو انگریزی کے استاد تھے اور مولانا علم الدین صادق تھے۔ ان کی محبت، شفقت اور صلاحیتیں ناقابلِ فراموش تھیں بحیثیت شاگرد کسی استاد کے بڑے اور چھوٹے ہونے کا فیصلہ کرنا میرا کام نہیں لیکن ان کے انداز تدریس نے بہت متاثر کیا۔ ہمارے پرنسپل ایم۔ اے عزیز صاحب بھی انگریزی پڑھانے میں منفرد مقام رکھتے تھے خاص طور پر ڈرامہ اور شیکسپیر کے بارے میں انکا انداز معراج کی بلندیوں تک پہنچا ہوا تھا۔ ایک اچھا استاد مشورے اور گائیڈ لائن کے ذریعے اپنے شاگردوں کی رہنمائی کرتا ہے اچھے Intelligent شاگرد اس اشارے کو خوب سمجھتے ہیں۔ مطالعہ اپنے فن میں بلند مقام دلانے کا باعث ہے کیونکہ مسلسل مطالعہ کی بدولت آپ لہروں کی روانی اور زمانے کی چال کا اندازہ کر سکتے ہیں۔''[2]

ایک اور شخصیت جس نے ان کی رہنمائی میں اہم کردار ادا کیا پروفیسر صوفی محمد اشرف کی ہے ان سے تعلق کی نسبت کو ڈاکٹر تصدق حسین راجا نے نسیم حجازی کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

''مرے کالج سیالکوٹ کے پروفیسر صوفی محمد اشرف سے نسیم حجازی ملے تو انہوں نے ایک روز پوچھا ''تم کیا بننا چاہتے ہو؟'' نسیم حجازی نے جواب دیا ''میں ایک بہت بڑا ناول نگار بننا چاہتا ہوں اس لیے کہ میرے اندر کہانیاں جنم لیتی ہیں۔'' صوفی صاحب نے

---

[1] انٹرویو نسیم حجازی، جولائی ۱۹۹۲ء مملوکہ راقم الحروف۔

[2] ایضاً۔

دو نشستوں میں نسیم صاحب کو یہ سمجھا دیا تھا کہ مقصد حیات کیا ہونا چاہیے۔ پروفیسر صاحب نے انہیں دنیا کی مختلف زبانوں کے زندہ جاوید ناول نگاروں کے مطالعہ کا مشورہ بھی دیا۔ چنانچہ نسیم حجازی نے ٹالسٹائی، ٹامس ہارڈی، گالزوردی اور بہت سے دوسرے ناول نگاروں کی تصانیف کھنگال ڈالیں اور پھر اسلامی تاریخ کا انتخاب کر کے اس بحرِ بیکراں میں سے وہ وہ موتی نکال لائے جن کی تابانی میں کبھی فرق نہیں آئے گا۔''[1]

اس سلسلے میں انہوں نے مجھے انٹرویو دیتے ہوئے بتایا تھا کہ میں اپنے دورِ طالب علمی تک دنیا کے اہم ترین ناولوں کا مطالعہ کر چکا تھا اس طرح یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ نسیم حجازی میں دورِ طالب علمی ہی سے کہانی کہنے کی خداداد صلاحیت موجود تھی اساتذہ کی تربیت اور نگرانی نے ان کے اس فن کو مزید نکھرنے اور نکھرنے کا موقع فراہم کیا جسے تابانی سیرت نگاری کی ابتدائی کتب کے مطالعے سے ملی ہوگی کیونکہ انہوں نے خود بتایا تھا کہ تاریخ کی پہلی باضابطہ کتاب جس کا مطالعہ انہوں نے کیا ''الفاروق'' تھی الفاروق کے مکمل مطالعے کی بدولت جہاں حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہوتی ہیں وہیں تاریخ کے مطالعے کا ذوق وشوق بھی ابھرتا ہے۔ بنیادی طور پر تاریخ کا مطالعہ اور پھر ناولوں کے گہرے مطالعے نے ان کے اندر کے نسیم حجازی کو بیدار کیا اور پھر قلم کی وہ روانی شروع ہوئی جو مرتے دم تک ان کے نام کے ساتھ وابستہ رہی تعلیم و تربیت کے دوران ان کے اساتذہ کی قابلیت نے ان کے اندر بھی مطالعے اور مشاہدے کا شوق پروان چڑھایا انہوں نے خود ہی اعتراف کیا کہ مختلف اساتذہ مختلف موضوعات کو پڑھانے میں انفرادیت کے مالک اور یگانہ روزگار تھے۔ جن کی بدولت جہاں تعلیمی ضروریات اور نصابی تعلیم کی تکمیل ہوئی وہیں زبان وبیان اور فکشن کے بارے میں مختلف زاویہ نظر سے قسم قسم کے موضوعات کے مطالعے کا موقع بھی ملا اس سلسلے میں بتانے لگے:

''دنیا کے بہترین ناول روسی زبان میں لکھے گئے اس کی وجہ روس کا رقبہ اور جغرافیائی حالات ہیں۔ روس اتنا بڑا ملک ہے کہ ہر قسم کا موسم اور ہر مذہب وتہذیب کے لوگ موجود تھے۔''[2]

ان کے اس نقطۂ نظر میں خاصی جان ہے کیونکہ دنیا کے بہترین ناول روسی زبان میں لکھے گئے حالانکہ ادب کسی زبان اور تہذیب کا محتاج نہیں ہوتا اس سب کے باوجود نسیم حجازی نے اپنے اساتذہ، ماحول، سیاسی حالات سے بہت کچھ سیکھا اور پھر اسے اپنے خاص انداز میں عوام الناس کو لوٹا دیا۔

---

[1] نسیم حجازی ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق راجا، ص ۲۷۔
[2] انٹرویو نسیم حجازی، جولائی ۱۹۹۳ء مملوکہ راقم الحروف۔

اس عہد کے سیاسی و تمدنی حالات

انسان جس معاشرے میں رہتا بستا ہے اپنے اردگرد کے حالات پر ضرور توجہ دیتا ہے۔ اس کے یہی مشاہدات اور تجربات زبانی یا قلمی سہارے کی بدولت دوسروں تک پہنچتے ہیں اور یوں اس کے احساسات اور جذبات اُن حالات سے مدغم ہو کر حالات حاضرہ پر تبصرے کا کام کرتے ہیں لیکن کوئی بھی قلمکار اُن عام مشاہداتی لوگوں کے مقابلے میں دوسرے زاویہ نظر سے حالات و واقعات کا جائزہ لیا کرتا ہے۔ اس کی سوچ و فکر میں موجودہ حالات کے ساتھ ساتھ ماضی کی کارفرمائیوں کا جائزہ لینے اور مستقبل کی بہتری کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کی سعی بھی پائی جاتی ہے۔ وہ معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات پر خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ رہتا کیونکہ وہ حساس دل اور بہترین صلاحیتوں کا مالک ہوا کرتا ہے۔ اس لیے اگر وہ مقرر ہے تو اپنے خطبات کے ذریعے اپنی بات دوسروں کو پہنچاتا ہے لیکن اگر وہ کوئی لکھاری ہے تو اپنی تحریروں کے ذریعے قارئین کے دل و دماغ میں اتر جانا چاہتا ہے اور اپنے قلم کی نوک سے ان کے دلوں میں چبھن پیدا کرتا ہے۔ اپنی تحریروں کے ذریعے ان حالات کا نقشہ پیش کرتا ہے جن سے وہ عہد گزر رہا ہو اور پھر اپنی قوم اور ملت کی بہتری کے لیے ایسا طریقہ وضع کرتا ہے جو ان کی کھوئی ہوئی ساکھ واپس لا سکے یہی صلاحیت انسان کو اشرف المخلوقات بنایا کرتی ہے اور اس کا یہی کام اس کے نام کو باقی رکھنے کا باعث بنتا ہے۔

نسیم حجازی نے اپنی تاریخی ناول نگاری کا آغاز اس عہد میں کیا جب دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ دوسری جانب ہندوستان میں تحریکِ آزادی آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی لیکن محض ان دو واقعات کو مدنظر رکھ کر ہم اس عہد کے حالات کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ہمیں تاریخ کی ورق گردانی کرنی ہوگی کہ آخر تحریک پاکستان کیوں برپا ہوئی۔ مسلمان کیسے حاکم سے محکوم بنے اور پھر ایک آزاد وطن کی تحریک چلانے پر مجبور ہوئے۔ دوسری جانب پہلی جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کے محض ۲۰ سال بعد ایسے کون سے عوامل تھے جن کی بنا پر دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔

ہم سب سے پہلے ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے زوال کا جائزہ لیں گے۔ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد اور تجارتی کوٹھیوں کے نام پر کچھ جگہ الاٹ کرا لینا مغلوں کے اقتدار میں پہلی دراڑ ثابت ہوئی کیونکہ انگریزوں نے تاجروں کے بھیس میں ہندوستان کے سیاسی اور انتظامی معاملات کا بغور جائزہ لے کر یہاں کے دفاعی معاملات کو سمجھا۔ جسکے نتیجے میں یہ تجارتی کمپنیاں فوجی قلعوں میں تبدیل ہونے لگیں سترھویں صدی کے اواخر میں انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ کس طرح یہاں کے اقتدار کو تقسیم کیا جا سکتا۔ اور جب اقتدار تقسیم در تقسیم ہوگا تو ہماری سازشیں اپنا کام دکھائیں گی اور یوں ہم مسندِ اقتدار تک جا پہنچیں گے۔ یہاں انگریزوں کی حریف دو قوتیں اور بھی تھیں جن میں ایک فرانس اور دوسری پرتگال کی صورت میں موجود تھی۔ سازشوں کا جال بچھاتے وقت اپنے مدمقابل کی طاقت کا اندازہ اور اپنی قوت کا اندازہ بھی کارآمد ثابت ہوا کرتا ہے۔ مزید یہ کہ مقامی طور پر سازش میں ملوث افراد کن عہدوں سے وابستہ ہیں۔ انگریزوں کی ان خواہشات کی تکمیل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اورنگ زیب عالمگیر کی موجودگی تھی۔

لیکن جب ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات نے ہندوستان کی وسیع سلطنت کو بے یارومددگار چھوڑ دیا تو شہزادوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط رکھ سکتا۔ بڑے صاحب زادے معظم بہادر شاہ اول کے لقب سے تخت پر رونق افروز ہوئے ان کے پانچ سالہ اقتدار کے بعد:

''جہاندار شاہ نے لٹیا ہی ڈبودی، یہ عیش ونشاط کا متوالا تھا۔ ایک نہایت گھٹیا درجے کی عورت اس کے اعصاب پر سوار ہوگئی جسے امتیاز محل کا خطاب دیا گیا، اس عورت اور اس کے بھائی بندوں نے سلطنت کا وقار مٹی میں ملا دیا اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو گیا۔ نااہلوں اور خوشامدیوں پر انعام واکرام کی بارش ہوتی اور دانشور اپنی قسمت کو روتے۔ جہاندار شاہ اپنی ہوس پروری اور شراب نوشی میں ایسا بدمست ہوا کہ سلطنت کی چولیں ہل گئیں لیکن اسے ہوش نہ آیا۔ اس صورت حال سے اس کے بھتیجے فرخ سیر نے فائدہ اٹھایا اور اس پر حملہ آور ہوا جہاندار شاہ میں مقابلے کی تاب کہاں تھی وہ محبوبہ لال کنور کے ساتھ گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔ اس طرح وہ ایک سال کے اندر ہی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

فرخ سیر ۱۷۱۳ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس نوجوان شہزادے میں کچھ خوبیاں ضرور ایسی تھیں کہ اگر وہ اجاگر ہوتیں تو شاید حالات سدھر جاتے۔ لیکن وہ سید برادران کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا رہا اور سات برس تک درباری سازشوں کا تماشہ دیکھتا رہا۔ ان ہی سازشوں کے نتیجے میں ایک دن اسے تخت سے گھسیٹ کر نیچے اتار دیا گیا، گالیاں دی گئیں، قید خانے میں ڈالا گیا اور پھر اندھا کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد سید برادران نے بادشاہ گری کے کئی تجربے کیے اور یکے بعد دیگرے کئی شہزادوں کو تخت طاؤس پر چڑھاتے رہے۔ آخر کار روشن اختر (محمد شاہ رنگیلا) کا ستارہ چمکا اور وہ بادشاہ بنائے گئے۔''[1]

اسی دوران بعض امراء نے سید برادران کو قتل کرا دیا تاکہ ان کے چنگل سے آزاد ہو کر بادشاہ ملکی انتظام پر توجہ دے سکے مگر یہ توقع خام خیالی ثابت ہوئی۔ اس نے جہاندار شاہ کی روایات کو پھر سے زندہ کیا۔ یہ عیش ونشاط کا متوالا مچھلیوں کے شکار اور پھولوں کی سیر کا شوقین ملکی انتظام حکومت پر توجہ نہ دے سکا۔ مرکزی حکومت کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اودھ اور بنگال کی سلطنتیں آزادی کا اعلان کیا چاہتی تھیں تو اندرونِ ملک سکھوں اور مرہٹوں کی بغاوت سر اٹھا رہی تھی ملک سے باہر بھی بعض نظریں تخت طاؤس کو اچک لینا چاہتی تھیں اور پھر:

''نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں دریائے ستلج پار کیا اور شاہی افواج کو کرنال کے مقام پر شکست دی۔ اس کے بعد اس نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ محمد شاہ نے صلح کی درخواست کی جو منظور ہوئی اور مغل شہنشاہ نے نادر شاہ کو بیس لاکھ روپے بطور ہرجانہ ادا کرنا منظور کیا۔ پہلے تو سب ٹھیک گزری لیکن ایرانی سپاہیوں اور دہلی کے باشندوں میں جھڑپ ہوگئی۔ لہٰذا نادر شاہ نے قتل عام کا حکم دے دیا۔ دہلی شہر اچھی طرح لوٹا گیا۔ تباہ و برباد کیا گیا۔ کافی تعداد میں مرد، عورتیں اور بچے بھی قتل کیے گئے۔ بہت سے مکانات نذر آتش کیے گئے۔ نادر شاہ

---

[1] اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ، ادریس صدیقی ص ۱۳۶، ۱۳۷۔

نے اسی طرح دولت کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اکٹھا کرلیا۔اس نے شاہی خزانہ کو بھی اپنے قبضہ میں کیا۔شاہجہاں کے بنوائے ہوئے تختِ طاؤس کو بھی سنبھالا اور واپس ایران کی راہ لی۔روانگی کے وقت اس نے محمد شاہ سے ایک اور عہد نامہ کیا جس کی رو سے اس نے محمد شاہ کو برصغیر کا شہنشاہ تسلیم کرلیا۔'' [1]

اسی دوران ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں فرنگیوں اور نواب سراج الدولہ کے درمیان تاریخی معرکہ برپا ہوا اور جعفر جیسے ننگ ملت، ننگ دین، ننگ وطن لوگوں کی غداری کے سبب انگریزوں کو قدم جمانے کا موقع مل گیا، دوسری طرف اندرون ملک مرہٹوں اور دیگر فتنہ پرور گروہوں کی سرکشی اور لوٹ مار جاری رہی۔

۱۷۵۹ء میں شاہ عالم نے حکومت سنبھالی اور ۱۸۰۶ء تک برسرِ اقتدار رہے لیکن سینتالیس برس کا یہ طویل عرصہ سیاسی انقلابات اور عبرت انگیز واقعات سے پُر ہے۔ابدالی کے ساتھ پانی پت کی تیسری لڑائی میں دلی کے اقتدار کو مزید کمزور ثابت کیا۔بعد ازاں غلام قادر روہیلہ اور سکھوں کی دھما چوکڑی نے لال قلعے کی عفت وحرمت کو داغدار کیا۔وہ لال قلعے میں داخل ہوا اور انسانیت سوز مظالم کی ایک نئی داستان رقم ہوئی۔اس نے نوک خنجر سے بادشاہ کی آنکھیں نکال لیں مرہٹوں کی آمد اور غلام قادر روہیلہ کے قتل کے بعد نابینا بادشاہ کے نام پر مرہٹہ راج قائم ہوگیا اور یہ تہمت اس کی موت تک اس کے نام سے وابستہ رہی۔۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کی وفات کے بعد اکبر شاہ ثانی تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔انگریزوں کی عملداری اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ لارڈ ہسٹنگز تاج پوشی کی تقریب میں اس شرط پر شرکت کے لیے آمادہ ہوا کہ اسے تمام آداب شاہی سے استثناء دیا جائے۔ہندوستانی معیشت میں انگریزوں کا اقتدار ۱۸۳۵ء میں سکوں کے اجراء پر منتج ہوا۔۱۸۳۷ء میں جب بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی ہوئی تو انگریز بہادر نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اس تکلف کی بھی کیا ضرورت ہے وہ چاہتے تھے کہ بادشاہ اپنے تمام خطابات سے دستبردار ہو جائے اور قلعہ چھوڑ دے اور بہادر شاہ کی بادشاہت ختم کردی جائے لیکن قلعے کے باہر عام لوگوں خصوصاً ہندوستانی سپاہیوں میں جو بے چینی پھیلی ہوئی تھی وہ اس منصوبے کی تکمیل سے پہلے ہی بغاوت بن کر پھوٹ پڑی۔اس جنگِ آزادی نے جو غدر ۱۸۵۷ء کے عنوان سے مشہور ہے سارے شمالی ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

بہادر شاہ ظفر ''بغاوت کے مجرم'' قرار دیے گئے اور انہیں قیدی بنا کر رنگون بھیج دیا گیا جہاں وہ زندگی کا ماتم کرنے کے لیے ۱۸۶۲ء تک زندہ رہے اسی دوران انیسویں صدی کے ربع اول میں احیائے دین کی تحریکیں نئے جوش وولولے کے ساتھ شروع ہوئیں۔ سید احمد شہید نے پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے تحریک جہاد کا آغاز کیا۔اس سلسلے میں انوار ہاشمی رقمطراز ہیں:

''معینہ تاریخ پر اپنے چند ہزار جاں نثاروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کر کے وہ براہ راجپوتانہ سندھ اور بلوچستان،

---

[1] تاریخ پاک وہند؛ انوار ہاشمی، ص ۳۴۸۔

افغانستان کی سمت روانہ ہو گئے (۱۸۲۵ء) اور وہاں سے پشاور کی طرف لوٹے۔ بعض افغانوں نے بھی مذہبی جوش میں آ کر سید احمد کا ساتھ دینے کا تہیہ کر لیا۔ سکھوں کے خلاف پہلا مقابلہ اکوڑہ کے مقام پر ہوا (۱۸۲۶ء) اس کے بعد حضرو اور پشاور میں ان تینوں مقامات پر مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی لیکن افغان سرداروں کو سید احمد کی شرعی پابندیاں پسند نہ آئیں اس لیے کہ وہ ان پابندیوں میں مقید ہونا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے سید صاحب کی مخالفت شروع کر دی۔ ادھر حکمرانانِ پشاور کو سکھ حکمران رنجیت سنگھ نے ملا لیا اس طرح تحریک جہاد کمزور ہو گئی۔ یہ دیکھ کر سید احمد نے کشمیر کا رخ کیا تا کہ وہاں جدوجہد آزادی شروع کی جائے لیکن راستہ میں بالا کوٹ (ہزارہ) کے مقام پر سکھوں نے انہیں جنگ پر مجبور کیا (۱۶ مئی ۱۸۳۱ء) ان کی جماعت قلیل تھی۔ سکھوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ سید صاحب اور ان کی جماعت کے بہت سے رکن شہید ہوئے۔ ان کی شہادت سے تحریک جہاد کو نقصان پہنچا لیکن یہ تحریک ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے شعلے اور بھی بلند ہوئے۔''[۱]

یہاں یہ امر افسوس ناک ہے کہ ذاتی ناپسندیدگی کی بناء پر بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ سید احمد شہید کی تحریک جو بظاہر سکھوں کے خلاف تھی کی وقتی افادیت کے پیش نظر انگریزوں نے امداد کی جبکہ غلام رسول مہر اس سے اختلاف کرتے ہیں اور اس تحریک کو کچلنے کے لیے انگریزوں کے اقدامات کا حال اس طرح لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس کے مرکز ستھیانہ کے در و دیوار بلکہ آس پاس کی پہاڑیاں تک جلا کر خاکستر کر دیں۔ انگریز علی الاعلان کہتے تھے کہ یہ فرقہ مسلمانوں کو قرآن کی اصل تعلیم سکھاتا ہے اور ان میں قرونِ اولیٰ کی روح تازہ کرنا چاہتا ہے۔ گویا انہیں کفار کے قتل اور فرنگی سے جنگ و جہاد کی ترغیب دینا چاہتا ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے نتیجے میں حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے گئی ساتھ ہی اعتبار بھی جاتا رہا۔ قتل عام کا ایک بازار گرم ہوا اور اس جنگ کا ذمہ دار مسلمانوں کو سمجھا گیا۔ یہ قتل و غارت جاری تھی کہ چند مسلمانانِ ہند جنکے تعلقات انگریز حکمرانوں سے تھے اٹھے ان میں سے بعض نے ذاتی کوششوں اور دیگر نے زورِ قلم کا سہارا لے کر بعض ایسے مضامین لکھے جو اس بہتے ہوئے خون کے سیلاب کے سامنے بند کا کام کر گئے۔ انہی میں سر سید احمد خان تھے کہ جن کی کوششوں نے خونِ ناحق کو بذریعہ شمشیر بہاتے ہوؤں کے ہاتھ بذریعہ قلم روک دیے تو دوسری جانب اپنی قوم کو اٹھا کر جدید علوم سے واقف کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ ان کوششوں سے تہذیب الاخلاق کا اجراء عمل میں آیا۔ جس کے ذریعے تعمیری مضامین عوام الناس کے لئے تحریر کیے گئے۔ دوسری جانب علی گڑھ کالج قائم ہوا جو جدید درسگاہ تھی اور ترقی کرتے کرتے یونیورسٹی کے درجے تک جا پہنچی ان کے ہمراہیوں میں حالی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، شبلی اور دیگر بہت سے افراد شامل تھے تو دوسری جانب اکبر الہ آبادی بظاہر ان کی مخالفت میں طنز و مزاح کی شاعری کا سہارا لے کر قوم کو ماضی کی معاشرتی روایات کا امین رکھنا چاہتے تھے۔ اس عہد میں اخبارات اور رسائل کا اجراء بھی خوب خوب ہوا۔ مولوی نذیر احمد ''مراۃ العروس'' لکھ کر ناول نگاری کے بانی سمجھے گئے تو حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر تنقید کے پہلے شہسوار کا خطاب پایا اور عبدالحلیم شرر نے عبدالعزیز ورجنا مرقوم کر کے

---

[۱] تاریخ پاک و ہند؛ انوار ہاشمی، ص ۲۷۳،۲۷۳۔

پہلے تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے اپنا نام مسلّم کرا لیا۔ ہم ہندوستان میں بیسویں صدی کا جائزہ لینے سے قبل ہندوستان سے باہر کی دنیا پر نظر ڈالیں گے۔

ہندوستان کا ایک اہم ہمسایہ روس ۱۹ویں صدی کی ساتویں دہائی تک ہنوز زاروں کے جبروت وجلال کے شکنجہ میں پھنسا ہوا تھا۔ غلام گردی کا یہ حال تھا کہ زمین کی خرید و فروخت کے ساتھ اس کے کاشتکاروں کا بھی سودا ہو جاتا تھا۔ روس میں اس وقت الگزنڈر ثالث کی حکومت تھی۔ ۱۸۴۸ء میں کارل مارکس اور فریڈرک انگلز نے مل کر ''اشتراکیت کا منشور'' مرتب کیا جبکہ ۱۸۶۷ء میں کارل مارکس کی مشہور تصنیف ''داس کیپٹال'' شائع ہوئی جس نے دانشوروں کو دنگ کر دیا۔ ۱۸۹۴ء میں نکولس ثانی برسرِ اقتدار آیا تو اس وقت تک سرزمین روس کسی عملی انقلاب کی منتظر تھی اور جب یہ انقلاب آیا تو کارل مارکس کا سیاسی فلسفہ اور اشتراکی حربہ پوری قوت کے ساتھ بروئے کار آیا۔ انقلاب کی پہلی کوشش ۱۹۰۵ء میں ہوئی اسے بزور قوت دبا دیا گیا اور پھر:

''ایک اور انقلاب ۱۹۱۷ء میں شروع ہوا۔ بالشوک جماعت آگے بڑھی۔ اس کی قیادت لینن کر رہا تھا۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں لینن کو کامیابی ہوئی اور اس نے اقتدار سنبھال لیا۔ اس انقلاب کے وقت اسٹالن ۴۴ سال کا انتہا پسند کارکن تھا۔ اس وقت وہ سائبیریا میں نظر بند تھا۔ اس بندۂ خدا کے والدین تو اسے پادری بنانا چاہتے تھے لیکن یہ کافر کھلم کھلا مارکس کے نظریات کا پرچار کرتا تھا۔ اس کی تصنیف ''قومی اور نوآبادیاتی مسئلہ'' لینن کی توجہ کا باعث ہوئی۔''[۱]

اسٹالن روس کی صنعتی ترقی کا مبلغ تھا۔ وہ ایک مکمل اشتراکی سوسائٹی کو وجود میں لانے کا حامی تھا۔ اس کے برعکس اس کے ہم عصر ٹرائسکی کا خیال تھا کہ روس میں اشتراکی نظام کا قیام ناممکن ہے۔ پایانِ کار ۱۹۲۷ء میں اسٹالن کے نظریات کی فتح ہوئی۔ اس تنازعہ میں ۱۹۲۴ء میں ٹرائسکی کو پارٹی کی کونسل کی رکنیت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ۱۹۲۷ء میں اسے پارٹی چھوڑنی پڑی اور ۱۹۲۹ء میں اس نے جلاوطنی اختیار کی۔ روس کی تمام مملکت میں عوام کو مساوی حقوق دلانے کا سہرا اسٹالن ہی کے سر ہے۔ ۱۹۳۶ء کے دستور کی تخلیق و نفاذ بھی زیادہ تر اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ اس نے پارٹی کے استحکام کے لیے اپنی کوششیں اور صلاحیتیں وقف کر دیں۔ ۱۹۴۱ء میں اسے وزیراعظم کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ اس وقت دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ اسٹالن نے روس کی اہمیت کو اس وقت امریکی صدر اور برطانوی وزیراعظم کے شانہ بشانہ رہ کر دنیا کے تین بڑوں میں مسلّم مقام دلایا۔

اگر انیسویں صدی کے اوائل پر نظر ڈالتے ہوئے فرانس کا جائزہ لیں تو یہاں نپولین بوناپارٹ کو واٹرلو کی جنگ میں شکست فاش ہوئی لیکن یہاں کے انقلاب نے اہلِ فرانس کو تو حریت، مساوات اور اخوت کے نعرے کے ساتھ وہ تمام حقوق دیے جو اس نعرے کے متقاضی تھے لیکن اسی فرانس کے مقبوضات پر نظر کریں تو ایشیا اور افریقہ کے اکثر علاقوں پر محیط ہے تو اس نعرے کی حقیقت اور انسان کی ذلت ہمارے سامنے آتی ہے اور روسو کا وہ مشہور قول یاد آتا ہے ''انسان آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا

۱۔ برگ گل، (قائداعظم کی صدی) مجد کی الدین بدایونی، ص ۲۰۶

ہوا نظر آتا ہے۔'' انقلاب فرانس کے اسی کھوکھلے نعرے کی بدولت روسی وزیر اعظم خروشیو نے طنزیہ یہ کہا تھا کہ آپ نے اس نعرے کو محض لکھا ہے مگر ہم نے اس پر عمل بھی کیا ہے۔

انیسویں صدی کے جرمنی پر نظر کریں تو چھٹی دہائی میں ولیم اوّل حکمران تھا لیکن اس عہد کو بسمارک کے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا۔ وہ نہایت شاطر اور چالاک انسان تھا۔ اس نے جرمنی کے طول و عرض کو بڑھانے اور دفاعی اعتبار سے اسے ایک قوت بنانے میں اہم کردار ادا کیا ۶۴۔ ۱۸۶۳ء تک وہ ڈنمارک سے برسر پیکار رہا۔ اس جنگ میں اس کو اسٹریا کی حمایت حاصل تھی لیکن ۱۸۶۶ء میں خود اسٹریا کے خلاف وہ محاذ آرا ہو گیا۔ پرشیا کی فتح اور بالا دستی نے آسٹریا کو تو جرمنی کے بندھن سے آزاد ہونے پر مجبور کر دیا لیکن جرمنی کی شمالی ریاستوں کا وفاق بسمارک کی قیادت میں جرمنی کے اتحاد اور وفاقی ریاستوں کے قیام سے فرانس کا نپولین ثالث چوکنا ہوا۔ بسمارک نے اسے ۱۸۷۰ء میں جنگ پر اکسایا اور فرانس اور پرشیا ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ بسمارک کو کامیابی حاصل ہوئی بلکہ السا س اور لورین کے الحاق نے اس کی فتح پر چار چاند لگا دیے۔ جرمنی کی وسیع اور متحد ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ اب بسمارک نے آسٹریا سے امن کا سمجھوتہ کر لیا جو ۱۸۸۲ء میں پرشیا، اٹلی اور سہ فریقی اتحاد کا باعث ہوا۔

بسمارک نے جرمنی کی ریاست ۸ سال کی قلیل مدت میں قائم کی اور اس پر ۲۰ سال تک بڑے طمطراق اور کروفر سے حکمران رہا لیکن تاریخ کی تلخ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تعمیر ہی میں خرابی کی ایک صورت مضمر تھی۔ آئندہ چند سال میں جرمنی میں صنعت کی بہت کچھ توسیع و ترقی ہوئی۔ اس ترقی کے نشہ نے جرمنی کے حکمرانوں کے دل میں نو آبادیات کی ہوس پیدا کی۔ ایک مضبوط بحری بیڑے کی تمنا بھی بیدار ہوئی۔ یہ خواہش برطانوی استعمار کی کامیابیوں کو دیکھ کر بیدار ہوئی تھی۔ اسی دوران ۱۸۸۸ء میں بسمارک کو استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ اہل جرمن کی خواہشات برطانیہ روس اور فرانس کو اس کا دشمن بنانے کا موجب ہوئیں۔ بسمارک کی حکومت سے علیحدگی اور ولیم کی معتدل مزاجی پہلی جنگ عظیم کا سبب بنی۔ جرمنی کے ہمراہ ترکی اور دیگر چند ممالک تھے جبکہ اس کے خلاف دنیا کی اکثر اقوام موجود تھیں ۱۹۱۹ء میں جنگ کے خاتمے سے قبل ولیم حکومت اور ملک سے نکل بھاگا۔ اسی دوران ہٹلر نے پہلے بحیثیت جاسوس اور پھر سیاسی کارکن عملی سیاست میں حصہ لیا۔

''۱۹۲۱ء میں اپنی سرکردگی میں نیشنل سوشلسٹ پارٹی کے نام سے منظم کیا اور اسے ایک مربوط لائحہ عمل دیا۔ اس کی گرفت بڑھتی گئی اور ۱۹۲۳ء میں بغاوت کے الزام میں اسے ۹ ماہ قید میں رہنا پڑا۔ جہاں اس نے اپنی سیاسی سوانح حیات ''میری جدو جہد'' تصنیف کی۔ ۱۹۳۰ء تک اسے صنعت کاروں کی حمایت حاصل ہو گئی اور اس کی نازی پارٹی کو بڑی مقبولیت حاصل ہو گئی۔ ۱۹۳۲ء میں ہنڈن برگ نے انتخابات میں ہٹلر کو شکست دی لیکن اس کی پارٹی کے منتخب شدہ ارکان کی تعداد کثیر تھی چنانچہ جوڑ توڑ کر کے ہٹلر ۱۹۳۳ء میں جرمنی کا چانسلر بن بیٹھا۔''[۱]

---

[۱] برگ گل (قائد اعظم کی صدی) محمد محی الدین بداوانی ص ۲۲۔

ہٹلر کی حکومت محض جرمنی تک خود کو محدود رکھنے کے حق میں نہ تھی۔ وہ جرمنوں کو اعلیٰ نسل قرار دیتا اور پوری دنیا پر حق حکمرانی کے علمبردار کے طور پر پیش کر رہا تھا۔ اس کی یہی ریشہ دوانیاں ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ ہم اپنے مضمون میں آگے چل کر اس جنگ کی نوعیت، مقاصد اور نقصانات کا جائزہ لیں گے۔

اب ہم ترکی کے سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ خلافت عباسیہ جو مسلمانوں کے اتحاد کی علامت تصور کی جاتی تھی، کی حدود ایشیا کے بڑے علاقے افریقہ اور یورپ کے اکثر ممالک تک پھیلی ہوئی تھی اور یوں دنیا کے ایک بڑے مسلم علاقے میں خلیفہ عثمانیہ کے نام پر خطبہ پڑھا جاتا تھا لیکن سترھویں صدی کے اواخر میں خلافت عثمانیہ کا زوال شروع ہو گیا۔

''۱۶۷۳ء میں عیسائیوں نے دولت عثمانیہ پر انتقامی حملے شروع کیے۔ سب سے پہلے ترکوں کو ویانا میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۶۹۹ء میں ہنگاریہ (ہنگری) ہاتھ سے جاتا رہا۔ ۱۷۸۳ء میں روسیوں نے ترکوں کو کریمیا سے نکال دیا۔ ۱۸۰۴ء میں بلقان کی بغاوت سربیا میں شروع ہوئی۔ ۱۸۱۹ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان یونان نے بھی ترکوں کی حکومت کا جوا اُتار پھینکا۔ روس نے ترکی کی زوال پذیر قوت سے فائدہ اٹھایا۔ اس سلسلے میں ۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۶ء ترکی کو جنگ کریمیا سے دوچار ہونا پڑا۔ بظاہر اس جنگ کا بہانہ وہ اختلاف آراء تھے جو یروشلم کے مقامات مقدسہ کی تحویل کے بارے میں پیدا ہو گئے تھے لیکن اس کی اصل بنا وہ شبہات تھے جو برطانیہ اور فرانس کے دلوں میں بلقان کے روس کی بدنیتی سے پیدا ہو چکے تھے۔ ۱۸۵۳ء میں روس بلقان پر ترکوں کے خلاف حملہ آور ہوا لیکن آسٹریائی مزاحمت نے اسے پسپائی پر مجبور کر دیا۔ روس نے ترکی بحری بیڑے کو غرق آب کر دیا۔ ۱۸۵۴ء برطانیہ اور فرانس نے روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔''[1]

اس موقع پر برطانوی افواج اپنی بدنظمی کی بدولت شدید مالی و جانی نقصان سے دوچار ہوئیں۔ معاہدہ پیرس ۱۸۵۶ء پر جنگ کا اختتام ہوا۔ لیکن ۱۸۷۶ء میں ترکوں کے خلاف بلغاریہ نے سر اٹھایا تو بلقانی سلاؤں کی حمایت میں روس نے پھر جنگ چھیڑ دی۔ یہ جنگ ۱۸۷۸ء میں معاہدۂ برلن پر ختم ہوئی۔ جسکی رو سے ترکی کو بلغاریہ، بوسانیہ اور ہرزیگووینا سے دستبردار ہونا پڑا۔ ترکوں کو اصل نقصان عربوں نے پہنچایا۔ عرب قوم پرستی کے باعث عراق، شام، اردن اور U.A.E وجود میں آئیں۔ بیرون ملک سلطنت کی کمزوری اندرون خانہ بغاوت کی شکل میں رونما ہوئی۔ ۱۹۰۸ء میں انور پاشا نوجوان فوجیوں کی معاونت سے سلطان عبدالحمید کو ۱۸۷۶ء کے آئین کی بحالی پر مجبور کرنے میں کامیاب ہوا اور ۱۹۰۹ء میں سلطان کو برطرف کر دیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں طرابلس پر اٹلی کا شدید حملہ ہوا۔ اہلِ طرابلس نے کئی بار اٹلی کے دانت کھٹے کیے مگر چاروں طرف سے گھر جانے کی وجہ سے انہیں شکست ہوئی۔ اس جنگی معرکہ کا تذکرہ اقبال کی مشہور نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' میں ملتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اخوت کے جذبے سے سرشار خلافتِ عثمانیہ کی بقا کے خواہش مند تھے ۱۹۱۲ء آتے آتے ترکوں کو جنگِ بلقان میں الجھا دیا گیا جو دو حصوں پر مشتمل تھی اور جس کے نتیجے میں ترکی

---

[1] برگ گل (قائداعظم کی صدی) محمد محی الدین بدایونی ص ۲۳۔

کو یورپ کے علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ جنگ بلقان کے سلسلے میں انگریزوں نے مسلمانانِ ہند کے دکھاوے کے لیے غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا لیکن درپردہ وہ ترکوں کے دشمنوں کو شہہ اور اسلحہ برابر دیتے رہے۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی جرمنی کا حلیف اور برطانیہ کا حریف تھا۔ یورپی اقوام نے ترکی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ ایک طرف روسی افواج اور دوسری طرف برطانوی افواج ترکی کی تباہی کے درپے تھیں اور ادھر اہلِ ہندوستان تحریکِ خلافت کے ذریعے ترکی سے حلف وفاداری نبھانے میں کوشاں تھے قربانیوں اور ظلم وستم کے درمیان یہ جنگ اپنے خاتمے کو پہنچی مگر اس کی تباہ کاریاں سمیٹنے کے لیے ایک طویل عرصہ لگا۔ کیونکہ:

''جنگِ عظیم دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے تباہی و مصیبت کا پیغام لائی تھی۔ سلطنتِ عثمانیہ بکھر گئی تھی۔ عرب دنیا مختلف ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی، جن پر استعماری طاقتوں کے کٹھ پتلی شریف حسین اور اس کے بیٹے دادِ حکمرانی دے رہے تھے۔ اعلان بالفور کے ذریعے برطانیہ نے یہودیوں کو فلسطین میں صیہونی ریاست کے قیام کے لیے بنیاد فراہم کر دی تھی۔ ترکی کا اندرونی خلفشار بڑھ گیا تھا۔ مصطفیٰ کمال اور ان کے ساتھیوں نے انقرہ میں متوازی حکومت قائم کر لی تھی۔ برائے نام خلافت چند دنوں کی مہمان نظر آتی تھی۔ بیرونی دباؤ بھی کم نہ تھا۔ ادھر ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت بہت قابلِ رحم تھی کیونکہ بہت سے لوگ تحریک ہجرت کی بے نظمی اور بے تدبیری کا نتیجہ بھگت رہے تھے۔''[۱]

اور پھر یورپین اقوام کی خواہش رنگ لائی مسلمان امت سے وطنیت کی طرف راغب ہوئے یوں:

''۱۹۱۹ء میں جب یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کر لیا تو ترکوں میں حب الوطنی کا شدید ردِ عمل ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں مصطفیٰ کمال نے انگورہ میں ایک عارضی حکومت قائم کر لی اور ۱۹۲۲ء میں خلافت اور سلطانی کا خاتمہ کر کے ''یورپ کے مرد بیمار'' کو نئی جمہوریہ کا درجہ دے گیا۔ اتاترک کا لقب پایا اور نئی جمہوریہ ترکی کے سربراہ مقرر ہوئے۔''[۲]

ان کا موقف تھا کہ وسیع و عریض ترکی سے محدود مگر مستحکم ترکی بہتر ہے اور یوں چار سو سال تک ایک طویل قطعہ اراضی پر ترکی کا پرچم لہرانے کے بعد ترکی موجودہ حدود تک محدود رہ گیا۔

غیر منقسم ہندوستان اور موجودہ پاکستان کی سرحد پر واقع ایران بھی شدید خلفشار اور بیرونی حملوں کا شکار رہا۔ ۱۹ویں صدی کے نصف تک روسی افواج اور پھر روسی اور برطانوی افواج نے مل کر دھما چوکڑی مچائی۔ یہاں تک کہ مقدس شہر مشہد پر بھی بمباری کی گئی اور شیراز پر برطانوی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ اندرون ملک اسلحہ کی کمیابی ان قابضین کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ایک فوجی افسر رضا خان برسرِ اقتدار آئے ۱۹۲۵ء میں ان کی بادشاہت کا اور خاندانِ پہلوی کی حکومت کا اعلان ہوا لیکن اسلامی عقائد اور رسومات کا جس طرح خون کیا گیا اسے ڈاکٹر محمد رفیع الدین ہاشمی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے؛

---

[۱] اقبال کی طویل نظمیں؛ رفیع الدین ہاشمی، ص ۸۸۔

[۲] برگ گل (قائداعظم کی صدی) محمد محی الدین نواب بدایونی ص ۶۱۔

''ایران بھی جدیدیت اور لادینیت کی راہ پر گامزن تھا۔ رضا شاہ مصطفیٰ کمال کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ اگرچہ اس کی حکمتِ عملی کمال پاشا سے مختلف اور زیادہ مدبرانہ تھی۔ اس نے اسکولوں سے لازمی مذہبی تعلیم کا خاتمہ کر دیا مشرقی لباس ممنوع قرار دیا۔ حتیٰ کہ اس کی بیوی اور صاحبزادی پردہ ترک کر کے برسرِ عام آ گئیں پردہ کی بھی ممانعت کر دی گئی۔''[۱]

ایک اور ہمسایہ ملک افغانستان بھی روسی اور برطانوی فوجوں کی یلغار میں رہا مگر افغانوں نے برطانوی فوجوں کو دور دور رکھا۔ برطانیہ کا عمل دخل بھی اسی وجہ سے تھا کہ کہیں روس نہ آ جائے۔ ۱۹ویں صدی کے اختتام تک افغانستان میں افغانوں کا اقتدار رہا جبکہ بیسویں صدی میں افغانوں نے برطانوی فوجوں کو مزید پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ بعد میں برطانوی حکومت کی خواہشات کی تکمیل میں ۱۹۳۳ء میں ظاہر شاہ بادشاہ بنائے گئے جو تقریباً چالیس سال تک اس عہدے پر متمکن رہے۔

غیر منقسم ہندوستان کا ایک اور پڑوسی ملک برما ۱۹ویں صدی میں اپنی بقاء کی جنگ میں مصروف تھا۔ مگر ہر معرکہ میں کچھ نہ کچھ علاقے پر انگریزوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی اور ۱۸۸۵ء تک پورا برما انگریزوں کے زیرنگیں آ گیا۔ اسے ہندوستان کا ایک صوبہ تصور کیا گیا بعد ازاں ۱۹۲۳ء میں اس کی الگ سیاسی حیثیت متعین کر کے پارلیمنٹ قائم کی گئی۔ ۱۹۳۷ء میں انگریزوں نے اپنی بین الاقوامی حکمت عملی کے تحت برما کو ہندوستان سے بالکل علیحدہ کر دیا۔

۱۹ویں صدی کے چین پر نظر ڈالیں تو اس کی ہر بندرگاہ پر غیر ملکی قابضین کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ کہیں فرانس، کہیں پرتگال اور کہیں برطانیہ قابض تھا۔ ان کے تجارتی مفادات برطانیہ سے وابستہ تھے۔ یہ افیون کی لت لگا کر چینیوں کو مالی اور جسمانی طور پر تباہ کر رہے تھے بیسویں صدی کے آغاز میں غیر ملکیوں کو نکال بھگانے کی ایک کوشش ناکامی میں بدلی مگر ۱۹۱۱ء میں جمہوریت، اشتراکیت اور قومیت کے نعرے کے تحت چینی متحد ہونے لگے مگر جاپان اور برطانیہ کی ملی بھگت چین کو سنبھلنے کا موقع نہ دیتی تھی لیکن ماؤزے تنگ کی قیادت میں چینیوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

ہم نے جس آدمی اور ہندوستانی منظر نامے کو پیش کیا ہے۔ اس میں ہندوستان کی حد تک یہ اضافہ ضروری ہے کہ برطانوی حکومت بیسویں صدی میں یہاں بھی کئی تجربے کرتی رہی۔ کبھی بنگال کو تقسیم کیا گیا تو کبھی منسوخ اور بمبئی اور سندھ کا الحاق کیا گیا اور پھر اس سے بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔ مقامی طور پر میثاق لکھنؤ میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک بنیاد فراہم کی گئی مگر تحریک خلافت کی ناکامی نے اس خواب کو شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا۔ انگریز حکمران، بربریت اور خون ریزی کے ذریعے اپنے اقتدار کو طول دے رہے تھے تو ہندو لیڈر ہندوستان سے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اپنی حکمرانی کی راہیں ہموار کر رہے تھے۔ انہی حالات میں نہرو رپورٹ سامنے آئی جس کا جواب قائداعظم کے چودہ نکات سے دیا گیا اور اور پھر گول میز کانفرنس کے ذریعے اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ خطبۂ الہ آباد میں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی گئی۔ انتخابات اور ان کی ناکامی کے دوران دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ جرمنی نے بڑی

۱۔ اقبال کی طویل نظمیں، رفیع الدین ہاشمی، ص ۱۷۱، ۱۷۲۔

چالاکی سے پہلے کچھ معاہدے کیے اور پھر یورپ، پر حملہ کر دیا:

''پولینڈ کے ہوائی حملوں کی تاب نہ لا سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دفاع کا ڈھانچہ تباہ ہو کر رہ گیا۔ روس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے **مغربی یوکرینا** اور بائیلوروسیا پر **قبضہ کر لیا جن کا الحاق پولینڈ نے** بیس سال قبل یعنی ۱۹۲۰ء میں کر لیا تھا۔ مغربی محاذ پر جانبین مجینو اور سگفرائڈ لائنوں کے پیچھے ایک دوسرے کو تکتے رہے تھے لیکن ۱۹ اپریل ۱۹۴۰ء کو جنگ کا ایک نیا محاذ کھل چکا تھا۔ اس تاریخ کو جرمنی نے ڈنمارک پر حملہ کیا جو بغیر مزاحمت کے زیر ہو گیا۔ **اسی وقت جرمنی** نے ناروے پر بھی حملہ کیا۔ برطانوی اور فرانسیسی افواج ناروے کی مدد کے لیے جا پہنچیں لیکن جرمنی نے **جون میں فرانس** پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے ناروے کے محاذ سے اتحادی افواج کی واپسی گھر کی آگ بجھانے کے لیے ناگزیر ہو گئی۔ اس **وقت برطانیہ** میں کابینہ کی تبدیلی عمل میں آئی۔ اب وہاں چیمبر لین کی امن کی چھتری کی جگہ چرچل کے شعلہ زا سگار کا دور آیا۔''[1]

لیکن چرچل کے اقتدار سنبھالتے ہی ہٹلر نے نیدرلینڈ پر حملہ کیا اور محض **پانچ دن میں اس** کی فوجیں قابض ہو گئیں اور پھر بلجیم پر حملہ آور ہوئیں اور بلجیم میں مقیم برطانوی اور فرانسیسی فوجیں نکلنے پر مجبور ہوئیں اور یوں **بلجیم فتح** ہو گیا جرمن فوجیں بڑھتی ہوئی رود بار انگلستان تک جا پہنچیں۔ ۱۰ جون ۱۹۴۰ء کو اٹلی نے بھی فرانس پر حملہ کر دیا اور یوں فرانس بد سے بدتر حالت میں چلا گیا۔ اسی دوران جرمنی کے ہوائی حملے برطانیہ کے لیے قیامت کا منظر پیش کر رہے تھے۔ پہلے پہل بندرگاہوں پر اور پھر ہوائی اڈوں اور شہری تنصیبات پر لڑاکا اور بمبار طیارے حملہ آور ہوئے۔ وہ دن اور رات جب چاہتے حملہ کرتے تقریباً ۳ ہزار طیارے اس مشن میں مصروف رہے۔ مئی ۱۹۴۱ء میں اس کی کچھ روک تھام ہو سکی اسی دوران دو ہزار جرمن طیارے مار گرائے گئے۔ پورا یورپ بارود کی بو میں بسا ہوا تھا۔ امریکہ اور روس خاموش تھے کہ ۲۱ جون ۱۹۴۱ء کو جنگ کا ایک حیرت انگیز محاذ قائم ہوا یعنی عدم جارحیت کے معاہدہ کو نذر آتش کر کے جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا۔ جرمن افواج پیش قدمی کرتی رہیں لیکن دسمبر میں برفباری اور سرد ہواؤں کی وجہ سے انہیں پیچھے ہٹنا پڑا اور روسی افواج نے مارچ ۱۹۴۲ء تک انہیں اپنی سرحدوں سے باہر دھکیل دیا لیکن گرمیاں شروع ہوتے ہی جرمن دوبارہ حملہ آور ہوئے مگر اب مقابلہ تقریباً برابر کا تھا نہ روسی افواج پیچھے ہٹتی تھیں اور نہ جرمن آگے بڑھنے میں کامیاب ہو پاتے تھے۔ اب امریکی عوام اور حکومت بھی اس میدان کارزار میں اترنے پر تیار ہوئے اور ۸ نومبر ۱۹۴۲ء کو آئزن ہاور کی قیادت میں امریکی اور برطانوی افواج مراکش اور الجزائر کی سرزمین پر اتریں اور یہیں سے جرمن افواج کی پسپائی کا آغاز ہوا۔ اٹلی نے بھی پسپائی اختیار کی اور جرمنی پر حملہ آور ہوا۔ روسی افواج مشرقی یورپ کے اکثر ممالک کو کاٹنے میں کامیاب ہوئی اور ۱۹۴۴ء کے اختتام تک برطانوی مقبوضات سے جرمن فوجیں بے دخل ہو چکی تھیں۔ اگر جاپان کی کارکردگی پر نظر کریں تو اس نے بحری بیڑوں کے ذریعے ایشیا کے کثیر علاقے پر اپنی بالادستی قائم کی جو امریکی افواج کے میدان میں آتے ہی محدود ہوتی گئیں اور پھر تاریخ عالم نے اس جنگ عظیم کا سیاہ ترین باب رقم کیا۔

---

[1] برگ گل: (قائد اعظم کی صدی) محمد محی الدین بدایونی ص ۷۔

''جاپان میں ۱۶۔اگست ۱۹۴۵ء کو ہیروشیما پر ایٹم بم اچانک پھینکا گیا۔ دو دن بعد ۸۱۔اگست کو روس نے جاپان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور منچوریا پر حملہ کیا۔ ۹۔اگست کو ایک اور ایٹم بم جاپان کے شہر ناگاساکی پر گرایا گیا۔ ۱۴۔اگست کو جاپان کے شہنشاہ ہیرو نے جنگ بندی کے لیے اتحادیوں کی شرائط قبول کرنے کا اعلان کیا۔ ۱۵۔اگست کو برما کے محاذ پر جاپانیوں نے ماؤنٹ بیٹن کے سامنے ہتھیار ڈالے۔''[1]

جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا جسکے پہلے چند اجلاس مختلف ممالک میں ہوئے پھر نیویارک میں اس کے مستقل دفاتر قائم ہو گئے۔

اب ہم نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں کے لکھنے کے مقاصد اور ان حالات کو بھی بیان کرتے ہیں جو ان سیاسی اور فوجی حالات کے ساتھ ساتھ معاشرتی، سماجی اور مذہبی نوعیت کے تھے۔ برطانیہ، فرانس، پرتگال اور دیگر ایسے ممالک جو تجارتی اغراض کی خاطر دنیا کو فتح کر رہے تھے تاجروں کے بھیس میں ان ملکوں کے حکمران بن بیٹھے اگر یہیں بات ختم ہو جاتی تو گوارہ تھا مگر انہوں نے اپنے معاشرے اور معاشرت کی چھاپ بھی ان علاقوں میں پیش کی اور عیسائی مشنریز کے ذریعے تبلیغ کا کام بھی شروع کیا۔ دراصل یہ قابضین یہ جانتے تھے کہ امتِ مسلمہ کو پارہ پارہ کرنے کے بعد ہی ان کا اقتدار قائم رہ سکتا ہے جس کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے انہوں نے خلافتِ عثمانیہ اور حجاز کے رہنے والوں میں قومیت اور وطنیت کا تعصبانہ بیج بویا اور پھر اپنے پٹھوؤں کے ذریعے آزاد جمہوری مملکتوں کا اعلان کروایا۔ اسلامی تہذیب وثقافت کو اکھاڑ پھینکنے کی سوچی سمجھی سازش کی گئی اور دینِ اسلام کے تصور اور تشخص کو ایک کھوکھلا اور بے معنی نعرہ قرار دے کر فرسودہ روایات کا امین قرار دیا گیا۔ تفرقے اور تنازعے کے ذریعے مسلمانوں کو لڑایا گیا اور ان میں موجود حمیت اور غیرت کو میٹھی لوری کے ذریعے سلا دیا گیا۔ ان حالات میں جس ولولے اور جوش کی ضرورت تھی اور جس انداز میں مسلمانوں کو اٹھ کھڑے ہونے کا درس دینا مقصود تھا اس کام کو ہمارے دیگر اکابر کر رہے تھے۔ شاعری کے ذریعے علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور دیگر بہت سے نام لیے جا سکتے ہیں تو دوسری طرف نثری خدمات کا سہارا لے کر مولانا عبدالحلیم شرر نے تاریخی ناول نگاری کا آغاز کیا تھا۔ بعد میں یہ سلسلہ جاری تو رہا مگر جس جوش جہاد، ولولے، امنگ اور تڑپ کی ضرورت تھی وہ اکثر تاریخی ناول نگاروں کے یہاں ناپید تھی۔ تحریک آزادی اپنی آخری دہائی میں داخل ہو چکی تھی۔ مسلمانوں میں اتحاد اور یقین محکم کے ساتھ ساتھ عمل پیہم اور جہاد زندگانی کو اپنانے کی اشد ضرورت تھی اور اسی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے نسیم حجازی نے اپنے زورِ قلم کا جادو جگایا وہ تحریروں کے ساتھ ساتھ عملی سیاست میں بھی موجود رہے۔ ایک طرف تحریک پاکستان تھی جو اپنی کامیابی کی منزل کو پہنچنا چاہتی تھی تو دوسری طرف دشمنوں کی سازشیں تھیں جو پاکستان کے استحکام میں دراڑیں ڈالنے کے لیے بڑھی چلی جاتی تھیں۔ صوبہ سرحد ہو کہ بلوچستان ہر جانب آستینوں کے سانپ ڈسنے کے لیے تیار تھے وہ کون مردِ مجاہد ہوگا جو ان کے منہ کچل دے اپنے قلم سے، اپنی زبان سے، عمل سے اور بزورِ بازو بھی۔

---

[1] برگِ گل: (قائداعظم کی صدی) محمد محی الدین بدایونی ص ۲۹۔

اسی میدان میں ایک شہسوار کامیاب وکامران نسیم حجازی کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔نسیم حجازی نے اپنے تاریخی ناولوں کے ذریعے اہلِ اسلام کوان کے تابناک ماضی کی جھلک دکھائی تا کہ وہ ماضی پرفخر کرسکیں تو دوسری طرف اپنے حال کو ماضی سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کوشاں رہیں۔

قیام پاکستان کا تاریخی پس منظر

بظاہر دنیا کے نقشے پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک نظریاتی مملکت معرض وجود میں آئی مگر یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ انگریزوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کو منظور کرتے ہوئے آخری وائسرائے ہند کے ذریعے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو یہ اعلان کر دیا کہ ہندوستان تقسیم کیا جا رہا ہے بلکہ ہندوستان کی تقسیم کے لیے ایک طویل جدوجہد اور تحریک چلائی گئی۔ ان کے حصول کے لیے مسلمانان ہند کو عظیم قربانیاں پیش کرنی پڑیں۔ لاکھوں لوگ اس وقت قتل کر دیے گئے جبکہ وہ بصد شوق اپنے نئے وطن کی طرف آ رہے تھے کیا اچانک ہندو مسلمان کے دشمن ہو گئے تھے؟ اور انہیں قتل کرنے کے درپے تھے یا مسلمان بلاوجہ ہندوؤں سے بددل ہو گئے تھے کہ متحدہ ہندوستان کے بجائے تقسیم کے حامی ہو گئے حالانکہ یہ تو وہ اقوام تھیں جو صدیوں سے ایک ساتھ رہتی بستی آ رہی تھیں۔ آخر وہ کیا عوامل تھے جو برطانوی حکومت اور کانگریس کی تمام تر کوششوں کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے کہ ہندوستان متحد رہے۔ یقیناً ان دونوں اقوام کے درمیان کوئی خلیج ضرور حائل تھی جو انگریزوں کے ملک چھوڑنے سے قبل تقسیم کے عمل پر منتج ہوئی۔ اس کے لیے ہمیں ان سیاسی، سماجی، تمدنی اور معاشی حالات کا جائزہ لینا ہوگا جو یہاں درپیش تھے۔

بعض کانگریسی رہنماؤں کا یہ خیال کہ دو قومی نظریہ محض دماغی اختراع ہے اور اس طرح بعض مسلمان رہنما مذہب کا سہارا لے کر ہندو مسلم نفاق کا بیج بو رہے ہیں جبکہ بعض دیگر لبرل عناصر یہ سوچتے تھے کہ انگریز اپنی چال کے مطابق تقسیم کرو اور حکومت کرو کے اصول کو بروئے کار لا کر یہ فتنہ کھڑا کر کے ہندوستان تقسیم کر رہے ہیں۔ رہے بعض دینی اور ثقافتی اختلافات تو یہ محض سطحی نوعیت کے مسائل تھے جنہیں بلاوجہ فروغ دے کر اختلاف کی بنیاد بنایا گیا اور اصل قومیت ہندوستانی قومیت تھی اور شاید یہی فرق کانگریسی اور دیگر نقطہ ہائے نظر رکھنے والوں اور مسلم قومیت کا تصور پیش کرنے والوں کے درمیان تھا حالانکہ حقیقت یوں تھی:

''اس سے انکار نہیں کہ ہندو اور مسلمانوں کے ہزار سالہ ملاپ نے ایک دوسرے کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا، ان کے فکر و نظر، علم و عمل، رہن سہن، اخلاق و اطوار، سماجی رسوم و آداب اور علوم و فنون سب پر ایک دوسرے کا اثر پڑا اور ان کی زندگی کا وہ اسلوب قائم نہ رہ سکا جو دونوں قوموں کے ملاپ سے پہلے تھا۔ اسکے باوجود وہ ایک دوسرے سے الگ رہے۔ سرکاری دفتروں، کاروباری اداروں، نجی محفلوں، بازاروں، تقریبوں اور علمی و ادبی مجلسوں اور تصوف و درویشی حلقوں میں ایک دوسرے سے ملتے، گھومتے پھرتے، خاطر مدارت کرتے اور غم و خوشی میں شریک ہوتے لیکن باہم شادی و بیاہ اور کھانا پینا ممکن نہ ہوا۔ دونوں کے طور طریقے، دینی عقائد و ملی نظریات اور عبادت و ریاضت کے آداب، ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف رہے۔''[1]

مسلمان قومیت کے اعتبار سے ہندوستانی نہیں بلکہ مسلم تھے اور امت مسلمہ کا خود کو ایک جزو مانتے تھے اور تحریک خلافت کے دوران ۱۹۱۱ء میں طرابلس کی جنگ پھر ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم اس کے بعد خلافتِ عثمانیہ کے حوالے سے چند ماہ چلنے والی تحریک اور بار ہا ایسے

---

[1] ہندو اردو تنازع؛ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص ۲۰۱۔

مواقع آئے کہ مسلمانوں نے امت کے مسائل کو اپنا مسئلہ جان کر اس میں اس قدر دلچسپی لی کہ یہ گمان کرنا حق بجانب ہے کہ ان کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ یعنی مسلم قوم کا تصور پہلے وجود میں آیا۔ اسی بات کو پروفیسر محمد رفیع انور حسن عسکری رضوی نے ان الفاظ میں بیان کیا:

''پاکستان نے کسی قومیت کو جنم نہیں دیا بلکہ مسلمان قومیت کے تصور نے پاکستان کو جنم دیا۔ بالفاظ دیگر قوم کا تصور مملکتِ پاکستان سے پہلے وجود میں آیا۔ یہ احساس کہ مسلمان اپنی ذات میں ایک قوم ہیں بالآخر پاکستان کے قیام کی شکل میں نمودار ہوا۔ پاکستان مسلم قومیت کا آغاز نہیں بلکہ نچوڑ تھا۔''[1]

اس کی وجہ مسلمانوں کا وہ قومی شعوری تصور ہے جو ان کے معاشی، معاشرتی اور اخلاقی نظریات کو ان کی عادات و اطوار اور مذہبی رہن سہن کی بنا پر منفرد کرتا تھا جو حضرت محمد ﷺ نے ایک مکمل نظریہ حیات کی صورت میں اپنی امت کے لیے تقریباً چودہ سو سال پہلے پیش کیا تھا۔ اسلامی تعلیمات میں مذہب اور ثقافت جدا جدا نہیں بلکہ مکمل نظریہ حیات پیش کیا گیا۔ یہی وہ اصول ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو دیگر اقوام سے ممتاز بنا دیا اور انفرادیت عطا کی۔

ان اصولوں نے مسلمانوں کو مخصوص معاشرتی طور طریقے، رسم و رواج، زبان و ادب، فنون لطیفہ، نام و نسب، شعور، اقدار و تناسب، قانون، تاریخ و روایات اور فلسفۂ حیات دیا۔ ہندو ایک ایسے مذہب اور فلسفۂ حیات کے پیروکار تھے جو کہ مسلمانوں کے طور طریقوں سے مختلف تھا۔ بعض صورتوں میں جن افراد کو ایک قوم قابلِ تقلید قرار دیتی تھی دوسری قوم اسے قابلِ احترام نہیں سمجھتی تھی۔ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن سنسکرت کی بجائے عربی، فارسی اور اردو میں پروان چڑھی، یہ دونوں اقوام تقریباً ایک ہزار سال تک ایک دوسرے کے ساتھ رہیں مگر افسوس تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ان کے تضادات جوں کے توں رہے۔ مغل شاہ اکبر نے دینِ الٰہی کے ذریعے مشترکہ اقدار کو رواج دینے کی ناکام کوشش کی۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرق کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ہر شہر میں عموماً مسلمانوں اور ہندوؤں کے محلے الگ الگ ہوتے تھے دونوں کے تہوار مختلف، لباس و خوراک کے اصول متضاد۔ ان دونوں قوموں کے مابین شادی بیاہ نہیں ہوتا اور ان کے عوام ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھانا بلا تکلف نہیں کھاتے تھے اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے فنِ تعمیر کا موازنہ کریں تو دونوں میں کافی تضاد نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کا تعمیری ذوق وسعت اور خارجی عظمت کا شائق ہے اور ہندوؤں کے فنِ تعمیر میں تنگی، گنجل پن اور داخلی تہ بہ تہ پیچیدگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے مسلمانوں کی تعمیرات میں مخروطیت اور کلس نمایاں ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے تشخص، ثقافت اور تمدن کی حفاظت کی حالانکہ سیاسی اعتبار سے اپنی اہمیت کو وسیع کرتے گئے اور دوسرے مذاہب بالخصوص ہندوؤں کی نچلی ذاتوں کا دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا عمل بھی جاری رہا یہ معاملہ ہندوؤں کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا:

---

[1] تحریک قیام پاکستان؛ پروفیسر محمد رفیع انور حسن عسکری رضوی، ص ۲۹۲۔

''سرسید احمد خان نے جو اس سے پہلے تک ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے حامی تھے تعجب و تاسف کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا کہ اب ہندو اور مسلمان قومیں ہند میں مل کر نہیں رہ سکتیں۔''[۱]

اور اسی تصور نے سرسید کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی اور انہوں نے مسلمانوں کے لیے ایک قوم کا لفظ استعمال کیا اور مختلف دلائل سے اور حوالوں سے اس فرق کو واضح کیا جو بہت سے ذہنوں میں موجود تھا۔ پھر تحریک پاکستان کے دوران قائداعظم نے اس مسئلے پر یوں رائے دی:

''ہم یہ کہتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ لفظ قوم کی کسی تعریف اور امتحان کی رُو سے مسلمان اور ہندو دو بڑی قومیں ہیں ہم دس کروڑ افراد کی ایک قوم ہیں اور مزید برآں ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کی اپنی مخصوص ثقافت، تمدن، زبان اور ادب، آرٹ اور صنائع، نام اور ناموں کا سلسلہ، قدروں کا معیار اور توازن، اخلاق اور قانونی نظام، رسوم و رواج اور کیلینڈر، تاریخ اور روایات فطری صلاحیتیں اور مقاصد ہیں۔ مختصراً زندگی کے متعلق ہمارا مخصوص نظریہ ہے اور ہم اسے ایک مخصوص انداز میں دیکھتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے تمام اصولوں کے مطابق ایک قوم ہیں۔''[۲]

اسی رجحان کو جناح گاندھی گفت وشنید میں اس طرح پیش کیا:

''ہمارا دعویٰ ہے کہ قومیت کی ہر تعریف اور معیار کی رُو سے مسلمان اور ہندو، دو بڑی قومیں ہیں۔ ہماری قوم دس کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے اور مزید برآں یہ کہ ہم ایک ایسی قوم ہیں جو اپنی خاص تہذیب وتمدن، زبان و ادب، فنون وتعمیرات، اسم اصطلاحات، رسم و رواج، نظام تقویم، تاریخ و روایات اور رجحانات وعزائم رکھتی ہے اور زندگی کے متعلق ہم ایک ممتاز تصور رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے تمام اصولوں کے مطابق ہم ایک قوم ہیں۔''[۳]

تحریک پاکستان کے دوران قائداعظم نے بار ہا اپنے اس مؤقف کو پیش کیا اور ثقافت اور تمدن کے فرق سے اپنی اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ نہ تو ہندوستان ایک ملک ہے اور نہ یہاں ایک قوم بستی ہے بلکہ یہ چھوٹا سا براعظم ہے اور یہاں مختلف اقوام رہتی بستی ہیں۔

انہی عوامل کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندو و مسلمان دو الگ اقوام تھیں۔ بظاہر وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتی بستی رہیں لیکن ان کے آپس کے رشتے کبھی اس طرح استوار نہ ہو سکے کہ وہ ایک قوم کی مانند بن جائیں۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ بعض رسم و رواج ایک دوسرے نے اپنا لیے لیکن مذہبی اعتبار اور شادی بیاہ کرنے کا رواج بھی فروغ نہ پا سکا۔ اسی لیے مختلف افراد نے ہندو مسلم تہذیب کے اختلاف کے حوالے سے یہ رائے نقل کی ہے کہ:

---

۱ حیات جاوید: الطاف حسین حالی، ص ۱۶۳۔

۲ تحریک قیام پاکستان: پروفیسر محمد رفیع انور حسن عسکری رضوی، ص ۲۹۳۔

۳ جناح گاندھی گفت وشنید، ص ۶۵، ۵۸۔

''ہندو مسلم ایک ساتھ رہتے بستے ضرور تھے مگر آپس میں ایک قوم کا تصور کبھی نہ پنپ سکا یہ بالکل دریا کے دوسروں پر رہنے والی اقوام تھیں جو ایک ہی دریا کا پانی پیتیں اور ایک دوسرے کے سامنے رہتی رہیں مگر کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔ مختلف حکمرانوں کی کوششیں بھی بارآور ثابت نہ ہوئیں۔'' اس بارے میں پروفیسر محمد رفیع انور اور حسن عسکری رضوی کی رائے ہے:

''جب کسی ملک کے رہنے والوں میں اتنا تضاد موجود ہو جتنا ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تھا تو سیاسی نظام کو چلانے کے تین ممکن راستے ہوتے ہیں۔

الف۔ طاقت ور گروہ یا قوم پر غالب آجائے اور اپنے اندر اس انداز سے جذب کرلے کہ اس کی انفرادیت ختم ہو جائے۔ یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جبکہ چھوٹی قوم یا گروہ اتنا کمزور ہو کہ وہ اپنے اصولوں اور اداروں کا دفاع نہ کر سکے یا اندرونی خلفشار اتنا ہو کہ اس کے اداروں اور اصولوں کی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں۔

ب۔ کوئی ایسا سیاسی فارمولہ تیار کرلیا جائے۔ متعلقہ گروہ اور قومیں اپنے مخصوص دائرہ میں رہ کر اپنے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔ یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے اگر متعلقہ قوموں میں اعتماد کی فضا برقرار ہو اور وہ ایک دوسرے کے اصولوں اور اداروں کا احترام کرتے ہوں اور اپنے مخصوص دائرہ میں ان کے نشو ونما کے خلاف نہ ہوں۔ اس کے علاوہ ایسا فارمولہ صرف اسی صورت میں تیار ہوسکتا ہے کہ ''کچھ لو اور کچھ دو'' کے اصول پر عمل کیا جائے۔

ج۔ اگر مندرجہ بالا دونوں طریقوں میں سے کسی پر عمل کرنا ممکن نہ ہو تو صرف ایک راستہ باقی رہ جاتا ہے۔ ہر گروہ یا قوم کو مخصوص خطۂ زمین دیا جائے اور انہیں اپنا ملک بنانے کی اجازت دی جائے اور کوشش کی جائے کہ اس کے بعد متعلقہ مملکتوں کے تعلقات خوشگوار رہیں اور وہ ماضی کی تلخیوں کو نظر انداز کردیں۔''[1]

ان تینوں اصولوں کی روشنی میں ہندوؤں کی خواہش پہلے اصول پر عمل پیرا ہونے میں تھی جبکہ مسلمان تیسرے اصول پر کاربند تھے۔ یہ معاملہ بھی ۱۹۴۰ء کے بعد منظر عام پر نہیں آیا تھا بلکہ سرسید احمد خان نے جب مسلمانوں کے لیے ایک قوم کا لفظ استعمال کیا تو فوراً ہی بعد مسلمان قوم کے تحفظ کے حوالے سے برطانوی پارلیمانی نظام کو رائج کرتے وقت ہندوستان کے مخصوص حالات اور یہاں موجود مختلف اقوام کو مدِ نظر رکھنے کا مشورہ بھی دیا تھا پھر ۱۹۰۶ء میں جداگانہ انتخابات اور ملازمتوں میں مسلمانوں کے لیے مخصوص کوٹے کا مطالبہ اور مسلم لیگ کا قیام انہی خدشات کے پیشِ نظر تھا کہ کہیں مسلم قوم کا تصور ماند نہ پڑ جائے اور ہندو اسے تر نوالہ سمجھ کر ہڑپ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر گول میز کانفرنسوں اور اس سے قبل ہونے والے اجلاسوں میں مسلم رہنما وفاقی طرز حکومت، صوبائی خودمختاری اور مسلمانوں کے لیے جداگانہ طریقۂ انتخاب کی وکالت کرتے رہے اور گول میز کانفرنس میں چوہدری رحمت علی کی الگ وطن کی تجویز محض ایک طالب علم کی خواہش جان کر قبول عام نہ ہوسکی۔

---

[1] تحریک قیام پاکستان، پروفیسر محمد انور، حسن عسکری رضوی، ص ۲۵۹۔

اگر ہم ہندوؤں کی ذہنی سازشوں کا جائزہ لیں کہ وہ کسی طرح مسلمانوں کو بحیثیت قوم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور کس طرح مسلمانوں کا استحصال کر کے جمہوریت کے زور پر اقتدار حاصل کرنے کے خواہش مند تھے تو ہمیں ۱۸۵۷ء کے حالات کا جائزہ لینا ہوگا کہ جب مسلمانوں کا اقتدار ختم ہوا تو ہندوؤں نے خوشامدانہ طریقے سے انگریزوں کی طرفداری شروع کی۔ سرکاری ملازمتوں اور عہدوں پر اُن کی تعیناتی اور پھر ہندواردوزبان کا تنازعہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ؛

''اردو کے مقابلے میں ایک نئی زبان ہندی کے نام سے سامنے لائی گئی اور اردو کو ہر اعتبار سے گردن زدنی قرار دیا گیا۔ ہندی کے پرچار کے لیے جا بجا طریقے اختیار کیے گئے۔ جگہ جگہ سبھائیں اور انجمنیں قائم ہوئیں، اردو اور اردو والوں کو مردود و مطعون ٹھہرایا گیا۔ ہندوؤں کے اس رویے نے آگے چل کر ہندی اردو تنازعے کی صورت میں ہندو مسلم سیاست میں ایسی اہمیت حاصل کر لی کہ ہندی، ہندوؤں کے لیے اور اردو مسلمانوں کے لیے ایک طاقتور قومی نشان Symbol بن گئی۔''[۱]

اور پھر:

''۱۸۶۷ء میں اردو ہندی تنازعے کا آغاز ہوا جسکا مقصد اردو کے بجائے ہندی کو عدالتی زبان قرار دینا تھا۔ ہندی وار دو کی مخالفت اس لیے کرتے تھے کہ وہ اردو کو مسلم ثقافت کی نمائندہ زبان سمجھتے تھے۔ ہندوؤں کے اس رویے نے ان کی ذہنیت کو مسلمانوں پر پوری طرح آشکار کر دیا۔''[۲]

کانگریس کے قیام کے وقت بھی اس کے ارکان میں مسلمانوں کی تعداد آبادی میں اُن کے تناسب کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی اور اس جماعت کے قیام کے پوشیدہ مقاصد کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''انڈین نیشنل کانگریس'' میں لفظ ''نیشنل'' کی شمولیت کا مقصد ہندوؤں کے نزدیک پہلے دن سے یہ تھا کہ مسلم قومیت کو کسی طرح ہندو قومیت میں ضم کر دیا جائے تا کہ کسی وقت اگر ہندوستان، جمہوری بنیادوں پر آزاد ہو تو ہندو ہی من حیث القوم اس کے حاکم و وارث قرار پائیں اور مسلمان اقلیتی فرقے کے طور پر ان کی محکومیت میں زندگی بسر کریں۔''[۳]

تقسیم بنگال کے موقع پر مخالفت اور جداگانہ انتخابات کی مخالفت مزید ذہنی انداز کو ظاہر کرتی ہے البتہ ایک خوش آیند کام ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ کی بدولت سامنے آیا اور بعد میں بظاہر مسلمان اور ہندو ایک پلیٹ فارم پر نظر آئے لیکن یہاں بھی گاندھی نے مسلمانوں کو ان کے رہنماؤں سے بدل کرنے کا حربہ استعمال کیا پھر نہرو رپورٹ نے ان کوششوں کو پانی پر لکھی تحریر ثابت کیا۔ رہی سہی امیدیں ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۹ء میں بننے والی کانگریسی حکومتوں نے توڑ دیں اور پھر قائداعظم یہ کہتے سنے گئے کہ ہندو مسلم اتحاد محض ایک خواب ہے اور میں نے تاریخ اسلام اور اسلامی قوانین کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ غیر ممکن اور ناقابل عمل ہے اور قائداعظم کا یہی انداز فکر درست

۱۔ Language , Religion and Politics in North India, Bress, Paul, R, P 36.

۲۔ پاکستان تاریخ وسیاست؛ ڈاکٹر صفدر محمود ص ۱۶۔

۳۔ ہندی اردو تنازعہ؛ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۱۱۔

ثابت ہوا اور ۱۹۴۲ء میں راج گوپال اچاریہ نے کانگریس اور مسلم لیگ میں معاہدہ کروانے کی کوشش کی اور کانگریس کو قیام پاکستان کی تجویز مان لینے پر زور دیا مگر کانگریس رضامند نہ ہوئی ۔ ۱۹۴۴ء میں جیل سے رہائی کے بعد گاندھی جی نے اس موضوع پر قائد اعظم سے گفتگو شروع کی لیکن گاندھی نے قیام پاکستان کے اصول ماننے سے انکار کر دیا۔ شملہ کانفرنس ۱۹۴۵ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہ ہوسکا۔ کانگریس اس کوشش میں مصروف رہی کہ مسلم لیگ میں انتشار پیدا کر کے حکومت برطانیہ کو یہ تاثر دیا جائے کہ کانگریس صحیح معنوں میں قومی جماعت بن گئی ہے۔ صرف اس جماعت کو اقتدار منتقل کیا جائے۔ کانگریس کی اس غیر دانشمندانہ پالیسی نے مسلمانوں کو مکمل طور پر کانگریس سے برگشتہ کر دیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۶ء میں انتخابات میں مسلم لیگ کی شاندار کامیابی کے باوجود کانگریس مساوی بنیادوں پر مذاکرات کرنے کے لیے تیار نہ تھی اگر کانگریس کے رہنما مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مان کر مسلمانانِ ہند کے حقوق کی حفاظت کے لیے فارمولہ وضع کرنے کے لیے صدقِ دل سے گفتگو کرتے تو دوسری جنگ عظیم کے دوران کوئی نہ کوئی سمجھوتہ ہو جاتا لیکن کانگریس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ وہ مسلمانوں کے حقوق اور نظریات سمجھتی ہے اور اسے مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ہے۔

مسلم لیگ نے ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں شرکت سے انکار کر دیا اور مطالبہ کیا دو دستور ساز اسمبلیاں قائم کی جائیں۔ ایک ہندوستان اور ایک پاکستان کا آئین تیار کرے۔ ابتداً برطانوی حکومت قیام پاکستان کے حق میں نہیں تھی۔ کابینہ مشن کی ناکامی کے بعد ہندوستان کی سیاسی فضا بہت کشیدہ ہوگئی۔

ہندوؤں نے راشٹریہ سیوک سنگھ قائم کی اور مسلم لیگ نے براہِ راست کارروائی کا اعلان کیا کلکتہ میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے اور ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئے جن سے برطانوی حکومت کو ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے بارے میں اپنی رائے بدلنی پڑی اور اس نتیجہ پر پہنچی کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے ۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو اس کی تکمیل ہوئی۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ہندوستان کی تقسیم کے سوا کوئی دوسرا راستہ موجود نہ تھا اور بالخصوص ۱۹۳۷ء کے بعد کانگریس کے سخت رویے نے غیر منقسم ہندوستان کی تمام توقعات کو خاک میں ملا دیا اگر انگریز اور ہندو ہندوستان کی تقسیم کی راہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش کرتے تو فسادات میں ہونے والا خون خرابہ دوسری صورت میں بہت زیادہ ہوتا اور یہ بہتر ہوا کہ ہندو اور مسلمان جو اپنی ثقافت اور تمدن کے اعتبار سے مختلف رائے کے مالک تھے ہندوستان کی تقسیم کے بعد الگ ملک کی صورت میں اپنی شناخت قائم رکھنے کے لیے کوشاں رہے۔

تحریک پاکستان میں نسیم حجازی کا کردار بلوچستان کے خصوصی حوالے سے

۱۸۵۷ء کے سیاسی خلفشار میں جب نوبت خانہ جنگی تک جا پہنچی اور فوجی مداخلت کے بعد آخری مغل تاجدار کو اقتدار سے الگ کر دیا گیا اور قلعۂ معلیٰ کو خالی کرالیا گیا تو آئینی اعتبار سے ایک اور تبدیلی بھی رونما ہوئی کہ اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاج برطانیہ کو تفویض کر دیا گیا اور یوں ہندوستان براہِ راست برطانوی حکومت کی نو آبادی بن گیا لیکن جب مسلمان رہنماؤں نے مسلمانوں کے لیے بعض تحفظات پیش کیے اور جداگانہ انتخاب و سرکاری ملازمتوں میں آبادی کے تناسب سے کوٹے کا مطالبہ کیا تو انگریز حکومت کے ساتھ ملک کی سیاسی جماعت کانگریس بھی اُن کی مخالفت میں خم ٹھونک کر میدان میں آ گئی حالانکہ مسلمان رہنما سرسید سے قائد اعظم تک ابتداء ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشاں رہے تھے۔ سرسید احمد خان نے ہندوؤں مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو قریب لانے اور ان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ انہیں احساس پیدا ہوا کہ اُن کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ ہندوؤں کے رویے کے پیش نظر انہیں احساس ہوا کہ ہندو اور مسلمان ایک نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں ترک کر دیں۔ مولانا محمد علی جوہر بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے کوشاں رہے۔ تحریک خلافت کے دوران آپ نے گاندھی اور دیگر قائدین کے ساتھ مل کر کام کیا۔ کانگریس کے جلسہ کی صدارت بھی کی لیکن جلد ہی انہیں ہندو ذہنیت کی حقیقت سے آگاہی حاصل ہوگئی۔ جب انہیں معلوم ہو گیا کہ کانگریس ایک خالصتاً ہندو جماعت ہے اور ہندو اسلامی اصولوں اور اداروں کو ختم کرنا چاہتے ہیں آپ نہ صرف کانگریس سے الگ ہو گئے بلکہ ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں بھی ترک کر دیں۔ علامہ اقبال کی ابتدائی شاعری وطنیت سے محبت کی جھلک کے طور پر دیکھی جا سکتی ہے لیکن ۱۹۰۸ء کے بعد اُن میں ملت اسلامیہ کے اتحاد کی تڑپ بیدار ہوئی اور اُن کی نظموں اور شاعری کا اصل میدان مسلمان کا تشخص، اتحاد اور جذبۂ جہاد کو فروغ دینا نظر آتا ہے۔ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں ایک آزاد مسلم ریاست کا تصور پیش کیا اور پھر ۱۹۳۷ء میں قائد اعظم کو لکھے جانے والے خطوط میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب، ملازمتوں میں ان کا کوٹہ، اور جدوجہد آزادی کا نعرہ بلند آہنگ کے ساتھ نظر آتا ہے۔ قائدِ اعظم نے جو ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کی حیثیت سے مشہور تھے اور جنکی ذاتی کوششوں کی بناء پر میثاق لکھنؤ عمل میں آیا تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون میں ہندو لیڈروں کی کارفرمائی دیکھ کر اور پھر نہرو رپورٹ کے مطالعے سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندو مسلم اتحاد سعی لا حاصل سے بڑھ کر کچھ نہیں اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنا زیادہ تر وقت مسلم لیگ اور مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ جب قائد اعظم نے اپنی تمام تر توجہ قیام پاکستان کے لیے مرکوز کر دی اور جغرافیائی اعتبار سے اُن علاقوں میں پاکستان کا وجود عمل میں آنا تھا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی تو سازشوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے تو اُن علاقوں میں جہاں مسلمان کم اکثریت رکھتے تھے ایسی کوششیں کی گئیں کہ وہ علاقے آزاد مملکت میں شامل نہ ہوں لیکن جب ایسا ہوتا نظر نہ آیا تو اُن علاقوں کو ہندو مسلم یا سکھ مسلم علاقوں میں تقسیم کیا گیا۔ اسی اصول کے تحت بنگال کی تقسیم عمل میں آئی اور یہی طریقہ پنجاب کی تقسیم کا باعث بنا۔ پنجاب میں تو یونینسٹوں کی حکومت پہلے تو کانگریس کی حاشیہ

بردار بنی رہی مگر ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی کامیابی نے اس کام کو آسان کر دیا لیکن صوبہ سرحد میں کانگریس کے تعاون سے ڈاکٹر خان کی قیادت میں موجود حکومت تقسیم برصغیر کی مخالفت تھی لیکن جب کانگریسی رہنماؤں نے بھی تقسیم برصغیر کو بادلِ نخواستہ قبول کر لیا تو سرحدی گاندھی عبدالغفار خان نے مہاتما گاندھی سے مستقبل کا لائحہ عمل پوچھا اور سازش یہ تیار ہوئی کہ شمالی سرحدی صوبہ خودمختاری کا اعلان کر دے مگر ریفرنڈم نے اس صوبہ کو پاکستان میں شمولیت کی راہ دکھائی۔ ایک اور جانب بلوچستان تھا جہاں انگریز اور کانگریس نے مل کر ایک سازش تیار کی۔ انگریزوں کی خواہش تو یہ تھی کہ بلوچستان کو اپنے زیرِ اہتمام رکھا جائے۔ اسی بات کو ڈاکٹر تصدق راجا نے یوں نقل کیا ہے:

''جنوری ۱۹۴۶ء میں مسٹر ڈی وائی فل پولیٹیکل ایجنٹ سے دورۂ چمن کے دوران نوابزادہ جہانگیر شاہ جوگیزئی نے پوچھا'' آپ کا کیبنٹ مشن ہندوستان آچکا ہے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہندوستان کے متعلق حکومت برطانیہ کیا کرنا چاہتی ہے؟'' اس نے جواب دیا:

" We have decided to withdraw our forces from India & concentrate then in Baluchistan. This will be our base against Russia and if there will be any rift in India we will be on their head."[1]

جبکہ کانگریس کا منصوبہ یہ تھا کہ بلوچستان کو دوسرے اسلامی صوبوں سے کاٹ کر سکھ اور گورکھا فوجوں کے غلبے کے نیچے رکھا جائے اور پھر نہ صرف پاکستان بلکہ افغانستان اور ایران تک بھارت ماتا کا جھنڈا گاڑا جائے مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ اپنے اُن ناپاک عزائم میں کامیاب نہ ہو سکی اگر یہی دو محاذ ہوتے تو بھی مقابلہ آسان ہوتا مگر ایک تیسرا محاذ بھی تھا جو ایسے بلوچ سرداروں پر مشتمل تھا جنھیں کانگریس نے خرید لیا تھا۔ مسلم لیگ اور پاکستان کے خواہش مند رہنماؤں کو ان تین محاذوں پر جنگ کرنا پڑی۔

تحریک پاکستان بالخصوص بلوچستان کی شمولیت کے حوالے سے نسیم حجازی کا ایک اہم کردار ہے۔ جسے تاریخ کے صفحات پر دیکھا جا سکتا ہے یہ مردِ مجاہد بلوچستان میں آیا تو اتالیق کی حیثیت سے تھا اور پھر یہاں رہ کر صحافتی میدان میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے مگر ذہنی طور پر وہ وڈیروں اور سرداروں کو ناپسند کرتا تھا لیکن اسے اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی کیونکہ میر جعفر جمالی اور محمد خان جوگیزئی نے اسکی اعانت اور رہنمائی کی بدولت جدوجہد پاکستان میں اپنا کردار ادا کیا اور پھر نسیم حجازی نے بھی محسوس کیا کہ ایک مسلمان اور نظریاتی فرد کے لیے تحریک کے دوران اپنے حصے کا کام کرنے کا اس سے بہتر موقع شاید ہی نصیب ہو انہوں نے بحیثیت صحافی اور تحریک پاکستان کے ایک کارکن اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے قیام بلوچستان کو غنیمت جانا اور یہاں رہ کر اپنے حصہ کا کام انجام دیا۔ یہاں پر مسئلہ یہ درپیش تھا کہ سیاسی رہنما آزادی کی تحریک میں سرگرم تھے۔ اُن کی یہی مصلحت پسندی سیدھے سادھے

---

[1] نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ؛ ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۳۵۔

عوام کو گمراہ کر رہی تھی۔ ایک کنونشن منعقدہ میں:

''خان عبدالصمد خان نے انجمن وطن کے پروگرام پر تفصیلی روشنی ڈالی اور اسے کانگریس کا حلیف بنانے کا عزم ظاہر کیا۔ ۱۹۴۶ء میں یہ تنظیم کانگریس میں ضم ہوگئی اس اقدام سے ان کے ساتھی الگ ہوگئے۔ [1]

کانگریس شاہی جرگے کے چند ممبروں کو بھی اپنا ہم خیال بنانے میں اس طرح کامیاب ہو چکی تھی کہ اس نے ایک چال یہ چلی کہ ان سے یہ کہا کہ تم لوگ نہیں جانتے کہ پاکستان بننے کے بعد تمھاری سرداریاں ختم کر دی جائیں گی۔ تمھارا سارا قبائلی نظام درہم برہم ہو جائے گا اور بلوچستان کے پاکستان میں شامل ہو جانے کے بعد پاکستان اپنے محدود وسائل کی وجہ سے تمھاری ضروریات پوری نہ کر سکے گا اگر بات کانگریس کی ریشہ دوانیوں تک محدود ہوتی تو بھی قابلِ برداشت تھی یہاں تو اپنے بھی تحریک پاکستان کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر رہے تھے اور خطرہ اس بات کا تھا کہ بلوچستان میں تحریک پاکستان کے کارکنوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے اور وہ فرد جس کے بارے میں قائداعظم نے کہا تھا:

''میر جعفر خان جمالی کو ''بلوچستان کا دروازہ'' قرار دیا۔'' [2]

کو برگشتہ اور دلبرداشتہ کیا گیا۔ اس بارے میں نوابزادہ جہانگیر خان جوگیزئی ایک اور واقعہ رقم کرتے ہیں:

''اپریل ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتے میں میک مون پارک کوئٹہ میں مسلم لیگ کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں چوہدری خلیق الزماں کی صدارت میں قاضی محمد عیسیٰ نے تقریر کرتے ہوئے قبائلی نظام کے خلاف بہت کچھ کہا اور یہاں تک کہہ دیا ''کہ یہ سردار انگریز کے بچے ہیں اور ہم انگریز کے ساتھ ان کو بھی بلوچستان سے نکال دیں گے۔''

مقصد اس کے سوا اُن کا اور کیا ہو سکتا تھا کہ سردارانِ قبائل اجتماعی طور پر تحریک پاکستان کے مخالف ہو جائیں۔

بلوچستان کے قبائل اور مسلم لیگ میں ایک تصادم کی صورت پیدا ہو گئی تھی اسی جلسے میں ایک اور تجویز پیش کی گئی کہ اب جبکہ انگریز ملک چھوڑ کر جا رہا ہے ان کے بعد بلوچستان کا نظام چلانے کے لیے چھ سات افراد کی ایک کمیٹی بنا دی جائے جس کا دائرہ اثر رسوخ کوئٹہ شہر کے بعض حصوں تک محدود ہو۔ ان میں سے ایک صاحب کباڑی تھے دوسرے ٹھیکیدار تھے۔ مخالفین پاکستان ان لوگوں کے پیچھے صف آراء ہو رہے تھے۔ اس جلسے کے بعد ان لوگوں کے کندھوں پر بھاری ذمہ داری آن پڑی تھی جو قیام پاکستان کو اپنی موت و حیات کا مسئلہ سمجھتے تھے۔ نواب محمد خان جوگیزئی، میر جعفر خان جمالی اور ان کے ساتھیوں نے قائداعظم کو بذریعہ تار صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ خود کوئٹہ شہر تشریف لائیں اور اس نازک صورت حال میں مسلمانان بلوچستان کی رہنمائی فرمائیں۔

انگریز اور ان کے حواری کھل کر میدان میں آ چکے تھے۔ چنانچہ پہلے ایک گروہ نے جو بظاہر مسلم لیگ کے حامیوں میں سے تھا کوشش کی کہ جوگیزئی میں پھوٹ ڈالی جائے، انہیں کامیابی نہ ہوئی تو ایک دوسری ٹولی اوستا محمد پہنچی اور جمالی قبیلے کے ایک شخص گل محمد

---

[1] بلوچستان کی نامور شخصیات: اختر علی خان بلوچ ص ۴۷۔

[2] ایضاً ص ۸۲۔

خان کو اپنے ساتھ ملا کر جلوس نکالا جس میں جمالیوں کے سردار اور دوسرے اکابر کے خلاف نعرے لگائے سردار رستم جمالی ایک نیک نفس انسان تھے کسی کو ان کے خلاف نعرے بازی سے طیش آ گیا اور اس نے گل محمد خان کو گولی ماردی۔

اگلی صبح کوئٹہ میں بعض ٹھیکیداروں کی جیپوں پر لگے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے میر جعفر خان کے خلاف نعرے لگائے جارہے تھے۔ شہر کی تمام دکانیں زبردستی بند کرادی گئی تھیں۔ میک مون پارک میں لوگوں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ قاضی محمد عیسیٰ کی تقریر حد درجہ اشتعال انگیز تھی وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ ''تم جعفر خان جمالی کو گرفتار کیوں نہیں کرتے؟'' شہر میں خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ سردار نور محمد گولہ جو اپنی جان کو خطرے میں محسوس کر کے کوئٹہ سے باہر نکلے تھے راستے میں بار بار اپنی پستول کا معائنہ کر رہے تھے کہ گولی چل گئی اور ان کی بیگم صاحبہ زخمی ہو گئیں!

اس روز خلاف توقع نسیم حجازی اچانک جلسے میں پہنچ گئے اور نوجوانوں نے جن میں خاکسار بھی تھے انہیں حفاظت میں لے لیا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد وہ عبدالخالق کاکڑ کے ہمراہ خان قلات کے پاس چلے گئے، خان قلات سے اُن کی ملاقات ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خانصاحب میر جعفر خان کے معاملے میں مداخلت کرنے پر مجبور ہو گئے اور اس طرح ہم اس خطرناک صورت حال سے بچ گئے جو جعفر خان جمالی کی گرفتاری کی وجہ سے پیدا ہو سکتی تھی۔ عبدالخالق خان کاکڑ نے مجھے بتایا کہ اُس نے راستے میں کئی بار نسیم حجازی سے پوچھا تھا کہ ''ہم قلات کیوں جا رہے ہیں۔'' ہر بار نسیم حجازی صاحب یہی جواب دیتے کہ ''آپ کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔'' جب ان کی گاڑی کوئٹہ سے قلات کی طرف دس پندرہ میل دور تھی تو قاضی عیسیٰ کی کار سامنے سے آتی نظر آئی۔ وہ قلات سے واپس آرہے تھے۔ نسیم حجازی نے عبدالخالق خان سے پوچھا ''خان صاحب! اب سمجھ میں آ گیا کہ ہم قلات کیوں جا رہے ہیں۔''

اور چند روز بعد نسیم حجازی نے ایک مضمون کے ذریعے اس جلسے کا خوب مذاق اڑایا انہی کی فراست کو نتیجہ تھا کہ میر صاحب گرفتاری سے اور بلوچستان تباہی اور خانہ جنگی سے بچ گیا۔ میر جعفر جمالی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے کہ جس نے اپنا تن من دھن آزاد وطن کی خاطر قربان کیا:

''میر جعفر خان جمالی بڑی خوبیوں کے مالک اور بڑی صلاحیتوں کے حامل انسان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اتحاد میں برکت ہے، چنانچہ انہوں نے اپنے منتشر و پراگندہ قبیلے کی شیرازہ بندی کی اور اپنی تمام تر توجہ ان کی تنظیم اور خوشحالی پر مرکوز کردی۔ اس مقصد کے لیے ان کے اخبار تنظیم جمالی نے بڑا کردار ادا کیا۔''[۱]

جدوجہد آزادی اور قیام پاکستان کے لئے میر جعفر خان جمالی کی شبانہ روز کوششوں اور غیر معمولی ایثار کے جذبے کا کون کافر منکر ہو سکتا ہے بلکہ ان کی جدوجہد اور اس کے تذکرے کے بغیر تو تاریخ پاکستان کے ابتدائی ابواب مرتب ہی نہیں کیے جا سکتے۔

''میر جعفر خان جمالی کہتے ہیں'' ہم ایک آزاد مملکت کی بنیاد ڈالنے والے ہیں۔ ہم کسی قیمت پر بھی ہندوؤں کی غلامی نہیں

---

[۱] بلوچستان کی نامور شخصیات، اختر علی خان بلوچ ص ۱۱۷۔

کریں گے۔ ہم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلیں گے۔ بلوچستان کے عوام کی آزادی کا بہترین تحفظ صرف پاکستان میں شامل ہونے کی صورت میں ممکن ہے۔"[۱]

میر صاحب نے بلوچستان اور سندھ دونوں علاقوں میں یکساں لگن اور خلوص کے ساتھ پاکستان کے قیام اور استحکام کے لیے کام کیا۔ بلوچستان میں قاضی عیسیٰ، حاجی قادر بخش زہری، نواب محمد خان جوگیزئی، سردار باز محمد خان جوگیزئی اور سردار انور خان کھیتران ان کے خاص رفیق تھے۔ وہ قائداعظم محمد علی سے اس وقت متعارف ہوئے تھے جب وہ تازہ تازہ بیرسٹر بن کر ریاست قلات کے قانونی مشیر بنے تھے اور صرف مسٹر جناح بار ایٹ لاء تھے میر صاحب نے جائیداد کے معاملے میں انہیں اپنا وکیل کیا تھا اور باہمی رابطہ کے لیے نوجوان بیرسٹر قاضی محمد عیسیٰ کو جن کے والد ریاست قلات میں وزیراعظم رہے تھے، اپنے ساتھ بمبئی لے گئے جو بعد میں قائداعظم کے دست راست کہلائے اور مسلم لیگ کے ایک نمایاں لیڈر کے طور پر مشہور ہوئے لیکن افسوس ناک صورتحال اس وقت رونما ہوئی جب کانگریسی امیدوار کے مقابلے میں قاضی عیسیٰ میدان کھلا چھوڑ کر دہلی جا چکے تھے۔ اس موقع پر نسیم حجازی نے میر جعفر خان جمالی کو مشورہ دیا کہ کانگریسی امیدوار کے مقابلے میں ہمارا بھی کوئی امیدوار ہونا چاہیے جو آئین ساز اسمبلی میں بلوچستان کی نمائندگی کرے اور قیام پاکستان میں ہمارے لیے کامرانی کی امید بن جائے۔ شاہی جرگہ کے ایک گروپ کے تعاون کی بدولت محمد خان جوگیزئی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے، اس بارے میں نوائے وقت کو انٹرویو دیتے ہوئے فضل احمد غازی نے بتایا:

"۱۹۴۶ء کے الیکشن کی انتخابی مہم میں قائداعظم کے ساتھ دوسرے علاقوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کی طرح بلوچستان، مسلم لیگ، ایم ایس ایف اور نیشنل گارڈز کے کارکن بھی تھے۔ ان میں میں بھی شامل تھا بلکہ مجھ پر ایم۔ ایس۔ ایف کی آرگنائزیشن کی ذمہ داری بھی تھی۔ انتخابی مہم میں نئی دہلی میں ایک رات قائداعظم نے اچانک کہا کہ وہ صوبہ سرحد کا دورہ کریں گے۔ اس پر انہیں بتایا گیا کہ یہاں پر کانگریسی امیدوار حسین بھائی لعل جی سے مقابلہ ہے۔ لہٰذا یہاں آپ کی زیادہ ضرورت ہے قائداعظم نے اس رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا کہ "میری اس وقت صوبہ سرحد میں زیادہ ضرورت ہے۔ یہاں میری قوت موجود ہے" استفسار کیا گیا کہ کون سی قوت؟ قائداعظم نے ایم ایس ایف کے کارکنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ ہے۔ قائداعظم کے اس پر اعتماد جملے سے نوجوانوں میں نیا جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ الیکشن میں حسین بھائی لال جی کو ایسی شکست ہوئی کی ضمانت تک ضبط ہو گئی۔"[۲]

اور جب پاکستان میں بلوچستان کی شمولیت کا سوال پیدا ہوا اور وائسرائے ہند کا ۳ جون ۱۹۴۷ء کا اعلان پڑھ کر سنایا گیا تو ایک عجیب ڈرامائی کیفیت پیدا ہو گئی جسے جہانگیر شاہ جوگیزئی اس طرح بیان کرتے ہیں:

"مقررہ وقت پر اے۔ جی۔ جی مسٹر جافرے پرائر تشریف لائے اور اسٹیج پر پہنچتے ہی کہا۔ "سردار صاحبان اور ممبران کوئٹہ میونسپل کمیٹی! آپ کو یہاں اس لیے بلایا گیا ہے کہ وہ اعلان جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۳ جون کو کیا تھا وہ سنا دیا جائے اور پھر اس میٹنگ کا وقت

---

[۱] میر جعفر خان جمالی کی ڈائری کے چند اوراق، مجید قیصر، اکرام الحق کوثر، ص ۲۳۔

[۲] روزنامہ نوائے وقت کراچی، فضل احمد غازی سے انٹرویو، ۱۴ اگست ۱۹۹۰ء۔

مقرر کیا جائے جس میں آپ نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ بلوچستان کا نمائندہ انڈیا کی دستور ساز اسمبلی میں بیٹھے گا یا پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں۔''

نواب صاحب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ''صاحب بہادر! اگر یہ انڈیا یا پاکستان کی بات ہے تو ہم اس کا فیصلہ ابھی کرتے ہیں۔ یہ ہماری قومی غیرت کا مسئلہ ہے۔ یہ فیصلہ ابھی ہوگا اور یہیں ہوگا۔''

اے جی جی سکتے میں آ گیا، نواب صاحب کا لہجہ سخت ہوتا گیا۔ سردار عثمان جوگیزئی اور سردار غلام محمد ترین نے بلند آواز میں نواب صاحب کی تائید کی۔ دودا خان مری کی یہ حالت تھی کہ وہ باتیں کرتے ہوئے مکا بھی لہرا رہے تھے۔ پھر یکے بعد دیگرے بہت سی آوازیں اُن کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ نواب صاحب کرسیوں کی قطار سے ہٹ کر دائیں طرف خالی جگہ کھڑے ہو گئے اور کہا ''جو ہمارے ساتھ ہیں پاکستان دستور ساز اسمبلی میں اپنا نمائندہ بھیجنا چاہتے ہیں وہ اس طرف آ جائیں اور جو ہمارے مخالف ہیں وہ دوسری طرف کھڑے ہو جائیں تاکہ ابھی اس بات کا فیصلہ ہو جائے سوچنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اے جی جی کو سوچنے کی ضرورت ہے تو ہم یہیں ٹھہریں گے۔''

کرسیاں خالی ہونے لگیں سردار صاحبان کی دیکھا دیکھی میونسپلٹی کے ارکان یہاں کے غیر مسلم ارکان بھی نواب صاحب کے ساتھ دائیں طرف کھڑے ہو گئے۔ نوشکی کے بلوچ سردار جو قلات کی انتظامیہ کے اشاروں پر چلتے تھے وہ بھی آن ملے۔ اے جی جی تلملا اٹھا اور کہا، ''بہت اچھا سردار صاحبان ہم ماؤنٹ بیٹن کو تار بھیج دے گا، آپ کو پاکستان مبارک ہو۔''[1]

اس مبارک باد کے پیچھے شب و روز ہونے والی اس محنت اور کاوش کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جو نسیم حجازی، میر جعفر جمالی، محمد خان جوگیزئی اور دیگر اکابرین کے علاوہ خاکسار تحریک اور مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے ہزاروں نوجوانوں سے عبارت ہے۔ بظاہر قیام پاکستان اور بلوچستان میں اس کی شمولیت کا ایک مرحلہ طے ہوا لیکن اس کے پیچھے جن مشکلات اور دشواریوں کا سامنا رہا وہ تاریخ کے اوراق میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان کے بعد بلوچستان کا فیصلہ شاہی جرگہ کے ذریعے ہونا تھا لیکن اسی دوران بعض عناصر نے یہ غلط فہمیاں پیدا کیں کہ قیام پاکستان کے بعد سرداریاں اور قبائلی نظام ختم کر دیا جائے گا اور بلوچستان کے حقوق کا تحفظ بھی ناممکن ہے۔ ایسی صورت میں نسیم حجازی اور دیگر سرداروں نے قائداعظم سے فون پر رابطے کی کوشش کی لیکن رابطہ نہ ہو سکا البتہ پیغامات کا تبادلہ ضرور ہوا اور نسیم حجازی نے خود کو محمد خان جوگیزئی کا سیکرٹری ظاہر کر کے قبائلی رہنماؤں کے خدشات اور ان کے لیے تحفظات کے بیان کی خواہش ظاہر کی جس پر قائداعظم نے ایک دو ٹوک بیان دیا جسے جہانگیر شاہ جوگیزئی اس طرح بیان کرتے ہیں:

''مجھے نواب صاحب کے پیغام سے بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں ممبران شاہی جرگہ کا بے حد ممنون ہوں اور ان کی کامیابی کے لیے دعاگو ہوں، میں رائٹر اور دوسری ایجنسیوں کو بیان دے رہا ہوں انشاءاللہ سردار صاحبان آج یہ بیان ریڈیو پر بھی سن لیں گے۔''

---

[1] نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ: ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۹۱۔

پھر ریڈیو پر ہم سب نے سنا قائداعظم نے دوٹوک الفاظ میں فرمایا کہ ''میں قبائل کے حقوق اور مفادات کا پورا خیال رکھوں گا''

قائداعظم کے اس پیغام کے ساتھ ہم پاکستان کی منزل کا ایک اور مرحلہ طے کر چکے تھے۔''[۱]

نسیم حجازی قیامِ پاکستان کی تحریک اور خصوصی طور پر بلوچستان کے حوالے سے کارکردگی کے اعتبار سے تاریخ میں سنہری حروف سے مرقوم ہے کیونکہ انہوں نے ۹ سال یہاں قیام کیا۔ یہاں کے قبائلی اور سرداری نظام کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد آزاد وطن اور بالخصوص متحدہ پاکستان کی جدوجہد کے لیے یہاں کے سرداروں کو تیار کیا۔ یہاں ان کے قیام کا مقصد میر جعفر جمالی اور ان کے اہل خانہ کی اتالیقی کے ساتھ ساتھ ان کے ہفت روزہ کی ادارت تھا لیکن انہوں نے میر صاحب کی دولت، ایثار، خلوص اور حب الوطنی سے متاثر ہو کر ان میں ملتِ اسلامیہ سے جذباتی وابستگی پیدا کی جس کا ثبوت انعام الحق کوثر اس طرح رقم کرتے ہیں:

''تنظیم کے بارے میں نسیم حجازی کی کہنا ہے کہ ''اس کے کل مصارف سردار میر جعفر خان جمالی برداشت کرتے تھے۔ سردار صاحب نے ایک نشست میں پورے بلوچستان میں سے پانچ سو اہم اور سرکردہ اشخاص کی ایک فہرست مجھے املا کرائی جنہیں بغیر کسی چندہ کے یہ اخبار بھیجا جاتا تھا۔ مرحوم میر جعفر خان جمالی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اگر یہ پانچ سو افراد پاکستان کی تحریک سے ذہنی طور پر وابستہ ہو گئے تو پورا بلوچستان پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھے گا۔ حقیقت حال بھی آگے چل کر یہی ثابت ہوئی۔''[۲]

لیکن میدان اتنا صاف اور کام اتنا سادہ نہیں تھا کہ آسانی سے بلوچستان کو پاکستان میں شامل کرالیا جائے۔ مسلم لیگ کے دیگر رہنماؤں نے بلوچستان کا دورہ کیا اور پھر ۱۹۴۳ء میں قائداعظم نے بلوچستان کا دورہ کیا۔ نوائے وقت کو دیے گئے انٹرویو میں فضل احمد غازی نے بتایا:

''۱۹۴۳ء میں قائداعظم پہلی بار کوئٹہ آئے ان کا شاندار استقبال ہوا۔ قندھاری بازار ''موجودہ شارع اقبال'' کی ایک عمارت کی بالکنی سے انہوں نے استقبالی جلوس کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''عوام کے جوش و خروش کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ بلوچستان پسماندہ یا سیاسی شعور میں پیچھے ہے۔''[۳]

بلوچستان کے عوام کے اس جوش و خروش کے پیچھے ان کے رہنماؤں کی تحریک پاکستان سے وابستگی اور اس کے لیے نسیم حجازی کا کردار تاریخ کا انمٹ نقش ہے اُن کے بارے میں یہ کہا جاتا کہ وہ بلوچستان کے ہر علاقے کو بالکل اس طرح جانتے ہیں جیسے ہاتھ کی لکیروں کو بالکل درست ہوگا۔ اُن کی دور اندیشی اس موقع پر جب قاضی عیسیٰ میدان خالی چھوڑ کر چلے گئے تھے محمد خان جوگیزئی کو آئین ساز اسمبلی کا ممبر بنانے کے حوالے سے ناقابلِ فراموش عمل ہے کیونکہ جوگیزئی صاحب نے ۲۹ جون ۱۹۴۷ء کو وہ کام کر دکھایا جس کی خاطر اُن کی نمائندگی کی خواہش اور کوشش کی گئی تھی۔ یوں تو نسیم حجازی بحیثیت صحافی ایک ہفت روزہ سے وابستہ تھے لیکن ۳ جون ۱۹۴۷ء کے بعد

۱۔ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ: جہانگیر شاہ جوگیزئی مرتبہ ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۱۹۹۔

۲۔ میر جعفر خان جمالی کی ڈائری کے چند اوراق، پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر، ص ۲۳۔

۳۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی، فضل احمد غازی سے انٹرویو، ۱۲ اگست ۱۹۹۳ء۔

اس کے ضمیمے تقریباً روزانہ ہی منظر عام پر آتے تھے اسی کاوش کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد خان جوگیزئی بلوچستان میں اپنے کام کی تکمیل کے بعد سرحد کے عوام کو پاکستان میں شمولیت کے لیے آمادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے سرحد کے عوام کو بتایا کہ:

''آزاد بلوچستان کا جھوٹا نعرہ بالکل جھوٹا ہو گیا ہے اور اب صوبہ سرحد میں ہمارے بھائیوں کو آزاد پٹھانستان کے نعرے سے ورغلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ نواب جوگیزئی کے اس بیان میں اشارتاً خان آف قلات، غوث بخش بزنجو اور عبدالصمد اچکزئی کو مورد الزام ٹھہرایا گیا تھا کیونکہ ۲۹ جون کے ریفرنڈم سے پہلے ان ہی کی جانب سے آزاد بلوچستان کا نعرہ لگایا گیا تھا۔''[1]

نسیم حجازی چونکہ کوئٹہ میں مقیم تھے اور بظاہر صحافتی اور غیر محسوس انداز میں سیاسی ذمہ داریاں پوری کر رہے تھے کہ انہوں نے محسوس کیا کہ ۲۹ جون ۱۹۴۷ء کے واقعہ پر انگریز حکومت اور اس کے ایجنٹ ابھی عملاً پیش پیش ہیں تو انہوں نے اپنے قیام کو مزید طول دیا اور ہفت روزہ تنظیم کے ذریعے خان قلات کے آزاد بلوچستان کے نعرے کا تدارک کرتے رہے اور پھر تاریخ عالم نے قائداعظم اور خان قلات کی ملاقات اور قلات کی پاکستان میں شمولیت کا منظر دیکھا ان تمام احوال اور قرائن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قرارداد پاکستان ۱۹۴۰ء کے بعد سے قیام پاکستان ۱۹۴۷ء تک بلوچستان کی سیاست میں پس پردہ اور کبھی منظر عام پر نسیم حجازی پیش پیش رہے جو ان کی حب الوطنی اور اتحاد بین المسلمین کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

---

۱ پاکستان کی سیاسی تاریخ، جلد ۷، بلوچستان، مسئلہ خود مختاری کا تجزیہ، زاہد چوہدری، ص ۹۶۔

تیسرا باب
نسیم حجازی۔ صحافت سے ناول نگاری تک
نسیم حجازی صحافت کا آغاز

نسیم حجازی کی شہرت ایک تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے مسلم ہے۔ لیکن عملی زندگی کا آغاز بحیثیت صحافی ہوا اور پھر صحافت اور ناول نگاری بین بین چلتے رہے حالانکہ ملکی سیاست اور ملک میں موجود آمریت نے ان کی صحافت کو مسدود کر دیا لیکن ان کے اندر کا موجود صحافی پابندِ سلاسل نہ کیا جا سکا اور وہ تمام پابندیوں سے بے نیاز ناول کے پلاٹ میں اپنے خیالات اور تصورات کو سموتا اور پیش کرتا رہا۔ اس موضوع کو ہم بعد میں زیرِ بحث لائیں گے کہ صحافت کے اثرات ناول نگاری پر کس طرح مرتب ہوئے۔ فی الوقت ہم صحافت میں ان کی آمد اور بحیثیت صحافی ان کے کردار کو پیش کر رہے ہیں۔ اس موضوع کا احاطہ کرنے سے قبل ضروری ہے کہ صحافت اور صحافی کے مفہوم کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا جائے۔

لفظ ''صحافی'' عربی کے لفظ ''صُحُف'' سے اردو میں آیا۔ قرآن کریم کی سورۃ اعلیٰ کی آخری آیات میں یہ لفظ دو مرتبہ استعمال ہوا۔ اُن آیات کا ترجمہ یہ ہے۔ ''یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں''۔ یہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ صحیفے اللہ کے پیغامات ہیں۔ جو اس نے اپنے انبیاء کی طرف بنی نوع انسان کی رہنمائی اور بھلائی کے لیے بھیجے۔ صحیفہ کے معنی تحریری شکل کے سبب عموماً دو گتوں کے درمیان مقید تحریر یعنی جلد بند کتاب کو صحیفہ کہا جاتا ہے قرآن کی اصطلاح میں پیغمبروں پر نازل ہونے والی وحی محفوظ تحریر کی صورت میں صحیفہ کہلاتی ہے۔ یقیناً یہ وہ پاک احکامات ہیں جو خالق نے اپنی مخلوق کے لیے بہتر جانتے ہوئے بھیجے اس لیے جب صحف سے ''صُحُفِی'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے تو یہ توقع کی جاتی ہے کہ صحافی اپنے مشاہدات صحیح صحیح پیش کرے گا اس لیے صحافی کے معنی ''اخبار نویس، نامہ نگار، صحیفہ نگار، روز نامچہ نویس'' بیان کیے جاتے ہیں۔ صحافی سے صحافت کا پیشہ بنا۔ اس لیے صحافی کا پیشہ صحافت کہلایا۔

اگر ہم صحافت کے لفظی معنوں پر غور کریں تو:

''صحافت (Journalism): خبریں جمع کر کے معین اوقات پر شائع کرنا۔ اس میں اخبارات اور رسائل کے لیے لکھنے کے علاوہ ان کی ادارت اور تنظیم بھی شامل ہے۔''[۱]

جبکہ قومی انگریزی اردو لغت میں jurnalism کے معنی:

''Journalism اخبار نویسی، صحافت، نامہ نگاری، اخبار کا پیشہ جس میں خبر نگاری، اشاعت، ادارت اور تحریر شامل ہیں، تعلیمی شعبہ جس میں مثالی انداز کی مصروفیت پائی جاتی ہے، لیکن بعض اوقات، موجودہ عوامی ذوق کی تسکین ملحوظ ہوتی

---

[۱] اردو جامع انسائیکلوپیڈیا: مولانا حامد علی، ص ۹۱۶۔

ہے، رپورتاژ، روداد' [1] درج ہیں۔ اس مفہوم کی روشنی میں شعبۂ صحافت کی ذمہ داریاں لوگوں کو دنیا بھر کے حالات سے باخبر رکھنا ہوئیں ان خبروں کی نوعیت تعمیری پہلو کو عوام الناس کے سامنے لانا جو اس معاشرے میں ظہور پذیر ہو رہا ہو اسی تشریح کو ایم۔ ایس ناز نے مزید وسعت کے ساتھ یوں رقم کیا ہے:

''اخبار خبر کی جمع، لیکن اخبار سے مراد وہ چھپے ہوئے اوراق ہوتے ہیں جن میں خبروں کے علاوہ مضامین، اداریے شذرات، تنقیدات، تبصرے، مراسلات، اعلانات، اشتہارات سبھی قسم کی چیزیں ہوتی ہیں، جو روزانہ سہ روزہ یا ہفت روزہ چھپتے ہیں۔'' [2]

مندرجہ بالا تعریفوں کی روشنی میں صحافت خبروں کو جمع کرنے، چھاپ کر شائع کرنا، تبصرہ، تنقید، اشتہارات، یعنی ہر وہ اطلاع جسکی ضرورت عوام کو ہو پہنچانے کا نام ہے۔ پہلے پہل لوگ ایک دوسرے کو زبانی اطلاعات پہنچایا کرتے تھے اکثر راتوں کو لوگ کسی ایک جگہ بیٹھ کر اپنے دن بھر کے واقعات سناتے اور انہی میں کوئی فرد دور دراز سے آیا ہوتا تو وہ وہاں کے حالات بیان کرتا۔ رومیوں نے اپنے شہریوں کو باخبر رکھنے کے لئے قلمی اخبار کا انداز اختیار کیا جو شہر کے کسی اہم چوک پر نصب کیا جاتا جس میں حکومت کی کارکردگی، انتظامی امور اور جنگی کامیابیوں کا تذکرہ موجود ہوتا تھا۔ اسے تحریر کرنے کی ذمہ داری سرکاری کاتبوں کی ہوا کرتی تھی۔ یہ رواج دنیا کے دوسرے علاقوں تک پھیلتا گیا اور یوں لوگ باخبر رہنے لگے۔ یہ الگ بات کہ یہ انداز کس قدر معتبر اور صداقت پر مبنی تھا۔ اس میں شک کی گنجائش حکومت کی مکمل بالادستی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے پھر عالم انسانی نے فاران کی چوٹیوں پر کھڑے دنیا کے سب سے بڑے انسان حضرت محمد ﷺ کی پکار سنی جو اللہ کی ہدایت اور پیغام لے کر آئے تھے اور یوں ہم اخبار کا قرآنی تصور بھی پیش کر سکتے ہیں کیونکہ:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن حکیم کی آیات بیّنات ایسی واضح نشانیاں ہیں جن میں خبر کے پہلو مستور ہیں۔ برائیوں کے اجتناب سے لے کر نیکیوں کی تلقین تک موعظت و عبرت کے کئی واقعات اس میں اوامر و اخبار کی صورت میں ملتے ہیں اور یہی اخبار کا وہ قرآنی تصور ہے جو روشنی بن کر سامنے آتا ہے اور ہدایت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔'' [3]

اس کے بعد احادیث کو بھی اخبار کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے پھر خلفائے راشدین اور بعد کے مسلم حکمرانوں نے کسی نہ کسی انداز میں اخبار یا روزنامچے مرتب کرنے کا انداز اختیار کئے رکھا اگر ہندوستان کی طرف نظر کی جائے تو یہاں کے مسلم حکمرانوں نے بھی عوام کو نہ سہی حکومت اور حکومت کے کارندوں کو باخبر رکھنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کیا اور پرچہ نویسی کا ادارہ ہمیشہ مستحکم رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد نے بہت سی سائنسی ایجادات سے یہاں کے لوگوں کو متعارف کرایا۔ اس میں چھاپا خانہ بھی شامل ہے گو کہ بعض روایات پرتگال کے جہازوں پر چھاپہ خانے کی ابتداء کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں مگر ہم اپنے اصل موضوع اخبار کی طرف توجہ کریں تو پہلی کوشش بولٹس نے کی یہ الگ بات کہ اسے کامیابی نہ ہو سکی۔ اس کے بارہ سال بعد ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر جاری ہوا

---

[1] قومی انگریزی اردو لغت؛ ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۱۰۶۲۔

[2] اخبار نویسی کی مختصر ترین تاریخ؛ ایم۔ ایس ناز، ص ۲۱۔

[3] ایضاً، ص ۲۱۔

جو چھوٹے سائز کے چار صفحات پر مشتمل تھا جس میں برصغیر کے دور دراز علاقوں کے نامہ نگاروں کے مکتوب شامل اشاعت ہوتے تھے۔ کبھی کبھار یورپ کی خبروں کا خلاصہ بھی پیش کر دیا جاتا تھا یہ اخبار خبروں کی نوعیت، طباعت کے معیار اور کاغذ کی کوالٹی کے اعتبار سے کوئی خاص اہمیت حاصل نہ کر سکا پھر اخبارات مختلف شہروں اور زبانوں میں شائع ہونے لگے لیکن ہم اپنے موضوع کی مناسبت سے اردو صحافت اور اردو کے پہلے اخبار کی طرف آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ''جامِ جہاں نما'' کا نام لیا جاتا ہے کہ جو پہلے اردو میں، پھر فارسی میں اور پھر اردو ضمیمے کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ اصل میں اردو ہندوستان کے ایک بڑے علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی لیکن اسے تحریر کرنے کا رواج عام نہ ہو سکا تھا کیونکہ اس وقت سرکاری زبان فارسی تھی۔ شاعر اور ادیب اور تذکرہ نگار فارسی کو اختیار کرتے اس لئے اردو فروغ نہ پا سکی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام اور اس میں زبانوں کی اہمیت اور ترقی کے حوالے سے جو کام ہوئے انہی کی بناء پر ۱۸۳۰ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ مل سکا۔ بعض افراد کی رائے ہے کہ مولوی محمد باقر کا اخبار ''اردو'' دہلی سے ۱۸۳۶ء میں شائع ہوا اور یہ اردو کا پہلا اخبار ہے لیکن حقیقت ہم اوپر رقم کر چکے ہیں کیونکہ تحقیق کاروں کی کاوشوں کا یہی نتیجہ ہے ویسے مولوی محمد باقر کا اخبار اپنی صحافتی ذمہ داریوں اور ملک کے سیاسی حالات پر رائے عامہ ہموار کرنے میں بڑا معاون اور مددگار رہا تھا اور یہی وجہ ''غدر'' ۱۸۵۷ء میں اس اخبار کے کردار مولوی محمد باقر کو سزائے موت دیے جانے پر منتج ہوئی۔ یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ اخبارات کی بڑھتی ہوئی تعداد اور اشاعت نے حکومت کے حلقوں میں سنسر بورڈ کے قیام اور اس کی اہمیت کو جلا بخشی ہوگی اگر سنسر کے ادارے کے قیام کو دیکھا جائے تو یہ اخبارات کی اشاعت اور تعداد بڑھنے کے ساتھ ہی قائم ہو گیا تھا مگر آزادی صحافت پر سنسر کے اثرات کس قدر ہوتے ہیں اس کا اندازہ آج کے دور میں کیا جا سکتا ہے۔ دہلی اردو اخبار کے علاوہ ''سید الاخبار'' (جو سرسید احمد خان کے بڑے بھائی سید محمد خان نے جاری کیا تھا) بھی اہم ہے اس کے علاوہ خود سرسید احمد خان نے ۱۸۶۶ء میں ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' جاری کیا جو ان کے مرتے دم تک جاری رہا اسی دوران ۱۸۷۰ء کے آخر میں انگلستان کے سفر سے واپسی پر رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا جس کا مقصد روشن خیالی کو فروغ دینا اور مذہبی اصلاح اور عقلیت کے لئے فضا ہموار کرنا تھا اس سے قبل ۱۸۵۸ء میں منشی نول کشور نے ''اودھ اخبار'' جاری کیا اور اس نے بہت جلد شمالی ہند میں ایک مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے پہلے ایک رسالہ ''خدنگ نظر'' نکالا اور اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں ''الہلال'' جاری کیا جو ٹائپ میں چھپتا تھا ''گزٹ'' اور ''تہذیب الاخلاق'' کے بعد یہ ٹائپ میں سب سے اہم صحیفہ ہے۔ یہ وہ دور ہے جب دنیا کی اکثر اقوام نوآبادیاتی نظام سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھیں اور خود برصغیر کے عوام بھی خواب غفلت سے بیداری کی طرف رواں دواں تھے اسی زمانے میں حسرت موہانی نے ''اردوئے معلیٰ'' جاری کیا۔ اس پرچے میں ایک باغیانہ مضمون ''مصر میں انگریز کی پالیسی'' چھپنے پر ڈیڑھ برس قید بامشقت کی سزا پائی اور اردوئے معلیٰ بند ہو گیا۔ ظفر علی خان نے بھی لاہور سے ''زمیندار'' جاری کیا جس میں انہوں نے ہندوستان کے سیاسی حالات کے بدلتے ہوئے تناظر میں اپنی نظم و نثر کو صرف قومی مقاصد کے لیے ہی استعمال کیا۔ برطانوی استعماری قوتوں کے خلاف انہوں نے جس طنز و ہجو کے رویے سے کام لیا اس سے

جراتِ گفتار کا پتہ چلتا ہے ان کا اخبار بند ہوا تو کارکنوں نے کچھ رقم اکٹھی کر کے غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک کی زیرِ نگرانی لاہور سے انقلاب جاری کیا یہ اخبار ۱۹۲۷ء میں شروع ہوا اور تقریباً ۲۲ سال تک جاری رہنے کے بعد منظر نامے سے غائب ہو گیا تحریک پاکستان میں اس اخبار کا اہم کردار رہا۔ ایک اور اخبار جو امرتسر سے جاری ہوا ''وکیل'' ہے پہلے پہل یہ ہفت روزہ تھا بعد میں سہ روزہ ہو گیا اس کی اہمیت ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے ان الفاظ میں رقم کی ہے:

''انیسویں صدی کے اواخر میں امرتسر سے ہفت روزہ ''وکیل'' جاری ہوا جو اصابت فکر، بیان کی متانت اور مسلمانوں کے حقوق کی ترجمانی کے لیے سارے ہندوستان میں ایک عرصے تک مشہور رہا''۔[۱]

نسیم حجازی نے بھی اپنی عملی زندگی کا آغاز بحیثیت صحافی کیا تھا اور جیسا کہ ہم پہلے رقم کر چکے ہیں کہ صحافی اور صحافت بالکل درست حقائق کو اخبار میں پیش کرنے کا نام ہے اور اسی بے باکی اور حق گوئی کا علمبردار نسیم حجازی پہلے پہل اپنی اسی خوبی کی بناء پر کراچی کے ''روز نامہ حیات'' سے منسلک ہوا جو انسانی اور اخلاقی اوصاف ان کے اندر تڑپ رہے تھے اور جو اختلاف انہیں حکومت وقت سے تھا جسے وہ ایک سامراجی اور استعماری قوت ہی نہیں بلکہ ایک غاصب اور دھوکہ باز حکومت بھی گردانتے تھے کھلم کھلا کر سامنے آیا اگر بات انگریز حکمرانوں کی حد تک ہو جنہیں بالآخر ہندوستان چھوڑ کر جانا تھا تو بھی قابلِ برداشت ہو سکتی تھی مگر مسئلہ اس انگریز حکومت کے زیرِ سرپرستی پروان چڑھنے والی کانگریسی حکومت کا تھا جو ہندوستان پر تن تنہا حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی اور ہندوستان میں موجود دوسری اقوام کو آزما رہی تھی اور اپنے مستقبل کے ارادوں سے باخبر کر رہی تھی اور یوں بھی کانگریس کو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا اعلان لاہور ہضم نہیں ہو رہا تھا وہ تو ہندوستان کی تقسیم کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے مگر ان کے قول و کردار نے علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد کی بازگشت کو حقیقت کے قریب تر لا کھڑا کیا تھا اور اب مسلمان رہنماؤں کا کام دو محاذوں پر لڑنا تھا اور ہر مسلمان اپنی انفرادی حیثیت میں اس بات کا ذمہ دار تھا کہ اس ملک میں انگریزوں کے چلے جانے بعد کیسے زندہ رہا جائے۔ جب نسیم حجازی نے بحیثیت ایک مسلمان اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کیا تو راستے مسدود نظر آئے مگر ابتداء ہی میں لڑکھڑا کر گر جانے یا حالات سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے انہوں نے ہر اس دیوار کو پھاند جانے کا فیصلہ کیا جو قومی غیرت اور آزادی کی راہ میں رکاٹ بنے۔ اس زمانے میں جب وہ روزنامہ ''زمانہ'' کراچی سے وابستہ تھے حکومت کی جانب سے اخبارات کو وار فنڈ (war fund) کے نام پر گرانٹ عطا ہوتی تھی۔ اس اخبار کو بھی ۱۰ ہزار روپے کی رقم اس مد میں ملی مگر نسیم حجازی نے ان سرکاری ہتھکنڈوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے واہ واہ اور سب کچھ ٹھیک ہے لکھنے کے بجائے war fund کے خلاف ایک اداریہ لکھا اور ساتھ ہی اپنا استعفیٰ بھی۔ کیونکہ انہیں یہاں پر انہیں اپنے قلم کی موت نظر آ رہی تھی بظاہر ایک ملازمت چھوڑی تھی لیکن اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا تھا یہی وجہ تھی کہ انہیں بلوچستان جانے کا موقع نصیب ہوا جہاں دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ ہفت روزہ ''تنظیم'' کوئٹہ (۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۸ء) سے منسلک رہے اسی دوران روزنامہ ''تعمیر'' راولپنڈی (۱۹۴۰ء تا

---

[۱] صحافت پاکستان و ہند میں: ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ص ۳۲۲۔

۱۹۵۲ء) کے لیے بھی ان کے قلم سے نکلی ہوئی تحریریں شامل اشاعت رہیں۔ صحافت کے میدان میں ان کا اصل کام اخبار روز نامہ ''کوہستان'' کے حوالے سے یادر کھنے کے قابل ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ قیام کوئٹہ میں ہفت روزہ ''تنظیم'' کے ذریعے تحریک پاکستان میں بلوچستان کی شمولیت کو ایک حقیقت کا روپ دے چکے تھے۔ جب انہیں یہ محسوس ہوا کہ بلوچستان میں ان کی موجودگی اشد ضروری نہیں تو اپنے مہربان دوستوں سے رخصت چاہی اور پنجاب کے مختصر قیام کے بعد ایبٹ آباد جا پہنچے۔ یہاں آ کر محسوس یہ ہوا کہ یہی وہ جگہ ہے جس کا وہ بار ہا خواب دیکھ چکے ہیں۔ انہیں مناظر فطرت کی رنگینوں سے ہمیشہ پیار رہا ہے۔ سرسبز و شاداب پہاڑ اور ان کی برف پوش چوٹیاں ان کے لئے عجیب کشش رکھتی ہیں۔ انہیں عالم خواب میں اپنی رہائش گاہ ایک ایسے سرسبز کوہستانی علاقے میں نظر آتی تھی جہاں ان کا قیام ایک سفید دو منزلہ مکان میں ہوتا تھا جسکے سامنے اونچے اونچے پہاڑ استادہ ہوں۔ خشک اور چٹیل پہاڑ نہیں بلکہ اونچے اونچے درختوں سے ڈھکے ہوئے سرسبز پہاڑ۔ یہ محض ان کی خواہش نہیں بلکہ پسندیدہ جگہ تھی اور اس قسم کے مناظر اور کوہ پیائی کا شوق انہیں بہت پہلے سے تھا اور پھر ان سرسبز اور بلند قامت پہاڑوں کے تصور نے انہیں اپنے اخبار کا نام رکھنے میں مدد فراہم کی ان کا انداز فکر پہاڑوں کی طرح بلند اور ان کی سوچ اس سبزہ کی مانند نرم تھی جو پہاڑوں پر موجود ہوتا ہے اور ان کا تخیل ان فطری نظاروں اور ان برف پوش پہاڑوں کے ساتھ ان حسین آبشاروں کی مانند کارفرما تھا جو ان کے قیام گاہ کی قرب و جوار کی زینت تھے یہاں رہ کر انہوں نے کوہستان کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں انجام دیں یہ اخبار بیک وقت راولپنڈی، لاہور اور ملتان سے شائع ہوتا رہا مگر افسوس اس ملک کی بدقسمتی کہ جن جمہوری اصولوں کی بنیاد پر یہ ارضِ مقدس قائم ہوئی وہی جمہوری روایات اس ملک میں نہ پھل پھول سکیں اور جب جمہوریت کا خاتمہ ہوتو آمریت پسند حکمران صحافیوں کو خرید لینا یا ان کے ہونٹ سی دینا چاہتے ہیں اور یہی کچھ نسیم حجازی کے ساتھ ہوا اور انہیں مجبوراً ۱۹۶۶ء میں اس اخبار سے علیحدہ ہونا پڑا۔

مختلف جرائد کا اجراء۔ مقاصد

صحافی کی ذمہ داری حق گوئی ہے اور بے باکی ہے اور اسے اس نظریے کو بھی اداریوں اور کالموں کے ذریعے اجاگر کرنا چاہیے جو اس کا نصب العین ہو۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے مسلمانوں نے پہلے ہندوؤں کے ساتھ مشترکہ جدوجہد آزادی چلائی لیکن بہت جلد انہیں احساس ہوا کہ انہیں ایک آزاد ہندوستان کے بجائے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد وطن کی تحریک چلانی چاہیے اور اسی نقطہ نظر کو رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس زمانے میں ریڈیو کی ایجاد نئی اور مقامی لوگوں میں اس کی موجودگی خال تھی۔ اخبارات اور رسائل ہی ایک ایسا ذریعہ تھے کہ جسے اپنا کر مسلمانوں میں اخوت کے ساتھ ساتھ حریت اور پھر آزادی کی تحریک پروان چڑھائی جائے۔ آزادی کی رہنمائی میں قائدین کی مصروفیات اور آزادی کے متوالوں کے لیے ان کا پیغام اخبارات اور رسائل کے توسط سے پہنچایا جانے لگا۔ جب مسلمانوں نے اعلان لاہور کے ذریعے قرارداد پاکستان منظور کی تو ہندوؤں نے مسلمان رہنماؤں کو خریدنے اور رشوتوں کے ذریعے منہ بند کرنے کے ساتھ ساتھ صحافتی حلقوں کو بھی زر خرید غلام کی طرح استعمال کرنا چاہا اگر ہم تاریخ کے آئینے میں نسیم حجازی کی صحافتی زندگی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وار فنڈ کی رشوت انہیں اپنے قلم کی موت کی صورت میں نظر آئی اور انہوں نے عزیمت کا راستہ اختیار کیا حالانکہ رخصت کے بہت سے راستے موجود تھے مگر فتوے کے بجائے تقویٰ کا راستہ ہی کامیابی کی علامت ہوا کرتا ہے۔ روزنامہ ''حیات'' کراچی سے علیحدگی کے حوالے کے مندرجہ بالا اصولوں کو اختیار کر کے اپنے ضمیر کا سودا کرنے کے بجائے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا اور آنے والی مشکلات اور مسائل کو بالائے طاق رکھ کر اصل مقصد حیات کی جانب رواں دواں رہے کچھ عرصے کے لئے ''زمانہ'' کراچی کے مدیر کی حیثیت سے ذمہ داریاں بھی انجام دیں۔ کراچی میں دوران قیام میر جعفر جمالی کی دعوت موصول ہوئی اور یوں بلوچستان میں وارد ہونے کا موقع نصیب ہوا۔ قبائلی سرداروں اور وڈیروں کے بارے میں ان کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہ تھی مگر ذاتی تجربے نے نسیم حجازی کو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا کہ بظاہر سخت اور تند مزاج لوگ اندر سے کس قدر حلیم اور مہربان ہوا کرتے ہیں پھر انہوں یہی محسوس کیا کہ یہاں ان کی اشد ضرورت ہے یہ وہ دور تھا جب بلوچستان میں پولیٹکل ایجنٹ کے ذریعے انگریزوں کی حکمرانی قائم تھی اور انگریز ہندوستان چھوڑ دینے کے بعد بھی بلوچستان سے دست کش ہونے کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے جبکہ دوسری طرف کانگریسی لیڈر بلوچستان کے قبائلی سرداروں کی خریداری میں مصروف تھے اسی دوران ایک سازش نواب قلات کے ذریعے اعلان آزادی کرا دینے سے منسوب تھی ہر محاذ پر سنبھل سنبھل اور ٹھہر ٹھہر کر ثابت قدمی کے ساتھ گامزن رہنے کی اشد ضرورت تھی نسیم حجازی اپنے محسنوں کے ہمراہ اس راہِ مستقیم پر چل رہے تھے اور ڈاکٹر تصدق راجا نے لکھا ہے:

''کوئٹہ سے نکلنے والے اخبار ''تنظیم'' کی اشاعت کے سلسلے میں سارے مصارف سردار میر جعفر جمالی برداشت کرتے تھے اور ۱۵۰۰ اہم اور سرکردہ اشخاص کو یہ اخبار بلا کسی قیمت کے بھیجا جاتا تھا، میر جعفر جمالی کہتے تھے کہ ''اگر یہ ۱۵۰۰ افراد تحریک پاکستان سے ذہنی و قلبی طور پر وابستہ ہو گئے تو پورا بلوچستان پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھے گا'' اور واقعی یہی کچھ ہوا بعد کے حالات نے یہ ثابت کیا کہ

آج بھی پاکستان کو میر جعفر جمالی اور نسیم حجازی جیسے مخلص، وطن دوست اور انتھک کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔''[۱]

''تنظیم''، کوئٹہ کا کردار تحریک پاکستان میں ناقابل فراموش ہے۔ نسیم حجازی کی شکل میں بلوچستان کے سرداروں کے درمیان ایک ایسا شخص موجود تھا جو پاکستان کا مقدمہ لڑ رہا تھا قبائلی روایات اور ذہنیت کا ہمہ گیر مطالعہ کرنے کے بعد انتہائی سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا تھا کیونکہ یہاں تحریک پاکستان کے رہنما قبائلی عداوتوں کے پیشِ نظر اتحادِ ملت کو بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک اہم واقعہ اپریل ۱۹۴۷ء میں اس وقت رونما ہوا جب چوہدری خلیق الزمان کی زیر صدارت مسلم لیگ کے ایک جلسے میں قاضی محمد عیسیٰ نے قبائلی نظام اور قبائلی سرداروں کو آڑے ہاتھوں لیا اور جوش بیان میں انہوں نے انہیں انگریزوں کی اولاد قرار دیا یہ انتہائی نازک معاملہ تھا تحریک پاکستان کو اس سے بہت نقصان پہنچ سکتا تھا جس کی ابتداء گل محمد خاں جمالی کے حادثاتی قتل سے رونما ہوئی اگلے روز کوئٹہ کے میک موہن پارک میں جلسہ ہوا جس میں میر جعفر جمالی کی گرفتاری کا مطالبہ کیا گیا بعد ازاں نسیم حجازی اور عبدالخالق خان کاکڑ نے خان قلات سے ملاقات کی اور یہ معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہوا جس کے بعد نسیم حجازی کا تاریخی مضمون شائع ہوا جس میں:

''میک موہن پارک کے جلسے کی کاروائی کا مذاق اڑانے کے بعد اے جی جی اور کوئٹہ کی انتظامیہ کو کھری کھری سنا گیا تھا۔''[۲]

ان کی صحافتی ذمہ داری نے میر صاحب کو گرفتاری سے بچالیا اور تحریک پاکستان ایک نازک نزاعی معاملے سے بچ گئی اس کے علاوہ ''تنظیم'' میں ایک مضمون کے ذریعے نسیم حجازی نے پیش گوئی کی کہ:

''شاہی جرگہ بلوچستان کے حال و مستقبل کا فیصلہ کرنے میں ایک فیصلہ کن عنصر ثابت ہوگا، بعد کے حالات نے اس کی تصدیق کر دی۔''[۳]

یہ اندازہ درست ثابت ہوا اور پھر جب بلوچستان کی قسمت کے فیصلے کے لیے ۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو تاریخ مقرر ہوئی مگر بلوچستان سے نمائندگی کرنے والے نواب محمد خان جوگیزئی نے ۲۹ جون ۱۹۴۷ء کو اے جی جی مسٹر جیفرے پرائر کی موجودگی میں یہ اعلان کیا کہ ہم بالاتفاق یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ بلوچستان، پاکستان میں شامل ہوگا۔

قیام پاکستان کے بعد بلوچستان کے الحاق کا معاملہ ایک مسئلے کی شکل میں موجود تھا اور خدشہ تھا کہ قبائلی سردار ذاتی رنجشوں کی بناء پر الحاق پاکستان کا معاملہ کھٹائی میں نہ ڈلوا دیں: ''ماہ ستمبر میں ایک دن ہفت روزہ ''تنظیم'' میں ایک دھماکہ خیز خبر شائع ہوئی اور جو لوگ بلوچستان کی سیاست سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے انہیں یہ محسوس ہوا کہ افق کی تاریکیاں چھٹ رہی ہیں۔ خبر کا متن یہ تھا کہ میر حبیب اللہ خان نوشیروانی والئی خاران نے میر احمد یار خان آف قلات کی سیادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور ان سے مطالبہ کیا ہے کہ بلوچستانی ریاستوں کے مستقبل کے متعلق سمجھوتہ کرنے سے پہلے آپ پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کریں۔

---

[۱] نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۳۲۔

[۲] نسیم حجازی اور بلوچستان مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ نوابزادہ جہانگیر شاہ جوگیزئی، ص ۱۹۲۔

[۳] ایضاً، ص ۱۹۱۔

جب نوکرشاہی کے کل پرزے حرکت میں آئے تو پتہ چلا کہ گذشتہ رات والئی خاران نے بولان ہوٹل میں نسیم حجازی سے ملاقات کی تھی'' [۱] نسیم حجازی کا کام جو بلوچستان میں رہ کر انہوں نے خود کو تفویض کیا تھا پورا ہوتا نظر آیا اور پھر قیام پاکستان اور بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی قیام پاکستان کے بعد نسیم حجازی کوئٹہ اور بلوچستان کو خیر باد کہہ کر پنجاب کے مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے ایبٹ آباد پہنچے جہاں رہ کر انہوں نے اردو صحافت اور کوہستان کی خدمت میں اپنا تن من دھن لگا دیا۔

لیکن اس کے قبل نسیم حجازی راولپنڈی سے روز نامہ تعمیر کے مدیر کی حیثیت سے ذمہ داریاں انجام دے چکے تھے یہ امر قابل ذکر ہے کہ روز نامہ تعمیر راولپنڈی سے جاری ہونے والے اوّلین روز ناموں میں شامل ہے لیکن:

''ختم نبوت کی تحریک میں عوام کو اشتعال دلانے کے الزام میں زمیندار، الفضل، تسنیم اور تعمیر (راولپنڈی) کو ایک سال کے لیے بند کر دیا گیا۔'' [۲]

اخباروں کی جرات مندی اور صحافتی ذمہ داریوں کو پرکھنے کے ان مدیروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ جب کوئی مدیر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے فرائض میں بے جا مداخلت کی جا رہی ہے اور وہ اپنی ذمہ داریاں صلاحیت کے عین مطابق ادا کرنے سے قاصر ہے تو اس کے لیے علیحدگی کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہوتا اور اگر معاشی حالات اجازت دیں تو اپنی خواہشات کی تکمیل اور آزادی صحافت کے پرچم کو سر بلند رکھنے کے لیے خود میدانِ عمل میں آ جائے اور یہی کچھ نسیم حجازی کے ساتھ ہوا کہ وہ ہفت روزہ تنظیم میں اپنی ذمہ داریاں باحسن وخوبی انجام دے کر کوئٹہ سے رخصت اور ''تعمیر'' (راولپنڈی) سے وابستہ ہوئے لیکن بہت جلد دوسروں کے زیر اثر کام کرنے کو ترک کیا اور راولپنڈی سے ''کوہستان'' جاری کیا جو بعد میں لاہور اور ملتان سے بھی شائع ہونے لگا۔ اس وقت تک نسیم حجازی بحیثیت تاریخی ناول نگار اپنی شناخت پیدا کر چکے تھے اور ان کے ناولوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے تھے کہ صحافتی ذمہ داریوں میں خود کو مصروف کر کے وہ عملی سیاست میں سرگرم رہنا چاہتے تھے ہر اچھے کام کی تعریف اور ہر غلطی اور کوتاہی پر احتساب نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا یہی وجہ ہے کہ لاہور سے نکلنے والے دوسرے اخبار اس کے دائرہ اثر میں آنے لگے عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

''کوہستان پاپولر جرنلزم (ہر دلعزیز صحافت) کا ایک نمونہ ہے، اور اس کی دیکھا دیکھی دوسرے اخباروں نے بھی یہی رنگ اختیار کر لیا ہے۔'' [۳]

اس کے علاوہ بھی کوہستان میں بہت سی دیگر خوبیاں تھیں جنہیں اگر یہ کہا جائے کہ نسیم حجازی اور عنایت اللہ کے امتزاج سے رونما ہوئیں تھیں تو بے جا نہ ہوگا۔ کوہستان کی ان خوبیوں کا تذکرہ جو اس کی اشاعت میں اضافے اور اسے مقبول عام بنانے کا باعث

۱۔ نسیم حجازی اور بلوچستان مشمولہ نسیم حجازی ایک مطالعہ، نوابزادہ جہانگیر شاہ جوگزئی، ص ۲۰۰۔

۲۔ صحافت پاکستان و ہند میں: ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ص ۵۳۹۔

۳۔ ایضاً، ص ۵۲۳، ۵۲۴۔

تھیں عبدالسلام خورشید نے اس طرح کیا ہے:

''(۱) صفحات کی تعداد بارہ کردی۔ پہلے اخبار چھ یا آٹھ صفحوں پر نکلتے تھے۔ اس طرح زیادہ مواد دینا ممکن ہوگیا۔

(۲) آف سیٹ طباعت کا طریقہ اپنالیا اس سے ایک تو اخبار کا ظاہری حسن دوآتشہ ہوگیا، دوسرے اس میں تصاویر کا دینا آسان ہوگیا۔

(۳) دینی کالم، طبی کالم وغیرہ دیئے جانے لگے۔

(۴) سنڈے ایڈیشن کے علاوہ ہر جمعتہ المبارک کو اشاعت ملی کا اہتمام کیا گیا جس میں دینی مسائل کے علاوہ دنیائے اسلام اور اسلامی تاریخ پر مقالات بھی چھپنے لگے۔

(۵) بڑی شخصیتوں کے ساتھ ساتھ چھوٹی شخصیتوں، سیاسی کارکنوں، معاشرتی کارکنوں اور بڑی جماعتوں کے پہلو بہ پہلو چھوٹی جماعتوں اور اداروں کے خیالات اور تاثرات اور سرگرمیاں بھی مضامین اور خبروں کا موضوع بنائی گئیں۔

(۶) میک اپ یعنی خبروں کی ترتیب وتزئین میں ایک نیا رنگ پیدا کیا گیا جو قاہرہ اور بیروت کے عربی اخبارات سے ملتا جلتا تھا اور یہاں کی عام روش کے ہٹ کر تھا۔

(۷) جنس وجرم کی خبروں کو زیادہ تفصیل کے ساتھ چھاپا گیا اور انسانی دلچسپی کا دوسرا مواد بھی پیش کیا گیا''[۱]

اس طرح اخبار شہرت اور مقبولیت کی معراج کو پہنچ گیا مگر افسوس کہ اسی دوران نسیم حجازی اور عنایت اللہ کے درمیان کارکنوں کے معاملات پر اختلاف ہوا اور عنایت اللہ کارکنوں کے ایک گروپ کے ہمراہ اخبار سے علیحدہ ہوگئے۔ اخبار کی بہترین کارکردگی ہر قسم کی خبروں کی اشاعت، بہترین کالم نویسی اور بے باک اداریوں پر مشتمل ہونے کے علاوہ اس کے دلچسپ کارٹون پر بھی تھی۔ اس سلسلے میں دو کارٹون اپنے طنز، معاشرے پر اثرات اور اس عہد کے حالات کے حوالے سے آج تک مجھے یاد ہیں۔ ایک کارٹون میں ایک نوجوان لڑکی اس کے پیچھے ایک نوجوان لڑکے اور اسے پکارتے ہوئے ایک بزرگ کو دکھایا گیا ہے کہ نوجوان بزرگ کی پکار پر دونوں جانب توجہ کیے ہوئے ہے اور نیچے یہ مصرہ لکھا ہے:

''کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے''

ایک دوسرے کارٹون میں ایک خزاں رسیدہ درخت کے تنے سے ایک بکری بندھی ہے اور اوپر درخت کو دیکھ رہی ہے اور نیچے یہ مصرع لکھا ہے:

''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ''

یہ اور ایسے لاتعداد موضوعات ''کوہستان'' کو قومی روزنامے کا درجہ دلانے اور پاکستان کا مقبول ترین اخبار بنانے کا باعث تھے اس اخبار کا سنہری دور ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۳ء تک کا ہے جب اس کی اشاعت تقریباً ۷۵ ہزار تک جا پہنچی جو اس زمانے کے اعتبار سے

---

[۱] داستان صحافت، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ص ۱۳۱، ۱۳۲۔

روزنامہ جنگ کے علاوہ کسی اور اخبار کو حاصل نہ تھی مگر افسوس ۱۹۶۳ء میں جب یہ اخبار بامِ عروج پر تھا، حکومت کے جبر کا نشانہ بن گیا۔ گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد خان نے ۲ ماہ کے لیے اس پر پابندی عائد کر دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی ہنگامے کی خبر روزنامہ کوہستان نے اشتعال انگیز انداز میں شائع کر دی خبر یہ تھی کہ پولیس فائرنگ سے تین طالب علم ہلاک ہو گئے ہیں جبکہ تحقیقات نے یہ ثابت کیا کہ کوئی طالب علم ہلاک نہیں ہوا تھا۔ بیالیس دن بعد ''کوہستان'' کو دوبارہ اجازت مل گئی اور پھر اخبار اپنی آزاد پالیسی پر رواں دواں رہا اور یہ انداز حکومت کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ سرکاری حلقوں نے مختلف ہتھکنڈے آزمائے مگر اخبار کو اپنی خواہشات کے مطابق چلوانے میں ناکام رہے لیکن سرکار پھر سرکار ہے کون کب تک جبر و استبداد کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ مجبوراً ۱۹۶۶ء میں اس اخبار کو برسر اقتدار جماعت کنونشن لیگ کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا اور یہیں سے اس اخبار کا زوال شروع ہوا جب کنونشن لیگ اقتدار میں نہ رہی تو اخبار کیسے چلتا اور یہ وہ زمانہ تھا کہ کسی اخبار کو نکالنے کے لیے ڈیکلریشن کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف تھا کنونشن لیگ اپنی سیاسی حیثیت کھو چکی تھی اور جماعت اسلامی متوقع انتخابات میں خم ٹھونک کر اقتدار کی سیڑھیوں پر چڑھنے کی منتظر تھی۔ رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے اخبار کی ضرورت کے پیشِ نظر ''کوہستان'' کو خرید لیا اس موقع پر جو کچھ ہوا اسے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید یوں بیان کرتے ہیں:

''پہلے اسے پاکستان مسلم لیگ نے خریدا۔ جس کی وجہ سے اخبار اپنی انفرادیت کھو بیٹھا اس کے بعد لیگ نے ہاتھ اٹھا لیا تو جماعت اسلامی کے ایک رہنما نے خرید لیا وہ نہ چلا سکے تو اسے کارکنوں کے حوالے کر دیا اور چند مہینے چل سکنے کے بعد اخبار بند ہو گیا۔''[1]

اگر ہم کوہستان کی اشاعت کے سلسلے کے خاتمے کا جائزہ لیں تو اخبار کی اہمیت اسی وقت متاثر ہو گئی ہو گی جب مختلف سیاسی جماعتیں پرشکوہ جلوس دیکھ کر خوش فہمی کا شکار ہو گئی تھیں مگر ے دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتائج کے مطابق ۳۰۰ رکنی آئین ساز اسمبلی میں اس کی نشستوں کی تعداد محض چار تھی پھر عوامی نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی ٹالی جاتی رہی یہاں تک کہ سقوطِ ڈھاکہ نے ملک کی تقسیم کے عمل کو مکمل کر دیا، ملک میں سول مارشل لاء نافذ ہوا عوام کے بنیادی حقوق معطل کر دیے گئے اور اس موقع پر جماعتِ اسلامی اور اس کے کارکنان احساسِ شکست سے اس قدر دلگرفتہ تھے کہ اخبار پر توجہ نہ دے سکے، نسیم حجازی نے بھی ہوا کے رخ کو پہچانتے ہوئے اس سے علیحدگی اختیار کی اور پھر کارکنوں کی باہمی چپقلش اور اخبار کی گرتی ہوئی سرکولیشن اسے تاریخ کا حصہ بنا گئی۔

اگر ہم ماضی کے جھروکوں میں دیکھیں تو کوہستان اور نسیم حجازی ایک دوسرے سے وابستہ رہے اور ان کی شخصیت میں جو بے باکی اور نڈرپن زندگی کی ابتداء سے موجود تھا وہ ان کے قلم کے ذریعے قرطاس پر منڈلاتا رہا کیونکہ ان کے اندر کا انسان دبنے اور ڈرنے والا نہیں تھا اگر ہم ان کی زندگی کے ان واقعات کو سامنے رکھیں کہ جب چڑیا گھر میں چیتے کے بچے نے ایک انسان کے بچے کا ہاتھ چبا لیا تو نسیم حجازی نے انتہائی ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے سر پر اس زور سے چھڑی رسید کی کہ بچے کا ہاتھ مکمل تباہی سے بچ گیا۔ ایک دوسرے واقعہ میں دریائے سندھ میں کشتی کے سفر کے دوران ملاحوں کی زیادتی اور مسافروں کی خاموشی پر اچانک ملاحوں کو بے

---

[1] داستان صحافت؛ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ص ۲۳۱۔

بس کر کے رعب میں لے لینا ان کی شخصیت اور جبلت کا امتیاز تھا پھر کس وقت اور کس طرح نظریے اور قوم کی خدمت کے شعار کو اختیار کیا جا سکتا ہے اسے خوب جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ کراچی سے نکلنے والے اخبار میں وارفنڈ کے مسئلے کو اس خوبی سے رقم کرنا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے اور پھر اس سے علیحدہ ہو جانا ایک دانشمندی کی مثال نہیں تو کیا ہے؟ کوئٹہ میں رہ کر تنظیم جمالی کے ذریعے نظریاتی اور جغرافیائی حدود کے تحفظ اور آزادی کے لیے اپنا کردار اس خوبی سے ادا کیا کہ بلوچستان نہ صرف آزاد ہوا بلکہ پاکستان کا حصّہ بھی رہا۔ قیام پاکستان کے بعد استحکام پاکستان کے لیے ان کی کوشش کسی سے ڈھکی چھپی نہیں وہ جانتے تھے کہ قائداعظم کی جلد موت اور مفاد پرست ٹولے کا اقتدار میں آ جانا ملک کی سلامتی کے لیے نقصان دہ ہے اسی مقصد کی تکمیل کے لیے کہ ان دشمنانِ وطن کے نقاب اڑھا کے عوام الناس کو حقیقت حال سے آگاہ کیا جائے کے کردار کو ایک صحافی کے روپ میں ادا کیا۔ محض خبروں کی اشاعت اور اخبار کا نکالنا ان کا مطمعٔ نظر نہ تھا بلکہ جدّت اور ترقی کے انداز کو اختیار کر کے خوب سے خوب اور خوب صورت ترین عوام کے من پسند انداز میں اخبار کو سامنے لانا انہی کا مرہونِ منت ہے:

آپ نے روزنامہ کوہستان اور تعمیر کے ذریعے تعمیر وطن اور اصلاح عوام کا اہم فریضہ بھی سرانجام دیا۔ ناول نگاری کی طرح آپ نے صحافت میں بھی مقصدیت کو شامل کیا، آپ کو اردو زبان وادب پر مہارت حاصل تھی آپ مشکل اور پیچیدہ مسائل کو بڑے آسان فہم انداز میں عوام تک پہنچاتے، یہی وجہ ہے کہ کوہستان اور تعمیر کی عوامی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ آپ نے اپنے اخبارات کو جدید رنگ میں پیش کیا، اخبار کے میک اپ پر خصوصی توجہ دی جاتی، اخبارات میں چھوٹی بڑی سرخیاں، تصاویر، کارٹون اداریہ کالم اور مزاحیہ مضامین کی اشاعت نے اخبار کی سرکولیشن میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔

کوہستان کے بیشتر صفحات دینی مسائل، اسلامی مضامین، تاریخِ اسلام، مسلم دنیا کے مسائل اور خدمتِ خلق جیسے عنوانات اپنے اندر سموئے ہوئے تھے کوہستان مسلمانوں کے حقوق کا علمبردار اور اسلامی تحریکوں اور احیائے اسلام کی کوششوں کا حامی ومددگار تھا۔ کوہستان کے اخباری تبصرے متانت، اعتدال اور سنجیدگی کے حامل ہوئے تھے۔ نسیم حجازی اپنا موقف دلیل سے ثابت کرتے تھے ان کے انداز صحافت نے دیگر اخبارات میں بھی مقابلہ کا رجحان پیدا کیا جس سے ان کے ہمعصر اخبارات پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

چونکہ اداریہ لکھنے کی ذمہ داری زیادہ تر ایڈیٹر پر عائد ہوتی ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ اداریے ایڈیٹر ہی نے لکھے ہوں گے اور پھر بعض اداریوں کے اندازِ نگارش کو دیکھتے ہوئے ہم یہ اندازہ لگانے میں حق بجانب ہیں کہ نسیم حجازی صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہوں گے۔ استحکام پاکستان کے لیے ان کی کاوشیں کھل کر سامنے آ رہی تھیں تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں جب عوام اور مذہبی رہنماؤں کی اکثریت اٹھ کھڑی ہوئی تو آپ بھی اپنے اخبار کے ذریعے اس مسئلے کو بھرپور انداز میں پیش کر رہے تھے نتیجے میں تعمیر راولپنڈی کو بندش کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ یہی کچھ اس زمانے کے اکثر اخبارات کے ساتھ ہوا تھا لیکن اس عمل کی بدولت ایک صحافی اور عوام کے دلوں کی دھڑکنیں ایک ساتھ سنی جا سکتی تھیں۔ آپ ایک نظریاتی انسان تھے پاکستان کی آزادی اور اسلام کی بالادستی کا مقصد آپ کی زندگی کا

سنہری اور بلند اصول تھا اور ویسے بھی اسلام اور پاکستان ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں اس لیے آپ پاکستان کی ترقی اور استحکام کے لیے ہر لمحہ کوشاں رہے لیکن جب جمہوری روایات سے انحراف کرتے ہوئے ملک میں مارشل لاء لگا تو آپ کیونکر خاموش رہ سکتے تھے۔ آپ نے کھل کر مخالفت کی حکومت کبھی ڈرا کے اور کبھی آنکھیں دکھا کر خاموش رکھنے کا حربہ آزمانے میں ناکام رہی اور انہیں اپنا حاشیہ بردار نہ بنا سکی۔ فوجی اقتدار طول پکڑتا گیا یہاں تک کہ کوہستان کا پہلا دور اپنے اختتام کو جا پہنچا۔ قلم اور حرف کی حرمت کا لحاظ انہیں ذاتی منفعت سے زیادہ عزیز تھا اس لیے اخبار چھوڑ دیا روش نہ چھوڑی۔

۱۹۷۰ء آتے آتے فوجی آمروں نے محسوس کر لیا کہ ملک میں عام انتخابات کرانا ناگزیر ہے۔ اسی موقع پر کوہستان کا دوسرا دور شروع ہوا اب یہ اخبار ایک مذہبی سیاسی جماعت کے مقاصد کا آئینہ دار تھا۔ ایڈیٹر کی ذمہ داریاں ایک بار پھر نسیم حجازی کے کاندھوں پر تھیں۔ آپ نے سیاسی حالات کے ایسے تجزیے پیش کیے جو پیغمبرانہ پیشین گوئی ثابت ہوئے انہوں نے سابق مشرقی پاکستان کے حالات، بنگالیوں کی صورت حال اور وہاں پھیلنے والی عوامی بے چینی کا اظہار جہاں اپنے ناولوں میں کیا تھا وہیں اپنے اخبار میں بھی کیا۔ ہندو بنیے کی چال اور دل سے پاکستان تسلیم نہ کرنے کی ہندوانہ ذہنیت کو بارہا آشکار کرتے رہے ساتھ ہی مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کے مقاصد اور مستقبل کے منظرنامے کو ماضی کی حقیقتوں کے ساتھ جوڑ کر پیش کرتے رہے اس موقع پر ان کا ایک اداریہ ''ٹرائے کا گھوڑا پاکستان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے'' خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس اداریے میں انہوں نے یونانیوں کی چالاکی کا ذکر کیا ہے جو ٹرائے کی فتح پر منتج ہوئی۔ انہوں نے مسلسل جنگی ناکامی کے پیش نظر لکڑی کا ایک کھوکھلا گھوڑا بنا کر ٹرائے کے باہر کھڑا کر دیا۔ جب اہل ٹرائے نے اسے شہر لے جا کر جشن منایا اور شراب میں بدمست ہوئے تو اس کے کھوکھلے پیٹ سے چھپے ہوئے سپاہی نکل آئے انہوں نے قتل عام کیا پھر ان کے مددگار ساتھی بھی آن پہنچے یوں ٹرائے کا گھوڑا یونانیوں کے لئے فتح کی نوید لایا۔ اس اداریے میں آگے چل کر نسیم حجازی لکھتے ہیں:

آج بیسویں صدی میں اسی قسم کا گھوڑا جس کے اندر ہماری آزادی و بقاء کے ان گنت دشمن چھپے بیٹھے ہیں پاکستان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے یہ سوشلزم کا گھوڑا ہے۔ ہم نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اپنے دشمنوں کے عزائم خاک میں ملا دیے۔ اب لامرکزیت، انتشار، فاشزم اور اشتراکی آمریت کے علمبردار اس جنگ کو پاکستان کی سرحدوں کے اندر لے آئے ہیں اس گھوڑے کا خیر مقدم کرنے میں ان مفتیانِ شرع کا گروہ بھی موجود ہے جو ربع صدی قبل ہندو کی غلامی کے طوق کو مسلمانوں کے لئے زیور ثابت کیا کرتے تھے۔ اس گھوڑے کے جلوس میں بینڈ باجا بجانے والے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے ۱۹۵۱ء میں اس ملک کی آزادی اور بقاء کے خلاف پہلی سازشیں کی تھی اور اب وہ پاکستان کے نظریاتی حصار میں اس گھوڑے کا استحصال تلاش کرنے کے لئے مضطرب ہیں یہ گروہ اس گروہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جو ۱۹۵۸ء کی ایک رات جمہوریت کا گلا گھونٹ کر قوم پر سوار ہو گیا تھا جو فیلڈ مارشل محمد ایوب کے آمرانہ دور میں اسے ''ڈیڈی'' کہنے پر شرم محسوس نہیں کرتا تھا۔''[۱]

---

[۱] ٹرائے کا گھوڑا پاکستان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، نسیم حجازی، ص ۳۱۶۔

اسی تناظر میں اُن کا تحریر کردہ ایک اور اداریہ ''۱۹۴۷ء کی کرپان اور ۱۹۷۰ء کی تلوار'' بڑی اہمیت کا حامل ہے جسکا بنیادی نکتہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کا قتلِ عام بذریعہ سکھ ہے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے لاہور کے اسمبلی ہال کی سیڑھیوں پر جو کرپان لہرائی تھی وہ مسلمانوں کے خون سے رنگی گئی مگر سکھ اپنے خالصتان کے خواب کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ یہ ہندو بنیے کی سازش تھی کہ جو کام وہ خود نہ کر سکا وہ سکھوں سے کروایا پھر قیامِ پاکستان کے بعد اسی ہندوانہ ذہنیت نے اس نظریاتی مملکت کو نام نہاد مسلمانوں کے ذریعے اپنے مرکز سے دور کیا۔ جب ملک میں پہلے عام انتخابات کا اعلان ہوا اور مغربی پاکستان سے پاکستان پیپلز پارٹی تلوار کا انتخابی نشان لے کر میدان میں آئی تو نسیم حجازی نے آنے والے خطرے سے قوم کو آگاہ کرنے کا فریضہ انجام دیا انہوں نے اس اداریہ میں لکھا:

''۱۹۷۰ء میں ملتِ پاک اپنی تاریخ کا ایک نیا ورق اُلٹ رہی ہے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے عام انتخابات اسی بات کا فیصلہ کریں گے کہ پاکستان ایک جمہوری مُلک کی حیثیت سے زندہ رہتا ہے یا مسٹر بھٹو اس سرزمین پر اشترا کی الحاد کا آمرانہ نظام مسلط کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔[۱]

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ:

''وہ تمام جماعتیں جو پاکستان کو جمہوریت اور اسلام کے راستے سے دور لے جانے میں ہی اپنا مفاد دیکھتی ہیں مسٹر بھٹو ان کے ہمنوا ہیں وہ پکے کمیونسٹ جنہوں نے ۱۹۵۱ء میں ایک فوجی انقلاب کے ذریعے حکومت کا تختہ اُلٹنے کی ناکام کوشش کی تھی اور وہ نیشنلسٹ جنہوں نے تحریکِ پاکستان کے خلاف اکھنڈ بھارت کے حامیوں کا ساتھ دیا تھا اور وہ مفاد پرست جنہوں نے صدر ایوب کے دورِ اقتدار میں قوم کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا اب مسٹر بھٹو کے آمرانہ عزائم کا ساتھ دے کر قوم کے احتساب سے بچنا چاہتے ہیں۔''[۲]

یہ الگ بات ہے کہ رائے عامہ ہموار کرنے میں وہ کس قدر کامیاب ہوئے اور کہاں تک ناکام۔ انسان حتی المقدور کوشش کرتا ہے اور اُن حقیقتوں کو جو اس کے سامنے ہوتی ہیں عوام کے آگے پیش کر دیتا ہے کون مانتا ہے کون نہیں یہ اس کا کام نہیں اور یہی کچھ نسیم حجازی کے ساتھ ہوا کہ انہوں نے قیامِ پاکستان سے قبل لکھے گئے اپنے ناول ''انسان اور دیوتا'' کی ابتدا میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ پروان چڑھتے ہوئے ۱۹۷۱ء کے سقوطِ ڈھاکہ پر منتج ہوئے۔ اس ناول میں بیان کیا گیا ہے کہ:

''ہندو سماج کئی ہزار برس سے اچھوتوں کی سوکھی ہوئی ہڈیوں پر اپنے عشرت کدے تعمیر کر رہی ہے اور باغِ وطن کے کسی مالی نے ابھی تک یہ محسوس نہیں کیا کہ سماج کا جو بوجھ اس قوم کے نحیف کندھوں کے لئے ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے اتار ڈالا جائے۔''[۳]

یہاں وہ جس بات کو پیش کرنا چاہتے تھے وہ برہمن ذہنیت کے خوں فشاں پنجوں کی طرف توجہ دلانا تھا کہ قیامِ پاکستان کے موقع پر بظاہر اپنی ناکامی کا بدلہ مسلم کش فسادات اور لاکھوں مسلمانوں کو تہہ تیغ کر کے لیا بات یہیں تک ہوتی تو بھی ٹھیک تھا مگر اُن کے ذہن نے تقسیم

۱۔ ۱۹۴۷ء کی کرپان اور ۱۹۷۰ء کی تلوار، مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، نسیم حجازی، ص ۳۱۸۔

۲۔ ایضاً: ص ۳۱۹۔

۳۔ انسان اور دیوتا: نسیم حجازی، ص ۱۲،۱۱۔

برصغیر کو دل سے تسلیم ہی نہیں کیا بغض کا یہ بیج کونپل بن کر نمودار ہوا اور اہلِ بنگال نے اس پودے کو اپنا خونِ جگر دیا اور پھر یہ درخت ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھر پور انداز میں منظرِ عام پر آیا۔ بالکل اسی طرح سیاسی شطرنج کی بساط پر جو چالیں چلی جا رہی تھیں وہ بھی ملک کی تقسیم کا باعث بنیں یہ الگ بات کہ وہ اپنے اداریوں کے ذریعے اس منظرنامے کو پیش کر چکے تھے ایک اور موضوع جس نے نسیم حجازی کو ہر موقع پر بے چین کیے رکھا اسلامی نظریہ اور پاکستان میں اس کا نفاذ تھا۔ وہ اس اسلامی نظریاتی مملکت کے امین تھے جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا اور جس کے حصول کے لئے لاکھوں مسلمانانِ ہند نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے مگر تقسیم برصغیر کے بعد ان سازشی عناصر نے جو تقسیم کے مخالف تھے اس نظریے کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ اپنے ایک اداریے ''پاکستان ایک نظریاتی ریاست اور اس کی ذمہ داریاں'' میں انہوں نے لکھا:

''یہاں کسی بنی بنائی قوم نے کوئی نیا نظریہ نہیں اپنایا بلکہ یہاں ایک نظرے کے طفیل ملک معرضِ وجود میں آیا ہے اور اسی کی بدولت ہم ایک قوم بنے ہیں وہ نظریہ یہ ہے کہ مسلمان متحدہ ہندوستانی قومیت کا ایک حصہ ہیں بلکہ اپنے دین اور اپنی تہذیب وتمدن اور اپنی اخلاقی اور روحانی قدروں کے لحاظ سے ایک علیحدہ قوم ہیں اور انہیں زندہ رہنے اور پنپنے کے لیے ایک علیحدہ وطن کی ضرورت ہے۔''[۱]

انہوں نے ابتدائی کامیابی کے بعد اس راہِ مستقیم کا تعین کیا جو قوموں کے لیے ضروری ہے وہ اسی اداریے میں لکھتے ہیں:

''نظریاتی ریاستیں اپنے جہد وعمل، اپنی ہمہ وقت بیداری اور اپنے عمل وحرکت کے باعث زندہ رہتی ہیں اپنی نظریاتی اساس کے بارے میں ان کا رویہ مدافعانہ نہیں ہوتا وہ یا تو اپنے عمل وحرکت کی بدولت بڑھتی اور پھولتی ہیں اور یا اپنی بے راہ روی اور بے حسی کے باعث نابود ہو جاتی ہیں۔''[۲]

اپنے اس اداریے میں نسل نو کی تیاری کے لیے ان کی تجاویز اس طرح تھیں:

''قوم کی تعمیر کا کام باقی تھا اور قوم کی صحیح تعمیر اس نظریاتی اساس پر ہو سکتی تھی جو پاکستان کے قیام کا باعث تھا۔ ہماری اوّلین ضرورت ایک ایسا نصابِ تعلیم تھا جو قوم کے بچوں اور جوانوں کو اسلامی نظریات کے سانچے میں ڈھال سکتا یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہ تھا اگر ۱۹۴۸ء میں ہی پہلی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک کا نصابِ تعلیم ہماری ملی ضرورت کے تابع ہوتا تو چند سال کے اندر اندر قوم کا ہر جوان اقبال کا شاہین نظر آتا۔''[۳]

انہوں نے اس اداریے کا اختتام اس عبارت پر کیا:

''آخر میں میں ایک بار پھر یہ دہرانے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کے نظامِ تعلیم، اس کے ذرائع ابلاغ اور اس کے علم وادب کو ایک نظریاتی ریاست کی ضرورت کے مطابق ڈھالنا ہمارے لیے پسند یا ناپسند کا مسئلہ نہیں یہ ہمارے لیے موت وحیات

---

[۱] پاکستان۔ ایک نظریاتی ریاست اور اس کی ذمہ داریاں، مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، نسیم حجازی، ص ۳۲۷، ۳۲۸۔

[۲] ایضاً۔ ص ۳۳۴۔

[۳] ایضاً، ص ۳۳۵۔

کا مسئلہ ہے یہ ہمارے حکمرانوں، دانشوروں، ادیبوں اور مفکروں کی وہ اخلاقی ذمہ داری ہے۔ جس سے فرار کا ہر راستہ ہلاکت اور تباہی کی طرف جاتا ہے۔

میں اس مضمون کو اندلس کے آخری مجاہد موسیٰ بن ابی غسان کے الفاظ کے ساتھ ختم کرتا ہوں:

''اہل غرناطہ! ہم اس جگہ کے لیے لڑ رہے ہیں جہاں ہم کھڑے ہیں اس کے بعد نہ ہمارا وطن ہوگا اور نہ ہم کوئی قوم ہوں گے۔''[۱]

سلسلہ قلم و قرطاس تو قائم رہا مگر صحافت کے میدان کو بظاہر ایک خاص اخبار کی وابستگی کی حد تک خیر باد کہا اور یوں کوہستان سے ان کی علیحدگی دوسری مرتبہ عمل میں آئی جو آخری بھی ثابت ہوئی ان کا اور قلم کا رشتہ اٹوٹ تھا جو تا دم مرگ ان سے وابستہ رہا وہ اپنے انٹرویوز اور ناولوں کے ذریعے اپنے نظریات کا پرچار کرتے رہے۔

اب ہم خاص طور پر ان مقاصد کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنی بات پیش کریں گے کہ آخر ان اخبارات کے اجراء کا مقصد کیا تھا اس سلسلے میں کچھ امور تو اخبار کے میک اپ، پرنٹنگ کے معیار اور اس میں شامل ہونے والے مختلف موضوعات سے متعلق ہیں جن کی بدولت اخبار کی اشاعت کو چار چاند لگے۔ اس اخبار نے اردو صحافت کو بہت کچھ سکھایا مثال کے طور پر اشاعت ملی سب سے پہلے اس نے شائع کی اس کی تقلید کرتے ہوئے ایک انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز نے بھی شائع کرنا شروع کر دی۔ یہ صحافت میں ایک نئی بنیاد تھی جو کہ کوہستان نے ڈالی۔ اس کے علاوہ اس کی خدمات بہت وسیع نظر آتی ہیں آج کل کے اخبارات میں بچوں کا جو صفحہ ہم دیکھتے ہیں اس کا بانی کوہستان ہی تھا کوہستان نے بچوں کا صفحہ بھی اس انداز سے شائع کیا تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے ننھے منے نونہالوں کے لیے ایک ننھا سا اخبار تھا جسکو وہ باقاعدہ علیحدہ کر لیا کرتے تھے پھر کوہستان ہی کے سر پر سہرا جاتا ہے کہ اس نے خواتین کا صفحہ شروع کیا اور باقاعدہ عورتوں کے مسائل، ان کے حل پر لکھنے کے لیے ایک خاتون نامہ نگار کا تقرر کیا۔ اسی طرح فلم کے شائقین کے لئے باقاعدہ اخبار میں جگہ مخصوص کی، اور پنجاب میں پہلی مرتبہ فلمی صفحہ شائع کیا جبکہ اس سے قبل صرف روز نامہ جنگ کراچی فلمی صفحہ شائع کر رہا تھا۔ ان سب باتوں کے علاوہ کوہستان ہی نے قارئین کی سہولت کیلئے مختلف مواد کی خاطر ایک جگہ اخبار میں مخصوص کی مثال کے طور پر چھوٹے چھوٹے کاروباری اشتہارات، اموات، پیدائش و شادی بیاہ کی خبریں بھی ایک مخصوص کالم میں آیا کرتی تھیں ایک خصوصی کالم جس نے بڑی شہرت حاصل کی مذہبی معلومات سے متعلق تھا جسکے نگراں ان کے برادر نسبتی حافظ مظہر الدین صاحب تھے (ان معلومات کے حصول کے لئے میں نے نسیم حجازی مرحوم صاحب کے بڑے صاحبزادے خالد نسیم حجازی[۲] سے ملاقات کی) ان جدتوں کا مقصد اخبار کو معیاری بنانا اور عوام میں اس کی مقبولیت کو دوچند کرنا تھا اور اس مقصد کو حاصل کرنے میں وہ کامیاب بھی رہے کیونکہ ایک دور وہ بھی آیا کہ جب اخبار کی اشاعت ۷۵۰۰۰ تک جا پہنچی یہاں ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر کامیابی کے باوجود اخبار کیوں زوال پذیر ہوا اور

---

[۱] پاکستان۔ ایک نظریاتی ریاست اور اس کی ذمہ داریاں: مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، نسیم حجازی، ص ۳۳۲۔

[۲] انٹرویو خالد نسیم حجازی، ۲۳ مئی ۲۰۰۲ء، کیسٹ مملوکہ راقم الحروف۔

تاریخ کا حصہ بن کر رہ گیا اس سلسلے میں جو معلومات حاصل ہوئیں اس کے مطابق نسیم حجازی اور عنایت اللہ صاحب ایک اور ایک گیارہ والی مثال کے مصداق تھے لیکن جب نوجوانوں کی ہٹ دھرمی خودسری کی حد تک جا پہنچی جس کے ذمہ دار نسیم حجازی کے صاحبزادے اور عنایت اللہ کے بھانجے تھے تو اختلافات کی خلیج علیحدگی پر منتج ہوئی اور یہ اتحاد کی برکت نفاق کے فتنے کی نذر ہو گئی دوسری وجہ نواب کالا باغ اور خدا بخش بُچہ کے دباؤ کے سامنے نسیم حجازی کا نہ ڈٹے رہنا تھا۔ بظاہر وہ اپنی ثابت قدمی اور حوصلہ مندی کی شہرت رکھتے تھے مگر ان دونوں حضرات کے سامنے انہوں نے کسی خاص استقلال کا ثبوت نہ دیا یا دوسرے لفظوں میں اخبار کی گرتی ہوئی ساکھ کو محسوس کرتے ہوئے اخبار فروخت کر دینے میں غنیمت جانی ہمارا اصل موضوع تو دورِ صحافت؛ میں ان کے وہ مقاصد تھے جو اردو صحافت کے نئے اصول و ضوابط مرتب کرنے کا باعث ہوئے اگر ہم نسیم حجازی کے دورِ صحافت کا ابتداء ہی سے جائزہ لیں تو روزنامہ ''حیات'' کراچی سے ان کی علیحدگی اصولوں کے آگے ڈٹے رہنے کی بنا پر تھی وہ حکومت انگلیشیا کی اس پالیسی کو غلط جانتے تھے کہ چند روپوں کے حصول کی خاطر دوسری جنگ عظیم کے مقاصد کو اسی طرح پیش کیا جائے جیسی حکومت کی خواہش تھی انہوں نے وار فنڈ کے خلاف لکھا اور اس نتیجے کو محسوس کرتے ہوئے استعفیٰ بھی دے دیا جو سامنے آنے والا تھا یہ ایک اچھی بات رہی کہ انہیں بہت جلد کوئٹہ کے ہفت روزہ ''تنظیم'' کی ذمہ داریاں مل گئیں جہاں کے قبائلی معاشرے اُن کی روایات کو بغور محسوس کرنے کے بعد تحریک پاکستان کے لئے بلوچستان کے رہنماؤں کو تیار کرنے کا کام اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انتہائی جانفشانی سے کیا بلوچستان کے سیاسی منظر نامے کا جائزہ اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ تنظیم کے ذریعے نسیم حجازی بلوچستان کے معاشرے میں اپنا ایک مقام بنا چکے تھے وہ اسلامی نظریے اور ملتِ اسلامیہ کے تصورات کی ترجمانی ہر دو محاذوں پر کرتے رہے تھے ایک طرف تنظیم کے مضامین تھے تو دوسری طرف ان کی ذاتی ملاقاتیں وہ خود بھی اس دور کو اپنی زندگی کا سنہری دور قرار دیتے تھے جب بلوچستان کا الحاق پاکستان سے ہو گیا تو انہوں نے رختِ سفر باندھا صحافت سے وابستگی ''تعمیر'' راولپنڈی کی وجہ سے برقرار رہی اور پھر کوہستان کی بنیاد ڈالی یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ۱۹۴۷ء میں کوہستان نامی اخبار پہلے پہل کوئٹہ سے جاری ہوا[1] لیکن جو اخبار زیر بحث ہے وہ ۱۹۵۳ء میں جاری ہوا تھا۔ اس اخبار میں بھی تمام تر جدتوں کے ساتھ ساتھ بے باکی اور جرأت مندی ان کا مقصد حیات رہی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مسکین علی حجازی نے مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے اور بعد ازاں تحریری جواب رقم کرتے ہوئے بتایا کہ:

''نسیم حجازی جو اداریے خود لکھتے یا لکھواتے ان میں اس بات پر زور دیتے کہ مسائل کا تعاقب کیا جائے آج کی صحافت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اداریوں اور کالموں میں مسائل پر محض تبصرہ کیا جاتا ہے۔''[3]

انہوں نے اپنے تحریری تبصرے میں لکھا ہے:

---

[1] انٹرویو نسیم حجازی، ۱۷ جولائی ۱۹۹۲ء، کیسٹ مملوکہ راقم الحروف۔

[2] اردو زبان وادب کی ترقی میں صحافت کا کردار، مقالہ نگار ڈاکٹر عقیر وحامد علی، مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی۔

[3] انٹرویو ڈاکٹر مسکین علی حجازی، ۲۱ مئی ۲۰۰۲ء، کیسٹ مملوکہ راقم الحروف۔

''۱۔ اخبار جاری کرنے کے اسباب و محرکات کئی تھے ایک تو پاکستان میں حالات کی نہج وہ نہیں تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ اس دور میں پاکستان میں ''ترقی پسندی'' کا غلغلہ تھا کئی اخبارات و جرائد ''ترقی پسند'' صحافت کو فروغ دے رہے تھے اس دور میں ''ترقی پسندی'' کا مطلب اشتراکی نظریات سے اتفاق تھا۔ نسیم حجازی صاحب یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کے اساس نظریہ کی ترویج و اشاعت کے لئے ایک مؤثر اخبار کی ضرورت ہے دوسری وجہ یہ تھی کہ اخبار کی کاروباری کامیابی کے لئے انہیں عنایت اللہ مرحوم جیسا ساتھی مل گیا تھا، کوہستان کی ابتدا راولپنڈی سے ہوئی لیکن اس نے زیادہ مقبولیت لاہور ایڈیشن جاری ہونے کے بعد حاصل کی لاہور علم و ادب اور صحافت کا بڑا مرکز تھا۔ پی پی ایل کے اخبارات دی پاکستان ٹائمز، امروز، لیل و نہار جو ترقی پسندی کے علمبردار تھے لاہور سے شائع ہوتے تھے اگرچہ نوائے وقت نظریاتی محاذ پر کام کر رہا تھا لیکن نسیم حجازی صاحب اپنی مرضی سے اپنے انداز میں کام کرنے کے عادی تھے۔

۲۔ اخبار کی کامیابی کا ثبوت اس کی مقبولیت کو سمجھا جاتا ہے لیکن مقبولیت سے مراد صرف زیادہ اشاعت نہیں۔ کیونکہ اشاعت زرد صحافت کے علمبرداروں کی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور میں ''امروز'' ایک نئے رجحان کا سبب بنا لیکن یہ زیادہ تر ترقی پسندی کے لیے مختص ہوگیا۔ کوہستان نے ایسی مقبول عام صحافت کی طرح ڈالی جس میں پاکستانی عوامیت غالب تھی۔ سنسنی خیزی بھی نہیں تھی اور صرف خواص کی نمائندگی بھی نہیں تھی۔ کوہستان نے جو نیا انداز دیا وہ مقبول ہوتا گیا بعدازاں مشرق نے بھی اسی رجحان کو آگے بڑھایا اور پھر سارے اردو اخبارات نے کسی نہ کسی حد تک یہی انداز اپنا لیا۔

۳۔ کوہستان میں حافظ مظہر الدین مستقلاً دینی کالم لکھتے تھے بعدازاں یہ کالم ہر اخبار نے کسی نہ کسی طرح اپنایا اور اسے جاری رکھا۔ اب صحافت پر بڑی حد تک کمرشلزم غالب آچکی ہے لیکن پھر بھی حالت یہ ہے کہ انگریزی اخبار بھی ہفتہ وار دینی صفحہ شائع کرتے ہیں اور اردو اخبار بھی۔''[1]

اگر یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ نسیم حجازی نے روزنامہ کوہستان اور تعمیر کے ذریعے تعمیر وطن اور اصلاح عام کا اہم فریضہ بھی سرانجام دیا۔ ناول نگاری کی طرح آپ نے صحافت میں بھی مقصدیت کو شامل کیا، آپ کو اردو زبان و ادب پر مہارت حاصل تھی آپ مشکل اور پیچیدہ مسائل کو بڑے آسان فہم انداز میں عوام تک پہنچاتے یہی وجہ ہے کہ کوہستان اور تعمیر کی عوامی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور آپ نے اپنے اخبارات کو جدید رنگ میں پیش کیا وہ اپنے اخبارات کے ذریعے مسلمانوں کے حقوق کے علمبردار بن کر اسلامی تحریکوں اور احیائے اسلام کی کوششوں کے حامی و مددگار تھے وہ اپنے اداریوں میں متانت، سنجیدگی اور اعتدال کی راہ اختیار کرتے تھے وہ اپنا موقف دلیل سے ثابت کرتے تھے ان کے انداز صحافت نے دیگر اخبارات میں بھی مقابلہ کا رجحان پیدا کیا۔ جس سے ان کے ہم عصر اخبارات پر گہرے اثرات مرتب ہوئے انہوں نے دیگر جدتوں کے ساتھ ساتھ خبریت کے معیار کو صحیح لائنوں اور صحافتی پالیسی کے ماتحت تمام اقسام بمعہ جنس و جرم کی خبروں کو چھاپنے کا رواج عام کیا۔ ہم اپنے اس موضوع کو پروفیسر مرزا محمد منور کی اس رائے پر ختم کرتے ہیں:

---

[1] مکتوب، ڈاکٹر مسکین علی حجازی، ۳۰ مئی ۲۰۰۲ء بنام راقم۔

’’انہوں (نسیم حجازی) نے قوم کے سیاسی امور میں بھرپور دلچسپی لی اور مسلمانانِ برعظیم کے دلوں میں کلام اقبال کی روح پھونکنے کے لیے قائداعظم کا پیغام عام کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی ان کی یہ جدوجہد جاری رہی وہ ناول بھی لکھتے رہے، انہوں نے اخبار ’’تعمیر‘‘ بھی نکالا اور پھر پنڈی ہی سے ’’کوہستان‘‘ اخبار جاری کیا جسے لے کر پھر لاہور آ گئے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ’’کوہستان‘‘ پاکستان کا سب سے بڑا کثیرالاشاعت روزنامہ بن گیا۔ اس اخبار کے ذریعے بھی نسیم حجازی نے نظریۂ پاکستان کو تقویت دینے کے لیے اور قومی وملی استحکام کی خاطر جو بس میں تھا کیا۔‘‘[1]

۱۔ نسیم حجازی کی فتوحات، پروفیسر مرزا محمد منور، مشمولہ سیارہ، نعیم صدیقی، ص ۲۱۱

صحافت کا اثر ناول نگاری پر

صحافت کا لفظ عربی سے اردو میں مستعمل ہوا لفظ ''صَحُفِی'' معنی ''اخبار نویس'' اور ''صحافۃ'' معنی ''اخبار نویسی'' سے صحافی اور صحافت میں رواج پایا۔ اردو میں صحافت لفظ کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے ''خبریں جمع کرنا اور انہیں مفید وقت پر شائع کرنا۔''

اِن تعریفوں کی روشنی میں عوام الناس کو باخبر رکھنے کے لئے ایسی چھپی ہوئی دستاویز تیار کرنا جو روزانہ کے واقعات پر مشتمل ہو یہ واقعات مقامی، ملکی اور بین الاقوامی ہو سکتے ہیں ان کا موضوع، معاشرتی، سماجی، مذہبی اور معاشی ہر طرح کا ہوسکتا ہے۔ اخبارات و رسائل محض خبریں پیش کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ ان میں ایسے مضامین بھی شائع کئے جاتے ہیں جو ان حالات و واقعات پر تبصرہ ہوتے ہیں جو اس معاشرے کو درپیش ہوں یا کسی اعتبار سے اس سے وابستہ ہوں یعنی صحافی کی ذمہ داری حقیقت کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا اور اپنی دور بینی کی بدولت ماضی یا حال کے واقعات کے تسلسل میں موجود موضوع کا احاطہ کرنا مزید مستقبل کے لئے لائحہ عمل پیش کرنا ہونا چاہیے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے صحافی اور صحافتی ادارے اس کام کو باحسن وخوبی انجام دیتے آرہے ہیں۔

صحافی کی دوربینی اسکی خداداد صلاحیت کی بناء پر اسے اپنی پیشہ ورانہ خدمات میں منفرد اور ممتاز کرتی ہے۔ جس قدر گہرا مشاہدہ اور عمیق مطالعہ ہوگا اسی قدر خبروں اور مضامین کی تیاری میں اس کی صلاحیتیں ان مقاصد کی تکمیل کے لیے کامیاب ہوں گی جو اس قوم یا معاشرے کو مطلوب ہوں۔ مگر مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی اخبار یا رسالے کی اہمیت ایک محدود مدت کے لیے ہوا کرتی ہے مثلاً کسی روزنامے کی اہمیت خواہ اس میں کسی قدر بھرپور مضامین شائع ہوئے ہوں اگلے روز ماند پڑ جاتی ہے لیکن اگر مضامین زیادہ پراثر ہوں تو بھی اگلے دو تین دن میں حالات حاضرہ کا مطالعہ انہیں ذہن سے محو کر دیتا ہے۔ سوائے اس صورت کے کہ ان مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل میں پیش کر دیا جائے مگر پھر بھی ان مضامین کی اہمیت چونکہ وقتی نوعیت کے موضوعات پر مشتمل ہوتی ہے اور یہ موضوعات وقت کی تیز رفتاری کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اس لیے ان کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے البتہ کچھ صحافی ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ادب میں اپنا نام باقی رکھنے کے لیے کسی دوسری صنف کا سہارا لے کر اپنی صحافتی صلاحیتوں کی بدولت خود کو منواتے ہیں اس طرح وہ بحیثیت صحافی نہیں بلکہ اس دوسری صنف کی بدولت اپنا نام ادبی حلقوں میں زندہ رکھتے ہیں۔ یہاں ہمارے نزدیک نسیم حجازی کی صحافتی خدمات اور اس کا اثر ان کی ناول نگاری پر زیر بحث لانا ہے کیونکہ نسیم حجازی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بحیثیت صحافی کیا تھا اور اسی دوران اپنے ناولوں کے پلاٹ مرتب کر کے انہیں ترتیب دیا اور عوام کے سامنے پیش کیا۔ یہاں بعض افراد ان کے افسانے ''شودر'' کی مثال دے کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر کہانی نویس تھے لیکن یہ نوجوانی کی حدود میں قدم رکھنے والے فرد کے زورِ قلم کا ایسا شاہکار تھا جو نامکمل تھا اور پھر اس افسانے اور ناول نگاری کے درمیان تقریباً ایک دہائی کا عرصہ ہے اور اس عرصے میں وہ بحیثیت صحافی اپنی اہمیت کو منوا چکے تھے۔

نسیم حجازی کا صحافت سے ناول نگاری میں آنے کا عمل کوئی انوکھی اور انفرادی بات نہیں کیونکہ اردو کی تاریخی ناول نگاری کے

اہم ستون مولانا عبدالحلیم شرؔر بنیادی طور پر صحافی تھے اور پھر صحافت کے شعبے سے ناول نگار بنے۔ ہم اپنی اسی دلیل پر زور دیں گے کہ صحافی خبروں کو جمع کرنے اور انہیں ترتیب دیتے دیتے اس قدر وسیع النظر ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی قوم یا معاشرے کی اصلاح کے لیے بہت کچھ پیش کر سکتا ہے اگر کولمبیا کے ناول نگار گبریل گارسیا مارکس کی زندگی کا جائزہ لیں تو وہ بھی بنیادی طور پر صحافی نظر آتا ہے لیکن جب وہ صحافتی ذمہ داریوں کے علاوہ خود کو ناول نگار کے روپ میں پیش کرتا ہے تو اس کا ناول ''تنہائی کے سو برس'' شاہکار بن جاتا ہے وہ ادب میں نوبل انعام یافتہ ہے۔ اس کے ناول کا موضوع بظاہر ایک قصبے میں ایک خاندان کے عروج و زوال کی داستان ہے لیکن علامتی طور پر سارے لاطینی امریکہ یا شاید دنیا کے بھی پسماندہ ممالک کا المیہ ہے۔ اس ناول میں جس قصبے اور اس کی سرسبز و شاداب امارت کا تذکرہ ہے اور پھر اس کا جو انجام یا مقدر دکھایا ہے وہ ساری انسانیت کا مقدر ہے بظاہر یہ ایک داستان ہے جو ایک گاؤں کی بھی ہو سکتی ہے، ایک شہر، ایک ملک، ایک براعظم اور ساری انسانیت کی بھی۔ اس موضوع نے مارکس کو ناول نگاری کے فن میں اس قدر بلند مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ اس کا صحافتی دور اور ذمہ داریاں کچھ پردوں میں چھپے چھپے نظر آتے ہیں۔

دوسری طرف ناول نگار پیغمبرانہ پیش گوئی کے روپ میں خود کو پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں جرمنی کے مشہور ناول نگار ٹامس مان کے تذکرے کے بغیر یہ موضوع نامکمل رہے گا۔ بظاہر وہ خالص جرمن لکھاری ہے۔ جہاں کرداروں کے بجائے ان کے نظریات کو پیش کیا جاتا ہے لیکن ٹامس مان نے اپنے اس قومی تشخص کو پیش کرنے کے باوجود عالمی ادب میں اپنی اہمیت کو مسلّم کرایا ہے ٹامس مان نے پیغمبرانہ پیش گوئی کے اعتبار سے "The death in Venus" کو پہلے پہل پیش کیا جس میں ایک بیمار وینس کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور بظاہر کہانی میں ایک آرٹسٹ غیر فطری عشق میں مبتلا دکھایا گیا ہے ایشن باغ لڑکے کو مسحور نگاہوں سے دیکھتا رہا اس کا از حد حسین چہرہ، صندلی پیشانی پر شہد رنگے بالوں کی لٹیں، ستواں ناک اور دلکش دانت۔ اس حسن میں جو شیرینی اور دلکشی تھی وہ یونان کے مجسموں میں بھی ناپید تھی اور پھر اعضاء کے اس ظاہری حسن و تناسب کے ساتھ ساتھ اس کے باطن کا حسن یوں امڈا امڈ کے باہر آ رہا تھا کہ ایشن باغ کو لگا اس طرح کا حسنِ کامل نہ تو اس نے کبھی فطرت میں دیکھا اور نہ مصوری کے کسی شاہکار میں لڑکے کی حسین و جمیل زلفیں تراشنے کی ہمت کسی میں نہ ہوئی ہو گی جس کی گھنگریالی لٹیں ماتھے پر، کانوں پر اور پیچھے گردن تک چلی گئی تھیں، وہ پوری آستینوں کا ملاحوں والا لمبا کرتہ پہنے ہوا تھا۔ ایشن باغ کا یہ عشق اس وقت ناکامی میں تبدیل ہو جاتا ہے جب وینس میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑتی ہے جسکے نتیجے میں یہ لڑکا اور اہلیانِ شہر وینس اس وبا کی نذر ہو جاتے ہیں ۱۹۱۲ء میں شائع ہونے والا یہ ناول پورے بیمار یورپ کی تصویر کشی کرتا ہے اور پھر پہلی جنگ عظیم اس پیش گوئی کو درست ثابت کرتی ہے جو علامتی طور پر ٹامس مان نے پیش کی۔ اس کے بارہ سال بعد یعنی ۱۹۲۴ء میں ان کا ناول "The Magic Mountain" منظر عام پر آیا۔ یہ ناول صحیح معنوں میں تاریخ اور فلسفے کی ایک دستاویز ہے اس کی کہانی میں ایک پرفضا پہاڑی مقام پر ایک سینی ٹوریم میں مختلف مکتبہائے فکر کے مریض جمع ہیں اور اپنے اپنے نقطہ نظر سے ایک دوسرے کو آگاہ کر رہے ہیں دنیا سے ان کا رابطہ کٹا ہوا ہے اور وقت یہاں رک گیا ہے مصنف نے ایک مرتبہ پھر بیمار یورپ کا نقشہ کھینچا ہے اور جدید فکر کے تمام مکتبوں کو مختلف

کرداروں کی شکل میں پیش کیا ہے اس ناول کو خوشگوار اور رواں دواں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ موضوع ہے جو یورپ کی خاموش فضاؤں میں بارود کی بو محسوس کر رہا تھا اور پھر دوسری جنگ عظیم اور اقوام متحدہ کے قیام کو ٹامس مان کے ناول ''طلسماتی پہاڑ'' کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے ایک اور موضوع جو ناول سے ہٹ کر ٹامس مان نے مرتب کیا ۱۹۱۸ء میں اس کا ''ایک غیر سیاسی آدمی کے خیالات'' تھا اس میں انہوں نے یہ بات کھل کر کہی ہے کہ جرمن روایات کا ضمیر غیر جمہوری ہے اور جرمن قوم انہی روایات پر چلتی رہی تو اس میں انتہا پسند نظریات جنم لیں گے اور پھر وہی ہوا۔ جرمنوں کی قوم پرستی فسطائیت میں بدل گئی اور نازی کے عزم کے روپ میں ٹامس مان کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی یہ انداز دنیائے ادب کے دیگر ناول نگاروں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے بالخصوص مصری نال نگار نجیب محفوظ اپنے عہد اور مستقبل کا تانہ بانا بڑی خوبصورتی سے بنتے ہیں لیکن ہم اپنے موضوع صحافت سے ناول نگاری کی طرف واپس آتے ہوئے منشی پریم چند کو بحیثیت صحافی اور پھر ناول نگار کے روپ میں پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

نسیم حجازی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کراچی کے ایک اخبار کے ذریعے کیا تھا۔ اس اخبار سے علیحدگی وار فنڈ کے خلاف اداریہ لکھنے کی وجہ سے ہوئی اگر عمیق مشاہدہ کیا جائے کہ وقتی اور مالی منفعت اور حکومت کی نظروں میں اہمیت کو بالائے طاق رکھ کر جرأت اور ولولہ انگیزی کا پر خطر راستہ اختیار کرنا اور وہ بھی ایک ایسی حکومت کے خلاف جو اس وقت کی سپر پاور ہو اور جو اس زمانے کی بڑھتی ہوئی سپر پاور جرمنی سے نبرد آزما تھی تو ان کے اس تدبر اور ادراک کا معترف ہونا پڑتا ہے کہ انہوں نے سرکار انگلستان کی قوت اور مستقبل کے ارادوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس لیے اپنے قلم کی نوک سے حکمرانوں کے دل و دماغ کو نشتر بذریعہ قلم چبھونے کا انداز اپنایا۔ کراچی سے کوئٹہ تک اور کوئٹہ سے قیام پاکستان تک کا سفر اس جرأت مندی اور بے باکی کا منہ بولتا ثبوت ہے جو راہوں میں پڑی رکاوٹوں کو روند جانے یا پھلانگ جانے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے انگریزوں کی اس نیت سے واقفیت کے بعد کہ بلوچستان میں وہ اپنی فوجیں برقرار رکھ کر پاکستان، افغانستان، روس اور ایران پر اپنی موجودگی کا احساس برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ آئین ساز اسمبلی میں بلوچستان کے نمائندے کے ذریعے شاہی جرگے کے ممبران کی حمایت سے قیام پاکستان کی راہیں استوار کیں جبکہ آستینوں میں پلنے والے سانپ جنکی غذا کانگریسی رہنماؤں کے طفیل تھی کو خاموش کروانا اور تن تنہا یہ کام کر دینے کا فریضہ اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹی اور سانپ بھی مر گیا۔ اس دور میں کہ جب تحریک پاکستان چل رہی تھی اور مسلمانوں کا ایک گروہ کانگریسیوں کی حمایت پر کمر بستہ تھا ضرورت اس بات کی تھی کہ ہندو بنیے کے مکروہ عزائم سے اور اکھنڈ بھارت کے تصور سے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ہندوؤں کے پسے ہوئے طبقے کو بھی آگاہ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اخبار کی خبروں، اداریوں اور مضامین کے ساتھ ساتھ کسی اور صنف کو بھی اختیار کرنے کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کی تکمیل کے لیے نسیم حجازی نے صنف ناول کو اختیار کیا اگر بغور جائزہ لیں تو ہمیں ان کی ناول نگاری پر صحافتی تجربات کے اثرات جابجا نظر آئیں گے۔ بظاہر نسیم حجازی کی ناول نگاری کا آغاز داستان مجاہد کے منصۂ شہود پر آنے سے ہوا لیکن ان کے ابتدائی افسانے ''شودر'' کو جوان کے دل و دماغ میں ہلچل برپا کیے ہوئے تھا اور جسکی بنیاد پر ''انسان اور

دیوتا'' کا مسودہ پہلے تیار ہو گیا فراموش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس ناول، اس کے موضوع اور ۱۹۴۰ء کے بعد کے حالات مسلمانوں کے لیے لمحہ فکر یہ تھے انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو اس قوم کے مکروہ عزائم سے باخبر کیا جائے۔ اس ناول کے لکھنے کی وجہ آکاس بیل کے خوبصورت منظر کو دیکھ کر اس بیل کے ٹکڑوں کو دوسرے درختوں پر بکھیر دینے کی خواہش سے ہوا اور جب کسان نے اس کام سے روکا اور پھر وہ تمام کیفیت بیان کی جو آکاس بیل کی خوش رنگی میں پوشیدہ تھی کہ وہ کسی جڑ کے بغیر پروان چڑھ رہی تھی اور اسکی نشوونما کے لیے غذا بیری کے اس درخت سے مہیا ہو رہی تھی جو سوکھ رہا تھا اور جب انہوں نے ہندوستان کے شودروں کی حالت پر نظر کی تو انہیں بہت کچھ سمجھنے کا خود بخود موقع مل گیا۔ اس کیفیت کو نسیم حجازی نے ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے:

''مجھے مظلوم قوم کی گذشتہ کئی ہزار برس کی زندگی بیری کے اس سوکھے درخت سے مشابہ نظر آنے لگی اور ملک کے خودغرض سماج نے میرے دل میں اس زرد رنگ بیل کی یاد تازہ کر دی، جس نے اپنی زندگی کے سہارے کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع دینے کی بجائے نیست و نابود کر دیا تھا۔ ان دونوں میں مجھے فقط یہ فرق نظر آیا کہ اس بیل کو درخت کی زندگی تباہ کرنے کے بعد خود بھی تباہی کا سامنا کرنا پڑا لیکن ہندو سماج کئی ہزار برس سے اچھوتوں کی سوکھی ہوئی ہڈیوں پر اپنے عشرت کدے تعمیر کر رہی ہے اور باغ وطن کے کسی مالی نے ابھی تک یہ محسوس نہیں کیا کہ سماج کا جو بوجھ اس قوم کے نحیف کندھوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے اتار ڈالا جائے۔''[1]

بظاہر یہ موضوع ہندو سماج اور ان کے ذات پات کے نظام کے بارے میں ہے اور ۱۹۴۴ء میں شائع ہونے والے ناول میں شامل تھا لیکن یہ ایسا پہلو تھا جسے اجاگر کرنے کے پیچھے ہندوؤں کی اس ذہنیت سے باخبر کرنا تھا جو تحریکِ پاکستان کی کامیابی اور قیام پاکستان کی تکمیل کے بعد اہلِ پاکستان کو درپیش ہوں گے اور پھر تاریخ نے یہ سبق دیا کہ ہم نے اُن امور کو سمجھنے میں کوتاہی برتی اور ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ رونما ہوا اس المناک اور افسوس ناک کیفیت کے بعد جب اہلِ قلم کچھ سنبھلے اور نسیم حجازی نے اپنے ماضی اور حال کا جائزہ لیا تو ''انسان اور دیوتا'' پر ۱۹۷۴ء میں نظرِ ثانی کا فیصلہ کیا اس موقع پر وہ لکھتے ہیں:

''یہ کتاب ان ایام میں لکھی گئی تھی جب برہمی سامراج کا ''کالا بھوت'' صدیوں کے بعد اپنے طلسمی کوزے سے باہر نکل رہا تھا اور اس کے نکیلے بدنما پنجے'' جن پر شودروں کے خون کی دبیز تہیں جمی ہوئی تھیں'' ملت اسلام کے دامن کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔''[2]

اس ناول کی اشاعت کے بعد پہلے ہندو سماج اپنی نچلی ذاتوں پر چڑھ دوڑا اور جب انہی برہمنوں نے محسوس کیا کہ غیر منقسم ہندوستان کی آزادی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا تو مسلمانوں کے خون سے وہ ہولی کھیلی گئی جو تاریخ عالم کا سیاہ باب اور امن کے علمبرداروں کے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ ہے پھر قیام پاکستان کے بعد عصبیت کا وہ بیج بویا گیا جو آہستہ آہستہ پروان چڑھتا گیا اور اسی دوران کشمیر کا مسئلہ بین الاقوامی ایوانوں کی زینت بنا کر رکھ دیا گیا اور پھر ۱۹۶۵ء میں ہندوستانی فوجیں پاکستانی سرحدوں کو عبور کرنے

---

[1] انسان اور دیوتا، نسیم حجازی، ص ۱۱، ۱۲۔

[2] ایضاً، ص ۱۴۔

میں کامیاب ہوگئیں مگر چند گھنٹوں بعد جذبہ جہاد سے سرشار پاک فوج اور محبِ وطن لوگ اس پر جھپٹے اور دشمن کو اپنے علاقے میں بھی سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ چند ہی برس بعد مشرقی پاکستان پر بھارت کی لشکر کشی ڈھاکہ کا سقوط اور بہاری مسلمانوں کی تباہی اس صدی کا ایک عظیم المیہ ثابت ہوئی، لیکن اس سے بڑا المیہ یہ ہوگا کہ ہم اس تازہ جارحیت کو دشمن کی آخری جسارت سمجھ کر اپنے مستقبل سے آنکھیں بند کر لیں۔

بھارتی سامراج نے سقوط ڈھاکہ کے درمیان ربع صدی کی منازل جس رفتار سے طے کی ہیں اسے دیکھتے ہوئے کوئی سلیم العقل آدمی اس خوش فہمی میں ہرگز مبتلا نہیں ہوسکتا کہ منوجی کے بیٹے" جن کے اسلاف وسط ایشیا سے ہزاروں سال قبل پاپیادہ اور ٹٹوؤں پر سوار ہوکر نئی شکار گاہوں کی تلاش میں نکلے تھے اور اپنی لاٹھیوں اور تلواروں کے بل بوتے پر پورے ہندوستان پر مسلط ہوگئے تھے بیسویں صدی میں ٹینکوں، طیاروں اور ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح ہوکر اپنی نئی جارحیت کے راستے میں کسی سرحد کو آخری سرحد تسلیم کریں گے۔ انہیں مسلمانوں کے روپ میں ہندو ذہنیت کے پروردہ رہنماؤں کی تلاش ہے۔ اور اس میں وہ بہت حد تک اور بہت جلد کامیاب ہوگئے۔

''بنگلہ بندھو'' (شیخ مجیب الرحمٰن) بیسوں صدی کا ''راموُ'' ہے جس نے ''کالی دیوی'' کے لیے ایک نیا مندر تعمیر کیا ہے لیکن اُن کے کردار میں یہ فرق ہے کہ ''راموُ'' مٹی کا ایک بت بنا کر اسے اپنے دشمن کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا اور یہ ''بنگلہ بندھو'' بھارت کے سیاسی دیوتاؤں اور دیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہیں اپنے بھائیوں کا بھی بلیدان پیش کرسکتا ہے۔ بہاری مسلمان اس بلیدان کی پہلی قسط ہیں اور ان کی تعداد ان شودروں سے کہیں زیادہ ہے جنہیں برہمو جی کے بیٹوں نے تاریک ادوار میں ''کالی ماتا'' کی بھینٹ چڑھایا تھا۔[1]

یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ تقسیم برصغیر کے بعد پاکستان دو حصوں پر مشتمل تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان مگر عاقبت نااندیش رہنماؤں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر عوام کا ایک طبقہ تعصب کی بھینٹ چڑھ گیا اور ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان محض مغربی پاکستان کے جغرافیائی خدوخال پر قائم رہ گیا۔ بات یہیں تک مکمل ہو جاتی اور یہ محض آخری جارحیت ہوتی تو بھی قابل برداشت تھا لیکن برہمنی ذہنیت اس پاکستان کو بھی ہڑپ کر کے عالم اسلام کے دیگر علاقوں میں اپنے پنجے گاڑنا چاہتی ہے۔ امتِ مسلمہ متحد ہوکر اس کا مقابلہ کرسکتی ہے اور اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ناول میں موجود ہندو ذات پات کے نظام اور برہمن کے شودر سے تعلقات کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا جائے تاکہ اس کا توڑ کیا جاسکے یہ وہ تصورات ہیں جو نسیم حجازی نے ان مشاہدات سے اخذ کئے ہوں گے جو دورانِ صحافت ان کے تجربے سے گزرے ہوں گے۔

تاریخ اشاعت کے حوالے سے نسیم حجازی کا پہلا ناول ''داستان مجاہد'' ہے جس میں وہ تحریک پاکستان کے لیے ایسے نوجوان

---

[1] انسان اور دیوتا، نسیم حجازی، ص ۱۷۔

پیش کرنا چاہتے ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا جہاد ہو جن کے لیے بچپن میں کھلونے کے طور پر خنجر کا دستہ اور لڑکپن میں تیراندازی کے ذریعے اڑتے ہوئے پرندے کو گرادینا رہا ہو لیکن ان نوجوانوں کی پرورش ایسی ماؤں کی گود میں ہوئی ہو جو بچوں کو بلی کا خوف دلا کر سلا دینے کے بجائے شیروں کا حوصلہ پیدا کرسکتی ہوں اُن کا تخیلاتی کردار اپنے عشق کو قربان کر کے اصل مقصد حیات جہاد میں مصروف عمل رہ کر جامِ کوثر کے حصول اور جنتی حوروں کے تصور میں خود کو یقین محکم کے ساتھ مگن رکھ سکے۔ یہ انداز بحیثیت صحافی ان کی تحریروں میں جا گزیں رہا اور جسکی بدولت بلوچستان کے سرداروں اور وڈیروں کے قبائلی نظام میں تحریکِ پاکستان کے سپاہی پیدا ہوئے اور ان میں اس قدر اعتماد پیدا ہو چکا تھا کہ ۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو ہونے والا فیصلہ ۲۹ جون کو ہو گیا یہ وہ اولوالعزمی تھی جسکی گونج دہلی میں وائسرائے ہند تک نہیں بلکہ دس وکٹوریہ روڈ لندن اور قصرِ بکھنگم میں سنی جاسکتی تھی اور اس جذباتی کیفیت کے سامنے بند باندھنا کسی استعماری طاقت کے بس کا کام نہ تھا اسکی بقاء صرف اسی پر تھی کہ اپنا بستر بوریا سمیٹ کر واپس چلا جائے اور تاریخ نے اپنا فیصلہ صادر کیا کہ ہندوستان میں گورنر جنرل کی حیثیت سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو قبول نہ کیا جائے لیکن پاکستان اور اس کے غیور عوام اس طوق کو اتار کر پھینکنے میں کامیاب ہو گئے۔

نسیم حجازی کا ایک اور ناول ''شاہین'' انہی خدشات کا آئینہ دار ہے جو انہیں ہندو سماج سے تھے اور اس کے لیے بھی انہوں نے بظاہر تاریخِ اسلام کے ایک ایسے موضوع کو منتخب کیا جو عظمت رفتہ کی یاد دلاتا ہے یعنی اندلس جہاں مسلمان آٹھ سو سال تک حکمران رہے مگر مسلمانوں کی عدم اجتماعیت اور تعصبات نے انہیں ذلت و رسوائی کے گڑھے میں دھکیل دیا۔ آخری شہر غرناطہ صرف اس وجہ سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نہیں گیا کہ مسلمانوں کی تعداد کم تھی یا ہتھیار کم تھے بلکہ ان کی وجۂ شکست بربری، اندلسی اور عربی مسلمانوں کی تقسیم تھی۔ اس تصور اور خیال کو ''شاہین'' کے پلاٹ میں سمو کر انہوں نے پاکستان کے مسلمانوں کو مستقبل کی راہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے اور وہ تمام واقعات جو فسادات کی شکل میں رونما ہوئے اور جن کی وجہ سے دس لاکھ مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا محض اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ اس کا ادراک کرنے میں مسلمان رہنماؤں سے کوتاہی ہوئی تھی کیونکہ بقول نسیم حجازی:

''اندلس کی وہ داستان جسے بیان کر کے میں قوم کو مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا ہندوستان کے طول وعرض میں دہرائی جا چکی ہے، میرے نزدیک اندلس کی طرح ہندوستان میں مسلمانوں کا قتلِ عام بھی ایک اتفاقی حادثہ نہیں۔ ہم دشمن کے عزائم سے ناواقف نہ تھے۔ اس کی گذشتہ تاریخ ہمارے سامنے تھی۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ متحد اور منظم ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود ہم خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ ہو سکے۔ ہم میں وہ غدار موجود تھے جو مساجد میں کھڑے ہو کر ہندو کی اسلام دوستی کا ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے۔ وہ شکست خوردہ ذہنیت کے لوگ موجود تھے جو یہ تبلیغ کیا کرتے تھے کہ اکثریت اگر آدم خوروں کی ہو تو بھی وہ انسانوں پر حکومت کا حق رکھتی ہے۔

مشرقی پنجاب، دہلی، جوناگڑھ اور حیدر آباد دکن کے واقعات کے بعد پاکستان کے مسلمانوں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں

رہتی کہ پاکستان کے متعلق ہندوستان کے عزائم کیا ہیں۔ کشمیر پر حملہ پاکستان کے خلاف اس کا عملی اقدام ہے۔''[۱]

مندرجہ بالا اقتباس ناول کے پیش لفظ میں شامل تھا یہیں انہوں نے بہت سے ایسے مشورے بھی دیے تھے جو پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اسے ناقابلِ تسخیر قلعہ بنا دینے کے لیے تھے جن کا مقصد قوم میں نئی امنگ ولولہ اور جذبۂ جہاد کو برقرار رکھنا تھا کیونکہ ہر وقت دفاعی اعتبار سے تیاری دشمن کے مذموم ارادوں کو عملی جامہ پہنانے میں رکاوٹ کا باعث ہوتی ہے۔ پاکستان کے عوام کو ملتِ اسلامیہ کا سپاہی بن کر جینے کا ہنر سیکھ لینا چاہیے اور کشمیر کے مسئلہ کا حل جہاد میں پوشیدہ ہے۔ کوئی کانفرنس، معاہدہ یا عدالت کشمیر کو بطور تحفہ ہمیں نہیں دلا سکتی اور کشمیر ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جسے جہاد کے جذبے سے سرشار ہو کر بدر و حنین کے تیقن کے ساتھ حل کیا جا سکتا تھا جس کا مشورہ نسیم حجازی دیتے رہے۔ افسوس نصف صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد بھی حکومت پاکستان اقوامِ متحدہ کی قرار دادوں اور شملہ معاہدے کے مطابق اس کے حل کے لیے کوشاں ہے۔ دوسری طرف مجاہدین کشمیر گذشتہ ایک عشرے سے اپنی بقاء کی جنگ میں مصروف عمل ہیں اور مستقبل یہ فیصلہ کرے گا کہ کشمیر کس کا ہوگا۔ یہ وہ شعور ہے جو نسیم حجازی نے بحیثیت صحافی سیکھا تھا اور عوام الناس اور اربابِ حل و عقد کے سامنے پیش کیا تھا لیکن ہماری روایات رہی ہیں کہ ہم تاریخ سے سبق نہیں سیکھتے۔ جبکہ نسیم حجازی نے صحافت کے شعبہ کو اختیار کرنا اس وجہ سے قبول کیا تھا کہ اس کے ذریعے تحریکِ پاکستان میں رونما ہونے والے واقعات سے عوام الناس کو باخبر رکھا جائے اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کے ذہنی شعور کو آزادی کے مفہوم سے واقف کروانے کے ساتھ ساتھ اس جدوجہد میں شامل رکھا جا سکے اس حوالے سے ''تنظیم کوئٹہ'' میں ان کا کردار سنہری حروف سے رقم کرنے کے لائق ہے۔ اس صحافتی دور سے متاثر ہو کر انہوں نے تاریخی ناول نگاری کو نہ صرف اپنایا بلکہ مقصدیت کے اس اسلوب کو بھی اختیار کیا جو ناول کے مزاج پر گراں نہیں گزرتا۔ ان کے موضوعات تاریخ اسلام کے عظمتِ رفتہ کے دور کا بہت زیادہ احاطہ نہیں کرتے بلکہ ملتِ اسلامیہ کے عروج و زوال کی داستان پیش کرتے ہیں اور ان کا زیادہ زور زوال کے اسباب اور نتائج پر صرف ہوتا ہے۔ درحقیقت اس انداز کو اختیار کرنے کی وجہ تحریک پاکستان کے دوران مسلمانوں کو ان کا ماضی یاد دلانا، ان غلطیوں کی نشاندہی کرنا جنکی وجہ سے وہ حاکم سے محکوم بنے اور پھر جدوجہد آزادی کے اس دور میں آستین میں پلنے والے سانپوں سے ہوشیار رہنے کا درس دیتے ہیں اگر ایک ہی مصرعہ میں تمام بات کو سمجھ لینا ہو تو اُن کی ناول نگاری ''شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر'' کا پیغام دیتی ہے۔ دوسری طرف ''خاک اور خون'' اور ''انسان اور دیوتا'' جیسے ناول ہیں جو ہندو ذہنیت اور اس میں بھی برہمن تصورات کی سوچ، اور مقاصد کو نتائج کے ساتھ پیش کرتے ہیں یہ صحافتی رنگ اُن کے مختلف ایسے ناولوں میں بھی نظر آئے گا جنہیں ہم اختصار کی وجہ سے زیرِ بحث لانے سے معذور رہے۔

---

[۱] شاہین، نسیم حجازی، ص ۸۔

بحیثیت صحافی نسیم حجازی کا مقام

نسیم حجازی کی شخصیت دور طالب علمی ہی سے لکھنے پڑھنے سے متعلق رہی انہوں نے ایک افسانہ لکھ کر اپنے قلم کی روانی کا ابتدائی نقش ظاہر کیا اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے شعبہ صحافت کو اختیار کیا اُن کا تاریخی مطالعہ انتہائی عمیق اور گہرا تھا اسی وجہ سے اُنھوں نے صحافت اور صحافی کی ذمہ داریوں کو شعور کی گہرائیوں کے ساتھ قبول کیا اپنی معنویت کے اعتبار سے صحافی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے گردو پیش کے حالات و واقعات کو غیر جانبدارانہ انداز میں دیکھے اور پھر ایک خاص انداز میں پیش کرے سچائی اور صداقت اس کا ایمان، ایمانداری اس کا وصف ہونا چاہیے ایک مسلمان کی حیثیت سے جوابدہی کا تصور اسے مندرجہ بالا اصولوں پر قائم رکھنے میں بڑا مددگار ہوتا ہے ایک پکا اور راسخ العقیدہ مسلمان صحافی کے لفظ کو صحف کے مفہوم سے سمجھتا ہے جو قرآن کریم کی اصطلاح میں اس پیغام کے لیے استعمال ہوا جو اللہ کی طرف سے انبیاء کو پہنچایا گیا یعنی اللہ کے احکامات جو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے متعین کئے گئے ہر اعتبار اور ہر کسوٹی پر پرکھنے کے بعد سچے ثابت ہوتے ہیں اس مفہوم کا ادراک کرنے کے بعد نسیم حجازی نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور انتہائی جرأت و بے باکی کے ساتھ اپنے بنائے ہوئے بلکہ دوسرے لفظوں میں اللہ کے بتائے ہوئے میدان عمل میں اپنا کردار ادا کیا جب حالات نے انہیں اس پُر خطر راہ پر چلنے کی اجازت نہ دی بلکہ وقت کے حاکموں نے مصلحت اور وقتی ضرورتوں کے تحت ان کے قلم کی حرمت کو خریدنے کی کوشش کی تو انہوں نے اس سفر کو خیر باد کہا۔ آج نسیم حجازی ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن اُن کے افکار اور کردار آئینہ کی مانند روز روشن کی طرح عیاں ہیں اور تاریخ صحافت میں ان کی حیثیت متعین کرنے میں انتہائی معاون اور مددگار ہیں۔

بحیثیت صحافی نسیم حجازی کا مقام متعین کرنے کے لیے ان سیاسی حالات کو مدنظر رکھنا اشد ضروری ہے جس میں انہوں نے اپنے صحافتی سفر کا آغاز کیا۔ عالم اسلام خلافت کے کچے دھاگے سے بھی آزاد ہو چکا تھا۔ ترکی جدید مغربی جمہوری روایات کا امین بن کر سامنے آیا تھا تو ایران کے پہلوی حکمران اپنی خواتین کو برسر عام لے آئے وسط ایشیا کی مسلم ریاستیں اپنے اسلامی تشخص کو کھو کر سویت یونین کے کمیونسٹ انقلاب میں ضم ہو چکی تھیں۔ عرب ممالک آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے ہٹلر کی قیادت میں جرمنی سے اٹھنے والا طوفان تمام عالم کو زیر کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ چین کی قوم خواب غفلت سے بیداری کی طرف رواں دواں تھی۔ برطانیہ کا بحری بیڑہ جس نے برٹش ایمپائر کی وسعتوں میں اس قدر اضافہ کیا تھا کہ اس کی حدود میں سورج غروب نہ ہوتا تھا اپنی تنزلی کا تماشہ دیکھنے کے لیے حالات سے چشم پوشی کی روایت پر عمل پیرا تھا خود برصغیر کے عوام انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دینے کے لیے ڈٹ کر میدان میں آ گئے تھے مگر ابھی تک یہ مسئلہ موجود تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوستان کے اقتدار کے امین کانگریسی رہنما ہوں گے جن کا دعوٰی ملک کی سب سے بڑی جماعت ہونے کا تھا یا دو قومی نظریے کے اصول کے مطابق دو ریاستیں وجود میں آئیں گی اس سیاسی منظر نامے کی موجودگی میں اخبارات کا کردار جو رائے عامہ ہموار کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں بین بین تھا ایک طرف زمیندار اور الہلال

جیسے اخبار تھے تو دوسری طرف ابن الوقت اخبارات قوم کی تقدیر کے فیصلے پر اثر انداز ہونا چاہتے تھے ان حالات میں نسیم حجازی نے کراچی سے نکلنے والے اخبار ''حیات'' سے وابستگی اختیار کی ان کے سامنے دو راستے تھے ایک طرف اپنے قلم کا سودا کر کے مالکان اور ادارے کو منافع بخش مقام تک پہنچایا جا سکتا تھا تو دوسری طرف سوداگر بن کر آنے والی غاصب حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اُردو کی پسماندہ صحافت میں ''حیات'' کے ذریعے ایک نئے باب کا آغاز کیا انہوں نے وار فنڈ کے خلاف غاصب حکومت سے اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ بعد ازاں حالات نے انہیں اس اخبار سے علیحدگی پر مجبور کر دیا مگر جب کوئی موتی سیپ کا خول توڑ کر لوگوں کی جاذب نظری کا شکار ہوتا ہے تو پھر وہ وجودِ زن بھی منظر عام پر آ جاتا ہے کہ جس کے حسن میں اضافے کے لیے اسے تراش کر زیورِ حسن میں آراستہ کر دیا جائے یہی کچھ نسیم حجازی کی شخصیت کا امتیاز ہے۔ نسیم حجازی کی ''حیات'' سے علیحدگی کے بعد روزنامہ ''زمانہ'' سے وابستگی محدود عرصے کے لیے رہی۔ بہت جلد میر جعفر جمالی کی صحبت نے ان کے اس صحافتی جوہر کو تلاش کر کے انہیں ''تنظیم'' کی ذمہ داریاں سونپ دیں۔ قبائلی معاشرے میں جہاں تعلیم خال خال تھی سرداروں کی ذہنیت، جمہوریت اور جمہوری روایات سے بہت دور تھی اور جہاں کے عوام اپنے مستقبل کے لیے اپنے سرداروں کے جنبشِ ابرو کو اپنے لیے تقدیر کے فیصلے کی مانند جانتے تھے۔ اس قسم کے معاشرے میں نظریاتی مملکت اور تحریک پاکستان کے مقاصد کو پیش کرنا اور لوگوں کو اس کے لیے اپنا ہم خیال بنانا ناممکن نہیں تو ایک مشکل کام ضرور تھا اور جب انتخابات کے موقع پر اپنے ہی میدان چھوڑ کو غیروں کے لیے راستہ ہموار کرنے لگیں تو بعض اہم اور فوری فیصلے کرنا ایک ایسے انسان کی سرپرستی میں ہی ممکن ہے جو اپنی قابلیت، ذہانت، اور بڑائی کا سکہ اختلافِ فکر و نظر کے باوجود دلوں میں بٹھانا جانتا ہو ان باتوں اور لب و لہجہ میں بڑا پن پوری شان کے ساتھ موجود تھا، بے موقع تبسم سے گریز، مختصر اور دو ٹوک باتیں، خلا ملا سے پرہیز، تخلیہ اور تجلیہ میں یکساں سنجیدگی اور خاموشی بڑے آدمیوں کے یہی اسلحہ ہوتے ہیں اور نسیم حجازی ان سے پورے طور پر مسلح تھے۔ انہوں نے اپنی انہیں صلاحیتوں کی بدولت افکار دماغی، زورِ قلم اور متوازن رائے پیش کر کے اپنی شخصیت، اور اہمیت کو تسلیم کروایا یہ وہی صحافی تھا جس نے اپنی نوجوانی کے زمانہ میں بلوچستان کے عوام کے ترجمان ''تنظیم'' کی عنانِ ادارت اپنے ہاتھ میں لے کر اسے بامِ عروج پر پہنچایا اور اس کی افادیت کو برصغیر کے صحافتی حلقوں میں بلند مقام دلوایا اور اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اپنے اصل مقصد نظریاتی اسلامی مملکت کے قیام میں اس اخبار کے ذریعے بہ حسن و خوبی اپنا کردار انجام دیا تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کے صحافتی کردار اور بلوچستان کے حوالے سے اُن کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر شیر محمد زمان رقمطراز ہیں:

''یہ (تنظیم) اخبار کوئٹہ اور قرب و جوار کے تعلیم یافتہ طبقے میں ۵۰۰ کی تعداد میں مفت تقسیم کیا جاتا تھا یہیں سے آزادی کے چند متوالوں کی انتھک جدوجہد کی کہانی کا آغاز ہوتا ہے اور بلوچستان کے پاکستان سے الحاق کی تحریک شروع ہوتی ہے۔ وہ تحریک جس سے نسیم حجازی کا نام جدا نہیں کیا جا سکتا۔''[1]

---

[1] نسیم حجازی کی ناول نگاری اور ''محمد بن قاسم'' کا عربی ترجمہ۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ زمان مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۱۴۲۔

اس تحریک آزادی اور اس میں نسیم حجازی کے بلند پایہ افکار و تصورات کا اندازہ جہانگیر شاہ جوگیزئی کی اس رائے سے بخوبی ہو سکتا ہے:

"مجھے معلوم تھا کہ نسیم حجازی کی آواز جو بلوچستان کی سیاسی فضا میں گونج رہی تھی بڑی تیزی سے بلوچستان کے باشعور لوگوں کے دل کی آواز بنتی جا رہی تھی"۔[۱]

اس طرح نسیم حجازی نے بلوچستان کے قبائلی نظام میں خود کو اس طرح مدغم کر لیا تھا کہ وہاں کے رہنما ان کی رفاقت کو اپنی ضرورت جانتے تھے جہانگیر شاہ جوگیزئی ایک ایسے ہی موقع کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

"ہفت روزہ تنظیم کی ایک اشاعت میں نسیم حجازی کا یہ تجزیہ شائع ہوا تھا کہ شاہی جرگہ بلوچستان کے حال و مستقبل کا فیصلہ کرنے میں ایک فیصلہ کن عنصر ثابت ہوگا، بعد کے حالات نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔ آج لوگ اس بات پر حیران ہوتے ہوں گے کہ چالیس سال قبل ایک اجنبی شخص اس سوسائٹی میں کسی طرح گھل مل گیا تھا! میرے خیال میں اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ نسیم حجازی میر جعفر خان جمالی کے رفیق کار کی حیثیت سے متعارف ہوئے تھے اور دوسری وجہ ان کی ذاتی خوبیاں تھیں۔ بلوچستان میں نسیم حجازی کا اس قدر احترام کیا جاتا تھا کہ ۱۹۴۵ء میں جب نواب اسد اللہ خان رئیسانی کونسل آف سٹیٹ کے ممبر نامزد ہوئے تو انہوں نے پہلے اجلاس میں شمولیت کے ساتھ ہی نسیم حجازی کی رفاقت کو اپنی اہم ترین ضرورت قرار دیا اور بڑے اصرار کے بعد انہیں اپنے ساتھ دلی لے گئے۔"[۲]

یہی وجہ ہے کہ نسیم حجازی نے اپنی شخصیت اور قلم ہر دو محاذوں پر بلوچستان کے قبائلی مزاج لوگوں کو فتح کر لیا انہوں نے ضرورت کے مطابق ہر وہ کام کیا جو وقت کی ضرورت کہا جا سکتا ہے۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ کے جلسے میں قاضی عیسیٰ کی اشتعال انگیز تقریر نے بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت اور قبائلی سرداروں کو ذہنی اعتبار سے پراگندہ کر دیا حالات اس قدر خراب ہوئے کہ میر جعفر خان جمالی کی گرفتاری کے مطالبے ہونے لگے پھوٹ کی یہ کاروائی دشمنوں کے لیے مفید ہو سکتی تھی مگر اس موقع پر نسیم حجازی نے قبائلی سرداروں کے ہمراہ خان قلات کو مداخلت پر آمادہ کیا اور یوں انتشار سے بلوچ قبائل کو محفوظ رکھا ۳ جون کے اعلان کے بعد ہفت روزہ "تنظیم" تقریباً روزانہ ضمیمے کے طور پر شائع ہونے لگا یہ وہ دور تھا جب بلوچستان کی آزاد حیثیت کے علمبردار اور بلوچستان کو پاکستان میں شامل کروانے کے دعوے دار کھل کر میدان میں آ چکے تھے بالآخر شاہی جرگے نے پاکستان کے ساتھ شمولیت کا فیصلہ کیا مگر بعض آزاد ریاستوں نے ریاستوں کے الحاق کے بنیادی اصول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کانگریسی مفادات کے سامنے خود کو قابل فروخت مال کی طرح ڈال دیا اس موقع پر "تنظیم" اور نسیم حجازی کا کردار رہبری کرتا نظر آتا ہے بقول جہانگیر شاہ جوگیزئی:

"ماہ ستمبر میں ایک دن ہفت روزہ "تنظیم" میں ایک دھماکہ خیز خبر شائع ہوئی اور جو لوگ بلوچستان کی سیاست سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے انہیں یہ محسوس ہوا کہ افق کی تاریکیاں چھٹ رہی ہیں۔ خبر کا متن یہ تھا کہ میر حبیب اللہ خان نوشیروانی والئی خاران نے

---

[۱] نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۱۹۰۔

[۲] نسیم حجازی اور بلوچستان، نوابزادہ جہانگیر شاہ جوگیزئی مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۱۹۲۔

میر احمد یار خان آف قلات کی سیادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور ان سے مطالبہ کیا ہے کہ بلوچستانی ریاستوں کے مستقبل کے متعلق سمجھوتہ کرنے سے پہلے آپ پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کریں۔

جب نوکر شاہی کے کل پرزے حرکت میں آئے تو پتہ یہ چلا کہ گزشتہ رات والیٔ خاران نے بولان ہوٹل میں نسیم حجازی سے ملاقات کی تھی۔''[۱]

یہ اور ایسے ہی لاتعداد واقعات ایسے ہیں کہ جو نسیم حجازی کی شخصیت اور صحافت میں ان کے بلند مقام کو متعین کرنے اور آنے والوں کے لیے نشانِ راہ بننے کا باعث ہیں خود نسیم حجازی نے تحریک پاکستان کے اس دور کو یاد کرتے ہوئے بتایا:

''انتخابات کے دوران میں نے ''تنظیم'' کی ادارت کے ساتھ ساتھ سندھ کی انتخابی مہم میں جیکب آباد میں پبلسٹی کا کام بھی اپنے ذمہ لے لیا تھا اس کے ساتھ ہی پنجاب کے انتخابات میں اپنے ضلع گورداس پور کا دورہ کیا اور ایک ایک دن میں کئی کئی جلسوں کو خطاب کیا واپس آ کر میں نے پنجاب کے متعلق اپنے تاثرات پر مبنی جو رپورٹ قلمبند کی وہ نوے فیصد صحیح ثابت ہوئی۔''[۲]

ان تمام حالات اور روایات کی روشنی میں ''تنظیم'' کوئٹہ سے نسیم حجازی کی وابستگی کو وقت کی ضرورت، ملت کے اتحاد کی آواز اور صحافت میں ذمہ دار فرد کی حیثیت سے ان کی شمولیت صحافت کے مقاصد کی ترجمانی کہی جا سکتی ہے یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نسیم حجازی کے چند ابتدائی ناول اس دور میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکے تھے اگر ان کی شخصیت کو ناول نگار اور صحافی کی حیثیت سے یکجا کر کے دیکھا جائے تو وہ بلوچستان میں وہی کام کر رہے تھے جو پنجاب میں ''زمیندار'' کے ذریعے مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا نسیم حجازی نے اپنے ولولہ انگیز افکار و خیالات کو کبھی پوشیدہ نہیں رکھا جو ملت اسلامیہ کے اتحاد اور اسلام کی سربلندی کے لیے تھے انہوں نے اپنے ناول ''خاک و خون'' میں سلیم کے کردار کے ذریعے تحریک پاکستان میں اپنے روایتی کردار کی عکاسی پیش کی ہے تو دوسری طرف اس ناول کی کہانی کے ذریعے غیر مسلم قوتوں کی مسلم دشمنی کا پردہ چاک کیا ہے ساتھ ہی مسلمانوں کو خوابِ غفلت میں سوئے رہنے اور پھر تقسیم برصغیر کے وقت لاکھوں انسانوں کے تہہ تیغ کیے جانے کو محض ایک حادثہ نہیں بلکہ اپنی کاہلی اور لاپرواہی سے تعبیر کیا ہے اپنے ایک اور ناول ''گمشدہ قافلے'' میں یوسف کے کردار کے ذریعے بھی تحریک پاکستان کا ایک کارکن چلتا پھرتا نظر آتا ہے ان سب باتوں کے باوجود اگر نسیم حجازی کے تمام ناول ایک طرف رکھ دیے جائیں اور قیام پاکستان کے بعد ان کی صحافتی کارکردگی کو بھی بالائے طاق رکھ دیا جائے تو بھی ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ''تنظیم'' کے ذریعے انہوں نے جو کام کیا وہ تاریخ ساز ہی نہیں ایک تاریخی حقیقت بھی ہے۔

تقسیم برصغیر کے بعد بعض ریاستوں کے مسائل حل طلب رہے اور دیگر نے پاکستان یا ہندوستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا۔ بلوچستان کی آخری ریاست قلات نے بھی بادلِ نخواستہ پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کیا تو نسیم حجازی کو اپنا کام بلوچستان کی حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچتا محسوس ہوا اور یوں انہوں نے بلوچستان کو خیرباد کہا۔ راولپنڈی پہنچ کر روزنامہ ''تعمیر'' سے وابستگی اختیار کی جہاں کے

۱۔ نسیم حجازی اور بلوچستان، نوابزادہ جہانگیر شاہ جوگیزئی مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۲۰۰۔

۲۔ نسیم حجازی اپنے بارے میں کیا فرماتے ہیں مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۲۹۷۔

حالات میں گھٹن محسوس ہوئی عنایت اللہ کی ہمراہی اور حوصلہ مندی نے محدود سرمائے کے ساتھ اپنا اخبار نکالنے کی جانب رغبت دلائی اور یوں روز نامہ ''کوہستان'' جاری ہوا اس اخبار کی اہمیت ہر لحاظ سے منفرد ہے اگر یہ کہا جائے کہ ہر قسم کے موضوعات سے لے کر طباعت کے معیار تک پاکستان کی صحافتی تاریخ میں کوہستان ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اس اخبار کے ذریعے خبروں کے اعلیٰ معیار، ان کی نوعیت اور اہمیت کے علاوہ دیگر ایسے موضوعات جو عوام کے ہر شعبہ ہائے زندگی میں مقبول ہوئے شروع کیئے گئے ۔ مذہبی مسائل سے نفسیات تک ، کاروباری سے تفریحی تک اداریوں کی اعلیٰ زبان سے لے کر کارٹون کے ذریعے طنز و مزاح کے ہلکے پھلکے انداز تک ایسی کون سی جدت تھی جو اس اخبار نے اختیار نہ کی ہو پھر طباعت کے لیے آف سیٹ کا طریقہ رائج کیا اور ایک روز وہ آیا کہ یہ اخبار اشاعت کے اعتبار سے پاکستان کا سب سے بڑا اخبار بن گیا۔ مسائل و مصائب نے نسیم حجازی کے دامن کو ہمیشہ الجھائے رکھا جب یہ اخبار شہرت کی بلندیوں کو چھو رہا تھا عنایت اللہ کے ساتھ اختلافات نے ان کی علیٰحدگی کا راستہ ہموار کیا اور یوں کوہستان کی تمام تر ذمہ داریاں تنہا ان کے کاندھوں پر آ رہیں مگر انتہائی ثابت قدمی اور حوصلہ مندی سے مردانہ وار ان کا مقابلہ کیا تو اب کی بار پایہ ثبات میں لغزش ارباب حل وعقد کی جانب سے مداخلت کی صورت میں سامنے آئی اخبار کے اداریوں کے ذریعے ہونے والی نکتہ چینی حکومت کی آنکھ کو کھٹکنے لگی نواب کالا باغ نے چند مربع زمین دے کر آباؤ اجداد کے زراعت سے وابستہ پیشے کی طرف لوٹا کر قلم سے رشتہ توڑنے کی ناکام کوشش کی مگر انتہائی مضبوط اعصاب کا مالک زیادہ دیر تک حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ دیکھ سکا ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ چاہے حکمران اِن وقت اخبار بند کر دیتے نسیم حجازی کو اخبار جاری رکھنا چاہیے تھا مگر ہر انسان کی ہمت و جرأت کی ایک حد ہوتی ہے۔ مقتدر شخصیات کی خیرہ کن روشنی نے آنکھوں کے آگے اندھیرا کر دیا اور کوہستان کنونشن لیگ کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا دورِ ایوبی کے خاتمہ پر ایک بار پھر ''کوہستان'' سے ان کی وابستگی کا محدود دور آیا جو ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد اخبار کے خاتمے اور اخبار سے باضابطہ طور پر انکی وابستگی کے خاتمے پر منتج ہوا۔ اس دور میں ملک نئی جمہوری پُر اُمید راہوں پر گامزن ہوا چاہتا تھا لیکن شطرنج کے کھلاڑی مہروں کو اپنی چالوں کے مطابق ترتیب دے رہے تھے قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے کی اشد ضرورت تھی ان چہروں کو بے نقاب کرنے کی جو عوام دوست بن کر ایوان اقتدار تک آنا چاہتے تھے نسیم حجازی نے اس موقع پر بے شمار اداریے قلمبند کیئے مگر اپنے حال میں مست قوم نرم اور گرم بستر پر پڑی رہی انتخابات کا نتیجہ ملک کو دولخت کر گیا اور یہ صدمہ ایک ادیب کی حساس ذہنیت پر بجلی گرنے کے عمل کی مانند ہوا۔ ان کے ہاتھ شل ہو گئے ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا زبان گنگ ہو گئی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ایک طویل عرصے تک وہ کوئی کام نہ کر سکے جب حالات نے سنبھلنے کا موقع دیا تو اپنے ناول ''انسان اور دیوتا'' کے دیباچے میں مزید اضافہ کیا ماضی کی وہ تدبیریں یاد دلائیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہندو کی چھوت اچھوت والی ذہنیت سے چھٹکارا پایا تھا آستین میں پلنے والے اس سانپ کا تذکرہ کیا جو اپنے مالک ہی کو ڈس گیا لیکن ابھی وہ لمحہ نہیں آیا تھا کہ سب کچھ لٹ چکا ہو تمام راہیں مسدود نہیں ہوئیں تھیں ، گیدڑ اور لومڑیوں کی چالبازیوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی ان تمام امور کا جائزہ لینے کے بعد ان کا قلم سے اٹوٹ رشتہ قائم تو رہا مگر کسی

خاص اخبار سے ان کی مستقل وابستگی کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا تھا انہوں نے اپنی ناول نگاری پر توجہ مرکوز کی اب ان کے موضوعات آزادی کی قدر و قیمت بتانے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے وقف ہو چکے تھے۔ انہوں نے ماضی کے ایسے ہولناک واقعات اپنی قوم کے سامنے پیش کیے کہ جب آزادی کی راہ چھوڑ کر غلامی کا طوق ڈالا گیا تو پھر پناہ زمین کے اوپر نہیں زمین کے نیچے موت کی ابدی نیند سو جانے کی صورت میں ہی حاصل ہوتی تھی اندھیری رات کے مسافر اور ''کلیسا اور آگ'' اس سلسلے کی وہ کڑی ہیں جنہیں وقت کی ضرورت کے مطابق ناقابلِ فراموش حقیقت کے طور پر پیش کرنا نسیم حجازی کا عظیم کارنامہ ہے۔

نسیم حجازی نے بحیثیت صحافی اپنی ذمہ داریاں زیادہ تر دو اداروں کے لیے وقف کی تھیں ایک عظیم کارنامہ ''تنظیم'' کے ذریعے انجام دے چکے تھے تو اب ''کوہستان'' کے ذریعے ان کے کردار اور اردو صحافت میں ان کے مقام کو متعین کرنے کے لیے ہم ان کے احباب اور اہلِ علم و دانش کی رائے سے استفادہ کرتے ہیں۔ نسیم حجازی کے ایک رفیق کار عبدالقیوم قریشی اپنے تاثرات اس طرح بیان کرتے ہیں:

''نسیم صاحب کی صحافت، ادب، سیاست غرضیکہ پوری زندگی کے مقاصد وہی تھے جو انہوں نے اپنے مشہور ناول ''خاک و خون'' کے آخری حصے میں ''اے قوم'' کے عنوان سے کھل کر بیان کر دیئے ہیں۔ اس باب میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے بس وہ ایسا ہی پاکستان چاہتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ نسیم حجازی صاحب کی صحافت پر اُن کا ادب چھایا ہوا تھا اس لیے یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کا مقام بحیثیت صحافی کیا تھا اور بحیثیت ادیب کیا تھا جہاں تک اُن کے ادب کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں سید مودودی کا فرمانا حرفِ آخر ہے اُن سے کسی نے سوال کیا کہ نسیم حجازی کے ناولوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے تو سید صاحب نے جواب دیا کہ ان ناولوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُنھیں ایک مسلمان باپ اپنی مسلمان بچیوں کے سامنے بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے اور اُنھیں پڑھ کر سنا سکتا ہے۔

نسیم صاحب کے نزدیک مجاہد کا کردار بہت ارفع و اعلیٰ ہے اس لیے وہ پاکستان کے فوجی کا بہت احترام کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب کبھی فوجی آمریت پاکستان پر مسلط ہوئی تو نسیم صاحب کے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا تھا کہ اُنھیں بطور صحافی کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے ویسے بحیثیت مجموعی وہ ملک میں آمریت کا آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ ''کوہستان'' کی مقبولیت میں نسیم حجازی صاحب کا کردار بنیادی تھا اور جوں جوں ''کوہستان'' ترقی کرتا گیا نسیم صاحب کا مقام بحیثیت صحافی بلند ہوتا چلا گیا ایک وقت ایسا بھی تھا کہ ''کوہستان'' پاکستان کا واحد روزنامہ تھا جو بیک وقت تین مقامات (راولپنڈی، لاہور اور ملتان) سے شائع ہو رہا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر نسیم حجازی اور عنایت اللہ میں اختلافات نہ پیدا ہوتے اور وہ اپنی اپنی راہ چلنے پر مجبور نہ ہو جاتے تو ''کوہستان'' ترقی کی ایسی بلندیوں کو چھو لیتا کہ شاید اس تک پہنچنا کسی اور اخبار کی قسمت میں نہ ہوتا۔''[1]

---

[1] مکتوب عبدالقیوم قریشی: ۳۱ جولائی ۲۰۰۱ بنام راقم۔

ایک اور رائے اردو صحافت پر گہری نظر رکھنے والے ڈاکٹر مسکین علی حجازی کی ہے آپ شعبہ صحافت جامعہ پنجاب کے صدر رہے اس کے علاوہ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ نسیم حجازی کی زیر نگرانی کوہستان سے وابستہ رہے۔ نسیم حجازی کی صحافتی خدمات اور ان کے مقام کے حوالے سے آپ لکھتے ہیں:

۱۔ اخبار جاری کرنے کے اسباب ومحرکات کئی تھے۔ ایک تو پاکستان میں حالات کی نہج وہ نہیں تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ اس دور میں پاکستان میں ''ترقی پسندی'' کا غلغلہ تھا کئی اخبارات وجرائد ''ترقی پسندی'' صحافت کو فروغ دے رہے تھے۔ اُس دور میں ''ترقی پسندی'' کا معنیٰ اشتراکی نظریات سے اتفاق تھا۔ نسیم حجازی صاحب یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کے اساسی نظریہ کی ترویج و اشاعت کے لیے ایک مؤثر اخبار کی ضرورت ہے دوسری وجہ یہ تھی کہ اخبار کی کاروباری کامیابی کے لیے انہیں عنایت اللہ مرحوم جیسا ساتھی مل گیا تھا۔ کوہستان کی ابتدا راولپنڈی سے ہوئی لیکن اس نے زیادہ مقبولیت لاہور ایڈیشن جاری ہونے کے بعد حاصل کی۔ لاہور علم وادب اور صحافت کا بڑا مرکز تھا۔ پی پی ایل کے اخبارات دی پاکستان ٹائمز، امروز، لیل ونہار جو ترقی پسندی کے علمبردار تھے لاہور سے شائع ہوتے تھے اگرچہ نوائے وقت نظریاتی محاذ پر کام کر رہا تھا لیکن نسیم حجازی صاحب اپنی مرضی سے اپنے انداز میں کام کرنے کے عادی تھے۔

۲۔ اخبار کی کامیابی کا ثبوت اس کی ''مقبولیت'' کو سمجھا جاتا ہے لیکن مقبولیت سے مراد صرف زیادہ اشاعت نہیں کیونکہ اشاعت زرد صحافت کے علمبردار اخباروں کی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور میں ''امروز'' ایک نئے رجحان کا سبب بنا لیکن یہ زیادہ تر ترقی پسندی سے مختص ہوگیا۔ کوہستان نے ایسی مقبول عام صحافت کی طرح ڈالی جس میں پاکستانی عوامیت غالب تھی۔ سنسنی خیزی بھی نہیں تھی اور صرف خواص کی نمائندہ بھی نہیں تھا۔ کوہستان نے جو نیا انداز دیا وہ مقبول ہوتا گیا۔ بعد ازاں مشرق نے بھی اسی رجحان کو آگے بڑھایا اور پھر سارے اُردو اخبارات نے کسی نہ کسی حد تک یہی انداز اپنالیا۔

۳۔ کوہستان میں حافظ مظہر الدین مستقلاً دینی کام لکھتے تھے۔ بعد ازاں یہ کالم ہر اخبار نے کسی نہ کسی طرح اپنایا اور اسے جاری رکھا۔ اب صحافت پر بڑی حد تک کمرشلزم غالب آچکی ہے لیکن پھر بھی حالت یہ ہے کہ انگریزی اخبار بھی ہفتہ وار دینی صفحہ شائع کرتے ہیں اور اُردو اخبارات بھی اصل میں زمانہ بدلنے سے بہت کچھ بدلتا ہے یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک دور کی صحافت یا ادب یا فلسفہ کے نمایاں خدوخال دوسرے ادوار میں برقرار ہیں تاہم آج بھی وہ تمام صحافی جو ''نظریۂ پاکستان'' اور ''پاکستانیت'' پر ایمان رکھتے ہیں ان کو ہر کوئی جانتا ہے۔

۴۔ کسی انسان کی زندگی میں اس کی عظمت کا اعتراف ہمارے یہاں نہیں ہوتا۔ بقول احمد ندیم قاسمی

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن ۔۔۔ یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

''معاصرت'' ایک حقیقت ہے۔ ادب میں بھی نسیم حجازی کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ ادب میں گروہ بندی ہوئی صحافت میں بھی ہوئی۔ آج

بھی وہی صورت ہے اخبارات کے اپنے اپنے دھڑے ہیں۔ لوگوں کے اطمینان کو ناپنے کا پیمانہ ایک ہی ہے کہ وہ جس اخبار کو پسند کریں اسے پڑھیں جس صحافی کو پسند کریں اس کی تحریریں پڑھیں۔ کوہستان اشاعت کے لحاظ سے کامیاب تھا۔

۵۔ نسیم حجازی صاحب بنیادی طور پر ناول نگار تھے۔ صحافت کے میدان میں وہ ضرورتاً آئے تھے۔ بلوچستان میں تحریک پاکستان کے دوران ''تنظیم'' کے ذریعے انہوں نے ابلاغی محاذ پر شاندار خدمات انجام دیں پھر ان کا اخبار ''کوہستان'' اس قدر مقبول اور مؤثر تھا کہ حکومتِ وقت کے دباؤ کے تحت اسے حکومتی جماعت کے حوالے کرنا پڑا۔ اخبار لمیٹڈ کمپنی کا تھا ان کا ذاتی نہیں۔

صحافت میں وہ صاحبِ طرز صاحب دل اور صاحب دفاع صحافی تھے اگر ان کا اخبار زندہ رہتا تو ان کی وفات کے بعد ان کے یوم منائے جاتے خصوصی ایڈیشن چھپتے ان کی عظمت کی بے اندازہ تشہیر ہوتی۔

پاکستان میں جو صحافی بھی نظریہ پاکستان پر یقین رکھتا ہے اسلام کی حقانیت کو جانتا ہے اور پھر لکھتا ہے۔ وہ نسیم حجازی کا جانشین ہے لیکن نسیم حجازی کا اسلوب اپنا تھا۔ آج کے صحافیوں کے اسلوب اپنے نہیں۔''[۱]

صحافت، مشاہدات کے ذریعے انسان کو مستقبل کے ایسے تصوراتی رجحانات کی پیش گو بنا دیتی ہے کہ بظاہر اس کی باتیں بے وزن، بے جان اور بڑی بے کیف معلوم ہوتی ہیں مگر مستقبل پر اس کی نظر آنے والے وقت کا اس طرح احاطہ کرتی ہے کہ لوگ حیران و ششدر رہ جاتے ہیں قیام پاکستان کے بعد جب ملک کو ''ون یونٹ'' بنایا جا رہا تھا اور ابھی اس راز کی بھنک تک نہ ملی تھی نسیم حجازی نے محلاتی سازشوں کو محسوس کرتے ہوئے اس موضوع پر خوب خوب لکھا اس زمانے کی یادوں کا احاطہ کرتے ہوئے ذوق اختر سواتی رقمطراز ہیں:

''نسیم حجازی صاحب نے مجھے بتایا کہ آج ایسی بات ذہن میں آ رہی ہے جو چند سال بعد ہر باشعور پاکستانی کی زبان پر ہوگی اور وہ یہ ہے کہ مغربی پاکستان کو ایک یونٹ بنا دیا جائے اس وقت یہ بات عجیب اور انہونی سی معلوم ہوتی تھی لیکن ۱۹۵۲ء میں جب نسیم حجازی کی ادارت میں راولپنڈی سے روزنامہ کوہستان کا اجراء ہوا اور ایک سال بعد انہوں نے ایک یونٹ کے قیام کے متعلق سلسلہ وار مضامین شروع کیے تو لوگوں کو یہ بات قابلِ یقین معلوم ہونے لگی۔ صوبہ سرحد میں ''ون یونٹ'' تحریک کا بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان تک پہنچ گئی اس زمانہ میں نسیم حجازی کے نزدیک ''ون یونٹ'' سے زیادہ اہم اور کوئی مسئلہ نہ تھا۔''[۲]

اس کے بعد انہوں نے جس معاملے پر توجہ دی اس کے بارے میں آگے جا کر سواتی صاحب نے لکھا ہے کہ:

''موصوف (نسیم حجازی) نے روزنامہ کوہستان کے یکے بعد دیگرے دو اداریوں میں یہ خدشہ ظاہر کیا کہ بعض ایسے سیاستدان جن کے نامۂ اعمال میں قوم کی کوئی بھلائی نہیں یہ کوشش کریں گے کہ ون یونٹ کی اسمبلی براہ راست انتخابات کے ذریعہ معرضِ وجود میں آئے

۱۔ مکتوب ڈاکٹر مسکین علی حجازی، ۳۰ مئی ۲۰۰۲ء بنام راقم۔

۲۔ جناب نسیم حجازی کے ساتھ وابستہ چند تاریخی یادیں از ذوق اختر سواتی مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ: ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۲۰۲۔

یعنی سابق صوبائی اسمبلیوں کے نمائندے ون یونٹ اسمبلی کے ووٹر تصور کیے جائیں۔''[۱]

صحافی کی حیثیت سے نسیم حجازی کا مقام متعین کرنے کے لیے اُن کے اس سیاسی شعور کو مدنظر رکھنا ہوگا جو اخباری تجزیوں تک محدود نہ تھا بلکہ عملی طور پر سیاستدانوں سے ملاقاتیں کر کے ملک کو تباہی کے دوراہے سے واپس لانے کے لیے کوشاں رہتے تھے جب سکندر مرزا نے غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر مطلق العنان حکمران بننا چاہا تو انہوں نے اس وقت کے وزیر صحت خداداد خان کو آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ علم بغاوت بلند کریں خواہ اس کے نتیجے میں کوہستان اور خود ان پر کیسے بھی مظالم توڑے جائیں کیونکہ ملک کی سالمیت اور سیاسی آزادی انہیں ہر سزا سے بہتر معلوم ہوتی تھی اس سلسلے میں انہوں نے ملک کے اہم سیاسی رہنماؤں کو یکجا کرنے کی جو کوشش کی تھی اس کا حال ذوق اختر سواتی نے یوں بیان کیا ہے:

''خان عبدالقیوم خان جن کے تیس تیس میل لمبے جلوس نکلا کرتے تھے ایبٹ آباد تشریف لائے گوہر امان جدون کی قیام گاہ پر ٹھہرے۔ نسیم صاحب نے ان سے ملاقات کی اور ان سے چند منٹ علیحدگی میں گفتگو کی، اس گفتگو کا نتیجہ یہ تھا کہ خان عبدالقیوم فوراً مولانا مودودی اور چوہدری محمد علی مرحوم سے ملاقات کرنے پر آمادہ ہو گئے ان دنوں ان کی ملاقات بہت اہم تھی یہ ملاقات جسٹس عطاء اللہ صاحب کے مکان پر لاہور میں ہوئی تھی جہاں نسیم ٹھہرا کرتے تھے لیکن رازداری کا یہ عالم تھا کہ اپنے اخبار کوہستان تک میں کوئی خبر یا تبصرہ نہ چھپا۔ اس میٹنگ میں تینوں متذکرہ راہنماؤں نے سکندر مرزا کی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا تھا اگلے روز مولانا مودودی مرحوم نے ایک ڈرافٹ تیار کر کے نسیم حجازی کے سپرد کرنا تھا تاکہ وہ سب کے دستخط لینے کے بعد پریس کو دے دیں لیکن رات بارہ بجے نسیم حجازی کو دفتر کوہستان سے فون آیا کہ سکندر مرزا نے مارشل لاء لگا دیا ہے میں اکثر یہ سوچا کرتا ہوں کہ اگر یہ میٹنگ چار دن پہلے ہو جاتی تو شاید اس ملک کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔''[۲]

ہم نے نسیم حجازی کی صحافتی زندگی کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اس کوشش کے سلسلے میں میں نے خود ۷ جولائی ۱۹۹۲ء کو نسیم حجازی صاحب سے ملاقات کی تقریباً ایسے ہی حالات کا تذکرہ انہوں نے اپنے طویل ترین انٹرویو میں مجھ سے کیا جو آج بھی کیسٹوں کی صورت میں میرے پاس محفوظ ہے۔ نسیم حجازی صاحب جب اس دور کو یاد کرتے تھے کہ جب وہ بلوچستان میں مقیم تھے تو مسلم لیگ کی کارکردگی پر حرف شکایت لاتے ہوئے فرماتے تھے کہ میں نے محسوس کیا تھا کہ کشتی اپنی منزل کی طرف رواں دواں نہیں اور رہے مسافر تو وہ منزل اور چپو چلانے والوں دونوں سے لاتعلق ہیں میں نے تنظیم کے ذریعے میر جعفر خان جمالی کے خاندان اور ان کی وساطت سے دوسرے قبائلی سرداروں کو تنظیم کا قاری بنایا ساتھ ہی ذاتی مراسم پیدا کئے اور پھر وقتاً فوقتاً تحریک پاکستان اور تقسیم برصغیر میں اپنے کردار کو خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کی قاضی عیسیٰ نے جو آگ لگائی تھی نہ صرف اسے بجھایا بلکہ اس راکھ کو بھی دریا برد کرنے کی کوشش کی جو اس آتش زدگی کی صورت میں پیدا ہوئی تھی میرے لیے زندگی کا خوشگوار ترین دن وہ تھا جب شاہی جرگہ کے اجلاس میں

---

[۱] جناب نسیم حجازی کے ساتھ وابستہ چند تاریخی یادیں؛ ذوق اختر سواتی مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۲۰۲۔

[۲] ایضاً، ص ۲۰۸۔

محمد خان جوگیزئی نے اے جی جی کو حیران کرتے ہوئے جرگے کے فیصلے سے مطلع کیا اور میں سکون سے سو گیا اور جب قلات کی ریاست کا فیصلہ ہو گیا تو میں نے بلوچستان کو خیر باد کہا۔ راولپنڈی آکر پہلے روزنامہ تعمیر سے وابستہ رہا اور پھر روزنامہ کوہستان نکالا۔ اخبار نکالنا اور اسے چلانا محض ایک کاروباری ضرورت ہوتی تو میں بھی میر خلیل الرحمٰن کی طرح ایک کامیاب انسان ہوتا مگر میرا مقصد حیات پاکستان کو استحکام بخشنا، عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنا اور ملک دشمن عناصر کو بے نقاب کرنا تھا میں نے کبھی حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا اپنی ڈگر پر چلتا رہا نواب کالا باغ نے کئی مربع زمینیں دے کر میرا قلم چھیننے کی کوشش کی اس موقع پر نواب صاحب نے مجھ سے کہا تھا تمھارے آباؤ اجداد زراعت سے وابستہ تھے اور تم کیسے آرائیں ہو کہ انعام میں ملنے والی زمینوں سے خوش نہیں میں نے جواب دیا یہ انعام تو نہیں ایک سزا ہے کیونکہ آپ میرے اس کام سے خوش نہیں جو بحیثیت صحافی میں کر رہا ہوں اگر ہم ان تمام حالات کو مدنظر رکھیں تو یہ بات سمجھنا خاصا آسان ہو جاتا ہے کہ نسیم حجازی کیوں کوہستان سے الگ ہوئے ہوں گے حالانکہ ان جیسے مرد مجاہد اور جوشیلے مرد سے جو اپنے ناول کے کرداروں کے ذریعے ولولہ انگیزی اور ثابت قدمی کا درس دیتا ہے ان حالات میں کیوں نہ ڈٹا رہا یہاں تک کہ اسے قید کر لیا جاتا یا زبردستی اخبار سے نکال دیا جاتا یہ سوال" میں نے ۲۲ مئی ۲۰۰۲ء کو ان کے بڑے بیٹے خالد نسیم حجازی"[1] سے انٹرویو کرتے ہوئے ان کے سامنے رکھا وہ بھی اس کا جواب نہ دے سکے۔ میں نے جب نسیم حجازی کا انٹرویو کیا تھا تو ان سے یہ سوال کیا کہ" آپ نے صحافت کے شعبے میں جو روایات اور قدریں قائم کی تھیں کیا آج اُن پر کوئی گامزن ہے؟" تو اُن کا جواب تھا کہ" میں تکبیر کے مدیر صلاح الدین کو اپنا جانشین سمجھتا ہوں"[2] افسوس اُن کا یہ جانشین زیادہ عرصے جانبر نہ رہ سکا اسکے قلم کی حرمت اُس وقت تک نہ چھینی جا سکی جب تک اس کی زبان خاموش نہ کر دی گئی۔ نسیم حجازی نے مدیر "تکبیر" کی عظمت کا تو اعتراف کر لیا مگر ہر شخص کے ذاتی اعمال اس کے حساب میں لکھے جائیں گے۔ نسیم حجازی اُردو صحافت کا وہ عظیم سرمایہ ہیں جس نے حق و صداقت کا علمبردار ہوتے ہوئے کٹھن اور مشکل حالات میں ثابت قدمی اختیار کی وہ مسائل کا ادراک کرتے ہوئے ان کا تعاقب کرتے تھے یہ الگ بات کہ ان کی یہ حق گوئی اور بے باکی بے اثر اور بے نتیجہ ثابت ہوئی وقت کا مؤرخ ان کے کردار کا احاطہ کر سکتا ہے اثرات یا شعوری تبدیلی کسی کے اختیار میں نہیں مگر آنے والے زمانے میں جب بھی نسیم حجازی کا صحافتی مقام متعین کیا جائے گا تو وہ ایک بلند قامت صحافی نظر آئیں گے۔

---

[1] انٹرویو خالد نسیم حجازی، ۲۲ مئی ۲۰۰۲ء، مملوکہ راقم۔

[2] انٹرویو نسیم حجازی ۱۹۹۲ء، مملوکہ راقم۔

باب چہارم

نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری کا تحقیقی تجزیہ

ناول اور تاریخ کی ہم آہنگی

اردو ادب میں دوسری اصناف کی طرح ناول بھی بیسویں صدی کی ابتدا سے شہرت عام پا رہا تھا لیکن ابھی بقائے دوام کی منزل کچھ دور تھی اور بالخصوص تاریخی ناول نگاری کے حوالے سے اس کا بانی پیدا ہو چکا تھا اور اپنے ناولوں کی داد و تحسین بھی پا چکا تھا لیکن وہ منزل جسے بقائے دوام کہا جا سکتا ہے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں منظرِ عام پر آئی۔ یہ شخصیت محمد شریف نسیم حجازی کی تھی جو اردو صحافت کے حوالے سے اپنا ایک مستند مقام بنا چکے تھے اور تحریک پاکستان کے ایک کارکن کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کو پیش کر رہے تھے اب انہوں نے صنفِ ناول میں قدم رکھا۔ اُن کا مقصد اسلام کے تابندہ دور کے زوال یافتہ ایام کی یاد دہانی کرانا تھا اور ساتھ ہی اتحاد و قوت کا وہ سبق جسے امت مسلمہ بُھلا چکی تھی ذہن نشین کرانا تھا۔ پھر اس زوال یافتہ معاشرے میں جسے تاریخی بھول بھلیوں سے تلاش کر کے وہ ناول کے صفحات پر پیش کر رہے تھے نوجوانوں کے لئے ایک درس پوشیدہ تھا کہ کوئی بھی قوم اسی وقت تک اپنی شناخت اور اہمیت باقی رکھ سکتی ہے کہ جب تک اس کے خون میں وہ حرارت موجود ہو جو پلٹنے، جھپٹنے اور جھپٹ کر پلٹنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ بظاہر یہ خون گرم رکھنے کا بہانہ ہے لیکن اسکا مقصد متحرک رہنا ہے اور پھر دفاعی اعتبار سے ہر لمحے تیاری کی حالت اپنے دشمن کو حملہ کرنے سے روکنے کا باعث ہوا کرتی ہے کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے اور قرآن کریم کی سورۂ نساء میں یوں ارشاد ہوا:

''اے نبیؐ، جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالت جنگ میں) انہیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنا اسلحہ لیے رہے، پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آ کر تمھارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنا اسلحہ لیے رہے کیونکہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو وہ یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔''[1]

اس ارشادِ ربانی کی روشنی میں مسلمانوں میں اتحاد کے ساتھ ساتھ خود کو حالتِ جنگ یا جہاد کے لئے تیار رہنے کا حکم ہے اور پھر اس حکم کا مقصد مسلمانوں کی بقا اور دشمنوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا کر اللہ کے حکم کی سربلندی کرنا ہے جب بھی مسلمانوں نے فتوحات حاصل کرنے کے بعد اپنے اس مشن کو فراموش کیا ذلیل و رسوا ہوئے۔ اس دور میں جب نسیم حجازی ناول رقم کر رہے تھے تحریکِ پاکستان اپنے آخری مرحلے میں قدم رکھ چکی تھی۔ اس موقع پر سفاک و عیار دشمن سے ہوشیار رہنے اور آزادی ملنے کے بعد اس سے محفوظ رہنے کے لئے حکمتِ عملی کے طور پر نسیم حجازی نے یہ انداز اختیار کیا۔ ماضی کے وہ واقعات جو مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے زوال کے

---

[1] قرآن مجید، ترجمہ سید ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۲۶۱۔

عکاس تھے اپنی قوم کے سامنے پیش کر دیے۔

اگر ہم ناول کی تعریف کو اپنے سامنے رکھیں اور پھر تاریخی ناول کی ضرورت کو تسلیم کر لیں تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ نسیم حجازی کے یہاں ناول اور تاریخ کے درمیان ہم آہنگی موجود ہے کیونکہ ناول کی بنا ڈالتے ہوئے رابنسن کروسو کے غیر فانی مصنف ڈینیل ڈفو نے کہا:

''قصہ گو کو حقیقت نگار ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اُسے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دینا چاہیے۔''[۱]

اس تعریف میں مزید اضافہ پولینڈ کا رہنے والا اور انگریزی میں ناول لکھنے والا کانریڈ ان الفاظ میں کرتا ہے:

''ایک ناول اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہمیں اس کے ذریعے دوسرے انسانوں کے وجود کا یقین آ جاتا ہے اور اس یقین میں اتنی شدت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم اُسے تخیلی جامہ دے کر حقیقت سے بھی زیادہ واضح بنا دیتے ہیں۔''[۲]

اس تعریف کے ساتھ تاریخ کی تعریف کو بھی دیکھیے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں تاریخ کی اصطلاح کو اس طرح واضح کیا گیا:

''تاریخ کی اصطلاح دو صورتوں میں مستعمل ہے: اول، ان افعال و واقعات کا بیان جو نوعِ انسان یا کسی قوم یا ملک کے زمانۂ ماضی کو مشخص کرتے ہیں؛ دوم، مذکورہ افعال و واقعات کا تجزیہ، نیز یہ کہ یہ افعال و واقعات کیوں اور کیسے وقوع پذیر ہوئے اور نتیجہ کیا ہے۔ تاریخ میں سیاسی، معاشرتی اور فکری زندگی کے ماحول کا انعکاس بھی ہوتا ہے اور روزمرہ زندگی کے ماحول پر تنقید و تبصرہ بھی۔ اس میں وہ جغرافیائی حالات بھی آ جاتے ہیں جو عوام یا حکومت کے کاروبار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔''[۳]

ناول اور تاریخ کی ان تعریفوں کی روشنی میں تاریخی ناول نگاری کی گنجائش موجود ہے یعنی ماضی کے واقعات، تاریخی کردار اپنے حقیقی روپ میں زمانی تصرف کے بغیر لیکن تخیل کے ساتھ پیش کیے جا سکتے ہیں اور ناول نگار کی احتیاط پسندی تاریخ میں کسی تصرف سے بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔ اسے قاری کے لئے وہ مقصد بھی پیش کرنا آنا چاہیے جو اس کے نزدیک ضروری ہو۔ اس طرح تاریخی ناول نہ صرف قاری کے لئے دلچسپ ہوگا بلکہ ناقدین کے ہونٹ بھی سی دے گا انہی خوبیوں کے ساتھ اگر نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری کا جائزہ لیں تو وہ ہمیں ایک کامیاب لکھاری کے روپ میں نظر آتے ہیں۔

داستانِ مجاہد میں تاریخ اسلام کی پہلی صدی ہجری کے ربع آخر سے دوسری صدی ہجری کے ابتدائی عہد کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ تاریخ اسلام کے اہم کردار عبدالملک بن مروان، حجاج بن یوسف، قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد اور سلیمان بن عبدالملک شامل ہیں۔ ناول کا پلاٹ متوازن ہے۔ تجسس قاری کی دلچسپی کی خاطر جا بجا موجود ہے۔ کردار نگاری موزوں انداز میں ہے۔ ناول کے پلاٹ میں جس کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے اس کے لئے تخیلاتی کردار پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں عشق و محبت، جذبۂ

---

[۱] ناول اور ناول نگار، علی عباس حسینی، ص ۹۔

[۲] ایضاً، ص ۱۲۔

[۳] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ص ۱۸۹۔

جہاد اور ایثار و قربانی کو مقدم روپ میں پیش کیا گیا ہے اگر خطیبانہ انداز کچھ کم ہوتا تو ناول مزید دلچسپ ہو سکتا تھا اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر ایس۔ ایم زمان رقمطراز ہیں:

''داستان مجاہد کی کہانی تاریخی واقعات کی روشنی میں آگے بڑھتی ہے۔ اس میں مصنف نے اس اہم دور کو لیا ہے جب عرب فوجیں بیک وقت شمال میں افریقہ، مغرب میں اسپین، شمال میں وسطی ایشیا اور مشرق میں سندھ (جو ہندوستان میں داخل ہونے کے لئے صدر دروازے کا کام دیتا تھا) کی طرف اسلامی جھنڈے تلے بڑھ رہی تھیں۔''[1]

اب اگر ناول کی تعریف کے معیار پر رکھ کر اس ناول کا جائزہ لیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''وہ زندگی کے کسی خاص پہلو یا نقطۂ نظر کی وضاحت ہے اور اس کی فنا و بقا اسی وضاحت کی اہمیت پر مبنی ہے۔ ایک اچھا لکھا ہوا ناول اپنے مقصد و غرض کو اپنے ہر باب، ہر صفحے اور ہر جملے سے پکارتا اور دہراتا ہے۔'' اور یہ سب کچھ اس ناول میں موجود ہے۔ پھر تاریخی کردار اور ان کا زمانہ بھی بالکل درست دکھایا گیا ہے یوں تاریخ کو مسخ نہیں کیا گیا جو ناول اور تاریخ کے امتزاج کا ایک حسین روپ بن کر دل پر ثبت ہو جاتا ہے۔

اُن کا دوسرا ناول محمد بن قاسم ہے جو اپنے نام ہی سے مضمون کا احاطہ کرتا ہے۔ پہلے ناول میں کئی فاتحین بیک وقت دکھائے گئے تھے جبکہ اس ناول میں صرف ایک فاتح سندھ کی جانب توجہ مبذول کی گئی بقول نسیم حجازی اُن کے کرم فرماؤں کا مطالبہ یہی تھا اس لئے انہوں نے ان کی خواہش کی تکمیل کی۔ اس ناول میں بھی تاریخی کردار محمد بن قاسم، حجاج بن یوسف، سلیمان بن عبدالملک اور راجا داہر وغیرہ بالکل درست کردار ہیں جبکہ تاریخی اعتبار سے زمانہ بھی تقریباً وہی دکھایا گیا ہے البتہ ناول کی ابتدا کے لئے ناہید کے کردار کی تخلیق کی گئی جسکی پکار پر اسلامی افواج دیبل کی طرف بڑھیں اور پھر زبیر کا کردار جو نہایت باہمت، سخت جان اور بہترین دوست کے روپ میں پیش کیا گیا ہے ساتھ ہی صالح کا انتقامی کردار ہے۔ کہانی ابتدا میں عرب سے دور سیلون سے شروع ہوتی ہے۔ پھر محمد بن قاسم کی تربیت اور اس کی جرأت و شجاعت کے وہ قصے جو اسے کم عمری میں سپہ سالار بنا گئے مربوط کئے گئے ہیں۔ کہانی کا تسلسل نہایت دلچسپی کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اگر ناول اور تاریخ کی ہم آہنگی کو مربوط کر کے دیکھنا ہو تو اس ناول میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے بلا شک و شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نسیم حجازی ناول اور تاریخ کو ہم آہنگ کرنے کا سلیقہ جانتے تھے۔

نسیم حجازی کے ابتدائی ناولوں میں ''آخری چٹان'' بھی شامل ہے۔ جس میں تاریخی کردار کے طور پر چنگیز خاں، ہلاکو خان اور جلال الدین خوارزم شاہ کو ایک دوسرے سے نبرد آزما دکھایا گیا ہے حالانکہ یہ عہد آخری خلیفہ عباسی کا ہے کہ جب اہل بغداد مناظرے بازی اور غیر اسلامی رسومات میں گھر چکے تھے اور حکمران تعیش اور بے پرواہی کے دلدل میں دھنسے جا رہے تھے۔ دوسری طرف چنگیز خاں کی وحشت و بربریت اپنے عروج پر تھی ان حالات میں کہ جب مسلمان اتحاد سے بہت دور ٹکڑیوں میں بٹ چکے تھے جلال الدین خوارزم شاہ کا عزم و حوصلہ بھی اتحاد کی کمی کی بدولت نا امیدی میں تبدیل ہو جاتا ہے اکثر مواقع پر جنگی مناظر اور وحشت و بربریت کی

---

[1] نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ؛ ڈاکٹر ایس۔ ایم زمان مرتبہ؛ ڈاکٹر تصدق حسین راجا ص ۱۲۵۔

تصویر کشی کی گئی ہے ڈاکٹر وقار عظیم اس ناول کے بارے میں یوں رائے دیتے ہیں:

''آخری چٹان میں فن اور اسلوب، کے اعتبار سے خطابت اور ادبیت کا امتزاج ہے۔ ناول کے واقعات آہستہ آہستہ ابھرتے اور نقطۂ عروج تک پہنچتے پہنچتے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ لفظوں، فقروں اور جملوں کی ترتیب بھی موزوں ہے۔ ناول کے بعض حصوں میں لفظوں کا سیلاب پڑھنے والوں کو اپنے ساتھ بہاتا ہوا لے جاتا ہے۔ عبارت کی ڈرامائی ساخت میں بھی عموماً یکسانی اور ہمواری ہے۔ کہانی میں تبلیغی احساس کی لہر کہیں کہیں اٹھتی ہے لیکن ادبیت برابر اس کی عناں گیر رہتی ہے۔ کرداروں کے نقش واضح ہیں اور ان کی گفتگو میں اختصار و اعجاز اور مصنوعی گہرائی ہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ مصنف نے کہانی کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے ہر چیز کو اسکی مناسب حیثیت دی ہے۔''[1]

یعنی ناول کے فنی تقاضوں اور تاریخی ناول کے اصولوں کے عین مطابق اس ناول کا پلاٹ اور کہانی چلتی ہے ہمارا یہ موضوع (ناول اور تاریخ کی ہم آہنگی) ابتدائی نوعیت کا ہے اس لئے ہم اس کو مختصر کرتے ہوئے دیگر ناولوں کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں ان میں بھی ناول اور تاریخ کی ہم آہنگی موجود ہے مثال کے طور پر ''انسان اور دیوتا'' ہندو معاشرے کی تاریخی اور معاشرتی کیفیت کا اظہار ہے۔ اس ناول میں ہندو دھرم کے نام پر ذات پات کا نظام اور اچھوتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ ''شاہین'' غرناطہ مسلمانوں سے چھن جانے کی داستان کا المناک باب ہے۔ اسپین میں مسلمانوں کی فرقہ بندی انہیں اس ملک سے نکال دیئے یا قتل ہو جانے کا باعث بنی۔ تاریخ کا یہ عہد اُن کرداروں کی بدولت جو اس ناول میں چلتے پھرتے دکھائے گئے ہیں زندہ و جاوید ہو گیا ہے۔

''خاک اور خون'' یوں تو فسادات کے موضوع پر لکھا جانے والا ناول ہے لیکن اس کا پلاٹ اس قدر مربوط اور دلنشین ہے کہ اس کے کردار جیتے جاگتے نظر آتے ہیں حالانکہ یہ تخیلاتی کردار ہیں اور کرداروں کی سوچ اور فکر کے ذریعے ایک سبق دیا گیا ہے۔ ہندوستانی معاشرے سے تعلق رکھنے والے ناولوں میں ''آخری معرکہ'' ناول اور تاریخ کی ہم آہنگی کا منہ بولتا ثبوت ہے جس میں محمود غزنوی کی فتوحات کے ساتھ ساتھ ہندو عقائد کی قلعی کھولی گئی ہے اسی معاشرت سے متعلق ناول ''معظم علی'' جس میں ہندوستان کے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے تاریخی واقعات خوبصورت پیرائے میں مرقوم ہیں۔ کہانی دلچسپ ہے جو کسی لمحے قاری کو عدم توجہی کا شکار نہیں ہونے دیتی۔ اسی تسلسل کا اگلا ناول ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' ہے جس میں ٹیپو سلطان کی دلیری اور شجاعت کے ساتھ ساتھ ان سازشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو ہندوستان میں مسلم حکومتوں کے خاتمے اور انگریزوں کی پروردہ حکومتوں کے قیام کا باعث بنی۔ یوں تو نسیم حجازی کے دیگر کئی ناول ہیں لیکن ہم ''اندھیری رات کے مسافر'' کا تذکرہ کرتے ہیں جو بظاہر اسپین میں مسلمانوں کے اقتدار کے خاتمے کے بعد اُن حالات کا مرثیہ ہے جو کلمہ گویانِ حق پر گزری کس طرح قتل و غارت گری کی گئی، تبدیلی مذہب کا دباؤ اور ملک سے نکل

---

[1] داستان سے افسانے تک، وقار عظیم، ص ۹۵۔

جانے کے احکامات۔ لیکن یہ ناول سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں لکھا گیا تھا اوران کیفیات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو کہتے تھے کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا اِلٰہ اِلا اللہ۔

مذکورہ ناولوں، اُن کے موضوعات اوران میں موجود ناول کی خوبیاں اورتاریخی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے تاریخی ناول کی اصطلاح کے مطابق نسیم حجازی کو اردو کی تاریخی ناول نگاری کا اہم ستون سمجھنا چاہیے اور یہ بھی کہ ان کے قلم کو ناول اور تاریخ کو ہم آہنگ کرنے کا سلیقہ آتا تھا یہی وجہ قارئین میں ان کی مقبولیت اور ناقدین کو خاموش کرنے کا باعث ہوئی۔ سید وقار عظیم، ڈاکٹر ایس۔ ایم زمان اور ڈاکٹر تصدق راجا اُن کی ناول نگاری کے معترف ہیں۔

داستانِ مجاہد کا تحقیقی جائزہ

داستانِ مجاہد:

نسیم حجازی کا پہلا تاریخی ناول ہے جو ۱۹۴۳ء میں شائع ہو کر منصۂ شہود پر آیا۔ اس زمانے میں نسیم حجازی کوئٹہ میں مقیم تھے ان کی شہرت محمد شریف کے نام اور صحافت کے شعبے کی بدولت تھی۔ وہ اپنے دورِ طالب علمی میں ایک افسانہ ''شودر'' کے نام سے قلمبند کر چکے تھے اس لئے چاہتے تو یہ تھے کہ پہلے ہندو تہذیب کے حوالے سے کچھ قلمبند کیا جائے مگر عصری تقاضوں کے پیشِ نظر داستانِ مجاہد کو پہلے مرتب کیا۔ اوائل عمری سے تاریخ سے دلچسپی تھی اور شبلی کی اکثر کتب کا مطالعہ کر چکے تھے اس لئے تاریخ کے موضوعات کو اپنایا۔ خود بھی داستانِ مجاہد کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں:

''میں کسی ایک پھول کی تلاش میں ایک ایسی سرسبز و شاداب وادی میں پہنچ چکا تھا جس کی آغوش میں رنگا رنگ پھول مہک رہے تھے۔ دیر تک میری نگاہیں اس دلفریب وادی میں بھٹکتی رہیں اور میرے ہاتھ ایک پھول کے بعد دوسرے پھول کی طرف بڑھتے رہے۔ میں نے رنگا رنگ پھولوں سے اپنا دامن بھر لیا۔ آج میں ان پھولوں کو ایک گلدستے کی صورت میں پیش کر رہا ہوں اگر اس گلدستے کو دیکھ کر ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں اس وادی کی سیاحت کا شوق اور اپنے خزاں رسیدہ چمن کو اس وادی کی طرح سرسبز و شاداب بنانے کی آرزو پیدا ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ مجھے اپنی محنت کا پھل مل گیا۔'' اسی تصور کو جمع خاطر رکھ کر نسیم حجازی نے اپنا پہلا ناول قارئین کے سامنے پیش کیا جسے عوام و خواص ہر دو حلقوں میں پذیرائی ملی جس کی بدولت ان کے دیگر ناول منظرِ عام پر آنے لگے اور یوں اردو کی تاریخی ناول نگاری میں انہیں معتبر مقام نصیب ہوا۔

خلاصہ:

اس ناول کے واقعات کا تعلق تاریخ اسلام کے ابتدائی دور یعنی ۵۷ھ سے ۱۲۵ھ کے درمیان کا ہے۔ واقعات کا آغاز عراق کے شہر بصرہ کے ایک گھرانے سے ہوتا ہے۔ جہاں ایک ایسی لڑکی (عذرا) پرورش پا رہی ہوتی ہے جس کا باپ جہاد میں شہید ہو چکا ہے اور ماں اس کے بعد جانبر نہ رہ سکی۔ خاتون خانہ (صابرہ) کے دو بیٹے عبداللہ اور نعیم بھی اس گھر میں عذرا کے ساتھ زندگی کی منزلیں طے کر رہے ہوتے ہیں۔ نعیم اور عذرا کے درمیان بے تکلفی اور بچپن کی دوستی ہوتی ہے جبکہ عبداللہ کے ساتھ عذرا کا تعلق حجاب اور تکلف پر مبنی ہوتا ہے۔ عبداللہ ابتدائی تعلیم کے بعد حربی تعلیم اور تربیت کے لئے شہر سے باہر کسی مکتب میں داخلہ لے لیتا ہے۔ چھوٹے بھائی نعیم کو بھی فنِ سپہ گری کے حصول کا شوق اٹھتا ہے اور وہ بھی اپنے بھائی کے مکتب جا پہنچتا ہے۔ ایک واقعہ سے متاثر ہو کر محمد بن قاسم اس کے لئے تلوار بازی کا ایک مقابلہ منعقد کراتا ہے۔ مقابلے کے اختتام پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ نعیم کا مدِ مقابل کوئی اور نہیں خود اس کا بھائی عبداللہ تھا۔

عبداللہ اپنی تعلیم و تربیت مکمل کرنے کے بعد جہاد کی غرض سے فوج میں شامل ہو جاتا ہے۔ جہاد پر جانے سے قبل ملنے والی

رخصت میں عبداللہ اپنے گھر کا چکر لگا تا ہے۔ جہاں عذرا جواب عالمِ شباب میں قدم رکھ چکی تھی اس سے مزید حجاب اور تکلف سے پیش آتی ہے۔ گھر سے رخصت کے وقت عبداللہ کے پاس اپنی ماں کی دعاؤں کے علاوہ عذرا کا دیا ہوا رومال بھی ساتھ ہوتا ہے کچھ عرصے کے بعد عبداللہ جہاد سے رخصت لے کر جب گھر آنے لگتا ہے تو عذرا کے ولی سعید نے ایک رقعہ کے ذریعے عذرا اور عبداللہ کی شادی کی تجویز کو پیش کیا۔ اس تجویز سے نعیم کو اپنی دنیا اندھیر معلوم ہوتی ہے اور وہ اداسیوں میں گھر جاتا ہے۔ اس صورت حال کو عبداللہ محسوس کرتا ہے اور وہ ایک رقعہ لکھ کر عذرا کے ولی سعید کے پاس نعیم کو بھیجتا ہے جس میں عذرا کی شادی اپنے بجائے نعیم سے کرنے کی تجویز موجود ہوتی ہے۔ نعیم جب بصرہ پہنچتا ہے تو اسے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کی قیادت میں ایک فوج سندھ کے راجا داہر کی سرکوبی کے لئے روانہ ہونے والی ہے مگر بصرہ میں ایک شخص نے منافرت پھیلا رکھی ہے اس شخص کا نام ابن صادق ہے اور آج اس کی جانب سے فوج میں شمولیت کی دعوت دینے کے موقع پر کسی شرانگیزی کا خطرہ ہے۔ نعیم بھی جامع مسجد میں پہنچ جاتا ہے جہاں ابنِ عمر اہلِ بصرہ کو سندھ کے جہاد میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں اسی دوران ابنِ صادق اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور لوگوں کو جہاد سے روکنے کی ترغیب دیتا ہے۔ لوگ مسجد کے اندر تمام اخلاقی اور تقدسی حدود کو پار کر کے گتھم گتھا ہو جاتے ہیں اس ہنگامے میں نعیم منبر پر بیٹھ کر قرآنِ کریم کی تلاوت شروع کر دیتا ہے جب مسجد میں خاموشی چھا جاتی ہے تو نعیم تقریر شروع کرتا ہے اور لوگوں کو جہاد کی اہمیت اور افضلیت یاد دلاتا ہے۔ دورانِ تقریر ابنِ صادق خلل اندازی کرتا ہے لیکن اسے ناکامی ہوتی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ مسجد سے نکل بھاگتا ہے۔ لوگوں کی کثیر تعداد جہاد پر جانے کے لئے تیار ہو جاتی ہے پھر رات کے وقت جنگی حکمتِ عملی کے موقع پر محمد بن قاسم، نعیم اور سعید اکٹھے مشورہ کرتے ہیں۔ اختتام پر نعیم اپنے ماموں سعید کے ہمراہ جانا چاہتا ہے مگر محمد بن قاسم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ سندھ روانگی کے دوران ایک موقع ضرور ایسا آتا ہے کہ نعیم کی بستی اسکے راستے سے ذرا فاصلہ پر ہوتی ہے مگر وہ گھر جانے کے بجائے سندھ کے سفر کو ترجیح دیتا ہے۔ ادھر عذرا ایک دن، دوسرے دن اور پھر تیسرے دن بستی کے قریب ٹیلوں پر کھڑے ہو کر نعیم کا انتظار کرتی ہے مگر وہ نہیں آتا۔ ایک شام انتظار کے اس موقع پر عبداللہ اسے تسلی بھی دیتا ہے۔ دوسری طرف محمد بن قاسم کی زیرِ قیادت اسلامی افواج دیبل کا محاصرہ کرتی ہیں اور منجنیقوں کی مدد سے سنگ باری کی جاتی ہے یہاں تک کہ فصیل اور اس میں رکھا ہوا بت پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ راجا داہر پسپائی اختیار کرتا ہے اور برہمن آباد جا کر پورے ہندوستان کے راجا مہاراجاؤں سے فوجی امداد کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ محمد بن قاسم بھی اپنی فوج کے ہمراہ دریائے سندھ عبور کر کے سامنے آموجود ہوتا ہے۔ جنگ کا ابتدائی نقشہ ہاتھیوں کی وجہ سے مسلمانوں کے خلاف جاتا ہے مگر جلد ہی نئی حکمتِ عملی کے تحت کئی ہاتھیوں کی سونڈیں کاٹ دی جاتی ہیں اور وہی ہاتھی جو مسلمانوں کے لئے تباہی و بربادی کا پیام بن کر بڑھ رہے تھے اپنی فوج میں پلٹ کر بھگدڑ مچاتے ہیں۔ نعیم کا ماموں سعید اس جنگ میں جرأت و شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہید ہو جاتا ہے۔ نعیم دورانِ تدفین سعید کے نام لایا ہوا خط جیب سے نکال کر قبر میں ڈال دیتا ہے۔ محمد بن قاسم استفسار اور اجازت حاصل کرنے کے بعد یہ خط پڑھ کر نعیم کو واپس جانے اور مزید فوج جمع

کرنے کی خاطر فوری روانگی کا مشورہ دیتا ہے۔نعیم اسے احسان سمجھتا ہے مگر واپسی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔دورانِ سفر نعیم کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوتی ہے جو ہمسفر بن کر نعیم کو دھوکہ دے کر راستے سے بھٹکا دیتا ہے اور پھر کچھ کھانا جس میں نشہ آور اشیاء ملی تھیں نعیم کو کھلا دیتا ہے۔جس کے بعد نعیم بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔

ہوش آنے پر وہ خود کو ایک تاریک کوٹھڑی میں پاتا ہے جہاں ایک روزن سے صبح و شام اسے کھانا پانی فراہم کیا جاتا ہے وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہے بالآخر ایک دن ننگی تلواروں کے سائے میں اسے ابنِ صادق کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جہاں ابنِ صادق اسے دنیاوی عیش پرستی اور جاہ وحشمت کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی پیشکش کرتا ہے نعیم کے انکار پر اسے ستون سے باندھ دیا جاتا ہے اور اس پر کوڑے برسائے جاتے ہیں۔اس منظر کو زلیخا بھی دیکھتی ہے اور ابنِ صادق سے رحم کی درخواست کرتی ہے جسکے رد ہونے پر وہ وہاں سے چلی جاتی ہے۔نعیم کو اسی طرح کئی بار تشدد سے دوچار ہونا پڑتا ہے ایک دن ابنِ صادق،نعیم سے کہتا ہے کہ آج جی بھر کے دنیا کو دیکھ لے اور کانوں سے آوازیں سن لے کیونکہ اگلی صبح کا سورج طلوع ہونے سے قبل تیری آنکھیں نکال لی جائیں گی اور کان سننے کی حس سے محروم کر دیے جائیں گے اسی دوران وہی شخص اسحاق جس نے نعیم کو دھوکہ دے کر گرفتار کیا تھا ایک انسانی سر لاتا ہے جسے دیکھ کر نعیم پہچان لیتا ہے کہ یہ اس کے استاد ابنِ عامر کا سر ہے دل کو ایک دھچکا لگتا ہے اور وہ آنکھیں جھکا لیتا ہے۔

ابن صادق کی زندگی کا حال بھی دلچسپی سے خالی نہیں وہ ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا۔سولہ سال کی عمر میں کئی زبانوں پر عبور حاصل کر چکا تھا۔اسے ایک عیسائی لڑکی مریم سے عشق ہو جاتا ہے جسکے حصول کی خاطر عیسائی مذہب اختیار کر لیتا ہے لیکن مریم اس کے بھائی الیاس پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔یہ دونوں دمشق جا کر شادی کر لیتے ہیں ان کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے جس کا نام زلیخا رکھا گیا۔ابنِ صادق اسلام قبول کر کے دمشق جاتا ہے اور خلیفہ سے مریم کے بارے میں اپنا دعویٰ پیش کرتا ہے اسے ناکامی ہوتی ہے۔وہ بصرہ جا کر حجاج سے مدد طلب کرتا ہے جہاں سے اسے ذلیل کر کے شہر بدر کر دیا جاتا ہے وہ پوری دنیا اور اپنی محبوبہ اور بھائی سے انتقام کے جذبے سے سرشار ہو کر شر پسندوں کی ایک جماعت بناتا ہے اور خود اس کا روحانی پیشوا بن جاتا ہے۔پہلے زلیخا کو اغوا کراتا ہے اور پھر اس کی جماعت کے لوگ الیاس اور مریم کو قتل کر دیتے ہیں۔خود ابن صادق عالم اسلام میں فتنہ انگیزی پیدا کرنے کے لیے سرگرم رہتا ہے۔بصرہ کی جامع مسجد میں اسی کام کی تکمیل کی خاطر جاتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔وہ اسحٰق کی زلیخا سے شادی کرنے کے لئے اسحٰق سے ابن عامر اور محمد بن قاسم کے سر لانے کی فرمائش کرتا ہے جسکی پہلی کامیابی کے بعد اسحٰق محمد بن قاسم کا سر لانے کے لئے سندھ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ادھر نعیم اپنی کوٹھڑی میں سزا پر عملدرآمد کا منتظر کبھی رات کے طویل اور کبھی قلیل ہونے کی خواہش کرتا ہے اور سو جاتا ہے۔خواب میں اپنے گھر کو دیکھتا ہے کہ عذرا اسے آوازیں دے رہی ہے۔آنکھ کھلنے پر اور یہ یقین کر لینے کے بعد کہ وہ خواب نہیں حقیقت ہے یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ زلیخا سامنے کھڑی ہے۔منصوبے کے مطابق یہ دونوں دو گھوڑوں پر بیٹھ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ایک فوجی چوکی پر پہنچ کر نعیم،زلیخا کے ہمراہ بیس سپاہی لے کر خود اسحٰق کے تعاقب میں روانہ ہونا چاہتا ہے کہ زلیخا،عذرا کی بابت پوچھتی

ہے اور اس کے گھر جانے کی خواہش بھی کرتی ہے۔ نعیم سپاہیوں کو زلیخا کو اُس کے گھر چھوڑ آنے کا حکم دیتا ہے۔ زلیخا اس دوران ایک خنجر نعیم سے نشانی کے طور پر مانگ لیتی ہے۔ نعیم چند چوکیوں کے بعد اسحٰق تک پہنچ جاتا ہے دونوں میں مقابلہ ہوتا ہے بالآخر اسحٰق کو خاک و خون میں تڑپتا چھوڑ کر نعیم اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ وہ فاصلہ کو جلد سے جلد طے کر کے زلیخا کے قافلے میں شامل ہونے کا خواہشمند تھا کہ رات کے ایک پہر دلدوز منظر دیکھ وہ ٹھٹک جاتا ہے۔ چند انسانوں اور چند گھوڑوں کی لاشیں اور زخمی پڑے تھے وہ ہمت کر کے ایک زخمی سے کچھ پوچھتا ہے تو وہ اشارے سے کہتا ہے کہ آپ اُن کی خبر لیں ہم نے بہت کوشش کی مگر وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ نعیم زلیخا کے سر کو سہارا دیتا ہے پانی پلاتا ہے اور اس کے سینے میں پیوست خنجر نکالنا چاہتا ہے مگر زلیخا یہ کہتی ہے کہ میں آخری وقت آپ کی اس نشانی سے جدا نہیں ہونا چاہتی۔ نعیم کئی بار اٹھنا چاہتا ہے مگر زلیخا کی ملتجی نگاہیں اسے ایسا کرنے نہیں دیتیں۔ زلیخا روزِ آخرت نعیم سے ایک بار پھر ملنے کی خواہش ظاہر کرتی ہے تو نعیم اسے کلمہ شہادت پڑھنے کا مشورہ دیتا ہے۔ نعیم کلمہ پڑھتا ہے اور زلیخا دہراتی ہے۔ مزید کچھ وقت موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد زلیخا اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتی ہے۔ نعیم کے آنسو اس کے چہرے پر گرتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ وہ کہہ رہی ہو کہ اے عظیم ہستی میں تیرے احسانات کا بدلہ دے چکی ہوں۔

اگلے دن ان سب کی تدفین کے بعد نعیم بہت سی تکلیف دہ حقیقتوں اور یادوں کے ساتھ نئی آرزوئیں جاگزیں کرتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے جب نعیم اپنی بستی کے قریب پہنچا تو اسے دف بجنے اور شادی بیاہ کے گیت گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ دل کی بڑھتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ وہ اپنے گھر کی چاردیواری کے ساتھ کھڑا تھا گھر میں کوئی تقریب ہو رہی تھی۔ عبداللہ مہمانوں کی تواضع میں مصروف تھا۔ ایک لڑکا گھر سے نکلا تو نعیم نے اس کا راستہ روک کر دعوت کی نوعیت جاننا چاہی یہ جاننے پر کہ عبداللہ کی شادی عذرا سے ہو رہی ہے دل میں ایک خیال آیا کہ گھر چلا جائے اور اپنی دنیا بسا لے مگر دوسرا خیال آیا کہ تقدیر عبداللہ کو عذرا کا محافظ مقرر کر چکی ہے اور نعیم نے دل کی دوسری آواز پر لبیک کہا۔ اُس لڑکے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ماں مر چکی ہے۔ نعیم نے چند آہوں اور سسکیوں کے ساتھ ماں کو یاد کیا اور سجدہ ریز ہو کر عبداللہ اور عذرا کی شادی کی کامیابی کی دعائیں کیں۔ اگلی صبح عبداللہ جہاد پر روانہ ہوا۔ نعیم بھی اس کے پیچھے گھوڑا دوڑاتا ہوا اس سے آگے نکل گیا۔ عبداللہ نے اسے جا لیا اور دونوں ایک دوسرے کو پہچان کر بغل گیر ہو گئے۔ پچھلی زندگی کے واقعات ایک دوسرے کو بتائے کچھ دور ساتھ چلنے کے بعد دونوں مخالف سمتوں میں روانہ ہوئے۔ نعیم بصرہ پہنچا اور وہاں قتیبہ بن مسلم کی مدد کو جانے والے ایک فوجی قافلے کے ساتھ ترکستان روانہ ہوا۔ جہاں پہنچ کر اس نے قتیبہ کے معتبر ساتھی کی حیثیت سے اپنی اہمیت منوائی۔ مختلف مواقع پر اور بالخصوص بخارا کی فتح میں نعیم کے مشورے اور تجاویز کامیابی کی نوید لائیں۔ یہاں کے لوگ وقتی طور پر مغلوب ہو جاتے لیکن موقع پا کر بغاوت پر اتر آتے۔ ترکستان کے شکست خوردہ سردار زرتاق کی قیادت میں ایک فوج کی تشکیل کر رہے تھے اور انھیں اس عمل پر آمادہ کرنے والا ابنِ صادق تھا۔ جب اس واقعہ کی اطلاع قتیبہ بن مسلم کو ملی تو نعیم، ابنِ صادق کا نام سن کر بے چین اور متفکر ہوا اور اس کی سرکوبی کے لئے تین سو سواروں کے ہمراہ فوراً نکل کھڑا ہوا۔ ابنِ صادق اپنی چالاکی اور عیاری کی بدولت نعیم

کو ایک بار پھر جھانسا دینے اور نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا لیکن نعیم اس موقع پر شدید زخمی ہوا۔

نعیم کا زخمی ہونا کہانی کو ایک نئی کروٹ دیتا ہے۔ وہ اس حالت میں ایک ایسے گھر لایا جاتا ہے جہاں نرگس اور ہومان اس کی مرہم پٹی اور دل جوئی کرتے ہیں۔ نرگس میں اسے زلیخا اور عذرا کی شبیہ نظر آتی ہے کئی ہفتے یہاں رہنے کے بعد نعیم ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتا ہے اور یہ چھوٹا سا گاؤں اسلام کی روشنی سے منور ہو جاتا ہے۔ اپنی علالت سے صحت پانے کے بعد وہ اپنے محسنوں سے رخصت ہو کر قتیبہ بن مسلم کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ ترکستان پر فوج کشی کے لئے فوج دو حصوں میں تقسیم ہو کر روانہ ہو جاتی ہے۔ جب نعیم ایک ہراول کی قیادت کرتا ہوا اس بستی کے قریب آتا ہے تو نرگس اور زمرد کو ایک چشمے کے پاس پاتا ہے۔ نرگس ہجر کی کلفتوں کو ایک روگ کی شکل میں اپنائے ہوئے تھی۔ نعیم اسے تسلی دیتا ہے اور اس گاؤں کے چند نوجوانوں کو فوج میں شامل کر کے اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ اسلامی افواج فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑتی کاشغر تک جا پہنچتی ہیں۔ چین کے بادشاہ کو صلح نامے کی تجاویز اور پھر سفارت کاری کے لئے نعیم کو بھیجا جاتا ہے۔ واپسی پر نعیم چھ ماہ کی رخصت لے کر روانہ ہوتا ہے۔ دورانِ سفر اس بستی میں پہنچتا ہے جہاں نرگس محو انتظار تھی نعیم کی آمد اسے متحیر کر دیتی ہے اور پھر نرگس اور نعیم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ چند ہفتے قیام کے بعد نعیم بصرہ جانے کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس سے قبل قتیبہ اسے بلوا بھیجتا ہے۔ اس موقع پر اسے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفۃ المسلمین ولید کی وفات کے بعد سلیمان نے حجاج کے نامزد جرنیلوں کو واپس بلا لیا ہے محمد بن قاسم قتل کر دیا گیا ہے اور اب قتیبہ بن مسلم کی باری ہے۔ نعیم اور قتیبہ دیگر جرنیلوں سے مشورے کے بعد طے کرتے ہیں کہ نعیم دمشق جائے اور دربارِ خلافت میں خلیفہ کی بے گناہی ثابت کرے۔ نعیم نرگس برمک اور چند سپاہیوں کے ہمراہ روانہ ہوتا ہے اور دمشق پہنچ کر دربارِ خلافت میں قتیبہ کی جرأت مندی اور اس کے متعلق غلط فہمیاں د[illegible] کرنا چاہتا ہے کہ اچانک خلیفہ کے مشیروں میں اس کی نظر ابنِ صادق پر پڑتی ہے خلیفہ اس کی گرفتاری کا حکم دیتے ہیں۔

اس سے قبل عبداللہ اسپین میں دادِ شجاعت حاصل کر رہا تھا کہ دربارِ خلافت میں طلبی کے حکم پر دمشق پہنچتا ہے۔ اسے پانچ ہ[illegible] فوج لے کر قسطنطنیہ کی طرف کوچ کا حکم ملتا ہے۔ دربار سے واپسی پر اس کا پرانا رفیق یوسف مل جاتا ہے جو نعیم کی بابت عبداللہ کو ب[illegible] ہے۔ عبداللہ اسے پہچان کر بتاتا ہے کہ وہ تو اس کا چھوٹا بھائی ہے۔ اس کی رہائی کی تدبیر تیار ہوتی ہے کہ اس دوران ابنِ صادق پکڑا [illegible] ہے۔ اسے باندھ کر لکڑی کے ایک صندوق میں بند کر کے اونٹ کی پیٹھ پر سامانِ رسد کے ہمراہ قسطنطنیہ روانہ کیا جاتا ہے۔ نعیم، نرگس یوسف، عبداللہ کا خط لے کر براستہ قیروان، قرطبہ، طلیطلہ پہنچتے ہیں اور وہاں کی فوج میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مصلحت انگیزی کے [illegible] نظر ان کے نام تبدیل کر دیے جاتے ہیں۔

عبداللہ، ابنِ صادق کو ایک مکان میں مقید کر کے محاذ پر چلا جاتا ہے یہاں ابنِ صادق، زیاد کو دھوکے سے قتل کر کے بھا[illegible] نکلتا ہے اور خلیفہ کے پاس جا پہنچتا ہے اس کے حالات سے واقف ہو کر خلیفہ عبداللہ کو پابہ زنجیر واپس بلا لیتا ہے اور خود قسطنطنیہ کی فو[illegible] قیادت سنبھال لیتا ہے۔ ابنِ صادق کو مفتیِ اعظم کا عہدہ دے کر اسپین بھیج دیا جاتا ہے۔ اسی دوران سلیمان کی موت اور حضرت عم[illegible]

عبدالعزیز کی بحیثیت خلیفہ تقرری مظلوموں کے لئے دادرسی کی نوید لائی۔ دیگر بہت سے قیدیوں کی طرح عبداللہ بھی رہا ہو جاتا ہے اور امیرالمومنین کو نعیم اور ابنِ صادق کے بارے میں باخبر کرتا ہے جس پر امیرالمومنین نعیم کو پرتگال کا گورنر بنانے اور ابنِ صادق کو پابہ زنجیر دمشق بھیجنے کا حکم دیتے ہیں۔ عبداللہ کو ایک ماہ کی رخصت کے بعد خراسان کے گورنر کی حیثیت سے ذمے داریاں سنبھالنے کا حکم ہوتا ہے۔ والئی اسپین نعیم کو ایک نئے محاذ پر بھیجنے کے لئے طلب کرتے ہیں اس موقع پر ابنِ صادق بھی وہاں آجاتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ نعیم کو قید کر کے اس کی عدالت میں پیش کیا جائے۔ نعیم برق رفتاری سے تلوار نکال کر ابنِ صادق کے سینے پر رکھتا ہے لیکن اسے قتل نہیں کرتا۔ اسی دوران امیرالمومنین کا خط آتا ہے جس میں نعیم کے لئے گورنری اور ابنِ صادق کے لئے پابہ زنجیر دمشق روانگی کا حکم تھا۔ ابنِ صادق دورانِ سفر زہر کھا کر خودکشی کر لیتا ہے۔ نعیم تقریباً اٹھارہ سال تک بحیثیت گورنر اپنی ذمہ داریاں انجام دینے کے بعد بربریوں کی بغاوت کچلنے کے لئے خود فوج کی کمان سنبھال لیتا ہے۔ اس جنگ میں وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے ہفتوں علاج کرانے کے بعد بھی طبعیت پھر خراب ہو جاتی ہے وہ ایک رات اپنے بستر سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور عزم و حوصلے کے ساتھ سفر کا ارادہ کرتا ہے۔ اپنے میزبان کو مطلع کیئے بغیر بہت سے خوابوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر وہ اپنے گھر کے لئے روانہ ہوتا ہے کہ بستی سے چند کوس پہلے صحرائی طوفان میں گھر جاتا ہے۔ اس دوران گھوڑا دوڑانے کی کوشش میں اس کے زخم پھٹ جاتے ہیں جن سے خون رسنے لگتا ہے گھوڑا بھی خود کو چھڑا کر ایک طرف بھاگ نکلتا ہے۔ تمام تر قوت جمع کر کے یہ مجاہد پھر کھڑا ہوتا ہے لڑکھڑاتا ہے، گرتا ہے اور بالآخر ندی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ خوب سیر ہو کر پانی پیتا ہے اور نئی امنگوں اور ولولوں کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے بالآخر گھر پہنچ کر وہ اپنے بیٹوں، بھتیجے، بھتیجی، نرگس اور عذرا کو پاتا ہے۔ ایک طبیب آتا ہے مگر افاقہ نہیں ہوتا۔ نعیم اپنے بیٹے اور بھتیجے سے جہاد پر نہ جانے کی وجہ دریافت کرتا ہے وہ وجہ اس کی علالت کو بتاتے ہیں تو کہتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مقابلے میں کسی کی اہمیت نہیں۔ یہ دونوں جوان جہاد پر جانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور وہ خود ان کی جھلک دیکھنے کے لئے پہلے دروازے اور پھر گھر سے باہر ایک ٹیلے پر چڑھ کر سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور اسی دوران بے ہوش ہو جاتا ہے۔ عذرا کی بیٹی پانی لاتا ہے جس کے چند چھینٹوں کے بعد ہوش میں آ کر پانی پیتا ہے کلمۂ شہادت پڑھ کر کچھ مبہم باتیں کرنے کے بعد ابدی نیند سو جاتا ہے اور یوں ناول جہاد کے موضوع کے تناظر میں تاریخی واقعات اور کرداروں کے ساتھ امید و کامرانی کے نئے مفہوم اجاگر کرتا ہے۔

تحقیقی جائزہ

اس ناول کا آغاز بصرہ کے ایک گھرانے سے کیا گیا۔ جس میں بظاہر تخیلاتی کردار ہیں لیکن ان کرداروں کے اوصاف وہی ہیں جو اس عہد میں ہر عرب گھرانیسن میں پائے جاتے تھے۔ آگے چل کر جن تاریخی واقعات اور کرداروں کا تذکرہ ہے وہ عام طور پر حقیقی ہیں مثلاً حجاج بن یوسف، ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، حضرت عمر بن عبدالعزیز، قتیبہ بن مسلم باہلی، محمد بن قاسم اور موسیٰ بن نصیر وغیرہ واقعات کا زمانہ اور اکثر منظر کشی حقیقت کے عین مطابق ہے، مثلاً:

''محمد بن قاسم نے شہر کا محاصرہ کر کے منجنیق سے پتھر برسانے شروع کیے لیکن کئی دنوں کی سخت محنت کے باوجود مسلمان شہر پناہ توڑنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ آخر ایک دن ایک بھاری پتھر بدھ کے ایک مندر پر آ گرا اور اس کا سنہری گنبد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نیچے گر پڑا اور اس کے ساتھ ہی بدھ کا ایک قدیم مجسمہ چکنا چور ہو گیا۔ اس بُت کے ٹوٹ جانے کو راجا داہر اپنے لیے بُرا شگون خیال کرتے ہوئے بدحواس ہو گیا اور رات کے وقت اپنی فوج کے ساتھ بھاگ نکلا اور برہمن آباد پہنچ کر دم لیا۔''[۱]

اس واقعے کا ذکر علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شہر دیبل کے وسط میں ایک بہت بڑا رفیع الشان بت خانہ تھا۔ جس میں ایک بت رکھا ہوا تھا اور بت خانہ کے گنبد پر ایک نہایت طویل منارہ تھا اور منارے پر ایک نیزہ گڑا ہوا تھا جس میں سرخ حریر کا پھریرا اڑ رہا تھا جو تمام شہر پر اپنا سایہ کیے ہوئے تھا۔ محمد بن قاسم نے شہر پر سنگ باری شروع کر دی۔ اتفاق سے پہلے ہی نیزہ ٹوٹ کر گرا جس سے اہلِ دیبل کو اپنی شکست کا یقین ہو گیا۔''[۲]

دیبل کے معرکے کے بارے میں دیگر تواریخ کی طرح شاہ معین الدین احمد ندوی یوں رقمطراز ہیں۔

''حجاج کو اس مہم سے اتنا تعلق خاطر تھا کہ ہر تیسرے دن خبریں منگا کر حالات معلوم کر کے جنگ کے متعلق ہدایتیں بھیجتا تھا، جب محاصرے نے زیادہ طول کھینچا اور کوئی نتیجہ نہ نکلا تو حجاج نے لکھا کہ منجنیق کو ایک زاویہ کم کر کے مشرقی جانب نصب کر کے دیول پر سنگباری کی جائے (دیول بدھ کا صنمکدہ تھا جو اس شہر کا قلب اور اس کی جان تھا) اس ہدایت کے مطابق محمد بن قاسم نے سنگ باری کرنے کا حکم دیا اس سے دیول کا گنبد ٹوٹ گیا، اس کے ٹوٹتے ہی اہلِ شہر کی ہمت پست ہو گئی۔''[۳]

ناول اور تاریخ دونوں میں مقام دیبل، شہر کی فصیل اور شہر میں موجود مندر کے گنبد نما طرزِ تعمیر اور اس میں موجود بت کی اہمیت یکساں ہے۔ ساتھ ہی جغرافیائی اعتبار سے مقامات بھی درست ہیں اور ناول میں موجود ڈاک کی ان چوکیوں پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں جو مذکور ہیں۔ اس کے بعد محمد بن قاسم چھوٹے چھوٹے علاقوں کو فتح کرتا ہوا دریائے سندھ عبور کرتا ہے جہاں اس کا مقابلہ ۱۹ جون ۷۱۲ء بمطابق ۹۳ھ کو راجا داہر کی افواج سے ہوتا ہے۔ ناول کے صفحہ نمبر ۸۰ پر جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ زمانی، جغرافیائی اور جنگی

---

[۱] داستانِ مجاہد؛ نسیم حجازی، ص ۹۷۔

[۲] تاریخ ابنِ خلدون، جلد دوئم؛ علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون / علامہ احمد حسین الہ آبادی، ص ۲۱۷

[۳] تاریخ اسلام؛ شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۹۰۔

ہتھیاروں، تیر کمان، تلوار، گھوڑوں اور ہاتھیوں تک کے استعمال کے عین مطابق ہیں۔ علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون ان واقعات کی تفصیل اس طرح لکھتے ہیں:

''یہاں تک کہ ہران پہنچے بادشاہ سندھ (داہر بن صعصہ) لوگوں کو جمع کر کے پھر مقابلے پر آیا۔ عساکر اسلامیہ نے نہر پر پل باندھا اور نہایت اطمینان و استقلال سے عبور کر کے داہر کی فوج پر جا پڑے۔ داہر ایک ہاتھی پر سوار تھا اور اس کے اردگرد سینکڑوں ہاتھی کالے کالے پہاڑ کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ جن کی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک خفیف سی جنبش ہو جاتی تھی جس طرف وہ رخ کرتے تھے صف کی صف درہم برہم ہو جاتی تھی۔ اسلامی قدر اندازوں نے تیر اندازی شروع کر دی۔ سواران فیل تیرِ اجل کے نشانہ ہو ہو کر گرنے لگے اور ہاتھیوں کا جھنڈ بھاگ کھڑا ہوا۔ داہر مجبوراً پیادہ پا لڑتا ہوا عساکر اسلامیہ کی طرف بڑھا۔ ایک مسلمان سپاہی نے لپک کر ایک ہی وار سے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا بقیہ کفار میدانِ جنگ سے گرتے پڑتے بھاگ کھڑے ہوئے۔''[1]

علی کوفی نے اس منظر کو اس طرح پیش کیا ہے:

''داہر نے ہاتھی سے اتر کر ایک عرب کا مقابلہ کیا۔ بہادر عرب نے اس کے سر پر تلوار ماری اور اس کے سر کو شانوں تک دو ٹکڑے کر دیا۔''[2]

تقریباً یہی کیفیت اعجاز الحق قدوسی نے اِن الفاظ کے ساتھ درج کی ہے:

''داہر نے دیکھا کہ لڑائی جاری ہے، اُس کے بہت سے عزیز، رشتے دار اور ساتھی لڑائی میں مارے جا چکے ہیں، اس منظر کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک جوش پیدا ہوا اور پا پیادہ وہ بڑی بہادری سے میدان میں لڑتا رہا، سورج غروب ہو رہا تھا کہ ایک عرب نے اس کے سر پر زور سے تلوار ماری، تلوار سر سے گردن تک اتر گئی۔''[3]

دیبل کی فتح اور راجا داہر کی شکست اور اس کا قتل ''تاریخ اسلام مرتبہ ڈاکٹر حمید الدین کے صفحہ نمبر ۳۰۴ تا ۳۰۷''[4] میں تقریباً اسی طرح درج ہیں۔ یہاں دیبل کی فتح کے لیے ۷۱۱ء اور راجا داہر کے قتل کا سن درج نہیں جبکہ اس ناول میں اسی معرکہ کا سن جس میں راجا داہر قتل ہوا ۷۱۲ء کے وسط یا اواخر میں دیبل آئے اور دریائے سندھ کے اس معرکہ تک جہاں راجا داہر قتل ہوا ۷۱۲ء شروع ہو گیا ہو۔ یہاں ایک بات جغرافیائی اعتبار سے غلط مرقوم ہے۔ تاریخ ابنِ خلدون میں معرکہ کا مقام ہران ہے اور تاریخ اسلام مرتبہ ڈاکٹر حمید الدین میں محض دریائے سندھ کے کنارے کا ذکر ہے۔ محمد بن قاسم کی برہمن آباد روانگی اس معرکہ کے بعد دکھائی گئی ہے۔ ممکن ہے ناول نگار نے برہمن آباد کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ مقام درج کیا ہو۔ ویسے بھی معرکہ کا مقام برہمن آباد سے بہت زیادہ فاصلے پر نہیں،

---

[1] تاریخ ابنِ خلدون، جلد دوئم؛ علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون / علامہ حکیم احمد حسین الہ آبادی، ص ۲۱۸۔

[2] فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ؛ علی کوفی / اختر رضوی، ص ۲۵۳۔

[3] تاریخ سندھ؛ اعجاز الحق قدوسی، جلد اول، ص ۱۷۹۔

[4] تاریخ اسلام؛ ڈاکٹر حمید الدین، ص ۳۰۴۔

بالکل اسی طرح ناول میں راجا داہر کے میدان جنگ میں آنے کا منظر کچھ رومانوی اور غیر حقیقی معلوم ہوتا ہے لیکن شاہ معین الدین احمد ندوی کے الفاظ اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

''راجا داہر بڑے شکوہ و تجمل کے ساتھ مقابلے میں آیا، کوہ پیکر ہاتھیوں کی صف آگے تھی، اس کے پیچھے دس ہزار سوار اور تیس ہزار پیدل سپاہ تھی، خود داہر ایک سپید ہاتھی پر سوار تھا، خواصین چپ و راست جلوہ فگن تھیں ''[۱]

اس کیفیت کو علی کوفی نے یوں رقم کیا ہے:

''[داہر نے] اپنے لئے ایک مست ہاتھی پر پالکی بندھوائی، [اس پر] لوہے کا برگستوان ڈلوایا [اور پھر] زرہ پہن کر اور کمان کا چلہ چڑھا کر اس پر سوار ہوا۔ اس کے ساتھ پالکی پر دو کنیزیں تھیں، ایک اسے یکے بعد دیگرے تیر دیتی تھی اور دوسری پان پیش کرتی تھی۔''[۲]

یہی کیفیت اعجاز الحق قدوسی نے یوں رقم کی ہے:

''داہر نے یہ رنگ دیکھا تو وہ اپنے سفید ہاتھی پر سوار ہو کر چار سو سواروں کو لے کر جو تلواریں، ڈھالیں اور نیزے لئے ہوئے تھے میدانِ جنگ میں نکلا، ہاتھی کی عماری میں اس کے ساتھ دو خوبصورت کنیزیں بیٹھی ہوئی تھیں، ایک اس کو بار بار پان کے بیڑے دیتی جاتی تھی اور دوسری اس کو شراب کے جام بھر بھر کر پلا رہی تھی۔''[۳]

معرکہ محمد بن قاسم اور راجا داہر کے بارے میں ناول نگار اور مورخین کی اکثر آرا درست ہیں۔ مذکورہ رائے جو راجا داہر کے میدانِ جنگ میں آنے اور جاہ و حشمت کے ساتھ قیادت کے حوالے سے ہے مختلف تواریخ میں تقریباً یکساں انداز میں پیش ہوئی ہے۔

ناول کے صفحہ نمبر ۱۲۹ پر قتیبہ بن مسلم باہلی کا معرکہ ۸۷ھ میں بیکند کے مقام پر عرصہ دو ماہ پر مستقل پیش کیا گیا ہے۔ علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون نے جغرافیائی اور زمانی عرصے کا دورانیہ بالکل ٹھیک ٹھیک اس طرح درج کیا ہے:

''قتیبہ نے بیکن داد (بیکند) بلاد بخارا پر بہ راہ نہر ۸۷ھ میں حملہ کیا۔ اہلِ بیکن داد نے اہلِ صغد اور ان کے گرد و نواح کے ترکوں سے امداد طلب کی۔ اہلِ صغد ایک جم غفیر لے کر پہنچ گئے اور چاروں طرف سے راستہ گھیر لیا۔ دو مہینے تک قتیبہ اور مسلمانوں سے خط و کتابت بند رہی بالآخر قتیبہ نے ان لوگوں کو شکست دی۔''[۴]

اسی واقعہ کو علامہ حافظ ابوالفدا اعماد الدین نے اس طرح رقم کیا ہے:

''اسی سال (۸۷ھ) قتیبہ نے بیکند میں جنگ کی لیکن یہاں اس کے مقابلے میں (اہل صغد) بڑی تعداد میں جمع ہو گئے اور

---

[۱] تاریخ اسلام؛ شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۹۲۔

[۲] فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ؛ علی کوفی / اختر رضوی، ص ۲۳۵۔

[۳] تاریخ سندھ؛ اعجاز الحق قدوسی، جلد اول، ص ۱۷۶۔

[۴] تاریخ ابن خلدون، جلد دوئم؛ علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون / علامہ حکیم احمد حسین الہ آبادی، ص ۲۱۵۔

انہوں نے زبردست ہنگامہ کھڑا کر دیا یہ سب اہلِ بخارا کے کرتوت تھے جب قتیبہ ان کی سرزمین میں داخل ہوا تو اہلِ بخارا نے اہلِ صفد سے مسلمان فوجوں اور قتیبہ کے خلاف مدد طلب کر لی اور ان کے علاوہ آس پاس کے تمام ترک بھی اس میں شامل ہو گئے، چنانچہ ان سب نے مل کر قتیبہ پر یورش کر دی اور اس کے نکلنے کے تمام راستے مسدود کر دیئے جس کی وجہ سے قتیبہ تقریباً دو ماہ گھر کر وہیں رہ گیا۔[1]

اس واقعہ کو ڈاکٹر حمید الدین نے یوں نقل کیا ہے:

''اب قتیبہ نے شہر بیکند پر لشکر کشی کی۔ وہاں کا رئیس ایک بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مقابلے کو نکلا۔ دو ماہ تک برابر جنگ ہوتی رہی بالآخر مسلمان فتح یاب ہوئے۔''[2]

بالکل یہی واقعات تاریخ اسلام شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۸۵ پر بھی درج ہیں۔[3]

ان چاروں تواریخ کو مدِ نظر رکھ کر ہم یہ لکھنے میں حق بجانب ہیں کہ ناول میں پیش کردہ واقعات تقریباً ہر اعتبار سے درست ہیں۔

''قتیبہ بخارا کی جانب بڑھتا ہے جس کی تفصیل ناول کے صفحہ نمبر ۱۲۹''[4] اور ''تاریخ اسلام مرتبہ ڈاکٹر حمید الدین صفحہ نمبر ۲۹۹ تا ۳۰۰''[5] پر مرقوم ہے۔ واقعات جغرافیائی اعتبار سے اور جنگی اعتبار سے تقریباً یکساں ہیں اس کے بعد قتیبہ فتوحات کے جھنڈے گاڑتا ہوا چین کی سرحد تک جا پہنچا۔ جنگ سے قبل سفارت کا مرحلہ درپیش تھا۔ ناول کے بیان کے مطابق ۹۵ھ میں قتیبہ نے ہبیرہ کی زیرِ قیادت ایک سفارت شاہِ چین کو بھیجی تھی۔ اس بارے میں شاہ معین الدین احمد ندوی نے تحریر کیا ہے:

''چنانچہ کاشغر کو فتح کرتا ہوا چین کی حدود تک پہنچ گیا اور ہبیرہ بن کلابی کی سرکردگی میں ایک وفد خاقان کے پاس بھیجا۔''[6]

علامہ حافظ ابوالفدا عماد الدین نے سفارت کے رہنما کا نام عبیدہ لیکن خاقان کے دربار میں بھیجے جانے والے قائد کا نام ہبیرہ ہی درج کیا ہے۔ الفاظ کچھ یوں ہیں:

''اور جب شام ہو گئی تو بادشاہ نے کہلا بھیجا، ہمارے پاس ان کے کسی بڑے اور اہم لیڈر کو بھیجو۔ اس پر مسلمانوں کی طرف سے ہبیرہ کو بھیجا گیا۔''[7]

ناول نگاری اور فنِ تاریخ تقریباً ایک ساتھ رواں دواں ہیں۔ ناول کی دلچسپی اور تاریخ کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں آتا حتیٰ کہ بخارا کی فتح کے موقع پر تمیمی سرداروں کا نہر عبور کرنے کا واقعہ اور ہبیرہ کی سفارت تاریخی اعتبار سے بالکل درست اور صحیح ہیں اسی طرح ترکستان

۱۔ تاریخ ابنِ کثیر، البدایہ والنہایہ، جلد نہم؛ حافظ ابوالفدا عماد الدین ابنِ کثیر دمشقی / حافظ سید عبدالرشید ندوی ایم۔اے مولانا اختر فتح پوری، ص ۱۲۷۔

۲۔ تاریخ ابنِ خلدون، جلد دوئم؛ علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون / علامہ حکیم احمد حسین الٰہ آبادی، ص ۲۱۵۔

۳۔ تاریخ اسلام؛ شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۸۵۔

۴۔ داستان مجاہد؛ نسیم حجازی، ص ۱۲۹۔

۵۔ تاریخ اسلام؛ ڈاکٹر حمید الدین، ص ۲۹۹ تا ۳۰۰۔

۶۔ تاریخ اسلام؛ شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۳۰۴۔

۷۔ تاریخ ابنِ کثیر، البدایہ والنہایہ، جلد نہم؛ علامہ حافظ ابوالفدا عماد الدین ابنِ کثیر دمشقی / حافظ سید عبدالرشید ندوی ایم۔اے مولانا اختر فتح پوری، ص ۲۲۸۔

کے معرکوں میں نیزک کا تاریخی کردار ناول اور تقریباً ہر تاریخ میں یکساں موجود ہے البتہ اس کے قتل کے حوالے سے کچھ اختلاف ہے لیکن اس کا زمانہ بالکل درست ہے۔ نسیم حجازی رقم کرتے ہیں:

''خلیفہ ولید کے عہد حکومت کے آخری ایام میں بحرِ اوقیانوس سے لے کر کاشغر اور سندھ تک مسلمانوں کی فتوحات کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ تاریخِ اسلام کے تین سپہ سالار شہرت اور ناموری کی آخری حدود تک پہنچ چکے تھے۔ مشرق کی طرف محمد بن قاسم دریائے سندھ کے کنارے ڈیرہ ڈالے ہندوستان کے وسیع میدانوں کی تسخیر کی تیاری کر رہا تھا۔

قتیبہ کاشغر کی ایک بلند پہاڑی پر کھڑا دربارِ خلافت سے مملکت چین کی طرف پیش قدمی کے حکم کا انتظار کر رہا تھا۔ مغرب میں موسیٰ کا لشکر پرے نیز کی پہاڑیوں کو عبور کر کے فرانس کی حدود میں داخل ہوا چاہتا تھا۔ لیکن ۹۴ھ میں خلیفہ ولید کی وفات اور خلیفہ سلیمان کی جانشینی کی خبر نے اسلامی فتوحات کا نقشہ بدل دیا۔''[۱]

یہ عجیب بات ہے کہ ناول کے تازہ ترین ایڈیشن اور ۱۹۹۰ء کے ایڈیشن میں بھی یہ حصہ لفظ بہ لفظ اسی طرح شائع ہوا۔ تاریخی اعتبار سے یہ ایک فاش غلطی ہے کیونکہ تاریخ ابنِ خلدون اور تاریخ اسلام کے مختلف مرتبین نے ولید کی موت ۹۶ھ میں تحریر کی ہے یہ غلطی یقیناً نادانستہ ہوئی ہوگی۔ کیونکہ صفحہ ۱۷۴ پر کاشغر اور دیگر علاقوں کی فتح کا سن ۹۵ھ درج ہے اور اس کے بعد قتیبہ چین کی سرحدوں تک پہنچتا ہے لیکن قابلِ گرفت بات یہ ہے کہ ناول کے جو ایڈیشن مصنف کی زندگی میں شائع ہو رہے تھے اُن میں اتنی بڑی غلطی کیونکر ہوتی رہی میں نے ۱۹۹۲ء کے موسم گرما میں اُن سے ملاقات کی تھی اور اس وقت تک میں ناولوں کا تحقیقی مطالعہ نہیں کر رہا تھا اس لئے اس جانب اُن کی توجہ نہ دلا سکا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۹۵ھ کے بعد کے واقعات کے لئے وہ یقیناً ۹۶ھ لکھنا چاہتے ہوں گے لیکن نجانے کیسے حروف کے ردوبدل سے ۹۴ھ ضبط تحریر میں آگیا۔

ولید کی موت اور سلیمان کی تخت نشینی فتوحات پر اثر انداز تو ہوئیں تھیں مگر فاتحین کے ساتھ سلیمان کا سلوک تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ مثلاً فاتح سندھ محمد بن قاسم کے بارے میں نسیم حجازی نے واقعات اس طرح ترتیب دیے ہیں:

''محمد بن قاسم پر عرب کے تمام بچے اور بوڑھے فخر کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو بدترین مجرم کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ جب اسے واسط کے قید خانے میں بھیجا گیا تو مجھے بھی اس کی نگرانی کے لئے وہاں پہنچنے کا حکم ہوا۔ واسط کا حاکم صالح پہلے ہی اس کے خون کا پیاسا تھا۔ اُس نے محمد بن قاسم کو سخت اذیتیں دیں۔''[۲]

اس واقعہ کو علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون نے اس طرح رقم کیا ہے:

''صالح بن عبدالرحمٰن نے واسط کے قید خانے میں ڈال دیا اور حجاج کے اعزہ و اقارب کے ساتھ اس کو بھی تکلیفیں دینے

۱۔ داستانِ مجاہد، نسیم حجازی، ص ۱۸۸۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۰۲۔

لگا۔''[1]

جبکہ تاریخ اسلام مرتبہ ڈاکٹر حمید الدین میں یہ الفاظ رقم ہیں:

''صالح نے بھائی کا انتقام محمد بن قاسم سے لینے کی ٹھانی اور دنیائے اسلام کے اس مایۂ ناز جرنیل کو جیل خانے میں طرح طرح کی اذیتیں دے کر مرواڈالا۔''[2]

اور شاہ معین الدین احمد ندوی یوں رقمطراز ہیں:

''صالح نے اس (اپنے بھائی) کا انتقام محمد بن قاسم سے لیا اور اسے قید میں طرح طرح کی تکلیفیں دے کر قتل کردیا۔''[3]

اعجاز الحق قدوسی مزید وضاحت کے ساتھ یوں لکھتے ہیں:

''صالح نے اپنے بھائی آدم خارجی کا انتقام لینے کے لئے جس کو حجاج نے قتل کرایا تھا، محمد بن قاسم کو واسط کے جیل خانے میں آل عقیل کے حوالے کردیا، جنھوں نے ان کو اس قدر زدوکوب کیا کہ وہ ان سزاؤں اور تکلیفوں کو بھگتتے بھگتتے بائیس سال کی عمر میں واسط کے جیل خانے میں انتقال کرگئے۔''[4]

لیکن ان تمام آرا کے برخلاف علی کوفی نے اس واقعہ کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

''لوگوں نے محمد بن قاسم کو خلیفۂ وقت کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے صندوق میں بند کرکے حاضر کیا اور دربانِ خاص سے کہا کہ ولید بن عبدالملک بن مروان کو اطلاع کرے کہ ہم محمد بن قاسم ثقفی کو لے آئے ہیں، خلیفہ نے دریافت کیا کہ ''زندہ ہے یا مردہ''؟ انھوں نے کہا ''خدا خلیفہ کی عمر اور عزت کو دائمی بقا عطا کرے! جب شہر اودھاپور میں فرمان ملا تب حکم کے مطابق [محمد بن قاسم نے] فوراً خود کو کچے چمڑے میں بند کرایا اور دو دن بعد [راہ میں] جان جانِ آفرین خدائے پاک کے حوالے کرکے دارالبقا کو رحلت کرگیا۔''[5]

ناول اور اکثر تاریخی واقعات میں واسط کے قید خانے، صالح اور محمد بن قاسم کے اعتبار سے اور اسے اذیتیں دینے کے حوالے سے مماثلت ہے۔ البتہ ناول میں سزا کے انداز اور اس کے ذلت آمیز ہونے کا تذکرہ بھی ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ مورخ نے واقعات کو سرسری طور پر پیش کردیا اور ناول نگار تخیل کا سہارا لے کر رنگ آمیزی کرکے واقعات کو پیش کرتا ہے یہی اسکا کمال ہے لیکن فتح نامہ از چچ نامہ میں محمد بن قاسم کا جو انجام پیش کیا گیا ہے وہ حقیقت کے مطابق نہیں اور دیگر تاریخ دانوں کی رائے کے خلاف بھی ہے اکثر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ پہلے حجاج بن یوسف کا انتقال ہوا پھر ولید بن عبدالملک کا جس کے بعد سلیمان کی تخت نشینی ہوئی اور پھر سلیمان

---

[1] تاریخ ابنِ خلدون، جلد دوئم؛ علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون/علامہ حکیم احمد حسین الہ آبادی، ص ۲۲۹۔

[2] تاریخ اسلام؛ ڈاکٹر حمید الدین، ص ۳۰۸۔

[3] تاریخ اسلام؛ شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۱۱۵۔

[4] تاریخ سندھ، جلد اول؛ اعجاز الحق قدوسی، ص ۲۲۴۔

[5] فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ؛ علی کوفی/اختر رضوی، ص ۳۵۳۔

اورصالح نے سازباز کر کے محمد بن قاسم کو معزول کر کے موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی چچ نامہ کی رائے اس لئے قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ حجاج کی زندگی میں اس کے داماد سے کس طرح انتقام لیا جا سکتا تھا اور ان سب حالات پر حجاج خاموش رہتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ تقریباً تمام تاریخ دانوں نے محمد بن قاسم کا سندھ میں قیام ۹۶ھ تک بیان کیا ہے اور ولید کا انتقال بھی ۹۶ ہجری میں ہی ہوا تھا۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ محمد بن قاسم کے حوالے سے چچ نامہ کی روایت غلط ہے ایک دوسرے جرنیل قتیبہ بن مسلم باہلی کے بارے میں ناول کے واقعات میں یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ دربارِ خلافت میں خود پیش نہیں ہوا۔ اس لئے اس کے قتل کی سازش تیار ہوئی اور اسے ترکستان ہی میں قتل کرادیا گیا۔ علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

''(وکیع نے) قتیبہ کا سر اور انگوٹھی ازد سے طلب کی اور نہ دینے پر دھمکایا پس ہنواز نے سر اور انگوٹھی کو پیش کردیا۔ وکیع نے سلیمان بن عبدالملک کی خدمت میں بھیج دیا۔''[۱]

بالکل اس جیسے واقعات شاہ معین الدین احمد ندوی نے بھی نقل کئے ہیں۔ اس لئے قتیبہ کے قتل اور اس کا سر دربارِ خلافت میں پیش کرنے کے واقعات ناول اور تاریخ میں یکساں طور پر درج ہیں۔ اسی طرح سلیمان کے دورِ خلافت میں ہونے والے اہم ترین واقعات بالخصوص قسطنطنیہ کی مہم اپنے نام اور زمانے کے اعتبار سے درست ہے جبکہ اس مہم کا ذمہ دار ناول کا تخیلاتی کردار دکھایا گیا ہے البتہ سلیمان کا خود قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والی فوج کی قیادت کرنا اور اس کی فتح سے قبل ۹۹ھ میں مرجانا ناول اور تقریباً تمام تواریخ میں یکساں طور پر درج ہیں۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دورِ خلافت کا تذکرہ ناول میں موجود ہے ناول نگار نے اپنے موضوع کی ضرورت اور کہانی کے تصور کو پیشِ نظر رکھ کر خوب رنگ آمیزی کی ہے اور اس کی گنجائش بھی تاریخی ناول نگاری میں پائی جاتی ہے۔ مورخ محض واقعات کو اہمیت کے اعتبار سے رقم کرتا ہے اور اسی کا سہارا لے کر نسیم حجازی نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی شخصی خوبیوں، رحم دلی اور سلیمان کے دور میں ہونے والے ظلم وستم کے تدارک کو اپنے تخیلاتی کرداروں کے ذریعے خوب خوب اجاگر کیا ہے۔ اس کے بعد کے واقعات اندلس کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ اسلامی افواج کی کامیابیوں اور پھر مختلف قسم کی بغاوتوں کا تذکرہ ناول اور تاریخ دونوں جگہ ملتا ہے البتہ کہانی کا اصل موڑ بربریوں کی بغاوت کے موضوع سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر حمید الدین ان واقعات کو اس طرح لکھتے ہیں:

''اگلے سال (۱۲۳ھ) بربری بغاوت اس شدت سے شروع ہوئی کہ تھوڑے ہی عرصے میں سارے اسلامی افریقہ کو ہلا دیا۔ اس کا بہت بڑا سبب بربریوں اور عربوں کی قدیمی مناقشت تھی، جو ان کے تمدنی تفاوت کا نتیجہ تھی۔ بربری وحشی تھے لیکن طاقت اور تعداد میں زیادہ۔ عرب اپنی تہذیب پر نازاں تھے لیکن طاقت میں حریفوں کے ہم پلہ نہ تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ افریقہ کے خارجی جو امویوں کے ہمیشہ سے دشمن چلے آتے تھے بربریوں سے مل گئے اور ایک نیا جوشیلہ فرقہ پیدا ہو گیا جو اپنے آپ کو صفری کہتے تھے اور شدتِ تعصب کے باعث کسی قسم کے تشدد سے دریغ نہیں کرتے تھے۔''[۲]

---

[۱] تاریخ ابنِ خلدون، جلد دوئم، علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون، علامہ حکیم احمد حسین الہ آبادی، ص ۲۳۷۔

[۲] تاریخ اسلام، ڈاکٹر حمید الدین، ص ۳۳۱۔

ناول کے واقعات میں نعیم کو انہی بغاوتوں کو فرو کرنے کی خاطر میدانِ جنگ میں عملی طور پر حصہ لیتے دکھایا گیا ہے اور ناول میں ان جنگوں کے حوالے سے ۱۲۳ھ اور ۱۲۵ھ کے سن مرقوم ہیں جبکہ قتل کا تذکرہ بھی ملتا ہے یہ وہ واقعات ہیں جو شاہ معین الدین احمد ندوی اور ڈاکٹر حمید الدین نے تواریخ اسلام میں رقم کیے ہیں۔ اس طرح ناول کے تاریخی واقعات میں تسلسل، تاریخی کرداروں کا حقیقی ہونا، جغرافیائی اعتبار سے ان کی صداقت اور افواج کی تعداد کے اعتبار سے مماثلت حقیقت کے عین مطابق ہے۔

اس لیے تاریخی ناول نگاری کے میدان میں نسیم حجازی ایک کامیاب فنکار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ناول کے موضوعات کے لیے اس عہد کے واقعات زیادہ موزوں ہوتے ہیں جو تہذیبی اور تمدنی سرگرمیوں کے اعتبار سے زیادہ پرشکوہ اور معروف ہوں کیونکہ اس قسم کے واقعات اپنی دلچسپی اور دلکشی کے اعتبار سے حقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ قاری کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز رہ سکتے ہیں اور اس طرح ناول نگار تاریخ میں تصرف کرنے کا باعث بھی نہیں بنتا۔ ایک ایسا انداز بھی اختیار کیا جا سکتا ہے جس میں مورخ نے کچھ خلا چھوڑ دیا ہو اور فنکار اپنے تخیلاتی رنگوں کو ان خلاؤں میں اس طرح پر کرے کہ حقیقت بھی متاثر نہ ہو اور تاریخ کا خون بھی نہ ہو اور قاری کو ان کو پڑھتے ہوئے کوئی سقم بھی نہ محسوس ہو۔ اگر اس معیار کو سامنے رکھیں تو ان دونوں اصولوں کو نسیم حجازی نے برقرار رکھا ہے۔ تاریخی حقائق، مقامات، ان کا جغرافیائی محل وقوع، حملہ کی حکمتِ عملی اور اس عہد کا تذکرہ تاریخ کے عین مطابق کیا ہے۔ مثلاً محمد بن قاسم کا دیبل پر حملہ اور اس کے بعد راجا داہر کی فوج سے معرکہ وغیرہ یہاں تاریخ میں جنگی واقعات محدود انداز میں شامل تھے۔ ہاتھیوں کا میدان جنگ میں مسلمان افواج کے لیے آ موجود ہونا ایک مصیبت سے کم نہ تھا۔ یقیناً تیروں کی بارش نے ہاتھیوں کو آگے بڑھنے سے روکا ہوگا لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ کسی مسلمان سپاہی نے انتہائی جرآت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی ہاتھی کی سونڈ کاٹ ڈالی ہو اور پھر جانور زخمی ہو کر زیادہ نقصان دہ ہو جاتا ہے اور جس جانب سے اسے زخمی کیا گیا ہو اس کے مخالف سمت ہی بھاگے گا اور اس معرکے میں ایسا ہی ہوا ہوگا۔ ناول نگار نے تاریخ کے اس ہلکے سے خلا کا سہارا لے کر اپنے قلم کی رنگ آمیزی سے قاری کو خوب خوب محظوظ کیا ہے اور یہ انداز بظاہر تصرف بھی نہیں لگتا۔ اسی طرح نعیم کے واپس جانے اور راستے میں ابنِ صادق کے شکنجے میں پھنس جانے اور وہاں سے نکل بھاگنے کے واقعات میں ان چوکیوں کا سہارا لیا گیا ہے جو ڈاک اور اطلاعات کی غرض سے قائم کی گئیں تھیں۔ بظاہر ان چوکیوں کا مقصد ڈاک اور اطلاعات کی روانی کو برقرار رکھنا ہی ہو لیکن اس قسم کے واقعات جیسا کہ نعیم، اسحٰق، ابنِ صادق اور زلیخا وغیرہ کے ساتھ پیش آئے اس خوبی سے سمو دیئے کہ نہ تاریخ میں تصرف ہوا اور نہ ناول کی دلچسپی متاثر ہوئی اسی طرح قتیبہ بن مسلم باہلی کی فوجی پیش قدمی کا منظر تاریخ کے صفحات سے ناول کے قرطاس پر اتارا گیا ہے البتہ بخارا کی فتح اور جنگ کا نقشہ تبدیل کرنے کے حوالے سے تمیمی سرداروں کا کردار تاریخ میں اہمیت کے ساتھ رقم ہے اسے مزید دلچسپ بنانے کے لئے ندی کو عبور کرنا، اپنے فوجیوں کو فصیل تک پہنچانا وغیرہ وہ تخیلاتی انداز ہے جو مورخ کے قلم سے چھوٹ گیا اور ناول نگار نے اسے اس خوبی سے رقم کر دیا کہ اس میں دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ اسی طرح چین میں سفارت بھیجنے کے حوالے سے ہبیرہ کے زیرِ قیادت جانے والے افراد کا تذکرہ اور اُن کا سخت انداز تقریباً ہر مورخ کے یہاں موجود

ہے اسی کیفیت کو مدنظر رکھ کر بادشاہ چین کے ساتھ نعیم کے مکالمات، اس محفل کو دلچسپ بنانے کے لئے طاؤس ورباب کا استعمال اور حسن آراء کر کردار بظاہر تخیل کی کارفرمائی ہے لیکن یہ تمام تر رنگ آمیزی اُن حالات وواقعات اور کیفیات کے پیش نظر پیدا کی گئیں کہ ایسے یا اس جیسے تخیل کی گنجائش موجود تھی۔ اسی طرح دمشق میں قتیبہ کی طرف سے نعیم کا جانا اور گرفتار کرلیا جانا اس عہد کے حالات کے عین مطابق ہے کیونکہ سلیمان کے دور میں یہی کچھ ہورہا تھا اگر ہم ناول کے اختتامی واقعات اور کشمکش کو زیر بحث لائیں کہ جس سے نعیم دوچار رہوا کہ وہ جنگ میں زہریلے ہتھیاروں سے زخمی ہو کر موت وزیست کی جنگ لڑتا ہے اور اپنے ماضی سے رشتہ بھی جوڑنا چاہتا ہے یہ ناول نگار کی بلا کی کامیاب کارکردگی ہے کہ وہ اپنے قاری کو ہر ہر سطر پر متجسس اور حیران کرتا رہتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نسیم حجازی نے تاریخی ناول نگاری کے فنی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر اس میدان عمل میں کامیاب شہسوار کے طور پر ابتدا کی تھی تو یہ بے جا اور غلط نہ ہوگا۔ یقیناً وہ ایک کامیاب ناول نگار اور تاریخ کے سچے شیدائی تھے۔

محمد بن قاسم کا تحقیقی جائزہ

محمد بن قاسم:

ناول محمد بن قاسم کے واقعات ۸۵ھ سے ۹۶ھ تک کے ہیں۔ ناول کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کے ذیلی موضوعات دس جبکہ دوسرے حصے کے بارہ ہیں۔ کہانی کا آغاز سیلون (سری لنکا) کے ایک ساحلی علاقے سراندیپ کے اس معاشرے سے کیا گیا ہے جہاں عرب اور مقامی آبادی گذشتہ ایک صدی سے ایک ساتھ رہتے بستے تھے۔ اسلام کی روشنی پھیلنے کے بعد عربوں کی فتوحات نے مقامی راجا کو مسلمانوں کے موجودہ مذہب کی طرف راغب کیا اسی دوران عرب تاجروں کا ایک جہاز ساحل سے پرے لنگر انداز ہوتا ہے تو تجارتی سامان کی خریداری کی غرض سے مقامی اور عرب آبادی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں اس جہاز کے قریب جا پہنچتی ہے۔ پھر اس جہاز کے امیر ابوالحسن اور اس کے ایک عرب تاجر ساتھی عبدالشمس کے گھر قیام کرتے ہیں۔ مقامی راجا سے ملاقات اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے ساتھ مقامی عربوں کو اسلام کے دامن میں سمو لیتے ہیں۔ ان نو مسلموں کی تربیت کے لئے طلحہ کو مقرر کر کے باقی تاجر واپسی کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ اِن کے قیام کے دوران ابوالحسن اور عبداللہ (عبدالشمس) کی بیٹی سلمٰی کے درمیان انس پیدا ہو جاتا ہے جو سلمٰی کی ابوالحسن سے مرعوبیت اور ذاتی پسند کی بنا پر پروان چڑھتا ہے۔ تقریباً آٹھ ماہ گزرنے کے بعد ابوالحسن ایک اور تجارتی بیڑے کے ہمراہ سراندیپ کے ساحل پر لنگر انداز ہوتا ہے تو الفت اور انس کی اس کیفیت کو جسے آٹھ ماہ قبل ابتدائی حالت میں چھوڑ گیا تھا اب شادی کے بندھن میں بندھ جاتی ہے۔

ابوالحسن اور سلمٰی کے یہاں خالد اور ناہید کی پیدائش ان کی نیک نامی میں مزید اضافے کا باعث بنتی ہے۔ جب ان بچوں کی عمریں ۱۶ اور ۱۴ سال ہوئیں تو ابوالحسن حج بیت اللہ کی خاطر روانہ ہوتا ہے۔ منصوبے کے مطابق سلمٰی اور بچوں کو بھی اس کے ہمراہ جانا تھا لیکن سلمٰی کی اچانک علالت اسے سفر کی اجازت نہیں دیتی یوں ابوالحسن دیگر عرب خاندانوں اور مقامی نو مسلموں کے ہمراہ راجا کے بہت سے تحائف لے کر روانہ ہو جاتا ہے۔

ناول کے دوسرے حصے میں سراندیپ کے راجا کے دربار کا منظر پیش کیا گیا ہے جہاں راجا کا فوجی سربراہ ایک عرب نوجوان کے ساتھ دربار میں داخل ہو کر اطلاع دیتا ہے کہ سراندیپ سے دمشق اور جدّہ تک کہیں ان کے جہاز کا پتا نہیں چلا اور دمشق میں خلیفہ اور عراق کے گورنر نے آپ کے لئے نیک تمنائیں اور تحائف بھیجے ہیں۔ اس اطلاع کے ساتھ یہ افسوسناک خبر یقین کی صورت اختیار کر جاتی ہے کہ ابوالحسن اور اس کے ساتھیوں کا جہاز کہیں غرقِ آب ہو گیا۔ ایک ہلکا سا شبہ بحری قزاقوں کے بارے میں بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ عرب نوجوان زبیر، خالد اور دیگر عرب خاندانوں سے مل کر انہیں تسلی اور تشفی دینے کے ساتھ دربارِ خلافت کا یہ پیغام بھی پہنچاتا ہے کہ وہ سب اس کے ہمراہ آ جائیں یہیں آ کر اسے ابوالحسن کی بیوی کی موت کا علم ہوتا ہے۔ راجا، اس کا بیٹا، بیٹی اور بیوی، ناہید اور خالد کو نہ جانے کی پیشکش کرتے ہیں مگر خالد جہاد کے جذبے کو ظاہر کر کے روانگی کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ بادلِ ناخواستہ راجا انہیں

جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔

چند دن بعد دو جہاز سراندیپ کی بندرگاہ سے روانہ ہوتے ہیں۔ ایک جہاز میں عرب خاندانوں کے وہ افراد تھے جو بیوہ اور یتیم ہو چکے تھے جبکہ دوسرے جہاز پر راجا کا ایک فوجی وفد بصرہ کے گورنر اور دمشق میں خلیفہ کے لئے تحائف اور جہاز کو حفاظت فراہم کرنے کی غرض سے رواں دواں تھا۔ خوراک اور صاف پانی کے حصول کی خاطر یہ جہاز کئی چھوٹی چھوٹی بندرگاہوں پر رکنے کے بعد سمندر میں روانہ تھے کہ ایک دن دو جہازوں کے تعاقب کا شبہ ہوا۔ ایک جہاز پر دلیپ سنگھ اور دوسرے پر زبیر نے کمال ہوشیاری سے حکمتِ عملی تیار کی۔ پہلے لڑائی تیروں کی بارش تک محدود رہی مگر جلد ہی لٹیروں کے جہازوں کو آگ لگ گئی اکثریت پانی میں ڈوب گئی۔ ایک کشتی پر چند افراد نے سفید پھریرہ لہرا کر امان چاہی۔ ان سب کو جہاز پر لایا گیا۔ دو افراد کے علاوہ تمام قزاق تھے جنہیں کچھ عرصہ قبل انہی بحری قزاقوں نے لوٹ کر یرغمال بنا رکھا تھا اور اب تاوان کے بدلے اِن کی جان بخشی کے خواہش مند تھے مگر اس حادثے نے انہیں خود قیدی بنا دیا۔ قزاقوں کے سردار نے ایک روز اپنی دکھ بھری آپ بیتی سنائی اور آئندہ کے لئے اس پیشے سے دست کش ہونے اور اپنے سابقہ عمل پر توبہ کی تو زبیر کے حکم پر ان کی زنجیریں کھول دی گئیں۔ جب ان سے ابوالحسن اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ جہاز کی بابت باز پرس کی گئی تو انہوں نے بتایا کہ دیبل کے ساحل تک تو یہ جہاز بحفاظت پہنچا تھا لیکن دیبل کے راجا سے کوئی بعید نہیں کہ اس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے جہاز کو لوٹ کر مسافروں کو قید کروا لیا ہو۔ اس موقع پر بحری قزاقوں کے سردار منگو نے وعدہ کیا کہ وہ دیبل پہنچ کر ابوالحسن اور اس کے ساتھیوں کی تلاش میں کاٹھیاواڑ کے راجپوت جے رام کی مدد سے ضرور کوشش کرے گا۔ جب یہ دونوں جہاز دیبل کے ساحل پر لنگر انداز ہوئے تو منگو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وعدے کی تکمیل کے لیے چل دیا۔ جے رام نے گورنر کو ان جہازوں کی اطلاع دی تو اسے اس وقت شدید حیرت کا سامنا ہوا کہ گورنر راجا کے حکم پر ان جہازوں پر قبضہ کرنے اور مسافروں کو یرغمال بنانے کے احکامات حاصل کر چکا ہے۔ اس موقع پر جے رام کو قید کرنے کے بعد گورنر اپنے سپاہیوں کے ہمراہ ساحل پر گیا۔ اسی دوران منگو نے ان سپاہیوں کی نیت صحیح نہ پا کر شہر جانے کے بجائے ساحل کی طرف واپسی کو ترجیح دی۔ گورنر نے دھوکہ دے کر زبیر اور دلیپ کو جہازوں سے بلوا کر اپنے مکروفریب سے آگاہ کیا۔ دلیپ سنگھ کی مزاحمت اسے ابدی نیند سلانے کا باعث بنی البتہ اس نے مرنے سے قبل کلمۂ توحید پڑھ لیا۔ جہازوں پر حملہ ہوا۔ اس حملے کے دوران منگو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جہاز سے خالد، ناہید اور مایا دیوی کو نکال کر ایک طرف لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اگلے دن جے رام کو رہائی ملی۔ جب اس نے اپنی بہن کی بابت معلوم کیا اور دھمکیاں دیں تو گورنر کو سخت پریشانی ہوئی۔ مایا دیوی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی خاطر زبیر اور علی کو درختوں کے ساتھ باندھ کر اتنے کوڑے لگائے گئے کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ اس دوران جے رام انہیں چھڑوانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔ گورنر لوہے کی گرم سلاخ سے زبیر کی آنکھیں ضائع کرنا چاہتا تھا کہ جے رام اپنے مطالبے سے پیچھے ہٹ گیا اور اعلان کیا کہ اس کی بہن جہاز پر نہیں تھی۔ زبیر اور علی کی جاں بخشی کے بعد جے رام قید خانے میں ان سے ملا اور اپنی بے گناہی کا ہر ممکن یقین دلانے کے بعد اپنی بہن، خالد اور ناہید کی تلاش کا وعدہ

کر کے قید خانے سے باہر نکل گیا۔ اسی دوران منگو اپنے ساتھیوں کے ساتھ برہمن آباد سے چار کوس کے فاصلے پر دریائے سندھ کے کنارے گھنے جنگلات میں ایک قلعے میں روپوش ہو گیا جہاں بیمار ناہید کا علاج اور اس قافلے کا انتظار کرنے لگا جو دیبل کے حاکم پرتاب رائے کی قیادت میں راجا داہر سے ملنے والا تھا۔ اسی دوران مایا دیوی کے بارے میں پیدا ہونے والے خدشات اور اس کی بے گناہی ثابت ہو چکی تھی۔ ایک روز پرتاب رائے کا قافلہ قیدیوں کے ہمراہ برہمن آباد کی طرف رواں دواں تھا۔ منگو نے جے رام کو اپنی جانب متوجہ کیا اور اس کی ملاقات بقیہ لوگوں سے ہوئی بہت سے وعدے کرنے کے بعد جے رام دوبارہ اپنے قافلے سے آملا اور جب اسے راجا کے دربار میں بلایا گیا تو پرتاب رائے اس کے خلاف سازش تیار کر چکا تھا۔ راجا کے سامنے اس کی بے باکی اور حقیقت حال کے اظہار نے اسے راجا کے عتاب کا نشانہ بنا دیا۔ لیکن فوجی سربراہ کی مداخلت اس کی وقتی جاں بخشی کا باعث بنی۔ اس سے اگلے دن دربار میں راجا نے مسلمان قیدیوں کی طرف سے زبیر کو طلب کیا اور جب اس نے تلخ اور ترش روی سے راجا کو آڑے ہاتھوں لیا تو اس کے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگا آخر ایک نوجوان سپاہی سے زبیر کا مقابلہ کرایا گیا جس کا اختتام نوجوان کی شکست اور زبیر کی فتح پر ہوا۔ زبیر مہارت اور چابکدستی سے پرتاب رائے پر حملہ آور ہوا اور قریب تھا کہ اسے قتل کر دے کہ راجا کے تمام قیدیوں کے ساتھ انتقام لینے کے فیصلے نے اس کے ہاتھ روک دیے۔ وزیروں کے مشورے سے ان عرب قیدیوں کی رہائی کے بجائے عربوں سے متوقع جنگ کی تیاری شروع کی گئی اور برہمن آباد کے باسیوں کو عربوں کے خوف سے چھٹکارا دلانے کے لئے زبیر اور جے رام کو سرعام پھانسی دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ فیصلے کی تکمیل سے قبل والی رات کو زبیر نے جے رام کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جس پر وہ مسلمان ہو گیا اسی دوران فوجی سربراہ کا بیٹا بھیم سنگھ اس پنجرے کے قریب آیا جس میں یہ دونوں قید تھے اور محافظوں کو ذرا فاصلے پر رکھ کر اپنی گفتگو سے ان دونوں قیدیوں پر اپنی شدید ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے زبیر کے ہاتھوں کی رسی کاٹ کر اسے خنجر دے دیا اور قسمت آزمائی کا مشورہ دے کر محافظوں سے یہ کہتا ہوا چل دیا کہ یہ عرب نوجوان کوئی جادوگر معلوم ہوتا ہے اس سے بات کرتے ہوئے میرا سر چکرانے لگا یہ وہم محافظوں میں بھی سرایت کر گیا کہ عین اسی وقت منگو ایک مچھیرے کے بھیس میں سپاہیوں کو مچھلیاں تقسیم کرنے لگا اور پھر الغوزہ سنانے کی خواہش ظاہر کی جب الغوزہ کی دھن سے یہ لوگ مسحور ہو گئے تو منگو کے ساتھی مختلف گلیوں سے شہریوں کے بھیس میں تماشائیوں کی طرح جمع ہو کر اچانک ان محافظوں پر حملہ آور ہوئے ان کے قتل کے بعد پنجرہ توڑ کر زبیر اور جے رام کو نکال لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ جب یہ لوگ جنگل میں قلعے میں داخل ہوئے تو خالد، ناہید اور مایا دیوی نے ان کا خیر مقدم کیا۔ جب مایا دیوی کو اپنے بھائی کے مسلمان ہونے کا علم ہوا تو اس نے بھی ناہید کی گواہی کے ذریعے یہ اعلان کیا کہ وہ بھی مسلمان ہو چکی ہے۔ منصوبے کے مطابق داسو اور زبیر سندھ کا لباس زیب تن کر کے ناہید کا خط لے کر مکران کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

یہ ناول دو حصوں پر مشتمل ہے اس لئے ناول کے دوسرے حصے کا آغاز زبیر کے بصرہ میں داخل ہو کر حجاج کے سامنے تمام واقعات بتانے اور ناہید کا خط دکھانے سے شروع ہوتے ہیں۔ اس سے قبل کی کیفیت میں حجاج، قتیبہ کے ایک کمسن جرنیل سے ترش

گفتگو کرتا دکھایا گیا ہے لیکن جلد ہی محمد بن قاسم کو پہچان کر اور اس کی جنگی حکمتِ عملی سے متاثر ہو کر اُس کی صلاحیتوں کا معترف ہو جاتا ہے اور اسے فوجی مشیر کی حیثیت سے دمشق میں فرائض کی انجام دہی کے لئے امیر المومنین کے پاس بھیجنا چاہتا ہے کہ اچانک سندھ سے فرار ہونے والے زبیر کی آمد اور ناہید کے خط نے اسے جہاد کے لئے ایک نئے محاذ کھولنے پر آمادہ کیا اسی دوران اپنی بیوی کے مشورے پر اپنی بیٹی زبیدہ کی شادی محمد بن قاسم سے کر دیتا ہے اسکے بعد زبیر اور محمد بن قاسم کو دمشق روانہ کر کے خود فوجی بھرتی کے لئے سرگرم ہو جاتا ہے۔ محمد بن قاسم اور زبیر کی دربارِ خلافت میں آمد اور تمام واقعات سے باعلم ہو کر تمام ہی عہدے دار سندھ کے لئے جہاد کا مشورہ دیتے ہیں اور خود عوام الناس کو اس میں شرکت کے لئے آمادہ کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ اگلے دن حربی سامان اور جنگی کرتب دکھانے کی نمائش منعقد ہوئی۔ شمشیر زنی کے مقابلے میں صالح نے اپنے تمام مدِ مقابل کو ہرا کر تماش بینوں کی طرف فاتحانہ نگاہ ڈالی اور کسی متوقع مدِ مقابل کے مقابلے کی دعوت دی۔ اچانک زبیر اکھاڑے میں نمودار ہوتا ہے اور اس مقابلے کا اختتام صالح کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر گر جانے اور زبیر کی کامیابی پر ہوا۔ نیزہ بازی کے مقابلے میں سلیمان کے مقابلے پر محمد بن قاسم میدان میں آیا اور بغیر زرہ بکتر اور خود کے بہت جلد سلیمان کو شکست دی۔ نوجوانوں میں ایک نوجوان کی کامیابی دیکھ کر عزم و استقلال فلک شگاف نعروں کی گونج میں امنڈ آتا ہے۔ ولید کے اشارے پر محمد بن قاسم نے سندھ میں مسلمانوں کے مقید بیواؤں اور یتیموں کے حالات بیان کئے اور ناہید کا خط پڑھ کر سنایا۔ بے شمار لوگ اس مہم میں شامل ہونے کے لئے خود کو پیش کرنے لگے۔ چند روز فوجی تربیت دے کر کئی ہزار فوج دمشق سے بصرہ کی طرف روانہ ہوئی۔ جہاں سے دیگر سپاہ بھی اس میں شامل ہوگئی جب یہ لشکر مکران پہنچا تو محمد بن قاسم نے ایک پہاڑی علاقے کو منتخب کر کے پیش قدمی کا آغاز کیا۔ دوسری طرف بھیم سنگھ بیس ہزار افواج کے ساتھ لسبیلہ کے قریب ایک قلعے میں اس فوج کی پیش قدمی روکنے کے ارادے سے مقیم تھا۔ محمد بن قاسم نے حکمتِ عملی اختیار کرتے ہوئے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور خود ایک چھوٹے سے گروہ کی قیادت کرتا ہوا قلعے کی جانب بڑھا۔ محمد بن ہارون دوسرے گروہ کی قیادت کرتا ہوا راستہ تبدیل کر کے روانہ ہوا۔ فوجوں میں گھمسان پڑا قلعہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں پہلے ہی آ چکا تھا۔ دوسری طرف سے محمد بن ہارون کی فوج نے راجا داہر کی فوج کو گھیر لیا اور یوں بھیم سنگھ کے تقریباً دو ہزار سپاہی قتل ہوئے اور بقیہ نے فرار میں اپنی نجات سمجھی۔ اسی دوران منگو، ناہید اور خالد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اسی قلعے میں محمد بن قاسم کی فوج سے آملے۔ منگو اور اس کے ساتھیوں نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ اس موقع پر خالد اور زہرہ کی شادی طے کی گئی یہ خوشی زبیر اور ناہید کے عقد کے طے ہو جانے پر دوبالا ہوگئی۔ محمد بن قاسم نے دونوں کا نکاح پڑھایا۔ راجا کی فوج کے زخمیوں کی مرہم پٹی کی گئی اور ان کے سپہ سالار بھیم سنگھ کے ساتھ عفو و درگزر کا سلوک کیا گیا۔ محمد بن قاسم کا اگلا پڑاؤ دیبل کے قریب تھا۔ شہر کا محاصرہ کرنے کے بعد ایک رات وہ اپنی سپاہ کا جائزہ لینے اور چوکسی کرنے والوں کو دیکھتا پھر رہا تھا کہ ایک ٹیلے پر چڑھ کر اس نے زبیر کو صبح کے ستارے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ "ہزاروں ستاروں میں اس کی اپنی اہمیت ہے کہ یہ بہت کم وقت کے لئے نکلتا ہے لیکن ایک بہت اہم پیغام ساتھ لاتا ہے مجھے لگتا ہے کہ میری ذات سے قدرت سندھ میں یہی کام لینا چاہتی ہے جب سمندری راستے

سے بڑی منجنیق پہنچ گئی تو شہر کی فصیل پر سنگ باری کی گئی۔ ایک پتھر نشانہ لگا کر بڑے مندر اور اس پر لہرانے والے جھنڈے کی جانب پھینکا گیا۔ جھنڈا گرنے اور ٹوٹ جانے کے وہم نے فوج کے حوصلے کھو دیے۔ ایک سخت معرکہ ہوا اور بالآخر راجا داہر تقریباً تیس ہزار فوج کے ساتھ دیبل سے فرار ہو گیا۔ محمد بن قاسم نے شہر کا چکر لگایا اپنے سلوک سے یہاں کے لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کیا جس کے نتیجے میں ایک بڑی تعداد دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی اور یوں دیبل سے روانگی کے وقت عرب افواج کے ساتھ ۵ ہزار مقامی افراد بھی شامل تھے۔ دوسری طرف راجا داہر شکست کھا کر نیرون پہنچا جہاں بھیم سنگھ اس سے ملاقات کے لئے آیا اور اپنے اوپر بیتنے والے واقعات اور مسلمانوں کی افواج سے مقابلہ نہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ راجا اسکا بیٹا اور دیگر مصاحبین اسے ڈرپوک اور بزدل کہنے لگے ممکن تھا کہ راجا اسے قتل کرا دیتا۔ اودھے سنگھ کی مداخلت پر ان دونوں کو اندھیری کوٹھڑی میں قید کرا دیا گیا جہاں ان کی ملاقات ابوالحسن سے ہوئی جو مسلمانوں کی فتوحات کا حال سن کر اور اپنے بیٹے اور بیٹی کو زندہ جان کر حیرت زدہ رہ گیا۔ راجا داہر نے نیرون کے بجائے برہمن آباد میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا اور تھوڑی سی فوج نیرون میں چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ ادھر محمد بن قاسم نیرون کی طرف بڑھا اور چند دن محاصرے کے بعد اہلِ شہر نے بڑا دروازہ کھول کر صلح کے جھنڈے لہرا دیے۔ اس کے بعد سیون اور سوستان کا رخ کیا اور وہاں کے راجا کو گرفتار کرنے کے بعد رہا کر دیا جس کے نتیجے میں وہ بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ مسلمان فوج میں شامل ہو گیا۔ دریائے سندھ عبور کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے اپنی فوجوں کی صف بندی کی اور حملے سے قبل ایک تقریر میں کثیر اور قلیل تعداد اور حق و باطل کا مفہوم واضح کیا۔ جنگ کے اختتام پر راجا داہر قتل ہوا اور اس کے ۳۰ ہزار سپاہی کام آئے۔ جب زخمیوں کی مرہم پٹی اور شہداء کی تدفین کا مرحلہ درپیش تھا تو اچانک ایک گھڑ سوار ایک زخمی کو لئے آ پہنچا وہ بھیم سنگھ تھا اور اپنے ساتھ ابوالحسن کو قید خانے سے فرار کرا کے یہاں پہنچا تھا۔ راستے میں بھاگتی ہوئی فوج سے مقابلے میں اودھے سنگھ ہلاک اور ابوالحسن سخت زخمی ہوا۔ محمد بن قاسم نے دیبل سے ناہید اور زہرہ کو بلوا کر زبیر اور خالد کے ساتھ تیمارداری کی موقع فراہم کیا مگر وہ ان چاروں کی موجودگی میں صرف ایک دن زندہ رہ سکا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم کی افواج برہمن آباد کی طرف بڑھی اور تھوڑی سی مزاحمت کے بعد یہ شہر بھی فتح ہو گیا جب افواج قلعے میں داخل ہوئیں تو محل کے ایک کمرے میں پرتاب رائے نے لاڈھی رانی کو فرار ہونے کا مشورہ دیا جس پر وہ چراغ پا ہو گئی اور چند سپاہیوں کی مدد سے اس ظالم کا خاتمہ کر دیا۔ اچانک بھیم سنگھ اس کمرے میں آ پہنچا جہاں لاڈھی رانی نے ایک تیر کمان میں چڑھا کر قلعے میں موجود محمد بن قاسم کا نشانہ لے کر چھوڑ دیا۔ نشانہ خطا ہوا بھیم سنگھ نے رانی سے مسلمان قیدیوں کی بابت معلومات حاصل کیں اور اس کی جاں بخشی کے بارے میں بتایا۔ محمد بن قاسم، زبیر، خالد، ناہید اور زہرہ اس کمرے تک پہنچے جہاں قیدی موجود تھے اور پھر ایک دوسرے سے ملے۔ رانی نے ارور جانے اور اپنے بیٹے کی جاں بخشی کی درخواست کی جسے محمد بن قاسم نے منظور کر لیا مگر لاڈھی رانی کو ارور پہنچ کر شدید مخالفت کا سامنا ہوا۔ اپنے بیٹے، سوتن اور دیگر سرداروں کی نظر میں وہ ایک بزدل کا روپ دھار گئی لیکن محمد بن قاسم کی افواج ارور کے قریب پہنچیں تو راجکمار کے ساتھی سردار اپنی افواج کے ہمراہ فرار ہونے لگے یوں راج کمار کو فرار میں اپنی جاں بخشی نظر آئی۔ اپنی اس فتح

کے بعد محمد بن قاسم سندھ کے آخری سرے ملتان پر فوج کشی کے لئے روانہ ہوا۔ اس دوران اس نے حجاج اور ولید کو اپنی فتوحات کا حال اور سندھ کے حالات اور سندھیوں کے رویے سے باخبر رکھا۔ ملتان کی تسخیر کے بعد وہ ارور واپس آیا۔ اسی دوران اسے حجاج بن یوسف اور اپنی والدہ کی وفات کی خبریں موصول ہوئیں وہ انتظامی اور فوجی امور کو درست کرنے میں مصروف تھا اور چاہتا تھا کہ ہندوستان کے میدانوں کا رخ کرے۔ دوسری طرف سندھ کے عوام کی محبت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح امنڈی پڑتی تھیں۔ ایک دن ایک سنگ تراش نے ایک مجسمہ محمد بن قاسم کا بنایا اور اسے کسی مندر میں نصب کرنا چاہتا تھا کہ محمد بن قاسم کی مداخلت پر سنگ تراش نے اسے توڑ ڈالا۔ مزید آگے بڑھنے کی خواہش میں فوج کے لئے تیاری کا حکم دے کر محمد بن قاسم اپنی فوج کے لشکر کا معائنہ کر رہا تھا کہ اچانک پچاس سواروں کا ایک دستہ گرد اڑاتا ہوا آتا نظر آیا جب یہ گروہ قریب پہنچا تو ایک خط محمد بن قاسم کو پیش کیا گیا جو سلیمان بن عبدالملک کا حکم نامہ تھا کہ محمد بن قاسم کی جگہ یزید بن ابو کبشہ کو مقرر کیا جاتا ہے اور محمد بن قاسم کو پابہ زنجیر دمشق روانہ کیا جائے۔ فوج کے کوچ کا حکم ملتوی کرنے کے بعد سارا دن سندھ کے سردار اور مسلمان فوجی افسران مستقبل کے متوقع حالات پر غور کرتے رہے۔ بھیم سنگھ نے سندھ کی مقامی فوج کی طرف سے یقین دہانی کرائی کہ آپ نہ جائیں مگر محمد بن قاسم نے امیر المومنین کی اطاعت کو اپنا فرض جانا اور بھیم سنگھ اور دیگر سرداروں کو اسلام کی دعوت دی جس پر وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ معززین ارور نے یزید بن کبشہ سے ملاقات کی اور اس یقین دہانی پر کہ ان کا دیوتا واپس مل جائے گا مطمئن ہو گئے۔ نماز عشاء کے بعد یزید بن ابو کبشہ نے محمد بن قاسم سے ملاقات کی اور خود دمشق جا کر خلیفہ کی غلط فہمی دور کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن ابنِ قاسم کے انداز اور امیر کے حکم کی اتباع سے متاثر ہو کر سندھ کے حالات سے واقفیت حاصل کر کے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے زبیر کو بلا بھیجا۔ ایک خط حضرت عمر بن عبدالعزیز کے نام تحریر کیا۔ جس میں محمد بن قاسم کے بارے میں تفصیلات تحریر کیں اور سلیمان کو اس کے قتل سے روکنے کے لئے ذاتی مداخلت کی درخواست کی گئی یہ خط لے کر زبیر مدینے کی طرف روانہ ہوا۔ اگلی صبح محمد بن قاسم، خالد، ناہید، زہرہ اور وہ چالیس سپاہی جو اسے گرفتار کرنے آئے تھے روانگی کے لئے تیار تھے۔ اہلِ ارور کا جمِ غفیر پرنم آنکھوں اور سوگوار انداز سے اپنے محسن کو رخصت کر رہا تھا۔ جب یہ قافلہ دیبل اور مکران سے گزرا تو اس پر پھولوں کی بارش کی گئی۔ اس قافلے کا سردار مالک جو ذاتی طور پر سلیمان کا دوست تھا محمد بن قاسم کے تحمل سے اس قدر متاثر ہوا کہ بصرہ سے تیس کوس کے فاصلے پر اسے فرار کا ایک موقع فراہم کیا کیونکہ یہاں سے صالح اسے واسط لے جانا چاہتا تھا اس موقع پر ابنِ قاسم نے مالک کی رضامندی سے بصرہ جانے کی خواہش ظاہر کی اور اس کے ہمراہ خالد، علی، ناہید اور زہرہ تھے۔ جب وہ اپنے گھر پہنچا تو زبیدہ نیند میں محو تھی خادمہ نے اسے جگایا وہ اس منظر کو کبھی خواب اور کبھی حقیقت سمجھتی رہی اور پھر نیند سے مکمل بیداری پر وہ اپنے شوہر سے آخری ملاقات میں منہمک ہو گئی یہاں تک کہ وقتِ جدائی آن پہنچا۔ زبیدہ نے اپنی آنکھوں میں پوشیدہ آنسوؤں کو روک کر اپنے شوہر کو الوداع کہا۔ دوسری طرف زبیر نہایت نقاہت کی کیفیت میں مدینہ پہنچا اور اپنا مدعا بیان کرنے سے قبل ہی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سامنے بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آنے پر اس نے خط نکال کر دینا چاہا جس پر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسے تسلی دی کہ وہ خط مل چکا

ہے اور وہ ابھی دمشق جا رہے ہیں۔ زبیر نے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی اس کی ضد پر انہوں نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔ دمشق پہنچ کر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سلیمان کو اس کے عمل، انتقام اور مظلوموں پر بے جا تلوار اٹھانے کے عمل سے روکنے کے لئے بڑی لعن طعن کی۔ پہلے سلیمان طیش میں آیا مگر بہت جلد نادم ہو کر کہنے لگا کہ افسوس آپ دو دن تاخیر سے پہنچے میں قتل کا حکم جاری کر چکا ہوں پھر بھی ایک نیا حکم نامہ تحریر کئے دیتا ہوں لیکن تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ زبیر خلیفہ کا خط لے کر روانہ ہوا اور بنا آرام کئے چوکیوں سے گھوڑے بدلتا ہوا منزل کی طرف رواں دواں تھا نیند کا غلبہ، تھکاوٹ اور کمزوری ہر لمحے سفر سے روکنے کے لئے کوشاں تھی مگر ایک امید کے سہارے وہ واسط سے چند کوس کے فاصلے پر صبح کے اس ستارے کو نمودار ہوتا دیکھ رہا تھا جسے دیبل پر حملے سے قبل ایک ٹیلے پر چڑھ کر محمد بن قاسم کے ہمراہ دیکھا تھا اور جس کے بارے میں ابنِ قاسم نے کہا تھا کہ اس کی عمر کس قدر کم اور کام کس قدر اہم ہے۔ صبح کی سپیدی نمودار ہوئی اور مغربی دروازے سے یہ مدہوش سوار داخل ہوا کہ سامنے ایک جنازہ نظر آیا اس نے صالح کا پتا جاننا چاہا لیکن محمد بن قاسم کا جنازہ دیکھ کر اس کے ہاتھ سے خط گر پڑا وہ گھوڑے سے گر کر کچھ بڑبڑانے لگا کہ محمد میں کسی ندی کے کنارے گھنے درخت کے نیچے سو جانا چاہتا ہوں۔ خالد نے اسے جگایا کہ اے دوست اٹھ کہ اب تیرے اور میرے دوست کو قبر میں اتارا جا رہا ہے چل اور اس کی گور پر مٹی ڈال کہ ایک معمر شخص نے زبیر کے لائے ہوئے خط کو پڑھا اور پھر عین اس وقت جب محمد بن قاسم کی قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی پچاس نوجوان صالح کے گھر میں داخل ہوئے اور اسے تہ تیغ کر دیا۔

تحقیقی جائزہ

نسیم حجازی کا انمول ناول محمد بن قاسم تاریخ اور تخیل کا حسین امتزاج ہے۔ انہوں نے اس ناول کے اہم ترین کردار محمد بن قاسم کی سپاہیانہ شان و شوکت، کردار اور اسلام سے محبت اور ان اصولوں کو بالخصوص پیش کیا ہے جو اسلامی معاشرے کی ترتیب میں کارآمد ہوتے ہیں۔ ناول کا اصل موضوع مظلوموں کی دادرسی اور اطاعتِ امیر کے گرد گھومتا ہے۔ اس ناول کے کردار اکثر تاریخی ہیں مثلاً ناول کے اہم کردار محمد بن قاسم، حجاج بن یوسف، ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، صالح ابوالحسن، راجا داہر، دلیپ سنگھ، بھیم سنگھ اور لاڈھی رانی وغیرہ جبکہ جغرافیائی اعتبار سے جن مقامات کا تذکرہ کیا گیا ہے مثلاً سراندیپ، دمشق، بصرہ، مکران، ''دیبل''[۱] ''برہمن آباد''[۲] ''اروڑ''[۳] ملتان اور واسط وغیرہ بھی درست ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ادوار کے اعتبار سے کہانی تاریخ کے عین مطابق نظر آتی ہے اگر ہم اُن عوامل پر غور کریں جو سندھ پر حملے کا باعث بنے تو مختلف مورخوں کی رائے تقریباً ایک ہے۔ مثلاً ڈاکٹر حمید الدین اس واقعہ کو اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''اس زمانے میں کچھ مسلمان تاجر جزائر لنکا میں آباد ہو گئے تھے۔ ان میں سے جب ایک کا انتقال ہوا تو وہاں کے نیک دل راجا نے اس کے پس ماندگان کو جہاز پر سوار کر کے عرب بھیج دیا۔ جب یہ جہاز دیبل کی بندرگاہ کے قریب پہنچا تو سندھ کے بحری لٹیروں نے حملہ کر کے مال و اسباب لوٹ لیا اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا۔ کہتے ہیں کہ گرفتاری کے وقت ایک عورت کے منہ سے بے اختیار نکلا ''فریاد اے حجاج'' حجاج کو اس کی خبر ہوئی تو آنکھوں میں خون اتر آیا اور سندھ کے راجا داہر کو لکھا کہ ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دو اور نقصان کی تلافی کر کے مسلمان عورتوں اور بچوں کو واپس کر دو۔

راجا داہر نے جواب دیا کہ سمندری قزاق میرے قابو سے باہر ہیں اس لئے آپ کے حکم کی تعمیل سے قاصر ہوں آپ خود آ کر ان سے نپٹ لیں''[۴]

جبکہ شاہ معین الدین احمد ندوی رقمطراز ہیں کہ:

---

[۱] دیبل موجودہ آثار قدیمہ بھمبور کا پرانا نام ہے جو کراچی سے ۴۰ میل جنوب میں دریائے سندھ کی کھاڑی کے دائیں کنارے آباد تھا۔ ۱۹۵۱ء میں کھدائی کے بعد نمودار ہوا یہاں ایک قلعے اور مسجد کے آثار ملے مسجد کوفی طرز تعمیر کا نمونہ ہے جسے محمد بن قاسم نے تعمیر کروایا تھا اور یہی سندھ کی پہلی مسجد ہے میں نے ۱۳ مارچ ۲۰۰۲ء کو ڈاکٹر سعید کے ہمراہ اس علاقے کے بارے میں ذاتی طور پر معلومات جمع کیں نیز اردو انسائیکلوپیڈیا کے صفحہ نمبر ۲۵۲ شائع کردہ فیروز سنز لاہور، جنوری ۱۹۸۴ء میں بھی ایسی ہی معلومات درج ہیں۔

[۲] برہمن آباد کے اب محض کھنڈرات موجود ہیں جو حیدرآباد سے شمال مغرب کی طرف شہداد پور سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہیں اس کے بارے میں دو روایات ہیں پہلی کے مطابق ا۔ ایران کے بادشاہ بہمن نے آباد کیا جبکہ دوسری کے مطابق سندھ کے چچ برہمن راجا نے آباد کیا اور جوان کا زیریں دارالحکومت رہا ہے مزید معلومات کے لئے اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، صفحہ نمبر ۲۴۱ شائع کردہ غلام علی پرنٹرز لاہور، ۱۹۸۷ء کا شمارہ ملاحظہ فرمائیں۔

[۳] موجودہ روہڑی سے قومی شاہراہ پر ہتوں عاقل کی طرف سفر کرتے ہوئے تقریباً آٹھ میل کے بعد دائیں جانب کچے راستے پر مزید دو تین میل سفر کے بعد اس کے آثار مل جاتے ہیں جہاں آج بھی ایک مسجد موجود ہے سکھر اور گرد و نواح کے بعض مذہبی ذہن رکھنے والے افراد ٹولیوں کی شکل میں ۱۰ رمضان المبارک کو یہاں جاتے ہیں میں نے بھی ۲۳ مارچ ۲۰۰۱ء کو محمد فاروق خان کے ہمراہ اس جگہ جا کر یہ معلومات اکٹھی کیں۔

[۴] تاریخ اسلام؛ ڈاکٹر حمید الدین، ص ۳۰۴۔

''ولید کے زمانہ میں ایک ناگوار واقعہ نے حجاج کو اسے (سندھ) مستقل فتح کر لینے پر آمادہ کر دیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ لنکا میں کچھ عرب تاجر آباد تھے، ان میں سے ایک تاجر کا انتقال ہو گیا، لنکا کا راجا مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کا خواہش مند تھا ،اس لئے اس نے متوفی تاجر کے اہل وعیال کو جن میں کئی عورتیں تھیں جہاز کے ذریعہ بھجوا دیا اور ولید کے لئے قیمتی تحائف بھیجے، اس جہاز میں کچھ حاجی بھی تھے، دیبل (دیول) کے قریب سندھی قزاقوں نے جہاز پر حملہ کر کے لوٹ لیا اور عربی عورتوں کو گرفتار کر لیا، ان میں سے ایک عورت نے غائبانہ حجاج سے فریاد کی کہ حجاج المدد! حجاج کو اس کی خبر ہوئی تو اس پر اس کا بڑا اثر ہوا، اس نے جواب دیا، میں آیا، اور اسی وقت دیبل کے راجا داہر کو لکھا کہ عرب عورتوں کو واپس بھجوا دو اس نے جواب دیا کہ یہ کام بحری قزاقوں کا ہے اس لئے میں مجبور ہوں۔''[1]

سندھ پر حملے کی وجوہات تفصیل کے ساتھ مولانا اعجاز الحق قدوسی نے یوں درج کی ہیں:

''لنکا جسے سیلون بھی کہتے ہیں یہاں کچھ عرب مسلمان تاجر رہتے تھے۔ ولید بن عبدالملک کی حکومت کا سکہ دور دور بیٹھا ہوا تھا اس وقت بڑے بڑے بادشاہ ولید سے دوستی کی تمنا رکھتے تھے۔ لنکا کا راجا بھی چاہتا تھا کہ وہ ولید سے دوستی بڑھائے۔ اتفاق کی بات کہ جو مسلمان تاجر لنکا میں رہتے تھے ان میں سے ایک تاجر کا انتقال ہو گیا۔ لنکا کے راجا نے اس تاجر کے بیوی بچوں کو بڑے آرام سے ایک جہاز میں سوار کر کے خلیفہ ولید کے لئے بڑے قیمتی تحائف بھی روانہ کئے تاکہ وہ انکی طرف سے بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے جائیں یہ جہاز چونکہ عراق جارہا تھا اس جہاز میں کچھ حاجی بھی سوار ہو گئے۔ جہاز جب سندھ کی بندرگاہ دیبل کے قریب پہنچا تو سندھ کے سمندری ڈاکوؤں نے جہاز والوں کا مال واسباب لوٹ لیا اور ان میں سے اکثر کو قید کر لیا۔ جب قزاق پکڑ دھکڑ کر رہے تھے تو ان قیدیوں میں سے ایک لڑکی نے حجاج کی دہائی دی لیکن ڈاکوؤں نے اس کی بھی پروا نہ کی۔ اس قافلے کے بچے کھچے لوگ عراق پہنچے انہوں نے رو رو کر اس لڑکی کی فریاد حجاج تک پہنچائی۔ حجاج پر ان مظلوم مسلمانوں کی فریاد کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے خلیفہ ولید بن عبدالملک کو لکھا کہ مجھے سندھ سے جہاد کی اجازت دی جائے۔ اس نے حجاج کو فوراً اجازت دے دی۔ اب حجاج نے سندھ کے راجا داہر کو لکھا کہ ہمارے ملک کے لوگ جو تمہارے علاقے میں قید کر لئے گئے ہیں ان کو عزت کے ساتھ واپس کرو اور ہمارے لوگوں کے مال واسباب کا جو نقصان ہوا ہے اس کا تاوان بھی دو۔

راجا داہر کو جب حجاج کا خط ملا تو اس نے جواب میں لکھا کہ یہ جو کچھ بھی ظلم ہوا ہے سمندری ڈاکوؤں کا کام ہے۔ جن پر ہمارا زور نہیں چلتا، اس لئے میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔''[2]

تقریباً ایسی ہی روایت علی کوفی نے ان الفاظ میں نقل کی ہے:

''جب [یہ بحری بیڑا] ملک قازرون [کے قریب] پہنچا ہوا [سخت] مخالف ہوگئی [جس کی وجہ سے] جہازوں کا رخ پھیر کر دو

---

[1] تاریخ اسلام (جلد دوئم) شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۸۹۔

[2] سندھ کی منزل کی کہانیاں: مولانا اعجاز الحق قدوسی ص نمبر ۳۹۔

دیبل کے کنارے جا لگے [لیکن یہاں] قزاقوں کے ایک گروہ نے جسے نکامرہ کہتے تھے اور [وہ دیبل] کے باشندے تھے نے ان آٹھوں جہازوں کو گرفتار کر کے اس میں لدے ہوئے سامان پر قبضہ کرلیا اور مردوں اور عورتوں کو گرفتار کر کے سارا سامان اور جواہرات [وغیرہ] سب لوٹ لئے۔ سراندیپ کے بادشاہ کے آدمیوں اور عورتوں نے بہتیرا کہا کہ یہ مال وہ لوگ خلیفۂ وقت کے لئے لے جا رہے ہیں مگر انھوں نے توجہ نہ کی اور سب کو بند کر کے کہا کہ ''اگر کوئی تمھاری دادرسی کرنے والا ہے [تو اس کے توسل سے] خود کو پھر سے خرید لو'' اس پر ایک عورت نے چیخ کر کہا کہ] ''یا حَجّاج ایا حَجّاج اَغِثنِی اَغِثنِی (اے حجاج ! اے حجاج ! میری مدد کو پہنچ ، میری مدد کو پہنچ) یہ عورت قبیلۂ بنی عزیز میں سے تھی۔ حجاج نے یہ بات سن کر ''لبیک لبیک'' کہا۔

واسط اسعدی نے بیان کیا کہ ''جب دیبل فتح ہوا تو میں نے اس عورت کو دیکھا، اس کا رنگ سفید اور قد لمبا تھا۔''[۱]

ان واقعات کی جو مختلف تاریخوں میں رقم ہیں اور جن کی بنا پر اسلامی افواج سندھ پر حملہ آور ہوئیں سب سے مفصل حالات فیض عالم صدیقی نے اس طرح مرقوم کئے ہیں:

''چند عرب خاندان سراندیپ (موجودہ سری لنکا) اور جنوبی ہند کے مغربی ساحل کے بعض مقامات پر اپنی تجارتی کوٹھیاں بنا کر رہائش پذیر تھے۔ ان عرب تاجروں کی اپنے آبائی وطن میں باقاعدہ آمد و رفت تھی۔ اسلام کا چرچا پھیلا اور وطن میں مقیم ان کے رشتہ داروں نے اسلام قبول کیا تو یہ لوگ بھی آہستہ آہستہ حلقہ بگوش اسلام ہوتے چلے گئے۔

ان نو مسلم عرب تاجروں کے اخلاق، تدین اور نیکوکارانہ خصائل نے مقامی حکمرانوں کے دلوں پر بڑا اچھا اثر کیا۔ امیر المومنین ولید بن عبدالملک کے سنہری دور میں مسلمانوں کی فتوحات سے متاثر ہو کر خلیفۂ اسلام سے تعلقات پیدا کرنے چاہے۔ ان راجوں کو خلیفہ اسلام سے تعلق پیدا کرنے کی آسان صورت یہ نظر آئی کہ نو مسلم عرب تاجروں کو ذریعہ بنایا جائے۔ اتفاقاً انہی ایام میں ابوالحسن نامی ایک سربرآوردہ تاجر مع اپنے قافلے کے سراندیپ سے وطن واپس جاتے ہوئے دیبل کے ساحل پر داہر کے گورنر کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ اور گورنر نے سراندیپ کے حکمران کی طرف سے امیر المومنین کی خدمت میں بھیجے گئے تمام تحائف چھین لئے۔ ابوالحسن کے مفقود الخبر ہونے پر سراندیپ کے راجا نے امیر المومنین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے خاندان کی مستورات اور چند دیگر مسلمان بیوگان اور بچوں کو چند جہازوں میں سوار کر کے اپنے ایک معتمد دلیپ سنگھ کے ہمراہ امیر حجاج کی طرف روانہ کر دیا مگر یہ قافلہ پہلے قافلے کی طرح پرتاب رائے نے لوٹ لیا مردوں کو قتل کر دیا اور عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے راجا داہر کی خدمت میں بھیج دیا۔''[۲]

ناول میں حملے کے لئے جو اسباب بیان کئے گئے ان پانچوں آراء کے عین مطابق ہیں یعنی عرب خاندانوں کے بحری جہازوں کا دیبل کے قریب لٹ جانا اور مسافروں کا گرفتار ہونا پھر ایک لڑکی کی پکار اور حجاج کا امیر المومنین سے اجازت لے کر حملے کا ارادہ۔ یہاں یہ امر دلچسپ ہے کہ فیض عالم صدیقی نے ناول کے سب سے زیادہ قریب تر حالات رقم کئے ہیں اور ان کے یہاں ناموں

---

[۱] فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ، علی کوفی، اختر رضوی، ص ۱۱۹۔

[۲] اسلام کے نامور سپہ سالار، فیض عالم صدیقی، ص ۳۰،۲۹۔

کا استعمال ناول کے کرداروں کے بہت حد تک قریب ہے مثلاً ابوالحسن، دلیپ سنگھ اور پرتاب رائے وغیرہ یہاں یہ امر بحث طلب ہے کہ حجاج تک اس واقعے کی اطلاع کس طرح پہنچی کیونکہ دیبل کے مقام پر کسی لڑکی کا پکارنا حجاج کو کیونکر معلوم ہو سکتا تھا اس لئے کہ وہاں کوئی غیر جانب دار فرد موجود نہ تھا جو اس خبر کو آگے تک پہنچاتا البتہ ناول نگار نے جس چابکدستی کا سہارا لے کر اس موقع پر ایک کشتی کے ذریعے کچھ مسافروں کو فرار ہوتے دکھایا اور جو آگے چل کر حجاج تک خبر پہنچانے کا باعث بنے یہ حقیقت فیض عالم صدیقی نے اس طرح بیان کی ہے:

''یہ حجاج بن یوسف تھا جس کے آہنی پنجے سے دشمن تک پناہ مانگتے تھے جسکی تلوار عرب کے تخریب کاروں اور عجم کے دشمنوں پر صاعقہ بن کر کوندی۔ اچانک اس کی اس خلوت گاہ کے دروازے پر ایک شکستہ حال نووارد نمودار ہو کر چلاتا ہے۔ یا امیر! سراندیپ سے آنے والے مسلمانوں کا قافلہ سندھ کے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ مردوں کو قتل کر دیا اور عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے سندھ کے اندرونی حصوں میں لے گئے۔ گرفتاری کے وقت ایک نوجوان عورت کے منہ سے یا حجاج ادرکنی کی چیخ بلند ہوئی۔ میں اس بے بس مسلمان عورت کے یہ الفاظ آپ کے گوش گزار کرنے کے لئے منزلوں پر منزلیں مارتا آپ کے حضور میں پہنچا ہوں۔

حجاج ٹہلتے ٹہلتے رک گیا اور جونہی اس کے کانوں میں یا حجاج! کے الفاظ پہنچے تو بے اختیار اس کی زبان پر لبیک لبیک کے الفاظ جاری ہو گئے۔''[۱]

ایک اور معاملہ جو ناول اور تواریخ میں متنازع انداز میں مرقوم ہے۔ حجاج بن یوسف اور محمد بن قاسم کے درمیان رشتے کا ہے۔ ناول نگار محمد بن قاسم کو حجاج کا بھتیجا اور داماد قرار دیتا ہے جبکہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون رقمطراز ہیں:

''حجاج نے سرحد سندھ پر اپنے چچازاد بھائی محمد بن قاسم محمد بن الحکم بن ابی عقیل کو بسر افسری چھ ہزار جنگ آوروں کے مامور کیا تھا۔''[۲]

اسی رائے سے شاہ معین الدین احمد ندوی نے اتفاق کرتے ہوئے رقم کیا ہے کہ:

''اس لئے اس (حجاج بن یوسف) نے اپنے نوجوان چچیرے بھائی محمد بن قاسم ثقفی کو جو فارس کا حاکم تھا، چھ ہزار سپاہ کے ساتھ سندھ روانہ کیا''[۳]

شیخ محمد اکرام نے بھی تقریباً یہی روایت نقل کی ہے:

''اور اس کی قیادت کے لئے اپنے (حجاج بن یوسف نے) داماد اور چچازاد بھائی عمادالدین محمد بن قاسم کو چنا۔ جس کی عمر وقت صرف سترہ سال کی تھی۔''[۴]

---

[۱] اسلام کے نامور سپہ سالار، فیض عالم صدیقی، ص ۴۰، ۴۱۔
[۲] تاریخ ابن خلدون، جلد دوئم، علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون، ص ۲۱۷۔
[۳] تاریخ اسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۸۹۔
[۴] آبِ کوثر، شیخ محمد اکرام، ص ۴۴، ۴۵۔

علامہ ابن کثیر نے محمد بن قاسم کو حجاج کا عم زاد بھائی قرار دیا ہے جبکہ ڈاکٹر حمید الدین رقمطراز ہیں:

''اس نے (حجاج بن یوسف) اپنے داماد محمد بن قاسم کو حکم دیا کہ وہ سندھ پر لشکر کشی کرے۔'' [۱]

اسی رائے کو مزید تقویت فیض عالم صدیقی کے اس جملے سے پہنچتی ہے:

''محمد بن قاسم سے امیر حجاج نے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا اور اسے بڑی نیک تمناؤں کے ساتھ سندھ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔'' [۲]

ایک اور رائے جو مندرجہ بالا دونوں آراء سے مختلف ہے ڈاکٹر اعجاز الحق قدوسی نے یوں نقل کی ہے:

''حجاج نے محمد بن قاسم کو جو حجاج کا بھتیجا اور اس کا داماد بھی جس کی عمر اس وقت سترہ سال تھی سندھ کی مہم کا سپہ سالار بنایا۔'' [۳]

ابتدائی روایات گو کہ مستند مورخین کی ہیں اور ثانوی الذکر تینوں آراء بھی خاصی مستند ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہماری اکثر درسی کتب معاشرتی علوم اور بچوں کے لئے مرتب کردہ چھوٹی کہانیوں میں محمد بن قاسم کو حجاج بن یوسف کا بھتیجا اور داماد ہی قرار دیا جاتا ہے۔ علی کوفی نے اسی جانب زور دیا ہے:

''جب دارالخلافہ کی جانب سے ملک سندھ حجاج بن یوسف ثقفی کے حوالے ہوا تو اس نے محمد بن قاسم کو جو کہ اس کے چچا [کے بیٹے] کا بیٹا اور نواسہ بھی تھا اور حجاج کی بیٹی اس کے گھر میں تھی، ہند کا گورنر مقرر کیا۔'' [۴]

اور یقیناً اسی کا لحاظ کرتے ہوئے نسیم حجازی نے اسی رشتے کو اپنے ناول میں پیش کیا ہے یعنی پہلے محمد بن قاسم بھتیجا تھا اور پھر حجاج نے اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کر دیا۔ اس طرح وہ داماد بن گیا۔ یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ بھتیجے اور داماد کا رشتہ عام طور پر زیادہ قرینِ قیاس ہے لیکن چچازاد بھائی سے بیٹی کا رشتہ کرنے کی روایت عربوں میں موجود تھی خود نبی اکرم ﷺ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ الزہراؓ کا نکاح اپنے چچازاد بھائی حضرت علیؓ سے کیا تھا۔ اس لئے چچازاد بھائی یا بھتیجے اور پھر داماد کی اصطلاح کوئی بھی درست ہو سکتی ہے اور ناول نگار نے بھتیجے اور داماد کے قرینِ قیاس رشتہ کو اپنے ناول میں سمو دیا ہے۔ اس کے بعد محمد بن قاسم کے ساتھ فوج کی تعداد اور سامانِ حرب کی روانگی کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ اس سلسلے میں عبدالرحمٰن ابنِ خلدون اور شاہ معین الدین احمد ندوی کی نقل کردہ اوپر کی روایات میں فوج کی تعداد چھ ہزار بیان کی گئی ہے اسی تعداد کو ڈاکٹر حمید الدین ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''اس (محمد بن قاسم) کی امداد کے لئے چھ ہزار شامیوں کی ایک فوج بھیج دی۔'' [۵]

۱۔ تاریخ اسلام، ڈاکٹر حمید الدین، ص ۳۰۵۔

۲۔ اسلام کے نامور سپہ سالار، فیض عالم صدیقی، ص ۲۴۰۔

۳۔ سندھ کی تاریخی کہانیاں، مولانا اعجاز الحق قدوسی، جلد اول، ص ۵۴۔

۴۔ فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ، علی کوفی / اختر رضوی، ص ۱۲۲۔

۵۔ تاریخ اسلام، ڈاکٹر حمید الدین احمد ندوی، ص ۳۰۵۔

اسی رائے کو مزید تقویت شیخ محمد اکرام کی اس رائے سے ہوتی ہے:

''محمد بن قاسم چھ ہزار سوار لے کر خشکی کے راستے ۷۱۱ء کے موسم خزاں میں دیبل پہنچا۔[۱]

اسی رائے سے انوار ہاشمی اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''محمد بن قاسم بارہ ہزار کا لشکر لے کر خشکی کے راستے روانہ ہوا تھا۔ بارہ ہزار میں چھ ہزار شامی اور چھ ہزار سپاہی تھے۔[۲]

اس تعداد سے کچھ اختلاف مولانا اعجاز الحق قدوسی نے کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''پانچ ہزار بہادر اور پانچ ہزار تیز رفتار سانڈنیاں ان بہادروں کی سواری کے لئے دیں۔ اس کے علاوہ بوجھ لادنے والے کئی ہزار اونٹ بھی ساتھ کیے۔''[۳]

یہاں بہت تھوڑا سا اختلاف ہے اکثر مورخین نے دمشق سے روانہ ہوتے وقت فوج کی تعداد چھ ہزار بیان کی ہے جبکہ اعجاز الحق قدوسی پانچ ہزار فوج کی تعداد بیان کرتے ہیں۔ ناول نگار نے دمشق سے روانگی کے وقت فوج کی تعداد پانچ ہزار رقم کی ہے البتہ دیگر مورخین نے کل لشکر کی تعداد بیان نہیں کی جبکہ انوار ہاشمی نے بصرہ سے روانگی کے وقت لشکر کی کل تعداد بارہ ہزار بیان کی ہے اور ناول نگار نے بھی اس رعایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لشکر کی تعداد بارہ ہزار بیان کی ہے ویسے لوگ حجاج کے مخالف رہے ہیں لیکن سندھ کے محاذ پر فوج میں شامل ہونے کے لئے ان کی شمولیت کسی شک وشبہ سے بالاتر سمجھنی چاہیے کیونکہ قیدی لڑکی کا خط عوام اور خواص سبھی کی توجہ کا باعث رہا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امیر المومنین نے پانچ ہزار فوج روانہ کی ہو اور راستے میں لوگوں کے لشکر میں شامل ہونے اور بصرہ پہنچنے تک یہ تعداد چھ ہزار ہوگئی۔ ہو خود حجاج اس نئے محاذ کے لئے فوج جمع کرنے میں مصروف تھا۔ اس لئے بصرہ سے روانگی کے وقت اس لشکر کی کل تعداد انوار ہاشمی اور ناول نگار کے بیان کے عین مطابق بارہ ہزار رہی ہوگی چونکہ لشکر کے ساتھ منجنیق اور دیگر فوجی ساز وسامان بھی موجود تھا اسے بحری راستے سے بھیجا گیا۔ بالخصوص عروس نامی منجنیق جسے پانچ سو افراد حرکت دیتے تھے۔ ڈاکٹر حمید الدین اس کا حال یوں لکھتے ہیں:

''محمد بن قاسم نے اپنی فوج کے دو حصے کیے۔ ایک حصہ جس میں توپ خانہ اور پیدل فوج تھی، سمندر کی راہ روانہ کیا اور دوسرا حصہ جو سوار دستوں پر مشتمل تھا خود ساتھ لے کر چل پڑا۔''[۴]

اسی رائے سے شاہ معین الدین احمد ندوی بھی اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس (محمد بن قاسم) کے پہنچنے کے ساتھ ہی وہ سامان بھی جسے بحری راستے سے بھیجا تھا پہنچ گیا، اس میں ایک قلعہ شکن منجنیق تھی جسے پانسو آدمی حرکت دیتے تھے، اس کا نام عروس تھا۔''[۵]

---

[۱] آب کوثر، شیخ محمد اکرام، ص ۲۴۔

[۲] تاریخ پاک وہند؛ انوار ہاشمی، ص ۲۸۔

[۳] سندھ کی تاریخی کہانیاں؛ مولانا اعجاز الحق قدوسی، جلد اول، ص ۵۳۔

[۴] تاریخ اسلام؛ ڈاکٹر حمید الدین، ص ۳۰۵۔

[۵] تاریخ اسلام؛ شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۸۹، ۹۰۔

علی کوفی نے اس بارے میں تحریر کیا ہے:

''ایک منجنیق خاص امیر المومنین کی تھی جس کا نام ''عروسک'' [یہ اتنی بڑی تھی کہ] جب پانچ سو آدمی اُس کے لنگر کو کھینچتے تھے تب اس میں سے پتھر چھوٹتا تھا۔''[۱]

شیخ محمد اکرام نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے:

''بالآخر العروس نامی ایک بڑی منجنیق کی مدد سے جسے پانسو آدمی چلاتے تھے۔''[۲]

انوار ہاشمی رقمطراز ہیں:

''ساتھ ہی حجاج نے بحری راستے سے بہت سا سامان جنگ بھی روانہ کیا۔ اس میں عروس نامی ایک قلعہ شکن منجنیق (پتھر برسانے والی مشین) بھی شامل تھی۔''[۳]

مولانا اعجاز الحق قدوسی نے مرقوم کیا ہے:

''اس کے سوا فوجی ضرورتوں کا تمام سامان جہازوں پر لاد کر سمندری راستے دیبل بھیجا جس میں کئی منجنیقیں بھی تھیں جن سے دشمنوں کے قلعے پر پتھر پھینکے جا سکتے تھے۔''[۴]

اس رائے کو مزید تقویت سید سلیمان ندوی کی اس تحریر سے ملتی ہے:

''۹۳ھ میں محمد بن قاسم ثقفی کے زیرِ ہدایت سندھ پر جو حملہ کیا اس میں گو وہ اور اس کی فوج کا ایک حصہ شیراز کی راہ مکران ہو کر سندھ پر حملہ آور ہوا مگر اس کا دوسرا حصہ مع تمام سامان اور آلاتِ جنگ کے بحری راستے سے آیا اور بندرگاہ ٹھٹھہ (دیبل) پر قبضہ کر کے آگے بڑھا۔''[۵]

اس طرح یہ بات طے ہوئی کہ فوج دو حصوں پر مشتمل تھی ایک حصہ خشکی کے راستے اور دوسرا بحری راستے دیبل پہنچا جس میں منجنیق عروس بھی شامل تھی۔ جو دیبل اور بعد کے معرکوں میں ایک اہم ہتھیار کے طور پر استعمال ہوئی۔

جس فوج کی قیادت محمد بن قاسم کر رہا تھا وہ زمینی راستے سے شیراز اور مکران سے ہوتی ہوئے سندھ کی حدود میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ قبل اس کے مکران کے حاکم محمد بن ہارون کو بھی فوج میں شامل کر لیا گیا۔ اس سلسلے میں ناول نگار کی مندرجہ بالا رائے میر علی شیر قانع اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حجاج کے اشارے کے مطابق محمد بن ہارون بھی اپنی علالت کے باوجود اس کے ہمراہ ہو گیا۔''[۶]

۱؎ فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ: علی کوفی / اختر رضوی، ص ۱۲۸۔

۲؎ آبِ کوثر: شیخ محمد اکرام، ص ۲۴۔

۳؎ تاریخ پاک و ہند، انوار ہاشمی، ص ۲۸۔

۴؎ سندھ کی تاریخی کہانیاں: مولانا اعجاز الحق قدوسی، ص ۵۴۔

۵؎ عربوں کی جہازرانی: سید سلیمان ندوی، ص ۴۲۔

۶؎ تحفۃ الکرام، میر علی شیر قانع، ص ۳۵۔

اس رائے سے علی کوفی نے بھی اتفاق کیا ہے وہ روایت کرتے ہیں:

''محمد بن قاسم وہاں سے ارمابیل کی جانب روانہ ہوا اور محمد [بن] ہارون نے بھی اُس کے ساتھ [چلنے کا] مصمم ارادہ کیا۔ وہ حالانکہ بیمار تھا مگر پھر بھی اس نے محمد بن قاسم کی [سفر میں] رفاقت کی۔''[۱]

تقریباً ایسی ہی روایت تاریخ سندھ میں بیان ہوئی ہے۔

''محمد بن قاسم ارمن بیلے کی طرف روانہ ہوئے۔ محمد بن ہارون اُس وقت بیمار تھا باوجود بیماری کے اس نے اس مہم میں شرکت پر اصرار کیا، محمد بن قاسم نے اس کو ساتھ لے لیا۔''[۲]

اور یہ قافلہ ارمن بیلہ پہنچا جہاں پہلا معرکہ درپیش تھا۔ ناول نگار کے مطابق راجا داہر کا ایک سپہ سالار بھیم سنگھ تقریباً بیس ہزار فوج لے کر مقابلے پر آیا اس روایت کو فیض عالم صدیقی نے یوں بیان کیا ہے:

''لسبیلہ میں سندھی گورنر کی مدد کے لئے اپنے سپہ سالار بھیم سنگھ کو داہر پہلے ہی روانہ کر چکا تھا۔ اس مقام پر سندھی لشکر ایک مضبوط قلعہ میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنا چکا تھا۔ مگر محمد بن قاسم کے طوفانی حملوں نے قلعہ فتح کر کے سندھی لشکر کا کچومر نکال کر رکھ دیا۔''[۳]

اس معرکے کا تذکرہ مولانا اعجاز الحق قدوسی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''انہوں (محمد بن قاسم) نے ریاست لس بیلہ کے پایہ تخت ارمن بیلہ کو گھیرے میں لے کر فتح کر لیا۔''[۴]

مذکورہ واقعات اور روایات اس معرکے کی حقیقت کو ثابت کرتے ہیں اور یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ دیبل سے پہلے ہی محمد بن قاسم کو راجا داہر کی افواج سے مقابلہ کرنا پڑا تھا اور خود راجا داہر اور اس کے مشیروں کی خواہش یہ رہی ہوگی کہ محمد بن قاسم کو مکران کے قریب ہی روک لیا جائے تاکہ وہ پسپا ہونے پر مجبور ہو جائے مگر ہمت و شجاعت اور دلیری کا یہ پیکر آگے کی جانب بڑھنے کا حوصلہ لئے رواں دواں تھا اور اس نے دیبل کے قلعے کے نزدیک پہنچ کر اپنی فوجوں کو صف آراء کیا۔ دوسری طرف راجا داہر کے گورنر پرتاب رائے نے قلعہ بند ہو کر مسلمانوں کی افواج کو محض محاصرے پر مجبور کرنے اور یوں ہی تھکا دینے کی حکمتِ عملی پر عمل کیا۔ اس محاصرے کے بارے میں مختلف رائے ہیں کہ کتنے دن رہا لیکن محاصرے کے اختتام اور جنگ کی باقاعدہ ابتدا کے سلسلے میں مستند روایات ہیں کہ ایک برہمن کی زبانی قلعے کے گنبد اسکی اہمیت کے بارے میں جان کر اسے گرانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس کام کے لئے جس منجنیق کا استعمال کیا گیا وہ عروس نامی تھی جو بحری راستے سے یہاں تک پہنچی تھی۔ اس سلسلے میں دو مختلف آراء ہیں کہ منجنیق نشانہ باز نے انعام کی بدولت اور دوسری روایت کے مطابق حجاج نے نقشہ جنگ دیکھ کر منجنیق کا زاویہ متعین کر کے سنگ باری کا مشورہ دیا تھا مشہور ہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ

---

[۱] فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ، علی کوفی / اختر رضوی، ص ۱۳۲

[۲] اسلام کے نامور سپہ سالار، فیض عالم صدیقی، ص ۴۳۔

[۳] ایضاً۔

[۴] سندھ کی تاریخی کہانیاں، مولانا اعجاز الحق قدوسی، جلد اول، ص ۲۵

اس مندر کے گنبد کے ٹوٹنے سے قبل محض محاصرے تک حالات محدود تھے اس سلسلے میں میر علی شیر قانع رقمطراز ہیں:

''ایک برہمن نے قلعے سے نکل کر امان طلب کی اور محمد بن قاسم کے پاس حاضر ہو کر بولا کہ'' مجھے اپنی کتابوں سے معلوم ہوا ہے کہ یہ ملک اسلام کے زیرِ نگیں ہوگا اور اس کا وقت یہی ہے یہ بھی یقین ہے کہ اس فتح کو حاصل کرنے والا بھی تو ہی ہے اس لئے میں تیری رہنمائی کرنے آیا ہوں بزرگوں نے اس بت خانے کے جھنڈے میں ایک طلسم رکھا ہے چنانچہ جب تک یہ نہ ٹوٹے گا اس وقت تک یہ قلعہ ہرگز فتح نہ ہوگا اس لئے پہلے اسے توڑنے کی تدبیر کر'' محمد بن قاسم اس پر غور کرنے لگا۔ جھوئہ منجنیق نے کہا کہ'' اگر مجھے دس ہزار درم انعام دیں تو میں شرط کرتا ہوں کہ تین نشانوں سے میں اس جھنڈے اور گنبد کو برباد کردوں گا ورنہ میرے ہاتھ قلم کر ڈالے جائیں۔''[۱]

مولانا اعجاز الحق قدوسی بھی ایسی ہی روایت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلمان اسی شش و پنج میں تھے کہ اس شہر کو کس طرح فتح کیا جائے کہ اچانک ایک دن ایک برہمن شہر پناہ سے نکل کر اسلامی لشکر میں آیا اور اس نے محمد بن قاسم سے جان کی امان طلب کرتے ہوئے کہا'' خدا امیر کی عمر دراز کرے ہمیں نجوم کی کتابوں سے معلوم ہوا ہے کہ سندھ کا ملک مسلمان فتح کرلیں گے لیکن جب تک کہ یہ بت خانہ برقرار ہے، اس شہر کو فتح کرنا ممکن نہیں۔ آپ کو اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ بت خانہ مسمار ہو اور اس پر جو جھنڈا لہرا رہا ہے وہ کسی طرح پارہ پارہ ہو اسی میں اس شہر کی فتح کا راز ہے۔''[۲]

اسی روایت کو مزید تقویت ڈاکٹر حمید الدین ان الفاظ میں دیتے ہیں:

''جاسوسوں نے خبر دی کہ جب تک شہر کے مندر کا جھنڈا اپنی جگہ قائم ہے اس وقت تک ہندو ہار نہیں مانیں گے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ جھنڈے کے نیچے بیٹھا ہوا دیوتا برابر ان کی مدد کر رہا ہے۔''[۳]

اسی سے ملتی جلتی رائے انوار ہاشمی نے رقم کی ہے:

''اسی اثنا میں یہ پتا چلا کہ قلعے کے اندر مکینوں کا خیال ہے کہ جب تک ان کے مندر کے کلس پر ان کا مذہبی جھنڈا لہراتا رہے گا وہ شکست نہیں کھا سکتے کیونکہ ان کا دیوتا ان کا مددگار ہے۔ منجنیق کی مدد سے مندر کے کلس پر پتھر برسائے گئے اور بہت جلد کلس ٹوٹ کر گر پڑا۔''[۴]

ان روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ناول نگار نے انہی کا سہارا لے کر اپنی کہانی کو تیار کیا اور جنگی نقشے کو سامنے رکھ کر ناول کی کہانی میں سمویا۔ اس کے بعد کے حالات میں دیبل کی فتح اور وہاں سے آگے کی جانب مسلمان افواج کی روانگی کا تذکرہ ہے لیکن اس

۱۔ تحفۃ الکرام؛ میر علی شیر قانع، ص ۳۵۔

۲۔ تاریخ سندھ؛ اعجاز الحق قدوسی، جلد اول، ص ۹۷، ۹۸۔

۳۔ تاریخ اسلام؛ ڈاکٹر حمید الدین، ص ۳۰۲۔

۴۔ تاریخ پاک و ہند؛ انوار ہاشمی، ص ۴۸۔

سے قبل دیبل میں مسلمان گورنر کی نامزدگی کے سلسلے میں جس فرد کا نام آتا ہے مورخین اور ناول نگار دونوں کے درمیان شدید اختلاف ہے۔ ناول نگار اپنے ایک ہندو کردار بے رام جسکا اسلامی نام ناصرالدین تھا کو یہاں کا گورنر ظاہر کرتا ہے جبکہ میر علی شیر قانع رقمطراز ہیں:

''گیلو'' (۴) نامی ایک کافر مسلمان قیدیوں کا محافظ تھا۔ قیدیوں کو آزاد کرنے پر معلوم ہوا کہ انہیں تسلی تشفی دینے میں [۳۱] وہ انتہائی احسن کوشش کرتا رہا ہے اور انہیں آزادی اور اسلام کی فتح کی بشارتوں سے خوش کرتا رہا ہے چنانچہ محمد بن قاسم نے اسے بلا کر اسلام پیش کیا اور وہ فی الفور مسلمان ہو گیا اس پر اسے انتہائی اعزاز و نوازش سے سرفراز کر کے ''حمید بن وداع'' (ا) زحدی کے ساتھ وہاں کی حکومت کا شریک بنایا۔''[۱]

ایک دوسری روایت بھی اسی سے مطابقت رکھتی ہے جو مولانا اعجاز الحق قدوسی نے رقم کی ہے:

''وہاں (دیبل) کا سب سے بڑا افسر حمید بن وداع نجدی کو مقرر کیا۔''[۲]

یہاں اس اختلاف کی وجہ تاریخی ناول نگاری کے لیئے موجود رعایت کا فائدہ اٹھانا تسلیم کیا جاسکتا ہے نام پر اختلاف اپنی جگہ ناول نگار اور مورخ میں اتنا اتفاق ضرور ہے کہ ایک نومسلم کو مقرر کیا کیونکہ اہم تاریخی کردار کے علاوہ چھوٹے کرداروں کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے نسیم حجازی نے اپنے تخیلاتی کردار کو دیبل کے حاکم کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ دیبل سے رخصت ہو کر محمد بن قاسم نیرون کی جانب بڑھا۔ نیرون کے معرکے سے متعلق ناول نگار اور مورخین کی رائے میں اختلاف ہے یہ اختلاف محض ناول کی عبارت اور مورخین میں ہوتا تو بھی گوارا تھا لیکن خود مورخین بھی کسی ایک رائے پر متفق نہیں مثلاً شاہ معین الدین احمد ندوی نیرون کے واقعے کو اس طرح قلمبند کرتے ہیں:

''دیبل سے تھوڑی مسافت پر ایک مقام نیرون تھا، یہاں کے راجا بھدر کن نے اہلِ دیبل کا انجام دیکھ کر محمد بن قاسم سے صلح کر لی اور وہ دیبل سے نیرون پہنچا، حاکم نیرون نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا اور شہر لے جا کر مسلمانوں کی ضیافت کی ان کے مویشی کے لئے چارہ فراہم کیا، بہت سے قیمتی ہدیئے پیش کئے اور نامہ و پیام کے ذریعے جو صلح ہوئی تھی زبانی اس کی تکمیل ہوگئی۔''[۳]

اس رائے کو مزید تقویت مولانا اعجاز الحق قدوسی کی اس تحریر سے ملتی ہے:

''وہ جب نیرون پہنچا تو شہر والوں نے بغیر لڑے بھڑے شہر کے دروازے کھول دیئے شہر کا حاکم بہت سے تحفے تحائف لے کر خود محمد بن قاسم کے پاس آیا اور اس نے محمد بن قاسم کو پر تکلف دعوت دی۔''[۴]

ان دونوں آراء سے فیض عالم صدیقی نے کچھ اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

---

[۱] تحفۃ الکرام، میر علی شیر قانع، ص ۳۹۔

[۲] سندھ کی تاریخی کہانیاں، مولانا اعجاز الحق قدوسی، جلد اول، ص ۵۸۔

[۳] تاریخ اسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۹۰۔

[۴] سندھ کی تاریخی کہانیاں، مولانا اعجاز الحق قدوسی، ص ۶۱۔

''محمد بن قاسم دیبل کی فتح کے بعد نیرون کی طرف بڑھا۔ نیرون راجا داہر کا صدر مقام تھا۔ جب داہر کو دیبل کی فتح کی خبر ملی تو اس نے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ نیرون بھی غازیان اسلام کی یلغار کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔''[۱]

جبکہ تحفۃ الکرام میں بھی محاصرے اور جنگ کی کیفیت کا ذکر ملتا ہے۔ تاریخ ابن خلدون میں نیرون کے بجائے نیروز کا ذکر ہے اس نام کی نسبت سے کسی علاقے کے بارے میں سوائے اس مورخ کے کسی اور کے یہاں تذکرہ نہیں اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان مورخین کی آراء میں خود تضاد ہے جس کا فائدہ اٹھا کر ناول نگار نے کسی ایک رائے پر قیاس کر لیا جو اس کی کہانی کے قریب تر اور اس کے کردار کو نمایاں کرنے کا باعث ہو رہی تھی۔ نیرون کے بعد اسلامی افواج سیوستان اور سیبون و دیگر علاقوں کو فتح کرتی ہوئی دریائے سندھ کے کنارے پر جا پہنچیں یہاں دریا عبور کرنے کے حوالے سے مورخین اور ناول نگار میں شدید اختلاف ہے۔ ناول نگار کا موقف ہے کہ دریا باآسانی عبور کر لیا گیا جبکہ مورخین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ دریا عبور کرنے میں راجا داہر کے تیر انداز مزاحم ہوئے اور مسلمان کشتیوں کا ایک پل دریا کے پاٹ کا اندازہ کرنے کے بعد کنارے کے ساتھ ساتھ بنانے میں کامیاب ہوئے اور جب اسے بہاؤ پر چھوڑا گیا تو رات کی تاریکی میں مسلمان فوج دریا کے دوسرے کنارے پہنچنے اور راجا داہر کے حمایتیوں کو بھگانے میں کامیاب ہوئی۔ ناول نگار نے اس معرکے کا زمانہ جون ۷۱۳ء تحریر کیا ہے۔ اس تاریخ سے فیض عالم صدیقی مکمل اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جون ۷۱۳ء میں محمد بن قاسم نے دریائے سندھ عبور کر کے برہمن آباد کا رخ کیا۔''[۲]

جبکہ شفیق بریلوی نے محمد بن قاسم کی سندھ میں آمد کا زمانہ ان الفاظ میں مرقوم کیا ہے:

''اسلامی لشکر اپنے نوعمر مگر جری سپہ سالار کے زیر قیادت ۷۱۲ء بمطابق ۹۳ھ ماہ رمضان المبارک مکران کے راستے سندھ میں داخل ہوا۔''[۳]

یقیناً دیبل سے برہمن آباد تک پہنچنے میں کچھ عرصہ لگا ہو گا اور یہی بات قرین قیاس ہے کہ محمد بن قاسم اور راجا داہر کی افواج کا آمنا سامنا جون ۷۱۳ء میں ہوا ہو گا لیکن ان آراء سے مولانا اعجاز الحق قدوسی اختلاف کرتے ہیں۔ اُن کا نقل کردہ سنِ ہجری تو درست ہے جو دیگر مورخین کے مطابق ہے لیکن سنِ عیسوی کے سلسلے میں ایک سال کا فرق بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''آخر داہر نے ہاتھی سے اتر کر مقابلہ شروع کیا۔ ۱۰ رمضان، جمعرات کے دن ۹۳ھ بمطابق ۷۱۲ء کا سورج غروب ہو رہا تھا اور سندھ کا یہ راجا اپنی حکومت کے باقی رکھنے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا، اچانک ایک عرب نے اس کے سر پر تلوار ماری جو گردن

---

[۱] اسلام کے نامور سپہ سالار، فیض عالم صدیقی، ص ۴۳۔

[۲] ایضاً

[۳] محمد بن قاسم سے محمد علی جناح تک، شفیق بریلوی، ص ۴۰۔

تک اتر گئی، اور ساتھ ہی داہر کی زندگی کا سورج ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔''[۱]

ہمارا خیال ہے کہ دیگر مورخین کی رائے زیادہ درست ہے جبکہ مولانا اعجاز الحق قدوسی سے سنِ عیسوی لکھنے میں غلطی ہوئی ہے۔

راجا داہر اور محمد بن قاسم کے درمیان جنگ کا نقشہ، فوجوں کی تعداد اور راجا داہر کی موت کے بیان میں ناول نگار دو سو ہاتھیوں کے علاوہ پچاس ہزار سوار اور پیادہ فوج کا تذکرہ کرتا ہے یہ رائے اکثر مورخین کے نزدیک متنازع ہے مثلاً ڈاکٹر حمید الدین لکھتے ہیں:

''راجا داہر پچاس ہزار کا لشکر جرار لے کر دریائے سندھ کے کنارے پہنچ گیا۔''[۲]

میر علی شیر قانع رقمطراز ہیں:

''داہر اپنے نجومیوں کے منع کرنے کے باوجود عظیم لشکر ساتھ لے کر جس میں دس ہزار زرہ پوش سوار، تیس ہزار پیادے اور کچھ جنگی ہاتھی تھے، دو خوبصورت کنیزوں کے جلو میں جن میں سے ایک پان بنا کر پیش کر دیتی اور دوسری جام شراب (ا) پیش کرتی، پالکی پر سوار ہو کر مقابلہ کے لئے نکلا۔''[۳]

تقریباً اسی تعداد سے شاہ معین الدین احمد ندوی اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''راجا داہر بڑے شکوہ و تجمل کے ساتھ مقابلہ میں آیا، کوہ پیکر ہاتھیوں کی صف آگے تھی، اس کے پیچھے دس ہزار سوار اور تیس ہزار پیدل سپاہ تھی، خود داہر ایک سپید ہاتھی پر سوار تھا، خواصین چپ و راست جلوہ فگن تھیں۔''[۴]

اسی رائے کو مزید تقویت انوار ہاشمی بخشتے ہیں:

''راجا داہر بڑے شکوہ و تجمل کے ساتھ مقابلے پر آیا۔ کوہ پیکر ہاتھیوں کی صف آگے تھی۔ اس کے پیچھے دس ہزار سوار اور تیس ہزار پیدل سپاہ تھی خود داہر ایک سپید ہاتھی پر سوار تھا اور خواصین داہنے بائیں جلوہ فگن تھیں۔''[۵]

راجا داہر کی افواج کی تعداد بیان کرنے میں سب سے زیادہ تعداد مولانا اعجاز الحق قدوسی نے مرقوم کی ہے:

''اس جنگ میں داہر کے پاس ساٹھ ہزار سپاہی اور ایک سو جنگی ہاتھی تھے۔''[۶]

چونکہ مورخین خود ایک تعداد پر متفق نہیں اس لئے ان سب کی نقل کردہ تعداد میں دس ہزار کا فرق آتا ہے اکثر ۴۰ ہزار پر متفق ہیں جبکہ ایک رائے پچاس ہزار اور ساٹھ ہزار کی موجود ہے۔ اس لئے ناول نگار نے بھی اسی تضاد کا فائدہ اٹھا کر چالیس اور ساٹھ کے بجائے پچاس ہزار کی تعداد پر قیاس کر کے پیش کی ہوگی۔ جنگی نقشے میں تقریباً تمام مورخین راجا داہر کے قتل پر متفق ہیں اور تقریباً سبھی کی رائے یہ ہے

۱۔ سندھ کی تاریخی کہانیاں؛ مولانا اعجاز الحق قدوسی، جلد اول، ص ۰۷۔

۲۔ تاریخ اسلام؛ ڈاکٹر حمید الدین، ص ۳۰۶۔

۳۔ تحفۃ الکرام، میر علی شیر قانع، ص ۵۲۔

۴۔ تاریخ اسلام؛ شاہ معین الدین ندوی، ص ۹۲۔

۵۔ تاریخ پاک و ہند؛ انوار ہاشمی، ص ۲۹۔

۶۔ سندھ کی تاریخی کہانیاں؛ مولانا اعجاز الحق قدوسی، جلد اول، ص ۲۹۔

کہ وہ ہاتھی پر سوار تھا مگر جب مسلمان تیراندازوں کے تیر آگ لگانے لگے اور ہاتھیوں نے آگے بڑھنے کے بجائے اپنی ہی فوج کو کچلنا شروع کیا تو مجبوراً راجا داہر بھی پاپیادہ جواں مردی سے لڑتا ہوا قتل ہوا۔ اس سلسلے میں عبدالرحمٰن ابنِ خلدون نے مرقوم کیا ہے:

''سوارانِ فیل تیر اجل کا نشانہ ہو ہو کر گرنے لگے اور ہاتھیوں کا جھنڈ بھاگ کھڑا ہوا۔ داہر مجبوراً پیادہ پر لڑتا ہوا عساکر اسلامیہ کی طرف بڑھا۔ ایک مسلمان سپاہی نے لپک کر ایک ہی وار سے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔''[۱]

ڈاکٹر حمید الدین تحریر کرتے ہیں:

''راجا داہر بھی بڑی بہادری سے لڑا مگر ایک عرب نے بڑھ کر اس کا کام تمام کر دیا۔''[۲]

تقریباً یہی رائے فیض عالم صدیقی بیان کرتے ہیں:

''دنیا کی عظیم ترین جنگوں میں سے برہمن آباد کی جنگ بھی ایک ہے۔ محمد بن قاسم نے حملے کا حکم دے دیا۔ شام تک داہر تیس ہزار فوجیوں کے ساتھ خاک وخون میں تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔''[۳]

ہمارے پاس یہ واحد روایت ہے کہ جس میں راجا داہر کی موت کے ساتھ اس کے سپاہیوں کی ہلاکت شدہ تعداد کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی رقم کرتے ہیں:

''اس کے بڑے بڑے سرداروں نے لڑ کر مردانہ وار جان دی، ان کی جانبازی دیکھ کر داہر کی حمیت بھی جوش میں آ گئی، وہ شمشیر بکف میدانِ جنگ میں پہنچا، اور پاپیادہ عام سپاہیوں کے دوش بدوش لڑ کر قتل ہوا۔''[۴]

تقریباً یہی کیفیت انوار ہاشمی نے لکھی ہے:

''اس کے بڑے بڑے سرداروں نے مردانہ وار لڑ کر جان دیدی۔ ان کی بہادری دیکھ کر راجا داہر کی ہمت بھی بڑھ گئی اور وہ پیدل ہی میدانِ جنگ میں اتر آیا، لیکن قتل ہوا۔''[۵]

انہی آراء سے ملتی جلتی رائے میر علی شیر قانع نے نقل کی ہے:

''محمد بن قاسم نے لشکر کو تیر برسانے کا حکم دیا [اسی اثنا میں] قضائے الٰہی سے ایک تیر جا کر داہر کے گلے میں پیوست ہو گیا اور وہ [فی الفور] مر گیا۔''[۶]

ان تمام روایات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ راجا داہر میدانِ جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا کچھ اختلاف اس بات میں ہو سکتا ہے کہ اس کی

۱۔ تاریخ ابن خلدون، جلد دوئم، عبدالرحمٰن ابن خلدون/علامہ حکیم احمد حسین الہ آبادی، ص ۲۱۸۔

۲۔ تاریخ اسلام، ڈاکٹر حمید الدین، ص ۳۰۶۔

۳۔ اسلام کے نامور سپہ سالار، فیض عالم صدیقی، ص ۴۴۔

۴۔ تاریخ اسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۹۲۔

۵۔ تاریخ پاک و ہند، انوار ہاشمی، ص ۳۸۔

۶۔ تحفۃ الکرام، میر علی شیر قانع، ص ۵۳۔

موت کا باعث تیر لگنا ہو یا تلوار لگنا مگر یہ بات طے ہے کہ اس کی موت میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے واقع ہوئی اور ناول نگار نے اس واحد روایت یعنی فیض عالم صدیقی والی کا سہارا لے کر تیس ہزار فوج کی ہلاکت کو بیان کیا ہے۔

برہمن آباد میں مسلمانوں کی فتح کے بعد ایک اخلاقی اور معاشرتی مسئلہ راجا داہر کی بیوی ''لاڈی رانی'' سے متعلق پیدا ہوتا ہے۔اس سلسلے میں مختلف مورخین نے بڑے چٹخارے لئے ہیں اور محمد بن قاسم کی عفیفانہ طبعیت پر الزام تراشنے کے بہانے ڈھونڈے ہیں۔خود ناول نگار نے حاشیہ میں ایسی دو روایات نقل کر کے دلیل کے روز پر رد کی ہیں ہم بھی ایسی چند روایات نقل کرتے ہیں شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

''راجا داہر کی ایک رانی لاڈی جو برہمن آباد میں تھی گرفتار ہوئی، محمد بن قاسم نے اسے عزت کے ساتھ پردے میں ٹھہرایا پھر حجاج کی اجازت سے اپنے عقد میں لے آیا''۔[۱]

تقریباً ایسی ہی روایت ڈاکٹر حمید الدین نے تحریر کی ہے:

''اس معرکے میں راجا داہر کی ایک رانی جس کا نام لاڈی تھا، گرفتار ہوئی۔محمد بن قاسم نے خلیفہ سے اجازت لے کر اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا''۔[۲]

اسی جیسی رائے انوار ہاشمی نے بھی پیش کی ہے:

''راجا داہر کی ایک رانی ''رانی لاڈی'' کو محمد بن قاسم، حجاج کی اجازت سے اپنے عقد میں لے آیا''۔[۳]

اِن آرا سے جو بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ ہمارے مذکورہ بیان کے مطابق ہے۔بظاہر تاریخ دان لاڈی رانی اور محمد بن قاسم کے نکاح پر مصر ہیں مگر کہیں بھی لاڈی رانی کے قبول اسلام کا تذکرہ نہیں کرتے اور پھر حقیقت حال کا جائزہ لیں تو اس وقت محمد بن قاسم کی عمر محض اٹھارہ برس تھی اور لاڈی رانی جس کا بیٹا ارور کے محاذ پر صف آرا تھا یقیناً عمر میں ابن قاسم سے دگنی بڑی ہوگی۔بظاہر دلیل سے یہ روایات مناسب اور مصدقہ معلوم نہیں ہوتیں پھر محمد بن قاسم کی طبعیت، مزاج اور شخصی خوبیوں کو مدِ نظر رکھ کر ہم ان آراء کو مسترد کرتے ہیں اور ناول نگار کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ محمد بن قاسم نے لاڈی رانی کو محض سفیر کی حیثیت سے استعمال کیا تا کہ سندھ کے عوام مزید خون خرابے سے بچ جائیں۔لاڈی رانی کا یہ کردار اکثر مورخین نے تسلیم کیا ہے جس کی وجہ سے ارور کے محاذ سے راجا داہر کا بیٹا ''ففی'' جسے دیگر مورخین نے ''فوفی'' اور ''گوپی'' کے نام سے موسوم کیا ہے فرار ہوا۔مثلاً میر علی شیر قانع لکھتے ہیں:

''محمد بن قاسم فی الفور اس طرف متوجہ ہوا اور قلعہ اروڑ کا محاصرہ کر کے داہر کی بیوی لاڈی کو اپنے شوہر کے مرجانے کی خبر ظاہر کرنے کے لئے قلعہ کے دروازے پر بھیجا۔[اہلِ قلعہ نے] اسے جھوٹا قرار دیتے ہوئے اینٹ اور پتھر مارے اور کہا کہ ''تو ان گا۔

---

[۱] تاریخ اسلام: شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۹۴۔

[۲] تاریخ اسلام: ڈاکٹر حمید الدین، ص ۳۰۷۔

[۳] تاریخ پاک و ہند: انوار ہاشمی، ص ۳۰۔

خوروں سے مل گئی۔" (اس کتاب میں آگے یوں لکھا ہے) اس ساحرہ سے داہر کے مرجانے کی خبر کی تصدیق حاصل کر کے "فوفی" راتوں رات قلعے سے باہر نکل کر اپنے مذکورہ بھائیوں کے پاس بھاگ گیا۔"[۱]

ڈاکٹر حمید الدین ان الفاظ میں اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں:

"محمد بن قاسم کو اس کا علم ہوا تو رانی کی وساطت سے انہیں پیغام دیا کہ راجا داہر قتل ہو چکا ہے۔اس کی امداد کے خیال سے تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔اس پر اہلِ شہر نے اطاعت قبول کر لی اور گوپی کیرج کی طرف بھاگ گیا۔"[۲]

شاہ معین الدین احمد ندوی نے ان واقعات کو اس طرح منضبط کیا کہ:

"محمد بن قاسم کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے رانی لاڈی کے ذریعہ سے کہلا دیا کہ راجا قتل ہو چکا ہے،تم لوگ اطاعت قبول کر لو، یعقوبی کا بیان ہے کہ رانی کے یقین دلانے پر اہلِ شہر نے اطاعت قبول کر لی اور شہر کے دروازے کھول دیئے۔

لیکن چچ نامہ میں ہے کہ انہوں نے رانی کے بیان پر اعتماد نہ کیا اور اس کی شان میں نازیبا باتیں کہیں، اس لئے محاصرہ قائم رہا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد جب اہلِ شہر کو راجا کی موت کا یقین ہو گیا اور اس کی امداد کا سہارا جاتا رہا تو وہ اطاعت قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے، یہ صورت دیکھ کر گوپی کیرج بھاگ گیا۔"[۳]

مولانا اعجاز الحق قدوسی رقم فرماتے ہیں:

"آخر محمد بن قاسم نے الور کا گھیرا اور بھی سخت کر دیا، آخر میں مسلمان اس زور سے لڑے کہ الور والے گھبرا اٹھے، گوپی شہر چھوڑ کر چپکے سے بھاگ گیا۔"[۴]

انوار ہاشمی نے بھی انہی آراء سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ارور راجا داہر کے دوسرے لڑکے گوپی کے قبضے میں تھا کچھ عرصہ تک تو اس نے محمد بن قاسم کا مقابلہ کیا لیکن پھر راہ فرار اختیار کی۔"[۵]

یہاں پر یہ معاملہ طے ہو جاتا ہے کہ ارور کے محاذ پر راجا داہر کا ایک بیٹا موجود تھا جو بعد میں فرار ہو گیا اس طرح ناول نگار اور اکثر مورخین کی رائے میں یکسانیت اور مطابقت پائی جاتی ہے۔محمد بن قاسم دیگر علاقوں کو فتح کرتا ہوا ملتان جا پہنچا جہاں شہر کا محاصرہ خاصے عرصے قائم رہا اسی دوران حجاج کی موت کی اطلاع اسے ملی بقول ناول نگار یہ اطلاع اسے اپنی بیوی اور حجاج کی بیٹی زبیدہ کے خط سے ملی تھی جبکہ دیگر مورخین اس خبر کی کوئی سند بیان نہیں کرتے عبدالرحمٰن ابنِ خلدون نے لکھا ہے:

۱۔ تحفۃ الکرام؛ میر علی شیر قانع، ص ۶۱، ۶۶۔

۲۔ تاریخ اسلام؛ ڈاکٹر حمید الدین، ص ۳۰۷۔

۳۔ تاریخ اسلام؛ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ص ۹۴۔

۴۔ سندھ کی تاریخی کہانیاں؛ مولانا اعجاز الحق قدوسی، ص ۸۰۔

۵۔ تاریخ پاک و ہند؛ انوار ہاشمی، ص ۳۰۔

''جن دنوں محمد بن قاسم ملتان آیا اسی زمانے میں وہیں حجاج کے مرنے کی خبر پہنچی۔''[۱]

اس رائے سے کچھ مختلف انداز مولانا اعجاز الحق قدوسی نے اختیار کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''محمد بن قاسم ملتان فتح کرنے کے بعد آگے بڑھنے کی سوچ رہے تھے کہ ۹۵ھ (۱۴-۷۱۳ء) میں حجاج بن یوسف ثقفی کا انتقال ہوگیا۔ جو ان کے چچا تھے۔''[۲]

لیکن پہلی روایت کے قریب تر رائے پیش کرتے ہوئے فیض عالم صدیقی نے لکھا ہے:

''اب ملتان کی باری تھی۔ ملتان کے محاصرے کے درمیان محمد بن قاسم کو عرب کے مدبر اعظم، عظیم فاتح اور کفر شکن بطل عظیم حجاج بن یوسف کی وفات کی خبر ملی۔''[۳]

تھوڑے سے اختلاف کے علاوہ کم از کم اس رائے پر سبھی متفق ہیں کہ ملتان کے علاقے میں ابنِ قاسم کو حجاج کی موت کی خبر ملی یوں ناول نگار اور مورخین ایک رائے پر متفق نظر آتے ہیں۔

ناول نگار نے جہاں موضوع کو سب سے زیادہ رومانوی اور ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے اور جا بجا تخیل کا سہارا لے کر کہانی کو پُر اثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہیں تاریخی حقائق کو خاصی حد تک برقرار رکھنے کی کوشش بھی کی ہے البتہ اپنے ہیرو سے جذباتی وابستگی کی بنا پر اس کے عزم و استقلال میں کسی قسم کی کمی نہیں دکھائی جب کہ اس کے جانی دشمن انتقام کی آگ میں جل رہے تھے۔ اس سلسلے میں جو روایات ہمیں مل سکیں نقل کرتے ہیں۔ جو تقریباً ایک دوسرے سے مطابقت رکھتی ہیں۔

عبدالرحمٰن ابنِ خلدون نے لکھا ہے:

''یزید بن ابی کبشہ نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے عراق بھیج دیا۔ صالح بن عبدالرحمٰن نے واسط کے قید خانے میں ڈال دیا اور حجاج کے اعزہ و اقارب کے ساتھ اس کو بھی تکلیفیں دینے لگا۔''[۴]

ڈاکٹر حمید الدین رقمطراز ہیں:

''سلیمان حجاج اور اس کے متعلقین کا جانی دشمن تھا چنانچہ محمد بن قاسم کو سندھ کی امارت سے معزول کر کے اس کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو حاکم بنا کر بھیج دیا حجاج نے صالح کے بھائی کو قتل کرا دیا تھا۔ صالح نے بھائی کا انتقام محمد بن قاسم سے لینے کی ٹھانی اور دنیائے اسلام کے اس مایہ ناز جرنیل کو جیل خانے میں طرح طرح کی اذیتیں دے کر مروا ڈالا۔''[۵]

شاہ معین الدین احمد ندوی تحریر کرتے ہیں:

۱۔ تاریخ ابنِ خلدون، جلد دوئم: عبدالرحمٰن ابن خلدون / علامہ حکیم احمد حسین الٰہ آبادی، ص ۲۲۹۔

۲۔ سندھ کی تاریخی کہانیاں: مولانا اعجاز الحق قدوسی، ص ۸۲۔

۳۔ اسلام کے نامور سپہ سالار: فیض عالم صدیقی، ص ۳۳۔

۴۔ تاریخ ابن خلدون، جلد دوئم: عبدالرحمٰن ابن خلدون / علامہ حکیم احمد حسین الٰہ آبادی، ص ۲۲۹۔

۵۔ تاریخ اسلام: ڈاکٹر حمید الدین، ص ۳۰۸۔

''محمد بن قاسم صالح نوجوان تھا اس نے سندھ فتح کیا، وہاں اچھے اثرات پیدا کئے، عادلانہ نظامِ حکومت قائم کیا، لیکن وہ حجاج کا بھتیجا تھا، اس لئے عتاب سے نہ بچ سکا، چنانچہ سلیمان نے، اسے معزول کر کے اس کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو سندھ کا حاکم بنا کر بھیجا، اس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے عراق بھیج دیا۔''[۱]

مولانا اعجاز الحق قدوسی نے مرقوم کیا ہے:

''سلیمان، حجاج کا بہت مخالف تھا، جیسے ہی وہ خلیفہ ہوا اس نے اس کے مقرر کئے ہوئے گورنر قتیبہ بن مسلم کو جو ترکستان کا گورنر تھا اور محمد بن قاسم کو جو سندھ کا گورنر تھا مجرم قرار دیا اور محمد بن قاسم کو سندھ کی گورنری سے علیحدہ کر کے ۹۶ھ (۱۵-۷۱۴ء) میں سندھ کا گورنر یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو بنا کر بھیجا۔ یزید بن ابی کبشہ نے سندھ پہنچ کر محمد بن قاسم کو مجرموں کی طرح معاویہ بن مہلب کے ساتھ عراق بھجوا دیا، جب محمد بن قاسم سندھ سے رخصت ہونے لگے تو انہوں نے رخصت ہوتے وقت نہایت حسرت سے یہ شعر پڑھا:

ترجمہ: لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کیسے جوان کو ضائع کر دیا وہ جوان کے مصیبت کے دن کام آئے اور سرحدوں کی مضبوطی کے لئے مناسب ہو۔

محمد بن قاسم جب عراق پہنچے تو سلیمان نے ان کو ''واسط شہر کے جیل خانے میں ثقفی خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ قید کر دیا، یہ شہر حجاج ہی نے آباد کیا تھا۔ اس غازی کو ''واسط'' کے قید خانے میں طرح طرح کی سزائیں دی گئیں، وہ ان تکلیفوں اور سزاؤں کو بھگتتے ہوئے جیل خانے میں بڑے دردناک اشعار پڑھتے تھے جن کا مطلب یہ تھا:

اگر میں ''واسط'' کے جیل خانے میں طوق اور بیڑی پہنے مر جاؤں تو کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ بہت سے بہادر تھے جن کے دل میں، میں نے ہیبت بٹھا دی اور بہت سے جواں مرد جب میرے مقابلے میں آئے تو میں نے ان کو مار ڈالا۔

آخر طرح طرح کی تکلیفیں اور مصیبتیں سہہ کر سندھ کے اس فاتح نے جیل خانے میں وفات پائی اس وقت ان کی عمر بائیس سال تھی۔

سندھ کے لوگوں کو جب محمد قاسم کی وفات کی خبر ملی تو پورے ملک میں ان کا سوگ منایا گیا، وہ ان کے اوصاف و اخلاق کو یاد کر کے روئے اور شہر کیرج میں ان کی یاد تازہ رکھنے کے لئے انہوں نے محمد بن قاسم کا ایک اسٹیچو (مجسمہ) بنا کر نصب کیا۔''[۲]

ناول کی عبارت سے مماثل عبارت میں محمد بن قاسم کی معزولی اور موت تک کا حال فیض عالم صدیقی نے اس طرح لکھا ہے:

''نئے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے یزید بن ابو کبشہ کو سندھ کے گورنر کے عہدے پر تعینات کر کے حکم دیا تھا کہ محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے دمشق روانہ کیا جائے۔

تمام مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ اروڑ سے محمد بن قاسم کا کوچ سندھیوں کے لئے ایک جانگداز حادثہ تھا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے

---

۱ تاریخ اسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۱۱۵۔

۲ سندھ کی تاریخی کہانیاں، مولانا اعجاز الحق قدوسی، جلد اول، ص ۸۳۔

اور جوان تمام شہر سے نکل کر اس کے راستے میں پھولوں کے ہار لئے کھڑے تھے اور بعض کی اس منظر سے چیخیں نکل رہی تھیں ۔ فاتح سندھ ایک قیدی کی حیثیت میں ارور سے روانہ ہو رہا تھا۔ محمد بن قاسم کی گرفتاری اور دمشق کو روانگی کی خبر تمام سندھ میں بجلی کی چمک کی طرح پہنچ چکی تھی ۔ لوگ جوق در جوق چیختے چلاتے اس کے آخری درشن کے لئے وہاں پہنچ رہے تھے بعض ہندو سپہ سالاروں، بڑے بڑے زمینداروں اور راجوں نے محمد بن قاسم تک یہ آواز پہنچائی کہ آپ کے ایک اشارہ ابرو پر ہم دمشق سے آنے والے گورنر اور اس کی فوج کو تہس نہس کر سکتے ہیں مگر اس نے پُرزور الفاظ میں انہیں روک دیا۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ یزید بن ابی کبشہ نے سندھیوں کے جذبات سے متاثر ہو کر اشارتاً محمد بن قاسم کے سامنے چند تجاویز رکھیں بلکہ یہاں تک کہا کہ یہاں کے لوگ آپ کو ایک دیوتا سمجھتے ہیں آپ ارور سے نکل کر جو مناسب سمجھیں کریں ۔ میں خلیفہ سے نمٹ لوں گا مگر اسلام کے اس بطلِ جلیل، غازیٔ اعظم اور مجاہدِ ملت نے تمام تجویزوں کو ٹھکرا دیا اور قیدی کی حالت میں عازم دمشق ہوا یہ قافلہ دیبل پہنچا تو دیبل کے بازار پھولوں سے لدے ہوئے تھے اور تمام اہلِ شہر سڑکوں اور چھتوں پر نکل آئے تھے مگر محمد بن قاسم صبر و ثبات اور عزم و حوصلہ کی ایک چٹان بنا اپنے گھوڑے پر سوار خاموش یہ منظر دیکھتا ہوا جہاز تک پہنچ گیا۔ افسوس کہ اسلام کا یہ بطلِ جلیل ایک عاقبت نا اندیش خلیفہ سلیمان کی ذاتی انا کی نذر ہو گیا۔'' [۱]

مندرجہ بالا روایتوں میں سوائے فیض عالم صدیقی کے جو جذباتی طور پر محمد بن قاسم یا نامور سپہ سالاروں کے ممدوح محسوس ہوتے ہیں ۔ تاریخی اعتبار سے بہت کم حالات پیش کئے ہیں البتہ تمام ہی اس پر متفق ہیں ۔ یزید بن ابی کبشہ کو گورنر بنا کر بھیجا گیا اور اس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے بصرہ کی طرف روانہ کیا۔ ناول نگار نے اپنے کردار سے جس جذباتی وابستگی کا ثبوت دیا ہے اس کی وجہ علی عباس حسینی کی یہ رائے رہی ہوگی ۔

''ناول کی جگہ وہاں ہوتی ہے جہاں تاریخ کے صفحے سادے اور خاموش ہوں۔ امتدادِ زمانہ کی وجہ سے جو واقعات صاف نہیں دکھائی دیتے یا جو شخصیتیں دھندلی پڑ گئی ہیں انہیں قصے اور افسانے واضح کر کے دکھا سکتے ہیں۔'' [۲]

چونکہ سوائے ایک کے تمام راوی ارور سے واسط کے قید خانے تک کا حال نہیں لکھ پائے اور واسط کے قید خانے میں محض اذیتیں دینے کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس خلا کو پُر کرنے کے لئے ناول نگار نے رنگ آمیزی کی ہوگی اور پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اسلام کے اتنے بڑے سپہ سالار کی معزولی اور گرفتاری پر تمام لوگ خاموش رہے ہوں گے ۔ کچھ نہ کچھ سفارتی سرگرمیاں ضرور ہوئی ہوں گی جن کا بیان تاریخ میں موجود نہیں ۔ اس لئے فیض عالم صدیقی اور ناول نگار نے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے ۔ فیض عالم صدیقی نے تو محض یزید بن ابی کبشہ کی تجاویز کا تذکرہ کیا ہے البتہ نسیم حجازی نے زبیر کے کردار کے ذریعے سزائے موت رکوانے کی ایک کوشش پیدا کی ہے۔ اس طرح ناول میں انتہائی تجسس پیدا ہو گیا ہے اور اس تاریخی حقیقت سے انحراف بھی نہیں ہوا کہ محمد بن قاسم کو قتل کر دیا گیا۔ ہم

---

[۱] اسلام کے نامور سپہ سالار، فیض عالم صدیقی، ص ۴۶۔

[۲] اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی عباس حسینی، ص ۲۱۳۔

اس سلسلے میں ابواللیث صدیقی کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ:

''تاریخی ناول کی ترکیب بجائے خود بحث طلب ہے۔ تاریخ میں حالات وواقعات کا اس طرح بیان ہوتا ہے جس طرح وہ فی الحقیقت پیش آئے۔ ناول اور افسانے میں حالات وواقعات اس طرح پیش آئے ہیں جس طرح ناول نگار اور افسانہ نگار کے خیال میں ان کو درحقیقت پیش آنا چاہیے۔''[1]

ناول محمد بن قاسم اس عہد میں شائع ہوا جب تحریکِ پاکستان اپنے اختتامی اور منطقی نتیجے کی طرف گامزن تھی۔ قرارداد لاہور کی منظوری نے قوم میں جوش وولولہ امنگ وحوصلہ برپا کر دیا تھا اور اسے مزید تقویت پہنچانے کے لئے ایسے تاریخی واقعات اور کرداروں کو پیش کرنا ایک ضرورت بن گیا تھا جو لوگوں کے لئے مشعلِ راہ ہوں اور اسی ضرورت کے پیشِ نظر نسیم حجازی نے محمد بن قاسم تحریر کیا اور قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس سلسلے میں علی عباس حسینی کی یہ رائے خاصی اہم معلوم ہوتی ہے کہ:

''مشرق میں روس سے لے کر مغرب میں کیلیفورنیا تک صرف ناول نویس ہی معلم کے فرائض انجام دے رہا ہے اور وہ شغف وانہاک کا سرچشمہ ہے، وہی دنیا کے سامنے نئے نئے خیالات پیش کرتا ہے وہی انہیں سلجھاتا اور سمجھاتا ہے بعض اوقات [illegible] وہ کسی قوم کے دل کی رگوں کو اس طرح چھو لیتا ہے کہ اس کے الفاظ اس طرح دہرائے جاتے ہیں جیسے پہاڑیوں اور وادیوں سے ٹکرا کر صدائے بازگشت، سننے والے سے بہت دور فاصلے پر پیدا ہوتی ہے۔''[2]

---

[1] آج کا اردو ادب: ابواللیث صدیقی، ص ۲۰۷۔

[2] اردو ناول کی تاریخ اور تنقید: علی عباس حسینی، ص ۴۵۔

آخری چٹان کا تحقیقی جائزہ

آخری چٹان:

اس ناول کا تاریخی عہد چھٹی صدی ہجری کے ثلاثہ سے ساتویں صدی ہجری کے نصف آخر تک کے واقعات پر محیط ہے۔

صحرائے عرب کے ریگ زار میں جب اسلام کا بول بالا ہوا اور عرب کے صحرا نشین لات ومنات وہبل کی پرستش چھوڑ کر اسلام کے تہذیب وتمدن کو دنیا میں پھیلانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور یوں قیصر وکسریٰ کے محلات پر اسلام کا جھنڈا لہرانے میں کامیاب ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں اسپین تک اپنے تیز رفتار گھوڑوں سے زمین کی وسعتوں کو سمیٹتے چلے گئے۔ یہ ایک روشن انقلاب تھا لیکن چھ سو سال بعد ایک تاریک انقلاب صحرائے گوبی کے ایک چرواہے کی شکل میں سامنے آیا۔ اس چرواہے کا نام تموجن تھا جو بعد میں چنگیز خاں کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی قیادت میں منگولیا کے وحشی قبائل تہذیب کا ہر چراغ بجھاتے ہوئے دنیا کے چاروں طرف چھا گئے۔ چند ہی برسوں میں چنگیز خاں کی افواج شمال اور مشرق کے کئی ممالک پر قبضہ کر چکی تھیں تاتاریوں کی اس حیرت انگیز کامیابی کا راز ان کی رفتار میں تھا جب کہ مسلمانوں کے پاس دنیا کو فتح کرنے والی اسلاف کی تلواریں اب بھی تھیں لیکن ایمان کی روشنی ناپید تھی اس لیے اس قوم کے ہاتھوں عالم اسلام کی عبرت ناک تباہی مقدر ہو چکی تھی۔

ترکانِ سلجوق نے ایک طرف بغداد کے عباسی خلفاء کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا دوسری طرف ۴۶۳ھ میں بازنطینی سلطنت کو شکست دے کر بحیرۂ روم کے بہت سے ساحلی علاقے چھین لئے لیکن ملک شاہ کی وفات کے بعد سلجوقی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی پھر ۴۹۱ھ میں عیسائیت کا سیلاب امڈ آیا اس کے تقریباً پچاس سال کے بعد عماد الدین زنگیؒ کی شخصیت منظر عام پر آتی ہے، جو عالمِ اسلام کی پرانی شان وشوکت واپس دلانے کے لئے کوشاں رہی لیکن کامیاب نہ ہو سکی جبکہ ۵۸۳ھ میں صلاح الدین ایوبی کے کارناموں نے جلد ہی عالمِ اسلام کو اس کا گرویدہ بنا دیا۔ مدینے کے جوانوں کی طرح احمد بن حسن کو بھی صلیب کے مقابلے میں ہلال کا پرچم بلند رکھنے کا جذبہ فلسطین لے گیا اس کے دستے کا سالار ایک ترک تھا۔ ایک اور سپاہی یوسف بن ظہیر اس کے ساتھ شامل ہے اور اسے اپنا ہم راز بناتا ہے۔ یوسف کا شوقِ جہاد تمام خطرات اور خدشات سے بالاتر اسے فصیل پر چڑھنے میں مدد دیتا ہے۔ صلاح الدین ایوبی اس منظر کو دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے اگر یہ فصیل پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا تو میری تلوار کا حقدار ہوگا۔ یوسف کی منزل فصیل نہیں برج پر لگا صلیب کا نشان تھا اس کی تقلید میں چند اور نوجوان فصیل پر چڑھ کر قابض ہو چکے تھے ادھر صلاح الدین یوسف کو اپنے گھوڑے کا بھی حق دار قرار دے چکا تھا اور ادھر یوسف برج پر بیک وقت تین تلواروں سے تنہا مقابلہ کر رہا تھا۔ صلیب کا ٹکڑا ٹوٹ کر گر جاتا ہے، اس مجاہد کا ولولہ بھی زخموں کے باعث پاش پاش ہو چکا تھا۔ صلاح الدین ایوبی اسے اپنا بیٹا کہہ کر والیٔ شہر مقرر کرتا ہے۔

اسلامی افواج قلعے میں داخل ہو چکیں تھیں جب صلاح الدین اس برج تک پہنچا وہ یوسف کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے تو انتہائی مایوسی کے عالم میں کہتا ہے کہ والی شہر کی حیثیت سے کوئی حکم جاری کرو۔ احمد برج پر اسلامی جھنڈا لہرانے کی خواہش کے بارے میں بتاتا ہے، اور پھر اس کے بے جان ہاتھوں کی مدد سے اسلامی جھنڈا نصب کر دیا جاتا ہے۔ تب یوسف، احمد کو چوتھی بات بتا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے۔ احمد بن حسن کو صلاح الدین ایوبی یوسف کی بیوی زاہدہ اور اس کے بیٹے طاہر کے لئے رقم وغیرہ اور اپنی تلوار دے کر رخصت کرتا ہے احمد بن حسن، محسن کے ساتھ بغداد جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ زاہدہ مر چکی ہے محسن کی بیوی کے پاس یوسف کا بیٹا تھا۔ احمد بن حسن اسے اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر کرتا ہے محسن اور اس کی بیوی بادلِ نخواستہ طاہر کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ احمد بن حسن اور سعیدہ طاہر کو اپنے بچوں کی طرح پالتے ہیں۔ طلحہ اور دوسرا بیٹا امین بھی اسے سگا بھائی جانتے ہیں کچھ عرصہ بعد طلحہ بغداد جا کر شہید ہو جاتا ہے۔ امین، طاہر کے ساتھ رہتا ہے لیکن طاہر اس کو چھوڑ کر زید کے ساتھ بغداد چلا جاتا ہے جاتے وقت احمد بن حسن اس کو کچھ جواہرات اور وہ تلوار بھی دیتا ہے جو صلاح الدین نے اس کے لئے دی تھیں ساتھ ہی قاضی فخر الدین کے نام ایک خط بھی دیا اس زمانے میں بغداد کے لوگوں نے تلوار کے بجائے قلم کا سہارا لے لیا تھا وہاں بڑے بڑے کتب خانے تھے۔ بغداد پہنچنے کے بعد طاہر اور زید نے کچھ دن قاضی فخر الدین کے پاس قیام کیا اور پھر ان کے مشورے سے ایک مکان خرید لیا۔ بغداد کے علما نے طاہر کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی لیکن طاہر نے ان لوگوں کو انکار کر دیا۔ زید نے مناظروں میں شرکت کی جس کا انجام ہاتھا پائی تھا۔ طاہر کو بغداد کے وزیر اعظم افتخار الدین نے اپنے پاس بلایا جہاں طاہر کی قاسم سے ملاقات ہوئی جس نے صلاح الدین کی تلوار حاصل کرنے کے لئے طاہر کے ساتھ تیغ زنی کا مقابلہ رکھا اس موقع پر طاہر نے دو لڑکیوں صفیہ اور سکینہ کو دیکھا یہ دونوں گھڑ سواری کی شوقین تھیں۔

طاہر کے پاس عبدالعزیز سپہ سالار کا یہ پیغام لے کر آتا ہے کہ اگر وہ قاسم سے مقابلے میں جھجک محسوس کرے تو اسے گھوڑے فراہم کیے جا سکتے ہیں تا کہ وہ بغداد سے نکل جائے لیکن طاہر نے مقابلے کو اہمیت دی۔ اس مقابلے کو دیکھنے کے لئے قاسم کا استاد لوکس، ولی عہد ظاہر اس کا بیٹا مستنصر، علاؤالدین کا سفیر عماد الملک، چنگیز خاں کا سفیر، خلیفۃ المسلمین ناصر، وزیر اعظم، سپہ سالار اور عبدالعزیز سب جمع تھے۔ عام تماشائیوں کے علاوہ ان سب نے بھی دیکھا کہ طاہر نے پہلے قاسم کو اور پھر اس کے استاد لوکس کو شکست سے ہمکنار کیا۔ اسی روز رات کے وقت وزیر اعظم کے ہاں دعوت میں صفیہ طاہر کو قاسم کی سازش کے بارے میں بتاتی ہے کہ قاسم اس سے بدلہ لینے آئے گا لیکن طاہر، صفیہ کو غلط سمجھتا ہے اور عبدالعزیز اور اس کے دوستوں عبدالملک، مبارک، نصیر، افضل، موسیٰ اور زید کے ساتھ شکار پر چلا جاتا ہے۔ قاسم اسی وقت ان پر حملہ کرنے کا پروگرام بناتا ہے اور صفیہ یہ باتیں سن کر ایک بار پھر جا کر طاہر کو بتاتی ہے لیکن وہ اس بار بھی اس کی بات پر یقین نہیں کرتا جبکہ عبدالملک اس کی بات پر یقین کر لیتا ہے اور قاسم جب حملہ کرتا ہے تو اس کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ وزیر اعظم قاسم کی اس غلطی پر شرمندہ ہوتا ہے اور اس کو اپنا سفیر بنانے کا خیال ظاہر کرتا ہے۔ علاؤالدین کے سفیر کے ذریعے سے

طاہر کو پتا چلتا ہے کہ وحید الدین وزیر خارجہ غائب ہے اور اس کی تحریر موجود ہے جس میں اس نے چنگیز خاں کو یہ لکھا ہے کہ اگر وہ خوارزم پر حملہ کرے گا تو بغداد اس کا ساتھ نہیں دے گا لیکن طاہر کہتا ہے کہ اس میں خلیفہ اور وزیر اعظم شامل نہیں ہیں اور وہ وزیر اعظم سے ایک ایسی تحریر لکھوا کر لے جائے گا جس میں خوارزم کی حمایت کی جائے گی اور طاہر ایسی تحریر حاصل کر کے قراقرم چلا جاتا ہے۔ صفیہ، طاہر کے لئے الفت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ طاہر کے جانے سے پہلے اس کے دوست اس سے کہتے ہیں کہ وہ موجودہ وزیر خارجہ مہلب بن داؤد کو ایک خطرناک آدمی سمجھتے ہیں اس لئے احتیاط کی ضرورت ہے۔ طاہر کے ساتھ کمال، ابو اسحٰق اور جمیل جاتے ہیں۔ طاہر کی چنگیز خاں سے ملاقات ہوتی ہے لیکن مترجم طاہر کی گفتگو کو دوسرا رنگ دے دیتا ہے۔ اس لیے طاہر کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ واپسی میں طاہر خوارزم میں رکتا ہے اور وہاں اس کو پتا چلتا ہے کہ اس کے ساتھ جو تین افراد گئے تھے ان کے سر پر چنگیز خاں کے نام ایک پیغام لکھا ہوا تھا وہ اپنے ساتھیوں سے بازپرس کرتا ہے لیکن وہ لوگ خوارزم کے سپاہی دیکھ کر بات بدل دیتے ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ خوارزم کے سپاہی طاہر کو بھی گرفتار کر لیتے ہیں۔

قوقند کا حاکم اعلیٰ تیمور ملک، طاہر کی ساری بات سن کر کہتا ہے کہ اس کا فیصلہ سلطان معظم کریں گے۔ سلطان اس کو سب کے سامنے پھانسی دینے کی سزا تجویز کرتا ہے لیکن جب طاہر کو پھانسی دی جانے لگی تو تاتاری قوقند پر حملہ کر دیتے ہیں اس خبر کو سنتے ہی تیمور ملک موت کی سزا منسوخ کر کے طاہر کو آزاد کر دیتا ہے۔ ادھر تاپو کے قریب، دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ اس لئے زوچی نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یہ تاپو جلد فتح نہ ہوگا یہ مہم اپنے ایک نائب کے سپرد کر دی اور اپنا رخ دوسری طرف کیا۔ طاہر تاتاریوں سے نمٹنے کے بعد ایک ایسی جگہ پہنچتا ہے جس جگہ کو تاتاریوں نے پہلے سے ہی تباہ کیا ہوا تھا وہاں پہنچ کر ایک گھر میں طاہر اذان دے کر نماز پڑھتا ہے اذان کی آواز سن کر ایک لڑکی ثریا نوجوان مرد کے بھیس میں اپنے چھوٹے بھائی اسماعیل کے ہمراہ آتی ہے اور وہ دونوں طاہر کو اپنے ہمراہ لیکر تہ خانے میں چلے جاتے ہیں وہاں آٹھ تاتاری دوبارہ آجاتے ہیں طاہر اُن کا خاتمہ کر کے ثریا اور اسماعیل کو لیکر بلخ کی طرف روانہ ہوتا ہے لیکن راستے میں مسلمانوں کا ایک پڑاؤ نظر آتا ہے وہ ان کے افسرِ اعلیٰ سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ وہ افسر تیمور ملک تھا۔ یہ لوگ ایک رات وہاں قیام کرتے ہیں اور صبح بلخ کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ بلخ میں وہ ثریا کے نانا عبدالرحمٰن اور نانی حنیفہ سے ملتا ہے جو ثریا سے نکاح کرنے کی پیشکش کرتے ہیں جس کے جواب میں وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے بغداد کی جانب روانہ ہو جاتا ہے۔ بغداد پہنچ کر وہ مسجد کے منبر سے تقریر کرتا ہے اور لوگوں کو خوارزم کے مسلمانوں کے حالات بتاتا ہے اور ان کو جہاد کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسری طرف امرائے سلطنت اس کو اپنے نزدیک دیوانہ قرار دیتے ہیں اور اس کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ صفیہ اس کو باخبر کرنے کے لئے بلاتی ہے اور اس کو وہیں گرفتار کر لیا جاتا ہے جس جگہ طاہر کو قیدی بنا کر رکھا جاتا ہے وہاں ایک آدمی پہلے سے موجود ہوتا ہے اور وہ وزیر خارجہ وحید الدین تھا جس کو موجودہ وزیر خارجہ مہلب بن داؤد نے قید کر رکھا تھا۔

ادھر علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ نے پہلی شکست کے بعد دریائے سیحوں کے کنارے پڑاؤ ڈالا لیکن تاتاریوں کی آمد کا سن کر اس

نے تیس ہزار سپاہیوں کو وہاں چھوڑا اور خود بخارا کا رخ کیا۔ اس دوران چنگیز خاں کے بیٹے نے اترار پر حملہ کیا اور اس پر قابض ہو گیا چنگیز خاں کے دوسرے بیٹے نے تاشقند پر قبضہ کر لیا۔ چنگیز خاں اپنے بیٹے تولائی کے ہمراہ راستے کے شہروں کو آگ اور خون کا پیغام دیتا ہوا بخارا کی طرف بڑھا سمرقند میں خوارزم شاہ کو اس کی آمد کی خبر ملی۔ بخارا کے لوگوں نے صلح کے لئے ایک وفد چنگیز خاں کی طرف بھیجنے کا فیصلہ کیا تو امام زادہ رکن الدین نے اس فیصلے سے انکار کیا لیکن لوگوں نے اُن کی پرواہ نہ کی اور وفد کو بھیجا لیکن بخارا کا انجام تباہی و بربادی ہی رہا۔ سمرقند خوارزم شاہ کا ایک مضبوط شہر تھا لیکن بخارا کا انجام سن کر سلطان نے بلخ کا رخ کیا۔ سمرقند کو بھی چنگیز خاں نے فتح کر لیا تو خوارزم شاہ کو پتا چلا کہ تاتاری اب سلطنت کے شہروں کو فتح کرنے کے بجائے اس کو پکڑنا چاہتے ہیں اس نے مایوس ہو کر بحیرۂ خزر کے کنارے ڈیرہ ڈالا وہاں اس کے پاس اس کا بیٹا جلال الدین ملنے آیا لیکن وہ باپ کی بزدلی سے بہت خفا ہوا اور اس کو وہیں چھوڑ کر چلا گیا اور خوارزم شاہ بحیرۂ خزر کے ایک جزیرے میں گمنامی کی موت مر جاتا ہے۔

جلال الدین نے جانبازوں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ تاتاریوں کا مقابلہ کرنا شروع کیا اور اپنی سلطنت کے کئی کھوئے ہوئے شہر واپس حاصل کر لئے۔ دوسری طرف طاہر کے قید ہونے کی وجہ سے عوام مشتعل تھے اور بخارا، سمرقند، طوس، قرمز اور رے کے متعلق خبریں سن کر ان لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا تھا جو طاہر کے حامی تھے۔ عوام کا جوش دیکھ کر امرائے سلطنت نے یہ فیصلہ کیا کہ طاہر کو قید سے رہا کرا کے ایک موقع دیا جائے قاسم نے صفیہ سے یہ شرط رکھی تھی کہ اگر وہ اس سے شادی کے لیے تیار ہو جائے تو طاہر کو قید سے رہا کر دیا جائے گا۔ صفیہ راضی ہو جاتی ہے قاسم، مہلب سے بات کرتا ہے تو مہلب اس کی بات سن کر راضی ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ایک چال چلتے ہوئے وہ کھانے میں زہر ملا دیتا ہے جو طاہر کے بجائے وحید کھا لیتا ہے اور وہ مر جاتا ہے لیکن طاہر مردہ بن کر لیٹ جاتا ہے اور جب اس کو دریا میں وہ لوگ مردہ سمجھ کر پھینک دیتے ہیں تو وہ اس محل تک پہنچ جاتا ہے جہاں صفیہ رہتی تھی۔ صفیہ اس کو دیکھ لیتی ہے اور جب اس کو باہر نکالتی ہے تو طاہر سے اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ وہ صفیہ کو اپنے ساتھ لے جائے کیونکہ طاہر کو اس کی وجہ سے آزاد کیا گیا ہے تو طاہر زہر دینے کا واقعہ بتاتا ہے اور اس کو اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کرتا ہے کیونکہ اس نے ثریا سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ طاہر، صفیہ سے کہتا ہے کہ وہ ان حالات سے وزیر اعظم کو باخبر کر دے اور قید خانے سے وحید الدین کی لاش نکلوا لے۔ طاہر ایک ہزار سواروں کے ساتھ خوارزم شاہ کا ساتھ دینے کے لئے بغداد چھوڑ کر روانہ ہو جاتا ہے۔ بغداد سے طاہر اور ان کے ساتھیوں نے مرو کا رخ کیا لیکن راستے میں انہوں نے دیکھا کہ مسلمان سپاہیوں کو تاتاریوں نے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ انہوں نے اُن کی مدد کی مسلمانوں کا یہ لشکر جلال الدین کا تھا۔ جلال الدین کے اس لشکر میں تیمور ملک بھی شامل تھا۔ جلال الدین نے غزنی کا رخ کیا۔ غزنی میں امین الملک نے پچاس ہزار سپاہیوں کے ساتھ سلطان کا استقبال کیا اور سیف الدین اغراق بھی چالیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ آملا۔ غزنی پہنچ کر طاہر کو پتا چلا کہ عبدالرحمٰن جس کی وجہ سے اس نے غزنی کا رخ کیا تھا کچھ عرصہ وہاں ٹھہر کر ہندوستان روانہ ہو گیا ہے۔ غزنی میں طاہر کی تقریروں سے لوگ جہاد پر آمادہ ہوئے اور جوق در جوق سلطان کی فوج میں شامل ہونے لگے۔ جلال الدین

نے اپنی قوت کا اندازہ لگانے کے بعد چنگیز خاں کو جنگ کا پیغام دیا۔ چنگیز خاں نے شگی تو تو کو ایک زبردست فوج کے ساتھ بھیجا لیکن ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا مالِ غنیمت پر امین الدین ملک اور سیف الدین اغراق میں تکرار ہو گئی اور اس وجہ سے جلال الدین کی فوج کا ایک بڑا حصہ اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ جلال الدین کے لشکر میں پھوٹ پڑنے کی خبر سن کر چنگیز خاں نے حملہ کر دیا اور مسلسل ان پر حملہ کرتے رہے اور ان کا پیچھا کرتے رہے یہاں تک کہ جلال الدین دریائے سندھ تک پہنچ گیا اور گھوڑے سمیت دریا میں کود گیا۔ دریا عبور کر کے جلال الدین نے سلطان التمش کے پاس اپنے ایلچی بھیجے۔ عین الملک اور طاہر سے مل کر سلطان نے کہا کہ وہ اس صورت میں جلال الدین کی مدد کر سکتا ہے کہ وہ خود بغداد روانہ ہو جائے اور وہاں سے فوج کے دستوں کو ہندوستان بھیجے کیونکہ اگر جلال الدین کو ہندوستان میں پناہ دی گئی تو تاتاری ہندوستان پر حملہ کر دیں گے اور کیونکہ یہاں صرف مسلمان قوم آباد نہیں ہے بلکہ دوسری قومیں بھی ہیں اس لئے سلطان کو مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا طاہر کی ملاقات یہاں عبدالرحمٰن سے ہوتی ہے اور اس کی ثریا کے ساتھ شادی ہو جاتی ہے۔ شادی سے قبل وہ صفیہ کے متعلق ثریا کو بتاتا ہے جو انگوٹھی صفیہ نے دی ہوتی ہے وہ ثریا کو دیتا ہے۔ ثریا بھی اس کو ایک انگوٹھی دیتی ہے صفیہ کے لئے۔ طاہر کی شادی کے بعد تیمور ملک دلی آتا ہے اور طاہر کو خوارزم شاہ کے سفیر کے طور پر دلی میں ہی رکوا دیتا ہے۔

جلال الدین خلیفہ کی طرف سے حوصلہ افزا جواب سن کر بغداد کو اپنا مرکز بنانا بہتر سمجھتا ہے لیکن طاہر خلیفہ کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ طاہر کے روانہ ہونے کے ساتھ عبدالرحمٰن بھی مدینے کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ تیمور ملک، سلطان کو مشورہ دیتا ہے کہ بغداد سے باہر رک کر پہلے حالات کا جائزہ لے لیا جائے اور اس کام کے لیے طاہر اور عبدالملک کو روانہ کیا جاتا ہے۔ وزیر اعظم کے اصرار پر جلال الدین کو خلیفہ نے خط لکھا تھا اور اب مہلب کے ساتھ مل کر ان کا یہ منصوبہ بنایا کہ جلال الدین کو تاتاریوں کے ہاتھوں گرفتار کروا دیا جائے یہ بات وزیر اعظم صفیہ کو بتا دیتے ہیں اور پھر ان کا قتل ہو جاتا ہے۔ صفیہ یہ خبر طاہر اور عبدالملک تک پہنچانا چاہتی ہے اور دشمنوں سے بچتی بچاتی اس خبر کو پہنچانے میں تو کامیاب ہوتی ہے مگر اپنی زندگی ہار جاتی ہے۔ صفیہ کا جو لوگ پیچھا کر رہے تھے ان میں افضل شامل تھا جو پہلے طاہر اور عبدالملک کا بھی دوست تھا لیکن اس کی غداری کی وجہ سے عبدالملک اس کو مار دیتا ہے۔ بغداد سے قشمور کی قیادت میں بیس ہزار سپاہی آتے ہیں اور جلال الدین ان کو شکست سے ہمکنار کرتا ہے راستے میں اسے مظفر الدین کے دس ہزار سپاہی ٹکراتے ہیں جو معمولی مقابلے کے بعد ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ بغداد کی طرف سے ناامید ہونے کے بعد سلطان تبریز کا رخ کرتا ہے۔ اسی اثنا میں بغداد کے خلیفہ ناصر الدین کی وفات اور اس کے بیٹے ظاہر کی مسند نشینی کی خبر ملتی ہے۔ خلیفہ ناصر کی وفات کے بعد جلال الدین نے طاہر اور عبدالملک کو ایک بار پھر بغداد کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ خلیفہ سے بات کر کے اس کو جہاد کے لئے راضی کر سکیں۔ خلیفہ کی طرف سے حوصلہ افزا جواب ملنے پر یہ خبر جلال الدین کو دی جاتی ہے اور عبدالملک، طاہر کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ مکہ جائے وہاں ہر ملک کے مسلمان موجود ہوں گے اُن کو جہاد کی طرف راغب کرے اور راستے میں اپنے گھر بھی چلا جائے۔ طاہر اپنے گھر پہنچتا ہے تو اپنے بیٹے سے ملتا ہے جس کا نام اس کی مرضی کے مطابق عبدالعزیز رکھا گیا تھا۔ طاہر، ثریا کو صفیہ کی موت کے متعلق بتاتا ہے اور

ثریا کے ساتھ مکہ روانہ ہوتا ہے۔ جلال الدین آذر بائیجان پر حملہ کر کے وہاں کے بہت سے علاقے ان حکمرانوں سے چھین لیتا ہے پھر وہ گرجستان اور تفلیس کا رخ کرتا ہے تو اسے کرمان سے براق حاجب کے باغی ہونے کی اطلاع ملتی ہے۔ براق معذرت کرتا ہے واپسی پر سلطان اصفہان میں ٹھہرتا ہے جہاں اسے خلیفہ ظاہر کے انتقال اور خلیفہ مستنصر کی تخت نشینی کی خبر ملتی ہے۔ تبریز آنے کے بعد سلطان کو معلوم ہوا کہ تاتاریوں نے رے کی طرف پیش قدمی کر دی ہے۔ رے کے قریب تاتاریوں کے لشکر سے جلال الدین کا مقابلہ ہوا جس نے تاتاریوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا لیکن غیاث الدین کے اپنی فوج کے ساتھ میدان چھوڑ کر بھاگنے سے سلطان مایوس ہو گیا اور پسپائی کا حکم دے کر میدان سے نکل گیا۔ تاتاریوں نے اصفہان تک اس کا تعاقب کیا لیکن چنگیز خاں کی وفات کا سن کر ان کو واپس جانا پڑا۔ تبریز پہنچ کر سلطان نے عبدالملک کی وساطت سے خلیفہ مستنصر کو خط لکھا اور کہا کہ اب فیصلہ کن جنگ کا وقت آ گیا ہے طاہر کی طرف سے سلطان کو یہ اطلاع ملی کہ مصر، مراکش اور سلاطین سے امداد کا وعدہ وہ لے چکا ہے۔ شام سے امداد کی توقع ہے۔ سلطان اس کو حکم دیتا ہے کہ شام سے ہندوستان جائے اور سلطان التمش کو اس کے وعدے یاد دلائے۔ بغداد کے متعلق عبدالملک کی اطلاعات بہت حوصلہ افزا تھیں لیکن اس کو اس بات کا شک بھی تھا کہ خلیفہ عوام کے سامنے سلطان کی حمایت سے گھبراتا ہے۔ خلیفہ، عبدالملک سے کہتا ہے کہ اگر وہ علماء کو قائل کر لے تو وہ اعلانِ جہاد کر دے گا عبدالملک نے ان امراء کو قائل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہو گیا تو اس نے یہ تمام بات جلال الدین اور طاہر کو لکھ بھیجی۔ سلطان جلال الدین بغداد کی افواج کے انتظار میں تھا لیکن عبدالملک کا خط اس کو بہت مایوس کرتا ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کو جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ بغداد سے حوصلہ شکن پیغام کے بعد وہ شراب نوشی کرتے دیکھ کر بہت آزردہ ہوتا ہے اور اس کو عزت کی موت کی طرف راغب کرتا ہے اور جلال الدین عزت کی موت کی تلاش میں اپنے ایک پرانے ساتھی کے ساتھ نکل جاتا ہے اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ کیا ہوا۔ وہاں سے واپسی میں عبدالملک کی طاہر سے ملاقات ہوتی ہے۔ طاہر بھی سلطان جلال الدین کی تلاش میں ہوتا ہے۔ ان کو اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ تاتاریوں کے ساتھ معاہدے کے بعد مہلب بن داؤد وزیر اعظم بن چکا ہے۔ بغداد میں پھر سے وہی مناظرے شروع ہو چکے تھے۔ ہمدان میں تاتاریوں کی فوج جمع تھی اور خلیفہ اور تولائی کے معاہدے کے باوجود کسی کو یہ امید نہیں تھی کہ تاتاری حملہ آور نہ ہوں گے۔ ایک جگہ مناظرے میں طاہر پہنچ جاتا ہے اور تقریر کرتا ہے اور لوگوں کو بتاتا ہے کہ بغداد تباہی کے دہانے پر ہے۔ وہ جلسہ گاہ سے نکل کر وزیر اعظم کے محل جاتا ہے اور مہلب بن داؤد، ناظم شہر، قید خانے کا داروغہ اور قشمور کو گرفتار کر کے باہر لے آتا ہے اور ان کو دریا میں ڈال دیتا ہے مہلب بن داؤد، ناظم شہر اور قید خانے کے داروغہ تینوں میں سے کسی کو تیرنا نہیں آتا اس لیے وہ لوگ ڈوب کر مر جاتے ہیں۔ قشمور کو تیغ زنی کے مقابلے میں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ عبدالملک کے چند دوست اس سرائے میں پہنچ جاتے ہیں جہاں طاہر اور عبدالملک رکے تھے۔ وہاں سے یہ سب مل کر عبدالملک کے بیوی بچوں سمیت ہندوستان کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ وہاں یہ لوگ التمش کی فوج میں شامل ہو جاتے ہیں۔ طاہر کے تین بیٹے تیغ زنی میں ماہر ہو چکے تھے اور وہ تبلیغ کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ اس نے اور عبدالملک نے بہت سے غیر مسلموں کو مسلمان کیا۔ اٹھائیس برس

گزرنے کے بعد چنگیز خاں کی جگہ اس کا پوتا ہلاکو خاں حکمران تھا اور بغداد میں مستعصم کی خلافت کا تیسرا سال تھا جب تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کر دیا۔ بیس لاکھ انسانوں میں سے صرف چار لاکھ انسان اپنی جان بچا سکے۔ خلافت عباسیہ کے آخری چراغ کو قتل کرنے کے بجائے نمدے میں لپیٹ کر ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈالا گیا اور بغداد کے دریا کا بند تڑوا دیا گیا اہل بغداد اپنی کھیتی کا پھل کاٹ چکے تھے۔

آخری چٹان کا تحقیقی جائزہ

آخری چٹان:

ناول آخری چٹان کے واقعات کو قاری کی دلچسپی کی خاطر اسلام کی ترویج واشاعت سے مربوط کیا گیا ہے۔ ابتداً اسلام کی روشنی اور اس کے توسط سے دنیائے عالم میں پھیلی تاریکی کے خاتمے کا ذکر ہے پھر ان اولوالعزم اصحاب رسول اور ان کے جانشینوں کا تذکرہ ہے کہ جن کے تیز رفتار گھوڑوں نے دنیا کی وسعتوں کو سمیٹ لیا تھا۔ ایک طرف وسط ایشیا میں فتوحات کی منازل طے ہو رہی تھیں تو دوسری طرف اسپین کی سرحدوں سے پار فرانس تک اسلامی جھنڈا لہرانے لگا اور تیسری طرف ہندوستان کے میدانوں میں اسلامی فتوحات کا پھریرا بلند ہونے لگا محض چھ سو سال بعد ایک آندھی نے ان فتوحات کو خس وخاشاک کی طرح اڑا دیا۔ صحرائے گوبی سے اٹھنے والا یہ طوفان چنگیز خاں کی قیادت میں محض چند سالوں میں ترقی یافتہ اور مہذب معاشروں کے لئے آگ اور خون کا پیام لایا۔ ناول کے اکثر تاریخی واقعات چنگیز خاں، علاؤالدین خوارزم شاہ، جلال الدین خوارزم شاہ، شمس الدین التمش، خلیفہ ناصر، خلیفہ ظاہر، معتصم باللہ اور صلاح الدین ایوبی سے موسوم ہیں۔ معاشرے کی عکاسی کی خاطر بعض تخیلاتی کردار طاہر بن یوسف، ثریا، صفیہ، عبدالملک، عبدالعزیز، زید اور عبدالرحمٰن وغیرہ شامل کیے گئے ہیں۔ جن کے امتزاج سے یہ تاریخی ناول بیک وقت اپنے عہد کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اس عہد کے معاشرے، رسم ورواج اور رہن سہن وغیرہ پر پورا اترتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے جو واقعہ سب سے پہلے سامنے آتا ہے بیت المقدس پر صلاح الدین ایوبی کی زیر قیادت اسلامی افواج کی یلغار کا ہے۔ ایک مختصر محاصرے کے بعد مسلمان افواج شہر کی فصیل پر کمندیں ڈال کر چڑھنے میں کامیاب ہوئیں۔ تیروں کی بارش میں فصیل پر چڑھنا ایک ناممکن کام تھا مگر چند مسلمان مقصد کی تکمیل کی خاطر چڑھتے گئے یہاں تک کہ نشان صلیب کو سرنگوں کرنے اور اسلامی جھنڈا لہرانے میں کامیاب ہوئے۔ اس واقعہ کا تذکرہ تاریخ اسلام میں یوں رقم کیا گیا ہے:

''کئی دن تک نہایت پُر زور مقابلہ ہوتا رہا مسلمان شہر پناہ توڑنا چاہتے تھے لیکن اس کے اوپر سے تیر بازی ہو رہی تھی۔ باہر بھی صلیبی مصروف پیکار تھے۔ اس لئے وہ شہر پناہ تک نہ پہنچ سکے۔ جب صلیبیوں کی قوت کچھ کمزور پڑی تو مسلمانوں نے ریلا کر کے ان کو دھکیل دیا اور بڑھتے ہوئے فصیل تک پہنچ گئے اور سنگباری کر کے اس کو توڑ دیا۔ صلیبیوں نے جب دیکھا کہ وہ شہر کو نہیں بچا سکتے اور تلوار کے زور سے مسلمانوں کے قبضہ کی صورت میں ان کی ہلاکت و بربادی یقینی ہے اُس وقت وہ جان و مال کی حفاظت کی شرط پر شہر حوالہ کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔''[1]

اس واقعہ کی صداقت تاریخ مسلمانانِ عالم میں ان الفاظ میں رقم کی گئی ہے:

''سلطان صلاح الدین نے عیسائی لشکروں کو پے در پے شکستیں دے کر بیت المقدس کو ان سے چھین لیا۔''[2]

---

[1] تاریخ اسلام: شاہ معین الدین احمد ندوی، جلد چہارم، ص ۳۱۷۔

[2] تاریخ مسلمانان عالم: پروفیسر محمد رضا خان، ص ۳۲۔

علامہ حافظ ابوالفدا عماد الدین ابنِ کثیر دمشقی اس واقعہ کی حقیقت یوں رقم کرتے ہیں:

''اور آنکھیں صلیبوں کو دیواروں پر منسوب دیکھ رہی تھیں صخرہ کے گنبد کے اوپر بہت بڑی صلیب تھی۔ اس بات نے اہلِ ایمان کو مزید برافروختہ کر دیا اور یہ دن کافروں پر بڑا سخت تھا، آسان نہ تھا پس سلطان نے اپنے اصحاب کے ساتھ فصیل کے شمال مشرق کونے کی طرف سبقت کی اور اسے جلا دیا پس یہ جانب گر پڑی اور سارا برج گر پڑا کیا دیکھتے ہیں کہ وہ زمین پر پڑا ہے۔''[۱]

اِن آرا کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بیت المقدس کی فتح صلاح الدین ایوبی کی زیرِ قیادت افواج کو حاصل ہوئی۔ جس طرح عیسائی دنیا کے مختلف علاقوں سے آ کر جمع ہوئے تھے اسی طرح مسلمانوں کے بہت سے قافلے شوقِ شہادت لئے اس فوج میں شامل تھے۔ اسی رعایت کا فائدہ اٹھا کر ناول نگار نے یوسف بن ظہیر کے کردار کو متعارف کرایا ساتھ ہی اس کے دوستوں کو بھی پیش کیا ہے کیونکہ یہ اہم ترین معرکہ تھا اس لئے ہوسکتا ہے صلاح الدین ایوبی نے بہادری سے متاثر ہو کر مبینہ انعامات دیے ہوں۔

اس کے بعد ناول نگار موضوع کے اعتبار سے ان واقعات کا تذکرہ کرتا ہے جو پے در پے پیش آئے اور جن کی بنا پر خوارزم شاہ اور چنگیز خاں کے درمیان اختلاف کی بنا پڑی اس سلسلے میں جس واقعہ نے چنگیز خاں کو چراغ پا کیا وہ بقول ناول نگار یہ تھا:

''خوارزم کی سرحد کے ایک گورنر نے بخارا کے چند تاجروں کا مال چھین لیا اور انھیں اس الزام میں قتل کر ڈالا کہ وہ چنگیز خاں کے جاسوس کو خوارزم کے حالات سے باخبر کر رہے ہیں۔ چنگیز خاں نے خوارزم شاہ کے پاس اپنا ایلچی بھیج کر گورنر کی اس حرکت پر احتجاج کیا لیکن بخارا کے تاجر خوارزم شاہ کی رعیت تھے اور ان کے ساتھ چنگیز خاں کی ہمدردی سے خوارزم شاہ کے یہ شکوک اور زیادہ بڑھ گئے کہ چنگیز خاں خوارزم میں جو کام تاتاریوں سے نہیں لے سکتا، اس کے لئے اس نے بخارا کے تاجروں کی خدمات حاصل کی ہیں۔ چنانچہ اس نے برافروختہ ہو کر چنگیز خاں کے ایلچی کے قتل کا حکم دے دیا۔ بعض امراء نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ کچھ بھی ہو، ایلچی کا قتل جائز نہیں لیکن سلطان علاؤالدین محمد شاہ ایک خودسر حکمران تھا، اس نے کسی کا کہا نہ مانا۔ ایلچی کو قتل کر کے اس کے باقی ساتھیوں کی داڑھیاں جلانے کے بعد انہیں واپس بھیج دیا۔''[۲]

اس واقعہ کو آرمینیس ویمبرے اس طرح تحریر کرتے ہیں:

''ایلچی نے اطلاع دی کہ نائب نے منگول شہزادے چنگیز خاں کے چار سو جاسوس گرفتار کر لئے ہیں جاسوس سوداگروں کے بھیس میں آئے تھے۔ نائب، سلطان کے احکام کا منتظر تھا۔

''چنگیز کی سابقہ سفارت سے سلطان محمد بہت خفا تھا طبیعت کا بہت تیز و تند تھا چنانچہ اس نے حکم دیا کہ سب قیدی قتل کر دیے جائیں۔ ایلچی واپس اترار آیا۔ قیر خاں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اگرچہ وہ سب مسلمان تھے اور چنگیز خاں کی خاص حفاظت اور پناہ میں تھے اور اس کے علاقہ میں خاص مراعات کے حامل تھے جوینی ٹھیک لکھتا ہے کہ: ''ان کا خون بہا جس کے ایک ایک قطرہ نے کفارہ ادا کیا۔

---

[۱] تاریخ ابنِ کثیر، علامہ حافظ ابوالفدا عماد الدین ابنِ کثیر دمشقی / مولانا اختر فتح پوری، جلد سیزدھم، چہاردہم، ص ۵۷۷۔

[۲] آخری چٹان، نسیم حجازی، ص ۱۳۲، ۱۳۳۔

ان کے سرگرے مگر ایک لاکھ انسانوں کے قتل سے ان کے سروں کے ایک ایک بال کا انتقام لیا گیا۔''

صرف ایک بچ نکلا جس نے جا کر منگول شہزادے کو داستانِ غم سنائی۔ شہزادے نے فوراً ناراضگی کا اظہار نہ کیا بلکہ جواب طلبی کے لئے ایلچی بھیجا۔ یہ ایلچی بھی قید ہو کر قتل ہوا۔''[۱]

اس واقعہ کو مصنف تاریخ ابنِ خلدون اس طرح رقم کرتا ہے:

''چنگیز خاں کے ملک کے چند تاجر تجارتی مال لے کر اترار آئے۔ نیال خاں (سلطان کا ماموں زاد بھائی) وہاں کا گورنر تھا۔ بیس ہزار فوج رکاب میں رہتی تھی۔ مال و اسباب کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ دست درازی کا لالچ دامن گیر ہوا۔ شاہی دربار میں رپورٹ کر دی کہ یہ تاجر نہیں ہیں بلکہ جاسوسی کی غرض سے آئے ہیں، سلطنت کی طرف سے ان کی نگرانی کا حکم صادر ہو گیا۔ نیال خاں کو موقع مل گیا، نگرانی کے بجائے ان لوگوں کو پوشیدہ طور پر قتل کر کے مال و اسباب ضبط کر لیا۔

چنگیز خاں کو اس کی خبر لگی۔ سلطان کو ناراضگی اور تنبیہ کا خط لکھا، بدعہدی پر نفریں کا اظہار کیا سلطان نے چنگیز خاں کے ایلچی کو بجائے جواب دینے کے مار ڈالا۔[۲]

اس واقعہ کو مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے یوں مرقوم کیا ہے:

''جب یہ قافلہ مقام انزار میں پہنچا تو خوارزم شاہ کے نائب السلطنت نے جو وہاں موجود تھا اس قافلے کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ قافلہ والوں نے ہر چند کہا کہ ہم مسلمان ہیں سوداگری کے لیے مغولستان گئے تھے اب واپس آ رہے ہیں اور بادشاہ مغولستان کی طرف سے سفیر بن کر بھی آئے ہیں مگر اس حاکم نے کچھ نہ سنا اور خوارزم شاہ کو لکھا کہ مغولستان سے کچھ جاسوس، سوداگر اور سفیروں کے لباس میں آئے ہیں۔ میں نے اُن کو گرفتار کر لیا ہے ان کی نسبت آپ کا کیا حکم ہے۔ سلطان خوارزم شاہ نے لکھا کہ اُن کو قتل کر دو چنانچہ حاکم انزار نے ان ساڑھے چار سو آدمیوں کو بے دریغ تہ تیغ کر کے تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ ان میں سے ایک شخص کسی طرح بچ کر نکل بھاگا اور اُس نے جا کر چنگیز خاں کو قافلے کے مقتول ہونے کا حال سنایا۔

چنگیز خاں نے ایک خط پھر خوارزم شاہ کے پاس نہایت اہتمام و احتیاط کے ساتھ بھیجا اور اس میں لکھا کہ حاکم انزار نے بڑی نالائقی کا کام کیا ہے اور بے گناہ لوگوں کو قتل کر کے جرمِ عظیم کا مرتکب ہوا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اُس کو یا تو میرے سپرد کیا جائے یا آپ خود کوئی عبرت ناک سزا دیں۔ خوارزم شاہ نے اس خط کو پڑھتے ہی چنگیز خاں کے ایلچی کو جو یہ خط لے کر پہنچا تھا قتل کر دیا۔''[۳]

اس واقعہ کو علامہ حافظ ابوالفدا عماد الدین ابن کثیر دمشقی نے اس طرح بیان کیا ہے:

''چنگیز خاں نے اپنے تاجروں کو کثیر اموال کے ساتھ خوارزم شاہ کے علاقے کی طرف بھیجا، وہ اس کے پہناوے کے لئے

---

[۱] تاریخ بخارا؛ آرمینیس ویمبرے/ نفیس الدین احمد، ص ۱۳۵، ۱۳۶۔

[۲] تاریخ ابنِ خلدون؛ علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون/ علامہ حکیم احمد حسین الٰہ آبادی عثمانی، جلد ہشتم، ص ۳۴۴، ۳۴۵۔

[۳] تاریخ اسلام؛ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی، ص ۲۳۶، ۲۳۷۔

کپڑوں کی پونجی بناتے تھے اوراس کے نائب نے خوارزم شاہ کو خط لکھا، جس میں اس نے اسے ان اموال کے متعلق بتایا جو ان کے پاس تھے تو اس نے اسے پیغام بھیجا کہ وہ انہیں قتل کر دے اور جو کچھ ان کے پاس ہے اُسے چھین لے تو اس نے ایسے ہی کیا اور جب چنگیز خاں کو ان کی اطلاع ملی تو اس نے خوارزم شاہ کو دھمکی دی اور جو کچھ خوارزم شاہ نے کیا، وہ کوئی اچھا فعل نہ تھا۔''[۱]

تاریخ اسلام کے مصنف شاہ معین الدین احمد ندوی نے دیگر روایتوں کو جمع کر کے اس واقعہ کا حال اس طرح لکھا ہے:

''تاجروں کا یہ قافلہ جب خوارزمی حکومت کی سرحد اترار پہنچا تو یہاں کے حاکم اینال حق المعروف بہ غائر خاں نے ایک ہندی تاجر کو جس سے پہلے سے شناسائی تھی، بلا بھیجا یہ چنگیز خاں کے گھمنڈ میں نہ گیا۔ اس سے غائر خاں بگڑ گیا۔ اس قافلے کے پاس جو مال تھا اس کی بھی اس کو طمع دامن گیر ہوئی۔ اس نے اس کو روک لیا اور علاؤالدین محمد کو اس کی اطلاع دی۔ اس نے انجام پر غور کئے بغیر ان کا سامان ضبط کر کے قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ غائر خاں نے بلا تامل اس کی تعمیل کی۔ ان میں سے ایک شخص جان بچا کر بھاگ گیا اور چنگیز کو اس واقعہ کی خبر کی۔ وہ سن کر جوش و غضب سے لبریز ہو گیا اور علاؤالدین محمد کے پاس کہلا بھیجا کہ تم نے میرے آدمیوں کو دھوکے سے قتل کیا ہے اس کے انتقام کے لئے تیار ہو جاؤ۔ حمد اللہ مستوفی کا بیان ہے کہ چنگیز خاں نے پہلے خوارزم شاہ کے پاس کہلا بھیجا کہ وہ غائر خاں کو قصاص کے لئے اس کے حوالہ کرے۔ خوارزم شاہ اس پر آمادہ نہ ہوا بلکہ الٹے چنگیز کے قاصد کو قتل کر دیا۔

ابن اثیر میں اتنا اور اضافہ ہے کہ خوارزم شاہ نے اصل قاصد کو قتل کر دیا اور اس کے باقی ساتھیوں کی داڑھیاں منڈوا کر ان کی زبانی چنگیز خاں کے پاس کہلا بھیجا کہ میں خود تمھارے مقابلے آتا ہوں۔''[۲]

ان مذکورہ آراء کی روشنی میں ناول نگار کے اس ذوقِ سلیم کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ وہ اپنے واقعات کو مربوط کرتے وقت تمام تاریخی حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس واقعہ کے تمام نکات کسی نہ کسی راوی نے ضرور بیان کیے ہیں۔

ناول نگار نے قوقند کے حاکم تیمور ملک کی جواں مردی کا برملا ذکر کیا ہے۔ پہلے پہل وہ مدافعانہ جنگ لڑتا رہا مگر جب کمک نہ ملی تو دریا کے درمیان ایک ٹاپو پر مقیم ہوا۔ جہاں سے کشتیوں کے ذریعے کنارے تک جا کر تاتاریوں پر تیر برساتا رہا جب امداد سے ناامید ہوا تو کشتیوں کا ایک بیڑا بنا کر راہِ فرار اختیار کی۔ دریا کے دونوں طرف تاتاری موجود تھے کس چالاکی اور ہوشیاری سے ان تاتاریوں کو جھانسا دیا۔ اس بارے میں ناول نگار نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لوگوں کو اتار دیتا اور پھر خالی کشتی بیڑے کے ساتھ چلتی رہتی۔ جب ساری فوج دریا کے پار اتر گئی پھر اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور خوارزم کی طرف روانہ ہوا اس واقعہ کو آرمینیس ویمبرے نے اس طرح بیان کیا ہے:

''یہ قلعہ اس جگہ بنا ہوا تھا جہاں سیحوں کے دو حصے ہو جاتے ہیں۔ کچھ تو قلعہ کی جگہ اور دریا کی وجہ سے مگر زیادہ تر تیمور ملک کی مردانہ وار مدافعت کے باعث منگولوں کی توقع سے زیادہ مقابلہ پیش آیا۔ اس کے متعلق ایشائی مؤرخ کہتے ہیں ''اگر رستم زندہ ہوتا تو

---

[۱] تاریخ ابن کثیر، علامہ حافظ ابوالفد اعماد الدین ابن کثیر دمشقی / مولانا اختر فتح پوری، جلد سیزدہم، چہاردہم، ص ۱۷۲۔

[۲] تاریخ اسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، جلد چہارم، حصہ دوم، ص ۳۷۰، ۳۷۱۔

اس کا خادم بنتا'' (''جہاں کشا میں'' شمشیر بردار کا لفظ ہے)

انقاد خود محاصرے کا منتظم تھا۔ اس کے پاس پچاس ہزار غلام اور بیس ہزار منگول تھے جو گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے۔ غلام دس دس کی ٹولیوں میں ایک منگول کی زیر نگرانی تین میل دور پہاڑ سے پتھر لاتے تھے۔ تیمور کے پاس کمزور فوج تھی۔ اس نے بارہ جہاز بنا لئے تھے ان پر گیلا اونی کپڑا لگا ہوا تھا ایک اور قسم کی سریش بھی لگی ہوئی تھی جو سرکہ اور چونے سے بنی ہوئی تھی۔ گویہ دشمن کی آگ سے محفوظ تھے اور کناروں تک بغیر کسی خطرے کے آ کر دشمنوں پر سوراخوں سے تیر اندازی کر جاتے تھے۔ بہت عرصہ تک تیمور نے مدافعت کی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ مدافعت کو جاری رکھنا بے سود ہے تو اس نے ستر جہازوں میں خزانہ بھرا اور دریا کے راستے جند سے گزر کر صحرا میں اور وہاں سے خوارزم کی طرف نکل گیا۔ اس خطرناک سفر میں منگولوں نے کنارے کنارے اس کا تعاقب کیا۔ بناکیت میں دریا کے آر پار زنجیر کھینچ دی گئی جو ایک ہی جھٹکے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ بارکلک کیت اتر کر اسے ایک اور جنگ لڑنا پڑی جس کا حال تعجب انگیز سا ہے بہر حال وہ خوارزم پہنچ گیا۔''[۱]

اس روایت اور ناول نگار کے بیان کی مشابہت کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض ایسے واقعات جو بظاہر تخیلاتی یا مافوق الفطرت نظر آتے ہیں تاریخ کی ورق گردانی انہیں حق وصداقت کے معیار پر پورا اتارتی ہے اور کسی نہ کسی تاریخ میں اس کا تذکرہ نسیم حجازی کی تاریخی معلومات پر عبور کو واضح کرتا ہے۔

علاؤ الدین خوارزم شاہ دریائے سیحوں کے کنارے چنگیز خاں کے مقابلے کے لئے تیار تھا لیکن جب اسے یہ خبر ملی کہ چنگیز خاں مختلف مقامات پر حملہ آور ہوا چاہتا ہے تو اس نے بخارا، سمرقند وغیرہ کی حفاظت پر فوجیں روانہ کیں۔ اس موقع پر تاتاریوں نے اترار پر حملہ کیا جہاں کا حاکم آخر وقت تک مقابلے پر ڈٹا رہا۔ جب اس کے تیر ختم ہو گئے تو اس نے پتھروں سے مدافعت کی بالآخر زندہ گرفتار ہوا اس کی آنکھوں اور کانوں میں پگھلی ہوئی چاندی ڈال کر ہلاک کیا گیا۔ اترار کے اس واقعے کا تذکرہ آرمینیس ویمبرے نے ان الفاظ میں مرقوم کیا ہے:

''پچاس پچاس کی ٹکڑیوں میں جو حملے کئے ان میں اس کے کل آدمی قربان ہو گئے لیکن انہوں نے اپنی جان گراں قیمت میں بیچی۔ جب آخری دو سپاہی بھی قیر خاں کے پاس ہی مارے گئے تو اس نے تنہا مقابلہ جاری رکھا اور اینٹوں سے وار کرتا رہا جو اس کی نوکرانیاں اسے پکڑاتی رہیں۔ دشمن سخت غصے میں تھا اور اسے زندہ پکڑنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ آخر اینٹیں بھی ختم ہو گئیں۔ وہ گھر گیا اور گرفتار ہوا۔ اور ختائی اسے لڑائی کا انعام سمجھ کر سمرقند کے سبز محل میں لے گیا۔ اس کے کانوں میں اس ہوس کی یاد میں جس کی وجہ سے سوداگر قربان کئے گئے تھے پگھلی ہوئی چاندی ڈالی۔ وہ مر گیا اور اترار جو ترکستان کا شمال مغربی دروازہ تھا منگولوں کے ہاتھ آ گیا۔''[۲]

علامہ حکیم احمد حسین رقمطراز ہیں:

---

[۱] تاریخ بخارا: آرمینیس ویمبرے/ نفیس الدین احمد، ص ۱۵۵، ۱۵۶۔

[۲] تاریخ بخارا: آرمینیس ویمبرے/ نفیس الدین احمد، ص ۱۵۳۔

''امیر نیال خاں جس نے چنگیز خاں کے تاجروں کو قتل کر کے مال واسباب چھین لیا تھا گرفتار کر کے پیش کیا گیا۔ چنگیز خاں نے چاندی پگھلوا کر کانوں اور آنکھوں میں ڈلوادی، جس سے وہ مر گیا۔''[1]

ان دونوں آراء سے اترار کی فتح وہاں کے حاکم کا آخر وقت تک بے جگری سے لڑنا اور اس کا انجام ثابت ہوتا ہے۔ لیکن نام کا اختلاف سامنے آتا ہے ممکن ہے یہی اختلاف ناول نگار کے مدنظر رہا ہو اس نے نام لکھنے سے اعتراض کیا ہے اور جب ناول نگار نے الجھنے سے بچنے کا راستہ اختیار کیا ہے تو ہم بھی اس سہولت کا فائدہ اٹھا کر صرف انہی چیزوں کی حقیقت بیان کرنے پر اتفاق کرتے ہیں کچھ دیگر علاقوں کو فتح کرتا ہوا چنگیز خاں بخارا جا پہنچا۔ یہاں کی فصیل بہت مضبوط تھی اس نے آگ لگانے والے تیر پھینکے جس سے شہر میں آگ لگ گئی۔ اہلِ شہر نے مفاہمت کی خاطر ایک وفد چنگیز خاں کے پاس بھیجا جس کی برملا مخالفت امام زادہ رکن الدین نے کی۔ ان کی بات پر کسی نے دھیان نہ دیا شہر کے دروازے کھلتے تاتاری، بخارا میں داخل ہوئے خود چنگیز خاں بخارا کی جامع مسجد کے پاس پہنچ کر پوچھنے لگا۔ کیا یہ تمھارے بادشاہ کا گھر ہے اسے بتایا گیا نہیں یہ اللہ کا گھر ہے اس نے مسجد میں داخل ہو کر کہا کہ تم خدا کے قہر سے ڈرتے ہو اور میں خود خدا کا قہر ہوں۔ اپنی تمام بڑی بڑی عمارتیں میرے گھوڑوں کے لئے خالی کر دو۔ اپنے گھروں کے دروازے میرے فوجیوں کے لئے کھول دو، گھوڑوں کو چارہ فراہم کرو۔ پھر چشم فلک نے دیکھا کہ مساجد اور مدرسے اصطبل بن گئے۔ امراء کا قتل عام ہوا لوٹ مار کے بعد شہر کو آگ لگا دی گئی اور جب اہلِ شہر میدان میں کھڑے اپنی خواتین کی بے حرمتی پر خاموش تماشائی بنے تھے امام زادہ رکن الدین نے غیرت دلائی۔ نتیجے لوگ تاتاریوں پر ٹوٹ پڑے مگر تاتاریوں نے ذرا دیر میں میدان صاف کر دیا۔ یہ بڑا عبرت ناک منظر ہے اور پڑھنے سے گمان ہوتا ہے کہ ناول نگار اپنے قاری کی دلسوزی اور اس پر رقت پیدا کرنا چاہتا ہے مگر تاریخ کی ورق گردانی اس واقعہ کی حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے۔ تاریخ بخارا کا راوی رقمطراز ہے۔ اختصار کے پیش نظر ہم صفحہ نمبر ۱۵۸ کی نشاندہی کرتے ہوئے آخری حصہ رقم کرتے ہیں:

''بیویوں، بچوں اور خاوندوں کے شیون و بکا اور چیخ و پکار کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے۔ ان وحشیوں نے عورتوں اور لڑکیوں کی ان کے رشتہ داروں کے سامنے آبرو ریزی کی۔ رشتے دار بے چارے سوائے اشک ریزی کے اور کیا کر سکتے تھے۔ بہت لوگ اس گھناؤنے منظر کو دیکھنے کے بجائے جان پر کھیل گئے چنانچہ قاضی بدر الدین اور امام رکن الدین اس منظر سے طیش میں آ کر لازمی تباہی میں کود پڑے۔ مقابلہ برابر کا نہ تھا۔ اس لئے قتل ہوئے۔''[2]

اس واقعہ کو شاہ معین الدین احمد ندوی ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

''چنگیز خاں زرنوق اور نور بخارا کو فتح کرتا ہوا محرم ۶۱۷ھ میں بخارا پہنچا۔ اس کا نہایت سخت محاصرہ کر لیا۔ خوارزمی فوج اور

---

۱ تاریخ ابن خلدون؛ علامہ عبد الرحمٰن ابن خلدون/علامہ حکیم احمد حسین، ص ۳۳۵۔

۲ تاریخ بخارا؛ آرمینیس ویمبرے/نفیس الدین احمد، ص ۱۶۲۔

اہلِ بخارا نے دو چار دن تک مدافعت کی لیکن تاتاری سیلاب کو روکنا ان کے بس سے باہر تھا۔ بعض افسروں کی بھی ہمت چھوٹ گئی۔ اس لئے بخارا کے علما و عمائد چنگیز کے پاس جا کر امان کے طالب ہوئے۔ اُس نے منظور کر لیا۔ بخاریوں نے شہر کے دروازے کھول دیئے اور تاتاری فوج بخارا میں داخل ہو گئی۔ بخارا کی جامع مسجد بہت عظیم الشان تھی چنگیز نے اس کو دیکھ کر پوچھا، کیا یہ شاہی محل ہے؟ لوگوں نے جواب دیا، خانۂ خدا ہے۔ چنگیز خاں نے گھوڑوں کو دانہ کھلانے کا حکم دیا۔ اس حکم پر تاتاری غلہ کے ذخیروں پر ٹوٹ پڑے شہر بھر کا غلہ جمع کر کے کلامِ مجید کو پھینک دیا اور صندوقوں میں گھوڑوں کو چارہ دیا۔ علما و مشائخ کو ان کی نگرانی پر متعین کیا۔ شہر کی پوری آبادی کو باہر میدان میں لے جا کر اربابِ ثروت سے اُن کو دولت نکلوائی۔

خوارزمی فوج کا ایک حصہ قلعہ میں رہ گیا تھا جو تاتاریوں پر حملہ کرتا رہتا تھا اس لئے چنگیز نے شہر میں آگ لگوا دی۔ سارا شہر جل کر راکھ ہو گیا۔ صرف جامع مسجد کی عمارت باقی رہ گئی۔ قلعہ کی فوج نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ اس میں بہت سے تاتاری مارے گئے لیکن آخر میں تاتاریوں نے قلعہ بھی فتح کر لیا۔ قلعہ فتح کرنے کے بعد انہوں نے شہر کے ان تمام باشندوں کو جو کام کے لائق تھے جنگی کاموں کے لئے چھانٹ لیا، باقی ماندہ کو چھوڑ دیا۔ بخارا بالکل ویران ہو گیا۔"[1]

علامہ حافظ ابوالفدا اعماد الدین ابنِ کثیر دمشقی نے مرقوم کیا ہے:

"تاتاریوں نے بخارا کا قصد کیا، جہاں بیس ہزار جانباز موجود تھے، چنگیز خاں نے تین دن اس کا محاصرہ کیا تو بخارا کے باشندوں نے اس سے امان طلب کی۔ اس نے انہیں امان دے دی، اور بخارا میں داخل ہو گیا اور مکر و فریب سے ان سے اچھا سلوک کیا، اور قلعہ اس کے لئے رکاوٹ بن گیا تو اس نے اس کا محاصرہ کر لیا اور اس نے اہلِ شہر کو اس کی خندق بھرنے کو کہا اور تاتاری منابر اور اونٹنیوں کے بچوں کو لا کر انہیں خندق بھرنے کے لئے اس میں پھینک دیتے اور انہوں نے دس دنوں میں اُسے بزورِ قوت فتح کر لیا اور جو لوگ اس قلعہ میں موجود تھے، انہیں قتل کر دیا پھر وہ شہر کی طرف واپس آیا اور اس نے شہر کے تاجروں کے مال کو چھین لیا اور اسے اپنے سپاہیوں کے لئے حلال کر دیا اور انہوں نے شہر کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا جن کی تعداد کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور انہوں نے بچوں اور عورتوں کو قیدی بنا لیا اور ان کے اہل کی موجودگی میں ان کے ساتھ فواحش کا ارتکاب کیا اور کچھ لوگ تو اپنی بیویوں کا تحفظ کرتے ہوئے قتل ہو گئے اور کچھ کو انہوں نے قیدی بنا لیا اور انہیں طرح طرح کے عذاب دیے اور شہر میں مردوں، عورتوں اور بچوں کی بہت آہ و بکا ہو گئی۔ پھر تاتاریوں نے بخارا کے گھروں، مدارس اور مساجد میں آگ پھینکی اور وہ جل کر ویران ہو گیا اور وہ اپنی چھتوں سمیت منہدم ہو گیا۔"[2]

ان روایات کی روشنی میں ناول نگار کے بیان کردہ واقعات کی حقیقت ثابت ہوتی ہے کم از کم ایک ہی تاریخ میں سہی امام زادہ رکن الدین کا کردار واضح ہو کر سامنے آتا ہے اس کے علاوہ وہ بخارا کی جامع مسجد کے بارے میں چنگیز خاں کا بیان الفاظ کے اعتبار سے

---

1. تاریخ اسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۳۲۲، ۳۲۳۔

2. تاریخ ابن کثیر، علامہ حافظ ابوالفدا اعماد الدین ابن کثیر دمشقی / مولانا اختر فتح پوری، ص ۱۷۲، ۱۷۳۔

مختلف سہی مفہوم کے اعتبار سے ایک ہی ہے پھر لوگوں سے اس کا یہ کہنا کہ میں خدا کا قہر ہوں۔شہر کی تباہی اور شہریوں کا قتل عام وغیرہ تمام ہی واقعات تاریخی روایات کے مطابق ہیں۔

سقوط سمرقند سے قبل کے حالات بیان کرتے ہوئے ناول نگار رقم طراز ہے:

''سلطان کا نوجوان بیٹا جسے شیر خوارزم کہا جاتا تھا، سلطنت کے شمال مغربی علاقوں میں افواج تیار کر رہا تھا اس نے ایلچی بھیج کر اپنے ضدی باپ سے سمرقند آنے کی اجازت مانگی لیکن سلطان کی طرف سے یہ جواب ملا۔''تم مجھ سے زیادہ تجربہ کار نہیں ہو۔جب ضرورت ہوگی تمھیں بلا لیا جائے گا۔''[۱]

مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی نے اس واقعہ کی حقیقت یوں تحریر کی ہے:

''خوارزم شاہ کے سات بیٹے تھے اُن میں سے ایک بیٹے نے جس کا نام جلال الدین تھا باپ کو خائف اور ترساں دیکھ کر کہا کہ آپ اگر عراق کی طرف جانا چاہتے ہیں تو شوق سے چلے جائیے۔فوج کی سرداری مجھ کو عنایت کیجیے۔میں فوج لے کر دشمن پر حملہ کرتا ہوں اور انشاء اللہ دریائے جیحوں کے پار جا کر اپنا خیمہ نصب کروں گا۔ماوراء النہر کی حفاظت میرے سپرد کیجیے اور آپ عراق و خراسان کو سنبھالیے مگر خوارزم شاہ نے اس بات کو پسند نہ کیا۔بلخ سے ہرات کی طرف روانہ ہوا۔''[۲]

ناول نگار کے بیان اور تاریخ کے اوراق پر اس واقعہ کی موجودگی اس کی حقیقت کو ثابت کرتی ہے۔اب ہم اصل واقعہ یعنی سمرقند پر تاتاریوں کی یلغار کا حال بیان کرتے ہیں۔سمرقند کا قلعہ خوارزم کا مضبوط ترین قلعہ تھا۔جہاں ایک لاکھ سے زائد فوج موجود تھی مگر بخارا کی شکست اور علاؤالدین کے شہر سے چلے جانے پر اہل شہر اور لشکر مایوسی کا شکار ہو گئے۔جب تاتاری افواج سمرقند آئیں تو افواج نے باہر نکل کر مقابلہ کیا جنگ جاری تھی کہ غداروں کا ایک گروہ تیس ہزار فوج کے ساتھ تاتاریوں سے جا ملا۔فتح شکست میں بدل گئی قتل و غارت گری ہوئی اور شہر کو لوٹ کر برباد کر دیا گیا۔چنگیز خاں نے ان غداروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس واقعہ کا تذکرہ علامہ حافظ ابوالفدا عماد الدین ابن کثیر دمشقی نے اس طرح کیا ہے:

''(چنگیز خاں) اس نے سمرقند جا کر اس سال کی یکم محرم کو اس کا محاصرہ کر لیا، جہاں پر پچاس ہزار فوجی جانباز موجود تھے، جنہیں عذاب دیا گیا اور ستر ہزار عوام ان کے مقابلے میں نکل آئے اور وہ ایک ہی ساعت میں قتل ہو گئے اور پچاس نے اس کی طرف ایک ہزار سیڑھی پھینکی، تو اس نے ان کے ہتھیار اور جن چیزوں سے وہ اپنی حفاظت کرتے تھے، انہیں چھین لیا اور اسی روز انہیں قتل کر دیا اور اس نے شہر کو مباح کر دیا اور اس نے سب کو قتل کر دیا۔اور بچوں کو قیدی بنا لیا۔اور شہر کو نذرِ آتش کر کے ویران کر کے چھوڑ دیا۔''[۳]

آرمینیس ومبیرے رقمطراز ہے:

۱۔ آخری چٹان؛ نسیم حجازی، ص ۳۲۰۔

۲۔ تاریخ اسلام؛ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی، حصہ سوم، ص ۲۲۸۔

۳۔ تاریخ ابن کثیر؛ علامہ حافظ ابوالفدا عماد الدین ابن کثیر دمشقی/ مولانا اختر فتح پوری، جلد سیزدہم، چہاردہم، ص ۱۸۳۔

"دلیر قلعہ نشین جوانمرد الپ خاں اور شیخ خان اور بلاس خان کی سرکردگی میں باہر نکل کر حملہ کرتے رہے اور منگولوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ تیسرے دن چنگیز خود فوج کی کمان سنبھال کر شہر پر حملہ آور ہوا جلد ہی منگول دروازوں پر قابض ہو گئے۔ خوارزمی دوسرے دن برابر لڑتے رہے۔ شام کے قریب ان کے مشیروں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض اطاعت قبول کرنا چاہتے تھے۔ شیخ الاسلام کو بہت سے ملاؤں کے ساتھ چنگیز خاں کے پاس بھیج کر رحم کی درخواست کی۔ دوسرے قلعے میں چلے گئے اور دوسرے دن بھی لڑائی جاری رکھی۔ منگول نظامیہ دروازے سے شہر میں گھس آئے اور باشندوں کو باہر نکال دیا تاکہ شہر کو آرام سے لوٹ سکیں۔ اس پہلے حملے میں شیخ الاسلام اور پچاس ہزار آدمی جو اس کی خاص حفاظت میں تھے بچ سکے۔ قلعہ ابھی فتح نہ ہوا تھا اور محاصرین کو بہت قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی۔ الپ خان نے یہ دیکھ کر کہ انجام قریب ہے ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ دلیرانہ حملہ کیا اور منگول فوج کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ جن لوگوں نے ہتھیار ڈالے وہ کانگلی تھے یا چند ترک جنہیں منگولوں نے یقین دلایا تھا کہ ہم قوم ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا۔ انہیں مطمئن کرنے کے لئے ان کے سر ترشوائے گئے۔ یہ منگولوں کا طریقہ تھا مگر اسی شام ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ تیس ہزار آدمی مع شہزادوں کے الق بارشاس باغاں اور سارلگ خان بیس جرنیل، سب، کے سب ایک ہی رات میں مار ڈالے گئے سمرقند کا بارونق شہر اور قلعہ مسمار کر دیے گئے اور باشندوں سے ہر چیز چھین لی گئی اور وہ اپنے بخارا والے بھائیوں کی قسمت میں شریک ہو گئے۔ جو بھاگ گئے تھے وہ جھوٹے وعدے سے واپس بلا لئے گئے تمام ہتھیار بند آدمی جبراً منگول فوج میں شامل کیے گئے۔"[۱]

شاہ معین الدین احمد ندوی نے یوں مرقوم کیا ہے:

"بخارا کو تباہ کرنے کے بعد چنگیز خاں نے سمرقند کا رخ کیا۔ خوارزم شاہ نے اس کی حفاظت کا پورا انتظام کیا تھا۔ اس کے گرد نہایت بلند و مستحکم شہر پناہ تعمیر کرائی تھی۔ اُس کے چاروں طرف گہری اور وسیع خندق کھود کر اس کو دریا سے ملا دیا تھا۔ ایک لاکھ دس ہزار منتخب سپاہ اس کی حفاظت کے لئے متعین کی تھی۔ اس لئے چنگیز نے بھی بڑے اہتمام کے ساتھ اس پر فوج کشی کی تھی۔ اُس فتح کی تفصیلات میں عربی و فارسی مورخین کے بیان میں اختلاف ہے لیکن نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ اہلِ سمرقند نے بڑی پامردی سے مدافعت کی لیکن تاتاری سیلاب کو نہ روک سکے۔ آخر میں ان کے سامنے سپر ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ سمرقند پر قبضہ کے بعد تاتاریوں نے بخارا کی طرح اس کی بھی کل دولت لوٹ لی۔ جنھوں نے چھپانے کی کوشش کی انہیں اذیتیں دے کر اقرار کرایا۔ کچھ مسلمانوں نے مسجد کو آڑ بنایا تھا۔ اس لئے تاتاریوں نے اس کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ سمرقند کے ان باشندوں کو جو لونڈی غلام بنانے کے لائق تھے قید کر لیا، باقی عورتوں اور بچوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔"[۲]

ناول نگار کے بیان کی کسی نہ کسی روایت سے تصدیق ہوتی ہے خاص طور پر سمرقند میں موجود فوج کی تعداد، شہر کی فصیل، ایک گروہ کا غداری کرنا، غداروں کے ساتھ چنگیز خاں کا سلوک وغیرہ تقریباً ہر اہم معاملے کا ثبوت مل جانا ناول نگار کے اس ذہنی شعور کی پختگی کا

---

۱ تاریخ بخارا؛ آرمینیس ویمبرے/ نفیس الدین احمد، ص ۱۶۴۔

۲ تاریخ اسلام؛ شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۳۷۴۔

اعتراف ہے جوانہوں نے تاریخی ناول نگاری کے معیار اور مزاج دونوں کو خوب سمجھا اور اسی طرح برتا۔ ناول نگار نے جس واقعہ کو خاصی اہمیت دی ہے وہ خوارزم شاہ کا اپنی جان بچاتے پھرنا ہے اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہے:

''خوارزم شاہ مختلف شہروں سے گزرتا ہوا نیشا پور پہنچا۔ تاتاری راستے کے شہروں کو چھوڑتے ہوئے وہاں تک جا پہنچے تو خوارزم شاہ نے ہمدان کا رخ کیا لیکن تاتاری سائے کی طرح اس کے پیچھے تھے۔ ایک مقام پر انھوں نے اُسے آلیا اور خوارزم شاہ کے ساتھیوں میں سے چند ایک کے سوا باقی تمام تہ تیغ کر دیے گئے۔ خوارزم شاہ خود تیروں سے زخمی ہو کر بھاگا۔ اب دنیا میں اس کے لئے سب سے بڑا مسئلہ اپنی جان بچانا تھا۔ اس کے ساتھی اس سے تنگ آ چکے تھے۔

اس نے چاروں طرف سے مایوس ہو کر بحیرۂ خزر کے کنارے ڈیرہ ڈال دیا اور تمام قبائل کے سرداروں کی طرف ہرکارے دوڑا دیے لیکن اس کی مدد کے لئے کوئی نہ پہنچا۔''[۱]

آگے چل کر ناول نگار اس کا انجام یوں بیان کرتا ہے:

''چند دن کے بعد خوارزم شاہ کو کسی نے تاتاریوں کی آمد کی خبر دی اور وہ اپنے چند رفیقوں سمیت بحیرۂ خزر کے ایک جزیرے میں پناہ گزین ہو گیا اور وہیں گمنامی کی موت مر گیا۔''[۲]

اس واقعہ کا ذکر آرمینیس ویمبرے نے اس طرح کیا ہے:

''وہ جیحوں پار خراسان بھاگ گیا۔ چاہتا تھا کہ نیشا پور کے خوبصورت میدان میں کچھ وقت ٹھہرے تاکہ وہاں ان عشرتوں کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ سکے جن سے بدقسمتی سے وہ اب تک وابستہ تھا۔ حالانکہ خطرہ سر پر آ پہنچا تھا جب سنا کہ چیپی اور سنتائی قریب ہی تعاقب میں آ رہے ہیں تو روانہ ہوا۔ اگرچہ تعاقب بہت تیز رفتار تھا تاہم رے سے گزر کر مازندران کے بے راہ وجادہ پہاڑوں سے جا کر ایستون پہنچا اور وہاں سے بحیرۂ خزر کے ایک جزیرہ میں (جو غالباً ''اوغورت شالی'' تھا)۔ اگرچہ وحشی دشمن کے انتقام سے بچ نکلا تھا مگر خاندان کی تقدیر سے مایوس ہو چکا تھا کیونکہ اس کے اہل وعیال منگولوں کے کیمپ میں تھے۔ ۲۲ ذالحجہ ۶۱۷ھ (۱۲۲۰) کو نہایت غربت، افلاس اور کس مپرسی کی حالت میں فوت ہوا۔''[۳]

اس واقعہ کا حال تفصیل کے ساتھ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون نے کیا ہے۔ ہم اختصار کی خاطر دو حصوں میں بیان کرتے ہیں:

''سلطان خوارزم شاہ بحال پریشان نیشا پور پہنچا لیکن مغربی تاتاریوں کے تعاقب نے نیشا پور میں بھی قیام نہ کرنے دیا۔ عراق کی طرف چلا گیا اور مال واسباب کو ایک قلعہ میں امانت کے طور پر رکھ گیا۔''[۴]

اس کی موت کا حال یوں بیان کیا ہے:

---

[۱] آخری چٹان: نسیم حجازی، ص ۳۲۲۔

[۲] ایضاً، ص ۳۲۶۔

[۳] تاریخ بخارا: آرمینیس ویمبرے / نفیس الدین احمد، ص ۱۶۷، ۱۶۸۔

[۴] تاریخ ابن خلدون: علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون / علامہ حکیم احمد حسین، ص ۳۲۷

''چنگیز خانی تاتاریوں نے خوارزم شاہ کو یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ دوبارہ چھاپہ مارا خوارزم شاہ کشتی پر سوار ہو کر دریا عبور کر گیا اور خونریز تاتاری اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور ناکام واپس ہوئے۔ خوارزم شاہ نے دریائے طبرستان کے ایک جزیرے میں پہنچ کر اقامت اختیار کی اور وہیں رہنے لگا۔ مرض الموت نے آ کر گھیر لیا۔ اہالیان مازندران تیمارداری کرتے تھے۔ اس امید پر کہ اگر زمانے نے پلٹا کھایا تو اس خدمت کے صلے میں خوارزم شاہ انھیں جاگیریں دے گا۔ صوبجات کو گورنری پر مامور کرے گا لیکن خوارزم شاہ کو اس کو موقع نہ ملا۔ ۶۱۷ھ میں موت کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو گیا۔''[۱]

اس کیفیت کا حال مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی تفصیل کے ساتھ یوں مرقوم کرتے ہیں:

''اسی اثنا میں خبر پہنچی کہ مغلوں نے بخارا فتح کر کے وہاں کے تمام باشندوں کو قتل کر دیا۔ یہ سن کر اور بھی زیادہ پریشان و ہراساں ہوا۔ اور ہرات سے نیشا پور جا کر مقیم ہوا۔ مغلوں نے ابھی تک دریائے جیحوں کو عبور کرنے کی جرأت نہیں کی بلکہ وہ ماوراء النہر ہی میں مصروف تاخت و تاراج رہے اور خوارزم شاہ نیشا پور میں مصروف عیش و نشاط رہا۔

ماہ صفر ۶۱۷ھ میں چنگیز خاں کے ایک سردار نے تیس ہزار فوج کے ساتھ دریائے جیحوں کو عبور کیا۔ یہ خبر سن کر خوارزم شاہ سخت پریشان ہوا اور اپنے اہل و عیال اور خزانے کو قلعہ قارون میں بھیج کر خود نیشا پور سے اسفرائن چلا گیا مغلوں نے جب دیکھا کہ خوارزم شاہ مقابلہ پر نہیں آتا اور ہمارے خوف سے بھاگا پھرتا ہے تو ان کے حوصلے بہت بلند ہو گئے انہوں نے بڑھ کر خوارزم شاہ کا تعاقب شروع کر دیا۔ خوارزم شاہ، مغلوں کے آگے بھاگتا ہوا قارون دژ میں جہاں اس کے اہل و عیال اور خزانہ موجود تھا پہنچا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے دوسری طرف سے مغلوں نے اس کا محاصرہ کر لیا تھا۔ وہاں سے خوارزم شاہ بھاگتا ہوا استر آباد اور استر آباد سے آمل پہنچا۔

وہاں سے ایک جزیرہ میں جا کر پناہ گزین ہوا۔ یہاں اس کے پاس خبر پہنچی کہ مغلوں نے قلعہ قارون دژ فتح کر کے خزائن و اموال اور اس کے اہل و عیال پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ خبر سن کر اس کو سخت صدمہ ہوا اور اسی رنج و ملال میں فوت ہو گیا۔''[۲]

اس واقعہ کا حال منہاج سراج اس طرح نقل کرتے ہیں:

''جب ان لشکروں نے دریائے جیحوں کو عبور کیا تو سلطان محمد نیشا پور سے مازندران کے اندر چلا گیا اور درۂ تمیشہ کو لشکر گاہ بنایا۔ اچانک تاتاری وہاں بھی جا پہنچے سلطان نے شکست کھائی۔ پیدل پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ پھر پہاڑی پگڈنڈیوں ہی سے مازندران کے اندر چلا گیا۔ رئیس مازندران کا بیٹا ساتھ تھا۔ خود سلطان کا فرزند جلال الدین منکبرنی بھی ہمرکاب تھا۔ سلطان بحیرۂ خزر میں چلا گیا اور ایک خراب جزیرے میں کچھ مدت گزاری۔ تاتاریوں نے سلطان کو مازندران میں نہ پایا تو وہ عراق کی جانب نکل گئے۔

تاتاری وہاں سے چلے گئے تو سلطان محمد خوارزم شاہ چند سواروں کے ہمراہ جزیرے سے باہر آیا۔ اسے معدے کی تکلیف تھی جو بہت بڑھ گئی۔ اس پر مالیخولیا سا طاری ہو گیا۔ اپنے بیٹے جلال الدین سے کہا کوشش کر کے مجھے خوارزم پہنچا دے کیونکہ ہماری سلطنت

---

[۱] تاریخ ابن خلدون؛ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون/ علامہ حکیم احمد حسین، ص ۳۲۸۔

[۲] تاریخ اسلام؛ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی، حصہ سوم، ص ۲۲۸، ۲۲۹۔

کی ابتدا وہیں سے ہوئی تھی۔ بار بار یہ شعر پڑھتا:

جب آدمی کو اپنے کام کی کوئی تدبیر نہیں سوجھتی تو اس سے اچھی بات کوئی نہیں کہ اس کا رشتۂ حیات منقطع ہو جائے۔

جب معدے کی بیماری بہت بڑھ گئی تو سلطان میں گھوڑے پر سوار ہونے کی طاقت بھی نہ رہی چنانچہ اس کے لئے اونٹ مہیا کئے گئے اور اسے محمل میں لٹا کر خوارزم کی طرف روانہ کر دیا۔ دورانِ سفر ہی وفات پائی۔"[1]

ناول نگار اور مورخین کی روایات میں ابتدأ اتفاق ہے کہ خوارزم شاہ نیشا پور گیا اور پھر خراسان وغیرہ سے ہوتا ہو بحیرۂ خزر کے ایک جزیرے میں مقیم ہو گیا اور یہیں موت نے اس کا کام تمام کیا۔ مگر اس کی موت کا حال ابتدائی دو روایات میں بحیرۂ خزر میں بتایا گیا ہے جبکہ آخر الذکر روایت میں اسے دورانِ سفر موت سے واسطہ پڑا پھر اس روایت میں جلال الدین کو اس کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ جلال الدین کے پاس آنے کا واقعہ ناول نگار نے بھی لکھا ہے مگر محض گزرنے اور چند باتیں کرنے تک محدود ہے لیکن نہ جانے کیوں طبقاتِ ناصری میں یہ اختلاف سامنے آیا حالانکہ تاریخ اسلام میں معین الدین احمد ندوی نے بھی اس کی موت کا حال ان الفاظ میں لکھا ہے:

"اِن حوادث و مصائب، مسلسل سفر اور گرم و سرد آب و ہوا کے اثر سے سلطان ذات الجنب میں مبتلا ہو گیا۔ جزیرہ میں جانے کے چند ہی دنوں کے بعد ۶۱۷ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس غربت میں کفن تک میسر نہ آسکا۔ جو کپڑے اس کے جسم پر تھے، انہی میں دفن کیا گیا۔"[2]

اس رائے کو شامل کرنے کے بعد ہم ان آراء کی کثرت کی بنا پر کہ جن میں علاؤالدین خوارزم شاہ کی موت جزیرے میں ثابت کی گئی ہے اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں جو ناول نگار نے پیش کی ہے۔ ناول نگار نے واقعات جس ترتیب سے پیش کئے ہیں ان کے مطابق تاتاری افواج مرو کی طرف بڑھیں اس شہر میں دوسرے علاقوں کے بچے کھچے لوگ بھی موجود تھے جو طویل عرصے سے متوقع جنگ کی تیاری میں مصروف تھے۔ جب تاتاریوں کا لشکر مرو کی فصیل سے قریب پہنچا تو فصیل پر اس قدر تیر انداز تھے کہ کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔ انہوں نے تیر برسائے اور تاتاریوں کو پیچھے ہٹنا پڑا پھر انہوں نے غداروں سے کام لیا۔ شہر کے حاکم کو ملاقات کے لئے بلایا اور اس سے بڑے ہی خوش اخلاقی سے پیش آئے پھر مزید امرائے شہر کو بلایا انہیں قتل کر کے ان کے لباس پہن کر دھوکے سے شہر میں داخل ہو گئے۔ خوب قتل عام کیا کھوپڑیوں کے مینار بنائے گئے حاملہ خواتین کے پیٹ چاک کر کے نوزائیدہ بچوں تک کو قتل کیا۔ شہر کو آگ لگا دی یہاں تاتاریوں کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ اس واقعہ کا تفصیلی حال علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون ان الفاظ میں رقم کرتا ہے:

"خراسان کے سر ہونے کے بعد چنگیز خاں نے اپنے بیٹے کو شہر مرو کو سر کرنے کے لئے روانہ کیا۔ اور ان مسلمانوں کو بھی اس مہم پر جانے کا حکم دیا جن کے شہروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ بادلِ ناخواستہ بہ خوفِ جان و آبرو تاتاری لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے۔ مرو میں

---

[1] طبقاتِ ناصری: منہاج سراج / غلام رسول مہر (مرحوم)، جلد اول، ص ۵۶۴، ۵۶۵۔

[2] تاریخ اسلام: شاہ معین الدین احمد ندوی، جلد چہارم، ص ۲۷۵۔

اس وقت ان باقی ماندہ لوگوں کا ایک جمِ غفیر جمع تھا جو گذشتہ لڑائیوں میں تاتاریوں کے قتل سے بچ گئے جن کی تعداد دولاکھ سے زائد تھی۔ مرد کے باہر ان لوگوں نے صف آرائی کی اور اپنی کامیابی پر ذرا بھی شک وشبہ نہ کرتے تھے۔ تاتاریوں نے پہنچ کر جنگ چھیڑ دی۔ معرکۂ کارزار شروع ہوگیا۔ جس قدر ثابت قدمی سے مسلمانوں نے مقابلہ کیا اس سے کہیں زیادہ تاتاریوں نے اپنی ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ نہایت استقلال سے لڑتے رہے۔ بالآخر چوتھے دن مسلمانوں نے میدانِ جنگ چھوڑ دیا۔ تاتاری نہایت بے رحمی سے قتل کرنے لگے۔ پانچ دن تک شہر کا محاصرہ کئے رہے۔ حاکم مرو نے صلح کا پیام بھیجا۔ امان دینے کا وعدہ کیا۔ حاکم مرو نے امان حاصل کر کے شہر پناہ کا دروازہ کھول دیا اور خود تاتاری دربار میں حاضر ہوا۔

چنگیز خاں کے بیٹے نے اولاً نہایت تپاک سے خیر مقدم کیا۔ خلعت دیا اس کے بعد حاکم مرو کو حکم دیا کہ جائزے کی غرض سے اپنے لشکر کو حاضر کرو۔ جوں ہی تمام لشکر آ گیا گرفتار کر لیا۔ لشکر کی گرفتاری کے بعد حاکم شہر سے رؤساء شہر، تجار، کاریگران اور مہاجنوں کی علیحدہ علیحدہ فہرستیں مرتب کرائیں اور ان سب کو مع اہل وعیال حاضری کا حکم دیا۔ چنگیز خاں سونے کی کرسی پر بیٹھا اور اُس فوج کو پیش کرنے کا اشارہ کیا جو اس کے حکم سے گرفتار کی گئی تھی۔ چنگیز خاں نے بلا پس وپیش ان لوگوں کی گردن زنی کا حکم صادر کیا۔ بات کی بات میں قتل کر دیے گئے۔ امراء، رؤساء، تجار اور مہاجنوں کے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا کہ روپیہ حاصل کرنے کی غرض سے طرح طرح کی اذیتوں میں مبتلا کئے گئے۔ بعض تو زدوکوب کے صدمے سے مر گئے اور بعض مال نہ دینے کی وجہ سے زندہ قبروں میں دفن کر دیے گئے۔ حصول زر کی آرزو میں مُردوں کی قبریں کھود ڈالیں غرض کہ روپیہ حاصل کرنے کی غرض سے جو مظالم کر سکتے تھے کئے۔ عوام الناس کو جن میں مرد بھی تھے عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی تھے لشکریوں پر تقسیم کر دیا۔ اس قتلِ عام اور غارت گری سے فارغ ہو کر شہر میں آگ لگا دی شہر جل کر خاک سیاہ ہوگیا۔ مال ہی کی تلاش اور جستجو میں سلطان سنجر کی قبر کو کھود ڈالا۔ اس واقعہ کے چوتھے دن باقی ماندہ اہل شہر پیش ہوئے جو اس وقت تک تاتاریوں کی تلواروں سے بچ گئے تھے چنگیز خاں نے ان لوگوں کے قتل کا حکم دے دیا۔ جن کی تعداد سات ہزار سے کم نہ تھی۔''[1]

اس واقعہ کا مختصر حال علامہ حافظ ابوالفدا عماد الدین ابن کثیر دمشقی ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

''پھر انہوں نے چنگیز خاں کے ساتھ پڑاؤ کر لیا اور انہوں نے اس کے ساتھ عظیم جنگ کی حتیٰ کہ مسلمانوں کو شکست ہوئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّـآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، پھر انہوں نے پانچ دن تک شہر کا محاصرہ کیے رکھا اور اس کے نائب کو دھوکے سے اتار لیا۔ پھر اس سے اور اہلِ شہر سے خیانت کی، اور انہیں قتل کر دیا اور ان سے غنیمت حاصل کی اور ان سے اموال چھین لیے، اور انہیں طرح طرح کے عذاب دیے، حتیٰ کہ انہوں نے ایک دن میں سات لاکھ انسانوں کو قتل کیا۔''[2]

ناول نگار کے بیان اور ان دونوں روایتوں میں تقریباً تمام ہی معاملات ثابت ہوتے ہیں جن میں حاکم شہر کو امان دینا اور پھر اسے قتل کر

---

[1] تاریخ ابن خلدون، علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون / علامہ حکیم احمد حسین، حصہ ہفتم، ص ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰۔

[2] تاریخ ابن کثیر، علامہ حافظ ابوالفدا عماد الدین ابن کثیر دمشقی / مولانا اختر فتح پوری، جلد سیزدہم، چہاردہم، ص ۱۸۶، ۱۸۷۔

دینا، شہریوں کا قتلِ عام اور شہر کو آگ لگانا وغیرہ۔ ناول نگار نے واقعات میں دلسوزی اور رقت پیدا کرنے کے لئے چند اور واقعات بھی پیش کیے ہیں۔ جن کا تذکرہ تاریخ سے ثابت نہیں ہوا لیکن ہمارا خیال ہے کہ جب ظلم و ستم اور سفاکی اپنے عروج پر ہو گی تو ایسے مبینہ واقعات کا ہو جانا قرینِ قیاس ہے۔ ناول نگار نے جس واقعہ کی طرف توجہ دلائی ہے اس کے مطابق جلال الدین نے غزنی پہنچ کر اپنی فوج منظم کی امین الملک پچاس ہزار فوج اور سیف الدین اغراق چالیس ہزار فوج کے ساتھ آن ملے۔ مزید علاقوں سے رضا کاروں کی آمد کے بعد چند قیدی تاتاریوں کے ذریعے چنگیز خاں کے پاس طاقت آزمائی کا پیغام بھیجا۔ چنگیز نے شگی تو تو کی قیادت میں کئی لاکھ فوج روانہ کی غزنی سے چند کوس باہر ان کا آمنا سامنا ہوا۔ مقابلے میں تاتاریوں کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا شگی تو تو چند ساتھیوں کے ساتھ جان بچا سکا۔ اس واقعہ کا حال علامہ ابن خلدون اس طرح مرقوم کرتے ہیں:

''چند روز بعد اس (امین الملک) نے سلطان جلال الدین کی اطاعت قبول کر لی، سیف الدین بقراق خلجی، اعظم ملک بلخی، مظہر ملک اور حسن سلطان سے آملے۔ ان میں سے ہر ایک کی رکاب میں تیس تیس ہزار نبرد آزما موجود تھے۔ سلطان کے موکب ہمایوں میں بھی اسی قدر فوج تھی۔ سب نے متفقہ اور مجموعی قوت سے تاتاریوں پر جس وقت کہ وہ قلعہ قندھار کا محاصرہ کیے تھے حملہ کیا۔ اس معرکہ میں تاتاریوں کو شکست ہوئی۔ بقیہ بھاگ کر اپنے بادشاہ چنگیز خاں کے پاس پہنچے۔

چنگیز خاں نے ایک بڑی فوج اپنے بیٹے طولی خاں کی سرکردگی میں جلال الدین سے جنگ کرنے کے لئے روانہ کی۔ مقام شروان میں دونوں حریفوں کا مقابلہ ہوا۔ جلال الدین نے نہایت مردانگی سے مقابلہ کیا۔ تاتاریوں کو شکست ہوئی۔ طولی خاں بن چنگیز خاں معرکہ کارزار میں مارا گیا۔ تاتاری فوج تتر بتر ہو گئی۔''[۱]

اس واقعہ کی حقیقت علامہ ابن کثیر اس طرح رقم کرتے ہیں:

''اس (چنگیز خاں) نے ان میں سے ایک فوج کو غزنی کی طرف بھیج دیا اور جلال الدین خوارزم شاہ نے ان سے جنگ کی اور جلال الدین نے انہیں عظیم شکست دی اور ان میں سے بہت سے مسلمان قیدیوں کو چھڑا لیا۔''[۲]

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی اس واقعہ کو ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

''وہاں سے روانہ ہو کر غزنین پہنچا یہاں اس کو اپنے ہمدردوں اور دوستوں کی ایک جمعیت مل گئی۔ اس نواح میں جو مغلیہ فوج تھی اس نے حملہ کیا۔ جلال الدین نے اُس کو شکست دے کر بھگا دیا اور یہ غالباً پہلی شکست تھی جو چنگیزی فوج کو جلال الدین کے مقابلے میں حاصل ہوئی۔''[۳]

اس واقعہ اور روایات میں ایک بڑا بنیادی اختلاف چنگیز خاں کے بیٹے کا ہے۔ ناول نگار نے شگی تو تو جبکہ راوی طولی خاں بیان کرتا ہے

---

[۱] تاریخ ابنِ خلدون؛ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون/ علامہ حکیم احمد حسین، حصہ ہفتم، ص ۳۶۹، ۳۷۰۔

[۲] تاریخ ابنِ کثیر؛ علامہ حافظ ابوالفدا عماد الدین ابن کثیر دمشقی/ مولانا اختر فتح پوری، جلد سیزدہم، چہاردہم، ص ۱۸۷۔

[۳] تاریخ اسلام؛ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی، ص ۳۲۹۔

پھر دوسرا اختلاف اس کے بچ نکلنے کا ذکر کرتا ہے جبکہ راوی اس کے قتل ہو جانے کو بیان کرتا ہے البتہ اتفاق اس بات پر ہے کہ اس معرکے میں تاتاریوں کو نقصانِ عظیم اٹھانا پڑا اور جلال الدین سرخرو رہا۔ اختلافی نکات کیونکر آئے۔ شاید ناول نگار نے کسی ایسی تاریخ کا سہارا لیا ہو جو ہم تک نہیں پہنچی۔ اس کے بعد ناول نگار نے جس واقعہ کو بیان کیا ہے وہ جلال الدین کے دو سالاروں کے درمیان مالِ غنیمت کی تقسیم پر تکرار اور قتل کے واقعہ کا ہے۔ سیف الدین اغراق کا بھائی قتل ہو گیا۔ جلال الدین اور دیگر علما کی تمام تر مصالحتی کوششوں کے جواب میں سیف الدین کا یہی اصرار تھا کہ امین الدین ملک کو اس کے حوالے کر دیا جائے جب اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو اپنے پچاس ہزار سپاہیوں کے ہمراہ ناراض ہو کر چلا گیا۔ مالِ غنیمت پر جھگڑے کا حال کئی روایتوں میں ملتا ہے۔

علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون رقم طراز ہیں:

''سلطان جلال الدین کے لشکر میں تقسیم مالِ غنیمت پر جھگڑا ہو گیا۔ سیف الدین بُراق اور امین الملک نائب ہرات سے بھی اسی معاملہ میں جھگڑا ہو گیا۔ امین الملک نے عراق کا راستہ لیا اعظم ملک اور مظفر ملک بھی لڑ پڑے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اتفاق یہ کہ اس ہلڑ میں بقراق کا بھائی مار ڈالا گیا۔ بقراق ناراض ہو کر ہندوستان کی طرف واپس ہوا۔ اس کے ہمراہی ساتھ ہو لئے۔ جلال الدین نے ہر چند ملانے اور واپس لانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی اور ایک بھی واپس نہ ہوا۔''[1]

مصنف طبقاتِ ناصری اس واقعہ کا مختصر حال یوں لکھتا ہے:

''سلطان کے لشکر میں اغراق قبیلے کے آدمی زیادہ تھے، وہ بڑے مردِ میدان اور خونریز جنگوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ انہیں مالِ غنیمت کے متعلق عجمیوں اور عراقیوں سے عداوت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطان کے لشکر سے الگ ہو گئے اور دوسری طرف چلے گئے۔ سلطان کے ساتھ صرف ترک رہ گئے۔''[2]

اس واقعہ کی صداقت کے بعد بقول ناول نگار جلال الدین کی مشکلات بڑھ گئیں کیونکہ ایک طرف فوج کا ایک بازو ساتھ چھوڑ گیا تو دوسری طرف چنگیز خاں غضبناک ہو کر غزنی کی طرف روانہ ہوا۔ جلال الدین کے پاس مقابلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تاتاری اسے ہر طرف سے گھیر رہے تھے وہ پیچھے ہٹتا رہا یہاں تک کہ دریائے سندھ اس کی پشت پر آ گیا مردانہ وار لڑا اگر گرفتاری سے بچنے کے لئے گھوڑے سمیت دریائے سندھ میں چھلانگ لگا دی دریا کی دوسری جانب جا بیٹھا تاتاری اس کا پیچھا کرنا چاہتے تھے مگر چنگیز خاں نے انہیں روک دیا اور اس موقع پر اس کے شیر ہونے اور بہترین حسب و نسب کا اعتراف کیا یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے اس قدر اہم ہے کہ حکایتوں اور روایتوں ہر دو انداز میں ضرب المثل کی طرح مشہور ہے۔ تقریباً ہر مورخ نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس بارے میں شکیل احمد ضیاء یوں رقمطراز ہیں:

''جلال الدین خوارزم شاہ نے منگولوں کی خوں آشام افواج کا بڑی دلیری اور استقامت سے مقابلہ کیا تھا وہ خود اچانک منگولوں پر حملہ

---

[1] تاریخ ابن خلدون؛ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون/ علامہ حکیم احمد حسین، حصہ ہفتم، ص ۳۷۰۔

[2] طبقاتِ ناصری؛ منہاج سراج/ غلام رسول مہر، جلد دوم، ص ۱۲۷۔

کر کے انہیں شدید نقصان پہنچاتا تھا۔ چنگیز خاں کی فوج سے اس کا آخری مقابلہ دریائے سندھ کے کنارے پر ہوا جس میں اسے شکست ہوئی اور اس نے خود کو چنگیز خاں کے حوالے کرنے کے بجائے اپنا گھوڑا ایشیا کے ایک عظیم اور تیز رو دریا کی طوفانی لہروں میں ڈال کر شناوری شروع کر دی چنگیز خاں نے اس جرأت و مردانگی کو دیکھ کر بے ساختہ کہا۔

''وہ کیسی ماں ہے جس نے اتنے بہادر بیٹے کو جنم دیا''۔[1]

اس واقعہ کو آرمینیس ویمبرے ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

''جلال الدین نے حسبِ عادت بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ وہ شیر کی طرح کبھی دائیں طرف کبھی بائیں طرف جھپٹتا تھا اور پھر منگولوں کے قلب پر آخر کار وہ گھر گیا۔ اس کے دو گھوڑے پہلے مر چکے تھے۔ اب تیسرے پر لپک کر بیٹھ گیا۔ دریائے سندھ کے تیس فٹ اونچے کنارے سے دریا میں کود پڑا اور سلامتی سے دوسرے کنارے جا پہنچا۔ منگول اس دلیرانہ کام کو دیکھ کر تعاقب کرنا چاہتے تھے مگر چنگیز نے اس بہادری سے حیران اور متاثر ہو کر انہیں منع کر دیا اور اپنے لڑکوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ''ایسا باپ (سلطان محمد جس کی عزت و تعریف چنگیز نے ہمیشہ کی) ایسے ہی بیٹے کے لائق تھا''۔[2]

شاہ معین الدین احمد ندوی اس واقعہ کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''جلال الدین نے اپنی مختصر سپاہ کے ساتھ اس شجاعت سے مقابلہ کیا کہ تاتاریوں کی صفیں الٹ دیں لیکن ایک طرف دریائے سندھ تھا اور دوسری سمت کمان کی شکل میں تاتاری ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ حصار کا دائرہ تنگ کرتے جاتے تھے۔ جلال الدین نے جب دیکھا کہ اس کا بچنا مشکل ہے تو بے محابا گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا اور بڑی تیزی سے تیرتا ہوا نکل گیا۔ اس دلیری پر چنگیز بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے اپنے لڑکوں کو مخاطب کر کے کہا کہ ''ہر باپ کا بیٹا ایسا ہی ہونا چاہیے''۔[3]

اس واقعہ کو تاریخ اسلام میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''سلطان جلال الدین کی شجاعت و بہادری کا سکہ چنگیز خاں کے دل پر بیٹھ گیا یہاں تک کہ ان سات سو بہادروں میں سے بھی جب صرف ایک سو کے قریب باقی رہ گئے تو سلطان جلال نے اپنی زرہ بکتر اتار کر پھینک دی اور اپنا تاج ہاتھ میں لے کر گھوڑا دریائے سندھ میں ڈال دیا۔ اس کے بقیہ ہمراہیوں نے بھی اپنے سلطان کی تقلید کی چنگیز خاں نے چاہا کہ مغلوں کا لشکر بھی اس کا تعاقب کرے اور اس بہادر شخص کو گرفتار کر کے لائے لیکن اس بحرِ ذخار میں گھوڑا ڈالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ چنانچہ چنگیز خاں اور مغل دریائے سندھ کے کنارے پر رک گئے اور دریائے سندھ کے اندر ان مٹھی بھر بہادروں پر تیروں کا مینہ برساتے رہے یہاں تک کہ صرف سات آدمی مع سلطان جلال الدین کے کنارے پر پہنچ گئے۔ باقی سب دریا کے اندر مغلوں کے تیروں سے شہید ہو گئے۔ سلطان

---

[1] تاریخ پاکستان و ہند، شکیل احمد ضیاء، ص ۱۳۰۔

[2] تاریخ بخارا، آرمینیس ویمبرے، نفیس الدین احمد، ص ۱۶۸، ۱۶۹۔

[3] تاریخ اسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، جلد چہارم، ص ۳۲۹۔

جلال الدین نے اس کنارے پر پہنچ کر اپنے کپڑے اتار کر جھاڑیوں پر سکھانے کے لیے ڈال دیے نیزہ زمین پر گاڑ کر اس کی نوک پر اپنا تاج رکھ دیا اور اس کے نیچے دم لینے لگا اور گھوڑے کی زین کو اتار کر خشک ہونے کے لیے سامنے رکھ دیا۔

چنگیز خاں دوسرے کنارے پر کھڑا ہوا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور حیران تھا۔ اپنے تمام بیٹوں اور سرداروں کو جو اس کے لشکر میں موجود تھے سامنے بلا کر کہنے لگا کہ میں نے آج تک ایسا بہادر اور باہمت شخص نہیں دیکھا۔ اس کے ہمراہی بھی اسی کے مانند بے نظیر بہادر ہیں۔''[۱]

یہ روایات ناول نگار کے بیان کی تصدیق کرتی ہیں کہ حالات نے جلال الدین کو پسپائی پر مجبور کیا لیکن اس کی جوانمردی اور ہمت غالب رہی۔ اس نے انتہائی خطرناک بہاؤ دریائے سندھ کو گھوڑے کی پیٹھ پر عبور کیا اور اس کی شجاعت اور حوصلہ مندی کو دیکھ کر چنگیز خاں اس کی بہادرانہ ہمت کا معترف ہوا۔ بظاہر یہ کیفیت ناول نگار کی ذہنی اختراع معلوم ہوتی تھی مگر مورخین نے اس کی حقیقت کو بیان کر کے ناول نگار کے تاریخی مطالعے کا اعتراف کیا ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ تحسین ہے کہ نسیم حجازی بعض اہم واقعات کو انتہائی ڈرامائی انداز میں اتنی دلچسپی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ حقائق بھی متاثر نہیں ہوتے اور قاری بھی محظوظ رہتا ہے۔ دریائے سندھ عبور کرنے کے بعد جلال الدین اپنے بچے کچھے ساتھیوں کے ہمراہ دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ چند منازل پہلے رک کر اس نے اپنے سفیر سلطان شمس الدین التمش کے پاس بھیجے چنگیز خاں اس سے قبل دھمکی آمیز پیغام التمش کو بھیج چکا تھا۔ اس واقعہ کو مختلف مورخین نے اپنے اپنے انداز میں قلمبند کیا ہے۔ تاریخ پاک و ہند میں انوار ہاشمی رقمطراز ہے:

''منگولوں نے شاہ خوارزم جلال الدین پر حملہ کیا اس نے فرار ہو کر التمش کے پاس پناہ لینی چاہی لیکن التمش نے موسم کی خرابی کا بہانہ کر دیا اور اس طرح برصغیر کو تباہی سے بچا لیا۔''[۲]

اس واقعہ کی حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ جلال الدین نے ہندوستان میں رہ کر اپنی فوجی قوت منظم کرنا چاہی تھی لیکن التمش نے اپنی داخلی مجبوریوں کے پیشِ نظر تعاون سے معذرت چاہی لیکن علامہ عبدالرحمن ابنِ خلدون اس نوعیت سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''بادشاہانِ ہندوستان میں سے شمس الدین التمش نامی ایک بادشاہ جو شہاب الدین غوری کا غلام تھا، اس شہر کا حاکم تھا۔ اس نے جلال الدین سے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور جلال الدین کی حکومت کی اطاعت قبول کی، اہلِ شہر بھی مطیع ہو گئے، جلال الدین نے چند روز یہاں قیام کیا۔ التمش نے تیس ہزار سوار، ایک لاکھ پیادے اور تین سو زنجیر فیل سے حملہ کیا۔ جلال الدین بھی اپنی فوج مرتب کر کے مقابلہ پر آیا۔ مقدمۃ الجیش (ہراول) پر جہاں پہلوان ازبک تھا۔ دونوں فریق کے ہراول غلط راستے پر چلے گئے۔ ایک کی دوسرے سے مڈبھیڑ نہ ہوئی۔ التمش نے صلح کا پیغام بھیجا۔ جلال الدین مصالحت پر مائل ہو گیا۔''[۳]

بظاہر یہ بیان پہلے بیان سے متضاد ہے اگر شمس الدین التمش کی عادات و اخلاق کا جائزہ لیں تو پہلی روایت قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے

---

[۱] تاریخ اسلام، مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی، ص ۲۵۰۔

[۲] تاریخ پاک و ہند، انوار ہاشمی، ص ۷۰۔

[۳] تاریخ اسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، جلد چہارم، ص ۳۸۰۔

کیونکہ بعد کے حالات میں بھی جب جلال الدین نے مایوس ہو کر جنگ آزمائی سے کنارہ کشی کی تو اس کے اکثر ساتھی ہندوستان آکر رہنے لگے۔

بقول ناول نگار ہندوستان سے نکل کر فارس کے بہت سے علاقے فتح کرتا ہوا جلال الدین خوارزم شاہ بغداد کی طرف رواں دواں تھا اس سے قبل اس کے سفیر خلیفہ ناصر کی جانب سے حوصلہ افزا پیغام دے چکے تھے مگر جلال الدین کے ساتھ احتیاط سے کام لینے کا مشورہ دیتے تھے ابھی وہ بغداد سے کچھ فاصلے پر تھے۔ معلوم ہوا کہ خلیفہ ناصر نے ایک فوج قشمور کی زیرِ قیادت انہیں روکنے کے لئے روانہ کر دی ہے اس فوج سے معرکہ درپیش ہوا جس کے بعد جلال الدین بغداد کے بجائے دوبارہ وسط ایشیا کی طرف روانہ ہو گیا ان حالات کا تذکرہ شاہ معین الدین احمد ندوی یوں مرقوم کرتے ہیں:

''جلال الدین نے پہلے خلافتِ بغداد اور خوارزمی حکومت کی پرانی عداوت کو بھلا کر ناصر سے دوبارہ تعلقات درست کرنے کی کوشش کی۔ تاتاریوں کے مقابلے کے لئے اس سے مدد مانگی لیکن ناصر کے دل سے کینہ دور نہ ہوا تھا۔ اس نے جلال الدین کی درخواست کی جانب توجہ نہ کی اور امیر قشمتر کو اسے عراق سے نکالنے کا حکم دے دیا۔ [۱]

اس واقعہ کا حال علامہ حافظ ابوالفدا عماد الدین ابن کثیر دمشقی نے اس طرح لکھا ہے:

''بغداد میں خلیفہ کے پاس جانے کا قصد کیا اس لئے کہ اس کے خیال میں وہ اپنے باپ پر حاکم بنا تھا، حتیٰ کہ وہ مر گیا اور تاتاریوں نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اس نے معظم بن عادل کو خلیفہ سے جنگ کرنے کے لئے خط لکھا اور اسے اس کی ترغیب دی تو معظم نے اس سے انکار کیا اور جب خلیفہ کو پتا چلا کہ جلال الدین بن خوارزم شاہ بغداد کا قصد کیے ہوئے ہے تو وہ اس سے گھبرا گیا اور اس نے بغداد کو مضبوط کیا۔ فوجوں اور سپاہیوں سے کام لیا اور لوگوں میں ایک کروڑ دینار خرچ کیا، اور جلال الدین نے الکرج کی طرف فوج روانہ کی اور انہوں نے اسے لکھا کہ ہم سب کے ہلاک ہونے سے پہلے ہمیں آ ملنا اور بغداد قبضے سے نہیں جائے گا پس یہ ان کی طرف روانہ ہو گیا۔'' [۲]

اس واقعہ کے بارے میں مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی رقمطراز ہیں:

''سلطان جلال الدین نے موقع مناسب سمجھ کر بغداد کا رخ کیا کہ وہاں جا کر خلیفہ ناصر الدین اللہ عباسی کی خدمت میں حاضر ہو کر امداد طلب کروں تا کہ مغلوں کا ممالک اسلامیہ سے اخراج واستیصال بآسانی کیا جا سکے۔ خلیفہ کو چونکہ جلال الدین کے باپ سے نفرت تھی۔ لہٰذا اس نے جلال الدین کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھ کر فوراً امراء کو مامور کیا کہ جلال الدین کو آگے نہ بڑھنے دو اور ہماری مملکت سے باہر نکال دو یہ رنگ دیکھ کر سلطان جلال الدین مقابلہ پر مستعد ہو گیا اور امرائے بغداد کو شکست دے کر بھگا دیا۔'' [۳]

---

[۱] تاریخ اسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، جلد چہارم، ص ۳۸۰۔

[۲] تاریخ ابن کثیر، علامہ حافظ ابوالفدا عماد الدین ابن کثیر دمشقی/مولانا اختر فتح پوری، جلد سیزدہم، چہاردہم، ص ۲۰۸، ۲۰۹۔

[۳] تاریخ اسلام، مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی، ص ۲۵۱۔

بظاہر معمولی اختلاف سے واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کا بیان ثابت ہوتا ہے جس واقعہ نے جلال الدین کی ہمت کو متزلزل کیا وہ اس کے بھائی کی غداری کی ہے جسکا تذکرہ ناول نگار نے اس طرح کیا ہے:

''رے کے قریب تاتاریوں کے لشکر سے مقابلہ ہوا اور جان توڑ حملوں سے اس نے تاتاریوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا لیکن سلطان کے بھائی غیاث الدین نے جو فوج کی بائیں بازو کی قیادت پر فائز تھا، بدترین غداری کا ثبوت دیا اور اپنی فوج کے ساتھ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ تاتاریوں نے سلطان کی فوج کا ایک بازو خالی دیکھ کر قلب پر حملہ کر دیا اور اس کی فوج کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ سلطان نے پیچھے ہٹ کر دوبارہ لشکر کو منظم کرنے کے بعد حملے کیے لیکن تاتاریوں کے لشکر کی تعداد اور غیاث الدین کی غداری نے اس کے سپاہیوں کو بددل کر دیا تھا۔ وہ فتح سے مایوس ہو کر فقط سلطان کے حکم کی تعمیل میں لڑ رہے تھے، تاتاریوں کی ایک فوج عقب میں پہنچ کر گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سلطان نے چاروں طرف سے مایوس ہو کر فوج کو پسپائی کا حکم دیا اور مار دھاڑ کرتا ہوا میدان سے نکل گیا۔''[1]

مندرجہ بالا بیان سے ملتا جلتا ایک واقعہ علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون نے رقم کیا ہے جس کے مطابق:

''اتنے میں خبر لگی کہ تاتاریوں کا ایک لشکر علیحدہ ہو گئے۔ اس کے باوجود تاتاریوں کا میسرہ میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ سلطان نے تعاقب کیا تاتاریوں نے چند مقامات پر تھوڑی تھوڑی فوج کمین گاہ میں بٹھا دی تھی چنانچہ اس نے سلطانی موکب کے گذر جانے کے بعد کمین گاہ سے حملہ کیا۔ لشکرِ اسلام نے نہایت استقلال سے مقابلہ کیا۔ سردارونِ لشکر کا ایک گروہ کام آ گیا کچھ گرفتار ہو گئے جن میں علاء الدین والیِ یزد بھی داخل تھا۔ سلطان جلال الدین نے نہایت مردانگی سے حملہ کیا تاتاری کائی کی طرح پھٹ گئے اور اپنی لشکر گاہ کا راستہ لیا۔ سلطان گرفتاری سے بال بال بچ گیا۔''[2]

ناول نگار کے بیان اور اس روایت میں چند معاملات اتفاق پر مبنی ہیں جبکہ دیگر پر اختلاف ہے مثلاً رے پر تاتاریوں کی یلغار کے لئے خود جلال الدین نہیں گیا بلکہ ایک لشکر بھیجا تھا۔ رہی غیاث الدین کی بدعہدی یہ واقعہ کس مقام پر ہوا اس پر اختلاف ہے کیونکہ ناول نگار رے مقام لکھتا ہے جبکہ راوی اصفہان کے قریب کا مقام لکھتا ہے دیگر تواریخ میں اس واقعہ کا حال تفصیل سے نہیں ملتا اس لئے ممکن ہے ناول نگار نے ذاتی تخیل سے کام لیتے ہوئے اور اپنی کہانی کے پلاٹ کو مؤثر بنانے کے لئے یہ انداز اختیار کیا ہو اب ہم جس واقعہ کو اہمیت کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں وہ جلال الدین خوارزم شاہ کے انجام کا ہے اس بارے میں ناول نگار نے حتمی رائے قائم کرنے کے بجائے کچھ اس طرح واقعات کو رقم کیا ہے:

''سلطان جلال الدین خوارزم شاہ برف باری کے طوفان میں روپوش ہو گیا اور اس کے بعد کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں

---

[1] آخری چٹان، نسیم حجازی، ص ۴۵۷۔

[2] تاریخ ابن خلدون، علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون / علامہ حکیم احمد حسین، حصہ ہفتم، ص ۲۹۸۔

ہے اور کس حال میں ہے؟ کئی برس تک اس کے متعلق عجیب و غریب داستانیں مشہور ہوتی رہیں کبھی یہ افواہ اڑتی کہ اسے فلاں بستی میں ایک درویش کے لباس میں دیکھا گیا ہے۔ کبھی یہ قصہ مشہور ہوتا کہ وہ کسی جنگل میں گوشہ نشینی اختیار کر چکا ہے اور کبھی یہ خبر آتی کہ وہ دنیا کی نگاہوں سے چھپ کر تاتاریوں سے آخری جنگ لڑنے کے لئے جانبازوں کی ایک زبردست فوج منظم کر رہا ہے اور اچانک کسی دن فلاں مقام پر ظاہر ہوگا۔

تاتاریوں نے اس کی تلاش میں ملک کا کونہ کونہ چھان مارا۔ سینکڑوں آدمیوں کو جلال الدین سمجھ کر موت کے گھاٹ اُتار دیا اور اس کا سراغ لگانے والوں کے لئے بڑے بڑے انعامات مقرر کیے۔ لیکن اس کا پتا نہ لگا۔ بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ وہ ایک عام سپاہی کے لباس میں تاتاریوں کی کسی چوکی پر حملہ کرنے کے بعد شہید ہو چکا ہے اور بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اسے قوم کے کسی غدار یا تاتاریوں کے کسی جاسوس نے قتل کر دیا ہے۔''[۱]

اس بارے میں علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون روایت کرتے ہیں:

''تاتاریوں نے سلطان کو گرفتار کر لیا اور اس کے قتل کرنے پر آمادہ ہوئے کسی نے ان کے سردار کے کان میں کہہ دیا'' کہ یہی سلطان ہے'' سردار کو رحم آ گیا لوگوں کو قتل سے روک دیا۔ چھوڑ دینے کے خیال سے اپنے ساتھ اپنے مکان لایا۔

سردار کی عدم موجودگی میں ایک کمینہ تاتاری، سردار کے مکان پر آیا۔ ہاتھ میں ایک تیغہ لئے تھا۔ اس کے بھائی کو خلاط میں ایک خوارزمی نے مار ڈالا تھا اس نے اپنے بھائی کے بدلے میں سلطان کو مار ڈالا۔''[۲]

دو مختلف قسم کی روایات علامہ حافظ ابوالفدا اعماد الدین ابنِ کثیر دمشقی نے نقل کی ہیں پہلی روایت کے مطابق:

''جلال الدین کی جمعیت پریشان ہوگئی اور اس کی فوج اسے چھوڑ گئی اور وہ مختلف سمتوں میں بکھر گئے اور انہوں نے امن کے بدلے خوف اور عزت کے بدلے ذلت اور اجتماع کے بدلے پراگندگی اختیار کر لی۔ پس پاک ہے وہ ذات جس کے قبضے میں حکومت ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور جلال الدین کا حال معلوم نہیں ہوا کہ وہ کدھر اور کہاں چلا گیا۔''[۳]

دوسری روایت یہ ہے:

''پھر وہ (تاتاری) اس جلال الدین کے پیچھے لگ گئی حتیٰ کہ انہوں نے اس کی فوج کو تتر بتر کر دیا اور سب کے ہاتھ اسے چھوڑ گئے اور وہ اکیلا ہی رہ گیا اور میافارقین کے علاقے میں ایک کسان اسے ملا۔ اس نے اس پر اور اس کے گھوڑے پر سنہری جواہرات دیکھ کر اسے اجنبی خیال کیا اور اس سے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا میں خوارزمیوں کا بادشاہ ہوں۔ انہوں نے اس کسان کے بھائی کو

۱۔ آخری چٹان/نسیم حجازی، ص ۹۷۴۔

۲۔ تاریخ ابنِ خلدون؛ علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون/علامہ حکیم احمد حسین، حصہ ہشتم، ص ۴۷۲۔

۳۔ تاریخ ابنِ کثیر؛ علامہ حافظ ابوالفدا اعماد الدین ابنِ کثیر دمشقی/مولانا اختر فتح پوری، جلد سیزدہم، چہاردہم، ص ۲۲۵۔

قتل کیا تھا۔اس نے اسے اتارا اور اس کے اکرام کا اظہار کیا اور جب وہ سو گیا تو اسے اپنی کلہاڑی سے قتل کر دیا۔'' [۱]

شاہ معین الدین احمد ندوی یوں مرقوم ہیں:

''جلال الدین موقع پر ہاسورہ آمد چلا گیا لیکن آمد میں داخل نہ ہو سکا۔ مجبوراً میافارقین کے ایک گاؤں میں پناہ لی۔ یہاں آنے کے ساتھ تاتاریوں کا ایک دستہ پہنچ گیا۔ اس لئے جلال الدین یہاں بھی نہ ٹھہر سکا اور کوہستانی علاقہ کی جانب نکل گیا۔ یہاں جرائم پیشہ کردوں نے پکڑ لیا اور اس کا قیمتی لباس چھین کر قتل کر دینا چاہا۔ جلال الدین نے اس سے کہا میں سلطان ہوں مجھ کو قتل نہ کرو۔ میں تم کو بادشاہ بنا دوں گا۔ یہ سن کر کردی اسے اپنے گھر لے گیا۔ وہ اپنا کچھ سامان لینے کے لئے کوہستان چلا گیا۔ ایک دوسرے کرد کو جس کا بھائی جلال الدین کے ہاتھوں قتل ہوا تھا، پتا چل گیا۔ وہ پہنچا اور کرد کی بیوی سے کہا کہ اس خوارزمی کو تم لوگوں نے قتل کیوں نہیں کیا۔ اس نے جواب دیا کہ میرا شوہر اُسے امان دے چکا ہے۔ کرد بولا یہ سلطان ہے اور میرے بھائی کو خلاط میں قتل کر چکا ہے پھر نیزہ مار کر جلال الدین کا کام تمام کر دیا۔ یہ واقعہ وسط شوال ۶۲۶ھ، میں پیش آیا۔'' [۲]

اس بارے میں تین متضاد روایتیں مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے رقم کی ہیں۔ جن کے مطابق:

''جب بالکل مایوس ہو گیا تو اس ہنگامے سے نکل کر کسی سمت کو گھوڑا اڑا لے گیا۔ اس کے بعد کسی کو اُس کا حال معلوم نہ ہوا۔ دو روایتیں سلطان جلال الدین کے انجام کی نسبت مشہور ہیں ایک یہ کہ اس کو کسی پہاڑی شخص نے جب کہ وہ پہاڑ میں کسی جگہ آرام لینے ٹھہرا ہوا تھا، اس کے گھوڑے اور لباس کے لالچ میں دھوکے سے قتل کر دیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ بہ تبدیل لباس مشائخ عظام کی خدمت میں حاضر ہو کر صوفیوں اور عابدوں کی زندگی بسر کرنے لگا اور دور دراز ملکوں میں سفر کرتا رہا اور اسی زہد و عبادت کی حالت میں عرصہ دراز تک زندہ رہا۔ واللہ اعلم بالصواب۔'' [۳]

ناول نگار نے جلال الدین خوارزم شاہ کے انجام کی بابت مختلف آراء قائم کی تھیں اس کی وجہ یہی رہی ہو گی کہ ہر مؤرخ نے متضاد روایات رقم کی ہیں اور یقیناً اسی رعایت کا فائدہ اٹھا کر سالِ وفات بھی تصنیف نہ کیا ہو گا کیونکہ اس میں بھی اختلاف ہے۔

ناول نگار نے بغداد میں ہونے والے مناظروں کا حال خوب لکھا ہے ناول کی ابتدا میں ایسے ہی ایک مناظرے میں طاہر بن یوسف کے ملازم زید کا زخمی ہو کر لوٹنے کا تذکرہ ہے تو ناول کے اختتام پر اس عظیم الشان مناظرے کا حال بیان کیا گیا ہے جس کے کئی ماہ جاری رہنے کا امکان تھا یہ اس معاشرے کی عکاسی ہے اس کا تذکرہ پروفیسر محمد رضا خان نے یوں کیا ہے:

''ادھر چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر علمائے اسلام اپنے فرائض کی صحیح ادائیگی سے غافل و قاصر تھے۔ وہ علمی موشگافیوں میں مصروف نظر آتے تھے اور مسلمانوں کے لئے دماغی عیاشی کا سامان فراہم کر رہے تھے۔ کسی ایک عالم نے بھی آلاتِ جنگ کو بہتر سے

۱۔ تاریخ ابن کثیر؛ علامہ حافظ ابو الفداء عماد الدین ابن کثیر دمشقی / مولانا اختر فتح پوری، جلد سیزدہم، چہاردہم، ص ۲۴۹، ۲۵۰۔

۲۔ تاریخ اسلام؛ شاہ معین الدین احمد ندوی، جلد چہارم، حصہ دوم، ص ۳۹۷، ۳۹۸۔

۳۔ تاریخ اسلام؛ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی، حصہ سوم، ص ۲۵۱، ۲۵۲۔

بہتر بنانے پر کوئی کتاب تصنیف نہ کی۔ معتزلہ، سُنّی اور شیعہ علما نے اُمت مسلمہ کو نظریات کی الجھنوں میں پھنسا کر فکری انتشار میں مبتلا کر دیا تھا۔[1]

ناول نگار کے بیان کردہ واقعات میں سے سے اہم واقعہ بغداد پر تاتاریوں کی یلغار کا ہے جہاں قتل عام ہوا تقریباً سولہ لاکھ افراد تہ تیغ کر دیے گیے خلیفہ کو نمدے میں لپیٹ کر ہاتھی کے پیروں تلے کچلا گیا اس واقعہ کا حال پروفیسر محمد رضا خان نے یوں مرقوم کیا ہے:

''آخر تنگ آ کر خلیفہ مستعصم نے مدافعت ختم کر دی اور اپنے فرزندوں اور درباریوں سمیت ہلاکو خان کے خیمے میں چلا گیا۔ جہاں اسے قید کر لیا گیا۔ دوسرے روز ہلاکو کے حکم سے بغداد میں قتل و غارت کا بازار گرم ہوا اور مسلمانوں کا خون پانی کی طرح گلی کوچوں میں بہنے لگا ہر جگہ بچوں اور عورتوں کو طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ مدرسوں اور کتب خانوں کو آگ لگا دی گئی۔ محلات، باغات اور مساجد کو برباد کیا گیا۔ چھ ہفتوں کے اندر ہزار ہا اہلِ قلم قتل کر دیے گئے۔ بے نظیر ادبی پارے اور علمی نوادر برباد کر دیئے گئے۔ بغداد شہر میں انسانی خون نالیوں میں اس مقدار میں بہتا رہا کہ دریائے دجلہ کا پانی سرخ ہو گیا۔

بغداد کی بیس لاکھ آبادی سے بہت کم لوگ جان بچا کر بھاگ سکے۔ بغداد کی تباہی کے بعد ہلاکو کے حکم سے تاتاری سپاہیوں نے خلیفہ مستعصم کو نمدے میں لپیٹ کر اُسے اس قدر زدوکوب کیا کہ وہ ان ضربات کی تاب نہ لا کر اس جہانِ فانی سے چل بسا۔''[2]

علامہ حافظ ابوالفدا اعماد الدین ابنِ کثیر دمشقی اس واقعہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''اس معرکے میں بغداد کے جو مسلمان قتل ہوئے، ان کی تعداد کے بارے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ بعض آٹھ لاکھ اور بعض ایک کروڑ بیان کرتے ہیں اور بعض نے بیان کیا ہے کہ مقتولین کی تعداد دو کروڑ تک ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون، ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

اور بغداد میں ان کی آمد محرم کے آخر میں ہوئی اور تلوار مسلسل چالیس روز تک اس کے باشندوں کو قتل کرتی رہی اور خلیفہ مستعصم باللہ ۱۴ صفر کو بدھ کے روز قتل ہوا اور اس کی قبر مٹا دی گئی۔''[3]

شاہ معین الدین احمد ندوی اس واقعہ کا حال دو حصوں میں بیان کرتے ہیں۔ پہلا واقعہ یوں مرقوم ہے:

''ابھی ابنِ علقمی کا جذبۂ انتقام ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔ اس نے ہلاکو سے اپنی جاں بخشی کرائی۔ مستعصم اور اس کے ساتھ بغداد کے تمام علما و فقہا و مدرسین و اکابر و اعیان کو یہ یقین دلا کر ہلاکو کے پاس لے گیا کہ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ ہلاکو، مستعصم کو منصب خلافت پر برقرار رکھے گا اور اپنی لڑکی کی شادی اس کے لڑکے ابوبکر کے ساتھ کر دے گا۔ یہ سب قتل کر دیے گئے۔ مستعصم کو ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر ختم کیا اور اس کی لاش کو پیروں سے مسلا۔''[4]

---

[1] تاریخ مسلمانانِ عالم: پروفیسر محمد رضا خان، ایم اے (ریٹائرڈ پرنسپل) ص ۳۲۲۔

[2] تاریخ مسلمانانِ عالم: پروفیسر محمد رضا خان، ص ۳۲۵

[3] تاریخ ابنِ کثیر: علامہ حافظ ابوالفدا اعماد الدین ابنِ کثیر دمشقی: مولانا اختر فتح پوری، جلد سیزدہم، چہاردہم، ص ۳۵۳۔

[4] تاریخ اسلام: شاہ معین الدین احمد ندوی، جلد چہارم، حصہ دوم، ۲۰۹۔

جبکہ دوسرے واقعہ کا بیان اس طرح ہے:

''وحشی تاتاریوں نے اس عظیم الشان شہر کو لوٹ کر ویران کر ڈالا۔ ابنِ خلدون کا بیان ہے کہ صرف شاہی محلات سے انھوں نے جتنی دولت اور جس قدر ساز و سامان لوٹا، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ عباسی کتب خانہ کی تمام کتابوں کو جو صدیوں کا سرمایہ تھیں، دجلہ میں ڈبو دیا۔ مقتولین کی تعداد کا اندازہ سولہ لاکھ تھا۔'' [۱]

بغداد کی تباہی اور قتلِ عام کے بارے میں روایات میں انتہائی اختلاف پایا جاتا ہے اس اختلاف کو مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ اکثر راوی سولہ لاکھ افراد کے قتل پر متفق ہیں لیکن نہ جانے ابن کثیر کہاں سے ایک کروڑ آٹھ لاکھ کی روایت لے آئے اکثریت اور ناول نگار سولہ لاکھ پر متفق ہیں اس لیے ناول نگار نے انہی روایتوں سے استفادہ کیا ہوگا۔ خلیفہ کے قتل کا معاملہ کسی قدر مخدوش ہے۔ ناول نگار نے لکھا ہے کہ خلیفہ کو نمدے میں لپیٹ کر ہاتھیوں کے آگے ڈال دیا گیا اور ہاتھیوں نے اسے روند کر ہلاک کر دیا۔ ہاتھیوں کے پاؤں سے روندے جانے کی شہادت کسی معتبر تاریخ میں نہیں مل سکی البتہ مورخین نے یہ ضرور لکھا ہے کہ اسے نمدے میں لپیٹ کر لاٹھیوں سے کوٹا گیا۔ حالانکہ نمدے میں اگر مکمل طور پر لپیٹ کر بند کر دیا جائے تو بھی موت دم گھٹ کر واقع ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لاٹھی بازی مزید اذیت کے طور پر کی گئی ہو۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

اس ناول کے تقریباً تمام ہی اہم واقعات کو ہم نے تاریخ کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے جس کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نسیم حجازی نے تمام تر تاریخی شخصیات کو ان کے اصل حلیے اور کردار کے ساتھ پیش کیا ہے پھر دیگر تخیلاتی کرداروں کے ذریعے اس معاشرے کی عکاسی ان کے رہن سہن، عادات و اطوار اور رسم و رواج کو اس خوبی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ قاری ذہنی اور شعوری طور پر اس معاشرے میں جا پہنچتا ہے بظاہر بعض واقعات حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین معلوم ہوتے ہیں لیکن زندگی کی راہ گزر پر سفر کرتے ہوئے ہم آج بھی اس قسم کے ناقابلِ یقین حالات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں پھر ہم نے تاریخ کی ورق گردانی سے ایسے واقعات کی کوئی نہ کوئی پسند ضرور پیش کی ہے۔ نسیم حجازی نے ناول نگاری اور تاریخی ناول نگاری ہر دو انداز میں واقعات کو اس قدر مربوط اور تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے کہ وہ کامیاب قلمکار کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ ناول کے واقعات جن کا آغاز سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتح سے ہوتا ہے اور اختتام بغداد کی تباہی و بربادی پر اس دوران تمام واقعات کو تاریخی اعتبار سے مربوط رکھنے اور ان کے وقوع کا زمانہ جسے ناول نگار نے بیان کیا ہے اکثر درست ہے پھر انہوں نے کوشش بھی کی ہے کہ جہاں عہد میں کوئی تضاد ہو وہاں کوئی سن بیان کیا جائے البتہ اختلافی روایات کا فائدہ اٹھا کر کسی ایک رائے پر قیاس کرتے ہوئے اسے بیان کر دیا ہے بظاہر تاریخی ناول نگار کا کام انتہائی مشکل اور کٹھن ہے۔ جہاں وہ اس عہد کو جیتا جاگتا دکھانا چاہتا ہے وہیں تمام تر تاریخی حقائق کو بھی بنا تصرف کے پیش کرے مگر اس کا کیا کیجیے کہ مورخین کی رائے میں بڑا اختلاف سامنے آتا ہے۔ جب مورخین ہی اپنی ذمے داری باحسن و خوبی انجام نہ دے

---

[۱] تاریخ اسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، جلد چہارم، حصہ دوم، ص ۲۱۰۔

پائے ہوں تو ناول نگار اس سلسلے میں کیسے پکڑا جائے گا۔ایسی کئی روایتوں سے ہمارا واسطہ تاریخ کی ورق گردانی میں پڑ چکا ہے اور یقیناً یہی مشکل نسیم حجازی کو درپیش رہی ہوگی اور جب دیگر تاریخی ناول نگار اس مشکل سے فرار کا راستہ ڈھونڈتے ہیں تو پھر تاریخی ناول نگاری ایک بے کار کام محسوس ہوتی ہے۔ناول آخری چٹان کے بعض واقعات تاریخی حقائق کی روشنی میں اس قدر مختلف اور متضاد ہیں کہ ان کا بیان ناممکن ہے۔مثلاً جلال الدین کے انجام سے متعلق ایک ہی راوی دو قسم کی روایتیں پیش کرتا ہے۔پھر اس کی موت کا سال بھی دو سال کے فرق سے مختلف تاریخوں میں مختلف ہے۔سب سے حیران کن کیفیت تو بغداد میں لوگوں کے قتل کی تعداد پر ہے کہ آٹھ لاکھ اور ایک کروڑ آٹھ لاکھ کی تعداد بیان کر دی گئی جن میں زمین آسمان کا فرق ہے ایسی پر خار راہوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے صحیح اور کامیاب ناول نگار کے روپ میں خود کو پیش کرنا آسان کام نہیں اگر اب بھی ناقدین محض حرف گوئی کی خاطر نکتہ چینی کرتے رہیں تو شاید تاریخی ناول نگاری کا فن ترقی نہ پا سکے گا جن حالات اور جس قسم کی حقیقتوں کی موجودگی میں نسیم حجازی نے اپنا کام مکمل کیا ہے وہ لائق تحسین اور قابل مبارک باد ہے۔اس موقع پر ہم ناول کے دیگر ذیلی معاملات مثلاً جغرافیائی اور موسمی حالات وغیرہ پر تبصرہ کرنا چاہیں تو یہ بات کسی شک سے عاری سامنے آتی ہے کہ اس معاملے میں کسی قسم کا ردوبدل کیا ہو۔خواہ یہ معاملہ علاؤالدین خوارزم شاہ اور بغداد کی افواج کے درمیان تقریباً طے شدہ معرکے سے متعلق ہو یا پھر تاتاری افواج کا بخارا اور سمرقند پر حملہ آور ہونے اور ان شہروں کی فصیل وغیرہ سے متعلق اور جلال الدین کا لڑتے لڑتے دریائے سندھ کے کنارے پہنچنا اور گھوڑے سمیت چھلانگ لگا دینا وغیرہ ساتھ ہی جن موسموں کا تذکرہ آیا ہے وہ بھی اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ موجود ہے الغرض ہم اپنے اس بیان پر اکتفا کریں گے کہ موجود تاریخی معلومات کی روشنی میں نسیم حجازی کا قلم تمام تر تاریخی اور معاشرتی معلومات کے ساتھ عوام الناس کے لئے رواں دواں رہا اور اسی رائے سے ڈاکٹر تصدق حسین راجا بھی متفق دکھائی دیتے ہیں وہ رقمطراز ہیں:

''پہلی بات تو یہی ہے کہ سلاطین وامراء کے ناموں میں تغیر تبدل تو بہت دور کی بات ہے نسیم حجازی نے تو اس ناول میں مختلف خلفائے بغداد اور خوارزم شاہی حکمرانوں کی تاریخی ترتیب کو بھی من وعن برقرار رکھا ہے مثلاً ناول کا آغاز خلیفہ ناصرالدین کے عہد سے ہوتا ہے جس کے انتقال کے بعد علی الترتیب ظاہر اور مستنصر خلیفہ ہوئے۔بغداد کا آخری خلیفہ مستعصم تھا۔جس کے زمانے میں بغداد کے وزیراعظم ابن علقمی نے ہلاکو خاں سے ساز باز کی جس کے نتیجے میں نہ صرف سلطنت خوارزم شاہی کا خاتمہ ہوا بلکہ بغداد کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔''[1]

معروف تاریخی واقعات کو تغیر وتبدل کے بغیر ناول کا موضوع بنانا اور تاریخی حقائق سے نہ پھرنا نسیم حجازی کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ہم نے ان کے ہر ناول سے تاریخ اور ادب میں واقعات کی یکسانی تلاش کر کے ثابت کر دیا ہے کہ نسیم حجازی فن کے لیے تاریخ کا خون نہیں کرتے بلکہ تاریخ کو ناول بنانے کے لئے غیر تاریخی ذرائع سے مدد حاصل کرتے ہیں۔

---

[1] نسیم حجازی ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۹۷۔

خاک اور خون کا تحقیقی جائزہ

خاک اور خون

اس ناول کے واقعات تحریک پاکستان کی یاد دلاتے ہیں۔ ناول نگار نے واقعات کو بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ زیادہ تر واقعات فسادات، اعلان آزادی کے بعد مسلمانوں کے قتل عام، ریڈ کلف ایوارڈ میں تبدیلی اور کشمیر کے مسئلے کو حل طلب چھوڑنے سے متعلق ہیں۔ اس ناول کے موضوع کی اہمیت ہمارے قریب تر ماضی کے حالات کی عکاس ہے اور ان اَن مٹ نقوش کی آئینہ دار ہے جس کی ہلکی سی جھلک اُس ختم ہوتی ہوئی نسل کے ذہنوں میں زندہ ہے جو تقسیم برصغیر کے وقت عمر عزیز کی اس کیفیت میں تھا کہ اُن یادوں کو گوشۂ دماغ میں باقی رکھ سکے۔

ناول خاک وخون میں پاکستان کے قیام کے سلسلے میں رونما ہونے والے واقعات کو ممکنہ حد تک بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہانی کا آغاز برصغیر میں صوبہ پنجاب ضلع گورداسپور کی ایک ایسی بستی کے مشترکہ معاشرے سے کیا گیا ہے جہاں مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی گزشتہ کئی پشتوں سے ایک ساتھ رہتے آئے تھے۔ رحمت علی کو بستی کے لوگوں میں چودھری کی حیثیت حاصل تھی اس کا بڑا بیٹا علی اکبر نائب تحصیل دار تھا جبکہ غلام حیدر، اسماعیل اور افضل گاؤں میں ہی رہتے تھے اور اپنی ہی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ مجید، سلیم اور یوسف رحمت علی کے پوتے تھے اور امینہ، زبیدہ، صغریٰ اور راضیہ پوتیاں تھیں۔ رحمت علی کی تین پشتوں سے اندر سنگھ سے دشمنی چلی آرہی تھی جو کہ اس کے بیٹے افضل اور اندر سنگھ کے بیٹے شیر سنگھ کی دوستی نے ختم کی۔ شیر سنگھ کا بھتیجا گلاب سنگھ، سلیم اور مجید کے ساتھ اسکول میں پڑھتا تھا۔ سلیم اور مجید کے ساتھ گاؤں کے اور بچے بھی اسکول جاتے تھے۔ چودھری رمضان کا بیٹا جلال، چرن سنگھ کا بیٹا موہن سنگھ داؤد یہ سب ان کے اسکول کے ساتھی تھے اسکول گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر تھا اور وہاں دوسرے گاؤں اور مقامی گاؤں کے بچے بھی پڑھتے تھے۔ سلیم کو بچپن سے کہانیاں سنانے کا شوق تھا وہ اپنے دل سے بنا کر کہانیاں سناتا تھا وہ اور اس کے ساتھی کبھی کبھی اسکول جانے کے بجائے نہر میں نہانے اور باغوں میں اور کھیتوں میں گھومنے چلے جاتے تھے۔ گاؤں میں چودھری رمضان، اسماعیل، ہری سنگھ اور کالو عیسائی یہ لوگ ہر محفل کی جان سمجھے جاتے تھے۔ کھیتوں کے کام سے فارغ ہونے کے بعد جب سب لوگ مل کر بیٹھتے تو ان لوگوں کی باتیں خوب مزہ دیتیں۔ چودھری رمضان ایک پیر ولایت شاہ کو بہت مانتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کی پشتوں کی وجہ سے اس کی عزت کرتے تھے رمضان کے بلانے پر ایک بار پیر گاؤں آیا اور سلیم کا گھوڑا دیکھ کر اسے خریدنے کے درپے ہو گیا لیکن سلیم نے وہ گھوڑا بیچنے سے انکار کر دیا۔ سلیم، مجید، رام لال اور گلاب سنگھ ایک ساتھ شہر کے ہائی اسکول میں داخل ہوئے اور ان کے دوسرے ساتھی موہن سنگھ، معراج الدین اور احمد علی بھی ان کے ساتھ داخل ہوئے۔ داؤد، جلال اور بشیر اسکول چھوڑ چکے تھے گاؤں اور شہر کے درمیان کے گاؤں سے بلونت سنگھ، کندن لال بھی ان کے ساتھ اسکول جانے لگے۔ کندن لال کا باپ علاقے کا مشہور ساہوکار تھا۔ وہ لوگوں کو قرضہ دیتا اور سود ان کی نسلوں تک چلتا رہتا تھا۔ اسکول میں سلیم کی دوستی ارشد سے ہوئی ایک اتوار کو ارشد، سلیم کے گھر آیا اور گھوڑ

سواری کے دوران گر کر زخمی ہو گیا۔ سلیم، ارشد کو ڈاکٹر شوکت یعنی ارشد کے والد کو لیکر آیا ارشد کے زخمی ہونے کا سن کر اس کی ماں اپنے بچوں امجد، راحت اور عصمت کے ساتھ سلیم کے گھر آ گئی اور جب تک وہ صحت یاب نہیں ہو گیا سلیم کے گھر والوں نے انہیں واپس جانے نہیں دیا کچھ عرصے بعد ڈاکٹر شوکت کا امرتسر میں ٹرانسفر ہو گیا اور وہ اپنے خاندان سمیت وہاں چلے گئے۔ ان لوگوں کے درمیان کچھ عرصے تک خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور پھر وہ بھی بند ہو گیا۔ سلیم اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد لاہور کے کالج میں داخل ہو گیا مجید فوج میں بھرتی ہو گیا۔ رام لال شہر کے کارخانے میں منشی ہو گیا۔ گلاب سنگھ کاشتکاری کرنے لگا۔ بلونت سنگھ اور کندن لال امرتسر کالج میں داخل ہو گئے۔ پرائمری اسکول کے ماسٹر کا بیٹا احمد علی دفتر کا کلرک اور پٹواری کا بیٹا معراج الدین ریلوے میں بابو بن گیا۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کے اندر مغربی طرز کی جمہوریت کے تصور سے ہندو کی وہ پرانی جبلت زندہ ہو رہی تھی جس نے برہمن کی تقدیس کا چولا پہن کر نیچ ذات کو ہمیشہ کے لئے حقوق انسانیت سے محروم کر دیا تھا۔ ہندو نیشنلسٹ آل انڈیا کانگریس کا لبادہ پہن کر میدان میں آیا۔ کانگریس کی تحریک ہندو اکثریت کے بل بوتے پر رام راج قائم کرنا چاہتی تھی۔ مسلمانوں کی آنکھ اس وقت کھلی جب انتخابات نے ہندوستان کے ساتھ صوبوں پر کانگریس کی حکومت مسلط کر دی مسلمانوں کے بچوں کو گاندھی کی مورتی کے سامنے ہاتھ باندھنے کا سبق دیا جانے لگا۔ نصاب تعلیم میں داسیوں کے رقص شامل کئے گئے اور تمدن کے علاوہ جب زبان بدلنے کی ضرورت محسوس کی تو اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی جدوجہد شروع کی۔ وسط ہند کے صوبوں میں لوٹ مار اور قتل کی وارداتیں شروع ہوئیں مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مصالحت کرنے کے لئے ذلیل ترین شرائط ماننے پر مجبور کیا جانے لگا۔ مسلم لیگ کی طرف سے مصالحت اور تعاون کی پیشکش ٹھکرائی جا چکی تھی رام راج کا یہ دور مختصر تھا لیکن سنجیدہ اور حساس مسلمان متوجہ ہوئے اور ان کے شعور کی عملی تصویر پاکستان کی قرارداد کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ہندو نے جہاں اپنی قوم کو متحد اور منظم کر لیا تھا وہیں اس نے مسلمانوں کے اندر انتشار کے بیج بو دیے تھے۔ کانگریس نے ان ملت فروشوں کی ایک جماعت تیار کر لی تھی جو ایک ہاتھ سے مسلمانوں کو قرآن دکھاتے اور دوسرے سے ان کے گلے میں ہندوؤں کی غلامی کا طوق پہنانا چاہتے تھے۔ دوسری طرف حریت پسند مسلمان انگریز دشمنی میں ہندوؤں کا ساتھ دیتے اور جیل کا رخ کر رہے تھے مسلمانوں کو پاکستان کے محاذ سے بہکانے یا ان کی توجہ اس طرف سے ہٹانے کے لئے کانگریس نے کہا کہ مسلم لیگ انگریز کی آلہ کار ہے اور ہندوؤں نے موقع دیکھ کر اپنی تمام توقعات جاپانیوں کے ساتھ وابستہ کر لیں اور ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک شروع ہوئی لیکن جاپانیوں کا سیلاب برما سے آگے نہ بڑھ سکا۔

سلیم ایک ادیب کی حیثیت سے ہوسٹل کے لڑکوں میں اہمیت حاصل کر چکا تھا اس کا دوست اختر جو اس سے سینئر تھا اسے اجتماعی زندگی کے شعور سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اختر پاکستان کا ایک مبلغ تھا اور اس کا اہم جماعت الطاف نیشنلسٹوں کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ ہوسٹل میں اور کالج کے مباحثوں میں یہ لوگ شرکت کرتے تھے۔ بی۔ اے کے بعد اختر کی تقلید میں سلیم نے بھی ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا۔ ہوسٹل میں ایک مباحثہ ہوا جس کا موضوع تھا۔ کیا پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کی مشکلات کا صحیح حل پیش کرتا ہے اس میں اختر کو تقریر

کرنی تھی لیکن اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اس کے پوائنٹ دیکھ کر سلیم نے تقریر لکھی جو اختر اور اس کے دوستوں آفتاب اور منصور کو بہت پسند آئی اور ان کے اصرار پر سلیم نے مباحثے میں تقریر کی الطاف اور اس کے ساتھی پاکستان کے خلاف تھے اور مباحثے کے آخر میں فیصلہ سلیم کے حق میں ہوا۔ مباحثے کے اختتام پر سلیم کی ملاقات ارشد سے ہوئی جو کہ اب ایک ڈاکٹر بن چکا تھا۔ سلیم چھٹیوں میں امرتسر ارشد کے گھر گیا اور ان کے ساتھ ان کے گاؤں اجنالہ بھی گیا دو دن بعد وہ اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہوا، گاؤں سے اسے مجید کے ساتھ داؤد بھی ملا جو کہ فوج میں سپاہی تھا جبکہ مجید اب جمعدار ہو چکا تھا۔ جرمنی اور جاپان سے جنگ کے خاتمے پر انگریز ہندوستان سے جانا چاہتا تھا ہندو کا اس سے یہ مطالبہ تھا کہ اقتدار اور ہندوستان جو اسکے حصے کا ہے وہ اور جو اس کے مسلمان بھائی کے حصے کا ہے اسے دے کر جائے۔ ہندو فاشزم اپنی پوری قوت اور تنظیم کے ساتھ بڑھ رہا تھا اور مسلمان اپنے ہی ملت فروشوں کے کھودے ہوئے گڑھوں میں گر رہے تھے۔ اس مایوسی کے عالم میں محمد علی جناح مسلمانوں کے لئے ایک قوی سہارا تھے۔ کانگریس کا رویہ مسلم لیگ کے ساتھ غیر مصالحانہ تھا اور انگریز کا اب شمالی ہندوستان سے سپاہی بھرتی کرنے کی ضرورت نہ تھی اس لئے اس کا جھکاؤ بھی اب کانگریس کی طرف تھا مرکز میں ایگزیکٹو کونسل کے سلسلے میں شملہ کانفرنس کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ماننے کے لئے تیار نہ تھی وہ مرکز میں ہندو اور مسلم نمائندوں کی برابری کی مخالف اور وہ ایک نیشنلسٹ مسلمان کو نامزد کروانا چاہتی تھی کانفرنس کی ناکامی کے بعد صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے عام انتخابات مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک اہم ترین مرحلہ تھے۔ کانگریس کو کسی ہندو پارٹی سے مقابلے کا خطرہ نہ تھا مگر مسلم لیگ کے سامنے کئی محاذ تھے۔ پنجاب میں یونینسٹ مسلمانوں کا گروہ ہندو کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر چکا تھا۔ مسلم اکثریت کا شمال مغربی حصہ مسلمانوں کے لئے اہم حیثیت رکھتا تھا یہ وہ محاذ تھا جہاں کامیابی حاصل کیے بغیر مسلمان اپنی منزل مقصود پاکستان تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بنگال کے حالات امید افزا تھے۔ ان حالات میں مسلمان نوجوانوں نے بہت اہم کردار ادا کیا وہ طرے اور لنگوٹی کے اس ناپاک اتحاد کو شکست دینے کے لیے میدان میں آگئے۔ مسلم اکثریت کے صوبوں کی نسبت اقلیت کے مسلمانوں کا جوش و خروش زیادہ تھا ان صوبوں کے سینکڑوں طلبا پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کے محاذوں پر پہنچ چکے تھے۔ سلیم، ظفر، عزیز، جعفر، ناصر علی اور ان کے دوسرے ساتھی بھی ضلع گورداسپور اور امرتسر کے شہروں کے باشندوں کو پاکستان کا حامی بنانے کے لئے تقریریں کر رہے تھے اور جلسے منعقد کرتے تھے۔ ان کے جلسوں کو ناکام کرنے کی کوشش یونینسٹ پارٹی کر رہی تھی جس کو اب ہندو اور سکھ کا تعاون حاصل تھا لیکن زیادہ تر وہ ناکام ہی رہے۔ صوبہ سرحد کے علاوہ مسلم لیگ ہر صوبے میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی پنجاب میں یونینسٹ نے مسلم لیگ کے مقابلے میں بہت بڑی شکست کا سامنا کیا تھا۔ لیگ کے اسی امیدوار کامیاب ہوئے اور یونینسٹ کے نو لیکن انگریز گورنر نے خضر حیات کو وزارت کی تشکیل کا موقع دیا۔ صوبہ سرحد میں کانگریس کی وزارت بن چکی تھی سندھ میں مسلم لیگ وزارت بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ بنگال میں بھی مسلم لیگ کامیاب ہوئی لیکن ہندو اکثریت کے تمام صوبوں پر کانگریس کا تسلط تھا اور ہندو عوام کو پاکستان کے خلاف لڑنے کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ برطانیہ کا وزارتی مشن اپنی تجاویز لے کر آیا کانگریس نے

تجاویز رد کر دیں لیکن کابینہ کی تشکیل انگریز کی رضا مندی کے ساتھ کانگریس ہی نے کی۔ مسلم لیگ ہوا کا رخ دیکھ چکی تھی اور اس نے اپنا رخ اپنی اصلی منزل مقصود یعنی پاکستان کی طرف ہی رکھا۔ مسلم لیگ کا آخری حربہ ڈائریکٹ ایکشن تھا۔ مسلم اکثریت والے علاقے بمبئی، احمد آباد، الہ آباد میں ہندوؤں نے لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ کلکتہ میں ڈائریکٹ ایکشن کے دن مسلم لیگ کے جلوس پر پتھراؤ اور دستی بم پھینکے گئے۔ وائسرائے نے مرکز میں کانگریس کی وزارت بنا دی۔ نہرو نے وزارت عظمیٰ سنبھالی اور پٹیل کی تقریر سے بمبئی میں فساد کے شعلے اور تیز ہوئے۔ نوا کھالی جو مسلم اکثریت کا علاقہ تھا یہاں بھی فساد شروع ہوئے مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو کم مارے گئے مگر ہندو پریس نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ مہاتما گاندھی بھنگی کالونی سے نوا کھالی پہنچ گئے اور بالآخر وہ آتشیں مادہ پھوٹ نکلا جو بھارت کے سینے میں مدت سے پک رہا تھا۔ عدم تشدد کے دیوتا کے پجاری بہار میں مسلمانوں کو آگ و خون کا پیغام دے رہے تھے۔ مجید کی شادی کے لئے امینہ اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ لائل پور سے آئی تو سلیم اور مجید انہیں اسٹیشن لینے گئے وہاں چودھری رمضان کا ایک آدمی سے جھگڑا ہو جاتا ہے یہ لوگ جھگڑا نپٹا کر واپس آتے ہیں۔ مجید کی شادی میں سلیم کی متوقع شادی سب کا پسندیدہ موضوع بنا رہا۔ سلیم کے دوست اختر کا خط آیا اور اس نے کہا کہ وہ رضا کاروں کے ساتھ بہار جا رہا ہے اگر وہ جانا چاہے تو لاہور پہنچ جائے ایک اور خط ناصر علی کا تھا جو بہار کے ایک گاؤں میں رہتا تھا ناصر نے خط میں لکھا تھا کہ اُن کے گاؤں کے پانچ سو جوانوں نے لاٹھیوں سے دس ہزار مسلح آدمیوں کا مقابلہ کیا اور جب تک وہ زندہ رہے اپنی مدافعت کے لئے لڑتے رہے۔ ناصر کو بھی مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا حملے سے پہلے پولیس نے مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لیکر چاقو تک اپنے قبضے میں کر لئے تھے۔ امن اور شانتی کے علمبرداروں نے مردوں، عورتوں کے کان، ناک، ہاتھ اور دوسرے اعضاء کاٹ کر مسجد کی سیڑھیوں پر سجائے بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا اور نوجوان لڑکیوں کی عصمت و عفت کی دھجیاں اڑائی گئیں اور ان کے باپ بھائیوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی ذلت و رسوائی کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ ناصر نے یہ خط کلکتہ کے اسپتال سے لکھا تھا اور اب وہ دوبارہ بہار جا رہا تھا۔ سلیم نے یہ خط مہندر کو پڑھوایا تو اس نے کہا کہ یہ سیلاب بہت جلد ہمارے گاؤں میں بھی آ سکتا ہے اور ایک آدمی کی قربانی تباہی و ہلاکت کے اس طوفان کو روک نہیں سکتی۔ آگ پھیلتی گئی بمبئی اور بہار میں انسانیت کا دامن نوچنے والے ہاتھ یو۔ پی کی طرف بڑھ رہے تھے ہندو اکثریت کے صوبوں میں غنڈوں اور بلوائیوں کی فوج کو کانگریس کی سرپرستی حاصل تھی پنجاب کے ملت فروش مسلم لیگ کے رضا کاروں کی جماعت کو خلاف قانون قرار دے چکے تھے۔ پنجاب کے مسلمان اس وزارت کا تختہ الٹنے پر مجبور ہو گئے جس نے ان کی اکثریت کے صوبے میں بھی اقلیت کو مسلط کر رکھا تھا۔ مسلم لیگ کے دفاتر کی تلاشیاں اور کارکنان کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں اب قیادت متوسط درجہ کے باعمل نوجوانوں کے ہاتھ میں آ گئی اور یہ عوامی تحریک بن گئی۔ دفعہ ۱۴۴ کے قانون کے مطابق ایک جگہ چار مسلمانوں کا جمع ہونا جرم تھا لیکن کوئی قصبہ ایسا نہیں تھا جہاں جلسے نہ ہو رہے ہوں جلوس نہ نکل رہے ہوں۔ پنجاب کا ملت فروش یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے سودا کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے یہی حال صوبہ سرحد کا تھا۔ گورداسپور سے ایک لاری میں سلیم اور صدیق امرتسر آئے اور وہاں سے لاہور جانے

والی گاڑی میں بیٹھنا چاہتے تھے کہ کریم بخش حوالدار آ گیا سلیم نے بتایا کہ وہ لاہور جا رہا ہے جبکہ صدیق علی نے سیالکوٹ کا کہا۔ سلیم لاہور میں اختر کے ٹھکانے پر پہنچا تو پتا چلا کہ وہ جا چکا ہے وہاں سے سائیکلو اسٹائل مشین لے کر جب یہ لوگ شام کو واپس امرتسر پہنچے تو کریم بخش نے ان کو پکڑ لیا صدیق وہ مشین لے کر بھاگ گیا کریم بخش نے گنڈا سنگھ کو اس کے پیچھے بھیجا لیکن ایک عام آدمی نے اسے گرا دیا اور سلیم پولیس کی حراست میں آ گیا۔ سب انسپکٹر منصور علی، سلیم کا ہم جماعت تھا اس نے سلیم کو رہا کر دیا۔ سلیم ڈاکٹر شوکت کے گھر پہنچا تو پتا چلا کہ وہ بھی جیل میں ہیں۔ صحت یاب ہونے تک وہ وہیں رہا چلتے وقت عصمت کی ماں نے سلیم کو ایک خط دیا کہ وہ یہ خط اپنی ماں کو دے دے۔ سلیم عصمت کے لئے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ محسوس کر رہا تھا۔ یونینسٹ وزارت کے ہندو سرپرستوں کا خیال تھا کہ پنجاب میں مسلمانوں کا یہ جوش و خروش ہنگامی ہے یہ جلد ختم ہو جائے گا لیکن حالات نے ثابت کر دیا کہ یہ کسی سیاسی پارٹی یا لیڈروں کی تحریک نہ تھی مسلم لیگ اور پنجاب کے ننانوے فی صد مسلمان ایک ہی وجود کے دو نام تھے اس صورت حال میں خضر حیات کانگریس سے اپنا رسا تڑا کر بھاگا اور گورنر نے مسلم لیگ کے لیڈر کو تشکیل وزارت کی دعوت دی۔ کانگریس نے پنجاب میں بھی اپنا چولہ بدلا اور ایسے حالات پیدا کئے گئے جن کے باعث پنجاب میں لیگی وزارت کا قیام ناممکن ہو جائے۔ بہار کی تاریخ پنجاب میں بھی وہرائی جانے لگی لیکن پنجاب کے مسلمان زیادہ دیر خاموش تماشائیوں کی حیثیت میں سکھوں اور ہندوؤں کو اپنے گھر جلانے کی اجازت نہ دے سکے ان کی قوت مدافعت نے کانگریس کی یہ غلط فہمی دور کر دی کہ وہ سکھ کے بل بوتے پر پنجاب کو اکھنڈ ہندوستان میں شامل کر سکتی ہے۔ اب کانگریس پنجاب، بنگال اور آسام کی تقسیم چاہتی تھی جو ہندوستان کے نئے وائسرائے کو پسند آئی اور ۳ جون کے اعلان کے مطابق ان صوبوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم فسادات کا نتیجہ تھا فسادات بہار، یوپی اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی ہوئے یہ ہندو اور انگریز کی سازش تھی۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی تھی لیکن مسلم لیگ پنجاب اور بنگال کی تقسیم تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس نامنصفانہ فیصلے کے خلاف جنگ کرنے کی تیاری نہیں کی تھی۔ سلیم کی منگنی عصمت کے ساتھ ہوگئی اور شادی پاکستان کے قیام کے بعد کرنے کا فیصلہ کیا گیا مہندر سنگھ کے گاؤں میں علاقے کی امن کمیٹی کی میٹنگ میں ہندوؤں اور سکھوں نے گائے اور گرنتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے کیونکہ مسلمانوں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی اور امن قائم رکھا تھا جبکہ ضلع گورداسپور پاکستان میں جا چکا تھا۔ حد بندی کے متعلق آخری اعلان نہیں ہوا تھا لیکن سب کا یہی اندازہ تھا کہ یہ ضلع پاکستان میں شامل ہوگا۔ پنجاب میں جگہ جگہ ہندو، سکھ اور مسلم فسادات ہو رہے تھے لیکن یہ ضلع اس بات سے محفوظ تھا۔ اس میٹنگ کے بعد سلیم، کندن لال کے گھر گیا وہاں بلونت سنگھ آیا ہوا تھا آپس میں باتوں کے دوران سلیم نے کہا کہ اجنالہ، ہوشیار پور، دسوہے جالندھر، نکودر، زیرہ اور فیروز پور کی تحصیلیں مسلم آبادی کی اکثریت کی بنا پر پاکستان کو مل گئیں لیکن بلونت سنگھ نے نقشے پر لائن لگا کر سلیم کو بتایا کہ ستلج بیاس کے درمیان مسلم اکثریت کے تمام علاقے ہندوستان میں شامل ہوں گے اور شکر گڑھ کے سوا گورداسپور کا باقی ضلع، امرتسر کا تمام رقبہ اور لاہور کا کچھ علاقہ بھی ہندوستان

میں شامل ہوگا۔ کشمیر کا راجا کیونکہ ہندوستان کے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہے لہٰذا گورداسپور کو انگریز کو ہندوستان میں شامل کرنا پڑے گا۔ سلیم کو اس کی باتوں پر اعتبار نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ خوفزدہ تھا کہ اگر ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا۔ ماؤنٹ بیٹن بیسویں صدی کا ایک مہذب قاتل تھا وہ بظاہر ہندوستان کی تقسیم اور انتقالِ اختیارات کے لئے آیا تھا لیکن درحقیقت اس کا مشن مسلمانوں کا قتلِ عام تھا اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ آبادی کو ہندوستان اور ہندوستان کی کم سے کم آبادی کو پاکستان میں شامل کیا گیا۔ انتقالِ اختیارات میں مسلمانوں کو وہ سلطنت دی گئی جس کی حدود ابھی متعین نہیں تھی جس کی افواج ابھی تک ہندوستان سے باہر رکھی گئیں اور جس کے حصے کا اسلحہ تک ہندوستان کے پاس پڑا تھا۔ دہلی کے نواح سے امرتسر تک آگ اور خون کے طوفان کا نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ افواج مشرقی پنجاب پہنچ چکی تھیں اور وہ مسلمان پولیس والوں کو غیر مسلح کر رہی تھیں اگر پاکستان کے پاس اس کے حصے کا اسلحہ ہوتا تو ہندو اور سکھ ریاستوں کے سپاہی مشرقی پنجاب میں جب مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے تو ان کو اس کا جواب بھی ضرور ملتا۔ پندرہ اگست کو انگریز نے پتھر کے زمانے کی وحشت اور بربریت کو بیسویں صدی کی جنگی مشینوں پر سوار کر دیا۔ اس کے بعد کی کسر ریڈکلف کی بددیانتی اور بے ایمانی نے پوری کر دی۔ ماؤنٹ بیٹن مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال کے بعد اپنے ہندوستانی پجاریوں کو ایک تحفہ اور دینا چاہتا تھا اور یہ تحفہ کشمیر تھا جس کے راستے میں گورداسپور ہی ایک آخری پتھر تھا اس پتھر کو راہ سے ہٹانے کا کام ریڈکلف سے رہ گیا۔ سلیم کے گاؤں میں مسلمانوں میں اس کے دادا رحمت علی اور سکھوں میں اندر سنگھ خاص اہمیت کے حامل تھے اور انہوں نے ابھی تک اپنے گاؤں میں کسی فساد کو جنم نہیں لینے دیا تھا اور چودہ اور پندرہ اگست کی درمیانی رات میں تمام گاؤں کے لوگ مل کر بیٹھے اور انھوں نے کہا کہ یہ اچھی بات ہے کہ ان کے گاؤں میں کوئی فساد نہیں ہوا۔ اگلے دن مجید اور سلیم شہر گئے ان کی غیر حاضری میں تھانیدار نے ان کے گاؤں کے مسلمانوں کا اسلحہ جمع کر لیا کیونکہ یہ حکم تھا کہ مسلمان رضاکارانہ طور پر اسلحہ جمع کرا دیں واپسی پر تھانیدار کی ملاقات مجید سے ہوئی مجید کے پاس جو پستول تھا تھانیدار نے وہ مانگا لیکن مجید نے جمع کروانے سے انکار کر دیا۔ دو دن بعد ریڈیو سے اعلان ہوا کہ ضلع گورداسپور پاکستان کے بجائے ہندوستان میں شامل ہو گیا ہے اور اس اعلان کے ساتھ ساتھ پولیس کے تمام مسلمان ملازم غیر مسلح کر دیے گئے۔ سلیم کے والد کو سکھوں کے جتھے نے زخمی کر دیا مجید اور سلیم فجو کے ساتھ ہسپتال جاتے ہیں مجید، افضل کو خبردار کرتا ہے کہ گاؤں پر کسی وقت بھی حملہ ہو سکتا ہے اس لئے گاؤں کے تمام لوگوں کو اکٹھا کر لیں دوسری طرف مہندر سنگھ کے گاؤں میں جلسہ ہو رہا تھا تقریریں ہو رہی تھیں اور وہ لوگ رحمت علی کے گاؤں پر حملہ کرنے کے لئے تیار تھے کہ مسلمانوں کو ان کا پاکستان مل گیا ہے اس لیے وہ وہاں جائیں اور سکھ اپنا خالصتان حاصل کر لیں۔ رحمت علی کے گاؤں میں سکھوں میں صرف اندر سنگھ، شیر سنگھ اور اس کا لڑکا مسلمانوں کے ساتھ تھے جن میں سے شیر سنگھ کو انہوں نے شراب پلا کر بے ہوش کر دیا تھا اندر سنگھ بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور شیر سنگھ کا لڑکا اگر اپنے چچاؤں کے خلاف آیا تو اس کو جان سے مارنے کا طے کر لیا گیا تھا۔ مہندر سنگھ نے جلسے میں کہا کہ سکھوں کی مسلمانوں نے حفاظت کی تھی جب یہ علاقہ پاکستان میں شامل ہو رہا تھا اب جب یہ علاقہ ہندوستان میں شامل ہے تو سکھوں کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں کی حفاظت کریں۔ اُس

نے کہا کہ ہندو، مسلمانوں سے سکھوں کو لڑا کر اپنا اکھنڈ ہندوستان حاصل کرنا چاہتا ہے وہ سکھوں کو خالصتان نہیں دے گا اگر مسلمانوں کے ساتھ جنگ ہوئی تو بھی سکھ مارے جائیں گے اور ان کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔ یہ سب سن کر بلونت سنگھ، مہندر کو بہت مارتا ہے بلونت کی بہن بسنت اس کی نامی گن چھپا دیتی ہے۔ سلیم کو علی اکبر ایک انگوٹھی اس کی شادی کے لئے دیتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ سکھ حملہ ضرور کریں گے وہ گاؤں روانہ ہو جائے علی اکبر یہ کہہ کر مر جاتا ہے سلیم اور مجید اس کی لاش کو ایک بوڑھے کے حوالے کر کے کہتے ہیں کہ اگر شام تک وہ لوگ واپس نہ آئیں تو اسے دفن کر دیں۔ جب وہ گاؤں پہنچے تو بلوائی حملہ آور ہو چکے تھے اس موقع پر صدیق علی، سلیم کو ایک ریوالور اور چند گولیاں دیتا ہے۔ اندر سنگھ بھی تمام سکھوں کے ساتھ مل جاتا ہے۔ رحمت علی سکھوں سے بات کرتا ہے کہ ان کی کیا دشمنی ہے لیکن وہ اس کی بات نہیں سنتے اور فائر کر دیتے ہیں رحمت علی کے ساتھ اس کا بھائی اور بیوی بھی مر جاتے ہیں۔ سکھوں نے دو طرف سے حملہ کیا تھا ایک گروہ بغیر کسی دقت کے پھاٹک تک پہنچ گیا تھا گاؤں سے تھوڑی دور مجید کو رام چند، کندن لال اور چرن سنگھ بیٹھے نظر آتے ہیں ان کے پاس اسلحہ بھی موجود تھا مجید نے چرن سنگھ کو گولی مار کر ختم کر دیا اور کندن لال کو اپنے پاس بٹھا کر رام چند کو اسلحہ لانے کو بھیجتا ہے۔ فجو کو کندن کے پاس چھوڑ کر یہ لوگ گاؤں آتے ہیں حویلی سے کچھ دور مجید مسجد کی چھت پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور سلیم نے آم کے پیڑ پر چڑھ کر تقریباً سب کو ختم کر دیا اور اب وہ چھت پر سے حویلی کی طرف حملہ کرنے والوں کو ختم کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں سلیم بھی مجید کے پاس پہنچ چکا تھا افضل اور اسماعیل اس وقت تک شہید ہو چکے تھے اور افضل کے شہید ہونے کی وجہ سے سکھوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے لیکن مجید اور سلیم کے حملے کی وجہ سے سکھ بدحواس ہو گئے۔ جن مسلمانوں نے سکھوں کے گھر میں پناہ لی تھی ان میں مہر دین کی بیوی بھی شامل تھی اور اس کا نتیجہ وہی نکلا جو ہونا تھا مہر دین کی ماں بیوی اور لڑکوں کو سکھوں نے مار دیا اور اس کی بیٹیوں کے ساتھ شرمناک سلوک کیا۔ مہر دین جو اپنے ماموں کی فاتحہ میں گیا تھا جب واپس آیا تو سکھوں کا شکار بنا چودھری رمضان نے پچھمن سنگھ کے گھر میں پناہ لی اور پچھمن سنگھ نے چودھری رمضان کی پشت پر وار کیا چودھری رمضان کا پورا گھر ختم ہو گیا۔ یوسف گھر میں نہیں تھا اس کو کا کو عیسائی لیکر آتا ہے اور بتاتا ہے کہ راستے میں انہوں نے سکھوں کی باتیں سنی ہیں وہ رات تک دوبارہ حملہ کریں گے مجید چند لوگوں کے ساتھ ان کے پڑاؤ تک جاتا ہے اور ان پر حملہ کر دیتا ہے اور وہ دستی بم جو جتھے دار نے سکھوں کے لئے بھجوائے تھے وہ بھی حاصل کر لیتا ہے۔ مجید کے گھر میں داؤد کے ساتھ کافی لوگ آتے ہیں اور وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ان کے گاؤں پر سکھوں نے حملہ کر دیا اور کوئی باقی نہیں بچا۔ سلیم حویلی میں ایک طرف ایک بڑی کھائی کھدوا کر سب شہیدوں کو ایک ساتھ دفن کرواتا ہے چودھری رمضان کو بھی وہیں لاکر دفن کر دیا جاتا ہے۔ فجو، رام چند اور کندن لال کو حویلی میں لے آتا ہے داؤد کے ساتھ آنے والے لوگ بتاتے ہیں کہ سکھوں نے رام چند کی بیوی اور بیٹیوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ رام چند اور کندن لال کو کنڈیال کے اندر باندھ دیا جاتا ہے گاؤں کے تمام سکھ گھر خالی کر کے جا چکے تھے صرف شیر سنگھ کی بیٹی روپا اور اندر سنگھ باقی تھے۔ اندر سنگھ کو فالج ہو گیا تھا داؤد ان کو مارنے جاتا ہے لیکن وہ ایک عورت اور بوڑھے پر ہاتھ نہیں اٹھا پاتا۔ سلیم، روپا سے کہتا ہے کہ وہ گاؤں چھوڑ کر چلی جائے کیونکہ مسلمان دوسرے علاقوں سے آرہے ہیں اور وہ

بہت زیادہ جوش میں ہیں جو اس کے لئے نقصان دہ ہوگا۔ سلیم کے مکان میں پناہ لینے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی کہ اکال سینا نے سکھوں کے ساتھ حملہ کر دیا وہ فوج اور پولیس کے ذریعے پہلے مسلمانوں کو باہر نکلواتے اور پھر ان پر حملہ کر دیتے تھے لیکن مجید نے ان کی مدد لینے سے انکار کر دیا مجید اور سلیم کے ساتھ مل کر تمام پناہ گزین بھی مدافعتی حملہ کرتے ہیں سکھ سمجھتے ہیں کہ علاقے میں بلوچ رجمنٹ آ گئی ہے وہ کپتان سے اس بات پر لڑتے ہیں کہ ان کے بہت لوگ مارے گئے ہیں اور پولیس اور فوج پیچھے ہے۔ فوج کا کپتان اپنے آدمیوں کو مارٹر اور مشین گن لانے کے لئے بھیجتا ہے سلیم نے مجید سے کہا کہ انھیں سکھوں پر حملہ کر دینا چاہیے لیکن مجید نے اس بات سے انکار کر دیا کپتان کے آدمی مارٹر اور مشین گن لے آئے اور اب انھوں نے گولے برسانے شروع کر دیے تھے۔ مجید نے ان پناہ گزینوں سے کہا کہ وہ زمین پر لیٹ جائیں اس طرح زیادہ افراتفری نہیں پھیلی۔ شام کو سکھوں نے پھر حملہ کیا لیکن مسلمانوں نے حرارتِ ایمانی کا ثبوت دیا اور حملہ آور پیچھے ہٹ گئے۔ برین کیریر کو دیکھ کر مجید اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مشین گنیں لیکر جاتا ہے اور اپنی جگہ جمعدار عنایت علی کو ذمہ داری سونپ کر جاتا ہے مجید اور داؤد نے برین کیریر پر حملہ کیا اور وہ بے قابو ہو کر درختوں میں جا پھنسی اس دوران مجید زخمی ہو چکا تھا داؤد اُسے لے کر گاؤں کی طرف بھاگا برین کیریر اب دوبارہ فائر کر رہی تھی ایک دفعہ پھر سکھوں نے زوردار حملہ کیا سلیم زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا تھا مسلمان ایک دفعہ پھر اپنی مدافعت کے لئے آگے بڑھے تو سکھوں نے پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی اب وہ مجاہد اپنے بیوی، بچوں، ماں، بہنوں کی چیخیں سن رہے تھے اور آگ کے شعلے دیکھ رہے تھے۔ سلیم کو جب ہوش آیا تو سب جل کر خاک ہو چکا تھا مہندر سنگھ رو پا کو کا کو عیسائی کے کہنے پر سلیم پاکستان آنے کے لئے نکلتا ہے مجید داؤد اور بشیر اُن کے ساتھ ہوتا ہے شیر سنگھ کے حواس قابو میں نہیں رہتے وہ کہتا ہے کہ جب افضل کا گھر جل گیا تو کوئی بھی اس گاؤں میں نہیں رہے گا وہ تمام سکھوں کے گھروں کو آگ لگا دیتا ہے۔ سلیم اپنے عزیزوں کی جلی ہوئی راکھ لے کر یہ کہہ کر روانہ ہوتا ہے کہ قوموں کے کھیل اتنی جلدی ختم نہیں ہوتے وہ ضرور ایک دن واپس آئے گا۔ راستے میں مجید اور سلیم کے ساتھ وہ لوگ بھی مل گئے جو سکھوں کے حملے کے وقت ان کے گھر میں تھے اور پھر جان بچا کر وہاں سے نکلے تھے لیکن ان میں اُن کے خاندان کا کوئی فرد نہیں تھا۔ نہر کے پل پر ڈوگرہ سپاہیوں کا پہرہ تھا اور وہ لوگوں کو بٹھا کر سکھوں کے جتھے کو بلا لیتے تھے لیکن مجید، سلیم اور ان کے ساتھیوں نے ڈوگرہ سپاہیوں کو قتل کر دیا۔ فائر کی آواز سن کر سکھ نکل آئے اور ان لوگوں نے ان کا کام بھی تمام کر دیا۔ نہر کے نیچے سڑک پر سکھوں کے پانچ چھکڑے تھے جن پر لوٹ مار کے سامان کے ساتھ عورتیں بھی تھیں وہ سب ان لوگوں نے لے لیا۔ راستے میں ان کے ساتھ اور لوگ بھی ملتے جا رہے تھے اور ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ سب سے خطرناک مقام ڈیرہ بابا نانک تھا۔ وہاں گوردوارہ اور پولیس اسٹیشن اکال سینا کے مرکز تھے لیکن ان لوگوں نے یہ سن کر کہ ان کے ساتھ حفاظت کے لیے فوج بھی ہے یہ نہتے نہیں ہیں ان کو بغیر کسی پس و پیش کے جانے دیا لیکن ڈیرہ بابا نانک سے آگے دو مسلمانوں نے ان کے قافلے کو روکا اور کہا کہ پل پر ڈوگرہ رجمنٹ کا قبضہ ہے اس لیے دریا کے نیچے چند میل کے فاصلے پر ہزاروں مسلمان جمع ہیں وہاں پہنچ جائیں ان ہزاروں لوگوں میں ان کا قافلہ ایسا تھا جو یہ کہہ سکتا تھا کہ ہم نے فلاں مقام پر اتنے سکھ

مارے اور فلاں مقام پر اس طرح لڑے۔ تمام لوگ ان سے متاثر تھے دریا کو پار کرنے کے لئے کشتیاں درکار تھیں لیکن ملاح اور کشتیاں دریا پار تھے اور بغیر پیسوں کے وہ یہ کام کرنے کو راضی نہ تھے۔ ایک ملاح تھا فقیر دین جو کہ بغیر معاوضے کے یہ کام کر رہا تھا لیکن اس کی کشتی پر ایک دم اتنے لوگ سوار ہوئے کہ کشتی ڈوب گئی۔ داؤد اور سلیم دریا پار گئے اور انھوں نے ملاحوں کو سمجھایا اور وہ اس کام پر راضی ہوئے۔ مجید، عابد اور اس کی ماں کے ساتھ نارووال کی جانب روانہ ہو جاتا ہے۔ سلیم، داؤد اور تین ساتھیوں کے ساتھ ڈاکٹر شوکت کے گھر کا حال معلوم کرنے جاتا ہے۔ راستے میں ایک گاؤں پر سکھوں نے حملہ کیا ہوا تھا یہ وہاں کے لوگوں کی جان بچاتے ہیں تو امیر علی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے اسے ڈاکٹر شوکت کا گھر معلوم ہوتا ہے وہ جب ان لوگوں کو لیکر ڈاکٹر شوکت کے گھر پہنچتا ہے تو ان کے گاؤں پر حملہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر شوکت کے گھر میں انہیں امجد اور اس کی ماں کی لاشیں ملتی ہیں وہاں سے یہ لوگ مان سنگھ کی حویلی جاتے ہیں وہاں سارے سکھ جمع تھے اور گاؤں کی مسلمان لڑکیاں اور ڈاکٹر شوکت بھی یہیں تھے۔ داؤد، سلیم اور امیر علی فوج کے سپاہی بن کر مان سنگھ کے گھر میں گھس جاتے ہیں اور تمام بارود لے کر سکھوں کو مکان کے اندر بند کر کے آگ لگا دیتے ہیں اور راحت، عصمت اور ڈاکٹر شوکت ان کے ساتھ روانہ ہو جاتے ہیں آدھا بارود سلیم لیتا ہے اور آدھا امیر علی لے لیتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت کا بڑا بیٹا ارشد اب تک دہلی میں ہی تھا۔ سلیم، ڈاکٹر شوکت، راحت اور عصمت کو دریا پار پہنچا دیتا ہے ان کو اپنے خاندان کے بارے میں بتاتا ہے اور ان کو لاہور جانے کی تاکید کرتا ہے اور راکھ کی پوٹلی اور وہ انگوٹھی جو علی اکبر نے دی تھی عصمت کو دے دیتا ہے اور خود واپس دریا پار کرنے کے لئے کشتی میں سوار ہو جاتا ہے۔ مشرقی پنجاب میں وحشت اور بربریت کا سیلاب پھیلتا گیا اور اس کا جواز یہ پیش کیا جاتا کہ یہ سب مغربی پنجاب میں ہونے والی باتوں کا ردعمل ہے۔ مشرقی پنجاب کی ریاستیں مسلمانوں کے قتل عام میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں لیکن مہاراجا پٹیالہ سب سے آگے رہا اور یہی وجہ تھی کہ مشرقی پنجاب کی ریاستوں کے راج پر سکھ کی گدی سنبھالنے کے لیے پٹیل کو کوئی اور آدمی اس سے زیادہ موزوں دکھائی نہ دیا پھر دہلی کی باری آئی۔ گاندھی کے چیلوں کے عہد حکومت میں دہلی کی تاریخ کا پہلا باب مسلمانوں کے خون سے لکھا جا رہا تھا۔ مشرقی پنجاب کے شہر اور بستیاں خالی ہو چکی تھیں اب حملہ آوروں کے سامنے کیمپ یا قافلے تھے۔ ادھر مغربی پنجاب کی حکومت کے سامنے جس قدر بڑا کام تھا اُسی قدر کام چلانے والے ہاتھ ناتجربہ کار تھے۔ پاکستان ہزاروں مصیبتوں کا سامنا کر رہا تھا اب پاکستان کے حصے کی فوج ہندوستان سے آرہی تھی۔ راستے میں جگہ جگہ ان کی گاڑی روکی گئی اور ان سے ہتھیار ہندوستانی فوج کی تحویل میں دینے کے لیے کہا گیا لیکن ان کا ایک جواب تھا کہ ہم اپنی حفاظت خود کر سکتے ہیں۔ راوی کے کنارے پناہ گزینوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا۔ سلیم کے گروہ میں سے آٹھ آدمی شہید ہو چکے تھے۔ کسی قافلے پر حملے کی اطلاع ملتی تو وہ وہاں پہنچ جاتے انھوں نے چار بار سکھوں کو پسپا کیا پانچویں دفعہ وہ فیصلہ کن حملے کی نیت سے آئے سلیم اور اس کے ساتھ سکھوں کو اس حملے میں بھی شکست سے ہمکنار کر رہے تھے کہ سلیم کے گروہ کی مدد کے لئے امیر علی اپنے ساتھیوں کے ساتھ آ گیا اور سکھ بھاگ گئے۔ داؤد اور امیر علی سکھوں سے بارود لوٹنے کے لئے گئے لیکن دونوں مارے گئے۔ بلوچ رجمنٹ کے حوالدار نے سلیم کو کچھ

بارود دیا اور فالتو بندوقیں لے گئے اور ان کی حفاظت میں قافلہ چلا گیا۔ جو بیمار اور مریض تھے وہ بھی ایک ہزار جا چکے تھے پانچ سو باقی رہ گئے تھے کہ ڈیڑھ سو مسلمانوں کا قافلہ آ گیا اور انھوں نے بتایا کہ سکھ ان کے پیچھے ہیں۔ سلیم کے ساتھ اس کنارے پر غلام، صادق اور چار آدمی اور تھے انھوں نے مورچے وغیرہ بھی بنا لیے تھے کہ سکھوں نے دوبارہ حملہ کیا ارشد اپنے ساتھ دو آدمیوں کو کچھ بارود اور دوائیاں لے کر دریا کے پار جاتا ہے اس کے پیچھے ہی بلوچ رجمنٹ کے سپاہی جاتے ہیں اور بلوچ رجمنٹ کا نام سنتے ہی سکھ بھاگ جاتے ہیں ارشد، سلیم کو اپنے ساتھ لاہور لے آتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت اور ارشد کیمپ کے مریضوں میں مصروف ہوتے ہیں سلیم، امینہ کے گھر جانا چاہتا ہے لیکن ارشد منع کر دیتا ہے مجید فوجی وردی میں ڈاکٹر شوکت کے گھر آتا ہے اور سلیم کو بتاتا ہے کہ وہ لدھیانے جا رہا ہے اور اسے امینہ کے گھر جانے کی تاکید کرتا ہے۔

کشمیر کی سرحدیں تبت، روس اور چین کے ساتھ ملتی تھیں اور اب ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف نے اس کا ایک کونہ ہندوستان کے ساتھ بھی ملا دیا۔ کشمیر کی نوے فیصدی مسلم آبادی اب زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہی تھی۔ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے سلسلے میں راجا کو سب سے زیادہ پونچھ کے مسلمانوں سے مخالفت کا اندیشہ تھا۔ حالات نے پونچھ کے مسلمانوں کو آخری فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا پونچھ کی جنگ کشمیر کے عوام کی جنگ اور کشمیر کے عوام کی جنگ بالآخر پاکستان کے عوام کی جنگ بن گئی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اعلان کیا کہ جب کشمیر کے حالات پر امن ہو جائیں گے تو الحاق کے بارے میں کشمیر کے عوام سے استصواب رائے کیا جائے گا۔ سلیم تشمور سے کشمیر روانہ ہو جاتا ہے۔ اسے اسکا کلاس فیلو آفتاب بھی ملتا ہے جو کشمیر کے جہاد پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ جاتا ہے۔ سلیم کشمیر سے عصمت کو خط لکھتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ ایک مضمون ''اے قوم'' کے نام سے لکھ رہا ہے اور آفتاب اس کو کتابی شکل میں چھپوائے گا۔ مشرقی پنجاب اور ہندوستان میں شامل ہونے والی ریاستوں میں مسلمانوں کا صفایا ہو چکا تھا اب گاندھی دہلی میں بیٹھ کر عدم تشدد کا درس دے رہے تھے اور ان کے چیلے باقی ہندوستان میں مسلمانوں کو آگ اور خون کا پیغام سنا رہے تھے۔ انہوں نے پاکستان میں نیشنلسٹ کا بت کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن یہ سازش کامیاب نہ ہوئی۔ ہندو قوم کے وہ تخریبی عناصر جنھوں نے پندرہ اگست کے بعد مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی کسی رکاوٹ کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے چنانچہ ایک دن خبر آئی کہ کسی سیوک سنگھ نے مہاتماجی کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ ایک دن ڈاکٹر شوکت لاہور کیمپ سے پنڈی آئے تو انھوں نے راحت اور عصمت کو سلیم کی کتاب ''اے قوم'' دی اور بتایا کہ وہ پانچ ڈاکٹروں کے ساتھ کشمیر کے محاذ پر جا رہے ہیں۔ راحت اور عصمت اس کتاب کو پڑھنے لگیں۔ کتاب کے پہلے حصے میں پندرہ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کے واقعات پر تبصرہ تھا دوسرے حصے میں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کے چشم دید حالات تھے اور تیسرے حصے میں قوم کے نام سلیم کا پیغام تھا کہ پاکستان ان گنت قربانیوں کے بعد حاصل ہوا ہے اس کی بقا اور استحکام کے لئے مزید قربانیوں کی ضرورت ہے جب تک نہرو کی افواج کشمیر میں ہیں تب تک یہ سمجھو کہ اس دفاعی حصار کی تعمیر میں تمھارے حصے کا کام باقی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال کے بعد ہندوستان کی وحشت و بربریت کا سیلاب حیدرآباد کی حدود

میں داخل ہوا رضا کار سر پر کفن باندھ کر آئے لیکن نظام کی غداری اور بزدلی کی تاب نہ لا سکے۔ حیدر آباد میں خون کی ہولی کھیلنے کے بعد ہندوستان کی توپیں اور ٹینک پاکستان کی حدود کے پاس پہنچ چکے تھے لیکن پاکستان کے سپاہی دشمن کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ سلیم زخمی ہو کر میر پور کے اسپتال میں زیرِ علاج تھا اس کی ایڑی میں کوئی زخم لگا تھا جس کی وجہ سے وہ دوبارہ جنگ میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ اسپتال میں اس کی ملاقات الطاف سے ہوئی جو نیشنلسٹ تھا مگر اسے یہ پھل ملا کہ تمام تر تعلقات اور اثر رسوخ کے باوجود اس کا گھر لوٹا گیا افراد خانہ قتل ہوئے ماں بہنوں کی آبروریزی کی گئی۔ اس کیفیت سے بچ کر اس کی بہن فہمیدہ پاکستان پہنچی اسے پاگل پن کے دورے پڑنے لگے تھے اور اسی حالت میں مر گئی۔ اس کے انتقال کے بعد حامد اس کا بہنوئی کشمیر کے جہاد میں شہید ہوا اور وہ بھی جہاد میں شریک ہونے کے لیے آیا ہے۔ سلیم کو ڈاکٹر شوکت اپنے گھر لے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنے قلم کا صحیح استعمال کر سکے۔ سلیم کی شادی عصمت سے ہو جاتی ہے اور مجید ان کی شادی کے بعد کشمیر جانے والی پاکستانی فوج کے ساتھ روانہ ہوتا ہے اور سلیم ان کو روانہ ہوتے دیکھ کر یہ محسوس کر رہا تھا کہ ان جوانوں کے سینوں پر ایک قوم کی تقدیر لکھی ہے۔

خاک اور خون کا تحقیقی جائزہ

ناول خاک اور خون تقسیمِ برصغیر کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ناول میں پنجاب کے ضلع گورداسپور کے ایک گاؤں کا ماحول پیش کیا گیا ہے۔ اس گاؤں میں چار مختلف اقوام مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی رہتے بستے تھے جن کے درمیان تعلقات کی نوعیت کسی دور میں بھی انتہائی خوشگوار نہیں رہی تھی البتہ تعلیم کے شعوری دور نے دشمنیوں میں کچھ کمی ضرور پیدا کی تھی مگر مذہبی تعصب ان کے ذہنوں اور رگ و پے میں اس طرح سرایت کر چکا تھا کہ وہ کسی ذرا سی لغزش پر سر اٹھانے کے لیے تیار تھا۔ مسلمان اپنے مذہبی میلان کی بدولت اخوت کے قائل تھے مگر ہندو اور سکھ اپنی برتری کا لوہا منوانے کے لیے کسی چھوٹے سے بہانے کو بنیاد بنا کر رائی کا پہاڑ بنانا چاہتے تھے۔ یہی کچھ اس ناول کے واقعات کا خلاصہ ہے جو چیز اکثر قارئین کے ذہنی الجھاؤ کا باعث ہے وہ یہ ہے کہ نسیم حجازی کا تعلق چونکہ گورداسپور سے تھا اور ان کا خاندان بھی ہجرت کے تجربے سے گزرا تھا تو اس لیے کہانی کا مرکزی کردار سلیم دراصل نسیم حجازی کی شخصیت کا دوسرا نام ہے لیکن اس رائے سے ہمیں اختلاف ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ ایک اور ناول پردیسی درخت اور گمشدہ قافلے میں یوسف کا کردار بھی نسیم حجازی کی شخصیت کا آئینہ دار ہے گو کہ اسے بھی ان کی آپ بیتی قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ تمام تر قرائین اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ تقسیمِ برصغیر کے اس دور میں کہ جب فسادات اپنے عروج پر تھے نسیم حجازی کوئٹہ میں مقیم تھے اور ان کی تمام تر صلاحیتیں اور کوششیں بلوچستان کو پاکستان میں شامل کرانے کے لیے تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد انہوں نے کوئٹہ کو اس وقت خیر باد کہا جب قلات کی ریاست کا اعلان پاکستان کے ساتھ ہو گیا۔ اس لیے یوسف اور سلیم کے کردار جذباتی طور پر نسیم حجازی کی ترجمانی کرتے ہوں لیکن حقیقی طور پر یہ تخیلاتی کردار ہی ہیں۔ ناول کے واقعات کو آگے بڑھانے کے لئے نسیم حجازی نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ ہندو تہذیب و معاشرت اور اس کے بنائے ہوئے بت اور ان کی جبلی مسلم نفرت مکمل طور پر سامنے آجائے ساتھ ہی سکھوں کی بے وقوفی اور بروقت فیصلہ نہ کرنے کی صلاحیت یا دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کے خلاف کافروں کا اتحاد اس طرح پروان چڑھتا ہے کہ مسلم معاشرہ ان حالات میں زندگی کی راہوں پر گامزن نہیں رہ سکتا اور جب یہ تصور جاگزیں تھا کہ انگریز بالآخر اس ملک سے چلے جائیں گے تو مقتدر کون ہوگا۔ ہندوؤں کی ذہنیت اور مسلم دشمنی مسلمانوں کو تقسیم برصغیر کے لیے ورغلا رہی تھی پھر چھوٹے چھوٹے واقعات اس پُر خطر راہ پر چلنے کے لئے مسلمانوں کو تیار کرنے کا باعث بنے اگر بیسویں صدی کی تاریخ پر نظر کی جائے تو تقسیمِ بنگال سے لے کر میثاق لکھنؤ اور تحریکِ خلافت تک کے واقعات ہندو مسلم اتحاد کی طرف کوششوں کا پیش خیمہ کہی جا سکتی ہیں لیکن نہرو رپورٹ اور اس کے جواب میں قائدِ اعظم کے چودہ نکات نے اس بات کو اور متحدہ ہندوستان کے خواب کو چکنا چور کر دیا۔ گول میز کانفرنسوں کی ناکامی اور علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد میں مسلمانوں کے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوستان کی تقسیم ناگزیر ہے اگر کانگریس کا رویہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد برادرانہ اور مساویانہ ہوتا تو بھی اتحاد کی کوئی کوشش کارگر ہو جاتی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انتخابات میں کامیابی کے بعد کانگریسی حکومتوں نے یہ انداز اختیار کیا بقول ناول نگار:

''۱۹۳۷ء کے انتخابات نے پہلی بار کانگریس کی حکومت ہندوستان کے سات صوبوں پر مسلط کر دی۔ ہندو سیاستدانوں نے مسلمانوں کو نرغے میں لینے کے لیے جس قدر اطمینان اور دور اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا اسی قدر وہ نرغے میں پھنسے ہوئے شکار کو مغلوب کرنے کے لیے جلد بازی پر اتر آئے۔ وارد ھائی مہاتما کا زہر میں بجھا ہوا نشتر اب آستین سے باہر آ چکا تھا۔ رام راج کی برکات وار دھا یا ودّیا مندر جیسی ناپاک اسکیموں کی صورت میں نازل ہونے لگیں۔ ربِ کعبہ کے سامنے سر بسجود ہونے والی قوم کے بچوں کو مدارس میں گاندھی کی مورتی کے سامنے ہاتھ باندھنے کا سبق دیا جاتا۔ محمد عربی کی نعت پڑھنے والی کو بندے ماترم کا ترانہ سکھایا جا رہا تھا۔ دختران توحید کے نصاب تعلیم میں دیوداسیوں کے رقص شامل کیے جا رہے تھے۔''[۱]

ان حالات کا تذکرہ سید حسن ریاض ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

''کانگریس کی وزارتیں قائم ہوتے ہی ہندوؤں نے یہ سمجھ لیا کہ ان کا راج آ گیا۔ یو پی، بہار میں اور ہندو اکثریت کے دوسرے صوبوں میں اذان پر، نماز پر، قربانی پر، محرم کے جلوس پر روک ٹوک اور حملے اپنے خطبے کے مظاہرے کے لیے انہوں نے ضروری قرار دے لیے۔ پولیس نے ان ہنگاموں میں لا پروائی اختیار کی۔ اگر وہ دباتی بھی تھی تو مسلمانوں ہی کو خود کانگریسی حکومتوں نے سرکاری عمارتوں پر کانگریس کے جھنڈے لگوا دیے۔ بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا۔ سرکاری اسکولوں میں کانگریس کے جھنڈے کی اسلامی جاری کی۔ کانگریسی حکومتوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کو یہ محسوس کرایا کہ ان کی رائے اور مرضی کوئی چیز نہیں ان کو اس ملک میں ہندوؤں کے تابع ہو کر رہنا ہوگا۔''[۲]

جبکہ اشتیاق حسین قریشی رقمطراز ہیں:

''مدارس کا انتظام مخلوط انتخاب کے ذریعے منتخب ہونے والی مجالس کے سپرد کیا گیا۔ مسلم مدارس کے لئے کوئی بندوبست نہیں کیا گیا۔ اُردو بولنے والے اساتذہ کو تربیت دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ گاندھی کی شبیہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر ہندو پوجا کے انداز میں کھڑے ہوں اور اس کی تعریف و توصیف کے بھجن گائیں۔ اصل منصوبہ یعنی ''واردھا اسکیم'' گاندھی کے ذہن کی تخلیق تھا اس میں عدم تشدد کے ہندو اصول کو ذہن نشین کرایا گیا تھا اور بچوں کے دماغوں میں ہندوؤں کے افسانوی سورماؤں اور ہندو مت کی تعلیم اس اسکیم سے باہر چھوڑی گئی تھیں۔''[۳]

محمد علی چراغ ان حالات کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

''گاندھی کی زیر ہدایت ایک تعلیمی سکیم تیار ہوئی جسے ''واردھا تعلیمی سکیم'' کہا جاتا ہے۔ اس سکیم کے تحت مسلمانوں کے تمدن، معاشرت، روایت اور زبان سب کو تباہ کرنا اور اس کے بجائے ہندوانہ روایات اور رسوم اور مذہبی پرچار کرنا قرار دیا گیا۔ اسی طرح ''ودیا

۱۔ نسیم حجازی: خاک اور خون، ص ۱۹۹۔

۲۔ پاکستان ناگزیر تھا: سید حسن ریاض، ص ۱۹۰۔

۳۔ جدوجہد پاکستان: اشتیاق حسین قریشی / ہلال احمد زبیری، ص ۱۰۲۔

مندر اسکیم' بھی چلی "بندے ماترم" کو قومی ترانہ قرار دے کر ہندوؤں کی بالا دستی اور فوقیت کو زبردستی منوانے کی کوشش کی گئی'' [1]

ان بیانات اور حقائق سے یہ سمجھنا کہ کیسے مسلم معاشرے نے اپنی بقا کے لیے مسلم لیگ کے دامن میں خود کو چھپانا مناسب سمجھا ہوگا بہت آسان ہے کیونکہ محدود اقتدار اور محض وقتی نوعیت کی خودمختاری کے نتیجے میں آستین میں چھپا خنجر سامنے آ گیا تو مکمل اقتدار کی صورت میں کانگریس سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ یہاں ناول نگار نے سیاسی منظر نامے کا سہارا لے کر ناول کے موضوع میں اس طرح رنگ آمیزی کی ہے کہ تاریخ زندہ و جاوید ہو گئی ہے۔ اس کے بعد ناول نگار نے ان حالات کا تجزیہ پیش کیا ہے جس کے ذریعے مسلمانوں کو دبانے کی کوشش کی جا رہی تھی جب ان کے اقدار اور روایات کا خون ہوا اور حرف شکایت لب پر آیا جس نے احتجاج کی شکل اختیار کی تو اکثریت نے خود ہی اسے دبانے کی۔ کوشش کی انتظامیہ یا پولیس نے مداخلت کی تو ایسے شرمناک سمجھوتے کرائے کہ جن میں مسلمانوں کو ذلت آمیز معاہدہ کرنا پڑا۔

ان حالات کو اشتیاق حسین قریشی یوں رقم کرتے ہیں:

''سرکاری مداخلت ہمیشہ ہندوؤں کے حق میں متعصبانہ ہوتی تھی۔ بہت سے موقعوں پر ایک نام نہاد ''سمجھوتے'' کے ذریعے امن بحال کیا جاتا تھا جو در حقیقت ایک ہندو نواز تصفیہ ہوتا تھا جسے ''ایک بے بس اقلیت پر اقتدار حکومت کے دباؤ سے نافذ کر دیا جاتا تھا۔'' [2]

اس بیان کے بعد یہ بات سمجھنا بعید از قیاس ہے کہ مسلمان خود کو کس حال میں محسوس کر رہا ہوگا وہ محکوم ہی نہیں غیر محفوظ بھی ہو گیا تھا۔ ناول نگار نے اس عہد کی عکاسی خوب کی ہے۔ اس کے بعد ناول نگار نے ہندوؤں کی اردو سے ازلی دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو کو ختم کرنے کی مذموم کوشش ہوئی۔ یہ معاملہ بھی ناول نگار نے حقیقت پر مبنی بیان کیا کیونکہ ''پاکستان منزل بہ منزل'' میں محمد علی رقمطراز ہیں:

''کانگریس نے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی زبان اردو کو بھی ہدف بنایا۔ اردو ہندوؤں میں بھی یکساں مقبول تھی لیکن بنگال کے علاوہ باقی صوبوں میں اردو مسلمانوں کی ایک طرح سے شناخت بن چکی تھی۔ کانگریس نے اردو کی مخالفت کر کے اس کے بجائے ہندی کی ترویج کا پروگرام بنایا۔ کانگریسی لیڈروں نے بھی اس مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور سزائیں دینے تک سے گریز نہ کیا۔'' [3]

ان عوامل سے تحریک پاکستان کے اس دور کا احاطہ ہوتا ہے کہ جب ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے نتیجے میں بننے والی کانگریسی حکومتوں نے مستقبل کے سوالیہ نشان کا خاصا مناسب اور مؤثر جواب دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہونے اور علیحدہ وطن

---

[1] پاکستان منزل بہ منزل، محمد علی چراغ، ص ۱۱۲۔

[2] جدوجہد پاکستان، اشتیاق حسین قریشی/ہلال احمد زبیری، ص ۱۴۰۔

[3] پاکستان منزل بہ منزل، محمد علی چراغ، ص ۱۱۲۔

حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا پڑی۔ساتھ ہی وہ خوش گمانیاں بھی دم توڑ گئیں کہ ہندو مسلم اتحاد ہو سکتا ہے ان حکومتوں کے خاتمے پر مسلمانوں نے یومِ نجات منایا اور سکھ کا سانس لیا کیونکہ پنڈت جواہر لعل نہرو مسلمانوں کے الگ تشخص کے مخالف تھے جس کا اظہار وہ پہلے ان الفاظ میں کر چکے تھے جو محمد علی چراغ نے اس طرح لکھے ہیں:

''پنڈت جواہر لعل نہرو نے مسلم لیگ کے وجود ہی سے انکار کرتے ہوئے پہلی بار یہ نعرہ لگایا کہ اس ملک میں دو جماعتیں موجود ہیں ان میں سے ایک کانگریس اور دوسری برسرِ اقتدار حکمران جماعت یعنی برطانوی حکومت۔اس لیے اگر کوئی سمجھوتا ہوا تو ان دونوں جماعتوں میں ہونا چاہیے۔''[۱]

اس کے بعد ناول نگار نے مسلمانوں کی شعوری بیداری کا اظہار کرتے ہوئے مسلم لیگ کے اجلاس مارچ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری کا ذکر کیا ہے۔تحریک پاکستان میں اس قرارداد کو بڑی اہمیت حاصل ہے تحریک پاکستان کے بارے میں لکھی جانے والی تقریباً ہر کتاب میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔اس کے بعد ناول نگار نے ان مشکلات کا تذکرہ کیا ہے جو تحریک پاکستان میں اپنوں کی جانب سے آئیں ناول نگار رقمطراز ہے:

''ہندو نے جہاں گذشتہ پندرہ بیس برس میں اپنی قوم کو متحد اور منظم کر لیا تھا وہیں مسلمانوں کے اندر انتشار کے کئی بیج بو دیے تھے۔وہ اس بات کے لیے تیار تھا کہ اگر متحدہ قومیت، عدم تشدد اور وطنیت کی لوریاں مسلمانوں کو موت کی نیند نہ سلا سکیں اور وہ اپنی شہ رگ کے قریب اس کا زہر آلود خنجر دیکھ کر چونک پڑیں تو ان کے حلق میں خواب آور گولیاں ٹھونسنے کے لیے اُن بزرگانِ دین کے ہاتھ استعمال کیے جائیں جن کا جبہ اور دستار یہ ظاہر کرتا ہو کہ جنت کی راہ دکھانے والے یہی ہیں چنانچہ کانگریس ان ملت فروشوں کی ایک جماعت تیار کر چکی تھی جو ایک ہاتھ سے مسلمانوں کو قرآن دکھاتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے ان کے گلے میں ہندو کی غلامی کا طوق پہنانا چاہتے تھے۔''[۲]

اس بارے میں زاہد چودھری لکھتے ہیں:

''مذہبی جماعتوں کو چونکہ مسلم عوام الناس کی فلاح و بہبود سے کوئی سروکار نہیں تھا اور نہ ہی انہیں جناح کے ''پاکستان'' میں اپنے اقتدار کا کوئی مستقبل نظر آتا تھا۔وہ اپنے کاروبارِ دین فروشی کی منڈی کے طور پر متحدہ برصغیر کو برقرار رکھنے کے حق میں تھے۔مسلم لیگ کے مذکورہ کنونشن (۱۹۴۵ء۔۱۹۴۶) کے چھ روز بعد یعنی ۱۲۔اپریل کو برصغیر کی سرکردہ مذہبی جماعتوں کے رہنماؤں نے وزارتی مشن کے ساتھ ملاقات کر کے پاکستان کے خلاف اور متحدہ ہندوستان کے حق میں اپنا موقف پیش کیا۔ان رہنماؤں میں جمعیت العلمائے ہند کے مولانا حسین احمد مدنی، آل انڈیا مومن کانفرنس کے صدر ظہیر الدین، آل انڈیا مجلس احرار کے صدر حسام الدین آل پارٹیز شیعہ کانفرنس کے صدر حسین بھائی لال جی اور آل انڈیا مسلم مجلس کے صدر عبدالمجید خواجہ شامل تھے۔انہوں نے معمولی ردوبدل

۱۔ پاکستان منزل بہ منزل، محمد علی چراغ، ص ۱۰۸۔

۲۔ خاک اور خون، نسیم حجازی، ص ۳۰۳۔

کے ساتھ وہی موقف اختیار کیا جو گاندھی اور کانگریس نے اختیار کر رکھا تھا۔"[1]

اس معاملے میں مسلمان علما کے کردار نے عوام الناس کی رائے میں تذبذب کی کیفیت پیدا کر دی۔

۱۹۴۲ء میں جنگ کا منظر نامہ اس طرح تھا کہ جرمن کامیابیوں کی طرف گامزن تھے۔ جاپان کی مداخلت نے جلتی پر تیل کا کام کیا کانگریس کے عدم تشدد کے دیوتا جاپانیوں سے امیدیں وابستہ کر کے "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ لگاتے ہوئے میدان میں نکل آئے۔ جلاؤ گھیراؤ، سرکاری ملازمین کو ہراساں کرنا، بجلی کے تار کاٹنا اور سرکاری املاک پر کانگریس کا پرچم نصب کرنے لگے مگر جاپان کی طرح ان کی یہ تحریک بھی آگے نہ بڑھ سکی اس تحریک کا حال مصنفینِ تحریک پاکستان نے بھی کیا ہے:

"۹ اگست ۱۹۴۲ء کو دفعتاً کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام اراکین کو گرفتار کر لیا۔ ان گرفتاریوں کی خبر پورے ہندوستان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ملک میں مظاہرے، ہنگامے، آتش زنی اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے کے واقعات ہونے لگے۔ ملک میں امن دامان درہم برہم ہو گیا کئی مقامات پر حکومت نے فوج طلب کر لی تا کہ بلوائیوں کو کنٹرول کیا جا سکے کئی مقامات پر لوگوں نے ٹیکس دینے سے انکار کر دیا۔ بہت سے گاؤں میں گاؤں کے لیے متوازی حکومت قائم کر دی گئی۔ چند ماہ کی مسلسل کوششوں کے بعد حکومت نے تحریک پر مکمل طور پر قابو پا لیا۔"[2]

اس معاملے کی اہمیت کا اندازہ سید حسین رضوی کی اس رائے سے کیا جا سکتا ہے:

"جب جاپان، برما کو تباہ کر کے آسام کی سرحدوں کی طرف بڑھنے لگا تو ہندوستان کے ہندو تاجروں میں خصوصیت سے بڑی گھبراہٹ پیدا ہوئی اور وہ ان مقامات سے بھاگنے لگے جو خطرے کی زد میں تھے۔ مگر ساتھ ہی ہندوؤں کے سیاسی حلقوں میں نئی امیدیں پیدا ہوئیں۔ ہندو ہمیشہ چین اور جاپان کو کسی رشتے سے اپنا سمجھتے تھے۔ جاپان کی فتوحات سے وہ خوش تھے کہ وہ انگریزوں کو نکال کر انہیں ہندو راج دلائے گا۔ بقول ابوالکلام آزاد مسٹر گاندھی تک کو یہ یقین تھا کہ اس جنگ میں اتحادی ہار جائیں گے اور ان کو بھی جاپان سے امیدیں تھیں اور وہ بھی سوبھاش چندر بوس کے جرمنی چلے جانے اور وہاں ہندوستان کی آزادی کے لیے کوشش کرنے پر نازاں تھے۔"[3]

ان روایات اور ناول نگار کے بیان میں مکمل مطابقت پائی جاتی ہے۔ یقیناً کانگریس نے جرمنی اور جاپان کی وقتی فتوحات سے امیدیں وابستہ کرتے ہوئے اپنا قبلہ اسی طرف کر لیا ہو اور موقع کا فائدہ اٹھانے کے لیے برطانوی حکومت کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لیے ہنگامہ آرائی اور افرا تفری کی کیفیت پیدا کی ہو جو کچھ بھی رہا ہو نسیم حجازی تاریخی واقعات کو ان کی اہمیت کے ساتھ اپنے ناول میں پیش کرتے ہیں۔ ناول نگار نے جس اہم معاملے کو قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کیا ہے وہ شملہ کانفرنس کی ناکامی کا ہے جو کانگریس کی

---

[1] پاکستان کیسے بنا، زاہد چوہدری، جلد ۱، ص ۳۰۳۔

[2] تحریک قیام پاکستان، پروفیسر محمد رفیع اندر، حسن عسکری رضوی، ص ۲۲۶۔

[3] پاکستان ناگزیر تھا، سید حسن رضوی، ص ۲۹۲۔

ہٹ دھرمی کی بھینٹ چڑھی کیونکہ کانگریس ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل میں مسلمان اور ہندو ارکان کی برابر تعداد کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی پھر مسلمان ارکان کی نامزدگی کا کلی اختیار مسلم لیگ کو تفویض نہیں کیا جا رہا تھا اس بارے میں تمام ہی تاریخ دان متفق ہیں کیونکہ اس کانفرنس کی ناکامی کا اعلان خود وائسرائے ہند نے کیا تھا بشمول ان وجوہات کے جو ناکامی کا باعث بنیں۔ ہم محض ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ مصنف زاہد چودھری رقمطراز ہیں:

''جناح نے مطالبہ کیا کہ پانچوں مسلمان ارکان کی نامزدگی کا اختیار مسلم لیگ کو دیا جائے کیونکہ صرف مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ حیثیت حاصل ہے۔ ویول کا ارادہ یہ تھا کہ ان پانچ میں یونینسٹ پارٹی اور کانگریس کے نمائندے بھی لیے جائیں۔ ادھر کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں کی نشستوں کے علاوہ اچھوت نشست کی بھی دعویدار تھی نتیجہ صاف ظاہر تھا کہ ایگزیکٹو کونسل میں مسلم لیگ کی نمائندگی اس درجہ محدود ہو کر رہ جاتی کہ وہ کوئی بھی کردار ادا نہیں کر سکتی تھی۔ اس میں غالب حیثیت کانگریس کی حاصل ہوتی جس کے ہندو اور مسلمان ارکان کو سکھ اور اچھوت نمائندوں کے علاوہ یونینسٹ نمائندے کی بھی حمایت حاصل ہو سکتی تھی۔ کانگریس نے اپنے نامزد افراد کی جو فہرست ویول کو مہیا کی اس کی بنیاد پر ویول خود لکھتا ہے کہ ''کونسل میں کانگریس کو مکمل غلبہ حاصل ہو جائے گا۔'' چنانچہ ان حالات میں جناح اپنے مطالبے پر اڑ گئے کہ مسلمان ارکان کی نامزدگی صرف مسلم لیگ کا حق ہے۔ ویول نے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ کانگریس نے مخالفت کی اور مسلمان ارکان کی نامزدگی پر اپنے حق سے دستبردار نہ ہوئی۔ ۱۴ جولائی تک کانفرنس کے اندر اور باہر اس مسئلے پر کافی لے دے ہوتی رہی۔ بالآخر کانفرنس ناکام ہو گئی۔''[۱]

۱۹۴۶ء میں ہونے والے انتخابات کے نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے ناول نگار لکھتا ہے:

''صوبہ سرحد کے سوا مسلم لیگ ہر صوبے میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ پنجاب میں یونینسٹوں کا سفینہ انتخابات کے بھنور کی نذر ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ کے مقابلے میں انہوں نے بہت بڑی شکست کھائی تھی۔ جہاں لیگ کے اسی امیدوار کامیاب ہوئے تھے، وہاں ابن الوقتوں کی تعداد فقط نو تھی۔''[۲]

انتخابات کے نتیجے کا چارٹ سید حسن ریاض نے اس طرح پیش کیا ہے:

''پنجاب اسمبلی میں مسلمانوں کی کل ۸۶ نشستیں تھیں۔ مسلم لیگ نے ان میں سے ۷۵ حاصل کیں کانگریس نے غیر مسلم نشستوں میں سے ۵۱ حاصل کیں۔ پنتھ اکالیوں نے ۲۲، یونینسٹ نے ۲۰، باقی ۷ نشستیں انڈیپنڈینٹ امیدواروں کو ملیں۔ بعد کو چار اور کامیاب ارکان مسلم لیگ پارٹی میں شریک ہوئے۔''[۳]

انتخابی نتائج کا تجزیہ اشتیاق حسین قریشی نے اس طرح کیا ہے:

۱۔ پاکستان کیسے بنا: زاہد چودھری، ص ۱۱۴۳۔

۲۔ نسیم حجازی: خاک اور خون، ص ۲۷۳۔

۳۔ پاکستان ناگزیر تھا۔ سید حسن ریاض، ص ۲۸۰۔

’’پنجاب میں ۸۶ نشستوں میں سے ۷۵ لیگ کے پاس تھیں۔ حکمراں یونینسٹ جماعت کو کانگریس اور سکھوں کی حمایت کے باوجود ایک ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی تھی اور وہ گھٹ کر صرف ۲۰ ارکان کا ایک غیر اہم گروہ بن گئی تھی۔ بعد میں چار یونینسٹ لیگ میں شریک ہو گئے (جس سے لیگ کی تعدادِ ارکان ۷۹ تک پہنچ گئی) اور چھ آزاد اور دوسری بینچوں پر چلے گئے اور یونینسٹ جماعت صرف ۱۰ ارکان پر مشتمل رہ گئی۔‘‘[1]

ان دونوں آراء اور ناول نگار کے بیان میں کچھ فرق ہے حالانکہ وہ بہت معمولی سا ہی ہے۔ پہلی روایت میں تو یونینسٹوں کی تعداد ۲۰ بتائی گئی ہے لیکن دوسری روایت جو انتخابی نتائج کے تجزیے کے ساتھ پیش کی گئی یونینسٹوں کی تعداد ۱۰ اور مسلم لیگیوں کی تعداد ۷۹ بتائی گئی۔ ناول نگار نے دونوں جگہ ایک ایک نشست کا فرق دکھایا ہے یونینسٹوں کی تعداد ۹ اور مسلم لیگیوں کی تعداد ۸۰ بیان کی ہے بعد کے حالات میں یہ تعداد رہی ہو گی جس موقع کا حال بیان کیا ہے وہاں آخر الذکر رائے زیادہ مستند ہے فرق بہت معمولی ہے لیکن جذباتی وابستگی سے ہٹ کر حقیقت پسندی کے مطابق تعداد بیان کرتے تو زیادہ مناسب تھا۔

تقسیم برصغیر کی تحریک کے دوران اہم موقع کابینہ مشن کی ہندوستان میں آمد ہے۔ یہ سہ رکنی وفد طویل مذاکرات کے بعد جس نتیجے پر پہنچا وہ مسلم لیگ نے قبول کر لیا جبکہ کانگریس اس کی مخالفت کر رہی تھی۔ ناول نگار نے مذکورہ بالا رائے پیش کی ہے اگر اسے مصنف ’’مارشل لا سے مارشل لا‘‘ تک کے الفاظ میں دیکھا جائے تو بات زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

’’(کابینہ) مشن نے جو تجاویز پیش کیں۔ ان کے بنیادی نکات یہ تھے۔

۱۔ صوبوں کو تین مختلف گروپوں میں تقسیم کیا جائے۔ ایک گروپ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہو۔ دوسرا گروپ بنگال اور آسام پر اور تیسرا گروپ باقی تمام صوبوں پر۔

۲۔ ہر ایک گروپ کو اپنی مرضی کے مطابق اپنی اپنی فیڈریشن بنانے کا اختیار ہو گا لیکن تینوں فیڈریشنوں کے اوپر ایک آل انڈیا یونین ہو گی جس کی تحویل میں تین محکمے ہوں گے۔ دفاع، امور خارجہ اور مواصلات۔

۳۔ دستور ساز اسمبلی ایک ہی ہو گی جس میں صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کے ووٹ سے منتخب شدہ نمائندے شامل ہوں گے۔ مسلمان اور سکھ اپنے اپنے نمائندے اپنے علیحدہ ووٹ سے منتخب کریں گے۔ دستور ساز اسمبلی میں ہر صوبے کا فرقہ وارانہ کوٹہ ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق مقرر کر دیا گیا۔

۴۔ تمام صوبوں کے منتخب شدہ نمائندے پہلے دن ایک ہی دستور ساز اسمبلی میں بیٹھیں گے لیکن صدر کا انتخاب اور اس قسم کی رسمی کاروائی کے بعد گروپوں میں بٹ جائیں گے اور اس کے بعد گروپ اپنا اپنا اور اپنے صوبوں کا آئین مرتب کریں گے۔ جب آئین کا یہ حصہ مکمل ہو جائے تو اس کے بعد مختلف گروپ پھر پوری دستور ساز اسمبلی میں بیٹھ کر آل انڈیا یونین کا

---

[1] جدوجہد پاکستان: اشتیاق حسین قریشی / ہلال احمد زبیری، ص ۳۳۵۔

آئین بنائیں گے۔

۵۔ یونین کی مجلس قانون ساز کے آئین میں یہ شرط رکھی جائے گی کہ فرقہ وارانہ نوعیت کے امور کے متعلق (اس بات کا فیصلہ یونین کا صدر کرے گا) یا آئین میں ترمیم کرنے کے لئے نہ صرف پورے ایوان کی اکثریت کی تائید بلکہ ہندو اور مسلمان ممبروں کی اکثریت کی الگ الگ تائید بھی درکار ہوگی۔ یونین کی حکومت کو اپنے اخراجات کے لئے براہ راست ٹیکس لگانے اور وصول کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

۶۔ آئین سازی کے زمانے میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو از سرِ نو مرتب کر کے اس میں سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو شامل کر کے اس میں سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو شامل کیا جائے گا اور جہاں تک موجودہ آئین کے ماتحت ممکن ہوگا اس عبوری حکومت کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا جائے گا عبوری حکومت میں نشستوں کی تقسیم کا سوال گفت وشنید کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا۔

اس پلان کے ایک نکتے کی مشن کے ممبر اسٹیفورڈ کرپس نے اگلے دن ایک پریس کانفرنس میں سوالوں کا جواب دیتے ہوئے خاص طور پر وضاحت کی۔ آپ نے بتایا کہ اس پلان کے منشا کے مطابق صوبوں کو شروع میں لازماً انہی گروپوں میں کام کرنا پڑے گا۔ جن میں انہیں شامل کیا گیا ہے لیکن جب نئے آئین کے تحت پہلے انتخابات ہو جائیں گے اور نئے آئین کے تحت پہلے انتخابات ہو چکیں گے تو اس کے بعد ہر صوبے کو اختیار ہوگا اگر وہ چاہے تو ایک مخصوص ضابطے کے مطابق اس گروپ سے الگ ہو جائے۔"[1]

اس طرح مسلم لیگ نے اپنے مقاصد میں کامیابی محسوس کرتے ہوئے اس منصوبے کو قبول کیا جبکہ کانگریس کو اس میں پاکستان کے بنیادی تصورات نظر آئے اس لیے اس نے اسے رد کر دیا۔ اس سب کے باوجود مسلم لیگ کو بعد میں اپنے اس فیصلے پر پشیمانی ہوئی اور وہ اپنے بنیادی نعرے تقسیم برصغیر پر ڈٹ گئی۔ ادھر لارڈ ویول عبوری حکومت کی تشکیل میں مسلم لیگ کو نظر انداز کرنا چاہتے تھے بالآخر مسلم لیگ نے ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا بقول ناول نگار:

"بمبئی، احمد آباد، الہ آباد اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ ہندو نے لوٹ مار اور قتل و غارت شروع کر دی۔ اس کے بعد کلکتہ کی باری آئی اور یہاں ڈائریکٹ ایکشن کے دن مسلم لیگ کے جلوس پر اینٹوں، گولیوں اور دستی بموں کی بارش کی گئی۔"[2]

اس بارے میں محمد علی چراغ رقمطراز ہیں:

"کلکتہ میں "یوم راست اقدام" کے دوران ہی میں ہندو مسلم فسادات ہو گئے۔ ان فسادات میں قریباً پانچ ہزار افراد ہلاک

---

[1] مارشل لا سے مارشل لا تک، سید نور احمد، ص ۲۰۲-۲۰۳۔

[2] خاک اور خون، نسیم حجازی، ص ۲۷۶۔

اور ہزاروں زخمی ہو گئے ۔''[1]

اس بارے میں زاہد چودھری کا موقف یہ ہے:

''۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کا دن آیا جو ہندوستان کی تاریخ میں فیصلہ کن ثابت ہوا۔ مسلم لیگ نے پورے ہندوستان میں ڈائریکٹ ایکشن ڈے منایا۔ جگہ جگہ جلسے ہوئے۔ کسی جگہ بدامنی نہ ہوئی۔ البتہ کلکتہ میں ہندو مسلم فساد کا ایک ایسا ہولناک سلسلہ شروع ہوا جو تین دن تک جاری رہا۔ پہلے مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔ انہوں نے بے گناہ ہندوؤں کا خوب قتلِ عام کیا اس کے بعد ہندوؤں نے زبردست جوابی کاروائی کی جو ۱۸ اگست کی رات تک جاری رہی۔ جب ۱۹۔ اگست کی صبح کو فوج نے صورتِ حال پر قابو پایا تو کلکتے کی سڑکوں اور گلیوں میں بے گناہ ہندو اور مسلم عوام کی لاشوں کی ناقابلِ برداشت بو پھیلی ہوئی تھی اور بے شمار گدھ ٹوٹ پڑے تھے۔ تقریباً ایک لاکھ افراد مکانات جلنے سے خانماں برباد ہو گئے تھے جن کی عارضی پناہ کی خاطر مسلمانوں اور ہندوؤں کے علیحدہ علیحدہ کیمپ کھولے گئے تھے۔ بعض مقامی اخبارات کے تخمینے کے مطابق تقریباً پچاس ہزار افراد ہلاک و زخمی ہوئے تھے۔''[2]

ڈائریکٹ ایکشن کے موقع پر کلکتہ میں ہونے والے فسادات کا تفصیلی حال زاہد چودھری نے خاصے غیر جانبدارانہ انداز میں تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

پنجاب میں خضر حیات حکومت کے خلاف مسلم لیگیوں کی تحریک جلسے جلوسوں اور گرفتاریوں سے تقویت پاتی رہی یہاں تک کہ خضر حیات نے استعفیٰ دے دیا۔ جب یہ خبر گرم تھی کہ گورنر مسلم لیگیوں کو حکومت بنانے کی دعوت دیا چاہتے ہیں تو کانگریس نے سکھوں کے ساتھ مل کر ایجی ٹیشن شروع کر دیا اس موقع پر ماسٹر تارا سنگھ نے ''پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر''[3] اپنی کرپان بے نیام کی۔ اسے کانگریس کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ اس معاملے پر محمد علی چراغ رقمطراز ہیں:

''سکھوں کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب قانون ساز اسمبلی کے ایک اقدام پر نہایت جذباتی انداز میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر کے ردِعمل کے طور پر لاہور اور پنجاب کے دیگر کئی مقامات پر ایک بار پھر فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ ان فسادات میں جانی و مالی نقصان کے ساتھ ساتھ املاک کو بھی نقصان ہوا۔''[4]

اس واقعہ کا تفصیلی حال زاہد چودھری نے تحریر کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''جلوس پر پابندی بدستور عائد تھی لیکن خضر حیات کے مستعفی ہونے کے بعد دوسرے دن اس کا وزیر خزانہ بھیم سن سچر ایک جلوس لے کر اسمبلی چیمبر تک آیا۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ غیر مسلموں کو بھی قانون شکنی کی اتنی ہی آزادی حاصل ہے جتنی کہ گذشتہ چند

---

[1] پاکستان منزل بہ منزل: محمد علی چراغ، ص ۲۰۵۔

[2] پاکستان کیسے بنا: زاہد چودھری، جلد دوم، ص ۷۱۔

[3] اس بارے میں دو روایتیں ہیں پہلی یہ کہ ماسٹر تارا سنگھ نے یہ تقریر اسمبلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر کی۔ دوسری یہ کہ اسمبلی کے سامنے چبوترے پر دوسری روایت زیادہ درست ہے میں نے خود اکیس مئی ۲۰۰۲ء کو یہ چبوترا دیکھا جو اسمبلی کے سامنے ہے جس کے برابر میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا علامتی مینار تعمیر کیا گیا ہے۔

[4] پاکستان منزل بہ منزل: محمد علی چراغ، ص ۲۱۹۔

ہفتوں میں مسلمانوں نے دکھائی تھی۔ اس نے اسمبلی چیمبر کے سامنے ہزاروں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں حکومت کے ایک رکن کی حیثیت سے اعلان کرتا ہوں کہ تمھیں بھی جلوس نکالنے کا پورا حق حاصل ہے۔ سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے پاکستان مردہ باد کا نعرہ لگایا اور کرپان لہرا کر اعلان کیا کہ ''راج کرے گا خالصہ آکے رہے نہ کوئی۔''[۱]

آگے مزید لکھتے ہیں کہ:

''جلسے میں پنجاب اسمبلی کے دیرینہ کانگریسی رکن ڈاکٹر گوپی چند بھارگو نے اعلان کیا کہ ۱۱ مارچ کو پورے پنجاب میں ''اینٹی پاکستان ڈے'' منایا جائے گا جس کا مقصد صوبہ میں خالص فرقہ وارانہ وزارت کے مجوزہ قیام کے خلاف احتجاج کرنا ہوگا۔ گاندھی کے سوانح نگار پیارے لال نے لکھا ہے کہ اس جلسے میں پنجاب کانگریس کے ایک سرکردہ لیڈر نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ میں نے کانگریس کی ہائی کمان سے مشورہ کیا ہے اور میں پوری ذمے داری سے کہہ سکتا ہوں کہ تشدد ہو یا عدم تشدد ہو تصادم ہو یا تصادم نہ ہو ہم کسی صورت میں بھی یہاں مسلم لیگ کی وزارت نہیں بننے دیں گے۔''[۲]

ان مذکورہ بیانات اور ناول نگار کی رائے میں مماثلت اس بات کی غماز ہے کہ حالات کا رخ کشیدگی کی طرف رواں دواں تھا اور ناول نگار نے حالات اور ماحول کی عکاسی کرنے میں مناسب انداز اختیار کیا ہے۔ ناول نگار نے جس معاملے کو اہمیت دی ہے اس کے مطابق:

''کانگریس جو ہندوستان کے تقسیم ہو جانے کو گائے کے دو حصوں میں کٹ جانے کے مترادف قرار دے چکی تھی اب پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کر رہی تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ بنگال اور آسام کو بھی تقسیم کروانا چاہتی تھی اور اس تقسیم کے لئے کانگریس کے یہ دلائل تھے کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمان ہندوستان میں ہندو اکثریت کی حکومت کے ماتحت رہنا گوارا نہیں کرتے تو مغربی بنگال اور مشرقی پنجاب کے علاقوں کی ہندو اکثریت کو بھی پاکستان میں مسلم اکثریت کے ماتحت رہنا گوارا نہیں۔ ہندو اور دوسری اقلیتوں کے جان و مال اور تہذیب و تمدن کے تحفظ کے لئے ان صوبوں کی تقسیم ضروری ہے۔

ہندوستان کے نئے وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن کو کانگریس کا یہ استدلال پسند آگیا۔ اس لیے ۱۳ جون کے اعلان کے مطابق ان صوبوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ آسام کے ضلع سلہٹ، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لیے ریفرنڈم تجویز ہوا۔''[۳]

اس معاملے کا تذکرہ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''حکومت برطانیہ نے تقسیم کا فیصلہ تو کر لیا تھا لیکن یہ تقسیم اس صورت میں عمل میں آسکتی تھی کہ بنگال اور پنجاب کے صوبے بھی تقسیم ہوں۔ مسلم اکثریت کے صوبوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ چاہیں تو پاکستان میں شامل ہوں یا اس سے الگ رہیں۔ مغربی پنجاب، مشرقی بنگال اور سندھ میں یہ فیصلہ کرنے کا اختیار اسمبلی کو دے دیا گیا اور بلوچستان میں شاہی جرگے کو، صوبہ سرحد اور آسام کے

۱۔ پاکستان کیسے بنا؛ زاہد چودھری، جلد دوم، ص ۲۲۴۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۲۵۔

۳۔ خاک اور خون؛ نسیم حجازی، ص ۳۱۶، ۳۱۷۔

مسلم اکثریتی ضلع سلہٹ میں عام استصواب کا اہتمام کیا گیا اور ہر بالغ کو رائے دینے کا حق دیا گیا۔"[1]

جبکہ ایلن کیمبل جانسن رقمطراز ہے:

"پنجاب کی دستور ساز اسمبلی نے آج صوبہ کی تقسیم کی آخری منظوری دے دی۔ یہی فیصلہ تین دن پہلے صوبہ بنگال میں بھی دیا جا چکا ہے۔ اس فیصلے کے بعد سہروردی کے متحدہ بنگال کا خواب ہمیشہ کے لئے خواب بن کر رہ گیا۔ تاریخ کا پہیہ تیزی سے گھوم رہا ہے کانگریس جس نے بہت پہلے لارڈ کرزن کی تحریک تقسیم بنگال کی سختی سے مخالفت کی تھی آج چالیس سال کے بعد وہ خود اسی پالیسی پر عمل پیرا نظر آتی ہے۔"[2]

اس طرح یہ معاملہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے کہ وہی کانگریس جو اب تک ہندوستان کی تقسیم کی مخالف تھی اپنے اقتدار کو تقویت دینے اور جغرافیائی اعتبار سے اپنے علاقے کو بڑھانے کے لیے صوبوں کی تقسیم پر مصر رہی یہاں تک کہ وہ تقسیم ہو کر رہے۔ کانگریس کی لیڈر شپ کس طرح اپنے نصب العین سے دور ہوئی اس کی ایک وجہ ابوالکلام آزاد یہ بیان کرتے ہیں:

"جواہر لال نہرو، ماؤنٹ بیٹن سے بہت متاثر تھے اور شاید ان سے بھی زیادہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے۔ یہ خاتون نہایت ذہین تھیں اور اس کے علاوہ ان کی طبیعت اور انداز میں بڑی دلکشی اور ہمدردی تھی۔ یہ اپنے شوہر کی بہت مداح تھیں اور اکثر ان لوگوں کے لیے اپنے شوہر کے خیالات کی ترجمانی کرتی تھیں جو شروع میں ان سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔"[3]

مسلمانوں کو ایک وطن تو دیا گیا لیکن ابتدا ہی میں ایسی ناانصافیاں کی گئیں کہ اس کے وجود کو برقرار رکھنا ناممکن تھا انھیں وہ حکومت مل گئی جس کے حصے کی افواج ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق ابھی تک ہندوستان سے باہر رکھی گئی تھیں۔ پاکستان کے حصے کا تمام اسلحہ اور گولہ بارود ہندوستان میں پڑا ہوا تھا یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندو فاشزم کے سیلاب کے دروازے کھولنے سے پہلے پاکستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس معاملے کی تمام تر حقیقتوں کو مصنفین تحریک قیام پاکستان نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اسلحہ کے ذخائر اور دوسرے سامان کو بھی دونوں ممالک میں تقسیم کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔ افواج اور اس کے متعلقہ سامان کی کاغذات پر تو آسانی سے تقسیم ہو گئی لیکن جب فیلڈ مارشل کلاڈ آکنلیک نے ان فیصلوں پر عمل درآمد شروع کیا تو ہندوستان کی حکومت نے روڑے اٹکانے شروع کیے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی حکومت اور وزراء نے مشترکہ دفاعی کونسل اور فیلڈ مارشل کلاڈ آکنلیک کے خلاف سربازار اور نجی محفلوں میں زہریلے پروپیگنڈا کی مہم شروع کر دی اور الزام لگایا کہ فیلڈ مارشل پاکستان کی "بے جا" حمایت کر رہے ہیں اور مطالبہ کیا کہ اتنے سینئر افسر کو واپس انگلستان بلا لیا جائے اور مشترکہ دفاعی کونسل کو ختم کر دیا جائے ابتدائی معاہدہ

---

[1] مسلمانوں کی جدوجہد آزادی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ص ۱۶۲۔

[2] عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن، ایلن کیمبل جانسن / محمد یونس احمر، ص ۱۳۱۔

[3] ہماری آزادی، ابوالکلام آزاد / محمد مجیب، ص ۳۶۹، ۳۷۰۔

کی رو سے اس کونسل کو یکم اپریل ۱۹۴۸ء تک اپنا کام مکمل کرنا تھا۔ ہندوستان کے زہریلے پروپیگنڈا کا مقصد تھا کہ تقسیم کی نگرانی کرنے والے افسران واپس چلے جائیں اور ہندوستان، پاکستان کے فوجی ذخائر کے حصوں پر قبضہ کر لے۔ فیلڈ مارشل آکنلیک کے خلاف پروپیگنڈا اتنا تیز کر دیا گیا کہ ان کے لیے کام کرنا محال کر دیا گیا۔ بالآخر ۳۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو سپریم کمانڈر کا دفتر (فیلڈ مارشل آکنلیک) بند کر دیا گیا اور وہ واپس انگلستان چلے گئے اب ہندوستان کو کھلی چھٹی مل گئی۔ افسران اور جوان تو پاکستان پہنچ گئے لیکن حکومت ہندوستان نے اسلحہ کے ذخائر اور دیگر اسٹوروں سے پاکستان کو اس کا جائز حصہ نہ دیا۔ جو کچھ سامان پہنچا، ٹوٹا پھوٹا اور بیکار تھا۔ جو بحری جہاز اور ہوائی جہاز پاکستان کو ملے کافی خستہ حالت میں تھے پاکستان کے حصہ میں کوئی آرڈیننس فیکٹری نہ آئی سولہ کی سولہ آرڈیننس فیکٹریاں ان علاقوں میں تھیں جو ہندوستان کے حصہ میں آئے۔ دو آرڈیننس فیکٹریوں کی مشینری ابھی نصب نہیں ہوئی تھی۔ پاکستان کی یہ خواہش تھی کہ یہ مشینری اُسے مل جائے لیکن ہندوستان نے انکار کر دیا۔ ہندوستان نے پاکستان کو کچھ رقم دینے کا وعدہ کیا لیکن اس کی بھی مکمل ادائیگی نہ کی غرضیکہ پاکستان کے حصے میں ہندوستان کی نسبت چھوٹی اور کمزور فوجیں آئیں۔ انہیں اسلحہ، دیگر سٹور اور دوسری ضروریات کی اشیا کی کمی تھی۔ نہ کوئی آرڈیننس فیکٹری تھی اور فوجی ٹریننگ کے ادارے ناکافی تھے۔ بری فوج کی نسبت ہوائی اور بحری فوج کو لیس کرنے کی زیادہ ضرورت تھی پاکستان کی بری اور بحری افواج کے پہلے کمانڈر انچیف انگریز مقرر ہوئے۔''[۱]

اس روایت کو پیش کرنے کے بعد ناول نگار کا یہ موقف درست معلوم ہوتا ہے اور حقائق بھی یہی کچھ بتاتے ہیں کہ فسادات اور مہاجرین کے قافلوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی اصل وجہ یہی رہی تھی کہ پاکستان کو اس کے حصے کی فوج اور اسلحہ نہ مل سکا تھا۔ ایک افسوسناک معاملہ پاکستان اور ہندوستان کی حدود کے تعین کا ہے۔ ان ملکوں کی آزادی کا اعلان ۳ جون کو ہوا جس پر عملدرآمد ۱۴ اگست کو ہونا تھا لیکن جغرافیائی اعتبار سے حدود کا تعین کئی دن بعد ہوا جس کے مطابق پاکستان کے ساتھ زیادتی کی گئی بقول ناول نگار:

''ریڈکلف کا قلم ستلج یا بیاس کے کنارے رکنے کی بجائے راوی کے کنارے جا پہنچا، اس کی منطق سو فیصدی مہا بھائی تھی۔ ستلج بیاس اور راوی کے درمیان مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کے ساتھ شامل کر دینے سے نہروں اور ریلوں کے انتظام میں خلل اور انتشار کا اندیشہ تھا چونکہ امرتسر کی دو تحصیلوں میں سکھوں اور ہندوؤں کی اکثریت تھی اس لیے امرتسر کے سارے ضلع کو ہندوستان میں شامل کرنا ضروری سمجھا گیا تھا۔ بیاس کے پار مسلم اکثریت کی تمام تحصیلیں ہندوستان میں شامل کر دی گئیں۔ مسلم اکثریت کا ضلع گورداسپور جو تین جون کے اعلان کے مطابق پاکستان کا حصہ بن چکا تھا تحصیل شکرگڑھ کے سوا اس لیے ہندوستان میں شامل کر دیا گیا کہ مادھو پور سے نکلنے والی ان نہروں پر بھی بھارت کا کنٹرول ضروری سمجھا گیا تھا جو امرتسر کی دو تحصیلوں کے مقابلے میں اکثریت کے اڑھائی اضلاع کو سیراب کرتی تھیں۔ تحصیل اجنالہ کی مسلم آبادی ہندو اور سکھوں سے قریباً دوگنا تھی لیکن چونکہ یہ ہندو اور سکھ اکثریت کے ضلع امرتسر کا ایک حصہ تھی، اس لیے اسے ہندوستان میں شامل کر دیا گیا۔''[۲]

---

[۱] تحریک قیام پاکستان؛ پروفیسر محمد رفیع انور، حسن عسکری رضوی، ص ۲۸۵، ۲۸۶۔

[۲] خاک اور خون؛ نسیم حجازی، ص ۳۳۵۔

اس معاملے کا اہم ترین گواہ مصنف عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہے جو لکھتا ہے:

''ہر شخص کی زبان پر بے انصافی کی شکایتیں تھیں۔ ماؤنٹ بیٹن کی فراست و ذہانت کا جوہر یہاں بھی کھلا۔ انہوں نے صاف صاف لفظوں میں کہا کہ ریڈکلف نے جو فیصلہ صادر کیا ہے اس سے ہر پارٹی کا مطمئن ہونا غیر ممکن ہے۔ سب کی خوشی اس بات کی دلیل ہے کہ ایوارڈ منصفانہ ہے۔''

مشرقی پنجاب میں گورداسپور کی شمولیت سے لیاقت نے دکھ کا اظہار کیا اور مشرقی پاکستان میں چاٹگام کے پہاڑی علاقوں کی شمولیت پر پٹیل سخت ناراض ہوئے لیکن بلدیو سنگھ خاموش اداس اور گنگ بیٹھے رہے۔ کسی لیڈر نے بھی نکتہ چینی کی جرأت نہ کی کیونکہ پہلے ہی وہ ایوارڈ کو کسی شکل میں بھی منظور کر لینے کا حلف اٹھا چکے تھے۔''[۱]

اس معاملے کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر معین الدین عقیل رقمطراز ہیں:

''تقسیم ہونے والے صوبوں کی نئی سرحدیں قائم کرنے کے لیے دو ''سرحدی کمیشن'' تشکیل دیے گئے۔ دونوں کمیٹیوں کا صدر ریڈکلف کو مقرر کیا گیا۔ جسے ہر صورت میں غیر جانبدار رہنا تھا لیکن بعد کی شہادتوں سے یہ افسوسناک امر سامنے آیا کہ اس کی نام نہاد ''غیر جانب داری'' میں وائسرائے اور مسلم دشمنی کا بھی دخل رہا۔ ورنہ اس کے کیا معنی تھے کہ جب متنازعہ امور پر فیصلہ کرنے کا وقت آیا تو ریڈکلف نے مشرق میں نہ صرف کلکتہ بلکہ ضلع مرشد آباد کا تمام اور مسلم اکثریت والے ضلع نادیہ کا بیشتر علاقہ بھارت کو دے دیا اور مغرب میں گورداسپور، بٹالہ اور پٹھانکوٹ کی تین تحصیلیں بھارت کو بخش دیں حالانکہ یہ تمام علاقے مسلم اکثریت پر مشتمل تھے یہ فیصلے آخر وقت تک مسلم لیگ سے پوشیدہ رکھے گئے۔ چنانچہ فیصلہ سن کر قائدِ اعظم کو سخت تعجب اور صدمہ ہوا۔ ان کے خیال میں یہ فیصلہ سراسر نا انصافی پر مبنی تھا۔ اس فیصلے کو آئینی نہیں کہا جا سکتا یہ بدنیتی کا آئینہ دار ایک سیاسی فیصلہ تھا چونکہ قائداعظم نے ریڈکلف کا تقرر منظور کر لیا اس لئے فیصلے کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا۔''[۲]

اس سلسلے میں سب سے اچھا تبصرہ مصنفین تحریک قیام پاکستان نے کیا ہے جن کے مطابق:

''لارڈ ریڈکلف نے اپنے فیصلے میں پاکستان اور مسلمانوں سے زیادتی کی اور کئی ایسے علاقے جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ ہندوستان میں شامل کر دیے اور اس طرح پاکستان پر ایک ضرب لگائی۔ پنجاب میں فیروزپور، جالندھر اور گورداسپور کو ہندوستان کے حوالے کر دیا۔ گورداسپور ہندوستان کے حوالے کر کے ہندوستان کو کشمیر تک پہنچنے کا راستہ مہیا کیا گیا اسی طرح بنگال میں مسلم اکثریت کے کچھ علاقوں کو کاٹ کر ہندوستان میں شامل کر دیا گیا جو کہ پاکستان کے ساتھ سراسر زیادتی تھی۔''[۳]

ان روایات اور ناول نگار کے بیان کا جائزہ لیں تو ریڈکلف ایوارڈ کا اعلان مسلمانوں کے ساتھ سراسر زیادتی کی صورت میں سامنے آتا

---

[۱] عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن: ایلن کیمبل جانسن / محمد یونس احمر، ص ۱۸۷۔

[۲] مسلمانوں کی جدوجہد آزادی: ڈاکٹر معین الدین عقیل، ص ۱۲۶۔

[۳] تحریک قیام پاکستان: پروفیسر محمد رفیع انور، حسن عسکری رضوی، ص ۲۸۲

ہے۔ ریڈکلف نے پہلے تو ہندوستان سے یہ حلف حاصل کیا کہ اس کے فیصلے کو ہر صورت تسلیم کیا جائے گا اور پھر ایک ایسا فیصلہ مرتب کیا جو مسلمانوں کے ساتھ سراسر زیادتی پر مبنی تھا تمام تر ان اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا جو ۳ جون کے اعلان آزادی میں پیش کیے گئے تھے۔ گورداسپور کا مسلمانوں سے چھن جانا جغرافیائی اعتبار سے ان کے مستقبل کے منصوبوں پر اثر انداز ہوا اور بھارت کو اس کا مل جانا اس کے جارحانہ عزائم کی تکمیل میں مددگار ثابت ہوا پھر ان قافلوں کا غیر محفوظ ہو جانا جو اس علاقے سے گزر کر پاکستان کی جانب رواں دواں تھے عظیم انسانی قتلِ عام کا باعث بنا۔ تحقیقی نکتہ نظر سے ہمیں محض یہی ثابت کرنا ہے کہ ناول نگار نے جو کچھ بیان کیا تاریخی حقائق کے مطابق تھا۔ ناول نگار نے جس موضوع کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے وہ پنجاب میں فسادات کا موضوع ہے بظاہر ایک گاؤں اور پھر اس علاقے کی کہانی کے ساتھ دیگر علاقوں کی ایسی داستانیں شامل کی گئیں ہیں جو انتہائی لرزہ خیز ہیں ص ۳۲۷ سے ان واقعات کا آغاز ہوتا ہے اور تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل پنجاب میں کھیلے جانے والی خون کی اس ہولی کا تذکرہ ہے۔ وہی سکھ جو گورداسپور کے پاکستان میں شامل ہو جانے پر اپنی جانوں کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کی رہائیاں چاہتے تھے ریڈکلف ایوارڈ کے اعلان سے آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو چن چن کر قتل کیا اگر کسی گاؤں میں مسلمان جمع ہوئے تو ہندوستانی پولیس اور فوج نے ان مہاسبھائی بلوائیوں کا ساتھ دیا جبکہ اکالی جتھے ہراول کا کام کر رہے تھے۔ عورتوں کی آبروریزی کی گئی شیر خوار بچوں کو ان کی ماؤں کے سامنے زمین سے فضا کی طرف اچھالا گیا اور پھر انہیں کرپانوں اور نیزوں کی نوک پر روکا گیا۔ انسانیت کے خلاف ہونے والے جرائم اس قدر گھناؤنے تھے کہ جانور بھی اس وحشت و بربریت کو دیکھ کر حیران تھے اس قدر قتل عام ہوا کہ گدھوں نے انتخاب کر کے انسانی گوشت کھایا چنگیز خاں اور ہلاکو کے جبر کی داستان اس کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئی لیکن اس دور میں بھی چند مسلمان نوجوانوں نے مہاجرین کے قافلوں کو بحفاظت پاکستان پہنچانے کا فریضہ انجام دیا یہ ایک طویل داستان ہے اور اس بارے میں لاتعداد شواہد موجود ہیں۔ اس سلسلے میں بی بی سی نے پروگراموں کا ایک سلسلہ ہندو پانی مسلم پانی کے نام سے نشر کیا جس میں ایک سکھ نے بتایا کہ اس نے اپنی کرپان سے کس قدر مسلمان قتل کیے کہ کرپان ٹوٹ گئی اور پھر وہ دوسری کرپان لے آیا اور قتلِ عام کا سلسلہ جاری رکھا۔ تقسیم کے پچاس سال بعد بی بی سی کے نامہ نگار نے اس سکھ سے اس کے عمل پر سوال کیا کہ کیا اسے کوئی ندامت ہے تو اس نے نفی میں جواب دیا۔ کئی ایسے متاثرین کے انٹرویو پیش کیے گئے کہ جنھوں نے کنوؤں میں زہر ملا دینے کے واقعات بیان کیے۔ اصفہانی خاندان کی ایک نوجوان دوشیزہ کو صرف اس جرم پر قتل کیا گیا کہ کہو پاکستان مردہ باد مگر اس نے کہا پاکستان زندہ باد ظالموں نے اس کی زبان خاموش کر دی۔ اس قسم کے واقعات مختلف مصنفین نے نقل کیے ہیں ہم چیدہ چیدہ بیانات پیش کرتے ہیں۔ مصنف عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کے حالات کا احاطہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

""پنجاب میں فرقہ وارانہ خوف وہراس سے فضا گمبھیر ہو گئی ہے اور قتل و غارتگری اور پناہ گزینوں کی نقل و حرکت کا یہ عالم ہے کہ مخالف فوجوں کی جھڑپ سے بھی ایسے حالات کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ تاریخ کے صفحات ترک وطن کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔

اس المیہ میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ لوگوں کو استحصال کا موقع ہاتھ آ جاتا ہے۔ آج بھی کم و بیش فضا میں ایسے گرد و غبار چھائے ہوئے ہیں۔''[۱]

فسادات کے واقعات کا تذکرہ روزنامہ نوائے وقت لاہور کے اکثر اداریوں کی زینت بنا مثلاً:

''جالندھر، ہوشیار پور اور فیروز پور کے مظلومین کی حالت قابلِ رحم ہے۔ وہ تعداد میں کم ہیں ہتھیار ان کے پاس نہیں، حکام ان کی بات نہیں سنتے، پولیس ان کی محافظ نہیں۔ امرتسر کے لوگ تو لاہور چلے آئے۔ یہ مظلوم کہیں پناہ بھی نہیں لے سکتے۔''[۲]

مصنف تحریک قیام پاکستان فسادات کے واقعات اور مہاجروں کے قافلے پر بیتنے والے مظالم کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مسلمانوں کے قافلے پیدل، بیل گاڑیوں، ریل، بسوں اور ٹرکوں کے ذریعے مشرقی پنجاب سے پاکستان جا رہے تھے۔ ان میں عورتیں، بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ مہاجروں کی کثیر تعداد قاتلوں اور لٹیروں کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ہندو اور سکھ کرپانوں، بھالوں، بندوقوں اور اسی قسم کے دوسرے اسلحوں سے لیس ہو کر قافلوں پر حملہ کرتے اور بعض قافلوں کا کوئی بھی فرد زندہ نہ بچتا۔ اسی طرح مسلمانوں کے گاؤں کو آگ لگا دی اور عورتوں کو اغوا کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پنجاب کے متاثرہ علاقوں میں قانون کی عملداری بالکل ختم ہو چکی تھی۔''[۳]

فسادات اور ہجرت کے واقعات کا تذکرہ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے یوں مرقوم کیا ہے:

''مشرقی پنجاب کے تمام شہروں اور پاکستان کے راستوں پر ایک بڑے منظم طریقے سے مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا گیا، جو ایک عرصے تک جاری رہا۔ لاکھوں مسلمان جاں بحق ہوئے، سب کی املاک لوٹ لی گئیں اور جو کسی طرح بچ گئے وہ پاکستان کے راستے میں بھوک اور بیماری سے ہلاک ہوئے یا مزید حملوں کا شکار ہوئے۔''[۴]

یہ چند مثالیں ناول نگار کے اس تفصیلی بیان کا جواب تو نہیں جو اس نے ربط و تسلسل کے ساتھ ناول کے ایک بڑے حصے پر پھیلا کر پیش کئے ہیں۔ مگر یہ ثابت کرنے میں ہم ضرور کامیاب ہیں کہ جن واقعات کو ترتیب دے کر لڑی میں پرو کر پیش کیا گیا ہے وہ مختلف مقامات میں مختلف افراد کے ساتھ ہی ہوئے ہوں لیکن ہوئے ضرور تھے۔ یہاں ناول نگار نے تخیل کا سہارا لینے کے بجائے محض کرداروں کے تخیلاتی نام پیش کئے ہیں اور حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ ناول نگار نے جن معاملات کی نشاندہی کی ہے ان میں ایک کانگریسی لیڈروں کا یہ واویلا کہ مغربی پنجاب میں سکھوں اور ہندوؤں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے حالانکہ یہ حقیقت سے چشم پوشی کے مترادف ہے نوائے وقت لاہور نے ۲۰۔ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنے اداریے میں لکھا تھا کہ:

---

[۱] عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن: ایلن کیمبل جانسن / محمد یونس احمر، ص ۱۹۷۔

[۲] تحریک پاکستان: سرفراز حسین مرزا، ص ۸۷۴۔

[۳] تحریک قیام پاکستان: پروفیسر محمد رفیع انور، حسن عسکری رضوی، ص ۲۸۷۔

[۴] مسلمانوں کی جدوجہد آزادی: ڈاکٹر معین الدین عقیل، ص ۱۶۸۔

''امرتسر پر جو قیامت گزر رہی ہے اس کی تفاصیل اخبارات میں شائع نہیں ہوئیں۔ خبر رساں ایجنسیوں اور آل انڈیا ریڈیو نے اس معاملے میں افسوسناک بددیانتی سے کام لیا۔ جو خبریں دوسرے ذرائع سے لاہور پہنچیں، وہ سنسر کی پابندی کے باعث شائع نہ ہو سکیں اس کے برعکس لاہور میں جو ہنگامہ ہوا باوجودیکہ وہ امرتسر کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا تھا، خبر رساں ایجنسیوں اور آل انڈیا ریڈیو نے اس کی خوب تشہیر کی اور اخبارات نے بھی اسے زیبِ عنوان بنایا۔''[1]

فسادات کا موضوع محض مشرقی پنجاب میں رونما ہونے والے واقعات تک محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ پورے ہندوستان میں پھیل گیا تھا۔ دہلی جو آزاد ہندوستان کا دارالحکومت تھا وہاں بھی مسلمان سکون سے نہ رہ سکے۔ بقول ناول نگار:

''حکومت، سکھوں اور ہندوؤں کی اسٹین گنوں، ٹامی اور رائفلوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے گھروں میں قلم تراش چاقو، سبزی کاٹنے کی چھریاں اور جلانے کی لکڑیاں تک چھوڑنا خطرناک سمجھتی تھی۔''[2]

اس کے بعد تمام تر امن وامان قائم رکھنے کے حکومتی دعووں کے باوجود:

''لال قلعہ کی دیواروں اور جامع مسجد کے نیچے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہتی رہیں۔ وحشت اور بربریت کے ہاتھ انسانیت کا دامن تار تار کرتے رہے۔ گاندھی کے چیلوں کے عہدِ حکومت میں دہلی کی تاریخ کا پہلا باب مسلمانوں کے خون سے لکھا جا رہا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اب بھی وائسرائے تھا۔ پنڈت نہرو اب بھی وزیراعظم تھا لیکن دہلی پر غنڈوں کی حکومت تھی۔''[3]

ان واقعات کی حقیقت کو ایک چشم دید گواہ بشیر احمد دہلوی نے یوں بیان کیا ہے:

''جب دلی میں فسادات پھوٹے تو ایک روز ہمیں یوں محسوس ہوا کہ گویا سکھوں نے ہمارے محلے پر چڑھائی کر دی ہے۔ ہم نے اپنی عورتوں کو تسلی دی اور ہتھیاروں کی عدم دستیابی کے باعث بلیڈ، چاقو اور چھریاں انہیں دیں تاکہ اگر سکھ انتہا پسند ہم مردوں کو قتل کر دیں تو عورتیں ان چیزوں کی مدد سے اپنا دفاع کر سکیں۔ اسی دوران اچانک ٹرکوں کی آواز سنائی دی ہم سمجھے کہ ملٹری آ گئی ہے اب حالات کچھ بہتر ہو جائیں گے لیکن ٹرکوں میں ملٹری نہیں بلکہ مہا سبھا کے لوگ آئے اور انہوں نے ٹرکوں سے اترتے ہی فائرنگ شروع کر دی۔ جس کے نتیجے میں کئی افراد گلیوں میں ہی مر گئے، شہید ہو گئے، پھر انہوں نے مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگانا شروع کی۔ جس کسی کے لئے ممکن ہو سکا جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اسی ہنگامے کے دوران ہمارے بھائی تانگہ لے کر آئے اور بڑی دشواری کے ساتھ ہمیں محلے سے نکال لے گئے۔''[4]

دہلی کے فسادات کا تذکرہ ایک اور چشم دید گواہ سید حسن ریاض ان الفاظ میں کرتے ہیں ان کا بیان خاصا طویل ہے۔ ہم اختصار سے کام

---

[1] تحریک پاکستان: سرفراز حسین مرزا، ص ۸۶۸۔

[2] خاک اور خون: نسیم حجازی، ص ۵۲۶۔

[3] ایضاً، ص ۵۲۶۔

[4] اعراف رپورٹ مشمولہ ماہنامہ اعراف کراچی، تہدیہ حسینی، ص ۹۱۔

لے رہے ہیں:

''دہلی کی طرف آنے والی تمام ٹرینوں پر دہلی کی مفصلات میں حملے کیے جاتے تھے اور مسلمان مسافر تہ تیغ کر دئے جاتے تھے۔ رقبہ دہلی میں کرفیو نافذ ہونے کے باوجود سکھ تلواروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جیپوں میں گھومتے نظر آتے تھے۔ نواح دہلی کے دیہات میں ۳ ستمبر تک فسادات شروع ہو گئے۔ پالم کے ہوائی اڈے سے جلتے ہوئے دیہات کا دھواں نظر آ رہا تھا۔ ان دیہات کے مسلم باشندوں کو لوٹا گیا، قتل کیا گیا اور گھروں سے نکال دیا گیا۔ پنجاب میل کے بعد جو ٹرین بھی جی۔ آئی۔ پی لائین پر دہلی سے روانہ ہوئی وہ نظام الدین کے قریب روک لی جاتی تھی۔ مسلمان مسافر گھسیٹ کر باہر نکالے جاتے تھے اور ہلاک کر دیے جاتے تھے۔ ۹ بجے کے بعد دہلی کے اسٹیشن پر قتل عام اور لوٹ مار کا ہنگامہ گرم ہو گیا۔ ۹ بج کر بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ کناٹ پلیس میں لوٹ مار شروع ہو گئی۔ پولیس اور فوج الگ کھڑی ہوئی تماشہ دیکھ رہی تھی۔

پالم کے ہوائی اڈے پر ۷ ستمبر کو شام ۶ بجے تک میری ڈیوٹی تھی۔ دہلی کے تمام حصوں سے قتل عام، لوٹ مار اور آتش زنی کی خبریں آتی رہیں۔ ۵ ستمبر کو قرول باغ میں امتحان کے ہال کے باہر بہت سے ان مسلمان لڑکوں کو ذبح کر دیا گیا جو میٹرک کا امتحان دے رہے تھے۔ ۷ ستمبر کو لودی روڈ اور ویلنگٹن کے ہوائی اڈے کے رقبے کا محاصرہ کیا گیا، تمام گھیرے ہوئے مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا۔ صرف اس دن لودی روڈ اور ویلنگٹن کے ہوائی اڈے پر تھا مجھے بتایا گیا کہ مسلمانوں کو ہلاک کرنے کے لئے اسٹین گنیں اور تلواریں استعمال کی گئیں۔ ۸ ستمبر (۱۹۴۷) ۔ آج کا دن دہلی اور نئی دہلی میں قتل عام، لوٹ مار اور آتش زنی کے اعتبار سے سخت ترین تھا۔ کناٹ پلیس میں مسلمانوں کی تمام دکانیں لوٹ لی گئیں، چاندنی چوک، سبزی منڈی اور پہاڑ گنج میں مسلمانوں کی دکانیں اور ان کا مال و اسباب وسیع پیمانے پر لوٹا گیا اور صدہا مسلمان قتل کر دئے گئے۔ دہلی کے مسلمانوں میں ہمت اور مزاحمت کی اہلیت بالکل ختم ہو گئی کیوں کہ ان کو صرف مسلح بلوائیوں ہی کا مقابلہ درپیش نہیں تھا بلکہ پولیس اور فوج بھی ان کی مخالف تھی۔ مسلمان پولیس کی اکثریت یا تو غیر مسلح کر دی گئی تھی یا شہر کے غیر اہم حصوں میں تعینات کر دی گئی تھی۔ مسلمان پولیس مینوں کی بھی خاصی تعداد ہمارے کیمپ میں پناہ گزین ہوئی۔ ۸ ستمبر کی شام تک ایل بلاک میں ۱۲ ہزار پناہ گزین جمع ہو چکے تھے۔

ہمارے بعض افسر اور مٹھی بھر مسلمان سپاہی قرول باغ اور پہاڑ گنج جیسے خطرناک اور فساد زدہ علاقوں میں بھی گئے اور انہوں نے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ جانیں بچائیں۔ انہوں نے بے شمار لاشیں اور جلے ہوئے مکانات دیکھے، جتنے آدمی بچا کر نکالے گئے وہ سب کے سب ایک ہی قصہ سناتے تھے کہ فوج اور پولیس نے ان کی کوئی مدد نہیں کی اور پولیس نے مسلمانوں کو زبردستی ان کے گھروں سے نکالا، جو مکانات اس طرح خالی کرا دئے گئے ان میں ہندو اور سکھ فوراً داخل ہو گئے اور مسلمانوں کے مال و اسباب پر بھی انہوں نے قبضہ کر لیا۔''[۱]

---

۱ پاکستان ناگزیر تھا: سید حسن ریاض، ص ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے واقعات تاریخ کی مختلف کتابوں میں موجود ہیں۔ ریڈیو پر ان فسادات اور مظالم کی داستانیں مختلف انداز میں پیش کی جاتی رہیں۔ ٹیلی ویژن کی ایجاد کے بعد مختلف فیچر پروگراموں اور ڈراموں کے ذریعے تقسیم برصغیر کے ان اندوہناک واقعات کو پیش کیا گیا۔ فلموں کے ذریعے بھی خوب خوب عکاسی کی گئی یہی وجہ ہے کہ نسیم حجازی نے بھی اپنے ناول میں تقسیم کے ان لرزہ خیز واقعات کا تذکرہ انتہائی ربط و تسلسل کے ساتھ خاصے طویل انداز میں کیا ہے اگر یہ کہا جائے کہ ہجرت کے تجربے سے دوچار ہونے والا ہر خاندان اگر زندہ رہا تو ان واقعات کا چشم دید گواہ تھا۔ ان معاملات سے محض وہی خاندان دوچار نہیں ہوئے جو ہندوستان کے مختلف صوبوں سے ہجرت کر کے پاکستان آنا چاہتے تھے۔ گاندھی کے چیلے پاکستانی فوج کے ان جوانوں پر بھی شب خون مارنا چاہتے تھے جو پاکستان کی طرف مختلف ٹرینوں سے روانہ ہو رہے تھے ناول نگار نے صفحہ نمبر ۵۳۲ پر ان واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی ہمت و شجاعت کی داد دی ہے اور یہ بھی کہ وہ اپنا اسلحہ نام نہاد محافظوں کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھے۔ اس کیفیت کا اندازہ ایک فوجی ٹرین میں پاکستان پہنچنے والے محمد امین خان اس طرح کرتے ہیں:

”دہلی اور آس پاس کے علاقوں میں فسادات کی وجہ سے ہمارے شہر (مراد آباد) میں بھی خوف و ہراس تھا۔ اسی خوف میں دن گزرتے رہے اور ہم سوچتے رہے کہ لاہور کیسے پہنچیں۔ ایک روز اطلاع ملی کہ ایک فوجی ٹرین پاکستان جا رہی ہے۔ ہم گھر والوں کے ہمراہ اسٹیشن پہنچے۔ ٹرین آئی تو وہ فوجیوں اور ان کے خاندان سے بھری ہوئی تھی۔ اس میں سوار ہونے کے لئے کسی فوجی کا حوالہ ضروری تھا۔ ٹرین کے انچارج نے جب مجھ سے حوالہ طلب کیا تو میں نے ذہن پر زور دے کر اپنے ایک جاننے والے کرنل ارشاد کا نام لے دیا۔ کرنل صاحب کا نام سن کر اس نے مجھ سے کہا کہ اگر کہیں جگہ مل جائے تو بیٹھ جایئے۔ بالآخر ہم بھی کسی نہ کسی طرح اس ٹرین میں سوار ہو گئے۔ روانگی سے قبل کمانڈر نے اپنے مختصر خطاب میں مسافروں سے کہا کہ خورد و نوش کی اشیا کا بندوبست اچھی طرح کر لیجیے کیونکہ ہندوؤں نے راستے سے حاصل کی جانے والی اشیا اور پانی زہر آلود کر دیا ہے۔ ہمارے پاس اسلحہ کافی ہے اگر راستہ میں بلوائیوں نے حملہ کر دیا تو ہم مقابلہ کریں گے اور آپ لوگ بلا خوف بیٹھے رہیے گا۔ بلوائی آپ کے پاس اس وقت پہنچیں گے جب ہمیں قتل کر دیں گے۔“[۱]

نسیم حجازی نے جن معاملات کی طرف نشاندہی کی تھی وہ تاریخی اعتبار سے حقیقت پر مبنی تھے۔ ہم نے مختلف تاریخی حوالوں اور چشم دید گواہوں کی آراء سے ثابت کیا ہے۔

ان واقعات کے حوالے سے سید ابوالاعلیٰ مودودی کا موقف حالات کی منفرد تصویر پیش کرتا ہے:

”قوموں میں دشمنیاں بھی ہوئی ہیں، ملکوں میں خانہ جنگیاں بھی ہو چکی ہیں، لیکن غالباً کبھی دنیا کی دو قوموں کے درمیان عداوت نے یہ شدت، یہ تلخی اور تندی اختیار نہیں کی ہے۔ انسان، انسان سے بارہا لڑا ہے، مگر لڑائی میں کمینہ پن اور بدمعاشی کا جو مظاہرہ

---

[۱] اعتراف رپورٹ مشمولہ ماہنامہ اعتراف کراچی مجلد ہمہ جہتی، ص ۱۱۔

یہاں ہوا ہے، یہ اپنی نظیر بس آپ ہی ہے۔ یہاں انسان صورت جانوروں نے وہ وہ کام کیے ہیں کہ اگر کتوں اور بھیڑیوں پر ان کا الزام تھوپ دیا جائے تو وہ بھی اسے اپنی توہین محسوس کریں اور یہ کرتوت چند گنے چنے بدمعاشوں کے نہیں تھے بلکہ پوری پوری قوموں نے اپنے آپ کو بدمعاش ثابت کیا۔''[1]

ان تمام امور کا ذمے دار لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو قرار دیتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں کہ:

''آخر کار نگاہِ انتخاب لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر جا کر ٹھہری اور اس شخص نے آکر تقسیم ہند کا پورا نقشہ ایسے طرز پر بنایا جو لازمی اور قطعی طور پر وہی نتائج پیدا کر سکتا تھا جو اس نے فی الواقع پیدا کیے۔ کلکتہ، نوا کھالی، بہار، گڑھ مکتیشور، راولپنڈی اور امرتسر کے واقعات کے بعد تقسیم ملک اور انتقالِ اختیارات کا جو ڈھنگ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اختیار کیا اس کو دیکھ کر ایک معمولی عقل و بصیرت رکھنے والا آدمی بھی یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس سے ملک کے ایک بڑے حصے میں سخت خونریزی ہو کر رہے گی۔''[2]

نسیم حجازی نے ناول کا ایک حصہ کشمیر کے موضوع پر مختص کیا ہے جس میں ان عوامل کی نشان دہی کی ہے کہ نہتے مسلمان سری نگر اور بارہ مولا تک جا پہنچے۔ انہوں نے ڈوگرہ سپاہیوں سے اسلحہ چھین کر انہیں پیچھے دھکیلنا شروع کیا نوبت یہاں تک پہنچی کہ راجا ہری سنگھ کو اپنا اقتدار ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا اس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو خط لکھا جس کے جواب میں ماؤنٹ بیٹن نے مدد کی یقین دہانی کرائی اور یوں تقسیم برصغیر کا ناسور پیدا ہوا۔ ابتدا میں ماؤنٹ بیٹن اور کابینہ کا مؤقف ایلن کیمبل جانسن کے مطابق یوں ہے:

''حکومت کشمیر نے پہلے ہی حکومت ہند سے امداد طلب کی تھی لہٰذا دفاعی کمیٹی نے فوراً اسلحہ اور گولہ بارود بھیجنے کا فیصلہ کیا تا کہ سری نگر کی مقامی آبادی اس اسلحہ سے اپنی مدافعت کرنے کے قابل بن سکے۔ اس کے بعد فوجی کمک بھیجنے کے سوال پر غور کیا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے کہا کہ جب تک کشمیر ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنے کی پیش کش نہیں کرتا ہے اس وقت تک وہاں فوج نہ بھیجی جائے کیونکہ یہ اقدام خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ الحاق محض عارضی ہوگا کیونکہ حالات اعتدال پر آنے کے بعد استصواب کرانا ضروری ہے۔ ۲۵ تاریخ کو اس پر کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو سکا۔ البتہ یہ طے پایا کہ وی۔ پی مینن فوراً سری نگر پہنچ کر صحیح حالات معلوم کریں۔

دوسرے دن وی۔ پی مینن جو اطلاع اپنے ساتھ لے کر آئے وہ بے حد پریشان کن تھی انہوں نے بتایا کہ بحران کی وجہ سے مہاراجا پر غشی کا عالم طاری ہے اور وہ خود کو بے دست و پا اور مجبور محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے ذہن میں یہ بات آگئی ہے کہ اگر ہندوستان نے مدد نہ کی تو ریاست ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس کے بعد مینن ہی کے مشورہ پر مہاراجا اپنی بیوی اور لڑکے کے ساتھ سری نگر سے رخصت ہو گئے کیونکہ مینن نے ان سے کہا تھا کہ ایسے عالم میں جبکہ قبائلی بارہ مولا تک آ گئے ہیں دارالحکومت میں ان کا قیام خطرے سے خالی نہیں ہے۔ مہاراجا نے الحاق نامہ دفاعی کمیٹی کی میٹنگ میں پیش کیا۔

۱۔ تحریک آزادی ہند اور مسلمان، سید ابوالاعلیٰ مودودی، حصہ دوم، ص ۲۸۹۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۹۵۔

ریاست کی عسکری طاقت کے بارے میں وی۔ پی مینن نے کہا کہ گھوڑ اسواروں کا چھوٹا سا دستہ سری نگر پہنچا ہے جو قبائلیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس حوصلہ فرسا صورت حال کی روشنی میں کابینہ نے مہاراجا کے الحاق نامہ کو منظور کر لینا طے کر لیا ہے۔ ساتھ ہی اس کا بھی فیصلہ کیا گیا کہ دوسرے دن صبح سویرے پیادہ فوج کا ایک دستہ بذریعہ طیارہ روانہ کیا جائے۔''[1]

تقریباً ایسی ہی کیفیت سید حسن رضا نے بیان کی ہے جسکے مطابق:

''آزادی کی اس جنگ میں کشمیریوں کا غلبہ تھا۔ مہاراجا اوراس کی حکومت کے ارکان بھاگ چکے تھے ان حالات میں مہاراجا کشمیر نے بھارت سے الحاق کی درخواست کی اور آزادی خواہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے فوجی امداد طلب کی بھارت نے الحاق کی درخواست اس شرط کے ساتھ فوراً منظور کی کہ الحاق کا قطعی فیصلہ باشندگانِ کشمیر کی رائے سے ہوگا اور ریاست پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی فوجیں بھیج دیں۔''[2]

ناول نگار نے جو دو خطوط شامل کیے ہیں ان میں سے ایک راجا ہری سنگھ کی طرف سے ماؤنٹ بیٹن کے نام اور دوسرا ماؤنٹ بیٹن کا جواب ہے سید نور احمد نے ماؤنٹ بیٹن والے خط کا حوالہ اس سیاق و سباق کے ساتھ شامل کیا ہے:

''۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی سے کشمیر کا ''الحاق'' منظور کرنے کا سرکاری اعلان کیا گیا۔ منظوری ایک خط کی صورت میں تھی جو مہاراجا کی درخواست کے جواب میں اسے بھیجا گیا تھا۔ اس خط پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دستخط تھے اس کی عبارت حسبِ ذیل تھی:

''مائی ڈیر راجا صاحب، مسٹر وی۔ پی مینن نے آپ کا خط مورخہ ۲۶ اکتوبر مجھے دیا۔ جن خاص حالات کا آپ نے ذکر کیا ہے انہیں مدِ نظر رکھتے ہوئے میری حکومت بھارتی ڈومینین کے ساتھ ریاست کشمیر کا الحاق اپنی اس پالیسی کے ماتحت منظور کرتی ہے کہ ان ریاستوں کے الحاق کا سوال جہاں عوام کی اکثریت اور والیِ ریاست مختلف مذہبی فرقوں سے تعلق رکھتے ہوں عوام کی رائے کے مطابق طے ہونا چاہیے۔ لہٰذا میری حکومت چاہتی ہے کہ جونہی ریاست میں امن و امان قائم ہو اور ریاست کی سرزمین بیرونی حملہ آوروں سے خالی ہو جائے تو ریاست کشمیر کے الحاق پر عوام کی رائے معلوم کی جائے۔ دریں اثنا آپ کی اس خواہش کے مطابق ہندوستانی فوج کے سپاہی آپ کی فوج کی مدد کرنے اور آپ کی رعایا کی جان و مال کی حفاظت کرنے کے لئے روانہ کیے جا رہے ہیں۔ میری حکومت کو اور خود مجھے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا ہے کہ آپ نے شیخ عبداللہ کو دعوت دینے کا فیصلہ کیا ہے کہ وہ عارضی طور پر وزارت مرتب کریں اور آپ کے وزیرِاعظم کے ساتھ مل کر کام کریں آپ کا مخلص ماؤنٹ بیٹن آف برما۔''[3]

ناول نگار نے جس مسئلے کی طرف مزید توجہ مرکوز کی ہے وہ شیخ عبداللہ کا کردار ہے جو کشمیریوں کو آزادی دلانے کی پاداش میں پابندِ سلاسل کیا گیا تھا۔ اب بھارت کی ضرورت بن چکا تھا اور صد افسوس کہ شیخ صاحب اس دامِ فریب میں آ گئے جس کی چالیں مہاراجا، نہرو اور

---

[1] ہجد لارڈ ماؤنٹ بیٹن، ایلن کیمبل جانسن / محمد یونس احمر، ص ۲۴۲، ۲۴۳۔

[2] پاکستان ناگزیر تھا، سید حسن ریاض، ص ۵۴۶۔

[3] مارشل لاء سے مارشل لاء تک، سید نور احمد، ص ۲۷۸، ۲۷۹۔

ماؤنٹ بیٹن چل رہے تھے بقول سید نور احمد:

''کشمیر میں مہاراجا کی حکومت بالکل ہی ختم ہوگئی تھی۔ اس نے دارالحکومت سے بھاگ کر جموں میں پناہ لی تھی۔ اس بات کی ضرورت ہی باقی نہ رہی تھی کہ اسے راضی رکھنے کے لئے شیخ عبداللہ کے ساتھ ٹال مٹول کی جائے۔ وہ سراسیمگی کی حالت میں جموں سے دہلی پیغام بھیج رہا تھا۔ ''میری گدی بچاؤ۔ وادی کشمیر ہاتھ سے نکلنے والی ہے مجھے سب شرطیں منظور ہیں فوجی امداد اور الحاق نامے کا فارم فوراً بھیجو میں شیخ عبداللہ کے ساتھ تعاون منظور کرتا ہوں'' شیخ صاحب ابھی دہلی ہی میں تھے۔ پنڈت نہرو نے انہیں حتمی یقین دلایا کہ ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے الحاق کی رسمی کارروائی کی جائے گی۔ الحاق کا مستقل فیصلہ کرنے کا حق ریاست کے عوام ہی کو دیا جائے گا۔ شیخ صاحب دھوکے میں آگئے اور کشمیر پر بھارتی فوج کے عارضی قبضے کے منصوبے کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہوگئے۔''[1]

کشمیر کے مسئلے کو غیر منصفانہ انداز میں حل کرنے کی ناکام کوشش کا اظہار ناول نگار نے جس طرح کیا ہے اور مختلف مصنفین نے ان کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے اس بات کا غماز ہے کہ نسیم حجازی کسی بھی موقع پر تاریخی حقائق سے انحراف نہیں کرتے۔ ناول میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جن میں قبائلی اور کشمیریوں کی جدوجہد کا تذکرہ ہے ساتھ ہی پاکستان کی مجبوریوں اور ہندوستان کی غاصبانہ ذہنیت کا تذکرہ کیا گیا ہے، ناول نگار نے آگے چل کر گاندھی کی موت اور اس پر بے جا طور پر اٹھنے والے طوفان کا ذکر کیا ہے جسکے مطابق مہاتما جی کے قتل کی ذمہ داری مسلمانوں پر تھوپنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر آستین میں چھپے سانپ یعنی ایک مہا سبھائی نے ان کا کام تمام کیا پھر ناول نگار قیام پاکستان کے محض ایک سال بعد قائدِ اعظم کی اندوہناک موت کا افسوسناک باب رقم کرتے ہیں کہ ابھی اس نوزائیدہ ملک کو اس عظیم رہنما کی اشد ضرورت تھی مگر مشیت ایزدی کے سامنے کس کا بس چلتا ہے۔

نسیم حجازی اپنے تاریخی ناولوں میں مسلم معاشرے کا ایسا نوحہ پیش کرتے آئے ہیں کہ جس کے ذریعے قارئین کو ان رموز سے واقفیت کرانا تھا کہ مستقبل کی حقیقتوں سے چشم پوشی تباہی و بربادی کا باعث ہوئی۔ زیر بحث ناول خاک اور خون بظاہر تو ناولوں کے اس سلسلے کا حصہ کہا جاسکتا ہے جس کا آغاز معظم علی سے ہوا۔ اس ناول میں بھی مسلمانوں کی جدوجہد کا تذکرہ ہے اور وہ حالات ہیں جو تاریخی اعتبار سے ماضی قریب کے زمرے میں آتے ہیں۔ ابھی تو بے شمار ایسے چشم دید گواہ بقید حیات ہیں جنھوں نے تحریک آزادی کے مناظر کو دیکھا تھا۔ ہندو اور سکھوں کے وہ رویے کہ جس کی بدولت مسلمان ایک آزاد ملک کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہوئے ایک تاریخی حقیقت تھا لیکن مسلمان رہنماؤں کی طرح جو اس مطالبے پر ڈٹ گئے مسلم عوام ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہ تھے جن سے انہیں سابقہ پڑنے والا تھا تقسیم کا فارمولہ پہلے منظور ہوا جبکہ جغرافیائی خدوخال بعد میں سامنے آئے پھر غیر مسلم متحد ہوگئے۔ مسلمانوں کا خون پانی سے زیادہ ارزاں ہوگیا اور بقول شاعر

مول پانی کے بکا خون جگر
مطمئن پھر بھی خریدار نہ تھے

---

[1] مارشل لاء سے مارشل لاء تک، سید نور احمد، ص ۳۲۸۔

اس کے باوجود دنیا کے نقشے پر دو آزاد مملکتیں وجود میں آئیں۔ جن میں سے ایک مملکت خداداد پاکستان تھی کہ جس کے حصول کی قیمت لاکھوں مسلمانوں کی قربانی کی صورت میں ادا کرنی پڑی اگر یہ نظریاتی مملکت اس طرح بھی حاصل ہو جاتی تو بھی گوارا تھا۔ ایک ناسور پاکستان کی شہ رگ میں پیدا کیا گیا جو مسئلہ کشمیر کی صورت میں حل طلب چھوڑ دیا گیا اور تا حال ہے۔ ناول نگار نے کوشش کی ہے کہ ناول کے تمام تر فنی تقاضوں دلچسپی، تجسس، کہانی میں ربط و تسلسل اور تاریخی ناول نگاری کے بنیادی اصول یعنی حقیقت پسندی کا دامن ہرگز نہ چھوڑا جائے اگر کوئی جھول کہیں نظر آتا ہے تو وہ خط کی شکل میں اور کتاب جو سلیم کے ذریعے مرتب کی گئی ہے لیکن ناول نگار کی یہ کوشش کہ تمام تاریخی کردار مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، ماسٹر تارا سنگھ، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، ریڈکلف، قائد اعظم، لیاقت علی خان، خضر حیات و دیگر کو ان کی اصلی اور صحیح صورت میں پیش کیا جائے ساتھ ہی معاشرتی عکاسی اور تہذیبی اقدار و روایات کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے لئے بعض تخیلاتی کردار جو معاشرے کے جیتے جاگتے اور حقیقی کردار معلوم ہوتے ہیں پیش کئے ہیں جن میں اہم ترین سلیم، داؤد، عصمت، مجید، موہن سنگھ، مہندر، بلونت سنگھ وغیرہ کے ہیں۔ ساتھ ہی جغرافیائی حالات پیش کئے گئے ہیں ان میں کسی قسم کا کوئی ردوبدل نہیں ہے گورداس پور غیر منقسم پنجاب کا ایک ضلع تھا اس کا جغرافیائی حدود اربع تمام تر نہری اور سڑکوں کے نظام کے عین مطابق پیش کیا گیا ہے۔ پھر وہ تمام موسمی حالات جو جون، جولائی اور اگست میں اس علاقے میں رونما ہوتے ہیں پیش کئے گئے ہیں۔ نسیم حجازی اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ تاریخی ناول نگاری انتہائی احتیاط کا مطالبہ کرتی ہے۔ تمام تر مطالعہ اور تحقیقی حقائق کے بعد ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ نسیم حجازی نے درست اور صحیح حقائق کے ساتھ کامیاب ناول نگاری کی ہے۔

یوسف بن تاشفین کا تحقیقی جائزہ

یوسف بن تاشفین

اس ناول کے واقعات اندلس کے زوال پذیر معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ جب طوائف الملو کی عروج پر تھی عین ممکن تھا کہ الفانسو ششم پورے اسپین پر صلیب کا جھنڈا لہرا دے کہ افریقہ سے امیر یوسف بن تاشفین کی مداخلت نے اسپین کی مسلم حکومت کو استحکام بخشا۔ اس ناول میں جس عہد کا تذکرہ ہے وہ چوتھی صدی ہجری کی چوتھی دہائی سے آٹھویں دہائی پر محیط ہے۔ ہر قوم کی فتوحات کسی رجل عظیم کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں اور مورخ کا قلم ہمیشہ ان گمنام سپاہیوں کا تذکرہ کرنے سے قاصر رہتا ہے جن کے خون کی روشنائی سے تاریخ کے عنوان لکھے جاتے ہیں۔ یہ ناول اندلس کی تاریخ کا وہ باب ہے جو ایک قوم کے گمنام رضا کاروں کے خون اور پسینے سے لکھا گیا ہے۔ یوسف بن تاشفین اندلس کے مسلمانوں کے لئے ایک آفتاب تھا جو آزادی اور مسرت کی صبح کا پیغام لے کر آیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ گمنام مجاہد اور رضا کار بھی شامل تھے جو اپنی آزادی چاہتے تھے اور جنھوں نے اپنے خون سے اندلس کی تقدیر کو بدلا۔ کہانی کا آغاز عبدالمنعم کے بیٹوں سے ہوتا ہے جو اپنے نوکر الماس کے ساتھ مدینہ الزہراد یکھنے جاتے ہیں جہاں ان کی کچھ بچوں سے لڑائی ہوتی ہے جن میں زیاد اور ادریس شامل تھے۔ اس لڑائی کے بعد عبدالجبار کا بیٹا ادریس، سعد، احمد اور حسن سے دوستی کر لیتا ہے ان سے اصرار کرتا ہے کہ وہ اس کو بھی سپاہی بنا دیں وہ انہیں واپسی کے لئے تیز رفتار گھوڑا بھی دیتا ہے اور خود بھی ان کے ساتھ شہر جاتا ہے۔ یہ لوگ گھر واپس آتے ہیں تو غرناطہ سے ان کے خالہ خالو آئے ہوئے تھے۔ ابو صالح ان کا خالو غرناطہ کا ایک بڑا رئیس تھا۔ عبدالمنعم کا شمار بھی قرطبہ کے گنے چنے امراء میں ہوتا تھا اسے گھوڑوں کی تجارت کا شوق تھا۔ ایک دفعہ قبرص گیا تو ایک شامی تاجر سے ملاقات ہوئی اس کے کہنے پر وہ ایک بیوہ اور اس کی بیٹی کو غرناطہ پہنچانے کی حامی بھر لیتا ہے۔ صقلیہ کے ساحل سے کچھ دور بحری قزاقوں نے عبدالمنعم کے جہاز پر حملہ کر دیا۔ قزاقوں کا جہاز تباہ ہو گیا اور ان کے جہاز میں آگ لگ گئی۔ یہ لوگ کشتیوں میں اپنی جان بچا کر نکلے بیوہ کی لڑکی سکینہ کے بچوں سے بہت محبت کرتی تھی۔ الماس عبدالمنعم کا ایک بربری نوکر تھا جو مراکش سے اس کے ساتھ آیا تھا۔ قرطبہ میں لوگ اسے عبدالمنعم کے بھائی کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ عبدالمنعم کی زندگی ہر لحاظ سے خوشگوار تھی لیکن اندلس کے مستقبل کا خیال اسے پریشان رکھتا تھا۔ پانچویں صدی ہجری میں اندلس کے مسلمان نازک ترین دور سے گذر رہے تھے وہ سلطنت جسے عبدالرحمٰن اول کے جانشینوں نے ایک باغ کی طرح رکھا تھا خزاں کا سامنا کر رہی تھی۔ اندلس بیس چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ غرناطہ اور اس کے قرب وجوار میں بنی زیری، سرقسطہ اور لاردہ پر بنو ہود طلیطلہ پر بنو ذالنون، اشبیلیہ پر بنو عباد، قرطبہ پر بنی جہور، المریہ پر بنی صمادح، بطیوس پر بنی افطس، شلب پر بنی مزین، سہلہ پر بنی ازین، ولبہ پر بنی بکر، قرمونہ پر بنی رزال اور مالقہ پر بنی حمود قبضہ جما چکے تھے۔ ان حکمرانوں کے درباروں میں مفکروں، سیاستدانوں کی جگہ مسخروں اور شاعروں نے لے لی تھی۔ قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ کے اسلحہ خانوں میں اسلحہ کے بجائے اب موسیقی کے آلات بنائے جاتے تھے۔ قسطلہ کا حکمران فرڈیننڈ اول مسلمان امراء کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر

کئی علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر چکا تھا۔ اشبیلیہ کے عبادی حکمران معتضد نے اپنی طاقت میں اضافہ کرلیا تھا اور کئی سلطنتیں اشبیلیہ میں شامل کرلی تھیں۔ معتضد نے غرناطہ کے بربری حکمران بادیس کے چند شہر اس سے چھین لیے باقی ملوک الطوائف نے اس کی ہوس سے بچنے کے لئے قسطلہ کے عیسائی حکمران کو اپنا سرپرست اور محافظ بنالیا اور اس نے بھی موقع دیکھ کر بہت سے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔ اس کی موت کے بعد الفانسو ششم تخت نشیں ہوا۔ معتضد کی موت کے بعد اس کا بیٹا تخت نشیں ہوا اور اس نے اپنے لیے معتمد باللہ کا لقب پسند کیا۔ معتمد ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ ابن عمار کی رفاقت نے اسے اور زیادہ عیش پسند بنا دیا اور رمیک کی لونڈی اعتماد رمیکیہ کہلاتی تھی۔ اس سے شادی کے بعد عیش ونشاط اوج کمال تک پہنچ چکا تھا۔ اشبیلیہ کا حکمران معتمد اور طلیطلہ کا حکمران مامون قرطبہ پر اپنا حق سمجھتے تھے۔ لہٰذا وہ قرطبہ کی سرحدوں پر اپنی افواج جمع کر رہے تھے لیکن اس ڈر سے حملہ نہیں کر رہے تھے کہ اگر ایک نے حملہ کیا تو دوسرا فرد اہلِ قرطبہ کا طرفدار بن جائے گا لیکن مامون نے قسطلہ کے حکمران الفانسو سے معاہدہ کر کے حملہ کر دیا۔ قرطبہ پر عبدالملک تخت نشین تھا۔ اہلِ قرطبہ اس گئی گذری حالت میں بھی الفانسو کے باجگزار کی غلامی قبول نہیں کرنا چاہتے تھے۔ قرطبہ کے تحفظ کے لئے لوگ قرطبہ کے گوشوں سے نکل آئے اور انہوں نے یہ نعرہ بلند کیا کہ قرطبہ ہمارا ہے۔ عبدالمنعم نے عوام میں ایک رہنما کی سے حیثیت بنائی تھی۔ عبدالملک کی فوج نے قرطبہ سے پیش قدمی کر کے مامون کی فوج کو سرحد پر روکنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے۔ مامون کے لشکر نے قرطبہ کو تین اطراف سے گھیر لیا اور وہ الفانسو کی مدد کا انتظار کرنے لگا لیکن الفانسو نے اپنی فوج نہ بھیجی۔ معتمد کو یہ خبر ملی کہ بطلیوس کا حاکم اہلِ قرطبہ کی مدد کو پہنچ چکا ہے تو اس نے بھی ابنِ عمار اور اپنے بیٹے عماد کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا ان کی آمد سے ناراض ہو کر بطلیوس کا حاکم اپنا لشکر لے کر واپس چلا گیا۔ ایک دن قرطبہ اور اشبیلیہ کے سپاہیوں نے شہر کے دروازے کھول کر دشمن پر حملہ کیا اور دوپہر تک مامون کی فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سپاہی دشمن کے تعاقب میں تھے کہ انہیں احساس ہوا کہ ان کے ساتھ اشبیلیہ کا لشکر نہیں ہے۔ عبدالملک سپاہیوں کے ساتھ قرطبہ کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ شہر کے اندر داخل ہونے پر عبدالملک کو روکا جاتا ہے اور اس کے بعد اسے قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ سپاہی جو مامون کے تعاقب میں گئے تھے اور عبدالملک ان کو چھوڑ کر قرطبہ کے حالات دیکھنے آیا تھا واپس آتے ہیں تو انہیں قرطبہ کی عمارات پر معتمد کے جھنڈے نظر آتے ہیں۔ عبدالمنعم جب اپنے گھر واپس آتا ہے تو دروازے پر شہر کا نیا کوتوال اور اشبیلیہ کی فوج کے سپاہی اسے قصرِ زہرا میں لے جانے کے لئے آتے ہیں۔ عبدالمنعم اپنی بیوی کو غرناطہ جانے کی ہدایت کرتا ہے اور خود ان سپاہیوں کے ساتھ قصرِ زہرہ جاتا ہے جہاں عباد، معتمد کے گورنر کی حیثیت سے مسند حکومت پر رونق افروز تھا۔ عبدالمنعم، عباد کے ساتھ وفاداری اور اس کی حکومت کو قبول نہیں کرتا نتیجتاً قید خانہ اس کا مقدر بنتا ہے۔ سعد، سکینہ کو بتاتا ہے کہ عبدالمنعم قید ہو چکا ہے ادریس کے باپ عبدالجبار کا انتقال ہو جاتا ہے اور یہ لوگ الماس کو قرطبہ میں چھوڑ کر غرناطہ کا رخ کرتے ہیں۔ غرناطہ میں عبدالمنعم کی بیوی نے ایک مکان خرید لیا تھا الماس ان کو ہر سال زمین اور باغات کی آمدنی کا حساب دیتا تھا۔ قرطبہ کے قید خانے میں عبدالمنعم سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ سعد، احمد اور حسن غرناطہ کے نوعمر لڑکوں میں تیر اندازی اور شہسواری میں باعث

رشک تھے۔ ادھر قرطبہ میں اب لوگوں کے دلوں میں معتمد کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا ہو رہے تھے اور ابن عکاشہ ان کا رہنما بن گیا۔ بغاوت کے نتیجے میں معتمد کا بیٹا قتل کر دیا گیا۔ سعد جب یہ خبر سنتا ہے تو قرطبہ کا رخ کرتا ہے۔ قرطبہ کے دروازے پر ابن عکاشہ کے آدمیوں نے ناکہ بندی کی ہوئی تھی وہاں سعد کو ادریس ملتا ہے اور وہ اسے بتاتا ہے کہ اسے پتا چل گیا تھا اس بغاوت کی تمام بات اس کو عبدالرحمان نے بتائی تھی۔ عبدالرحمان کو ابنِ عکاشہ کے لوگوں نے قتل کر دیا تھا۔ ادریس اشبیلیہ جاتا ہے۔ جب تک وہ معتمد تک رسائی حاصل کرتا ہے عباد قتل ہو چکا ہوتا ہے۔ ادریس کی جگہ اس کی ماں اور بہن کی خیریت پتا کرنے کے لئے سعد ایک لکڑ ہارے کا بھیس بدل کر جاتا ہے۔ الماس کی مدد سے سعد، ادریس کی ماں اور بہن کو نکال کر لاتا ہے اور الماس کے ساتھ واپس قرطبہ آتا ہے جبکہ ادریس اشبیلیہ کا رخ کرتا ہے۔ قرطبہ پر مامون کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ عبدالمنعم، مامون کی بیعت سے انکار کر دیتا ہے تو اس کو طلیطلہ میں منتقل کر دیا جاتا ہے اور قتل کی افواہ پھیلا دی جاتی ہے اور اس کے اہل خانہ کو قرطبہ واپس آنے کا حکم دیا جاتا ہے لیکن سعد واپس غرناطہ کا رخ کرتا ہے۔ غرناطہ واپس آنے کے بعد سعد قاضی ابوجعفر کے مشورے سے ایک مکتب میں معلم کے فرائض انجام دینے لگا۔ مامون چھ ماہ زندہ رہ کر مر گیا۔ الماس غرناطہ آ گیا کیونکہ عکاشہ نے ان کی جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ معتمد نے دوبارہ قرطبہ پر قبضہ کیا تو ابن عکاشہ مارا گیا قرطبہ کے نئے گورنر نے ان کی جائیداد واپس کر دی۔ ابن عمار نے مرسیہ کو فتح کر لیا معتمد کی کامیابیوں کو دیکھ کر الفانسو نے خراج بڑھا دیا۔ معتمد نے انکار کر دیا تو اس نے حملہ کر دیا۔ بیغہ کے قاضی ابوالولید کی تحریک کے زیر اثر غرناطہ سے رضا کار جنگ لڑنے کے لئے گئے لیکن ان کو ایک عجیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ابنِ عمار نے شرط رکھ کر شطرنج کھیلی اور الفانسو کی ہار کی صورت میں اس کو بغیر جنگ کے واپس بھیج دیا۔ سعد، احمد، حسن اور الیاس اشبیلیہ کا رخ کرتے ہیں۔ ادریس دارالغرب میں ہوتا ہے اس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ میمونہ اپنی دوستوں کے ساتھ شاہی محل جاتی ہے تو رشید اسے پسند کرتا ہے اور شادی کی خواہش ظاہر کرتا ہے جس سے میمونہ اور ادریس دونوں انکار کرتے ہیں۔ سعد، ادریس کے پاس آتا ہے اور اس کو ساری تفصیل اپنے آنے کی بیان کرتا ہے اس کے بعد وہ محل کے ناظم سے ملتا ہے لیکن ابنِ عمار کے آنے کی وجہ سے جشن منایا جاتا ہے اور سعد کو سلطان معتمد سے ملنے کا موقع نہیں ملتا۔ وہیں سعد کو زیاد بھی نظر آتا ہے جو اب ایک کوتوال کی حیثیت میں تھا۔ احمد رمیکیہ کا قصیدہ لکھ کر سعد کے نام سے بھیج دیتا ہے شاہی محل سے اُس کا بلاوا آتا ہے تو سعد احمد اور حسین کو ادریس کے ہاں جانے اور اپنے باقی ساتھیوں کو شہر سے کچھ دور قیام کرنے کی رائے دیتا ہے۔ وزیر خزانہ الفانسو کے پاس خراج کی رقم بھیجتا ہے تو زیاد، رشید سے کہتا ہے کہ ادریس کو اس کے ساتھ بھیج کر میمونہ کو اغوا کیا جا سکتا ہے۔ رشید اس کی بات پر راضی ہو جاتا ہے۔ سعد شاہی محل میں جانے کے بعد قصیدہ سنانے کے بجائے تقریر کرتا ہے۔ اس کی تقریر سن کر بادشاہ کو غصہ آتا ہے۔ سپاہی اس کو پکڑ کے لے جانے لگتے ہیں تو وہ فرار ہوتا ہے۔ محل میں بھگدڑ کی کیفیت کے دوران فصیل سے دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہے اور ادریس کے گھر پہنچتا ہے وہاں سے وہ احمد کو واپس الیاس کے پاس اور غرناطہ کی طرف روانہ کرتا ہے۔ احمد جانے سے پہلے ابنِ عمار اور معتمد کی ہجو لکھتا ہے۔ سعد کے زخم دکھانے کے لئے میمونہ طبیب کو بلواتی ہے تو انہیں احمد کی ہجو مدرسے کے

دروازے پر لگانے کا قصہ معلوم ہوتا ہے اور یہ پتا چلتا ہے کہ وہ لوگ اشبیلیہ کی سرحد پار کر چکے ہیں۔ زیاد کی بہن زیاد کا خط لے کر میمونہ کے پاس آتی ہے جس میں وہ یہ دھمکی دیتا ہے کہ اگر وہ زیاد کے ساتھ جانے پر راضی نہ ہوئی تو ادریس کا مقدر قید خانہ ہوگا۔ سعد، زیاد اور اس کے ساتھیوں کو میمونہ کے گھر میں بند کر کے وہاں سے روانہ ہوتا ہے۔ لوشہ میں ان لوگوں کو چھوڑ کر خود طلیطلہ کا رخ کرتا ہے۔ حسن، میمونہ کو لے کر غرناطہ آتا ہے اور اپنے گھر والوں کو بتاتا ہے کہ سعد لوشہ سے طلیطلہ گیا ہے۔ میمونہ کو ابو صالح اپنی بیٹی بنا لیتا ہے ادریس واپس آ کر بتاتا ہے کہ سعد بیغہ گیا ہے۔ بیغہ میں ابوالولید کے گھر کے سامنے ایک اجلاس ہو رہا تھا۔ اس میں دو سو علما اندلس کے مختلف مقامات سے جمع ہوئے تھے غرناطہ کا قاضی ابو جعفر اس جلسے کا صدر تھا۔ ابوالولید کی تجویز تھی کہ علما کا ایک وفد اندلس کے حکمرانوں کے پاس جائے اور ان سے متحد اور منظم ہونے کے لیے کہے لیکن سعد اس بات سے اختلاف کرتا ہے لیکن ایک وفد تیار ہوتا ہے حکمرانوں کے پاس جانے کے لئے اور محفل برخواست ہو جاتی ہے۔ ابو جعفر سعد کو یوسف بن تاشفین کے بارے میں بتاتا ہے کہ مرابطین کے امیر یوسف بن تاشفین نے الجزائر سے طنجہ تک تمام بربری قبائل کو متحد کرنے کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ وہ سعد سے کہتے ہیں کہ مراکش جاؤ۔ یوسف بن تاشفین تک رسائی حاصل کرو۔ اگر کامیابی کی کوئی امید نظر نہ آئے تو واپس چلے آؤ لیکن اگر یہ دیکھو کہ وہاں چند مہینے یا برس رہ کر یوسف بن تاشفین کو مسلمانانِ اندلس کی مدد کے لئے آمادہ کر سکتے ہو تو وہیں رہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم کسی دن اندلس کے نجات دہندہ بن کر آؤ گے۔ غرناطہ آ کر سعد اپنے گھر والوں کو مراکش جانے کے بارے میں بتاتا ہے۔ شہر کے ناظم کے جاسوس سعد کی تقریر کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں جس پر وہ سعد کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں لیکن اس سے پہلے ہی سعد سبتہ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ سعد اور میمونہ ایک دوسرے کی الفت کے رشتوں میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ جب قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ کی عظیم الشان درس گاہوں کے معلم قوم کے مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے افریقہ کے صحرانشینوں کے جھونپڑوں میں زندگی کے نئے ولولے کروٹیں لے رہے تھے۔ پانچویں صدی میں اسلام کے کسی گمنام مبلغ کی کوششوں سے افریقہ کے بربریوں میں سے ایک قبیلے کے لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے مرابطین کے نام سے سلطنت کی بنیاد رکھی جس کا امیر ابوبکر بن عمر تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا یوسف بن تاشفین امیر ہوا اور اس کا چچا زاد بھائی سیر بن ابوبکر اس کا سب سے بڑا معاون تھا۔ امیر یوسف نے بہت سے ایسے مقامات اور علاقے فتح کیے تھے جہاں اس سے پہلے کوئی مسلمان نہ پہنچا تھا۔ سبتہ پہنچ کر سعد کو معلوم ہوا کہ امیر یوسف جنوب مغرب میں برسرپیکار ہیں۔ الیاس کا نوکر الیاس اور حسن کا خط لے کر آتا ہے۔ سعد اس کے ہاتھ خط کا جواب بھیجتا ہے اور طنجہ کی طرف روانہ ہوتا ہے وہاں سے وہ سبتہ واپس آ کر الجزائر ایک جہاز میں جاتا ہے۔ جہاز جب ساحل پر پہنچتا ہے تو خطرہ دیکھ کر واپس جانے لگتا ہے سعد وہیں ساحل پر اتر جاتا ہے۔ کچھ قزاقوں نے قلعے پر اور بحری جہازوں پر حملہ کر دیا تھا سعد کی ملاقات ایک زخمی سے ہوتی ہے وہ اس کے ساتھ صحراؤں کا سفر کرتا ہوا امیر یوسف تک پہنچتا ہے یہ زخمی سیر بن ابوبکر تھا۔ امیر یوسف تمام روداد سن کر حملہ کرتا ہے قلعے پر سعد اس کے ساتھ جاتا ہے یہ لوگ کامیاب لوٹتے ہیں سعد اپنے آنے کا مقصد بیان کرتا ہے جس پر امیر یوسف کسی یقین دہانی سے معذوری ظاہر

کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اندلس کے علما اور تم جیسے نو جوانوں نے مجھ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لی ہیں فی الوقت میرا طویل کام افریقہ میں ہے اس کے بعد وقت آنے پر میں اندلس کے مسلمانوں کی مدد کرنے پر غور کروں گا کچھ عرصے بعد میمونہ کا خط آتا ہے جس میں اس نے حسن اور احمد کے بارے میں لکھا کہ وہ سرقسطہ اور طلیطلہ گئے ہوئے ہیں جبکہ ادریس تجارتی مصروفیات کے پیش نظر مالقہ میں ہے۔ ابو صالح نے اپنے خط میں لکھا کہ ابن عمار، معتمد کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔ اہل طلیطلہ حکمران یحییٰ سے سخت نالاں ہیں الفانسو کی افواج سرقسطہ، بلنسیہ اور اشبیلیہ کی سرحدوں پر جمع ہو رہی ہیں اور عوام کی امید مرابطین کے مسلمانوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ سعد افریقہ کے قیام کے دوران اپنے آپ کو ایک بہترین سپاہی اور ایک کامیاب مبلغ ثابت کر رہا تھا۔ ابن عمار نے مرسیہ میں نائب السلطنت کی حیثیت سے انتظامات سنبھالے، ابنِ طاہر کو قید کیا اور معتمد کے کہنے سے بھی نہ چھوڑا اور ایک ہجو معتمد کی لکھی جو بالآخر اس کے قتل کا باعث بنی۔ معتمد نے اسے خود موت کے گھاٹ اتارا۔ طلیطلہ میں یحییٰ مسند نشین تھا جو ایک پست ہمت جوان تھا۔ الفانسو ہر سال خراج کی رقم بڑھاتا اور یحییٰ عوام پر ٹیکس بڑھا دیتا جب عوام ٹیکس نہ دے پاتے تو انہیں قید کر دیا جاتا جب اس کا طلیطلہ کا قید خانہ بھر گیا تو پرانے قیدیوں کو سرحد کے ایک قید خانے میں ڈال دیا عبدالمنعم بھی انہی قیدیوں میں تھا۔ حریت پسندوں کی سرکوبی کے لئے یحییٰ نے الفانسو سے مدد مانگی اور اس نے اپنی فوج کے چند دستے بھیج دیے۔ احمد بن عبدالمنعم ابو جعفر کے کہنے پر طلیطلہ روانہ ہوتا ہے ابو جعفر نے ابو یعقوب کے نام ایک تعارفی خط دیا تھا احمد طلیطلہ پہنچتا ہے تو اس کا گھوڑا سپاہی چھین کر لے جاتے ہیں وہ مسجد میں ایک آدمی سے ابو یعقوب کا گھر پوچھ کر ان کے گھر پہنچتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ ابو یعقوب گرفتار ہو چکے ہیں۔ احمد، ابو یعقوب کی بیٹی طاہرہ اور نوکر علی کے ساتھ عبدالواحد کے پاس جانے کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ راستے میں قسطلہ کے سپاہی ان پر حملہ کرتے ہیں علی شہید ہو جاتا ہے یہ دونوں عبدالواحد کے پاس پہنچتے ہیں تو بتاتے ہیں کہ اہل طلیطلہ نے بغاوت کر دی ہے اور قسطلہ کے سپاہیوں پر حملہ کر دیا ہے۔ یہ لوگ فوراً حملے کے لئے تیار ہوتے ہیں اور قسطلہ کے سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں لیکن یحییٰ الفانسو کے کچھ سپاہیوں کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ابو یعقوب احمد سے کہتے ہیں کہ کچھ لوگ عمر المتوکل کی مدد لینا چاہتے ہیں اور کچھ اس بات سے انکاری ہیں وہ اسے اپنے ساتھ شاہی ایوان میں اکابر کے اجلاس میں لے کر جاتے ہیں۔ سرحدی قلعوں کے محافظوں کو یحییٰ نے خط لکھا کہ بغیر کسی پس و پیش کے قسطلہ کے سپاہیوں کو قلعہ سپرد کر دو وہ سرحدی قلعہ جس میں عبدالمنعم اور باقی قیدی قید تھے انہوں نے ہتھیار ڈالنے کے بجائے ہتھیار اٹھانے کو بہتر جانا۔ احمد ان کی مدد کے لئے پہنچتا ہے ابو یعقوب احمد سے طاہرہ کے ساتھ شادی کی بات کرتے ہیں وہ رضامندی ظاہر کرتا ہے۔ قلعہ فتح کرنے کے بعد احمد کو پتا چلتا ہے کہ اس کا باپ بھی وہاں ہے وہ اپنی ساری سرگزشت اپنے باپ کو سناتا ہے۔ عبدالمنعم غرناطہ روانہ ہوتا ہے اور احمد طلیطلہ۔ غرناطہ سے عبدالمنعم مرسیہ ابو جعفر کے ساتھ روانہ ہو جاتا ہے احمد کی طاہرہ سے شادی ہو جاتی ہے۔ احمد ایک مہم پر جاتا ہے واپس آتا ہے تو یہ پتا چلتا ہے کہ الفانسو کے جرنیل نے شمال مشرقی سرحد سے حملہ کیا اور ابو یعقوب اس میں مارے گئے۔ اب الفانسو کی توجہ اشبیلیہ کی طرف ہو گئی تھی۔ اہل طلیطلہ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے کئی علاقے نصرانیوں سے چھین

لیے۔ الفانسو نے ایک دفعہ پھر طلیطلہ کی طرف پیش قدمی کی اور اس کے بعد اس نے بطلیوس کا رخ کیا جس کی وجہ سے عمر المتوکل اپنی فوج کے ساتھ روانہ ہو گیا اور اہلِ طلیطلہ مایوس ہو گئے حریت پسند طلیطلہ چھوڑ رہے تھے کیونکہ بہت سے لوگوں نے در پردہ یحییٰ کی بیعت کر لی تھی۔ عبدالواحد اشبیلیہ کا رخ کرتا ہے اور احمد طاہرہ کے ساتھ غرناطہ روانہ ہو جاتا ہے۔

الفانسو نے ایک بھاری خراج کے وعدے پر یحییٰ کی مدد کی تھی طلیطلہ پر یحییٰ کے رونق افروز ہوتے ہی الفانسو نے خراج بڑھانا شروع کیا اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ طلیطلہ یحییٰ کو الفانسو کے حوالے کرنا پڑا الفانسو نے یحییٰ کو بلنسیہ پر حکومت دلا دی لیکن یہاں بھی برائے نام یحییٰ کی حکومت تھی۔ الفانسو کے سپہ سالار ذمی نے جنوب میں حصن الملیط پر قبضہ کر لیا مسلمانوں کی تمام ریاستیں خطرے میں پڑ چکی تھیں۔ ذمی نیز کا نائب غرناطہ کے قرب وجوار میں پہنچ چکا تھا۔ سرسیہ میں ابن رشق کی حکومت تھی اور مرسیہ اور المریہ کی سرحدوں پر نصرانیوں کی لوٹ مار شروع ہو چکی تھی۔ ایک دن سرحد پر المریہ کی فوج کے ساتھ عیسائی فوج کا زبردست معرکہ ہوا المریہ کی فوج شکست کے نزدیک تھی کہ مرسیہ سے رضاکاروں کا ایک دستہ پہنچ گیا ان میں حسن بن عبدالمنعم بھی شامل تھا وہ سرقسطہ سے بلنسیہ کی فوج میں شامل ہو گیا تھا لیکن بلنسیہ کا حکمران نصرانیوں کے ہاتھ کا کھلونا تھا اس لیے انہیں وہ ملازمت چھوڑنی پڑی۔ حسن اب المریہ کی فوج میں شامل تھا اور معتصم بھی اس سے بہت خوش تھا۔ ایک رات غرناطہ کی طرف جانے والے نصرانی سواروں کو انہوں نے گھیر لیا اور ان کو پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں حسن کی ملاقات احمد سے ہوئی اور احمد نے اس کو عبدالمنعم سے ملوایا۔ احمد نے حسن کو بتایا کہ سعد دو ماہ پہلے آیا تھا اور اس کے کہنے کے مطابق امیر یوسف کی توجہ اب اندلس کے مسلمانوں کی جانب ہے۔ معتمد کے محل میں ایک اجلاس ہوا اور اس میں یہ طے پایا کہ امیر یوسف حکومت کے انتظامات میں نہیں پڑیں گے اور پھر ایک طویل خط لکھ کر اس پر اندلس کے علما اور تمام ریاستوں کے تخت نشینوں کے دستخط کرائے گئے اگلے دن چند چیدہ چیدہ نمائندگانِ حکومت اور علما کا وفد مراکش کی طرف روانہ ہوا۔ ان لوگوں کے ساتھ قاضی ابوجعفر بھی مراکش گئے اور یہ لوگ امیر یوسف کے طور طریقے دیکھ کر حیران رہ گئے اور ان میں سے کچھ لوگ یہ سوچنے لگے کہ الفانسو سے جنگ کے بعد اگر امیر یوسف حکومت کرنے لگا تو ان کا طرزِ زندگی بدل جائے گا۔ امیر یوسف نے معتمد کے وزیر سے کہا کہ وہ جبل الطارق کے بجائے جزیرۃ الخضرا پر اتریں گے۔ معتمد کے وزیر کو اس رائے سے اختلاف تھا کیونکہ اسے اس فیصلے کی اجازت نہ تھی۔ علما اور مفتیِ اعظم کے مشورے پر امیر یوسف نے اندلس میں اپنی مرضی کے مطابق فوجیں اتارنے کا فیصلہ کیا۔ جزیرۃ الخضرا پر معتمد کا بیٹا راضی تخت نشین تھا۔ سعد نے ایلچی کی حیثیت میں پہنچ کر اس کو امیر یوسف کے لشکر کے آنے کی اطلاع دی اور جو لوگ ان کے محل پر حملہ کرنے جا رہے تھے ان کو اس اقدام سے روکا اور خود غرناطہ کا رخ کیا۔ اسی دوران سعد کی شادی میمونہ کے ساتھ ہو گئی اور وہ امیر یوسف کے استقبال کے لیے جزیرۃ الخضرا پر میمونہ کو بھی لے آیا۔ امیر یوسف کے بیٹے کی طبعیت خراب تھی اور سمندر میں بھی طوفان کی کیفیت تھی لیکن امیر یوسف نے سفر کا ارادہ ملتوی نہ کیا دس دن جزیرۃ الخضرا پر رہنے کے بعد امیر یوسف کے لشکر نے اشبیلیہ کا رخ کیا سعد بھی ان کے ساتھ روانہ ہوا اور میمونہ اور الماس غرناطہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اشبیلیہ کے محل کو امیر یوسف کے لیے سجایا

گیا تھا لیکن امیر نے اپنے لشکر کے ساتھ میدان میں پڑاؤ ڈالا الفانسو نے سرقسطہ کا محاصرہ کر رکھا تھا امیر یوسف نے الفانسو کو خط میں لکھا کہ یا تو وہ مسلمان ہو جائے یا جزیہ ادا کرے یا جنگ پر آمادہ ہو جائے۔ الفانسو اپنی طاقت کے نشے میں چور تھا اور اس نے جنگ کو بہتر جانا وہ یہ سمجھتا تھا کہ جنگ جیت کر وہ بحیرہ روم کے ساحل تک قابض ہو سکتا ہے اس کے ساتھ جلیقیہ، اچوریا، لیون، ارغوان اور النوار کے حکمرانوں کے علاوہ فرانس اور اطالیہ کے کئی امراء بھی شامل تھے جبکہ امیر یوسف کے ساتھ بطلیوس، اشبیلیہ، مالقہ، غرناطہ، المریہ، مرسیہ، حصن اللیط کے امراء شامل تھے۔ امیر یوسف کی فوج کے آگے الفانسو کی فوج تین گنا زیادہ تھی۔ زرلاقہ کے مقام پر جنگ کی ابتدا ہوئی۔ پہلے حملے میں امیر یوسف کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن آخر کار انہیں ہی فتح حاصل ہوئی اور الفانسو کی فوج جو کافی بڑی تعداد میں تھی اس میں سے اس کے صرف پانچ سو ساتھی باقی رہ گئے تھے۔ جنگ کے خاتمے پر امیر یوسف اشبیلیہ کی طرف روانہ ہوا راستے میں لوگ پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے ایک جم غفیر اس کے اردگرد جمع ہو گیا۔ پولیس نے مداخلت کرنا چاہی تو امیر یوسف نے انہیں ایسا کرنے سے باز رکھا جب یہ کارواں اشبیلیہ کی بڑی مسجد پر پہنچا تو امیر یوسف نے مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر تقریر کی جس میں اہلِ اندلس کو اللہ اور اس کے رسول کے احکامات یاد دلائے۔ عبدالمنعم نے فریاد کی کہ آپ نصرانیوں کے خطرے سے نجات دلا کر تو جا رہے ہیں مگر ان حکمرانوں کو ہم پر یونہی مسلط چھوڑ رہے ہیں۔ امیر یوسف کچھ عرصے تک اشبیلیہ میں مقیم رہا اور ملوک الطوائف کی منافقت کو محسوس کرتا رہا مگر اپنے وعدے کا پاس کرتے ہوئے کہ وہ اندلس کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا مجبوراً خاموش رہا۔ جب اسے اپنے بیٹے کی موت کی خبر ملی جسے وہ سبتہ میں بیمار چھوڑ کر آیا تھا تو اس نے واپسی کا سفر شروع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور سعد سے یہ کہہ کر روانہ ہوا کہ وہ دوبارہ اپنی شرائط کے ساتھ واپس آئے گا۔ عبدالمنعم اپنے بیٹوں کے ساتھ گھر پہنچا تو گھر والوں نے قرطبہ جانے کے بارے میں پوچھا تو عبدالمنعم نے کہا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ امیر یوسف کی واپسی کے بعد اندلس میں اقتدار کی جنگ ایک نئی شدت کے ساتھ شروع ہو چکی تھی۔ حصن اللیط پر ابھی تک الفانسو کا قبضہ تھا۔ جنوب مشرقی اندلس میں مسلمان بری طرح پس رہے تھے۔ معتمد اپنی فوج لیکر نکلا تو وہ لوگ سمجھے شاید معتمد ان کی مدد کے لئے آ رہا ہے لیکن معتمد کا رخ لورقہ کی طرف تھا۔ حصن اللیط کے چند دستوں نے اس کو شکست دی۔ جنوب مشرقی اندلس کے اکابر کا وفد امیر یوسف کے پاس گیا ان کے بعد معتمد بھی امیر یوسف کے پاس گیا اور اس نے جلد آنے کی حامی بھر لی۔ امیر یوسف کے آنے کے بعد حصن اللیط پر حملہ کیا گیا لیکن ملوک الطوائف کی غداری کی وجہ سے شکست کا سامنا کرنا پڑا تمام امراء نے دوبارہ عہد کیا کہ وہ ایسی حرکت نہیں کریں گے اور واپس چلے گئے۔ ابو جعفر جب غرناطہ گئے تو ان کو قید کر لیا گیا۔ سعد حصن اللیط سے تھوڑی دور ایک چھوٹے قلعے کی حفاظت پر مامور تھا اور میمونہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ ابو جعفر جب قید سے رہا ہوا تو اس نے امیر یوسف کو کہا کہ اب وہ اندلس کے مسلمانوں کو دوبارہ ان امرا کے حوالے کر کے نہ جائے۔ اندلس کے تقریباً تمام حکمرانوں نے غداری اور الفانسو سے صلح کرنا چاہی سعد نے ان لوگوں کو پکڑ لیا جو صلح کا خط لے کر جا رہے تھے ان میں سے ایک زیاد تھا جبکہ شہزادہ رشید فرار ہو چکا تھا۔ سعد نے ایک آدمی کو امیر یوسف کے پاس بھیجا اور سعد اور صدیق بھی

روانہ ہوئے لیکن راستے میں وہ دشمنوں کے گھیرے میں آ گئے جب تک قلعے کے دوسرے سپاہی پہنچے صدیق اور سعد کافی زخمی ہو چکے تھے لیکن ان کو اس حملے میں شکست کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ دوسری طرف حصن اللیط میں امیر یوسف کو ملوک الطوائف کی غداری کے باوجود بھی کامیابی حاصل ہوئی۔ عبدالمنعم، الیاس، حسن اور ادریس اس حملے میں شہید ہو گئے امیر یوسف کو الفانسو کے اگلے حملے کا پتا چل چکا تھا لہٰذا وہ اپنی فوج کے ساتھ روانہ ہوا اور الفانسو کی فوج نے بغیر لڑائی کے ہی پسپائی اختیار کی۔ ملوک الطوائف کے تمام امراء کے لئے اب یومِ حساب شروع ہو چکا تھا امیر یوسف افریقہ کے حالات کی وجہ سے واپس چلے گئے اور اپنی جگہ سیر بن ابو بکر کو اپنا نائب بنا کر گئے۔ سیر بن ابو بکر نے تمام امراء کی حکومتیں ختم کر کے اسلامی آئین قائم کیا۔ اس موقع پر معتمد اس کی ملکہ رمیکیہ اور خاندان کے دیگر افراد کو ایک بحری جہاز میں مراکش روانہ کیا گیا یہ منظر انتہائی صبر آزما تھا۔ سعد اس موقع پر انتظامات کو دیکھ رہا تھا جہاز روانہ ہوا تو ملکہ حسرت بھری نگاہوں سے محل کو دیکھتی رہی۔ سیر بن ابو بکر نے اس کے بعد اور بہت سے ایسے علاقے فتح کیے جہاں کے عوام ابھی تک ان کا رستہ دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک قرطبہ بھی تھا احمد، الماس اور ان کے ساتھ باقی گھر والوں نے قرطبہ کا رخ کیا جبکہ سعد مریہ کی ایک مہم پر روانہ ہوا۔ وہاں سے اس نے سیر بن ابو بکر کو لکھا کہ سرحد پر دفاعی چوکیاں قائم ہو چکی ہیں لیکن قسطیطور کے اقتدار کا جب تک خاتمہ نہ ہوگا خطرہ کم نہیں ہوگا کیونکہ بلنسیہ اور سرقسطہ عیسائیوں کا مستقر بن چکا ہے۔ سیر بن ابو بکر نے سعد کو قرطبہ سے بلوا لیا اور اس کی جگہ ابن ماج کو بھیج دیا۔ سعد کو قرطبہ کا گورنر اور احمد کو المریہ کا گورنر بنا دیا گیا۔ عوام نے سیر بن ابو بکر کا یہ اعلان نہایت مسرت کے ساتھ سنا۔

یوسف بن تاشفین کا ''تحقیقی جائزہ''

واقعات کا آغاز عبدالمنعم کے گھرانے سے ہوتا ہے۔ جس کے تین بیٹے اپنے گھریلو ملازم کے ہمراہ مدینۃ الزہرہ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی چند دیگر کردار بھی متعارف ہوتے ہیں بظاہر یہ ناول نگار کے تخیلاتی کردار ہیں جو معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے اس دور کے رسم و رواج اور عادات واطوار سے اس عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ناول میں تاریخی کردار بھی ہیں جن میں معتضد، معتمد، ابن عمار، فرڈیننڈ، بادیس، مظفر، الفانسو، عمر المتوکل، ابن عکاشہ، عالم قاضی ابوالولید، ابن طاہر، یحییٰ القادر، قاضی ابوجعفر، امیر یوسف بن تاشفین، سیر بن ابوبکر، رمیکیہ اور راضی شامل ہیں۔ چونکہ ناول تخیلاتی اور تاریخی کرداروں کا حسین امتزاج ہے۔ اس لیے جہاں جس کردار کا تذکرہ آئے گا ہم بیان کریں گے۔ جغرافیائی اعتبار سے بہت سے مقامات بر سبیل تذکرہ آئیں گے ہم انہیں بھی مورخین کے بیان کردہ اصولوں پر پرکھتے ہوئے قارئین کے لیے پیش کریں گے۔ ناول نگار نے اشبیلیہ کے حکمران معتضد کے عادات واطوار کا تذکرہ کرتے ہوئے صفحہ نمبر ۳۴ پر نقل کیا ہے کہ انتہائی منتقم المزاج انسان رندہ میں قیام کے دوران بربر سرداروں نے اسے قتل کرنے کی سازش کی تھی جسے ایک شخص نے رکوا دیا۔ جب معتضد کو اس کا علم ہوا تو اس نے ان سرداروں کو ایک ضیافت پر مدعو کیا۔ دعوت سے قبل حمام میں بھیجا جہاں ہوا کے تمام راستے بند ہو گئے اور حمام اس قدر گرم ہوا کہ یہ سب تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ سوائے اس شخص کے جس نے معتضد کی جان بچانے میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ اس واقعہ کا تذکرہ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی نے ان الفاظ میں رقم کیا ہے:

''معتضد نے بڑے اہتمام سے ان کا استقبال کیا اور حسبِ دستور ان رئیسوں اور ان کے درباریوں کو حمام کرنے بھیجا، مگر کسی ترکیب سے معاذ کو حمام نہ جانے دیا۔

تقریباً ساٹھ بربر اس حمام پر جسے معتضد نے بتایا تھا پہنچے، برابر کے کمرے میں کپڑے اتار کر اندر کے درجے میں غسل کے لیے داخل ہوئے، اسلامی ملکوں کے حمام میں غسل کا کمرہ اور اس کی دیواروں اور فرش سب سنگ مرمر کا ہوتا ہے اور چھت کی جگہ ایک قبہ ہوتا ہے جس میں کھڑکیاں اور کھڑکیوں میں شیشے لگے ہوتے ہیں۔ غسل کے لئے حوض بھی سنگ مرمر کے ہوتے ہیں اور دیواروں کے اندر نل نیچے کے آتش دان سے گرم ہوا کھینچ کر تمام کمرے کو بہت گرم رکھتے ہیں۔

بربر غسل کی راحتوں سے لطف اٹھا رہے تھے کہ کسی نے کچھ ایسی آواز سنی جیسے کہیں دور معمار کام کر رہے ہوں مگر کسی نے اس کا کچھ خیال نہ کیا تھوڑی دیر میں حمام اتنا گرم ہو گیا کہ برداشت کے قابل نہ رہا۔ لوگوں نے چاہا کہ کواڑ کھول کر باہر نکلیں کواڑ کھولے تو دیکھتے کیا ہیں کہ دروازے میں تیغا لگا ہوا ہے اور تمام روزن جہاں سے ہوا آ سکتی تھی، بند کر دیے گئے ہیں، غرض ان میں سے ایک شخص بھی باہر نہ نکل سکا اور سب اسی حال میں دم گھٹ کر مر گئے۔

معاذ دیر تک اپنے ساتھیوں کا انتظار کرتا رہا جب وقت زیادہ گذر گیا اور کوئی نہ آیا تو اس نے معتضد سے اس دیر کی وجہ دریافت کی، معتضد نے صاف صاف کل واقعہ بیان کر دیا۔''[1]

---

[1] عبرت نامۂ اندلس: پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی / مولوی عنایت اللہ دہلوی، ص ۱۰۱۶، ۱۰۱۹۔

اس واقعہ کی تفصیل ڈاکٹر نصیر احمد ناصر یوں تحریر کرتے ہیں:

’’ان کی اردلی میں ساٹھ آدمی تھے استقبال کر کے قاعدہ مقرر کے مطابق حمام میں بھیجا گیا۔ المعتضد نے صرف معاذ ابن ابی قرہ کو کسی بہانے سے اپنے پاس رکھ لیا۔ باقی سب لوگ حمام میں جا پہنچے۔

حمام اتنا گرم اور بخارات سے بھرا ہوا تھا کہ ان مہمانوں کا دم گھٹنے لگا۔ کھڑکیاں کھولنے لگے تو وہ باہر سے بند تھیں، واپسی کے دروازے بھی نہ کھل سکے۔ انہوں نے کھڑکیاں توڑ دیں لیکن ان کے ساتھ ملحق دیوار نظر آئی غرض سب کا دم نکل گیا۔

معاذ بن ابی قرہ کو کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ جب ان کے باہر آنے میں دیر ہوگئی تو وہ اٹھ کر جانے ہی کو تھا کہ المعتضد نے اس سے اصل حقیقت کہہ دی اور یہ بھی بتا دیا کہ تم نے میری جان بچائی تھی میں نے تمھیں سلامت رکھا۔‘‘[1]

ان دونوں آراء کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ ناول نگار کا بیان افسانہ طرازی نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت کا بیان ہے۔

ناول نگار نے جن تاریخی شخصیات کا تذکرہ کیا ہے وہ قاری کو اپنے خصائل کے اعتبار سے محض ناول نگار کے ذہنی اختراع معلوم ہوتے ہیں لیکن تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت پر مہر ثبت کرتا ہے کہ نسیم حجازی کوئی بھی واقعہ محض دلچسپی کی غرض سے شامل نہیں کرتے۔ مثلاً ابن عمار کی مفلسی کا جو انداز منظر کشی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے پھر معتمد سے اس کی دوستی اور اشبیلیہ کا حکمران بننے کے بعد معتمد کی رضامندی سے شلب کی گورنری حاصل کرنا وہاں جاہ و حشمت سے داخل ہونا اور پھر اس امیر آدمی کے احسان کا بدلہ دینا جس نے کسی ضرورت کے وقت جو دیے تھے۔ بظاہر غیر حقیقی معلوم ہوتے ہیں لیکن پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی اس واقعہ کی حقیقت کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

’’ابنِ عمار ایسے خدم و حشم کے ساتھ شلب میں داخل ہوئے کہ معتمد بھی جس زمانہ میں شلب کے حاکم مقرر ہو کر بھیجے گئے تھے اس کرو فر کے ساتھ شہر میں داخل نہ ہوئے تھے لیکن اس غرور اور نمود کا کفارہ شکر گزاری کے ایک شریفانہ کام سے کیا آتے ہی دریافت کیا کہ وہ تاجر زندہ ہے یا نہیں جس نے انہیں مفلسی اور آوارہ گردی کے زمانہ میں ایک توبڑا جو کا بھر کر بھیجا تھا، وہ توبڑا ابن عمار نے اب تک اپنے پاس رکھا تھا جب معلوم ہوا کہ وہ تاجر زندہ ہے تو اسی توبڑے میں ابن عمار نے درہم (چاندی کے سکے) بھر کر اس کے پاس بھیجے مگر اس پرانے محسن سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ رکھی کہ جس وقت اس کا تحفہ پہنچا تھا تو خیال آیا تھا کہ محسن نے احسان کرنے میں خست کی ہے اگر وہی توبڑا گیہوں سے بھر کر بھیجتا تو میں آج اُسے دینار (سونے کے سکوں) سے بھروا کر واپس کرتا۔‘‘[2]

ایک اور تاریخی کردار جس کو انتہائی دلچسپی کے ساتھ ناول نگار نے پیش کیا ہے ملکہ رمیکیہ کا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ اس کا نام اعتماد تھا۔ رمیک کی لونڈی تھی اس لیے رمیکیہ کہلاتی تھی۔ اس کے حسن اور بے باکی نے معتمد کو اس قدر متاثر کیا کہ اس کا گرویدہ بن بیٹھا اس کی خواہشات کی تکمیل کرنا اپنا فرض عین جانتا تھا۔ ایک مرتبہ ملکہ رمیکیہ نے دیہاتی عورتوں کو مٹی گوندھتے ہوئے دیکھا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ کھیل ہم بھی کھیلیں گے معتمد نے محل میں اس کا اہتمام کر دیا۔ مشک و عنبر اور کافور کا ڈھیر اور اسے گوندھنے کے

---

[1] تاریخ ہسپانیہ؛ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص ۲۵۶۔

[2] عبرت نامہ اندلس؛ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی / مولوی عنایت اللہ دہلوی، ص ۱۷۱۔

لئے شہر کی معزز خواتین کا اجتماع۔ بظاہر یہ کردار اپنی حرکات وسکنات کے اعتبار سے افسانوی معلوم ہوتا ہے مگر مورخین نے حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی نے ان واقعات کا تذکرہ ان الفاظ میں مرقوم کیا ہے:

''وہ حسین عورت سامنے آئی تو معتمد نے اس کا حسب نسب دریافت کیا، عورت نے جواب دیا کہ میرا نام اعتماد ہے لیکن بالعموم رمیکیہ کے نام سے مشہور ہوں کیونکہ میں رمیک کی لونڈی ہوں اور خچر ہانکنا میرا کام ہے۔ اتنا سن کر شہزادے نے پوچھا ''کیا تمھاری شادی ہو چکی ہے؟'' رمیکیہ نے جواب دیا ''نہیں'' معتمد نے کہا ''یہ خوب ہوا میں تمھیں تمھارے آقا سے خرید کر تم سے شادی کروں گا۔''[۱]

ملکہ رمیکیہ کے بارے میں مزید حالات یوں درج کیے ہیں:

''ایک اور موقع پر رمیکیہ نے دیکھا کہ کچھ غریب عورتیں اینٹیں بنانے کے لئے پاؤں سے مٹی گوندھ رہی ہیں، رمیکیہ یہ دیکھ کر پھر رو کر شوہر سے کہنے لگی ''ہائے! جس دن سے ایک غریب گھر سے نکل کر جہاں میں خوش اور آزاد رہتی تھی، تم نے آداب شاہی کی زنجیروں میں جکڑ کر مجھے اس تاریک محل میں بند کیا ہے وہ دن اور آج کا دن جسے آرام کہتے ہیں وہ مجھے کبھی نصیب نہیں ہوا، ذرا دریا کے کنارے ان غریب عورتوں کو دیکھو! کیا اچھا ہوتا کہ میں بھی انہی کی طرح پاؤں سے مٹی گوندھتی ہوتی مگر افسوس تم نے ملکہ بنا کر مجھے قید میں ڈال دیا، ان غریب عورتوں کی طرح مٹی گوندھنے کا لطف مجھے کب نصیب ہوسکتا ہے'' معتمد نے مسکرا کر کہا کیوں نصیب نہیں ہو سکتا۔'' اس کے بعد معتمد محل کے صحن میں آئے اور خدام شاہی کو حکم ہوا کہ کافور وشکر اور مشک وعنبر کے ڈھیر صحن میں لگائے جائیں جب یہ چیزیں حاضر کر دی گئیں تو دوسرا حکم یہ ہوا کہ ان سب اشیا کو آمیختہ کر کے عرقِ گلاب سے نرم کیا جائے یہاں تک کہ وہ نرم گیلی مٹی کی طرح ہو جائیں۔

جب یہ سب کچھ ہو لیا تو معتمد نے رمیکیہ کو آواز دی ''اب ذرا یہاں قدم رنجہ فرمائیے۔ خواص اور سہیلیاں بھی ساتھ ہوں، پائے نازک سے پامال کرنے کے لئے مٹی تیار ہے۔'' اتنا سنتے ہی سلطانہ رمیکیہ مع خواصوں کے بالا خانے سے نیچے اتریں اور ننگے پاؤں ہو کر اس مشک وعنبر کی کیچڑ کو خوب خوش ہو ہو کر روندنا شروع کیا۔''[۲]

اس واقعہ کی صداقت ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کے اس بیان سے ہوتی ہے وہ مذکور ہیں:

''ایک روز دریا پر کچھ عورتیں مٹی گوندھ رہی تھیں ملکہ نے معتمد سے کہا ہم بھی مٹی گوندھیں گے۔ اس نے بہت سا عنبر اور مشک منگوا کر خادماؤں کے ذریعے اس میں پانی ڈال کر بھیج دیا وہ اسے اپنے پیروں سے اسی طرح گوندھتی رہی جس طرح اس نے ان عورتوں کو دیکھا تھا۔''[۳]

---

[۱] عبرت نامہ اندلس؛ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی/ مولوی عنایت اللہ دہلوی، ص ۱۰۶۲۔

[۲] ایضاً، ص ۱۰۶۷، ۱۰۶۸۔

[۳] تاریخ ہسپانیہ؛ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص ۲۷۱۔

ان واقعات کو رقم کرنے سے ہمارا مقصد ناول نگاری کی تاریخ سے واقفیت اور تاریخی واقعات میں تصرف نہ کرنے کی وضاحت کرنا ہے کیونکہ ہمارے اکثر ناقدین تاریخی ناول نگاروں پر یہ ہی اعتراض کرتے ہیں کہ وہ تاریخ میں تصرف کر جاتے ہیں اس طرح تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے اور اگر دلچسپ واقعات یا معاشرت کی عکاسی صحیح طور پر نہ ہو تو ناول کے فنی تقاضے متاثر ہوتے ہیں مگر نسیم حجازی ناول کے فنی تقاضوں اور تاریخ کی حقیقتوں کو مسخ کیے بغیر اپنے قلم کی جادو بیانی اپنے قارئین کے سامنے لاتے ہیں۔

ناول نگار نے معتمد کے زمانے میں قرطبہ پر دھوکے سے اس کے قبضے کا حال بیان کیا ہے صفحہ نمبر ۶۲ سے واقعہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ عبدالملک کی کمزور حکومت کو دیکھتے ہوئے مامون ذی النون نے قرطبہ کا محاصرہ کر لیا۔ عبدالملک نے معتمد سے مدد چاہی۔ فوج آئی ابن ذی النون محاصرہ اٹھا کر بھاگ نکلا مگر عباد نے ایک سازش کے ذریعہ عبدالملک اور اس کے خاندان کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا اور قرطبہ میں معتمد کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس واقعہ کا تذکرہ علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

''عنانِ حکومت اس (ابن جہور) کے بیٹے عبدالملک کے حوالے کی گئی اس نے کج ادائی اور بداطواری شروع کر دی۔ لوگوں کو اس سے نفرت اور کشیدگی پیدا ہوگئی۔ ابن ذی النون نے اس کا قرطبہ میں محاصرہ کر لیا اس نے محمد بن عباد سے ذی النون کے محاصرے کی شکایت کی اور امداد کا خواستگار ہوا۔

محمد بن عباد نے اپنی فوجیں اس کی کمک پر بھیجیں مگر در پردہ یہ ہدایت کر دی تھی کہ قرطبہ میں داخل ہو کر اسے معزول کر دینا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ابنِ ذی النون کے محاصرے کو محمد بن عباد کے لشکر نے اٹھایا اور جب یہ قرطبہ میں داخل ہو گیا تو اہل قرطبہ سے سازش کر کے ۴۶۱ھ میں عبدالملک کو معزول کر دیا اور قرطبہ سے جلاوطن کر کے شلیطش لے جا کر قید کر دیا۔''[۱]

اس واقعہ کو ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اس انتشار کی خبریں طلیطلہ میں پہنچیں تو مامون ذوالنون ۴۶۳ھ میں قرطبہ پر چڑھ آیا اور محاصرہ کر لیا۔ عبدالملک نے اپنی مجبوری میں معتمد سے کمک مانگی جو فوراً روانہ کی گئی۔ مامون یہ دیکھ کر محاصرہ اٹھا کر لے گیا۔

اب معتمد کے افسر شہر کے لوگوں سے مل کر سازش میں مصروف ہو گئے۔ اپنی حکومت کی تعریفیں اور ان کے ابتر حالات کا مقابلہ کر کے دکھایا، کچھ سخت مزاج لوگوں کو رشوتوں سے رام کیا اور عام لوگوں سے یہ تحریک پیدا کی کہ قرطبہ کا علاقہ اشبیلیہ میں شامل کر کے اس کا بہتر طریقے سے انتظام کیا جائے۔

عبدالملک کو خفیہ کارروائیوں کی کچھ خبر نہ تھی، مامون کے چلے جانے کے سات روز بعد وہ اہل اشبیلیہ کا شکریہ ادا کر کے انہیں رخصت کرنے نکلا تو دیکھا کہ اشبیلیہ کی سپاہ نے جو دوست بن کر آئی تھی قصر کو گھیر لیا ہے اب عبدالملک اور اس کے باپ جہور کو گرفتار کر لیا گیا۔ معتمد کی بادشاہی کا اعلان ہوا۔''[۲]

---

[۱] تاریخ ابن خلدون: علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون/ مولانا اختر فتحپوری، حصہ ہفتم، ص ۳۶۰۔

[۲] تاریخ ہسپانیہ: ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص ۳۷۲، ۳۷۳۔

پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی یہ واقعہ اس طرح مرقوم کرتے ہیں:

''۴۶۳ھ میں ابوالحسن یحییٰ المامون ذوالنونی صاحب طلیطلہ نے قرطبہ کا محاصرہ کیا تو عبدالملک کی قوت زائل ہو چکی تھی۔ لشکر میں سواروں کے رسالے برائے نام رہ گئے تھے اور جو تھے وہ بھی بھروسے کے نہ تھے۔ پس عبدالملک نے مجبور ہو کر معتمد سے مدد چاہی، معتمد نے کمک روانہ کی اور یہ کمک ایسی زبردست تھی کہ المامون ذوالنونی کی فوجیں محاصرہ اٹھا کر واپس چلی گئیں لیکن اس سے عبدالملک کو کوئی نفع نہ ہوا، کیونکہ اشبیلیہ سے جو کمک آئی تھی اس کے افسروں نے معتمد کی ہدایت کے مطابق اہل قرطبہ سے اس امر میں اتفاق کر لیا کہ عبدالملک کے ہاتھ سے کل اختیارات نکال کر قرطبہ کو سلطنت اشبیلیہ میں شامل کر دیا جائے۔ یہ سازش ایسے خفیہ طریقہ پر کی گئی تھی کہ عبدالملک کو کچھ خبر نہ ہوئی اور اس کو اپنی نسبت کوئی اندیشہ یا خوف پیدا نہ ہوا جب المامون ذوالنونی صاحب طلیطلہ قرطبہ کا محاصرہ اٹھا کر چلا گیا تو اس کے ساتھ ایک دن عبدالملک اپنے قصر سے نکل کر اشبیلیہ کی فوجوں کو رخصت کرنے جانے لگا جنہوں نے اسی روز اشبیلیہ کو واپسی کا قصد کیا تھا۔ باہر نکلنے کو تھا کہ باغیوں کی آوازیں کان میں آئیں اور دیکھا کہ قرطبہ کے باشندوں اور اشبیلیہ کی سپاہ نے جو دوست بن کر کمک پر آئی تھی قصر کو گھیر لیا ہے، اب عبدالملک اور عبدالملک کے باپ ابوالولید ابن جہور مع اہل وعیال کے سب گرفتار کر لیے گئے۔ قرطبہ میں اب معتمد کی بادشاہی کا اعلان ہوا۔''[1]

ان تینوں روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عبدالملک کے دور میں مامون نے قرطبہ کا محاصرہ کیا تھا اور پھر بیرونی امداد سے ان سے چھٹکارا بھی حاصل کیا مگر جو دوست بن کر آئے تھے گھر کے بھیدیوں کے ساتھ مل کر صاحب اقتدار بن گئے۔ ان روایات میں سب سے زیادہ اختلاف تاریخ ابن خلدون سے ہوتا ہے جس میں اس واقعہ کا سن ۴۶۱ھ اور مدد کرنے والی فوج محمد بن عباد کی بیان کی گئی ہے جبکہ دیگر دونوں راوی اس واقعہ کا سن ۴۶۳ھ اور مدد کو آنے والی فوج اشبیلیہ کی عباد کے زیر کمان معتمد کی بھیجی ہوئی بیان کرتے ہیں اور ناول نگار کی رائے بھی ان دونوں آراء سے مطابقت رکھتی ہے البتہ وقوع کا زمانہ خواہ کچھ بھی رہا ہو ناول نگار نے بیان ہی نہیں کیا اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ناول نگار نے مورخین کے اختلاف کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی دیگر تمام باتیں ناول نگار اور مورخین کے درمیان متفقہ ہیں۔ عباد کی حکومت کا خاتمہ ایک قزاق کے ہاتھوں ہوا بقول ناول نگار ابن عکاشہ تے جو ایک زمانے میں قزاق رہ چکا تھا ایک ایسی رات جب عباد اور اس کے افسر رقص وسرور کی محفل سے لطف اندوز ہو رہے تھے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ محل میں داخل ہوا عباد کو قتل کر دیا اور حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ کو پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی نے اس طرح بیان کیا ہے:

''ایک رات جبکہ اندھیرا بہت تھا اور طوفان آیا ہوا تھا۔ ابن عکاشہ کو موقع مل گیا اور اپنے لوگوں کو ساتھ لئے شہر میں اس طرح داخل ہوا کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی، ابن عکاشہ اور اس کے آدمی عباد کے قصر تک آئے اور یہ دیکھ کر کہ پہرا کچھ نہیں ہے دروازہ توڑنے کو ہوئے، اتنے میں اندر کے دربان کو معلوم ہو گیا اور اس نے دوڑ کر عباد کو اطلاع کی عباد چند غلاموں اور سپاہیوں کو لے کر

---

[1] عبرت نامہ اندلس؛ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی / مولوی عنایت اللہ دہلوی، ص ۱۰۷۹، ۱۰۸۰۔

نکلے اور ابن عکاشہ کا راستہ روکا اور نو عمر ہونے کے باوجود شیر کی طرح لڑ کر اپنے کو دشمن سے بچاتے رہے یہ امر یقینی ہے کہ انہوں نے ابن عکاشہ کے آدمیوں کو قصر کے سامنے سے ہٹا دیا، لیکن لڑنے میں پاؤں پھسلا، زمین پر گرے اور گرتے ہی ایک دشمن نے کام تمام کر دیا۔"[۱]

تقریباً ایسی ہی روایت ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے یوں رقم کی ہے:

"۴۶۷ھ میں ایک رات آندھی اور طوفان آیا۔ ابن عکاشہ اپنے آدمیوں کو لے کر قصر امارت پر پہنچا۔ پہرے دار آندھی کی وجہ سے ادھر اُدھر ہو گئے تھے۔ یہ دروازے پر جا پہنچا اور اسے توڑنے لگا۔ دربانوں نے عباد کو اطلاع دی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں چند غلاموں اور سپاہیوں کو ساتھ لے کر مقابلے پر آ گیا۔ شیر کی طرح لڑا اور حملہ آوروں کو قصر کے سامنے سے ہٹا دیا۔ فرش پر خون گرا تھا۔ وہاں اچانک عباد کا پاؤں پھسلا اور وہ گر پڑا، دشمن نے لپک کر اسے ختم کر دیا۔"[۲]

ان روایات اور ناول نگار کے بیان میں ایک بات اختلافی ہے کہ رقص و سرور کی محفل ہو رہی تھی یا اندھیری رات تھی ہمارا خیال ہے کہ ناول نگار نے عباد کے مزاج کے پیش نظر اس تصرف کو مناسب جانا ہوگا ورنہ ابن عکاشہ کا محل پر حملہ عباد کا مقابلے پر آنا اور قتل ہو جانا حقیقت کے عین مطابق ہے۔ ناول نگار کے بیان کے مطابق قرطبہ میں عباد کے قتل کے بعد معتمد انتہائی بے چین رہا اس نے کئی بار قرطبہ پر قبضے کی کوشش کی بالآخر ۴۷۱ھ میں اس کی فوجیں قرطبہ میں داخل ہوئیں۔

ابن عکاشہ قتل ہوا اس واقعہ کو ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اسطرح بیان کرتے ہیں:

"آخری ماہ صفر ۴۷۱ھ کو اندلس کے اس قابل تعظیم دارالسلطنت کو پھر قتل و خون کی مصیبت اٹھانا پڑی اور ایسی مصیبتیں وہ بارہا اٹھا چکا تھا۔

افواج طلیطلہ نے اپنے دل سے اپنے بادشاہ کا نام خون کے پانی سے دھویا۔ معتمد ایک دروازے سے اندر داخل ہوا تو دوسرے دروازے سے اس کے بیٹے کا قاتل ابن عکاشہ بھاگ رہا تھا، فوجیوں نے اسے گھیر لیا، اسے معلوم تھا کہ معافی تو ہو نہیں سکتی وہ ایک جنگلی سور کی طرح سٹ پٹا کر لوگوں میں گھس گیا اور تلوار چلانے لگا لیکن جلد ہی پکڑ لیا گیا اور ایک کتے کی لاش کے ساتھ ملا کر اس کی لاش سولی پر لٹکائی گئی۔"[۳]

ایسی ہی روایت ڈوزی نے نقل کی ہے:

"۴۷۱ھ معتمد کی فوج نے قرطبہ کو حملہ کر کے دشمن سے چھین لیا۔ معتمد شہر کے ایک دروازے سے داخل ہوئے اور ابن عکاشہ دوسرے دروازے سے بھاگا، معتمد کے سواروں نے اس کا تعاقب کیا اور آخر کار اسے گھیر لیا، ابن عکاشہ نے یہ سمجھ کر کہ جس کے بیٹے کو

---

[۱] عبرت نامہ اندلس؛ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی / مولوی عنایت اللہ دہلوی، ص ۱۰۸۱، ۱۰۸۲۔

[۲] تاریخ ہسپانیہ؛ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص ۳۷۳۔

[۳] ایضاً، ص ۳۷۵۔

کام لیں گے مورخ رقمطراز ہے:

''غرض افونش کی اس کمزوری سے ابن عمار نے نفع حاصل کرنا چاہا، لڑ کر مقابلہ کرنے کی جگہ اس وزیر نے حکم دیا کہ فلاں شطرنج نکلوائی جائے یہ شطرنج صنعت میں ایسی عجیب وغریب تھی کہ اُس کی مثل کسی اور بادشاہ کے ہاں نہ تھی۔ اس کے مہرے آبنوس اور صندل کے تھے جن پر سونے کا کام ہو رہا تھا۔''[1]

اس تجویز کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ابن عمار نے جو طریقہ اختیار کیا اس کے مطابق:

''اس نے چند قشتالی رئیسوں کو جو افونش کے ساتھ تھے بہت خفیہ طور پر بتا دیا کہ بازی جیتنے پر وہ بادشاہ سے کیا چیز طلب کرے گا۔ اس نے ان رئیسوں سے یہ بھی کہا کہ اگر اس کام میں انہوں نے مدد کی تو بہت روپیہ دیا جائے گا، عیسائی رئیسوں کو روپے کی طمع تو تھی ہی جب ان کو یقین ہو گیا کہ ابن عمار کیا چیز مانگنے والا ہے تو انہوں نے مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔

افونش پہلے شطرنج دیکھ کر اس پر ایسا فریفتہ ہوا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسے حاصل کرنا چاہتا تھا مگر اپنے درباریوں سے اس بارے میں مشورہ کرنا بھی ضروری سمجھا۔ ان کو ابن عمار نے پہلے ہی درست کر رکھا تھا، چنانچہ افونش نے جب ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ ''اگر حضور جیت گئے تو ایک ایسی نایاب چیز ہاتھ لگتی ہے جسے دیکھ کر کون سا بادشاہ ہے جو رشک نہ کرے گا اور اگر ہار گئے تو یہ عرب آخر کار کچھ مانگے گا تو بھی کیا مانگے گا اگر اس نے کوئی درخواست حد سے متجاوز کی تو پھر ہم اس کو اور ہر طرح پر سمجھانے کو تیار ہیں افونش نے اپنے مشیروں کی بات مان لی اور ابن عمار کو مع شطرنج طلب کر کے کہا مجھے شرط قبول ہے، آؤ ایک بازی ابھی کھیلیں۔'' ابن عمار نے کہا بہت مناسب لیکن حضور شرط کا خیال رکھیں اور چند گواہ بھی حاضر رہیں تو اچھا ہو۔ افونش نے یہ بات بھی منظور کر لی اور جب قشتالیہ کے وہی رئیس جن سے پہلے ابن عمار کی گفتگو ہو چکی تھی بطور گواہ حاضر ہو گئے تو بازی شروع ہوئی، افونش ہار گیا۔

ابن عمار نے بادشاہ سے عرض کی ''اب مجھے حق حاصل ہو گیا ہے کہ جو چاہوں سو مانگوں۔ افونش نے کہا ''مانگو کیا مانگتے ہو؟'' ابن عمار نے کہا ''میں جو کچھ مانگتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ آپ اپنا لشکر یہاں سے اٹھا کر اپنے ملک کو واپس چلے جائیں اتنا سنتے ہی افونش کا رنگ فق ہو گیا کبھی اٹھ کر کمرے میں ٹہلتا، کبھی بیٹھ جاتا اور پھر کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو جاتا، اور ٹہلتا، تھوڑی دیر کے بعد دربار کے رئیسوں سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا ''تم نے دیکھا کہ مجھے کس طرح دھوکا دیا ہے اور تم سب اس دھوکے کا باعث ہوئے ہو، میں خوب سمجھتا تھا کہ ایسی ہی کوئی درخواست یہ عرب کرے گا مگر تم لوگوں نے اطمینان دلایا اور میں شرط قبول کرنے پر راضی ہو گیا اور اب تمہارے مشورے کا کڑوا پھل مجھے چکھنا پڑا'' پھر کچھ دیر چپ رہ کر بادشاہ نے کہا ''مگر میں شرط پوری ہی کیوں کروں کوئی میرا کیا کر سکتا ہے؟ پس سن لو ہم فوج کشی جاری رکھیں گے۔'' قشتالی رئیسوں نے کہا ''حضور یہ عہد شکنی ہو گی۔ آپ مسیحی بادشاہوں میں سب سے زبردست بادشاہ ہیں حضور اپنے قول سے پھرنا کیوں کر گوارا فرما سکتے ہیں۔''

---

[1] عبرت نامہ اندلس، پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی، مولوی عنایت اللہ دہلوی، ص ۱۰۸۵۔

افونش خاموش ہوکر پھر غور کرنے لگا اور آخر کار بولا ''اچھا میں اپنے قول کا پابند ہوں۔''[۱]

یہ واقعہ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ شطرنج کے مہروں کی خوبصورتی کا ذکر اس طرح ہے:

''اس کی بساط کا تختہ صندل اور دیگر قیمتی لکڑیوں سے بنایا گیا تھا۔ اس کے جوڑ سونے اور چاندی سے بٹھائے گئے تھے اور اس پر جواہرات جڑ دیے گئے تھے، خانے آبنوس اور ہاتھی دانت کے تھے۔ مہرے صندل اور آبنوس کے تھے جس پر سونے کا کام کیا ہوا تھا۔ اس کھلونے کو اس نے اپنی نجات کا ذریعہ بنایا۔''[۲]

جنگ کو ٹالنے کے لئے ان خوبصورت مہروں کا استعمال ابن عمار نے جس طرح کیا اس واقعہ کو راوی ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''بادشاہ کی اس خوبصورتی اور عمدہ صنعت کو دیکھ کر اس قدر حیران ہوا کہ فوراً نشان صلیب بنایا (یہ عیسائیوں کا قسم کھانے کا طریقہ تھا) یعنی واللہ اور کہا کیا کمال دکھایا ہے۔ یہ کبھی وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا کہ شطرنج اس طرح کی بن سکتی ہے،

بازی کھیلنے سے پہلے ابن عمار نے کہا ''کچھ گواہ اور ثالث بھی چاہئیں جو شرط پوری کر سکیں اور ہار جیت کا فیصلہ بھی کریں''

حاضرین میں وہ رشوت خور موجود تھے۔ انہوں نے بڑھ کر کہا ''تم کھیلو ہم گواہ ہوں گے'' الفانسو نے دیکھا۔ ابن عمار نے انہیں کو مان لیا ہے، وہ مطمئن ہو گیا۔ ابن عمار جیسے شاطر کے سامنے وہ خستہ دماغ کیا کھیلتا، الفانسو بازی ہار گیا۔ ابن عمار نے کہا: کہ اب مجھے حق ہو گیا کہ جو چاہوں مانگوں۔

الفانسو نے کہا: اچھا مانگو۔

ابن عمار نے کہا: آپ اپنا لشکر یہاں سے اٹھا کر واپس چلے جائیں۔ یہ سن کر الفانسو کا رنگ اتر گیا۔ وہ اٹھ کر کبھی خیمے میں جاتا کبھی ٹہلنا شروع کر دیتا، کبھی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ پھر درباریوں کے سامنے آکر کہنے لگا: دیکھا یہ دھوکہ، اس میں تمہارا بھی قصور ہے۔'' پھر گرج کر بولا اگر میں نہ مانوں۔

ابن عمار نے کہا: آپ سب سے بڑے بادشاہ ہیں۔ آپ کو عہد شکنی شایان شان نہیں۔

پھر الفانسو نے کہا: ''اچھا''[۳]

اس واقعہ کو ناول نگار اور راویوں نے تقریباً ایک ہی انداز میں بیان کیا ہے۔ رہا نام کا مسئلہ تو افونش اور الفانسو زبان کی ادائیگی کی وجہ سے مختلف ہے۔ یہ دونوں ایک ہی فرد کے نام ہیں۔ ان کا واسطہ ابن عمار سے پڑا۔ رہا شطرنج کی خوبصورتی کا سوال تو اس میں کہیں مبالغے سے کام لیا گیا ہے جس سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور جنگ ٹل جانے کے معاملے پر ناول نگار اور مورخین متفق ہیں۔

ایک اور واقعہ جو تاریخی اعتبار سے ناول نگار اور مورخین کے خیال میں یکساں حقیقت پر مبنی ہے۔ ابن عمار کا ہے کہ جس نے

---

۱ عبرت نامہ اندلس؛ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی/ مولوی عنایت اللہ دہلوی، ص ۱۰۸۶، ۱۰۸۷۔

۲ تاریخ ہسپانیہ؛ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص ۳۷۶۔

۳ ایضاً، ص ۳۷۷، ۳۷۸۔

اپنی حد سے تجاوز کیا جو اس کی ذلت و رسوائی کے ساتھ ساتھ موت کا باعث بنا۔ اس واقعہ کو ناول نگار نے یوں مرقوم کیا ہے:

''بلنیسہ کا حکمران ابن عبدالعزیز ابن طاہر کا دیرینہ دوست تھا۔ معتمد کے ساتھ بھی اس کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ چنانچہ اس نے معتمد کو خط لکھا، ابن طاہر کی سفارش کی اور معتمد نے ابن عمار کو حکم بھیجا کہ ابن طاہر کو رہا کر دیا جائے۔ ابن عمار نے معتمد کے اس حکم کی پروانہ کی لیکن ابن طاہر ایک دن قید خانے سے فرار ہوا اور ابن عبدالعزیز کے پاس یہ نظم پہنچی تو اس نے معتمد سے شکایت کی، اس پر معتمد کو غصہ آیا اور اس نے ابن عمار کے متعلق ایک نظم لکھ کر اس کے پاس بھیج دی۔ پھر اس کے جواب میں ابن عمار نے قلم اٹھایا اور وہ نظم لکھ ڈالی جو اس کے زوال اور بالآخر قتل کا باعث ہوئی۔''[1]

اس واقعہ کی دلچسپی اس کی حقیقت پر حرف لاتی ہے۔ پڑھتے ہوئے گمان ہوتا ہے اس قدر افسانوی انداز کا واقعہ رونما ہوا ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ ہوا اور اس کا تذکرہ انتہائی تفصیل کے ساتھ مورخین نے رقم کیا ہے۔ جسکے مطابق ابن عمار کو یہ گمان ہو چلا تھا کہ معتمد سے اس کی دوستی اس کے قصور اور غلطیوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گی۔ اس لئے حد سے تجاوز کر گیا اس نے احکامات کی کوئی پروانہ کی بلکہ خودسری انتہا کو جا پہنچی پہلے ابن عبدالعزیز کی ہجو لکھی۔ اور جب یہ ہجو معتمد کی شایان پہنچی تو معتمد نے اس کی حیثیت یاد دلانے کے لئے ایک ہجو لکھ بھیجی تکبر اپنے عروج پر تھا ابن عمار نے معتمد کے اشعار کا نہ صرف جواب دیا بلکہ حد سے تجاوز کرتے ہوئے ملکہ رمیکیہ اور اس کے بیٹوں تک کی توہین کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معتمد، ابن عمار کے خون کا پیاسا ہو گیا پہلے ابن عمار نے فرار ہو کر جان بچائی مگر موت اسے معتمد کے قید خانے تک لے گئی ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ معتمد کو اس پر رحم آیا جان بخشی کی امید پیدا ہوئی۔ مگر ابن عمار کی جلد بازی اُسے موت کی نیند سلوانے کا باعث ہوئی۔ اس واقعہ کو عبرت نامہ اندلس کے صفحہ نمبر ۱۰۹۶ تا ۱۱۰۶ اور تاریخ ہسپانیہ کے صفحہ نمبر ۳۷۸ تا ۳۸۳ پر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

ناول نگار نے الفانسو کی بڑھتی ہوئی قوت کے بارے میں لکھا ہے کہ پہلے تو وہ اندلس کے ملوک الطوائف سے خراج وصول کرتا رہا پھر خراج کی رقم میں اضافہ کیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے لگا۔ قابل ذکر واقعہ ۴۷۸ھ میں طلیطلہ سے یحییٰ القادر کا انخلاء اور الفانسو کا فاتح کی حیثیت سے داخل ہونا ہے۔ اس واقعہ کی حقیقت پر تمام ہی مورخین متفق ہیں مثلاً علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون مرقوم ہیں:

''ابن ادفونش نے فوجیں آراستہ کر کے طلیطلہ کی جانب ۴۷۸ھ میں پیش قدمی شروع کی قادر یحییٰ نے ابن ادفونش کے خوف سے طلیطلہ کو خالی کر دیا۔''[2]

اس واقعہ کو ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اس طرح بیان کرتے ہیں:

---

[1] یوسف بن تاشفین؛ نسیم حجازی، ص ۲۵۶۔

[2] تاریخ ابن خلدون؛ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون / علامہ حکیم احمد حسین، حصہ ہفتم ص ۳۶۳۔

''۲۷محرم ۴۷۸ھ/۲۵مئی ۱۰۸۵ءکوالفانسوطلیطلہ میں بطور وہاں کے بادشاہ کے داخل ہوگیا۔''[1]

قاضی عقیل احمد رقمطراز ہیں:

''اس وقت عیسائی حکمرانوں نے (افونش) ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء میں طلیطہ پر فوج کشی کی۔ قادر نے طلیطلہ کو خالی کردیا۔''[2]

اس کیفیت کا اظہار ڈوزی نے اس طرح کیا ہے:

افونش نے ''۲۵مئی ۱۰۸۵ء (۲۷محرم ۴۷۸ھ) کو یہ عیسائی بادشاہ طلیطلہ کے شہر میں جو قوم فسیقوط کا قدیم دارالسلطنت تھا بطور بادشاہ اور فرمانروا کے داخل ہوا۔''[3]

یہ واقعہ اس قدر اہم ہے کہ اس کے وقوع کی تاریخ سنہ ہجری اور سنہ عیسوی ناول نگار اور مورخین ہردو کے نزدیک ایک ہی رقم کی گئی ہے۔ ناول نگار نے اس کی اہمیت کے پیش نظر بالخصوص اور اپنی جبلت کے تحت بالعموم تاریخی واقعات بنا کسی تصرف کے جوں کے توں پیش کیے ہیں۔ اس کے باوجود ناول کا پلاٹ انتہائی مربوط اور دلچسپی کے ساتھ برقرار رہتا ہے۔ یہی کامیابی نسیم حجازی کو کمال معراج تک پہنچاتی ہے۔ مذکور واقعہ کے بعد الفانسو کی ہوس بڑھ گئی اور اس کی افواج گردونواح کے علاقوں پر قابض ہونے لگیں قریب تھا کہ اندلس سے مسلمانوں کا خاتمہ کردیا جائے مسلمان علما نے ملوک الطوائف کی مدد سے ملک بچانے کی کوشش کا آغاز کیا۔ جس کے لئے ایک وفد امیر یوسف بن تاشفین کے پاس پہنچا جس میں علما کی قیادت قاضی ابوجعفر اور ملوک الطوائف کی نمائندگی ابن زیدون کر رہا تھا شرف ملاقات پر قاضی ابوجعفر نے اسپین کی حالت زار کے بارے میں اور الفانسو کی بربریت کی داستان اس رقت کے ساتھ پیش کی امیر یوسف سر جھکائے انتہائی انہماک سے سنتا رہا (یہ واقعات ناول کے صفحہ نمبر ۳۳۶ پر دیکھے جاسکتے ہیں) پھر ملوک الطوائف کے نمائندے ابن زیدون نے ایک مراسلہ پیش کیا جو پُرتکلف عبارت کا شہ پارہ تھا۔ مراسلے کے مندرجات سمجھنے کے بعد امیر یوسف نے سمندر عبور کرنے کے بعد بندرگارہ جس پر اس کی افواج اتریں گی کی بابت دریافت کیا ابن زیدون نے بتایا کہ آپ جبل الطارق کی بندرگاہ پر اتریں۔ جس پر امیر نے جزیرۃ الخضر ا پر اترنے کی خواہش ظاہر کی ابن زیدون نے معذوری پیش کی اور معاملہ اگلے دن پر ملتوی کر دیا گیا۔ اس دوران امیر یوسف نے اپنے علما سے مشورہ کیا انہوں نے نیک نیتی کی صورت میں کسی بھی بندرگاہ پر اترنے کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے اسپین میں فوجی مداخلت کی اجازت دے دی۔ یوں ملوک الطوائف اور علما اندلس کا وفد پُرامید واپس آ گیا۔ اس واقعہ کو تقریباً تمام ہی مورخین نے رقم کیا ہے۔ پروفیسر ڈوزی تحریر کرتے ہیں:

''اس درخواست کے مطابق بطلیوس کے قاضی ابواسحاق ابن مکانا اور غرناطہ کے قاضی ابوجعفر قلیعی نامزد ہو کر اشبیلیہ آئے، معتمد نے ابن ادہم قاضی قرطبہ اور اشبیلیہ کے وزیر ابوبکر ابن زیدون کو سفارت میں اور اضافہ کیا اور یہ سب لوگ جزیرۃ الخضر ا پہنچ کر

---

[1] تاریخ ہسپانیہ؛ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص ۲۸۵۔

[2] تاریخ ملت مسلمہ؛ قاضی عقیل احمد، ص ۴۱۸۔

[3] عبرت نامہ اندلس ہسپانیہ؛ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی / مولوی عنایت اللہ، ص ۱۱۱۲۔

وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر یوسف بن تاشفین کے پاس افریقہ پہنچے۔

ان سفیروں کو اپنے اپنے بادشاہ کی طرف سے اجازت تھی کہ یوسف کو مع اس کے لشکر کے اندلس میں آنے کی دعوت دیں لیکن اس کے ساتھ یہ ہدایت بھی کی تھی کہ چند شرطیں بھی یوسف بن تاشفین سے کرالی جائیں ان شرائط کی تفصیل ہم تک نہیں پہنچی، صرف اتنا دریافت ہوتا ہے کہ یوسف نے قسم کھائی کہ وہ اندلس کے کسی مسلمان بادشاہ کی ریاست پر قبضہ نہ کریں گے۔

اس شرط کے بعد یہ ضروری ہوا کہ کوئی خاص مقام اسپین کے ساحل پر مقرر کیا جائے جہاں یوسف بن تاشفین جہاز سے اتریں۔ زیدون نے جبل طارق کی بندرگاہ تجویز کی لیکن یوسف نے جزیرۃ الخضرا کو ترجیح دی اور کہا کہ یہ شہر ان کے حوالے کر دیا جائے ابن زیدون نے کہا کہ ''اس کا مجھے اختیار نہیں دیا گیا۔''

اتنا سن کر یوسف نے سفیروں سے سرد مہری کا برتاؤ کیا اور ان کے سوالوں کا جواب مبہم طور پر دینے لگا۔ غرض جس وقت اہل سفارت یوسف سے رخصت ہوئے تو کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ''یوسف کیا ارادہ رکھتے ہیں؟ اور کیا کریں گے؟ اسپین آنے کا انہوں نے نہ اقرار کیا ہے نہ انکار۔''[1]

اسپین کے ملوک الطوائف اسی پریشانی میں تھے کہ ایک واقعے نے اس پریشانی کو رفع کر دیا مگر وہ واقعہ فی نفسہ ایسا تھا جو ناگوار گزرا اور یوسف کی طرف سے جو اندیشہ ملوک الطوائف کو پہلے سے تھا وہ اور بھی پختہ ہو گیا۔

یوسف بن تاشفین کوئی کام بغیر فقہاء کے مشورے کے نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اندلس جانے کے بارے میں بھی ان لوگوں سے استصواب کیا۔ فقیہوں نے کہا قشتالیہ کے عیسائیوں سے جنگ کرنا یوسف کا فرض ہے اور اس کے لئے اگر جزیرۃ الخضرا تفویض نہیں کیا جاتا تو اس پر قبضہ کر لیا جائے۔

فقیہوں کے اس فتویٰ پر یوسف اندلس جانے پر آمادہ ہو گئے۔ اس واقعہ کا تذکرہ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے اس طرح کیا ہے:

''تجویز یہ ہوئی کہ یوسف بن تاشفین کے پاس ایک سفارت بھیجی جائے بطلیوس سے وہاں کے قاضی اسحاق ابن مکانا، غرناطہ سے قاضی ابو جعفر قلیعی، قرطبہ سے قاضی ابن ادہم اور اشبیلیہ سے وزیر ابوبکر بن زیدون منتخب کئے گئے۔

یہ وفد جزیرۃ الخضرا پہنچا، وہاں سے جہاز پر سوار ہر کر ابن تاشفین کے پاس افریقہ پہنچے۔ ان سفیروں کو اجازت تھی کہ یوسف کو مع اس کے لشکر کے اندلس آنے پر آمادہ کرلیں۔''[2]

اس واقعہ کا تسلسل آگے چل کر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''اس وفد سے یوسف نے ساحل اسپین پر اترنے کے لئے کوئی مقام مانگا۔ ابن زیدون نے جبل الطارق کی بندرگاہ تجویز کی لیکن یوسف نے جزیرۃ الخضرا کی حوالگی کا مطالبہ کیا وفد نے جواب دیا، اس کی ہمیں اجازت نہیں۔ یوسف نے اس کے بعد وفد کے

---

[1] عبرت نامہ اندلس؛ پروفیسر لائن پارٹ ڈوزی/ مولوی عنایت اللہ دہلوی، ص ۱۱۷، ۱۱۸۔

[2] تاریخ ہسپانیہ؛ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص ۳۹۱۔

ارکان کو بلا کسی فیصلہ کے رخصت کر دیا۔

یوسف نے اپنے مشیروں سے صلاح لی تو انہوں نے کہا جنگ قشتالیہ کے عیسائیوں سے ہے تو جزیرۃ الخضراء ہی مناسب مقام ہے۔"[۱]

اس کے بعد واقعات کا تسلسل امیر یوسف کی اندلس آمد اور الفانسو کے ساتھ جنگ کے حالات پر مبنی ہے امیر یوسف کی فوجیں جزیرۃ الخضرا کی بندرگاہ پر اتریں۔ جہاں کا حاکم معتمد کا بیٹا راضی تھا یہاں سے یہ فوجیں اشبیلیہ کی طرف روانہ ہوئیں جہاں معتمد نے خود امیر یوسف اور اسکی افواج کا استقبال کیا یہاں سے یہ لشکر زلاقہ کی طرف روانہ ہوا جہاں الفانسو کی فوجیں بھی آموجود ہوئیں۔ الفانسو کو ایک خط کے ذریعے امیر یوسف نے اسلام کی دعوت پیش کی یا جزیہ دینے ورنہ مقابلہ کرنے کے بارے میں لکھا جس کا جواب الفانسو نے انتہائی متکبرانہ انداز میں لکھا کہ تمھاری موت تمھیں افریقہ سے لے آئی ہے۔ چاہو تو اب بھی نکل جاؤ اس کے جواب میں امیر یوسف نے یہ مختصر سی عبارت لکھی کہ جو کچھ ہونے والا ہے تم خود دیکھ لو گے اس واقعہ کا تذکرہ عبرت نامہ اندلس میں اس طرح مرقوم ہے:

"ادفونش کا لشکر گاہ ابھی پورا درست نہ ہوا تھا کہ یوسف بن تاشفین کا خط اس مضمون کا اس کے نام آیا کہ 'یا تو اسلام قبول کر دو یا جزیہ دو اور اگر ان دونوں باتوں سے انکار ہے تو ہم تم سے لڑیں گے۔"

ادفونش اس خط کو پڑھ کر بہت برہم ہوا اور عرب کاتب جو لشکر میں حاضر تھے ان سے جواب لکھوایا "چونکہ اسپین کے مسلمان بادشاہ کئی سال سے میرے باجگزار ہیں اس لئے میں تمھاری اس گستاخانہ تحریر کی کچھ پروا نہیں کرتا" اس کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ "میرے پاس ایسا زبردست لشکر موجود ہے جو دشمنوں کے غرور کو ڈھا دے گا۔"

جس وقت ادفونش کا یہ خط دار الارشاد میں پہنچا تو ایک اندلسی کاتب نے فوراً اس کا جواب لکھا مگر اس جواب کی عبارت یوسف کو بہت پر تکلف معلوم ہوئی، اور اسی خط پر اپنے قلم سے یہ سادے الفاظ لکھ دیئے "جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ تم خود ہی دیکھ لو گے۔"[۲]

اس واقعہ کو ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے یوں بیان کیا ہے:

"یوسف کی طرف سے ایک خط اس مضمون کا پہنچا کہ یا اسلام قبول کرو یا جزیہ دو یا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ الفانسو نے مغرورانہ جواب دیا کہ میرے پاس فرانس تک کے شجاعت مند سپاہی ہیں اور عرب سردار سب میرے مطیع ہو چکے ہیں۔ میں تمھاری قلیل فوج کو ٹھکانے لگا دوں گا۔ حقیقت میں اس کے پاس ساٹھ ہزار جنگجو تھے۔ یوسف نے خط پا کر اس کو جواب لکھنے کو کہا تو کاتب نے رسمی طور پر پہلے طویل طویل عبارت سے تمہید باندھی، یوسف نے یہ دیکھ کر اسی خط پر اپنے ہاتھ سے صرف اتنا لکھ دیا کہ "جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ تم خود ہی دیکھ لو گے۔"[۳]

۱۔ تاریخ ہسپانیہ: ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص ۳۹۲۔

۲۔ عبرت نامہ اندلس: پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی، مولوی عنایت اللہ دہلوی، ص ۱۱۱۹۔۱۱۲۰۔

۳۔ تاریخ ہسپانیہ: ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص ۳۹۲، ۳۹۳۔

اس خط و کتابت کے بعد جنگ کا آغاز ہوا۔ اس موقع پر ناول نگار نے الفانسو کی فوج کی تعداد پچاس ہزار سے اسی ہزار تک ظاہر کی ہے جو اوپر کی روایت کے قریب تر ہے جبکہ مرابطین اور ملوک الطوائف کی مشترکہ فوج ایک تہائی کی تعداد میں تھی بقول ناول نگار:

''ماہ رمضان ۴۸۰ھ جمعرات کے دن جب کہ اسلامی لشکر دشمن پر حملے کی تیاریاں شروع کر رہا تھا، الفانسو نے امیر یوسف کے نام پیغام بھیجا کہ کل جمعہ ہے اور یہ تمہارا مقدس دن ہے اس کے بعد اتوار ہمارا مقدس دن ہے۔ اس لئے یہ بہتر ہو کہ ہم طاقت آزمائی کے لئے دوشنبہ کا دن مقرر کریں۔ امیر یوسف نے دشمن کا یہ مطالبہ مان لیا لیکن اسے معتمد کا یہ پیغام ملا کہ دشمن ضرور دھوکہ دے گا، اس لئے آپ خبردار رہیں!

چنانچہ امیر یوسف کی فوج جمعہ کی نماز کے لئے کھڑی تھی کہ الفانسو نے اچانک پہاڑی کی دوسری طرف اندلس کی فوج کے پڑاؤ پر حملہ کر دیا۔''[۱]

اس بارے میں پروفیسر ڈوزی رقمطراز ہے کہ:

''جمعرات کے دن ۲۲ اکتوبر ۱۰۸۶ء (۱۲ رمضان ۴۸۰ھ) کو ادفونش نے مسلمانوں کو یہ پیغام بھیجا کہ ''جمعہ تمہارا مبارک دن ہے اور اتوار ہمارا اس لئے مناسب ہوگا کہ اتوار کے دوسرے دن لڑائی شروع کی جائے۔''

امیر یوسف نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا لیکن معتمد کو شبہ ہوا کہ ادفونش نے اس میں کوئی فریب سوچا ہے۔''[۲]

لیکن جمعہ کے دن (۱۳ رمضان ۴۸۰ھ) علی الصبح معتمد کو معلوم ہو گیا کہ ادفونش کی طرف سے فریب و دغا کا جو اندیشہ تھا وہ غلط نہ تھا۔''[۳]

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اس واقعہ کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

''جمعرات کے دن ۱۲ رمضان المبارک ۴۸۰ھ / ۲۲ اکتوبر ۱۰۸۶ء کو الفانسو نے کہلا بھیجا کہ جمعہ تمہارا مبارک دن ہے اور اتوار ہمارا اس لئے لڑائی ان دونوں کو چھوڑ کر پیر کو ہوگی امیر یوسف نے یہ الٹی میٹم منظور کر لیا لیکن عیسائی فطری طور پر عہد شکن اور دغاباز ہوتے ہیں الفانسو نے جمعہ کے روز ہی حملہ کر دیا۔''[۴]

ان روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ناول نگار نے تاریخی حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے واقعات کو پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں معمولی سے معمولی تاریخی حقیقت کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس کے بعد جنگ کا منظر نامہ سامنے آتا ہے۔ پہلے پہل اندلس کی افواج پر مصیبت آن پڑی لیکن بربری سواروں نے ان کی مدد کو پہنچ کر جنگ کا نقشہ تبدیل کر دیا ساتھ ہی امیر یوسف بن تاشفین، سیر بن ابوبکر

---

[۱] یوسف بن تاشفین، نسیم حجازی، ص ۲۷۲۔

[۲] عبرت نامہ اندلس، سپرو فیسر رائن ہارٹ ڈوزی/ مولوی عنایت اللہ دہلوی، ص ۱۲۰۔

[۳] ایضاً، ص ۱۲۱۔

[۴] تاریخ ہسپانیہ، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص ۳۹۳۔

اور ایک تیسرے بربری جرنیل نے فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر کے مختلف اطراف سے حملہ کیا جنگ کئی بار کسی کی ہار کسی کی جیت کا انداز اختیار کرتی رہی لیکن شام کے وقت تک امیر یوسف کے سپاہی الفانسو کے لشکر گاہ میں آگ لگا چکے تھے۔ اسودی سواروں کے گھوڑے ان کی طرح انتہائی طاقتور تھے ویسے بھی یہ افریقی سوار خود اور زرہ بکتر سے بے نیاز ہوتے تھے اس لئے گھوڑوں کو کم بوجھ اٹھانا پڑتا تھا۔ شام کے وقت نقاروں پر چوٹ لگی امیر یوسف کا یہ پیغام ہر سپاہی تک پہنچا دیا گیا کہ جنگ کا اصل موقع یہی ہے فوج تین حصوں میں تقسیم ہوئی دائیں اور بائیں یہ سوار عیسائی افواج کو گھیرتے اور پیچھے آنے والے انہیں قتل کرتے۔ سورج غروب ہو رہا تھا مسلمانوں نے چلتے گھوڑوں کی پیٹھ پر روزہ افطار کیا دریا سے کچھ فاصلے پر پہنچتے پہنچتے الفانسو کے گرد چار پانچ ہزار سپاہی ہوں گے رات کے اندھیرے میں چاند کی روشنی کا فائدہ اٹھانے کی تمنا لئے الفانسو میدان جنگ میں آیا تھا اب یہی چاندنی اس کے ساتھیوں کے لئے موت کا پیغام بن گئی تھی دریا عبور کرنے کے بعد الفانسو کے محض پانچ سو سپاہی تھے۔ ایک اسودی سوار کا نیزہ الفانسو کی ران زخمی کر چکا تھا ان واقعات کا تسلسل عبرت نامہ اندلس میں دیکھا جا سکتا ہے راوی رقم طراز ہے:

''اب لڑائی تعداد کے لحاظ سے اتنی بے جوڑ نہ رہی جتنی پہلے تھی مگر اشبیلیہ کی فوجیں یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ ادفونش کی فوجیں میدان چھوڑ کر یک لخت بھاگ رہی ہیں۔ حالانکہ امیر یوسف نے جو کمک معتمد کو بھیجی تھی وہ ایسی نہ تھی کہ مسلمانوں کو فتح کی امید ہو جاتی۔ واقعات جو پیش آئے وہ یہ تھے کہ امیر یوسف نے یہ دیکھ کر کہ ادفونش کی فوجیں مسلمانوں سے لڑنے میں مصروف ہیں عیسائیوں کے عقب سے ان پر حملہ کرنا چاہا معتمد کے پاس صرف اتنی کمک بھیج کر کہ عیسائی معتمد کی فوجوں کو نیست و نابود نہ کر دیں، خود چکر کاٹ کر اپنی پوری قوت سے ادفونش کے لشکر گاہ پر حملہ آور ہوا، عیسائی سواروں کے رسالے جو لشکر گاہ کی حفاظت پر مقرر تھے، ان میں امیر یوسف نے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا اور لشکر گاہ میں آگ لگا کر عقب والی عیسائی فوجوں پر ایسی زبردست یلغار کی کہ وہ تاب نہ لا سکیں، آگے عیسائی بھاگ رہے تھے اور پیچھے امیر یوسف کے رسالے تھے، اب ادفونش نے دیکھا کہ دشمن نے ہر طرف سے اسے گھیر لیا ہے اور چونکہ اسلامی فوجیں جو عیسائیوں کے عقب پر حملہ کر رہی تھیں تعداد میں ان فوجوں سے زیادہ تھیں جو سامنے سے حملہ کر رہی تھیں اس لئے ادفونش مجبور ہوا کہ اپنے قلب کی فوجوں کو عقب کی فوجوں سے بچانے کے لئے کام میں لائے۔

اب بہت زور کی لڑائی ہوئی اور ادفونش کے لشکر گاہ پر امیر یوسف نے بار بار قبضہ کیا اور اپنی فوجوں میں للکارتے رہے

''مسلمانو! ہمت سے کام لو تمھارے سامنے خدا کے دشمن ہیں اور جو مسلمان اس لڑائی میں شہید ہوں گے جنت ان کی منتظر ہے۔''

اندلسی، جو شروع میں میدان سے ہٹ گئے تھے، اب پھر یکجا ہو کر معتمد کی مدد کو آئے، ادھر تو یہ ہوا، ادھر امیر یوسف نے اپنے اسودی سواروں کو جن سے اب تک کچھ کام نہیں لیا تھا عیسائی فوجوں پر دھر لیکا یا اور اب ان سیاہ فام افریقیوں نے عیسائیوں میں ایک تہلکۂ عظیم برپا کر دیا، ایک اسودی راستہ کاٹتا ہوا ادفونش تک پہنچ گیا اور اپنے خنجر سے اس کی ران میں زخم پہنچایا۔

جب رات ہوئی تو اس لڑائی میں جو نہایت سخت تھی، فتح کا سہرا مسلمانوں کے سر بندھا، ادفونش کی فوجوں کے زیادہ تر لوگ

میدان کارزار میں زخمی یا مردہ پڑے تھے، باقی سب میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور اذفونش بادشاہ قشتالیہ، لیون وجلیقیہ پانچ سواروں کے ساتھ بمشکل تمام میدان سے بھاگ سکا۔''[۱]

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے اس بات کو یوں مرقوم کیا ہے:

''اب اندلسیوں کو ذرا سستانے کی مہلت ملی۔ معتمد نے زخم پونچھے، تین گھوڑے اس کی رانوں تلے مر چکے تھے اس کی زرہ بکتر کے ٹکڑے اڑ گئے تھے مقتولین کا ایک ڈھیر جوان کی شمشیر آبدار سے واصل جہنم ہوا سامنے پڑا تھا۔

اتنے میں دیکھا کہ عیسائیوں نے بھاگنا شروع کیا۔ یوسف اپنے نقشہ جنگ کے مطابق الفانسو کی چھاؤنی پر پیچھے سے جا پڑا اور عام سامان پر قبضہ کر کے خیموں کو آگ لگا دی حفاظتی دستے جو وہاں موجود تھے وہ گاجر مولی کی طرح یوسف نے کاٹ کر پھینک دیا پھر آگے بڑھ کر عقبی فوج پر زور کا حملہ کر دیا۔ شام ڈھل رہی تھی، بربر کے اونٹوں نے عیسائیوں کے گھوڑوں کو بھڑکا دیا۔ گھوڑوں نے اپنی ہی فوج کو کچلنا شروع کر دیا۔

ادھر معتمد اور مضبوطی سے ڈٹ گیا، اندلسی جو پہلے بھاگ رہے تھے یہ نقشہ دیکھ کر پلٹ آئے اور معتمد کے ساتھ شریک جنگ ہوئے۔

صفیں اس قدر گتھم گتھا ہوئیں کہ تلوار چلانا بھی مشکل ہو گیا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں یوسف نے حبشیوں کا ایک گروہ جو ریزرو رکھا تھا عیسائیوں پر دھر لپکایا۔ عیسائی ایسی تنگ حالت میں پھنسے ہوئے تھے کہ چاروں طرف سے گھر گئے۔ اب وہ نہ پسپا ہو سکتے تھے نہ اپنی مدافعت کر سکتے تھے۔ تمام صلیبی لڑائیوں میں جو سرزمین اسپین پر لڑی گئیں ان میں جنگ زلاقہ سخت ترین تھی۔ فرانسیسی نائٹ اور لیون قشتالیہ، جلیقیہ کے بہادر امراء پادری سب موت کے منہ میں تھے، نعرے اور چیخیں آسمان تک جاتی تھیں۔ رات کا اندھیرا چھا گیا لیکن موت کا فرشتہ آرام نہ کرتا تھا۔ بیس ہزار عیسائی ختم ہو چکے تھے۔ الفانسو جوش دلا رہا تھا، پادری صلیب اٹھا اٹھا کر دکھا رہے تھے، ایک حبشی نے بڑھ کر الفانسو کی ران میں نیزہ گاڑ دیا۔ الفانسو اپنی نیم جان کو لے کر پانچ سواروں کی مدد سے نکل بھاگا۔ زخمیوں کی تعداد بیس ہزار مقتول عیسائیوں سے زیادہ تھی۔ اگر اندھیرا نہ ہوتا تو ایک بھی عیسائی بچ کر نہ نکلتا۔''[۲]

قاضی عقیل احمد اس جنگ کا قصہ اس طرح تحریر کرتے ہیں:

''میدان زلاقہ (ZALQA) میں دونوں فوجوں نے آمنے سامنے ڈیرے ڈالے اور لڑائی کی تیاریاں کرنے لگے اور ۲۳ اکتوبر ۱۰۸۶ء کو ایک بہت تاریخی خونریز جنگ ہوئی۔ یوسف بن تاشفین اور معتمد کی متفقہ فوجیں اس کے مقابلے پر ساٹھ ہزار تھیں مڈ بھیڑ ہوئی یہ لڑائی تاریخ اندلس میں بڑی اہم ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں کا رعب ایک دفعہ پھر قائم ہو گیا۔ اس لڑائی میں طرفین نے

۱۔ عبرت نامہ اندلس؛ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی/ مولوی عنایت اللہ دہلوی، ص ۱۲۱، ۱۲۲۔

۲۔ تاریخ ہسپانیہ؛ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص ۳۹۲، ۳۹۳۔

کس قدر کوشش اور شجاعت کا مظاہرہ کیا بقول ابن اثیر الفانسو چہارم میدان جنگ سے صرف تین سو آدمی لے کر فرار ہو گیا باقی سب وہیں کھیت ہو گئے۔''[1]

جنگ زلاقہ کا قصہ پروفیسر محمد رضا خان نے اس طرح بیان کیا ہے:

''معتمد نے مرابطی بادشاہ یوسف بن تاشفین سے امداد کی درخواست کی چنانچہ یوسف ایک زبردست فوج لے کر معتمد کے پاس پہنچ گیا۔ زلاقہ کے مقام پر عیسائیوں اور مسلمانوں کی زبردست لڑائی ہوئی جس میں عیسائیوں کو عبرت ناک شکست ہوئی اور الفانسو صرف تین سو سپاہیوں سمیت جان بچا کر فرار ہو گیا۔''[2]

جنگ کے واقعات جن کا تذکرہ ناول نگار نے کیا ہے کسی نہ کسی تاریخ سے ثابت ہیں مثلاً جنگ کا آغاز دھوکے سے ہوا، الفانسو کی افواج نے پہلے اندلسی افواج سے چھیڑ چھاڑ کی مگر جب امیر یوسف کے دستے ان کی مدد کو آ پہنچے تو میدان جنگ میں برابر کی ٹکر نظر آنے لگی۔ افریقی دستوں کا فوج کے عقب پر حملہ آور ہونا لشکر گاہ کو آگ لگا دینا الفانسو کا ران پر زخم کھانا تحقیقی اعتبار سے درست ہے البتہ اول الذکر دونوں روایتوں میں الفانسو کے ساتھ محض چند سوار فرار ہوتے بتائے گئے ہیں جبکہ موخرالذکر دونوں روایتوں میں الفانسو کے ساتھیوں کی تعداد تین سو بیان کی گئی ہے جبکہ ناول نگار نے یہ تعداد پانچ سو بتائی ہے یہ ایک بہت چھوٹا سا اختلاف ضرور سامنے آتا ہے ورنہ دونوں فوجوں کے جمع ہونے سے ابتدائی خط و کتابت جنگ کے آغاز کے دن کا حوالہ اور پھر دھوکہ دہی سے لے کر الفانسو کے زخمی ہو کر فرار ہونے تک کے واقعات درست اور حقیقت پر مبنی ہیں اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ نسیم حجازی تاریخی حقائق میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کرتے یہی ان کی کامیاب ناول نگاری کی خوبی ہے۔

جنگ زلاقہ کے خاتمے کے بعد امیر یوسف چاہتے تھے کہ عیسائیوں کا تعاقب بہت دور تک کیا جائے مگر سبتہ سے یہ افسوسناک خبر آئی کہ جس بیٹے کو بیمار چھوڑ آئے تھے وہ چل بسا۔ اس لئے انہوں نے واپس افریقہ کا قصد کیا۔ ناول نگار کا بیان تقریباً ہر راوی کی روایت کے عین مطابق ہے البتہ کہیں کہیں یہ اختلاف موجود ہے کہ روانگی کا فیصلہ جنگ کے دو روز بعد ہوا یا دس روز بعد یہ بات طے ہے کہ رمضان المبارک کے دوران ہی امیر یوسف واپسی کے لئے روانہ ہو گئے۔ ناول کے واقعات مسلمانوں کی اس ملوک الطوائف ذہنیت کا اظہار کرتے ہیں جس نے اندلس میں عیسائیوں کے قدم جمائے تھے۔ مسلمان جنگ زلاقہ کا کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے البتہ عیسائی ایک بار پھر مجتمع ہوئے اور حصن الیط کے قلعے پر اپنے قبضے کو مستحکم بنانے لگے۔ ایک بار پھر اسلامی اقتدار کا جھنڈا سرنگوں ہوا چاہتا تھا کہ اکابر اندلس اور شاہان اندلس نے ایک سعی کی جس کا حال ناول نگار نے ان الفاظ میں رقم کیا ہے:

''بالآخر جنوب مشرقی اندلس کی ریاستوں کے اکابر کا ایک گروہ مراکش پہنچا اور انہوں نے امیر یوسف کے سامنے فریاد کی ان لوگوں کی منت و زاری سے متاثر ہو کر امیر یوسف نے انہیں تسلی دی اور وعدہ کیا کہ عنقریب سمندر عبور کر کے ان کی مدد کے لئے پہنچ

---

[1] تاریخ ملت اسلامیہ، قاضی عقیل احمد، ص ۲۱۳۔

[2] تاریخ مسلمانان عالم، پروفیسر محمد رضا خان، ص ۴۰۰۔

جائیں گے۔

لورقہ کے قریب عیسائیوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد معتمد کی آنکھیں بھی کھل چکی تھیں۔ اندلس کے عوام سے زیادہ اپنی بے بسی اور مجبوری کے احساس سے وہ بذات خود امیر یوسف کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امیر یوسف اس کے ساتھ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ چند دن امیر یوسف کے پاس قیام کرنے کے بعد معتمد واپس لوٹا تو اندلس کے پریشان حال باشندے یہ خبر سن رہے تھے کہ امیر یوسف جلد آ رہے ہیں۔''[۱]

ان دونوں وفود کی ملاقات کا تذکرہ پروفیسر ڈوزی نے دو مختلف مقامات پر مرقوم کیا ہے۔ پہلے وفد کا حال اس طرح پیش کیا گیا ہے:

''اندلس کے فقیہوں اور بلنسیہ، مرسیہ، لورقہ اور بیاسہ کے رئیسوں نے افریقہ پہنچ کر امیر یوسف کے قصر پر ہجوم کیا اور اپنا اپنا حال ان سے عرض کیا۔''[۲]

دوسرے وفد کی ملاقات کا حال یوں لکھا ہے:

''امیر یوسف نے معتمد کو نہایت تواضع و اخلاق کے ساتھ اپنے پاس ٹھہرایا اور ان کے حالات دریافت کئے اور یہ بھی کہا ''آپ نے خود کیوں تکلیف کی، صرف ایک خط بھیج دینا کافی تھا۔''[۳]

تاریخ ہسپانیہ میں راوی اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''چنانچہ ریاستوں کے علما و فقہا اور سرداروں نے قصر پر ہجوم کیا۔ امیر یوسف بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا ان کی خاطر و مدارت کی اور احوال پرسی کی۔ بلنسیہ والوں کی شکایت یہ تھی کہ راڈرک قنبطور ریحییٰ القادر ذوالنونی سے چھ ہزار اشرفی ماہانہ اس بہانے لیتا ہے کہ ہم تمھارے محافظ ہیں۔ یہ بھاری رقم جبراً وصول کر کے پھر بھی علاقہ بھر کو لوٹتا رہتا ہے۔ ایسی ہی شکایتیں دوسروں نے کیں لیکن امیر یوسف نے صرف یہی وعدہ کیا کہ جب سمندر عبور کرنے کا موسم آئے گا تو پھر تیاری کریں گے۔ اصل میں یوسف کی نیت یہ تھی کہ اندلس کے بادشاہوں میں سے کوئی درخواست کرے تو وہ قدم اٹھائے۔

اس وفد نے آ کر معتمد سے درخواست کی کہ وہ براہِ راست اپنے سفیر بھیج کر یوسف سے عرض کریں معتمد نے دیکھ لیا تھا کہ یوسف نے جزیرۃ الخضر الینے کے بعد کوئی اور لالچ نہیں کیا۔ وہ خود بھی اپنے خطرات کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک وفد اپنی طرف سے بھیج دیا۔''[۴]

ناول نگار کے بیان اور روایات میں اختلاف سامنے آتا ہے اول الذکر روایت تو ناول نگار کے بیان کے مطابق ہے جبکہ موخر الذکر میں یہ تضاد سامنے آتا ہے کہ معتمد خود امیر یوسف کے دربار میں گیا یا اسکا وفد، انہی روایت کے تضاد کا فائدہ اٹھا کر ناول نگار نے

---

[۱] یوسف بن تاشفین، نسیم حجازی، ص ۴۰۴، ۴۰۵۔

[۲] عبرت نامہ اندلس؛ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی / مولوی عنایت اللہ دہلوی، ص ۱۱۲۷۔

[۳] ایضاً، ص ۱۱۲۸۔

[۴] تاریخ ہسپانیہ؛ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص ۳۹۵۔

روایت کو قلم بند کیا ہے۔

ناول کے واقعات کا تاریخی تسلسل ملوک الطوائف کی حکومتوں کا خاتمہ اور مرابطین کا اندلس پر مکمل قبضے تک ہے چونکہ معتمد ہی نے امیر یوسف کو اندلس آنے کی دعوت دی تھی اور بدعہدی کرنے کا قصوروار بھی تھا اس لئے مرابطین نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا اُسے ناول نگار نے ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:

''مرابطین نے اہل اشبیلیہ کے تعاون سے فصیل کو ایک جگہ سے توڑ دیا اور شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے معتمد کے محل پر حملہ کر دیا اور سیڑھیاں لگا کر محل کی فصیل کے اوپر چڑھ گئے معتمد کا ایک اور بیٹا مالک محل کی حفاظت کرتا ہوا مارا گیا۔

معتمد نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن بالآخر اپنے چاروں اطراف مایوسی کی گھٹائیں دیکھ کر ہتھیار ڈال دیے۔

سیر بن ابوبکر نے معتمد، ملکہ رمیکیہ، شہزادہ رشید اور شاہی خاندان کے باقی افراد کو گرفتار کر کے طنجہ بھیج دیا۔''[۱]

اس بارے میں علامہ حافظ ابوالفدا اعماد الدین ابن کثیر دمشقی درج کرتے ہیں:

''اس سال امیر المسلمین یوسف بن تاشفین نے بلاد مغرب کے حکمران کے بعد اندلس کے بہت سے شہروں پر قبضہ کر لیا اور اس کے حکمران المعتمد بن عباد کو قید کر لیا اور اسے اور اس کے اہل کو قید خانے میں ڈال دیا۔''[۲]

اس واقعہ کو پروفیسر محمد رضا خان نے اس طرح رقم کیا ہے:

''یوسف بن تاشفین اگلے سال اندلس پہنچ گیا اور اکثر ریاستوں پر اپنا تسلط جما لیا۔ اس موقع پر معتمد نے عیسائیوں سے یوسف بن تاشفین کے خلاف سازباز کی اس مذموم حرکت کی پاداش میں اسے ۴۸۴ھ میں گرفتار کر کے افریقہ بھیج دیا گیا۔''[۳]

قاضی عقیل احمد اس واقعہ کی تفصیل اس طرح لکھتے ہیں:

''چنانچہ ۴۸۴ھ میں یوسف بن تاشفین نے معتمد کو گرفتار کر کے مراقش کے ایک مقام اغمات میں قید کر دیا۔''[۴]

مصنف تاریخ ہسپانیہ نے اشبیلیہ کی فتح کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے، ہم واقعہ کے اہم حصے کو نقل کرتے ہیں:

''معتمد پھر قصر میں آیا یہاں خودکشی کا خیال آیا لیکن اسے خلاف شرع سمجھ کر ترک کر دیا اور اطاعت اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے رات ہی کو اپنے فرزند رشید کو سیر بن ابوبکر کے پاس بھیجا کہ صلح کی شرائط طے کی جائیں۔ ابوبکر نے شرائط طے کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اپنے آپ کو غیر مشروط طور پر حوالے کر دو۔

ناچار معتمد اور رشید دونوں سب لواحقین اور فوج کو روتا ہوا چھوڑ کر ابن ابوبکر کے پاس چلے گئے۔''[۵]

۱؎ یوسف بن تاشفین؛ نسیم حجازی، ص ۴۷۱، ۴۷۲۔

۲؎ تاریخ ابن کثیر؛ علامہ حافظ ابوالفدا اعماد الدین ابن کثیر دمشقی / مولانا اختر فتح پوری، ص ۲۷۷۔

۳؎ تاریخ مسلمانان عالم؛ پروفیسر محمد رضا خان، ص ۴۰۱۔

۴؎ تاریخ ملت مسلمہ؛ قاضی عقیل احمد، ص ۳۱۴۔

۵؎ تاریخ ہسپانیہ؛ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص ۴۰۱، ۴۰۲۔

پروفیسر ڈوزی رقمطراز ہیں:

''ایک مرتبہ پھر معتمد نے موت کو جوان سے بچنا چاہتی تھی تلاش کیا، انھوں نے اپنے سپاہیوں کو جمع کیا اور مرابطین کے اس دستۂ فوج پر جو قصر میں داخل ہو گیا تھا حملہ کیا اور اسے قصر سے باہر نکال دیا، جو لوگ فصیل پر چڑھ آئے تھے انہیں دریا میں دھکا دے دیا گیا۔ اس ہنگامے میں معتمد کے ایک فرزند جن کا نام مالک تھا کام آئے لیکن معتمد کو کوئی ضرر نہ پہنچا، معتمد جب قصر میں واپس آئے تو خود کشی کا ارادہ کیا لیکن خدا کی نظر میں ایسے کام کو برا سمجھ کر اس کا خیال دل سے نکال ڈالا اور آخر کار مرابطین کی اطاعت اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔

جب رات ہوئی تو معتمد نے اپنے فرزند رشید کو سیر بن ابو بکر کے پاس اس امید سے بھیجا کہ شاید صلح کی کچھ شرطیں منظور کر جائیں لیکن یہ امید بے کار ثابت ہوئی۔ رشید نے بہت چاہا کہ سیر بن ابو بکر سے بالمواجہ گفتگو ہو مگر کامیابی نہ ہوئی اور ابن ابو بکر نے رشید کو کہلا بھیجا کہ اپنے باپ سے کہہ دو کہ بلا کسی شرط کے اطاعت قبول کرے۔

معتمد نے اب مشیت کے سامنے سر جھکا دیا، اپنے اہل و عیال اور روتے ہوئے افسران فوج کو الوداع کہا اور خود اور اپنے فرزند کو مرابطین کے حوالے کر دیا۔''[۱]

ان روایات کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ناول نگار نے تاریخی حقائق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنی کہانی پیش کی ہے واقعات کا تجزیہ کریں تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سیر بن ابو بکر کی زیر قیادت فوج نے اشبیلیہ فتح کیا۔ سیڑھیاں لگا کر محل کی فصیل پر چڑھے۔ معتمد کا بیٹا مالک محل کی حفاظت میں قتل ہوا۔ معتمد نے مجبوراً ہتھیار ڈالے اور اسے گرفتار کر کے افریقہ بھیج دیا گیا یہ واقعہ ۴۸۴ھ کا ہے ان حقائق کے بعد یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نسیم حجازی تاریخی ناول نگاری کے مزاج اور معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے ناول رقم کرتے تھے۔

نسیم حجازی کے تاریخی ناول جہاں تاریخی حقائق کا بہترین اظہار ہیں۔ وہیں اس عہد کی معاشرت اور سماجی حقیقتوں کا عکاس بھی ہیں ناقدین نے تاریخی ناول نگار کے لئے جو اصول وضوابط مرتب کئے ہیں ان کے مطابق ناول اور تاریخ کی تعریف کے بین بین سفر کرتے ہوئے قاری کی دلچسپی کا سامان کرے۔ یہ گمان ہوتا ہے کہ ناول نگار اپنے پسندیدہ تاریخی کردار سے جذباتی لگاؤ کے پیش نظر اُسے بے عیب یا اسم با مسمّیٰ بنا کر پیش کرتا ہے تو یہیں سے مسائل جنم لیتے ہیں لیکن اگر تاریخی ناول نگار اپنی ذاتی خواہشات کو بالائے طاق رکھ کر ادب کے فروغ اور قاری کے شعور کو اجاگر کرنا چاہتا ہے تو اسے تاریخ کا بہترین مطالعہ کرتے ہوئے کہانی کا پلاٹ اس طرح ترتیب دینا چاہیے کہ تاریخی حقائق مسخ نہ ہوں اور اس عہد کی معاشرت رسم و رواج اور تہذیب و تمدن قاری کے سامنے آجائیں۔ اس تصور کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نسیم حجازی نے اپنے ناول یوسف بن تاشفین میں اندلس کے زوال پذیر معاشرے کی خوبصورت عکاسی

---

[۱] عبرت نامہ اندلس؛ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی/مولوی عنایت اللہ دہلوی، ص ۱۱۵۲،۱۱۵۱۔

کی ہے انہوں نے جغرافیائی اعتبار سے ان مقامات کو درست انداز میں پیش کیا ہے جو کہانی کے لئے ضروری تھے مثلاً افریقہ کے مقامات جزیرۃ الخضرا کی بندرگاہ قرطبہ، اشبیلیہ انکے درمیان بہنے والے دریا حصن الئیط کا قلعہ وغیرہ اس کے بعد انہوں نے جنگی معرکوں کا تذکرہ خاص حد تک حقیقت پر مبنی پیش کیا ہے جو پیش آئے تھے مثلاً جنگ زلاقہ میں فوجوں کی تعداد جنگ کے دوران ہونے والی خط و کتابت میدان جنگ کا نقشہ اور جنگ میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد وغیرہ ان حقائق کے ساتھ ساتھ جس معاشرتی حقیقت کو تخیلاتی کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے وہ ان کا کامیاب انداز نگارش ہے۔ پہلے پہل والدین اور ان کی اولاد کے درمیان اطاعت و فرمانبرداری وہ انداز ہے جو مسلمان گھرانوں کی میراث کہا جا سکتا ہے پھر سن بلوغت کو پہنچتے پہنچتے دل کی دھڑکنوں میں انس والفت کی وہ رمق جو عشق ومحبت کی گہرائی تک پہنچ جائے لیکن ان حدود کا پاس رکھنا جو معاشرے کی اقدار کے مطابق ہوں اس سے بھی زیادہ مشکل کام جو نسیم حجازی بڑی خوبی سے کرگزرتے ہیں ان تخیلاتی کرداروں کو ان تاریخی کرداروں کے ساتھ لے کر چلنا ہے یہ ایک جان دو قالب ہو جاتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ڈاکٹر رشید گوریجہ کا خیال ہے:

””بعض لوگ تاریخی ناول کے فن کو عام ناول کے فن سے زیادہ نازک اور اہم گردانتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک تاریخی ناول کچھ اور اہم ادبی مقاصد بھی پورے کرتی ہے اول وہ کچھ زمانوں کے ماحول کو جیتا جاگتا ہمارے سامنے لے آتی ہے دوسرے کچھ مشہور تاریخی ہستیوں کو ان کے صحیح رنگوں میں رنگ کر پھر سے زندہ کر دیتی ہے اور تیسرے کچھ تاریخی واقعات کو اس خوبی سے بیان کر دیتی ہے کہ وہ زندہ وجاوید ہو جائیں۔“[1]

اس معیار پر نسیم حجازی کے تمام ناول اور بالخصوص یوسف بن تاشفین پورا اترتا ہے رہی اس نکتے کی بات کہ جو عظیم مقصد جو نسیم حجازی کے سامنے رہا تو اس کی تشریح ہمارا کام نہیں لیکن پھر بھی وضاحت کے لئے ہم یہ بات کہیں گے کہ نسیم حجازی نے جو موضوعات منتخب کئے وہ عام طور پر زوال پذیر تھے اس کا مقصد انکے نزدیک یہ تھا کہ معاشروں کا بہترین اور کامیاب دور دکھانے کے بجائے زوال پذیر معاشرہ پیش کیا جائے تاکہ ان عوامل اور رجحانات کو بغور دیکھا جا سکے جو اس معاشرے کی تباہی کا باعث بنے اس کام میں وہ کامیاب سوار نظر آتے ہیں۔

---

[1] اردو میں تاریخی ناول از ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۳۱۔

معظم علی کا تحقیقی جائزہ

معظم علی:

''معظم علی'' کی اہمیت یہ ہے کہ یہ برصغیر کے ایک انتہائی اہم دور کے سیاسی حالات کا عکاس ناول ہے۔ جب عظیم الشان مغل حکومت آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ مغل سلطنت کے صوبے دار ایک ایک کر کے خودمختار حکمران بنتے جا رہے تھے۔ بنگال اور دکن کی حکومتیں اہمیت اختیار کر گئی تھیں مرکزی حکومت اور مغل بادشاہ برائے نام بادشاہ تھے۔ وزراء وامراء سازشی اور ضمیر فروش تھے اور انگریز اس کا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے یکے بعد دیگرے ان خودمختار حکومتوں کو شکست دیتے جا رہے تھے اور یوں انگریز کی اقتدار بڑھتا جا رہا تھا، اس ناول میں ہم برصغیر کی سیاسی اور ثقافتی صورت حال کے واضح نقش دیکھ سکتے ہیں۔

اس ناول کے واقعات ۱۷۴۰ء سے ۱۷۵۸ء تک کے ہیں۔ ناول معظم علی میں ان مہیب آندھیوں اور طوفانوں کا ذکر ہے جن کے درمیان سلطان ٹیپو کی شخصیت روشنی کے ایک مینار کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بیشتر کردار میسور سے زیادہ بنگال کی تاریخ کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب ملت کے شہیدوں کی لاشوں پر وطن فروش اپنے اقتدار کی مسندیں آراستہ کر رہے تھے۔ معظم علی اس قوم کا ایک فرد تھا جس نے صدیوں تک اس ملک پر اپنے پرچم لہرائے اور اب وہی سلطنت اپنی تباہی کی مہیب گہرائیوں میں داخل ہو رہی تھی۔ مغل سلطنت کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی نظام الملک کا قبضہ دکن اور محمد علی والا جاہ جو نورالدین خان کا بیٹا تھا کرناٹک کی حکومت پر قابض تھا۔ انگریز اور فرانسیسی تاجر پرتگالی اور ولندیزی حریفوں کو مات دے چکے تھے وہ تجارتی منڈیاں تلاش کرنے کے بجائے ملک کے سیاسی اقتدار کے حصول میں کوشاں تھے۔ محمد علی والا جاہ انگریزوں کی سیاست کا ایک مہرہ تھا اور فرانسیسی دلار چندا صاحب کے طرفدار بن گئے تھے۔ دلی کے تخت کے ساتھ نوابان اودھ کا تعلق بھی برائے نام تھا۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ پر علی وردی خان قابض تھا۔ اس زمانے میں ایک اور بڑی طاقت مرہٹے تھے۔

کہانی کا آغاز مرشد آباد کے قید خانے سے ہوتا ہے جہاں معظم علی بہت سے خیالات اور تصورات میں اپنے ماضی، حال اور مستقبل پر غور کرتا ہے۔ اسے فرحت کے خدوخال اور لڑکپن سے دورِ شباب تک کی وہ کیفیات یاد آتی ہیں جو فرحت کو اس کا مقدر بنا دینے کے لئے کافی تھیں۔ میر جعفر کا یہ قید خانہ اس کی عملی کوششوں کے لیے رکاوٹ ضرور تھا کیونکہ جنگِ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کی شکست بنگال کو انگریزوں کے دائرہ اقتدار میں لے جانے کا باعث بنی۔ وہ مستقبل کے خوش کن خیالات اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ ایک بار پھر اپنے گھر اور فرحت کے پاس جا پہنچے گا مگر بہت جلد قید خانے میں آنے والے دوسرے قیدی اس امید کو توڑ دیتے ہیں۔ ان کی اطلاع کہ فرحت اور اس کی ماں ہجرت کر چکے ہیں وہ خیالات کی ان وادیوں میں کھو جاتا ہے جو بچپن کے حسین لمحات پر مشتمل تھی۔ معظم علی کا باپ علی وردی خان کی محافظ فوج میں شامل تھا۔ اسی محلے کے ایک اور جاگیردار مرزا حسین بیگ سے ان کے گہرے تعلقات تھے یہ تعلقات دونوں حضرات کے علاوہ ان کی بیویوں آمنہ اور عابدہ کے علاوہ ان کے بیٹوں مرزا افضل بیگ اور مرزا آصف بیگ

،یوسف علی و معظم علی کی صورت میں پروان چڑھ رہے تھے۔ مرزا حسین بیگ کی ایک بیٹی فرحت تھی۔ مرزا حسین بیگ نے اپنے بیٹوں کی تعلیمی ضروریات کے لیے عبدالقدوس اور فوجی تربیت کے لئے شیر علی کی خدمات حاصل کی تھیں جن کا دائرہ بعد میں یوسف علی اور معظم علی کی تربیت تک بڑھ گیا۔ تربیت کی تکمیل کے بعد معظم علی کے علاوہ تینوں صاحب زادے فوج میں بھرتی ہو گئے۔ مرزا حسین بیگ کے سمجھانے کے باوجود معظم علی فوجی خدمات سے دور دور رہا اور اپنے خیالات کے ذریعے ملک کے موجودہ حالات اور مقتدر شخصیات پر تنقید کرتا رہا۔ اسی دوران پنڈت بھاسکر کی قیادت میں راگھو جی بھونسلہ کی فوج نے بردوان کی طرف پیش قدمی کی۔ علی وردی خان اپنی افواج لے کر وہاں پہنچ گیا۔ میر حبیب اور چند اور افسر بنگال سے غداری کر کے مرہٹوں کے ساتھ مل گئے۔ مرشد آباد کی طرف خطرہ زیادہ بڑھا تو معظم علی نے رضا کاروں کی ایک جماعت تیار کی اور حسین بیگ کے محل کو ایک فصیل کے ذریعے قلعہ کی شکل دے دی۔ شیر علی کو جگت سیٹھ نے اپنے خزانے کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کر لیا۔ رضا کاروں میں اس کے نوکر صابر اور جمال بھی شامل تھے۔ مرہٹوں نے حملہ کیا اور صلح کی بات چیت کے لئے ایک لاکھ تاوان کا مطالبہ کیا لیکن معظم علی اور اس کے ساتھیوں نے تاوان دینے سے انکار کر دیا اور ان کو اس حملے میں فتح حاصل ہوئی۔ میر مدن کے کہنے سے معظم علی فوج میں شامل ہو کر ہنگلی کا قلعہ جس پر مرہٹے قابض تھے اس قلعے کو حاصل کرتا ہے اور اس قلعے کے کمانداری کی حیثیت سے وہیں رہتا ہے۔ میر جعفر اڑیسہ کا نائب صوبیدار مقرر ہوا تو اس نے میدنا پور اور ہنگلی کی فوجداری بھی حاصل کر لی۔ مرہٹوں اور افغان کے متحدہ حملے اور میر جعفر کی وجہ سے ہنگلی کے قلعے پر شکست سے ہمکنار ہونا پڑا۔ اڑیسہ کی مہم میر جعفر کے بجائے عطاء اللہ خان کو سونپی گئی۔ اس کے ساتھ معظم علی اور آصف بیگ کو جانے کی اجازت ملی مرزا حسین بیگ کے ہاں دعوت میں میر مدن، راجا رام موہن لال، عطاء اللہ خان اور سراج الدولہ تھے۔ اڑیسہ میں مرہٹوں کے پے در پے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ میر جعفر نے مرہٹوں کے ایک لشکر پر حملہ کیا اُن میں آصف بیگ بھی شامل تھا۔ معظم علی یہ سن کر وہاں جاتا ہے تو میر جعفر میدان چھوڑ کر بھاگتا ہے معظم علی نے اسے روکا لیکن وہ نہ رکا اس حملے میں آصف بیگ شہید ہو جاتا ہے۔ معظم علی، میر جعفر سمیت قلعے پر حملہ کر دیتا ہے اور دشمن کو شکست سے ہمکنار کرتا ہے۔ میر مدن، معظم علی سے کہتا ہے کہ میر جعفر اور عطاء اللہ خان کٹک میں حکومت کے خلاف سازش کر رہے ہیں وہاں جا کر اس بات کا خیال رکھو کہ وہ لوگ مرہٹوں سے ساز باز کر نہ پائیں۔ معظم علی کو نائب فوجدار کی حیثیت سے سرحدی اضلاع کا محافظ مقرر کیا گیا۔ عطاء اللہ خان کو معظم علی کے لئے فوج مہیا کرنی تھی لیکن اس نے اور میر جعفر نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس کو آٹھ ساتھیوں کے ہمراہ ہی روانہ کر دیا جو اس کے ساتھ آئے تھے اور میر حبیب کو اطلاع کر دی۔ میر حبیب کے ساتھیوں نے انہیں قید کر لیا۔ یہاں معظم علی کی ملاقات اکبر خان سے ہوئی اکبر خان روہیل کھنڈ کا رہنے والا تھا اس کا باپ عظیم خان گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا۔ مرہٹوں نے اس کو اس لئے قید کیا تھا کہ جب روہیل کھنڈ پر حملہ کریں گے تو خزانہ اکبر خان کے ذریعے حاصل کریں گے میر حبیب نے معظم علی کو اپنا ہم خیال بنانا چاہا لیکن اس کو ناکامی ہوئی۔ میر جعفر، علی وردی خان کو عطاء اللہ خان کا استعفیٰ دیتا ہے اور اس کا وظیفہ مقرر کراتا ہے۔ میر حبیب سے معظم علی، اکبر خان کو حویلی میں آزادانہ گھومنے کی اجازت دلواتا

ہے۔ اکبر خان، مرلی دت سے چابی حاصل کرتا ہے اور معظم علی اور اکبر خان سمیت تمام قیدی فرار ہو جاتے ہیں۔ علی وردی خان میدنا پور کے محل میں مقیم تھا اور سراج الدولہ بھی وہیں تھا۔ میر حبیب کے ساتھ صلح کا سن کر معظم علی مستعفی ہونے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ سراج الدولہ معظم علی سے کہتا ہے کہ ہگلی میں اس کو قابل اعتماد افسروں کی ضرورت ہے اور اگر وہ مستعفی ہونے کا ارادہ بدل دے تو اس کے پاس آئے۔ مرشد آباد پہنچنے پر معظم علی، اکبر خان کے ساتھ روہیل کھنڈ روانہ ہوتا ہے۔ اکبر خان کا بھائی اطہر خان، معظم علی کا دوست بن گیا۔ اس کے بعد معظم علی مرشد آباد میں سراج الدولہ سے ملا اور ہگلی کے قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اڑیسہ میں مرہٹوں نے حملہ کر کے کٹک کے فوجدار میر حبیب کو قتل کر دیا۔ ہگلی اور مرشد آباد کی فوج کٹک سے کچھ دور ڈھاکہ سے میر مدن کے لشکر کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ میر مدن کے ساتھ شوکت بیگ بھی تھا جس کی فرحت کے ساتھ شادی ہونے والی تھی۔ جانو جی نے ایک شدید حملے کے بعد بنگال کی فوج کو میدنا پور کی طرف ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ سراج الدولہ نے معظم علی کو بہار کے جنوب مغربی سرحد کے آخری قلعے کی طرف روانہ کیا۔ معظم علی کے ساتھ شوکت بیگ بھی تھا۔ شوکت بیگ اور اس کے ساتھی رضا کاروں کی حیثیت سے شامل تھے۔ مرہٹوں کے ساتھیوں پر حملہ کرنے میں ایک جگہ شوکت بیگ زخمی ہوتا ہے اور شہید ہو جاتا ہے۔ معظم علی کچھ عرصے بعد مرشد آباد آتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ علی وردی خان بستر مرگ پر ہے۔ علی وردی خان کے بعد انگریزوں نے بنگال کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا۔ معظم علی سرحدی قلعے پر تھا اس نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں شامل ہونا چاہا۔ سراج الدولہ نے فورٹ ولیم پر قبضہ کر لیا اور میر مدن نے معظم علی کو وہیں رہنے کے لئے کہا۔ مرہٹوں نے چوکیوں پر حملے کئے تو معظم علی نے قلعے کی کمان عبدالرحمٰن کے حوالے کی اور خود چوکیوں کا رخ کیا اور اس نے مرہٹوں کو پسپا کر دیا۔ ایک فوجی افسر ہاشم خان نے میدنا پور کے فوجدار کا خط پیش کیا۔ معظم علی روانہ ہوتا ہے تو عبداللہ خان اس کو بتاتا ہے کہ محمود علی، یوسف علی اور افضل بیگ شہید ہو چکے ہیں۔ سراج الدولہ مرشد آباد آئے اور بنگال کو شکست ہوئی۔ میر جعفر نے انگریزوں سے بنگال کی آزادی کا سودا کر لیا ہے۔ میر مدن شہید ہو چکے ہیں۔ سراج الدولہ مرشد آباد چھوڑ کر جا چکے ہیں لیکن اس موقع پر معظم علی میدنا پور جانے کے بجائے مرشد آباد کا رخ کرتا ہے۔ رستے میں خبر ملی کہ سراج الدولہ کا قتل ہو چکا ہے۔ میر جعفر نے لارڈ کلائیو کی سرپرستی میں بنگال کی حکومت سنبھال لی اور سراج الدولہ کے وفادار ساتھیوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔ مرشد آباد میں داخل ہونے کے بعد عبداللہ اپنے گھر چلا گیا۔ معظم علی اپنے گھر پہنچا تو وہاں اس کی ماں اور ایک بوڑھی ملازمہ حمیدہ تھیں۔ اس کی ماں بیمار تھی اور حکیم احمد خان کے زیر علاج تھی۔ وہ اس کو بتاتی ہے کہ اس کی امانت کہاں ہے اس کی ماں حیات کا سفر ختم کر چکی تھی فرحت وہاں آئی اور صابر کو اٹھایا۔ والدہ کو دفنانے کے بعد وہ حسین بیگ کے گھر گیا وہاں میر میرن آیا۔ وہ اپنے باپ کے لئے وفاداری کا حلف لینا چاہتا تھا انکار کی صورت میں اس نے معظم علی کو گرفتار کر لیا اور حسین بیگ کو بنگال چھوڑ کر جانے کا حکم دیا۔ معظم علی کو مرشد آباد کے قید خانے میں کچھ عرصہ گزر اتو اسے میر ناصر کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ میر ناصر نے سات سال کی سزا سنائی ایک رات میر ناصر، معظم علی کو میر قاسم کے پاس لے کر گیا لیکن معظم علی نے میر قاسم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود میر قاسم نے معظم علی کو آزاد کر دیا۔ معظم علی اپنے گھر

سے اس تھیلی کو جس کی اس کی ماں نے ہدایت کی تھی لیکر صابر کے ہمراہ روانہ ہوا۔ وہ لکھنو پہنچے وہاں اس نے کھانا پکانے کے لئے اور گھوڑوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک نوکر رکھا جس کا نام دلاور خان تھا۔ لکھنؤ میں اس کی ملاقات شیر علی سے ہوئی اس نے بتایا کہ حسین بیگ کا انتقال ہو گیا اور ان کی بیوی اور بیٹی ایک قافلے کے ہمراہ روانہ ہوئی ہیں۔ اس قافلے میں بعض آدمی آگرہ، لکھنؤ، فیض آباد اور دلی جانے والے تھے یا حیدر آباد میں ان کے عزیز ارشد بیگ ہیں ممکن ہے وہاں گئی ہوں۔ معظم علی، شیر علی کو اپنے ساتھ لایا اور دو ہفتے بعد پانچ سو اشرفیاں شیر علی کو دیکر دلاور خان کے ساتھ فیض آباد، روہیلکھنڈ، آگرہ، دلی اور حیدر آباد کی طرف روانہ ہوا۔ ایک گھنے جنگل میں اس کی ملاقات اکبر خان سے ہوئی پانچ دن کے قیام کے بعد معظم علی نے آگرہ اور دہلی جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اکبر خان بھی اس کے ساتھ ہو لیا اس کے چچا نے ان کے ساتھ آٹھ آدمی روانہ کئے۔ دلی میں معظم علی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتا، حیدر آباد کا رخ کرتا ہے تو راستے میں ایک قافلے کو مرہٹوں کے گھیرے میں دیکھ کر حملہ کر دیتا ہے اور مرہٹے پسپا ہو کر فرار کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ فخر الدین ایک تاجر تھا جو اس قافلے میں شامل تھا اس کے ساتھ اس کی دو بھانجیاں عطیہ، بلقیس اور ان کی ماں بھی تھیں۔ اس کا کاروبار میسور سے کرناٹک تک پھیلا ہوا تھا معظم علی اس کے ہمراہ حیدر آباد پہنچتا ہے تو حیدر آباد میں فخر الدین، حسین بیگ کے رشتے داروں کو بلواتا ہے تو ارشد بیگ، شوکت بیگ کا باپ اور عبدالکریم آتے ہیں لیکن انہیں فرحت اور اس کی ماں کے بارے میں کوئی معلومات نہ تھیں۔ فخر الدین اس کو اپنی بھانجی عطیہ کا رشتہ دیتا ہے لیکن وہ انکار کر دیتا ہے فخر الدین کاروبار کے سلسلے میں معظم علی کی مدد کرتا ہے اور اسے گھوڑوں کی تجارت کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ واپسی پر دلاور، خان صابر اور شیر علی سے کہتا ہے کہ وہ گھوڑوں کے رکھنے کے لئے انتظام کریں وہ لکھنؤ شہر کے مضافات میں ایک سرائے خرید لیتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھی عورت اور اس کی بیٹی بھی رہتی ہیں۔ معظم علی نے شیر علی کو بنارس کے راجا کے چچا زاد بھائی کے ساتھ تیس گھوڑوں کے ہمراہ روانہ کیا۔ شیر علی وہاں سے ان پیسوں سے کپڑا خرید کر لے آتا ہے۔ دتاجی سندھیا کی افواج نجیب الدولہ کو مغلوب کر رہی تھیں یہ سن کر اکبر خان روانہ ہوتا ہے، وہ دونوں عورتیں فرحت اور اس کی ماں تھیں۔ عابدہ کا علاج کرانے کے بعد معظم علی فرحت سے شادی کر لیتا ہے اور اس کو عطیہ کے متعلق بتاتا ہے فرحت اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتی ہے۔ معظم علی کا کاروبار کافی وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ اکبر خان، نجیب الدولہ کی فوج میں شامل ہو گیا اور احمد شاہ ابدالی ان کی مدد کو پہنچ گیا۔ دلی کے غدار وزیر عماد الملک غازی الدین نے شہنشاہ عالمگیر ثانی اور وزیر انتظام الدولہ کو قتل کرا دیا۔ دتاجی سندھیا، ابدالی کے مقابلے کے لئے روانہ ہوا۔ ابدالی کے ساتھ روہیلہ اکابر نجیب الدولہ، حافظ رحمت خان، سعد اللہ خان، مولا سردار شامل تھے۔ دتاجی مارا گیا اور اس کی جگہ اس کا بھتیجا جنکو جی آیا جس کے ساتھ راؤ ہلکر کی فوج بھی تھی۔ جہاں خان نے انہیں بھی شکست سے ہمکنار کیا حیدر آباد کے توپخانے کا کمانڈنٹ ابراہیم گاردی نظام سے غداری کر کے بالاجی سے مل گیا۔ سداشیو راؤ کے ساتھ مل کر مغل سے برسرِ پیکار ہوئے تو نظام نے شرمناک شرائط پر صلح کر لی۔ جہاں خان اور ابدالی کی افواج نے مرہٹوں کو پیچھے دھکیلنا شروع کیا پیشوا کو مرہٹوں کی شکستوں کی خبر ملی تو یہ شکستیں ان کی قوم کی عزت اور وقار کا مسئلہ بن گئیں اور ایک تاریخی فوجی قوت بیدار ہوئی۔ معظم علی بھی میدان

جنگ کی طرف روانہ ہوا اور ابدالی کے لشکر میں شامل ہو گیا۔ ابدالی کے لشکر نے دریا عبور کیا تو بھاؤ جی نے اپنے لشکر کو پانی پت کی طرف سے ہٹا کر شہر کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ ابدالی نے پانی پت کا رخ کیا اور مرہٹوں سے آٹھ میل دور پڑاؤ ڈالا۔ دوڑ دھائی ماہ فریقین کے درمیان معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں جنگ کی ابتدا مرہٹی توپوں کی آتش بازی سے ہوئی جنگ کے ابتدائی دور میں مرہٹوں کا پانسا بھاری تھا لیکن شام تک ان کی فوج میدان سے بھاگ نکلی، ابدالی کے لشکر نے اُن کا پیچھا کیا ان میں سب سے آخر میں واپس آنے والے معظم علی اور اس کے ساتھی تھے۔ پانی پت کی شکست مرہٹہ تاریخ کی ایک مکمل شکست تھی۔ ابدالی کی فوج دلی کا رخ کر رہی تھی۔ معظم علی کو اسد خان ملا جو حیدر علی کا پیغام لے کر ابدالی کے پاس میسور سے آیا تھا اسد خان نے معظم علی کو سرنگا پٹم آنے کی دعوت دی۔ دوران جنگ معظم علی کے یہاں بیٹے کی ولادت ہوئی جس کا نام صدیق علی تجویز کیا گیا۔ معظم علی اودھ واپس آیا تو یہاں کے حالات میں درستگی کے لئے کوشش کرنے لگا جس پر شجاع الدولہ کہتا ہے کہ وہ لکھنؤ کے بجائے حیدر آباد جا کر قوم کے مسائل حل کرے۔ معظم علی حیدر آباد کا سفر کرتا ہے تو اس کے ہمراہ بیوی، ساس، بیٹا اور اکبر خان بھی تھے۔ فرحت، عطیہ اور بلقیس سے ملتی ہے اور یہ آپس میں گھل مل جاتی ہیں ان کے قیام کے دوران عطیہ کی شادی طاہر بیگ سے کی جاتی ہے جبکہ بلقیس کا رشتہ اکبر خان سے طے ہو جاتا ہے یہاں معظم علی کی ملاقات اسد خان سے ہوئی تو اس مرتبہ وہ اکبر خان کے ہمراہ سرنگا پٹم کا سفر کرتے ہیں جہاں ان کی ملاقات حیدر علی اور فتح علی سے ہوئی اس موقع پر فتح علی، معظم علی سے پانی پت کی جنگ کا نقشہ بنانے کی فرمائش کرتا ہے اور پھر نقشہ دیکھ کر مختلف سوالات کرتا ہے اس موقع پر معظم علی خود کو ماضی میں کھویا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس ملاقات کے بعد معظم علی اور اکبر خان واپس حیدر آباد آتے ہیں جہاں اکبر خان کی شادی بلقیس سے ہو جاتی ہے۔ شادی کے بعد اکبر خان بلقیس کے ہمراہ اودھ کی طرف اور معظم علی، فرحت کے ہمراہ سرنگا پٹم کا رخ کرتا ہے اس کے یہاں دو بیٹوں مسعود علی اور انور علی کی ولادت ہوتی ہے۔

دوسری طرف بنگال میں میر جعفر کی جگہ میر قاسم کو گدی پر بٹھایا گیا مگر کچھ ہی عرصے بعد میر جعفر کے بیٹے نجم الدولہ کو بھاری خراج کے عوض بنگال کا حکمران بنا دیا گیا۔ جبکہ ابدالی پانی پت سے واپسی پر سکھوں کی بغاوتوں کو کچلنے میں مصروف تھا اب مرہٹے، نظام اور انگریز کی افواج حیدر علی کو اپنا سب سے بڑا دشمن جان کر مشترکہ حکمت عملی تیار کر رہے تھے۔ میدان جنگ میں ان کا آمنا سامنا ہوا تو تینوں افواج پس و پیش سے کام لیتی رہیں حیدر علی نے سفارتی محاذ پر پیش قدمی کرتے ہوئے مرہٹوں اور نظام سے صلح کر لی اور انگریزوں کی طرف جھپٹا اور انہیں دھکیلتا ہوا مدراس کے قریب جا پہنچا۔ جہاں صلح نامہ تیار ہوا۔ آٹھ ماہ بعد مرہٹے حملہ آور ہوئے تو میسور کی حکومت کو مجبوراً صلح کرنی پڑی کیونکہ معاہدۂ مدراس کی رو سے انگریز اس کی مدد کو نہیں پہنچے تھے۔ معظم علی نے جو سرنگا پٹم کی فوجی تربیت گاہ میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ سفارتی محاذوں پر بھی اپنی صلاحیتیں منوا چکا تھا کئی سال کی جنگی مصروفیات کے بعد اکبر خان کو بذریعہ خط اپنی خیریت سے مطلع کیا، جس میں خوشدامن کی وفات کی اطلاع بھی دی اکبر خان کو سرنگا پٹم آنے کی دعوت بھی دی۔ تھی اس خط کے جواب میں اکبر خان نے بلقیس کی ماں کے انتقال کی خبر اور اپنے بڑے بیٹے کی وفات کی اطلاع دی۔ اپنے بیٹے شہباز

اور بیٹی تنویر کی بابت بھی مطلع کیا ساتھ ہی مرہٹوں کے حملوں کے بارے میں بتایا اور خود ان میں مصروف رہ کر حافظ رحمت کی مدد کرنے سے متعلق مطلع کیا۔ اکبر خان نے سرنگا پٹم آنے کی دعوت قبول کر لی لیکن اسی دوران حیدر علی مستقبل کے خطرے کو بھانپ کر ایک سفارت اودھ اور روہیل کھنڈ کے لئے معظم علی کی صورت میں روانہ کرتا ہے۔ اودھ پہنچ کر یہ افسوس ناک اطلاع معظم علی کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے کہ اودھ کی افواج روہیلکھنڈ پر چڑھائی کر چکی ہیں وہ سفارتی فرائض ایک طرف رکھ کر خود اکبر خان کے علاقے کی طرف روانہ ہو جاتا ہے روہیل کھنڈ میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی معظم علی بکھرے ہوئے جوانوں کو اکٹھا کرتا ہے اور اچھی حکمت عملی کے ذریعے اودھ اور انگریز فوج سے اکبر خان اور اس کے ساتھیوں کو رہا کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ سب حیدر آباد کر رخ کرتے ہیں جبکہ ایک قافلہ افغانستان کی طرف چلا جاتا ہے۔ معظم علی میسور روانہ ہونے سے پہلے اکبر خان سے کہتا ہے کہ اگر اسے حیدر آباد میں مشکلات کا سامنا ہو تو میسور کا رخ کرے اور خود سرنگا پٹم کی راہ لیتا ہے۔ ایک سال بعد معظم علی، فخر الدین کی معرفت سے اکبر خان کو خط لکھتا ہے تو ایک مہینے بعد اس کو جواب ملتا ہے جس میں اکبر خان اسے بتاتا ہے کہ اس کا قبیلہ وہاں آباد ہو چکا ہے اور اگر کبھی سرنگا پٹم آیا تو صرف اور صرف معظم علی سے ملنے کے لئے آئے گا یہ اس کا اپنی جائے پناہ سے پہلا اور آخری خط تھا اس کے بعد یہ دونوں دوست اپنی اپنی دنیا کی تعمیر میں مصروف رہے۔ چھ سال بعد صدیق علی سترہ سال کی عمر میں جہاز رانی کا تجربہ حاصل کر کے منگلور جا چکا تھا مسعود علی، انور علی، مراد علی فوجی درس گاہ میں تعلیم پا رہے تھے انگریزوں کے مظالم انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ میر جعفر کے پسماندگان سے وارن ہیسٹنگز نے لاکھوں روپے وصول کئے۔ لوٹ مار کے خلاف آواز بلند کرنے والے نندکمار کو پھانسی دی اور راجا چیت سنگھ کو گرفتار کرنا چاہا تو عوام نے انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہیسٹنگز بھاگا اور ایک بڑی فوج کے ساتھ چڑھائی کی راجا جان بچانے کے لئے گوالیار کی طرف بھاگا۔ شجاع الدولہ کے بعد اودھ کی حکومت آصف الدولہ کے ہاتھ آئی۔ وارن ہیسٹنگز نے اس سے پندرہ لاکھ کا مطالبہ کیا اس نے برٹش ریزیڈنٹ کی مدد سے پانچ لاکھ پونڈ کی رقم اس شرط پر دی کہ انگریز ان سے کوئی مطالبہ نہ کریں گے لیکن انگریزوں نے مڈلٹن کی ناکامی کے بعد برسٹوف کو بھیجا اور اودھ کی بیگمات نے سب کچھ ان کے حوالے کر دیا۔ عالم ثانی مرہٹوں کی سرپرستی میں دلی کے تخت پر رونق افروز تھا۔ محمد علی والا جاہ بظاہر کرناٹک کا حکمران تھا لیکن وہاں انگریز قابض تھے۔ والا جاہ یہ چاہتا تھا کہ انگریز میسور فتح کر لیں لیکن حیدر علی نے کرناٹک پر حملہ کر دیا۔ مدراس کے گورنر نے قیادت ہیکٹر منرو کو سونپی اور کرنل بیلی کو بلوایا۔ حیدر علی نے ٹیپو کو کرنل بیلی کا راستہ روکنے کے لئے بھیجا۔ ٹیپو نے اس لشکر پر حملہ کیا تو حیدر علی بھی اس کے ساتھ آملا۔ اُن کے دیسی سپاہی بھاگ نکلے اور یورپین سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ سر ہیکٹر منرو اس شکست کا سن کر مدراس کی طرف چلا گیا حیدر علی نے ارکاٹ کا رخ کیا تو محمد علی اپنے ساتھیوں سمیت بھاگ نکلا اور ارکاٹ میں حیدر علی کی فتح کا پرچم لہرانے لگا۔ ست گڑھ اور ابنور کے قلعوں پر قبضہ کرنے کے بعد ٹیپو نے تیاگڑھ کی طرف پیش قدمی کی انہوں نے صلح کرنی چاہی لیکن آئرکوٹ کے آنے کا سن کر جنگ دوبارہ شروع کی۔ آئرکوٹ رسد کے لئے رک گیا تو انہوں نے دوبارہ صلح کرنا چاہی لیکن ٹیپو نے حملہ کر کے قلعہ فتح کر لیا۔ بریتھ ویٹ کو شکست دے کر ٹیپو نے تنجور کے بیشتر

علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ حیدر علی کی ہدایات پر ٹیپو پوالونود کی طرف بڑھا اور وہاں سے اس نے کڈلور پر قبضہ کرلیا۔ حیدر علی اور ٹیپو کے لشکر نے مل کر پرموکل کے پہاڑی قلعے پر قبضہ کرلیا۔ جنرل آئر کوٹ نے مدد دینے کے لئے پیشقدمی کی لیکن جس رفتار سے میسور کے خلاف قوت آزمائی کے لئے آیا تھا اس سے زیادہ رفتار سے واپس مدراس کا رخ کیا۔ معظم علی فوجی تربیت گاہ میں نگران کے فرائض انجام دے رہا تھا اس کا بیٹا صدیق علی جنگی جہاز کا کپتان تھا۔ مسعود علی بری فوج میں شامل ہو چکا تھا، انور علی جرنیل غازی کی قیادت میں جنگ کو روانہ ہو چکا تھا۔ صدیق علی نے ایک دن آکر بتایا کہ وہ کالی کٹ سے آرہا ہے اور ماہی کے قریب دو انگریزی جہازوں نے حملہ کر دیا تھا۔ فرانسیسی ملاحوں کی مدد سے وہ یہاں تک پہنچے انگریزوں نے تیلی چری اور ماہی پر قبضہ کر کے کالی کٹ پر حملہ کر دیا اور انہیں کامیابی ہوئی۔ ایک دن صابر نے اسد خان کے آنے کی اطلاع دی۔ اسد خان نے بتایا کہ اسے ارکاٹ پہنچنے کا حکم ملا ہے۔ برہان الدین کے خط سے حیدر علی کی ناسازی طبع ظاہر ہوتی ہے۔ میسور کی افواج ارکاٹ سے چند میل دور پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ ٹیپو ملیبار کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے حیدر علی کے پاس آتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میسور میں ابھی اجتماعی خصوصیات کا فقدان ہے۔ عوام سے پہلے ان امراء سے سابقہ پڑے گا جو اسلام کے نعرے کو اپنے اقتدار کے خلاف اعلان جنگ سمجھتے ہیں۔ ٹیپو کی افواج نے جب ملیبار میں رام گلی کے دروازے پر دستک دی تو ہمبرا سٹون کی قیادت میں انگریزی فوج نے بھاگنا زیادہ مناسب سمجھا۔ انہوں نے دریا عبور کر کے یونان کا رخ کیا کرنل میکلوڈ کی کمان میں ایک فوج ان کی مدد کے لئے پہنچ چکی تھی۔ ٹیپو فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے حیدر علی کی وفات کی خبر ملی۔ محمد علی والا جاہ جنرل اسٹورٹ کو میسور پر حملہ کرنے کی تاکید کرتا ہے تو اسٹورٹ کہتا ہے کہ ایک ماہ بعد وہ میسور پر چڑھائی کر دیں گے۔ میسور پر حملے کے لئے جنرل اسٹورٹ نے ونڈی وش کی طرف سے پیش قدمی کی جبکہ یونان سے جنرل میکلوڈ کی افواج بڈنور اور میتھوز کی کمان میں اونور کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ سلطان ٹیپو نے جنرل اسٹورٹ کو ونڈی وش کے قریب جالیا اور پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اسٹورٹ کی پسپائی سے مدراس میں کمپنی کے ایوانوں میں زلزلہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ صدیق علی کے جنگی جہاز پر ناصر الدین اس کی بیٹی رضیہ ایک خادمہ اور دو نوکر کافی بحث کے بعد سوار ہو کر کنڈاپور کا رخ کر رہے تھے۔ انگریزی جہاز کے حملے کے ڈر سے صدیق علی انہیں کشتی میں سوار کرانا چاہتا ہے لیکن رضیہ انکار کر دیتی ہے کچھ دیر میں معلوم ہوتا ہے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ صدیق علی ان لوگوں کو کنڈاپور کے قلعے دار تک پہنچاتا ہے وہاں اس کی اپنے بھائی مسعود سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ بتاتا ہے کہ اسد خان بھی یہیں ہے۔ قلعہ دار صدیق علی کو کہتا ہے غلے کے لئے اس کو چند دن انتظار کرنا پڑے گا جبکہ منگلور کے فوجدار نے اسے فوراً واپس آنے کا کہا تھا۔ اسد خان سے ملنے کے بعد جب صدیق علی واپس جہاز پر جاتا ہے تو اسے افتخار الدین ملتا ہے وہ دعوت پر مسعود علی اور صدیق علی کو قلعے میں لے جاتا ہے وہاں قلعہ دار آتا ہے اور بتاتا ہے کہ بڈنور سے صوبیدار کا ایلچی آیا ہے اور اس کی تاکید ہے کہ آپ کو یہاں سے فوراً روانہ کر دیا جائے۔ ناصر الدین رات کے وقت جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ رات میں انگریز، صدیق علی کے جہاز پر حملہ کر دیتے ہیں اور اس کا جہاز ڈوب جاتا ہے اور صدیق علی یہ دیکھتا ہے کہ قلعے دار کی توپیں خاموش ہیں اور مشعلیں ان کی نشاندہی کر رہی ہیں اور صبح تک کنڈاپور

پر انگریز اپنی فوج اتار کر اس پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ صدیق علی پڑاؤ کی طرف اسد خان کے پاس آتا ہے۔ اسد خان جو زخمی حالت میں تھا فوج کی کمان صدیق علی کے سپرد کر کے شہید ہو جاتا ہے۔ بڈنور کے گورنر ایاز خان نے میسور کی سلطنت سے بغاوت کر دی تھی اور اس نے ناصر الدین کو بتایا کہ اس کا حکم تھا کہ قلعہ بغیر کسی مزاحمت کے دشمن کے حوالے کر دیا جائے۔ ناصر الدین، ایاز خان کی بغاوت کا سن کر اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتا ہے مسعود علی آکر بتاتا ہے کہ قلعے کے حالات کیا ہے اور وہاں کمک کا انتظار ہو رہا ہے۔ ایاز خان انہیں حیدر گڑھ، اننتا پور اور انور پہنچنے کا حکم دیتا ہے۔ مسعود علی نے افتخار کے شہید ہونے کی خبر ناصر الدین کو دی۔ رضیہ، مسعود علی کے ساتھ کنڈاپور کے لئے روانہ ہوتی ہے راستے میں وہ بتاتی ہے کہ ایاز خان نے غداری کی ہے اور بڈنور کے قلعے انگریزوں کے قبضہ میں دینے کا فیصلہ کر چکا ہے اور رضیہ سے زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے اور اگر ناصر الدین کو موقع ملا تو وہ خشکی کے راستے منگلور یا سرنگا پٹم چلے جائیں گے۔ مسعود علی آکر صدیق علی کو تمام باتیں بتاتا ہے۔ صدیق علی قلعہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا وہ مسعود علی کو شموگہ کی طرف روانہ کرتا ہے رضیہ اس کے ساتھ جاتی ہے۔ حسن گوی کے درے کے قریب صدیق علی کی فوج جنرل میتھیوز پر حملہ کرتی ہے لیکن وہ ان حملوں سے متاثر نہیں ہوتا اور حیدر گڑھ کے قلعہ پر قابض ہو جاتا ہے اور بڈنور پر میسور کے بجائے انگریزوں کا پرچم لہرانے لگتا ہے۔ مسعود علی نے شموگہ کے قلعے دار کو حالات سے باخبر کیا سلطان کی فوج کا ایک افسر لطف علی چند دستوں کے ساتھ چتل ڈرگ سے یلغار کرتے ہوئے آیا اور اس نے سلطان کے لشکر کے آنے کی خبر سنائی۔ صدیق علی رضیہ کو اس کے باپ کی موت کی خبر سناتا ہے اور اسے سرنگا پٹم اپنے گھر بھیجنے کا فیصلہ کرتا ہے اور خود اننت پور کی مہم پر روانہ ہو جاتا ہے۔ انگریز ان سے قلعہ خالی کرنے کے لئے کہتے ہیں لیکن وہ انکار کر دیتے ہیں۔ رضیہ سرنگا پٹم جانے کے بجائے قلعہ پر پہنچ جاتی ہے۔ بارود کم ہونے اور کمک نہ پہنچنے کی وجہ سے صدیق علی کو انگریزوں کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے پڑے۔ رضیہ اور صدیق علی کے درمیان الفت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ مسعود علی قلعے میں ہی شہید ہو چکا تھا انگریزوں نے تمام آدمیوں کو باندھ کر فائر کرنا شروع کیا تو رضیہ صدیق کے سامنے آگئی اور دونوں شہید ہو گئے۔ بہت سی لڑکیوں نے دشمن کی وحشت اور بربریت سے بچنے کے لئے قلعے کے کنویں میں کود کر جان دے دی۔ بیمار اور زخمیوں کے علاوہ قلعے کے تمام محافظ اپنا سفر حیات ختم کر چکے تھے۔ معظم علی کو ایاز خان کی غداری اور انگریزوں کے قابض ہونے کی خبر تھی لیکن صدیق علی اور مسعود علی کے شہید ہونے کی خبر نہیں تھی۔ لطف علی نے اس کو ان دونوں کی شہادت کا بتایا اور سلطان ٹیپو کا خط دیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اگر وہ چاہے تو جنگ میں شامل ہونے کے لئے آسکتا ہے کیونکہ اس جنگ میں ایسے لوگوں کے مشورے کی ضرورت ہے۔ معظم علی کچھ دن بعد روانہ ہو جاتا ہے۔ میسور کی افواج حیدر گڑھ اور بڈنور کے ارد گرد کئی قلعوں پر قابض ہو چکی تھیں۔ سلطان ٹیپو نے معظم علی کو بڈنور کی صوبیداری سنبھالنے کے لئے کہا وہ حیدر گڑھ کے قلعے پر پہنچا تو وہاں اس کی ملاقات انور علی اور جرنیل غازی سے ہوئی۔ معظم علی نے اننت پور کے قلعے پر حملہ کیا انگریزوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ معظم علی کو وہاں موجود لوگوں نے رضیہ کے متعلق بتایا۔ معظم علی، رضیہ کے لئے ایک بیٹی جیسے جذبات محسوس کر رہا تھا۔ معظم علی نے بڈنور کا رخ کیا وہاں لڑائی شروع ہو چکی تھی لیکن دشمن کی شدید مزاحمت کے

باعث وہ قابض نہ ہو سکے تھے۔ دو فرانسیسی نوجوان ایک گولہ اور ایک مشعل لیکر بھاگ رہے تھے انہوں نے وہ گولہ فصیل کے شگاف میں ڈال دیا لیکن مشعل جلانے سے پہلے ہی دشمن کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ معظم علی نے مشعل کو اس گولے کے فیتے پر ڈال دیا اور وہاں ایک بڑا شگاف ہو گیا لیکن نتیجے میں وہ خود زخمی ہو گیا جب اسے ہوش آیا تو انور علی اسے بتاتا ہے کہ بڈنور شہر فتح ہو چکا ہے صرف قلعہ باقی ہے۔ انور علی سے فرحت کے نام معظم علی ایک خط لکھواتا ہے۔ غازی اور برہان الدین اسے ملتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ شام تک قلعے پر گولہ باری شروع ہو جائے گی۔ ایک رات سلطان معظم علی سے ملنے آتا ہے معظم علی اس کو غداروں سے خبردار رہنے کا کہتا ہے اور باتوں میں ہی سلطان کا ہاتھ ہاتھ میں پکڑے ہوئے معظم علی کا رشتہ حیات سے ٹوٹ جاتا ہے۔ انور علی گھر آ کر فرحت کو معظم علی کی شہادت کی خبر سناتا ہے اور خط اسے دیتا ہے۔ خط میں معظم علی نے لکھا تھا کہ وہ انور علی اور مراد کو بھی حق پرستوں کی اس صف میں دیکھنا چاہتا ہے جس میں یوسف، آصف، افضل اور محمود علی کھڑے تھے۔ انور علی محاذ جنگ پر روانہ ہو جاتا ہے اور بڈنور کے قلعے کی فتح کے بعد منگلور کا شہر اور قلعہ بھی فتح ہو جاتا ہے۔

تحقیقی جائزہ

اس ناول کا آغاز مرشد آباد کے قید خانے میں ایک قیدی کے ذہنی تصورات اور سوچ و بچار سے ہوتا ہے۔ بظاہر یہ کردار جو بطور قیدی دکھایا گیا ہے ایک تخیلاتی کردار ہے لیکن اس ناول کے اکثر کردار اور مقامات جن کا تذکرہ ہم وقتاً فوقتاً کرتے رہیں گے بالکل حقیقی ہیں۔ فی الوقت ہم ناول کے ابتدائی حصے پر توجہ مرکوز کرتے ہیں ۔ یہ منظر نامہ بنگال کا ہے جہاں کا دارالحکومت مرشد آباد ہے اہم تاریخی شخصیات علی وردی خان، نواب سراج الدولہ، میر جعفر، لارڈ کلائیو، پنڈت بھاسکر وغیرہ ہیں حقیقت کے عین مطابق ناول اور تاریخ دونوں جگہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ ناول نگار نے دلچسپی کی خاطر یا قاری کو متوجہ کرنے کے لئے ناول کا آغاز مرشد آباد کے قید خانے سے کیا ہے اور پھر ماضی کے جھروکوں سے اس قیدی کے تصورات جو بنگال کی تاریخ میں پیش کیے ہیں۔ ناول نگار علی وردی خان کے واقعات کو یوں رقم کرتا ہے:

''دلی کے تخت کے ساتھ نوابان اودھ کا تعلق بھی برائے نام تھا ١٧٤١ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی حکومت پر علی وردی خان نے قبضہ جمالیا۔''[١]

ناول نگار کی اس رائے سے باری اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حکومت بنگال کی کونسل کے ایک رکن علی وردی خان (جو اس وقت بہار کا ناظم تھا) نے شجاع الدین کے بیٹے سرفراز کو مرشد آباد کے قریب شکست دے کر بنگال کی صوبے داری پر قبضہ کرلیا۔ اس زمانے میں دلی کی مرکزی حکومت بہت کمزور ہو چکی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علی وردی خان نے بنگال میں آزاد حکومت کی بنیاد ڈالی۔ بنگال کی طرح دوسرے صوبوں نے بھی اپنی اپنی آزادی کا اعلان کردیا۔''[٢]

تقریباً یہی زمانہ صاحبزادہ عبدالرسول نے رقم کیا ہے:

''اس خاندان کے آخری فرمانروا کو ١٧٤٠ء میں علی وردی خان جو کہ بہار کا نائب صوبیدار تھا، نے شکست دی اور سارے بنگال پر قابض ہوگیا۔ علی وردی خان ایک قابل منتظم اور لائق مدبر ثابت ہوا۔ اس نے اڑیسہ کو بھی فتح کیا۔''[٣]

علی وردی خان کے بنگال پر قبضے کے بارے میں شکیل احمد ضیاء یوں رقمطراز ہیں:

''اسی سال (١٧٣٩ء) بہار کے نائب صوبیدار علی وردی خان نے بنگال کے خود مختار حکمران سرفراز خان کو شکست دے، کر سارے بنگال پر قبضہ کرلیا تھا۔''[٤]

---

[١] معظم علی؛ نسیم حجازی، ص ٢١۔

[٢] کمپنی کی حکومت؛ باری، ص ١٠١۔

[٣] تاریخ پاک و ہند؛ صاحبزادہ عبدالرسول، ص ٥٣۔

[٤] تاریخ پاکستان و ہند؛ شکیل احمد ضیاء، ص ٢٨٣۔

یہی رائے انوار ہاشمی کی ہے:

''جسے (سرفراز خان) ۱۷۴۰ء میں بہار کے نائب صوبیدار علی وردی خان نے شکست دی اور خود بنگال پر قابض ہو گیا وہ ۱۷۵۶ء تک بنگال، بہار اور اڑیسہ کا خود مختار حکمران بنا رہا۔''[۱]

اسی رائے سے ڈاکٹر ایم۔اے عزیز نے اتفاق کرتے ہوئے رقم کیا ہے:

"Haji Ahmad invited his brother Ali Vardi Khan who was a powerful deputy Subedar of Bihar . In 1740 A.D. Ali Vardi Khan attacked Bengal Sarfraz Khan fought bravely but was killed. Now the way to power was clear..[۲]

یہاں زمانی اعتبار سے یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ ناول نگار نے ۱۷۴۱ء کا زمانہ لکھا ہے جبکہ مختلف مورخین ۱۷۳۹ء اور ۱۷۴۰ء کا زمانہ رقم کرتے ہیں اگر بغور اس فرق پر غور کریں تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ناول نگار نے ۱۷۴۱ء کا زمانہ بنگال کے بعد اڑیسہ کی فتح تک کا لکھا ہے جبکہ ہم جن مورخین کی رائے نقل کر چکے ہیں وہ بنگال پر حملے کا زمانہ لکھ رہے تھے یقیناً بنگال پر حملہ کرنے نظم و نسق درست کرنے اور پھر اڑیسہ پر حملہ کرنے میں ۱۷۴۱ء تک کا زمانہ لگا ہو گا۔

ایک اور موقع جو تاریخی اعتبار سے ناول نگار نے تحریر کیا ہے یہ ہے:

''ایک دن مرشد آباد میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ پنڈت بھاسکر کی قیادت میں راگھوجی بھونسلہ کی چالیس ہزار مرہٹہ فوج بردوان کی طرف بڑھ رہی ہے علی وردی خان مرشد آباد سے باہر شکار کھیل رہا تھا۔ اس نے مرہٹوں کی پیشقدمی کی خبر ملتے ہی بردوان کا رخ کیا۔''[۳]

ایک اور واقعہ جو اس دوران پیش آیا شکست خوردہ مرہٹہ فوج کا مرشد آباد پر حملہ تھا واپس بھاگتی ہوئی فوج نے یہ جان کر کہ علی وردی خان مرشد آباد سے باہر ہے اور اس کی فوج بھی شہر میں نہیں اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کیوں نہ مرشد آباد پر حملہ کیا جائے اور لوٹ مار کی جائے اس حملے اور حملہ آوروں کی قیادت کے بارے میں ناول نگار رقمطراز ہے:

''معظم علی نے حسین بیگ کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا ''فوجدار کی طرف سے کوئی جواب آیا؟''

''ہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ صبح سے پہلے مرشد آباد پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں اور اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو اہل شہر کو خبردار کرنے کے لئے توپیں چلا دی جائیں گی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ مرہٹہ دستوں کی قیادت میر حبیب کر رہا ہے۔''[۴]

۱۔ تاریخ پاک و ہند، انوار ہاشمی، ص۴۲۔

۲۔ A History of Pakistan, Dr. M.A. Aziz, pg.85.

۳۔ معظم علی؛ نسیم حجازی، ص۴۵۔

۴۔ معظم علی؛ نسیم حجازی، ص۴۷۔

ان دونوں واقعات کے بارے میں باری رقمطراز ہے:

''۱۷۴۱ء میں راگھو جی بھونسلہ (برار) کے ایک جرنیل بکسر راؤ نے بنگال پر حملہ کر کے علی وردی خان کو بردوان کے قریب گھیر لیا۔ میر حبیب کی قیادت میں برار کی فوج نے مرشد آباد لوٹا۔ علی وردی خان کی ہوشیاری نے برار کی فوج کو مرشد آباد سے باہر نکل جانے پر مجبور کر دیا۔''[۱]

اس رائے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مرہٹوں نے پہلے بردوان کے مقام پر علی وردی خان کا مقابلہ کیا اور جب انہیں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا تو انہوں نے مرشد آباد کا رخ کیا لیکن یہاں پہلے پہل اہل شہر نے اس فوج کی راہ میں رکاوٹ ڈالی جب کہ بعد میں علی وردی خان نے بھی مرشد آباد کی طرف توجہ کی اور یوں مرہٹوں کو واپس لوٹنا پڑا۔ بظاہر ناول نگار نے کسی حقیقت سے انحراف کئے بغیر اپنے پلاٹ کا تانا بانا بُنا۔

اس کے بعد بنگال کے سرحدی علاقوں پر مرہٹوں کی چھیڑ چھاڑ جاری رہی مگر علی وردی خان کی بہترین حکمت عملی اپنے علاقوں کے دفاع میں اس کی کامیابی کی ضامن رہی۔ ناول نگار رقمطراز ہے:

''علی وردی خان کبھی اپنے گھر کے غداروں سے لڑتا اور کبھی بیرونی حملہ آوروں سے مقابلہ کرتا۔ جب اندرونی بغاوت کا خطرہ پیش آتا تو وہ مرہٹوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہوتا اور جب مرہٹے دوستی کے تمام معاہدے توڑ کر بنگال کی حدود میں آگھستے تو وہ شکست خوردہ غداروں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے بجائے اٹھا کر گلے لگانے کی ضرورت محسوس کرتا۔

علی وردی خان کو اس لحاظ سے کامیاب سیاست دان کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اپنے حریفوں کے درمیان ایسا توازن قائم رکھا کہ وہ ایک متحدہ محاذ بنا کر اس کے اقتدار پر فیصلہ کن ضرب نہ لگا سکے۔''[۲]

ناول نگار کی اس رائے سے صاحب زادہ عبدالرسول اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس (علی وردی خان) نے اندرونی طور پر امن وامان قائم رکھا اور بڑی دانش سے ملک کو مرہٹوں کی غارت گری سے محفوظ رکھا۔''[۳]

ڈاکٹر ایم۔ اے عزیز بھی اسی رائے سے اتفاق کرتے ہیں:

"Ali Vardi Khan was a capable ruler and a military general. He fought against the Marhatta all his life and defeated them several times.[4]

۱۔ کمپنی کی حکومت، باری، ص ۱۰۱۔

۲۔ معظم علی، نسیم حجازی، ص ۱۰۲۔

۳۔ تاریخ پاک و ہند، صاحبزادہ عبدالرسول، ص ۵۳۔

4. A History of Pakistan, Dr. M.A. Aziz, Pg. 85.

اسی رائے میں زور باری کی اس تحریر سے پیدا ہوتا ہے:

''دس سال کے لڑائی جھگڑوں کے بعد علی وردی نے بنگال کو خوش حال بنانے کی طرف توجہ کی۔ اس نے مٹی ہوئی بستیوں اور اُجڑے ہوئے کھیتوں کو پھر سے آباد کرایا۔ علی وردی کے عہد کی باقی مدت میں بنگالیوں کو کسی آفت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔''[1]

شکیل احمد ضیاء بھی علی وردی خان کی حکمت عملی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں؛

''علی وردی خان کے زمانے میں مرہٹوں نے بنگال پر حملہ کیا لیکن اس نے انہیں شکست فاش دی۔ اس طرح نہ صرف بنگال کو ان کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رکھا بلکہ بالواسطہ طور ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے آباد کردہ شہر کلکتہ کو بھی تباہی سے بچا لیا۔''[2]

ان تمام آراء کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ علی وردی خان نے بیرونی اور اندرونی ہر دو سازشوں کا مقابلہ کیا اور سیاسی اور فوجی اعتبار سے خود کو ایک اچھا منتظم ثابت کیا۔ چونکہ ہر چھوٹی بڑی جنگ یا ہر قسم کے معاملات مورخین قلمبند کرنے سے قاصر رہے ہیں اس لئے ناول نگار نے تخیل کا سہارا لے کر اپنے ممدوحین کو مختلف محاذوں پر دکھایا ہے البتہ یہ خیال ضرور رکھا کہ جس اہم محاذ پر کوئی بھی تاریخی شخصیت موجود ہو اسے جوں کا توں پیش کرے۔

علی وردی خان کی موت اور سراج الدولہ کی تخت نشینی، ادھر سازشوں کا جال مگر اس موقع پر سراج الدولہ کی جواں مردی اور ہمت قابل داد ہے۔ بقول ناول نگار:

''علی وردی خان کے آنکھیں بند کرتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا۔ انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں، قلعوں اور اسلحہ خانوں میں تبدیل ہونے لگیں اور وہ حریص قسمت آزما جو قوم کی عزت اور آزادی کو مالِ تجارت سمجھتے تھے انگریزوں کے ساتھ ساز باز کرنے لگے۔ سراج الدولہ کو انگریزوں کے عزائم کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی اور اس نے مسندِ حکومت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف توجہ کی۔ انگریز تاجر، حکومت بنگال کے ساتھ اپنے سابقہ معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر قلعہ بندیوں میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ مصالحت کی گفتگو بے نتیجہ ثابت ہو چکی تھی اور سراج الدولہ کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ بنگال کی حکومت کے لئے دعویداروں کو صرف ایک فوجی شکست ہی راہ راست پر لا سکتی ہے چنانچہ ایک دن فورٹ ولیم کے سفید فام محافظ شیر بنگال کی گرج سن رہے تھے۔''[3]

اور دیگر سازشوں کا ذکر جن سے سراج الدولہ دوچار تھا ڈاکٹر ایم۔ اے۔ عزیز نے اس طرح کیا ہے:

Siraj-ud-Daula planned to subdue the rebellion by marching on the stronghold of shaukat jang. But when he was about to leave for Purnia the news of the English

---

1. کمپنی کی حکومت، باری، ص ۱۰۲۔
2. تاریخ پاکستان و ہند، شکیل احمد ضیاء، ص ۲۸۲،۸۲۔
3. معظم علی، نسیم حجازی، ص ۱۹۶،۱۹۵۔

disruption come and he was forced by circumstances to delay his departure Siraj-ud-Daula was not happy with the English because (1) they failed to offer to him even the traditional homage at the time of his succession , (2) gave asylum to Krishna Ballabh, son of Raja Ballaba accused of embezzement; (3) turned out from Calcutta his agent Narayandas and (4) started fortifying Calcutta without his permession.

These factors were enough to enrage him to view the situation seriously. He seized the Qasim Bazar factory, marched on Calcutta and made the English Surrender. But most of them managed to run away; while the rest were taken prisoners. Omiched and Kirshna Ballabh were brought before hirn but he treated them with utmost civility." [1]

ناول نگار کے بیان کی صداقت باری کے اس بیان سے ہوتی ہے:

''انگریزوں کو اپنی مملکت سے باہر نکالنے کے لئے سراج الدولہ، قاسم بازار کی فیکٹری پر حملہ آور ہوا۔ فیکٹری زیادہ مستحکم اور مضبوط نہ تھی۔ نواب کی فوجوں کا مقابلہ غیر ممکن تھا۔ انگریز سپاہی تعداد میں بہت کم تھے۔ فیکٹری کی تسخیر پر نواب کے سپاہیوں کا ایک بھی کارتوس ضائع نہ ہوا۔'' [2]

کلکتہ پر حملہ کا بیان باری نے اس طرح کیا ہے:

''نواب ۱۶ جون ۱۷۵۶ء کو کلکتہ پہنچا۔ تین دن بعد نواب کی فوجوں نے فورٹ ولیم پر حملہ کیا۔ نواب کے فرانسیسی اور پرتگالی توپچیوں نے انگریزی قلعے پر گولے برساتے وقت نمک حرامی کا ثبوت دیا۔ اس امر کے باوجود انگریز، نواب کی فوجوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہے۔'' [3]

اس کیفیت کا اظہار صاحبزادہ عبدالرسول نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''انگریزوں کے اس طرز عمل سے تنگ آ کر بالآخر سراج الدولہ نے مئی ۱۷۵۶ء میں فوج روانہ کی۔ جس نے بڑی آسانی سے قاسم بازار کی تجارتی کوٹھی پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں نواب کلکتہ روانہ ہوا۔ عین شدت کی گرمی میں اور ایک ایسے ملک میں جہاں سڑکوں کا انتظام نہ تھا، اس نے فوج اور بھاری توپ خانے کے ہمراہ ۱۶۰ میل کا سفر صرف ۱۱ دنوں میں طے کیا اور اچانک کلکتہ پر حملہ آور ہوا۔ نواب نے قابل ستائش طریق جنگ کا مظاہرہ کیا چنانچہ انگریزوں کو شکست ہوئی اور کلکتہ پر نواب کا قبضہ ہو گیا۔'' [4]

---

1. History of Pakistan, Dr. M.A. Aziz, pg,86.
2. کمپنی کی حکومت، باری، ص ۱۰۴۔
3. ایضاً، ص ۱۰۵۔
4. تاریخ پاک و ہند، صاحبزادہ عبدالرسول، ص ۵۵۔

ان واقعات کو شکیل احمد ضیاء نے اس طرح رقم کیا ہے:

''سراج الدولہ کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیوں کو بڑی تشویش کی نظر سے دیکھتا تھا اور اسے اس امر کا اندازہ ہو چکا تھا کہ ریاست میں ریاست تشکیل پذیر ہو چکی ہے۔ چنانچہ سراج الدولہ نے انگریزوں کو قلعہ بندیوں اور فوجی تیاریوں سے باز رہنے کا حکم دیا لیکن انہوں نے بڑی بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا اور بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر ڈریک نے ان الفاظ میں جواب دیا:

''ہماری کھودی ہوئی خندقیں صرف اسی صورت میں پائی جا سکتی ہیں جبکہ انہیں مسلمانوں کے سروں سے بھر دیا جائے۔''[۱]

کلکتہ پر حملہ آور ہونے کی کیفیت آگے چل کر اس طرح بیان کی ہے:

''سراج الدولہ نے انگریزوں کے خلاف تعزیری اقدام کا فیصلہ کر کے فوج روانہ کی۔ جس نے مئی ۱۷۵۶ء میں قاسم بازار کے تمام تجارتی مراکز پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں سراج الدولہ نے کلکتے پر حملہ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا۔''[۲]

انوار ہاشمی نے بھی انہی آراء سے اتفاق کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''سراج الدولہ ایک باہمت اور اولوالعزم نوجوان تھا۔ اسے بنگال میں انگریزوں کا بڑھتا ہوا اقتدار قطعاً پسند نہ آیا۔ انگریز امور حکومت میں مداخلت بھی کرتے تھے۔ سازشوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور سرکاری احکامات کی خلاف ورزی بھی کرتے تھے۔ سراج الدولہ نے انگریزوں کی طاقت کو کچلنے کا فیصلہ کیا اور ان کی فیکٹری واقع قاسم بازار پر قبضہ کر لیا اور کلکتہ جو انگریزوں کا زبردست اڈہ تھا اسے بھی فتح کر لیا۔''[۳]

ان تمام آراء سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ناول نگار نے تاریخی حقائق کو مسخ کیے بغیر اپنی کہانی پیش کی ہے اور کہانی دلچسپ اور مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ قاری کو اپنی جانب متوجہ رکھنے اور ناول کے اگلے صفحات الٹنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس ناول کا اہم ترین رخ غداران وطن کا وہ کردار ہے جس کی بدولت بنگال میں انگریزوں کی پروردہ حکومت قائم ہوئی۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا ان سازشوں کے نتیجے میں جو سراج الدولہ کے خلاف طویل عرصے سے اپنا کام کر رہی تھیں۔ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ان غداروں کی بدولت جو اقتدار کے حصول کے لیے ننگ وطن، ننگ دین، ننگ ملت کہلائے۔ یہ واقعات ناول نگار نے تفصیل سے بیان کیے ہیں ہم چیدہ چیدہ اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ ناول نگار اپنے دو کرداروں کے درمیان گفتگو کے ذریعے اس واقعہ کو یوں پیش کرتا ہے:

''عبداللہ خان نے بڑی مشکل سے اپنی چیخیں ضبط کرتے ہوئے کہا ''آپ کے ابا جان اور یوسف شہید ہو چکے ہیں افضل بھی شہید ہو چکا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو تمام واقعات کی اطلاع مل چکی ہو گی۔ ہم جنگ ہار چکے ہیں۔ میر جعفر نے بنگال کو انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔''

۱۔ تاریخ پاکستان و ہند، شکیل احمد ضیا، ص ۴۸۴۔

۲۔ ایضاً، ص ۴۸۵۔

۳۔ انوار ہاشمی، تاریخ پاک و ہند، ص ۲۰۴۔

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ اپنے باپ، اپنے بھائی اور افضل کی موت کا یقین کر سکتا تھا لیکن بنگال کی افواج کی شکست اس کے لئے ناقابل یقین تھی اس نے کرب انگیز آواز میں سوال کیا ''سراج الدولہ کہاں ہیں؟ ہمیں شکست کیسے ہوئی؟''

''سراج الدولہ کے متعلق میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ شکست کے بعد مرشد آباد آ گئے تھے اور پھر راتوں رات وہاں سے نکل گئے تھے۔''

''یہ کبھی نہیں ہو سکتا میں انگریزوں کے ہاتھوں سراج الدولہ کی شکست پر کبھی یقین نہیں کر سکتا۔''

''ہمیں انگریزوں نے شکست نہیں دی ہم اپنے غداروں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ میر جعفر انگریزوں سے بنگال کی آزادی کا سودا کر چکا ہے۔ میر مدن شہید ہو چکے ہیں۔ میر جعفر نے فوج کے افسروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا جس وقت ہماری فتح بالکل قریب تھی وہ انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔ میں جنگ میں شریک تھا اور غداری اور وطن فروشی کا منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہمارا توپخانہ خاموش تھا۔ ہمارے بیشتر سوار میدان سے دور کھڑے تھے۔ سراج الدولہ کے مٹھی بھر جان نثار سینوں پر گولیاں کھا کھا کر گر رہے تھے اور ہم آخری وقت تک یہ سمجھتے تھے کہ ہماری توپیں اچانک آگ برسائیں گی۔ ہمارے سوار اچانک فیصلہ کن حملہ کریں گے اور آن کی آن میں دشمن کو کچل کر رکھ دیا جائے گا۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ ہم پلاسی کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے جنگ ہار چکے ہیں۔''[1]

سراج الدولہ کا انجام ناول میں اس طرح بیان ہوا ہے:

''سراج الدولہ قتل ہو چکا ہے۔ میر جعفر نے لارڈ کلائیو کی سرپرستی میں بنگال کی حکومت سنبھال لی ہے۔''[2]

ان واقعات کو تاریخی حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو باری کی رائے اس طرح سامنے آتی ہے:

''۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو گیارہ بجے کے قریب باقاعدہ لڑائی شروع ہوئی نواب کے نقصانات انگریزوں سے زیادہ رہے۔ کلائیو نے اپنے خاص افسروں کو مشورے کے لئے بلایا اور طے کیا کہ آدھی رات تک اسی جگہ پر قیام کیا جائے اور اس کے بعد نواب کے پڑاؤ پر چھاپا مارا جائے۔ کلائیو کی مجلس مشاورت برخاست ہوتے ہی موسلا دھار بارش پڑنے لگی۔ آدھا گھنٹہ بارش ہوتی رہی۔ نواب کی فوجوں کی آتش بازی بھی کم ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ نواب کی توپیں خاموش ہو گئیں۔ نواب کے افسروں نے بارود کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بارش نے اسے بےکار کر دیا۔ جب نواب کی سوار فوج نے یہ خیال کر کے حملہ کیا کہ بارش نے انگریزوں کے بارود کو بھی خراب کر دیا ہو گا تو ان کا سختی سے مقابلہ کیا گیا۔ انگریزی توپوں کی گولہ باری نے انہیں پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ میر مدن بھی اس معرکے میں کام آیا۔ اس وفادار اور بہادر سپاہی کی موت نے نواب کے حوصلے پست کر دیے۔ اب اس نے میر جعفر کو بلایا اور اس سے امداد کے لئے کہا۔ میر جعفر نے نواب کی مدد کرنے کا دوبارہ وعدہ کیا لیکن وعدہ پورا کرنے کی جگہ اس نے کلائیو کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا اور اسے آگے

---

[1] معظم علی، نسیم حجازی، ص ۲۰۲۔

[2] ایضاً، ص ۲۰۱۳۔

بڑھنے کے لئے کہا۔ اس نوجوان نواب سے جس کے گرد غدار جمع تھے اور جس کا وفادار جنرل میدان جنگ میں کام آ چکا تھا ہمدردی کیے بغیر رہنا غیر ممکن ہے۔ میر جعفر کے بعد راجا درلاب اس کے پاس پہنچا۔ انگریزی فوج آگے بڑھ رہی تھی اور راجا درلاب کے سپاہی پیچھے ہٹ رہے تھے۔ نواب بہت زیادہ پریشان تھا۔ راجا درلاب نے نواب کو اور ڈرایا۔ اس نے نواب سے کہا کہ لڑائی میں شکست ہو چکی ہے۔ اس لیے مرشد آباد چلنا ہی بہتر ہے۔ نواب نے مصیبت کے وقت اپنی جان بچانے اور اپنے خاندان کا وجود قائم رکھنے کے لئے غدار کی بات مان لی۔ اپنی فوجوں کو خندقوں میں واپس ہونے کا حکم دے کر وہ ایک تیز رفتار اونٹنی پر سوار ہوا اور اپنے ساتھ ہزار سواروں کو لے کر راجدھانی کی طرف چل دیا۔'' [1]

سراج الدولہ کے انجام کو آگے چل کر باری نے یوں بیان کیا ہے:

''سراج الدولہ پلاسی سے بھاگ کر اسی شام مرشد آباد پہنچ گیا تھا۔ دوسرے دن جب اسے اپنی فوج کی تباہی کی خبر ملی تو وہ اپنی بیوی سمیت مرشد آباد سے بھاگ نکلا۔ راج محل پہنچ کر اس نے ایک ویران باغ میں رات گزارنا چاہی لیکن چند لوگوں نے اسے پہچان لیا۔ اسے میر جعفر کے حوالے کر دیا۔ میر جعفر نے اسے قید کر دیا۔ رات کو میر جعفر کے بیٹے میرن نے اسے قتل کر دیا۔'' [2]

اس کیفیت کو بڑے مربوط انداز میں شکیل احمد ضیاء نے یوں پیش کیا ہے:

''کلائیو مرشد آباد سے ۲۳ میل کے فاصلے پر پلاسی کے میدان تک پہنچ کر صف آرا ہو گیا۔ میر جعفر نے قرآن مجید ہاتھوں میں لے کر نواب کو اپنی جاں نثاری اور وفاداری کا یقین دلایا اور سراج الدولہ پچاس ہزار سپاہ کا لشکر جرار لے کر نبرد آزمائی کے لئے میدان جنگ میں پہنچ گیا اور جنگ شروع ہو گئی۔ سراج الدولہ کی جانب سے میر مدن اور موہن لال نامی ایک ہندو زمیندار نے بڑی جرات اور جسارت سے کام لیا۔ میر مدن گولہ لگنے سے ہلاک ہو گیا اور اس کے دستے کے متعدد سپاہی کام آ گئے۔ باقی تمام فوج بے حس و حرکت کھڑی ہوئی تماشہ دیکھتی رہی۔ میر جعفر نے سراج الدولہ سے کہا کہ وہ موہن لال اور اس کے دستے کو واپس بلا لے تاکہ جنگ مغلوبہ شروع کی جائے لیکن جیسے ہی نواب نے موہن لال کو واپس بلایا میر جعفر نے کلائیو کے سپاہیوں کو حملے کا اشارہ کر دیا۔ میر جعفر نے اپنی افواج کو پیچھے ہٹا لیا اور کلائیو کو فتح نصیب ہوئی۔ سراج الدولہ نے یہ حال دیکھا کر راہِ فرار اختیار کی لیکن اسے راج محل سے گرفتار کر کے مرشد آباد لایا گیا اور قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو ایک شاہراہ پر لٹکا کر تذلیل و تشہیر کی گئی۔'' [3]

صاحبزادہ عبدالرسول نے تاریخ پاک و ہند کے صفحہ نمبر ''۵۷، ۵۸'' [4] پر یہی کیفیت من و عن بیان کی ہے اور اتفاق سے کوئی لفظ تک تبدیل نہیں کیا۔

---

[1] کمپنی کی حکومت: باری، ص ۱۱۳۔

[2] ایضاً، ص ۱۱۴۔

[3] تاریخ پاکستان و ہند، شکیل احمد ضیاء، ص ۴۸۸۔

[4] تاریخ پاک و ہند، صاحبزادہ عبدالرسول، ص ۵۷۔

ناول نگار کی رائے سے انوار ہاشمی نے بھی اتفاق کیا ہے وہ رقمطراز ہے کہ:

''کلائیو تین ہزار دو سو سپاہیوں کی ایک مختصر فوج لے کر مرشد آباد (پایۂ تخت بنگال) کی طرف بڑھا۔ سراج الدولہ نے میر جعفر پر اعتماد کر کے پچاس ہزار سپاہیوں کی قیادت اس کے سپرد کی لیکن جون ۱۷۵۷ء میں جب پلاسی کے میدان میں انگریزوں سے مقابلہ ہوا تو غدار سالار میر جعفر مع چند دیگر ہندو غداروں کے جنگ میں حصہ لینے کے بجائے خاموش تماشائی بنا کھڑا رہا۔ صرف چند وفادار کمانداروں نے لڑتے لڑتے اپنی جان دے دی۔ لیکن ان کے جاں بحق ہوتے ہی سراج الدولہ پر عجب کیفیت چھا گئی۔ وہ خوفزدہ ہو گیا اور میر جعفر کے مشورے پر جنگ بندی کا حکم دے دیا اور جب نواب کی فوج واپس ہو رہی تھی کلائیو نے اس پر پیچھے سے حملے کا حکم دے دیا۔ اس طرح نواب کی فوج بری طرح پسپا ہوئی۔ سراج الدولہ کو گرفتار کر لیا گیا اور اسے میر جعفر نے قتل کرا دیا۔''[۱]

تاریخ ملت میں اس واقعے کا ذکر یوں مرقوم ہے:

''اس عرصہ میں انگریزوں نے پھر جنگ شروع کی مگر جب عین لڑائی میں جعفر کے بے وفائی کھلی تو سراج الدولہ کے ہوش جاتے رہے اور ساتھ ہی اس کے پیر اکھڑ گئے۔ اس لڑائی میں سراج الدولہ کو ناکامیابی ہوئی اور وہ ختم کر دیا گیا۔''[۲]

ڈاکٹر ایم۔ اے۔ عزیز نے بھی انہی آرا سے اتفاق کرتے ہوئے یہی کیفیت نقل کی ہے:

" On June 23, 1757 A.D. a storm of rain burst out and swamped the battle ground. This put his artillery out of order. Following which his two trusted generals, Mir Madan and Bahadur Khan were killed . The loss of these generals frusted the Nawab and disappointed, disgusted and confused as he was he did not know how to build up his defence against the enemy. And then came out Mir Jafar to play his treacherous role. He showed his allegaince to the Nawab and promised him to put all his weight on his side, but secretly sent a message to Clive to make an attack on the Nawab's army whthout any loss of time.

Clive made a good use of the situation and attacked the confused army of the Nawab, which fought bravely, but when Mir Jaffer and his forces withdraw, defeat seemed to have been its fate. In utter disgust and under bad counsel, instead of encouraging his troops , the Nawab fled to Murshidabad and was consequently was

---

۱۔ تاریخ پاک و ہند: انوار ہاشمی، ص ۳۰۴۔

۲۔ تاریخ ملت: جناب مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی، جناب مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی، ص ۷۸۳۔

caught and murdered by Miran on July 2, 1757 A.D.[1]

ناول نگار کا بیان اور مورخین کی آراء اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ نے میر جعفر پر اعتماد کر کے انتہائی غلطی کی تھی۔ یہ غلطی اسے اپنے معتبر ساتھیوں سے محروم کرنے کا باعث تو بنی تھی ساتھ ہی اس کی جان بھی لے گئی۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ نسیم حجازی ناول کا پلاٹ ترتیب دیتے وقت اہم تاریخی کرداروں اور اہم واقعات کا بڑی باریک بینی سے خیال رکھتے ہیں اور اپنے تخیلاتی کرداروں اور واقعات کے ذریعے اس خلا کو پر کرتے ہیں۔ جو مورخین کے قلم سے لکھنے سے رہ گیا ہے یا دوسرے لفظوں میں تاریخی ناول نگاری کے لئے جس کی گنجائش موجود ہے۔ انسان فطری طور پر معاشرے کا ایک فرد ہے معاشرے میں رہنے بسنے کے لئے اسے لوگوں سے ملنا جلنا ہوتا ہے جن سے دوستیاں ہوتی ہیں اور پھر محبت اور عشق کی منازل طے ہوتی ہیں۔ ناول معاشرے یا سماج کی داستان ہے خواہ وہ تاریخی ہی کیوں نہ ہو یہی وجہ ہے کہ نسیم حجازی نے تاریخی کرداروں اور واقعات کے ساتھ ساتھ اسی رہن سہن اور معاشرت کے مطابق اپنے تخیلاتی کردار پیش کئے جو عشق و محبت بھی کرتے ہیں۔ یہاں ناول نگار نے خاندانوں کے ملاپ سے دو دلوں کی دھڑکنوں کو یکجا ہوتے دکھایا ہے۔ ویسے یہ دونوں کردار یعنی معظم علی اور فرحت بنیادی طور پر ناول کے تاریخی کرداروں سے الگ سب سے اہم کردار ہیں۔ یہاں ناول نگار نے تاریخ کے اس تبدیل دور میں ان الفتوں کو محبتوں کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

نواب سراج الدولہ کی شکست اور قتل کے بعد بظاہر میر جعفر بنگال کا حکمران بنا مگر یہ جس ساز باز کے نتیجے میں اقتدار کی سیڑھیوں پر چڑھا تھا اسے پورا کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا اس تاریخی دور کو ناول نگار اس طرح بیان کرتا ہے:

''قید ہونے والوں میں صرف حکومت کے باغی ہی نہیں بلکہ وہ متمول لوگ بھی ہیں جن کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ میر جعفر کو بڑی بڑی رقومات پیش نہیں کر سکے۔ میر جعفر اپنے انگریز سرپرستوں کو خوش رکھنے کی کوشش میں مرشد آباد کا خزانہ ان کے حوالے کر چکا ہے اور اب لارڈ کلائیو کے بڑھتے ہوئے مطالبات پورا کرنے کے لئے اس نے بنگال کے امراء کو بے تحاشا لوٹنا شروع کر دیا ہے۔ بڑے بڑے زمیندار اور تاجر کوڑی کوڑی کے محتاج ہو کر بنگال سے ہجرت کر رہے ہیں۔''[2]

ناول نگار کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے شکیل احمد ضیاء رقمطراز ہیں:

''انگریزوں نے اس سے (میر جعفر) سازشی معاہدے کے مطابق کمپنی کے لئے بردوان، میدنا پور اور چٹا گانگ کے اضلاع حاصل کر کے ڈھائی لاکھ پونڈ کی رقم مزید انعامات اور تحائف کے طور پر وصول کر لی۔ میر جعفر کمپنی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خود بھی انگریزوں سے مالی الطاف و اکرام کا مظاہرہ کرتا رہا جس کے نتیجے میں خزانہ خالی ہو گیا۔''[3]

باری اس دور کا احاطہ یوں کرتا ہے:

---

[1] A history of Pakistan, Dr. M.A. Aziz , Pg 88.

[2] معظم علی، نسیم حجازی، ص ۲۲۔

[3] تاریخ پاکستان و ہند، شکیل احمد ضیاء، ص ۲۸۹۔

''میر جعفر کا خزانہ خالی ہو چکا تھا لیکن اس پر بھی اسے ان اقساط کی ادائیگی کی فکر تھی جو اس کے ذمے باقی تھیں۔ خزانے کو پُر کرنے کے لئے اس نے اپنی رعایا ہی کو لوٹنا چاہا۔ رعایا میں بے چینی اور جاگیرداروں میں بغاوت پیدا ہو رہی تھی۔''[۱]

ان آراء کی روشنی میں بنگال کی تباہی کا منظر نامہ جو ناول نگار نے پیش کیا تھا ثابت ہوتا ہے۔ یہاں کہانی اپنا رخ بدلتی ہے کیونکہ بنگال میں آزادی کا پرچم سرنگوں ہو چکا تھا۔ غداران وطن غیروں کو اپنا حاکم بنا چکے تھے اس لئے کسی ذی شعور کے لئے اس معاشرے میں رہنا ناممکن تھا۔ اس افراتفری کے دور میں ناول نگار اپنے کرداروں کو اس ماحول سے نکال کر دوسرے معاشرے کا فرد بتایا ہے یہ کام انتہائی چابکدستی اور سلیقہ لیے ہوتا ہے کہ کسی خامی کا شائبہ تک نہیں کیا جا سکتا۔

ناول نگار نے اپنی کہانی اپنے تخیلاتی کرداروں کے ذریعے جاری رکھی ہے لیکن چونکہ ناول تاریخی ہے اس لیے تاریخی واقعات اور کرداروں کو ضرورت کے مطابق پیش کیا ہے ساتھ ہی اس زمانے کے ہندوستان میں طوائف الملوکی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ملک کے سیاسی منظر نامے کو معاشرتی اور معاشی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اجاگر کیا ہے اب جو واقعہ تاریخی حقائق کے اعتبار سے پرکھنے کے لیے ہمارے سامنے آتا ہے پانی پت کی لڑائی کا ہے جسے ناول نگار ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

''۱۳۔ جنوری ۱۷۶۱ء کا آفتاب ہندوستان کی تاریخ کا ایک عظیم ترین معرکہ دیکھ رہا تھا۔ طلوع سحر کے ساتھ مرہٹہ فوج نے میلوں لمبی صفوں میں اپنے پڑاؤ سے نکل کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ ان کے میسرہ پر گاردی کے تربیت یافتہ دستے تھے اور اس کے ساتھ گیکوار کی فوجیں تھیں۔ میمنہ میں ملہار راؤ ہلکر اور جنکوجی سندھیا تھے۔ مسلمانوں کے لشکر کے قلب میں ابدالی کا وزیر اعظم شاہ ولی خان تھا اور اس کی کمان میں درانی فوج کے وہ آزمودہ کار جانباز تھے جو کئی میدانوں میں داد شجاعت دے چکے تھے۔ میسرہ پر شاہ پسند خان اور نجیب الدولہ تھے۔ شجاع الدولہ کی افواج میسرہ اور قلب لشکر کے درمیان تھیں۔ میمنہ کی قیادت برخوردار خان کے ہاتھ میں تھی اور روہیلہ، مغل اور بلوچ سپاہیوں کے کئی دستے اس کے ساتھ تھے۔

احمد شاہ ابدالی ایک سفید گھوڑے پر سوار اپنی عقابی نگاہوں سے میدان جنگ کا نقشہ دیکھ رہا تھا۔ برق رفتار سواروں کی ایک جماعت فوج کے جرنیلوں اور سالاروں کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کی ہدایات پہنچانے میں مصروف تھی۔ جنگ کی ابتدا مرہٹہ توپوں کی آتشبازی سے ہوئی اور اس کے بعد گاردی کے تربیت یافتہ دستوں نے افغان فوج کے دائیں بازو کے روہیلہ دستوں پر سنگینوں سے حملہ کر دیا۔ روہیلوں کے پیچھے ہٹتے ہی بھاؤ نے اپنے سواروں کو ایک عام حملے کا حکم دیا اور افغان فوج کی اگلی تین صفیں درہم برہم کر دیں۔ پانی پت کا معرکہ اب پوری شدت کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ گرد و غبار کے بادلوں میں گھوڑوں کی ٹاپ، توپوں کی دھنا دھن، بندوقوں کے دھماکوں، تلواروں کی جھنکار سے ''ہر ہر مہادیو'' کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔''[۲]

ناول نگار نے جنگ کے خاتمے کو یوں پیش کیا ہے:

۱۔ کمپنی کی حکومت، باری، ص ۱۱۴۔

۲۔ معظم علی، نسیم حجازی، ص ۳۲۷۔

''پانی پت کی شکست مرہٹہ تاریخ کی ایک مکمل شکست تھی۔ ہلکر، داماجی گیکوار، نارو شنکر، مہاجی سندھیا اور نانا فرنویس کے سوا تمام بڑے بڑے مرہٹہ سردار مارے جاچکے تھے۔ ابراہیم گاردی جسے مسلمانوں کا بدترین غدار سمجھا جاتا تھا، گرفتار ہونے کے بعد قتل کیا گیا۔ شمشیر بہادر اور انتاجی منکیشور، جو زخمی ہو کر بھاگے تھے راستے میں مر گئے۔ مرہٹوں کی عظیم فوج میں سے صرف ایک چوتھائی سپاہی ایسے تھے جنھیں دوبارہ اپنا وطن دیکھنا نصیب ہوا۔''[1]

اس واقعہ کو شکیل احمد ضیاء اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اکتوبر ۱۷۶۰ء میں ابدالی نے اپنی ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ دریائے جمنا کو عبور کیا اور دہلی و پانی پت کے وسط میں ڈیرہ جما لیا اس عسکری تدبیر سے اس نے مرہٹوں کو ان کے مرکز دہلی سے غیر متعلق کر کے ان کا خط رسد منقطع کر دیا اور ابدالی کے لشکر سے مرہٹہ افواج کی جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ حتیٰ کہ ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو مرہٹہ افواج نے ابدالی کے لشکر پر یکبارگی حملہ کر دیا۔ صبح سے شام تک شدید جنگ جاری رہی۔ سہ پہر کے قریب مرہٹے بدحواس ہو گئے اور تتر بتر ہو کر بھاگنے لگے۔ ابدالی کے لشکر نے پوری قوت سے حملہ کیا مرہٹے فرار ہو گئے۔ مسلم عساکر نے دور تک ان کا تعاقب کیا اس جنگ میں شہنشاہ ہند بننے کے خواب دیکھنے والا سداشیو راؤ، وشواش راؤ، اور لاتعداد مرہٹہ سرداروں اور سالاروں کے علاوہ ایک لاکھ مرہٹے ہلاک ہوئے۔''[2]

پانی پت کی اس جنگ کا احوال ڈاکٹر ایم۔اے۔عزیز نے اس طرح پیش کیا ہے:

" Third Battle of Panipat 1761: the combined Maratha forces of more than two lakhs under the command of Sada Shiv Rao Bhao and Vishvas Rao as its nominal commander -in-chief marched on to the north."[3]

"The result of this war is that "They (Marathas) attacked the positions of Ahmed Shah Abdali with great force but were pushed back. The Marathas were now left with no choice but to resort to a hand to hand fight in which Vishvas Rao and Sada Shiv Rao Bhao were killed. The Maratha army was completely routed out and only a few had been able to escape starvation or killing" [4]

ان آراء سے مرہٹوں کی فوجی تیاری اور احمد شاہ ابدالی کی حکمت عملی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور پھر ان تباہ حال مرہٹہ افواج کا تذکرہ بھی

۱۔ معظم علی، نسیم حجازی، ص ۳۳۳۔

۲۔ تاریخ پاکستان و ہند، شکیل احمد ضیاء، ص ۴۰۶۔

۳۔ A history of Pakistan, Dr. M.A.Aziz, Pg, 63

۴۔ Same as above, Pg, 64.

ثابت ہوتا ہے جو ناول اور تاریخ دونوں میں یکساں انداز میں موجود ہے۔ یہاں یہ امر توجہ طلب ہے کہ شکیل احمد ضیاء نے جنگ کے لئے ۱۴ جنوری کی تاریخ رقم کی ہے جبکہ ناول نگار نے ۱۳۔ جنوری لکھی ہے یہ محض ایک دن کا فرق ہے ممکن ہے عیسوی اور ہجری سالوں کے فرق کے تحت یہ ایک روزہ فرق سامنے آ گیا ہو ورنہ جنگ کا سال ۱۷۶۱ء پر کوئی اختلاف نہیں۔ یہ بات دلچسپی کی حد تک تحریر کیے دیتے ہیں کہ شکیل احمد ضیاء کی کتاب میں چھپائی کی بعض فاش غلطیاں ہیں مثلاً پانی پت کے مقام پر ابدالی کی افواج کے جمع ہونے کا عہد ۱۷۶۱ء اور جنگ کا سال ۱۹۶۱ء چھپا ہوا ہے جو کتاب کی چھپائی کے وقت کتابت کی غلطی ہے۔ جس پر توجہ دی جانی چاہیے تھی۔ دراصل جنگ کا سال اکتوبر ۱۷۶۰ء ہے جبکہ جنگ کا آغاز جنوری ۱۷۶۱ء میں ہوا اس کی صداقت باری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے:

''ستمبر ۱۷۵۹ء میں احمد شاہ ابدالی پنجاب میں داخل ہو چکا تھا۔ نجیب الدولہ، حافظ رحمت خان، شجاع الدولہ اور کئی ایک دوسرے سرداران نے ابدالی کا ساتھ دیا۔ ۶ جنوری ۱۷۶۱ء کو پانی پت کی لڑائی میں مرہٹوں کو شکست دینے کے بعد احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم (جو اس وقت الہ آباد میں تھا) کو مغل بادشاہ تسلیم کرتے ہوئے نجیب الدولہ کو اس کا کمانڈر ان چیف اور شجاع الدولہ کو اس کا وزیر اعظم مقرر کیا۔''[۱]

ناول نگار نے بکسر کی لڑائی (جنگ) کا منظر نامہ اس طرح پیش کیا ہے:

''۱۵ ستمبر ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں انہیں شکست ہوئی۔ میر قاسم نے فرار ہو کر جان بچائی اور شہنشاہ جسے ابھی تک دلی کے تخت پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا تھا ایسٹ انڈیا کمپنی سے جا ملا۔''[۲]

اس واقعہ کی حقیقت باری نے ناول نگار کے عین مطابق رقم کی ہے وہ لکھتا ہے:

''بکسر کی جنگ ۱۵ ستمبر ۱۷۶۴ء کو لڑی گئی۔ شجاع الدولہ کو نقصان عظیم کے ساتھ شکست کھانی پڑی۔ میر قاسم نے فرار ہو کر اپنی جان بچائی۔ شہنشاہ کمپنی سے جا ملا۔''[۳]

اس واقعہ کے ساتھ ہی ہم اس امر کی وضاحت ضروری خیال کرتے ہیں کہ ایسے واقعات کا تحقیقی جائزہ نظر انداز کر رہے ہیں جن کا براہِ راست تعلق ناول کے تخیلاتی کرداروں سے نہ ہو کیونکہ تحقیقی جائزہ انہی واقعات کا لکھیں گے جو تخیلاتی کردار ہونے کے باوجود تاریخی کرداروں یا واقعات سے اس طرح مل جل گئے ہیں کہ حقیقی معلوم ہوتے ہیں یقیناً یہ کردار ناول نگار کی ذہنی اختراع ہوں گے لیکن یہ اور اس قسم کے کردار اور ان سے منسوب واقعات اس عہد اور معاشرت کی عکاس ضرور رہی ہوں گی۔ جنہیں ناول نگار پیش کر رہا ہے لیکن مورخ نے بوجہ اسے قلمبند نہیں کیا اکثر ایسے تاریخی واقعات بھی ناول میں موجود ہیں جو قارئین کی معلومات کی غرض سے یا اس عہد کی کیفیت کو بیان کرنے کی بنا پر شامل کئے گئے ہیں۔ بظاہر ناول کے پلاٹ اور اس کی کہانی سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

۱۔ کمپنی کی حکومت: باری، ص ۱۵۷۔

۲۔ معظم علی: نسیم حجازی، ص ۳۹۵۔

۳۔ کمپنی کی حکومت: باری، ص ۱۳۰۔

ناول کے سولہویں باب کے صفحہ نمبر ۴۱۲ سے ۴۱۴ تک کے واقعات روہیل کھنڈ پر شجاع الدولہ اور انگریزوں کی مشترکہ چڑھائی کے واقعات کے عکاس ہیں۔ حافظ رحمت نے مرہٹوں کو روہیل کھنڈ سے نکالنے کے عوض چالیس لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ صرف فوج کے اودھ میں داخل ہونے پر مرہٹے بھاگ گئے رقم کی ادائیگی تاخیر میں ہوئی اور مذکورہ واقعہ رونما ہوا۔ اس واقعہ کو باری اس طرح بیان کرتا ہے:

''۱۲ مئی ۱۷۷۳ء کو شجاع الدولہ کی فوج روہیل کھنڈ چھوڑ کر اودھ کی طرف چل دی۔ رقم ادا کرنے میں حافظ رحمت خان کی تھوڑی تاخیر نے شجاع الدولہ کے لئے موقع فراہم کر دیا کہ وہ انگریزی فوج کی مدد سے روہیل کھنڈ پر قبضہ کرے۔''[1]

اس واقعہ کی صداقت شکیل احمد ضیاء نے ان الفاظ میں رقم کی ہے:

''شجاع الدولہ نے انگریزوں کو اپنا ہمدرد سمجھ کر انہیں اپنے مخالف روہیلوں سے ٹکرا دیا جس کے نتیجے میں روہیلوں کی طاقت ختم ہوگئی اور ان کا سردار حافظ رحمت خان شہید ہوگیا۔''[2]

اس واقعہ کی مزید اہمیت صاحبزادہ عبدالرسول کے منقولہ بیان سے ہوتی ہے جس کے مطابق:

''اپریل ۱۷۷۴ء میں نواب اور کمپنی کی متحدہ افواج روہیل کھنڈ پر حملہ آور ہوئیں۔ روہیلوں نے جانبازی سے مقابلہ کیا مگر دو بڑی طاقتوں کی متحدہ قوت کا مقابلہ نہ کر سکے اور میراں پور کے مقام پر فیصلہ کن لڑائی میں حافظ رحمت خان بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔''[3]

انوار ہاشمی اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اپریل ۱۷۷۴ء میں نواب اودھ نے اس انگریز فوج کی مدد سے روہیل کھنڈ پر حملہ کیا۔ روہیلوں نے نہایت بہادری سے مقابلہ کیا لیکن ان کا دشمن ان سے کئی گنا بڑا تھا۔ لہٰذا انہیں میراں پور کی فیصلہ کن جنگ میں شکست ہوئی۔ ان کا سردار حافظ رحمت خان دورانِ جنگ لڑتا ہوا مارا گیا۔''[4]

ان روایات اور ناول نگار کی آراء میں ذرا بھی اختلاف نہیں مسئلہ چالیس لاکھ روپے کا تھا روہیلوں کے مقابلے کے لئے اودھ کے ساتھ ساتھ انگریز فوج آئی۔ حافظ رحمت خان اس جنگ میں شہید ہوئے جنگ کی جو منظر کشی ناول نگار نے قارئین کی دلچسپی کی خاطر بیان کی ہے ممکن ہے سو فیصد درست نہ ہو لیکن جنگی نقشہ اور میدان جنگ کی کیفیت اسی قسم کی ہوا کرتی ہے جس کی رعایت سے فائدہ اٹھا کر ناول نگار نے اپنی کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔

۱۔ کمپنی کی حکومت، باری، ص ۱۵۹۔
۲۔ تاریخ پاکستان و ہند، شکیل احمد ضیاء، ص ۵۰۵۔
۳۔ تاریخ پاک و ہند، صاحبزادہ عبدالرسول، ص ۱۲۷۔
۴۔ تاریخ پاک و ہند، انوار ہاشمی، ص ۴۳۶۔

ناول میں اٹھارویں باب کے صفحہ نمبر ۴۵۵ سے ۴۵۲ تک کے واقعات میسور کی دوسری جنگ سے متعلق ہیں جب حیدر علی ۹۰ ہزار فوج لے کر انگریزوں کے مقابلے کے لئے نکلا کیونکہ مرہٹوں سے جنگ کے دوران انگریزوں نے حیدر علی کا ساتھ دینے کے بجائے غیر جانبداری اختیار کی تھی۔ حیدر علی نے اپنے بیٹے ٹیپو کو کرنل بیلی اور جنرل منرو کی فوجوں کو روکنے کے لئے بھیجا تا کہ یہ آپس میں نہ مل سکیں اس کے بعد ٹیپو اور حیدر علی نے مشترکہ طور پر ارکاٹ تک پیش قدمی کی اور اسے فتح کر لیا۔ فوج کی تعداد اور شہزادہ ٹیپو کی کارکردگی کا تذکرہ نریندر کرشن سنہا (مترجم: اقتدار حسین صدیقی) نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''(حیدر علی کی) یہ فوج ۲۵ ہزار پیادوں اور ۲۸ ہزار سواروں اور اس کے علاوہ تیر اندازوں اور دوسرے فوجیوں پر مشتمل تھی اور جن کی مجموعی تعداد نوے ہزار تھی۔[۱]

ارکاٹ کی فتح کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

''حیدر نے مدراس پر چڑھائی کرنے کے بجائے ۱۸ ستمبر کو ارکاٹ کا محاصرہ پھر سے شروع کر دیا۔ شہر کا قطر سات میل تھا اور اس کی محافظ فوج کمزور تھی کیونکہ وہ صرف ڈیڑھ سو انگریز، ڈیڑھ سو سپاہیوں اور نواب محمد علی کی ڈیڑھ ہزار فوج اور کچھ بے قاعدہ فوجیوں پر مشتمل تھی۔ گہری خندقیں کھودی گئیں اور آخر کار پشتہ میں دو شگاف پڑ گئے اور شہر دشمن کے قبضے میں آ گیا۔''[۲]

ناول کے واقعات میں ارکاٹ کی فتح کا ذکر باری اس طرح کرتا ہے:

''جب مدراس کی انگریزی حکومت نے ماہی کی بندرگاہ پر سے اپنا قبضہ اٹھانے سے انکار کر دیا تو انگریزوں اور حیدر علی میں لڑائی چھڑ گئی۔ یہ لڑائی ۱۷۸۰ء سے ۱۷۸۴ء تک ہوئی۔

حیدر علی نے کرناٹک پر دھاوا بول دیا۔ اس نے کرنل بیلی کی فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ بکسر کا فاتح منرو بھی حیدر علی کے حملے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ اپنی بہت سی توپوں کو چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ چند دنوں کے اندر اندر حیدر علی نے ارکاٹ پر قبضہ کر لیا۔''[۳]

اس رائے سے شکیل احمد ضیاء نے بھی اتفاق کیا ہے وہ رقمطراز ہیں:

''۱۷۸۰ء میں نواب حیدر علی نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور نوے ہزار سپاہ کی جمعیت کے ساتھ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے سرگرم کارزار ہوا۔ سب سے پہلے نواب نے کرناٹک کی تسخیر کی اس کے بعد پائیں گھاٹ، ارنی، کلوہ، کاویری، پٹن اور محمود و بندر پر قابض ہو گیا۔ مدراس کے گورنر نے بکسر کی جنگ میں شاہ عالم شجاع الدولہ کی افواج کو شکست دینے والے فاتح میجر ہیکٹر منرو اور کرنل بیلی کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ مقابلے کے لئے روانہ کیا مگر پومی پور کے مقام پر نواب حیدر علی کے فرزند ٹیپو سلطان نے کرنل بیلی کو شکست دے کر تمام انگریز فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔ میجر ہیکٹر منرو یہ حال دیکھ کر اس قدر خائف ہوا کہ اس نے

۱۔ حیدر علی: نریندر کرشن سنہا/اقتدار حسین صدیقی، ص ۲۰۷۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۱۵۔

۳۔ کمپنی کی حکومت: باری، ص ۱۸۲۔

اپنے توپ خانے کی ساری توپیں کانج درم کے تالاب میں پھینک دیں اور فرار ہو گیا۔"[۱]

فوج کی تعداد میں کچھ اختلاف کرتے ہوئے صاحبزادہ عبدالرسول یوں رقم کرتے ہیں:

"۱۷۸۰ء میں نواب حیدر علی خان اسی ہزار سپاہ کے ساتھ طوفانِ برق و باد کی طرح میسور سے اٹھا اور کرناٹک پر چھا گیا۔ چند ہی دنوں میں پائیں گھاٹ، آرنی، کلوہ، کاویری، پٹن، محمود بندر وغیرہ پر اس کا جھنڈا لہرانے لگا اور اس کی فوجیں مدراس کے نواح میں پہنچ گئیں۔ انگریزی حکومت نے فوراً مدراس سے جنرل منرو اور علاقہ نظام سے کرنل بیلی کو روانہ کیا تاکہ دونوں فوجیں مل کر حیدر علی خان کے مدِ مقابل ہوں مگر پولی پور کے مقام پر ٹیپو سلطان نے کرنل بیلی کو شکست فاش دی اور اسے گرفتار کر لیا۔ اس پر جنرل منرو اپنی توپیں دریا میں پھینک کر مدراس کو فرار ہو گیا۔

اس مرحلہ پر اگر نواب چاہتا تو مدراس فتح کر سکتا تھا مگر انگریزوں کی خوش قسمتی سے اس نے ویلور اور ارکاٹ کا رخ کیا اور انہیں فتح کر لیا۔"[۲]

ایم۔ اے۔ عزیز اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

" He (Haider Ali) moved to Qarnatic with an army of 90,000 men and sent tipu with 10,000 men to check Col. Baillie."[۳]

سوائے ایک مورخ کے باقی تمام فوج کی تعداد نوے ہزار پر متفق ہیں اس کے علاوہ کرنل بیلی اور جنرل منرو کے کردار پر بھی متفق ہیں جبکہ ارکاٹ کی فتح کے بارے میں بھی ناول نگار اور مورخین متفق ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ناول نگار نے واقعات اس طرح ترتیب دیے کہ تاریخ میں اصراف نہ ہونے پائے۔ ناول کے واقعات میں ایک اہم موقع ملیبار کے محاذِ جنگ اور حیدر علی کی وفات کی خبر کے بارے میں ہے جس کا تذکرہ ناول میں اس طرح تحریر ہے:

"ماہ نومبر کے تیسرے ہفتے شہزادہ ٹیپو کی افواج ملیبار میں رام گلی کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ ہمبراسٹون کی قیادت میں انگریزی فوج ان کی آمد کی اطلاع ملتے ہی رفو چکر ہو چکی تھی۔ ٹیپو نے اس کا پیچھا کیا اور رام گلی سے چند میل کے فاصلے پر جا لیا۔ ہمبراسٹون نے شیرِ میسور کا مقابلہ کرنے کے بجائے بھاگنا زیادہ مناسب سمجھا۔ رات کے وقت ہمبراسٹون کی فوج نے دریا عبور کرنے کے بعد پونانی کا رخ کیا۔ اس عرصے میں کرنل میکلوڈ کی کمان میں انگریزوں کی ایک فوج ہمبراسٹون کی مدد کو پہنچ چکی تھی۔ ٹیپو، پونانی کے گرد گھیرا ڈال کر فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے حیدر علی کی وفات کی خبر ملی۔"[۴]

۱۔ تاریخ پاکستان و ہند، شکیل احمد ضیاء، ص ۴۹۵۶۔

۲۔ تاریخ پاک و ہند، صاحبزادہ عبدالرسول، ص ۹۷۔

۳۔ A History of Pakistan, Dr. M.A. Aziz, Pg. 92.

۴۔ معظم علی، نسیم حجازی، ص ۳۶۵۔

ناول کے بیان سے اتفاق کرتے ہوئے شکیل احمد ضیاء رقم طراز ہیں:

''بریتھ وئٹ کو شکست دے کر ٹیپو مالابار پہنچ گیا۔ جہاں انگریز مملکتِ خداداد (میسور) کے خلاف زبردست بغاوت کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ٹیپو نے انگریزوں کی فوج کے کمانڈر ہمبر اسٹون کو شکست دے کر پونانی کی جانب فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس فاتحانہ جنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ ٹیپو سلطان نے اناگدی سے آگے بڑھ کر پونانی کا محاصرہ کر لیا تھا کہ اسے نواب حیدر علی کے انتقال کی خبر ملی (دسمبر ۱۷۸۲ء)۔''[۱]

تقریباً یہی رائے صاحبزادہ عبدالرسول نے رقم کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''۱۷۸۲ء میں کرنل بریتھ ویٹ نے اناگدی کے مقام پر ٹیپو سلطان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ انگریزوں نے مالابار میں نواب کے خلاف بغاوت اکسانے کی کوشش کی لیکن ٹیپو سلطان نے بروقت پہنچ کر بغاوت دبا دی اور انگریزی سالار ہمبر اسٹون پونانی کی طرف پسپا کر دیا۔ ٹیپو سلطان پونانی کے محاصرے میں مصروف تھا کہ اسے حیدر علی خان کی وفات کی خبر ملی۔''[۲]

حیدر علی کی موت اور ملیبار کی فتح کے واقعات ناول نگار اور مورخین کے نزدیک یکساں انداز میں پیش کیے گیے ہیں۔

ناول کے انیسویں باب سے اختتام تک کے واقعات ٹیپو سلطان کی تاج پوشی کے بعد کے ہیں۔ ان میں اہم مواقع ونڈی وش میں اسٹورٹ کی شکست اور بڈنور کی فتح کے ہیں۔ ان واقعات کے بارے میں شکیل احمد ضیاء رقمطراز ہیں:

''سلطان نے تخت نشینی کی رسم کے بعد ہی میدانِ جنگ کا رخ کیا۔ سلطان کی پیشقدمی سے گھبرا کر جنرل اسٹورٹ جس کا عظیم لشکر ونڈی وش کا محاصرہ کیے ہوئے تھا مدراس کی جانب پسپا ہو گیا۔ سلطان بڈنور کی جانب پلٹا اور انگریز سالار میتھوز کی افواج کو شکست دے کر اسے اسیر کر لیا۔''[۳]

ان واقعات کو صاحبزادہ عبدالرسول ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں:

''تاج پوشی کی تقریبات کے فوراً بعد اس نے میدان جنگ کا رخ کیا۔ اس اثنا میں انگریزی حکومت نے مشرق اور مغرب دونوں طرف سے حملہ شروع کر رکھا تھا۔ انگریزی سپاہ جنرل سٹورٹ کے تحت ونڈی واش میں خیمہ زن تھیں مگر سلطان کی آمد پر میدان چھوڑ کر مدراس کی طرف چلی گئیں۔ اس کے بعد سلطان بڈنور کی طرف بڑھا اور برطانوی سالار میتھوز کو شکست دے کر قید کر لیا۔''[۴]

ناول معظم علی ایک عہد ساز ناول ہے۔ جس کا آغاز بنگال میں علی وردی خان کے دورِ حکومت سے ہوتا ہے اور جس میں حیدر علی کی موت اور ٹیپو سلطان کی ابتدائی جنگوں کا تذکرہ موجود ہے۔ ہم نے چیدہ چیدہ تاریخی واقعات، شخصیات اور مختلف جنگوں کے حالات ناول سے اخذ کر کے تاریخی حقائق کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ اکثر ناقدین جو تاریخی ناول نگار کے لیے کچھ حدود

۱۔ تاریخ پاکستان و ہند، شکیل احمد ضیاء، ص ۲۹۶۔

۲۔ تاریخ پاک و ہند، صاحبزادہ عبدالرسول، ص ۹۸۔

۳۔ تاریخ پاکستان و ہند، شکیل احمد ضیاء، ص ۲۹۶۔

۴۔ تاریخ پاک و ہند، صاحبزادہ عبدالرسول، ص ۹۸۔

متعین کر کے طبع آزمائی کی اجازت دیتے ہیں بالعموم ان حقیقتوں کو پیش کر چکے ہیں کہ نسیم حجازی نے تاریخ کے ان سادہ خانوں میں رنگ آمیزی کی ہے جس کی اجازت ہر قسم کے ناول میں دی جا سکتی ہے خواہ وہ معاشرتی ہو یا تاریخی ۔ نسیم حجازی نے چند کردار تیار کیے اور تاریخ کے ان سادہ خانوں میں اس طرح پیش کیے کہ بظاہر وہ حقیقی معلوم ہوتے ہیں اور بقیہ ایسے اور اس قسم کے بہت سے کردار تاریخ میں گزرے ہوں گے جن کا تذکرہ مورخ ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ مورخین کے نزدیک اہم تاریخی شخصیات ، واقعات ہی بیان کرنا ہوتے ہیں ۔ اس لیے وہ بہت سے ضمنی معاملات پیش نہیں کرتا البتہ تاریخی ناول نگار کو اس ہوشیاری اور چابک دستی سے اپنے ناول کا پلاٹ ترتیب دینا چاہیے کہ جس میں تاریخی حقائق مسخ نہ ہوں اور قاری کے لئے دلچسپی اور کوئی ایسی بات ضرور ہو جسے مبلغ کی زبان سے نہیں صرف اشارے کنائے میں پیش کیا جائے ۔ اس ناول کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تاریخی حقائق اور بہترین کہانی کے ساتھ ساتھ ایک مسلم نوجوان کے لئے وہ تمام اصول وضوابط موجود ہیں جو اس میں حب الوطنی ، اسلام کی سربلندی اور جذبۂ شہادت کو بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا انسان بناتی ہیں ۔ وہ اپنے خاندان اور ماحول سے مطابقت پیدا کرے ، حقوق العباد کو سمجھے اور دنیا و آخرت کی خاطر اپنی زندگی کو کامیاب طریق سے گزارے ۔ یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ ناول ''معظم علی'' اور ناول ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' کو علیحدہ علیحدہ رکھ نہیں دیکھا جا سکتا یہ دونوں ناول حصہ اول اور حصہ دوم کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ممکن ہے قارئین کو اس تحقیقی جائزے میں کچھ تشنگی محسوس ہو امید ہے ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' کا تحقیقی جائزہ پڑھنے کے بعد ان کی یہ خلش دور ہو جائے گی ۔

اور تلوار ٹوٹ گئی کا تحقیقی جائزہ

اور تلوار ٹوٹ گئی:

اس ناول کے واقعات برصغیر کی تاریخ کا وہ دور پیش کرتے ہیں جو محض پندرہ سال پر محیط ہے یعنی ۱۷۸۵ء تا ۱۸۰۰ء تک لیکن اس عہد نے انگریزوں کی بالادستی کو مسلّم حقیقت اور مسلمانوں کی غداری کو ایک المیہ بنا دیا۔ کہانی میں بتایا گیا ہے کہ معاہدۂ منگلور کی رو سے میسور اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی دوسری جنگ کا خاتمہ سلطان ٹیپو کی ایک بہت بڑی فتح تھی۔ بڈنور کو انگریز فتح کر چکے تھے لیکن کڈلور میں فرانسیسی لشکر کے ہاتھوں ان کی فوج تباہی کا سامنا کر رہی تھی کہ یورپ سے خبر ملی کہ برطانیہ اور فرانس کے درمیان صلح ہو گئی ہے لہٰذا فرانسیسی سپہ سالار نے جنگ بند کر دی۔ جنگ سے فارغ ہونے کے بعد سلطان نے نرگنڈ کے راجا ونکٹ راؤ سے مصالحت کے لئے اپنا ایلچی بھیجا اور پونا میں نانا فرنویس کو ان معاملات میں دخل اندازی سے منع کیا لیکن دونوں نہ مانے بالآخر برہان الدین کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا۔ جس نے نرگنڈ سے چند میل دور ونکٹ راؤ کو شکست دی۔ مرہٹہ فوج کا سالار پرس رام بھاؤ، رام ڈرگ میں برسات کی وجہ سے پڑاؤ ڈال کر بیٹھ گیا۔ برہان الدین نے ان کو بھی شکست سے ہمکنار کیا اسی زمانے میں سلطان کا ایک سپہ سالار حیدر علی کورگ کی بغاوت ختم کرنے میں مصروف تھا میسور کی افواج نے ابتدا میں چند کامیابیاں حاصل کیں لیکن آخر کار وہ ناکام رہا اور سلطان ٹیپو کو خود میدان میں آنا پڑا۔ کورگ کے نائروں نے ہتھیار ڈال دیئے سلطان نے زین العابدین مہدوی کو کورگ کا صوبیدار مقرر کیا اور خود سرنگاپٹم کا رخ کیا۔ نانا فرنویس کی فوج دریائے کرشنا کے کنارے جمع ہو رہی تھی اسی دوران اکبر خان، معظم علی کے خاندان سے ملنے سرنگاپٹم آتا ہے جہاں وہ معظم علی، صدیق علی اور مسعود علی کی شہادت کے بارے میں اظہار افسوس کرتا ہے کہ اسے اس کی اطلاع دو سال بعد ملی اور وہ کتنا بے خبر ہے کہ اپنوں کی خیریت بھی نہیں رکھتا ساتھ ہی صابر کے انتقال کی خبر بھی اس کے رنج و ملال میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ انور علی پانڈی چری کسی مہم کے سلسلے میں گیا ہوا ہے اور مراد علی فوجی مدرسے سے تربیت حاصل کر رہا ہے اس نے بتایا کہ شہباز، تنویر اور ثمینہ تینوں ان لوگوں کو بہت یاد کرتے ہیں۔ اکبر خان نے واپسی پر مراد علی کو اپنے پاس آنے کے لیے بھی اصرار کیا۔

ایک دوپہر کو فرانسیسی جہاز سے گیارہ آدمی جن میں سے پانچ یورپین اور باقی افریقی تھے میسور کی فوج میں شامل ہونے کی غرض سے آئے۔ ان آدمیوں کو کپتان فرانسک لیکر آیا تھا۔ اس نے انور علی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی رات گیارہ بجے دلاور خان نے کپتان کے آنے کی اطلاع دی اس کے ساتھ لیگرانڈ تھا اس کے پیچھے پیرس کی پولیس لگی ہوئی تھی۔ تیسرے دن کپتان فرانسک لیگرانڈ کو انور علی کے پاس چھوڑ کر خود روانہ ہو گیا۔ لیگرانڈ کا اصل نام لیمبرٹ تھا۔ لیگرانڈ اپنے بارے میں انور علی کو بتاتا ہے کہ اس کی ملاقات انٹین اور اس کی بیٹی جینن سے اپنے سرائے میں ہوئی۔ جینن کا بھائی ڈینس انقلابی جماعت کا لیڈر تھا وہ پولیس کے ہاتھوں زخمی ہو کر مر گیا اور پولیس ان کے پیچھے لگ گئی اور وہ اپنی جان بچاتے بچاتے ہندوستان تک پہنچ گیا۔ انسپکٹر برنارڈ ان کی تلاش میں پانڈی چری تک پہنچ

جاتا ہے۔ انور علی نے لیگر انڈ کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پانڈی چری سے پندرہ میل دور مغرب کی طرف کرشنا گری کی جانب روانہ کیا اور وہاں کے فوجدار کے نام ایک تعارفی خط بھی لکھا اور وہاں سے لیگر انڈ کو انور علی کے نام ایک خط لکھنے کو کہا اور اسے سرنگا پٹم کی طرف روانہ ہونے کا کہہ کر خود پانڈی چری کی راہ لی۔ تین ہفتے بعد جین پانڈی چری پہنچنے والے ایک جہاز میں آئی اور اسی دن انور علی کے ساتھ سرنگا پٹم کا رخ کیا۔ پانڈی چری کے گورنر نے پولیس کو برنارڈ کی مدد کے لیے بھیجا لیکن اس شرط پر کہ وہ پانڈی چری کی حدود سے باہر ان کا پیچھا نہیں کریں گیا اور میسور میں پناہ لینے کے بعد وہ ان کی دسترس سے باہر ہوں گے۔ دلاور خان اور انور علی نے اپنے پیچھے آنے والے سپاہیوں کو چکمہ دے کر ان کو انگریز چوکی تک پہنچایا اور خود کرشنا گری کا رخ کیا۔ جب یہ لوگ سرنگا پٹم پہنچے تو لیگر انڈ لالی کے رجمنٹ کے ساتھ کسی مہم پر روانہ ہو رہا تھا۔ اس لیے ان کی شادی واپسی تک کے لئے ملتوی ہوگئی اور جین، انور علی کی والدہ کے پاس رہنے لگی۔ مراد علی، اکبر خان کی بیٹی تنویر شادی میں شرکت کے لئے گیا۔ تنویر کی شادی ہاشم بیگ سے ہو رہی تھی۔ جو طاہر بیگ کا بیٹا تھا وہاں مراد علی کی ملاقات فخر الدین اور امتیاز الدولہ سے ہوئی۔ شادی کی تقریب میں سیاست پر بحث ہونے کی وجہ سے امتیاز الدولہ مراد علی سے متاثر ہوا اور اس نے بتایا کہ دکن کے کئی لوگ ایسے ہیں جو سلطان ٹیپو کو اچھا آدمی سمجھتے ہیں۔ مراد علی سے اکبر خان کی بستی کے لوگ بھی بہت خلوص اور محبت سے ملے اور انہوں نے اس کے باپ کا تذکرہ بھی بہت اچھے الفاظ میں کیا مراد علی شادی میں شرکت کرنے کے بعد واپس آ گیا۔

ایک دن جین، فرحت کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے بتایا کہ انور علی کا خط آیا ہے مراد علی نے آ کر جین کو بتایا کہ لیگر انڈ آیا ہے۔ لیگر انڈ نے جین سے شادی کرنے کے بارے میں بات کی تو جین نے کہا کہ جب حالات بہتر ہوں گے تو وہ شادی کر لیں گے۔ لیگر انڈ نے اپنی فوج کے ساتھ بنگلور سے شمال کی طرف کا رخ کیا۔ میر نظام اور مرہٹہ لشکر مل کر ایک بار پھر میسور پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے لیکن انگریزوں نے ان کے ساتھ حامی نہ بھری لیکن انگریز اس بات کا یقین دلا چکے تھی کہ جب ان کو اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ اُن کی دفاعی قوت ختم ہوگئی ہے تو وہ بھی اپنے معاہدوں کی پاسداری نہیں کریں گے۔ شہباز خان، تنویر کو لینے کے لئے ادھونی گیا اور جب آٹھ روز بعد واپس آیا تو اس نے بتایا کہ اس نے ادھونی کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ اکبر خان نے اس کو بتایا کہ ادھونی کی فوج اسلام کے بدترین دشمنوں کو کرائے کی فوج مہیا کرتی ہے اور وہ فوج میں اس کی شمولیت پر خوش نہیں ہے لیکن کیونکہ اب وہ اس فوج میں شامل ہو چکا ہے اس لیے اس کو غداری نہیں کرنی چاہیے اور اپنے فیصلے پر قائم رہنا چاہیے۔ نظام اور مرہٹوں کی افواج نے میسور پر حملہ کر کے بادامی کا محاصرہ کیا۔ بادامی کی فتح کے بعد نانا فرنویس نے مرہٹہ افواج کی قیادت ہری پنت کے سپرد کی اور خود پونا روانہ ہوا۔ ایک اور لشکر گنیش پنت کی قیادت میں برہان الدین کا مقابلہ کر رہا تھا تکوجی ہلکر ان کی مدد کے لیے پہنچا اور شاہنور کا نواب عبدالحکیم سلطان کے ساتھ غداری کر کے مرہٹوں کے ساتھ مل گیا۔ سلطان ٹیپو نے ان کی توجہ دوسری جانب کرنے کے لیے ادھونی پر حملہ کر دیا اور مدد کے لئے آنے والے تہور جنگ، ہری پنت اور مغل علی خان کے لشکر کو شکست سے ہمکنار کیا۔ شہباز قلعے میں زخمی ہوا اس کی بینائی ختم ہوگئی جب

میسور کی افواج کی آمد کی وجہ سے تمام لوگ قلعہ خالی کر کے جانے لگے تو تنویر شہباز کے ساتھ رک گئی اور اس نے انور علی اور مراد علی کو بلوایا اور جب ان سے قلعہ خالی کرنے کی وجہ جاننا چاہی تو انہوں نے بتایا کہ اس قلعہ کو بارود سے اڑا دیا جائے گا۔ ان کو ان کے شہر کے گھر میں منتقل کر دیا گیا۔ شہباز کو اپنے ادھونی کی فوج میں شمولیت اختیار کرنے پر پچھتاوا ہوتا ہے اور وہ مراد علی اور انور علی کا اپنے اوپر بہت بڑا احسان سمجھتا ہے کہ انہوں نے اس کی مدد کی۔ انور علی نے بتایا کہ اس نے اکبر خان کو اس کے متعلق خط لکھ دیا ہے کیونکہ شہباز نے اپنی بیماری کے بارے میں گھر پر خبر نہیں دی تھی اس نے بتایا کہ نظام اب سلطان کی فوج کے لئے پریشانی کا باعث نہیں ہے اب صرف مرہٹوں کو ایک عبرتناک شکست دینے کی ضرورت ہے۔ ادھونی کی حفاظت سلطان نے قطب الدین کو سونپی اور دریائے تنگبھدرہ عبور کر لیا۔ ہری پنت نے سلطان کا راستہ روکنے کے لئے باجی پنت کی فوج روانہ کر دی۔ اس عرصے میں ایک لاکھ مرہٹہ فوج جمع ہو چکی تھی۔ سلطان کی پنڈارا فوج نے مرہٹہ فوج کے رسد و کمک کے راستوں کو بند کر دیا۔ ہری پنت نے شاہنور کا رخ کیا۔ سلطان نے پانچ میل دور پڑاؤ ڈالا۔ وہاں برہان الدین اور بدرالزماں خان کی افواج سلطان کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ مرہٹوں کے ساتھ تہور جنگ اور نواب شاہنور کی افواج شامل ہو چکی تھیں۔ ایک رات سلطان ٹیپو نے اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کر کے دشمن کے پڑاؤ کی طرف پیش قدمی کر دی لیکن برہان الدین، مہا مرزا خان اور میر معین الدین کی قیادت میں فوج کے تین قشون راستہ بھول گئے سلطان نے صبح تک ان کا انتظار کیا اور پھر حملہ کر دیا لیکن اس عرصے میں مرہٹے فرار ہو کر جائے پناہ لے چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سلطان کی بقیہ فوج وہاں پہنچ گئی اور شاہنور فتح ہو گیا۔ اس کے بعد میر معین الدین کی قیادت میں ایک قشون نے حیدر آباد کے سرحدی علاقوں کا رخ کیا۔ دوسرا قشون جس کی قیادت برہان الدین کے ہاتھ میں تھی بنکاپور اور مصری کوٹ کا رخ کر رہا تھا۔ ایک لشکر مہا مرزا خان کی قیادت میں رائچور اور کٹھور کا رخ کر رہا تھا اور حسین علی خان کی رہنمائی میں ایک لشکر پٹن کے گرد و نواح میں پیشوا اور نظام کے پالیگاروں کی سرکوبی پر مامور تھا۔ باقی لشکر سلطان کی قیادت میں مرہٹوں کے نئے پڑاؤ کی طرف یلغار کر رہا تھا۔ ہری پنت نے سلطان کی آمد کا سن کر چیدہ چیدہ سرداروں کا اجلاس طلب کیا اور کالکیری کی طرف ہٹنے کا فیصلہ کیا۔ انور علی کو سید غفار نے دو اور آدمیوں کے ساتھ مرہٹے سپاہیوں کے بھیس میں ان کے پڑاؤ میں جانے کا کہا۔ انور علی وہاں سے واپس آیا تو اس نے سلطان کو وہاں کا نقشہ سمجھایا اور بتایا کہ تین بجے اس کے بارود کے ذخیرے کو تباہ کر دیں گے۔ اس کے بعد ان پر حملہ کیا جائے۔ لیگرانڈ نے انور علی سے کہا کہ اگر اسے جنگ میں کچھ ہو جائے تو وہ جین کا خیال رکھے۔ رات کے تین بجے سلطان نے پڑاؤ پر حملہ کیا۔ ہری پنت اپنے سپاہیوں کے ساتھ فرار ہو گیا۔ تہور جنگ، بھونسلے، ہلکر اور دوسرے مرہٹہ اور مغل سردار جو رات کو انتہائی بے سر و سامانی میں فرار ہوئے تھے دریا کے کنارے اپنے ساتھیوں کو جمع کر رہے تھے۔ صبح کے آٹھ بجے تک پڑاؤ کے اندر مرہٹہ اور حیدر آبادی سپاہیوں کی رہی سہی مزاحمت بھی ختم ہو چکی تھی اور فاتح لشکر خالی گھوڑوں، رسد اور بارود سے لدی ہوئی بیل گاڑیوں اور اونٹوں کو جمع کر رہا تھا۔

ایک دن سلطان ٹیپو، مغل علی خان کے خیمے میں ایک نقشے کو دیکھ کر حملہ کرنے کی ہدایت کر رہا تھا اس نے کہا کہ ہماری اگلی

منزل کو پال اور بہادر بند کے قلعے ہیں ۔انور علی نے سلطان کو بتایا کہ قیدی عورتوں میں ہلکر کی بیوی بھی ہے ۔سلطان نے تمام قیدی عورتوں کو انور علی کے ساتھ بیس مسلح سواروں اور چند قیدیوں کو رہا کر کے ان تمام عورتوں کو مرہٹوں کے پڑاؤ تک پہنچوایا۔ ہلکر سلطان کا احسان مند ہو گیا۔ پونا اور دکن کی شکست خوردہ افواج سرنگا پٹم پر حملہ کرنے کی تجویز پر غور کر رہی تھیں کہ اُن کی قیدی عورتیں اُن کے پاس پہنچ گئیں تین دن بعد اس تجویز پر غور کرنے کے بعد حیدر آبادی اور مرہٹہ افواج کے رہنما ہری پنت کے خیمے میں جمع تھے۔انگریز افسر مسٹر یون بھی موجود تھا جو کمپنی کے ایجنٹ سر چارلس میلٹ سے ہدایات لے کر آیا تھا۔ ہلکر نے کہا کہ انگریز جب سلطان کے ساتھ معاہدہ توڑ سکتے ہیں تو ہمارے ساتھ بھی غداری کر سکتے ہیں اور لارڈ کارنوالس کی تیاریاں جب تک ختم نہ ہوں گی جب تک کہ ہماری رگوں سے خون کا آخری قطرہ نہ بہہ جائے گا۔ پونا اور حیدر آباد کی افواج جوابی حملے کی تیاریاں کر رہی تھیں کہ سلطان نے تنگبھدرہ کے آس پاس چوکیوں اور قلعوں پر قبضہ کرنے کے بعد بہادر بند کا محاصرہ کر لیا۔ ۸ جنوری کو پہلا حملہ کیا کہ اتحادی لشکر کا ایلچی صلح کی بات کرنے کے لئے آیا لیکن چار دن بعد سلطان کے لشکر نے دوبارہ حملہ کر دیا۔ مرہٹہ کمانڈنٹ مارا گیا اور سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیے سلطان کو اندازہ تھا کہ اگر اس نے جنگ کو طول دیا تو اسے دو محاذوں پر لڑنا پڑے گا کیونکہ انگریزوں کو تیاری کا موقع مل جائے گا لہٰذا اس نے ایک شدید حملہ کیا اور چند گھنٹوں میں میدان خالی ہو چکا تھا۔ اس فتح کے بعد سلطان نے تنگبھدرہ اور کرشنا کے درمیان کسی جگہ دشمن کو دم لینے کا موقع نہ دیا لیکن جب انہوں نے صلح کے لیے ہاتھ بڑھائے تو سلطان نے اپنی تلوار نیام میں ڈال لی۔ لیگرانڈ، انور علی اور مراد علی کے آنے بعد جین کی شادی لیگرانڈ سے ہو گئی اور فرحت نے ایک مکان اسے تحفے میں دیا اور ایک نوکر سردار خان بھی ان کو دیا۔ انگریزوں کی طرح پانڈی چری کی فرانسیسی حکومت کو بھی یہ امید نہ تھی کہ سلطان یہ جنگ جیت جائے گا ۔اس لیے انہوں نے معاہدہ وارسیلز کی آڑ لے کر ایک فریق بننے سے انکار کر دیا۔ پانڈی چری کے فرانسیسی گورنر موسیو کاسگنی نے یہ کوشش کی کہ مرہٹوں اور حیدر آبادی افواج کو جنگ سے باز رکھا جائے اور جب وہ اس میں ناکام ہوا تو اس نے مرہٹوں سے صلح چاہی لیکن اسے اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ لارڈ کارنوالس حکومت برطانیہ کو جنگ کے لیے تیار کر چکا تھا۔ ہلکر نے جنگ میں سلطان کے مقابل لڑنے سے انکار کر دیا تھا اور میر نظام علی اور نانا فرنویس دونوں جنگ میں اپنے اشتراک کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے پر مصر تھے۔ میر نظام علی کو اس کا وزیر میر عالم جنگ میں شامل ہونے کے لیے اصرار کر رہا تھا تو دوسری طرف شمس الامراء اور امتیاز الدولہ سلطان سے صلح کا معاہدہ کرنے پر زور دے رہے تھے۔ میر نظام نے حافظ فرید الدین کو سلطان کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا تا کہ اس کو صحیح قیمت مل سکے۔ برہان الدین سے انور علی نے کہا کہ نظام کے سفیر کے ساتھ مراد علی کو بھیج دیا جائے کیونکہ وہ امتیاز الدولہ کا دوست ہے۔ برہان الدین اس بات پر راضی ہو گیا حیدر آباد میں مراد علی، تنویر اور اس کے شوہر ہاشم بیگ سے ملنے گیا ان کا ایک بیٹا نصرت بیگ بھی تھا۔ ہاشم علی نے اسے بتایا کہ وہ ادھونی کی فوج چھوڑ کر نظام کی فوج میں شامل ہو چکا ہے۔ شہباز کی بینائی ختم ہو چکی ہے۔ شمس الامراء کو جب یہ پتا چلا کہ نظام سلطان کے ساتھ صلح نہیں کر رہا ہے بلکہ انگریزوں کے ساتھ شامل ہو رہا ہے تو اس نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود ثابت ہوئی۔ دو دن بعد اس کا

انتقال ہوگیا اور سرجان کیناوے لارڈ کارنوالس کو یہ خط لکھ رہا تھا کہ ہمارا بدترین دشمن ختم ہوا۔ سلطان کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے تین طاقتیں جمع ہوچکی تھیں۔ باہر سے اُسے کسی اعانت کی امید نہ تھی۔ فرانس نے معاہدہ وارسیلز کی خلاف ورزی سے انکار کردیا۔ ٹراونکور کا راجارامارو ما سلطان کے ساتھ صلح پر آمادہ نہ تھا۔ سلطان نے گورنر مدراس جنرل میڈوز کو صورتحال کی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن اس نے سلطان کی اپیلوں کی طرف سے کان بند کرلیے۔ بالآخر سارا ٹراونکور سلطان کے قدموں میں تھا۔ ویراپولی پہنچ کر سلطان کو اطلاع ملی کہ اتحادی میسور پر حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں اس لیے سلطان کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا۔ جنرل میڈوز نے مدراس سے پیش قدمی کی اور ترچناپلی کے قریب ڈیرے ڈال دیے اس نے کرور اور دھاراپورم کے علاوہ چند اور قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ سلطان نے ایک مہینہ کوئمبٹور میں قیام کرنے کے بعد سرنگاپٹم کا رخ کیا اور دشمن کی توجہ دوسری جانب مبذول کرنے کے لیے میر معین الدین کو ایک لشکر کے ساتھ چھوڑ دیا۔ کرنل اسٹورٹ نے ڈنڈیگل کے قلعے پر حملہ کیا اس کا کمانڈر حیدر عباس تھا اس نے اس شرط پر یہ قلعہ کھول دیا کہ اس کے سپاہیوں کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ مہابت جنگ کی کمان میں حیدرآباد کا لشکر رائچور کے مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا اور انہوں نے سرجان کیناوے سے کہا کہ جب تک اُن کو سلطان کی سمت معلوم نہیں ہوجاتی وہ جنگ میں شامل نہیں ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہم دشمن کے ارادے سے باخبر ہوئے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ دوسری طرف انگریزوں کو مرہٹوں سے بھی ایسے ہی جوابات مل رہے تھے کہ پہلے نظام کی فوج جنگ میں شامل ہو تو ان کی فوج بھی جنگ میں شامل ہوجائے گی۔ کپتان فرانسک جین اور لیگرانڈ کے پاس آیا کہ اس کو ان کی مدد کرنے کی وجہ سے قید کردیا گیا تھا لیکن انقلاب آنے کی وجہ سے وہ آزاد ہوگیا اور اگر وہ فرانس جانا چاہیں تو اُن کو اُن کی جائیداد وغیرہ مل سکتی ہے لیکن لیگرانڈ نے جانے سے منع کردیا۔ انور علی بھی جنگ کے لیے کسی مہم پر روانہ ہوگیا اور مراد علی اس سے پہلے ہی روانہ ہوچکا تھا۔ سلطان ٹیپو کی افواج سیتامنگلم کے قلعے پر قبضہ کرچکی تھیں۔ برہان الدین شہید ہوگیا سرنگاپٹم سے سلطان کی روانگی اور انگریزوں کی شکست کے دوران بارہ دن کا وقفہ تھا۔ انگریز اتنا نقصان اٹھا چکے تھے کہ جنگ مدافعانہ لڑائی میں تبدیل ہوچکی تھی۔ دھاراپورم کے قلعے پر بھی سلطان کی فتح کا جھنڈا لہرا رہا تھا سلطان نے قمرالدین کی کمان میں فوج کے چند دستے چھوڑ کر خود کرشناگری کی طرف پیش قدمی کی۔ سلطان کے لشکر نے درہ تھوپو کی طرف پیش قدمی کی جنرل میڈوز نے حملہ کیا لیکن کامیابی نہ ہوئی جنگ کا پہلا دور ختم ہوچکا تھا لیکن انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی۔ پانڈی چری سے تھوڑی دور سلطان کے پڑاؤ میں انور علی نے آکر بتایا کہ کارنوال چتوڑ سے بارہ میل کی دوری پر ہے۔ سلطان انور علی کو دھاڑ واڑ کے محاذ پر روانہ کردیتا ہے۔ ڈھونڈیا داغ کے علاوہ انور علی کی کمان میں پانچ سو سوار شامل تھے انہیں چتل ڈرگ سے بارود اور رسد کی گاڑیاں بھی لینی تھیں۔ ڈھونڈیا داغ ایک حریت پسند مرہٹہ تھا۔ لارڈ کارنوالس نے مختلف محاذوں سے فوج کو جمع کیا اور پیش قدمی کرکے میسور میں داخل ہوگیا۔ ۷ مارچ کو انگریزوں نے منگلور پر قبضہ کرلیا۔ سلطان نے کنگری سے پیش قدمی کی انگریزوں کی جنگی قابلیت جواب دے چکی تھی لیکن عیاری کام آئی غداروں نے دشمن کی کامیابی کا راستہ کھول دیا ان کا سرغنہ کرشن راؤ تھا۔ بہادر خان اور اس کے ایک ہزار ساتھی شہید ہوچکے تھے۔ سلطان نے میر معین

الدین کو کرشن راؤ کے پیچھے روانہ کیا اور میر معین الدین نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ منگلور سے باہر انگریزوں کے رسد و کمک کے راستے بند تھے لیکن میر نظام علی کے لشکر کی پیش قدمی نے سلطان کو منگلور کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ دھاڑواڑ میں بدرالزماں خان ڈٹا ہوا تھا۔ پرس رام بھاؤ اور کرنل فیڈرک کی افواج اُس وقت حیران رہ گئیں جب انور علی کی قیادت میں ایک لشکر بدرالزماں کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ چھ مہینوں بعد بدرالزماں نے چند شرائط پر قلعہ خالی کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے ساتھیوں کے قلعے خالی کرنے سے پہلے خود پرس رام بھاؤ کے پاس چلا گیا اور باقی لوگوں کو قلعے میں رہ کر اپنی توانائیاں بحال کرنے کا موقع دیا بدرالزماں نے شموگہ کے راستے پر پڑاؤ ڈالا۔ پانچ دن بعد انور علی نے قلعہ خالی کر دیا اور یہ لوگ وہاں سے روانہ ہوئے راستہ میں بھاؤ کے آدمی آئے اور اس کے ساتھ کچھ ساتھی واپس قلعے چلے گئے۔ باقی کو انور علی لیکر آگے بڑھتا رہا۔ شام کی تاریکی میں ان مرہٹوں نے جن کی قیادت میں یہ جا رہے تھے ان پر حملہ کر دیا لیکن انور علی کے دماغ اور تیزی کی وجہ سے بہت سے لوگ اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیگر انڈ زخمی ہو گیا تھا ۔ انور علی اسے چتل ڈرگ کے قلعے میں لایا اور جین کو بھی وہیں بلوایا گیا جین کے آنے کے بعد لیگر انڈ کا انتقال ہو گیا تھا انور علی، جین کو واپس سرنگا پٹم بھیج دیتا ہے۔ بدرالزماں کا ساتھی جو اُس کے ساتھ گیا تھا وہ بتاتا ہے کہ وہ ایک رات بھاگنے میں کامیاب ہو گیا اور بدرالزماں پرس رام بھاؤ کی قید میں ہے اور اس کا کہنا ہے کہ وہ جنگ کے بعد بدرالزماں کو نرگنڈ کی طرف روانہ کر دے گا اور جو کچھ بھی مرہٹوں نے اس کے ساتھ کیا وہ پرس رام بھاؤ کی مرضی سے نہیں تھا اور وہ اس پر شرمسار ہے۔ دھاڑواڑ کی فتح کے بعد لارڈ کارنوالس نے سرنگا پٹم پر حملہ کیا لیکن بارش اور مرہٹوں کے صحیح وقت پر نہ پہنچنے کے باعث اس کو اس حملے میں پسپائی اختیار کرنا پڑی اور وہ اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ بنگلور کی طرف روانہ ہو گیا۔ جین مسلمان ہو گئی تھی اور اس کا نام منیرہ خانم تھا۔ سرنگا پٹم سے پسپائی کے بعد اتحادی فوجیں منگلور میں جمع ہوئیں انہوں نے مختلف شہروں اور قلعوں پر حملے کیے لیکن ان میں بھی ناکام رہے۔ لارڈ کارنوالس کے پاس لامحدود اور سلطان کے پاس محدود وسائل تھے۔ اس کے باوجود میسور کے سپاہی ان سے اگر کسی مقام پر شکست کھاتے تو دوسرے مقام پر دوبارہ اپنا قبضہ واپس لے لیتے۔ انگریزوں، مرہٹہ اور نظام کی افواج ایک دفعہ پھر سرنگا پٹم کی طرف بڑھیں۔ لیکن قلعے کی فصیلیں انہیں ایک طویل صبر آزما جنگ کا پیغام دے رہی تھیں۔ صلح نامے کی شرائط میں سلطان کے دو بیٹے عبدالخالق اور معزالدین کو مانگا گیا اور تین کروڑ روپے کا تاوان طلب کیا گیا۔ سلطان نے اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ وکیل غلام علی اور رضا علی کو بھی بھیجا۔ اسی دوران دلاور خان کا انتقال ہو گیا اور اس نے اپنی طرف سے رقم سلطان کو تاوان دینے کے لئے بھیجی۔ لوگ رضا کارانہ طور پر رقم جمع کر رہے تھے کہ انگریزوں نے معاہدۂ جنگ کی خلاف ورزی کی لیکن میر قمرالدین کی ایک ڈویژن فوج پہنچنے کے بعد وہ دوبارہ صلح کے لیے سوچنے لگے۔ اس جنگ میں انگریز اور ان کے حلیف سلطان کو پوری طرح مغلوب نہ کر سکے لیکن سلطان اپنے زرخیز ترین علاقوں سے محروم ہو چکا تھا اور انگریز میسور کے اقتصادی اور فوجی وسائل پر ایک کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہو چکے تھے یہ جنگ ایک اور جنگ کے لئے راستہ صاف کر چکی تھی۔ سید غفار نے ہری پنت کو کہا کہ سلطان اُس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے جس کے بعد سلطان ٹیپو نے ہری پنت کو مشورہ

دیا کہ وہ انگریزوں سے ہوشیار رہے۔ ہری پنت سلطان کے رویے سے بہت متاثر ہوا اور اس نے آگے جا کر انگریزوں کے بجائے مرہٹوں کو سلطان کے ساتھ شامل ہونے کے لیے کہا۔ پرس رام جنگ کے بعد پانچ مہینے گذارنے کے بعد بھی قیدیوں کو رہا نہیں کر رہا تھا۔ سندھیا اور ہری پنت کی کوششوں سے مرہٹوں اور سلطان کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار ہوا ہی چاہتے تھے کہ ان دونوں کا انتقال ہو گیا۔ لیگرانڈ کا بہنوئی جولین، جین کو لے جانے کے لئے آتا ہے لیکن جین انکار کر دیتی ہے۔ فرحت، انور علی کے نام ایک خط لکھتی ہے اور اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ سلطان مراد علی کو تاوان کی دوسری قسط دے کر مدراس کی جانب روانہ کر دیتے ہیں۔ انور علی واپس آتا ہے تو اسے فرحت کے انتقال کی خبر ملتی ہے۔ وہ جین یعنی منیرہ سے شادی کے لیے تیار ہو جاتا ہے لیکن مراد کا انتظار کرتا ہے۔ جولین واپس چلا جاتا ہے۔ مراد کے آنے پر ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ لارڈ کارنوالس انگلستان چلا گیا اور اس کی جگہ سر جان شور نے کمپنی کی ذمے داریاں سنبھالیں۔ پہلے سال ہی سلطان تاوان کی رقم ادا کر چکا تھا لہٰذا ان کو سلطان کے بیٹے واپس کرنے پڑے۔ منیرہ نے مراد کو شادی کے بارے میں لکھا جو کہ چتل ڈرگ میں تھا۔ لیکن اس نے کہا کہ وہ پہلے اکبر خان کے ہاں جائے گا۔ اکبر خان کے گاؤں سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر مراد علی کو ڈھونڈیا داغ ملا۔ وہ مراد علی کے ساتھ روانہ ہوا راستے میں ایک بستی میں ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تھا اُن لوگوں کی انہوں نے مدد کی وہاں مراد علی کی ملاقات ثمینہ سے ہوئی۔ جس نے بتایا کہ اکبر خان اور شہباز کو مرہٹوں نے شہید کر دیا ہے۔ مراد نے فرحت کے انتقال کے بارے میں بتایا واپس آنے کے بعد مراد علی نے غازی خان سے کہہ کر ڈھونڈیا داغ کو واپس سرنگا پٹم بلوایا۔ اس نے اور اس کے چند ساتھیوں نے اسلام قبول کر لیا اور اب اس کا نام ملک جہاں خان تھا۔ جنگ کے بعد سلطان کی ساری توجہ سلطنت کے انتظام کی طرف تھی کہ میر نظام نے کرنول کا جھگڑا شروع کر دیا اور مرہٹہ اور انگریز افواج نے میر نظام کا سلطان کے مقابلے میں ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ مرہٹوں نے نظام پر بھی حملہ کر دیا اور عبرت ناک شکست حاصل کی وہ مشیر الملک کو اپنے ساتھ لے گئے اور میر عالم وزیر اعظم منتخب ہوا۔ میر نظام نے جان کیناوے سے ایک دفاعی معاہدہ کرنے کے لیے زور دیا لیکن جان کیناوے نے منع کر دیا۔ میر نظام نے انگریوں کی توجہ اپنی جانب کرنے کے لئے سلطان کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھایا لیکن سلطان اس دفعہ نظام کی چالاکی کو سمجھ گیا اور اس نے اپنا ایلچی واپس بلوالیا۔ میسور میں ایک بار پھر ولولوں کی نئی دنیا آباد ہو رہی تھی۔ دوسرے طرف نپولین بوناپارٹ کے عروج سے فرانس میں ایک نئی روح بیدار ہو رہی تھی۔ سر جان شور کے ریٹائر ہونے کے بعد رچرڈ ولزلی (ارل آف مارننگٹن) اس کی جگہ آیا۔ رچرڈ ولزلی آتے ہی میسور پر حملہ کرنے کے لیے بے تاب تھا لیکن مصر میں نپولین بوناپارٹ اور لاہور میں زمان شاہ کی مداخلت کی وجہ سے پیچھے ہٹ گیا لیکن بحیرہ روم میں نپولین کے جنگی بیڑے کی تباہی اور زمان شاہ کی واپسی کے بعد رچرڈ ولزلی کی ہمت بندھی۔ ملک جہاں خان کو ایک خط ملا وہ میر صادق کے پاس لے کر گیا۔ میر صادق، پورنیا اور میر قمر الدین نے ملک جہاں خان کو قید کر دیا۔ انگریزوں کی جنگی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں سلطان ٹیپو نے مراد علی کو زمان شاہ کے پاس بھیجا لیکن اس نے جنگ میں سلطان کے ساتھ مدد نہ کی مرہٹہ اس جنگ میں غیر جانب دار ہو گئے تھے۔ ولزلی کو اپنی اور میر نظام کی افواج سے زیادہ ان غداروں پر بھروسہ تھا جو

سرنگاپٹم میں سلطان کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے ان کو یہ پتا تھا کہ کون سی چوکیاں اور قلعے ایسے ہیں جس کے سپاہی ان کے ساتھ زیادہ دیر تک لڑائی کو جاری نہ رکھیں گے اور کون سے سپاہی ایسے ہیں جو آخری دم تک لڑتے رہیں گے۔ غداروں میں میر معین الدین، میر قمرالدین، بدرالزماں خان، میر غلام علی، میر صادق اور پورنیا اہم ہیں۔ انگریزوں نے اس بار بھی صلح کے لیے کچھ شرائط پیش کیں جن کو یہ غدار کہتے تھے کہ قبول کرلیا جائے۔ لیکن باقی تمام سپاہیوں کے کہنے پر جنگ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ میر صادق کے آدمیوں کو جب اس بات کا خدشہ ہوا کہ غازی خان کو ملک جہاں خان کے بارے میں پتا چل گیا ہے اور ان کی غداری کا بھی علم ہو گیا تو انہوں نے غازی خان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جنگ میں غداروں کی وجہ سے میسور کے شیروں کو جلد ہی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن سید غفار اور سلطان ٹیپو جنگ میں شہید ہو گئے۔ انور علی شدید زخمی حالت میں اپنے گھر پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ شہر میں لوٹ مار کا بازار گرم تھا ایک دستہ ان کے محلے تک آ پہنچتا ہے۔ فائرنگ کے تبادلے میں منیرہ شہید ہو جاتی ہے اور فوجی واپس چلے جاتے ہیں۔ اس موقع پر ہاشم بیگ انور علی کی جاں بخشی کا پروانہ لیے آتا ہے تو اسے حالت نزع میں پاتا ہے۔ انور علی، سراج الدولہ کی جانب سے ملی ہوئی قیمتی ہیروں کی تھیلی سے تین ہیرے اپنے ملازمین میں بانٹنے کے بعد باقی ہاشم بیگ کو ثمینہ یا مراد علی تک پہنچانے کے لیے سونپ دیتا ہے۔ اسی دوران ملک جہاں خان آتا ہے جو ٹیپو سلطان کے بیٹے کے ساتھ جنگ میں شرکت کے لیے جا رہا تھا۔ انور علی کو آمادہ کرتا ہے کہ شہر سے نکل جائے مگر پھر تنہا ہی روانہ ہو جاتا ہے۔ انور علی، ہاشم بیگ سے کہتا ہے کہ وہ اسے اور منیرہ کو اسی گھر میں دفن کر دے اور پھر داعی اجل کو لبیک کہتا ہے۔

رات گئے محل کے قریب لاشوں کا جائزہ لیا گیا اور جب شناخت سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ ٹیپو سلطان شہید ہو چکے ہیں تو جنگی کاروائیاں روک دی گئیں۔ اگلے روز انتہائی حبس تھا۔ گرمی شدت پر تھی۔ دریائے کاویری میں طغیانی تھی۔ تمام شہر سلطان کے جلوس میں شامل تھا جب لحد میں اتارنے کا وقت آیا اور انگریز بٹالین سلامی دینے کے لیے تیار ہوئی تو بادلوں کی شدید گرج اور بجلیوں کی چمک نے ماحول کو انتہائی رقت انگیز بنا دیا اور لوگ کہہ اٹھے کہ سلطان کو اسی دن کا انتظار تھا۔ افسوس غداران وطن کی سازشیں دو دن اور ناکام ہو جاتیں تو فلک کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ ادھر ایک شام مراد علی کے ساتھ آٹھ سوار دریائے کابل کے کنارے سردار کی بستی میں داخل ہوئے۔ سردار کا نام مکرم خان تھا۔ مراد علی سے اس کا پوتا محمود خان ملتا ہے۔ مکرم خان نے بتایا کہ وہ اُس کے باپ معظم علی اور اکبر خان کو جانتا ہے۔ وہ پانی پت کی جنگ میں اُن کے ساتھ تھا اور وہ مراد علی سے کہتا ہے کہ پشاور اور قندھار میں ہونے والی بغاوت کی وجہ سے شاہ زمان ادھر مصروف ہیں اور اس کو یقین ہے کہ وہ اندرونی بغاوتوں سے نمٹنے کے بعد ہندوستان کا رخ کریں گے اور مراد علی جب بھی آنا چاہے اُس کے گھر کے دروازے اس کے لیے ہمیشہ کھلے ہیں۔ مراد علی ہندوستان کے لیے روانہ ہو جاتا ہے یہاں سلطان کے بیٹے نے انگریز اور غداروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے لیکن ملک جہاں خان نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اہل میسور اپنی آزادی کھو چکے تھے لیکن میسور کی راکھ میں ابھی تک چند چنگاریاں سلگ رہی تھیں نئے راجا کی تاج پوشی کے بعد جنرل ہیرس نے لارڈ ولزلی کو یہ خط لکھا کہ

ہمارے خلاف ملک جہاں خان کی کاروائیاں باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر رہی ہیں اور ملک جہاں خان کے ساتھ پانچ ہزار باغی جمع ہو چکے ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک دن بلقیس اور ثمینہ کے پاس ہاشم کا خط اور مراد علی کا نوکر آیا اور ان کو پتا چلا کہ مراد علی اپنے بھائی اور بھابھی کی موت کا سن کر لا پتا ہو چکا ہے کچھ دنوں بعد ہاشم خان آتا ہے اور بتاتا ہے کہ مراد علی ملک جہاں خان کے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ ہاشم بیگ کو پتا چلتا ہے کہ ثمینہ، مراد علی کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی ہے تو وہ مراد علی کو ڈھونڈنے نکلتا ہے۔ مراد علی ملتا ہے تو وہ واپس آنے سے انکار کر دیتا ہے ہاشم یہ تمام باتیں واپس آ کر بلقیس اور ثمینہ کو بتاتا ہے لیکن ثمینہ کہتی ہے کہ مراد علی ضرور واپس آئے گا۔ ملک جہاں خان کی فوج میں انگریزوں نے اپنے جاسوس شامل کر دیے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جہاں خان کی ہر سرگرمی سے باخبر رہتے اور وہ جہاں خان کے ساتھیوں کو مایوس بھی کر رہے تھے آخر کار جہاں خان مارا گیا اور باقی افسروں کو مرہٹوں نے مل کر انگریزوں کی قید میں ڈلوا دیا۔ مراد علی بھاگ کر بلقیس کے گھر آ گیا اور اس نے افغانستان جانے کا ارادہ ظاہر کیا وہ بیمار تھا ہاشم بیگ نے ادھونی سے طبیب مصطفیٰ خان کو بھیجا اور اپنی آمد کی اطلاع دی۔ ہاشم بیگ کی آمد کے بعد ثمینہ اور مراد علی کی شادی ہو گئی اور وہ منور خان اور پانچ نوکروں کے ساتھ کابل کے کنارے مکرم خان کی بستی کی طرف روانہ ہوئے۔ جب وہ دریائے کابل کے قریب پہنچے تو عصر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ مراد علی گھوڑے سے اترا اور وضو کے لیے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے دریائے کاویری کے دلکش مناظر آ گئے۔ وہ تصور کے عالم میں سرنگا پٹم کے قلعے کی فصیلیں اور برج دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے بچپن اور جوانی کے ساتھیوں کے ہمراہ سرنگا پٹم کے خوبصورت باغات کی سیر کر رہا تھا۔ وہ ان دلکش مساجد کا طواف کر رہا تھا جہاں کبھی ہر نماز کے ساتھ سلطان ٹیپو کی فتح کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ پھر یکے بعد دیگرے اس کے سامنے اپنے گھر کی مختلف تصویریں آنے لگیں۔ زندگی کی کتنی مسرتیں تھیں جو وہاں دفن ہو چکی تھیں۔ کتنے قہقہے تھے جو خاموش ہو گئے۔ ''بہت دیر ہو گئی آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' ثمینہ نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ مراد علی نے مڑ کر دیکھا اور اس کی چھلکتی ہوئی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ ''کیا ہوا؟'' ثمینہ نے بھرائی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ''آپ رو رہے ہیں؟'' ''کچھ نہیں ثمینہ یہ آنسو دریائے کاویری سے دریائے کابل تک پہنچنے والے مسافر کی زندگی کی آخری متاع ہیں۔''

اورتلوارٹوٹ گئی کا تحقیقی جائزہ

ناول ''اورتلوارٹوٹ گئی'' غیر منقسم ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور مختلف علاقوں پر ہونے والے واقعات پر مشتمل ہے۔ یہ بجا طور پر معظم علی کا دوسرا حصہ کہا جاتا ہے۔ معظم علی کے واقعات بنگال میں علی وردی خان کے دورِ اقتدار سے سراج الدولہ کی شکست، دہلی میں مرہٹوں اور ابدالی کے معرکے اور میسور میں حیدر علی کے دورِ اقتدار کا احاطہ کرتے ہوئے ٹیپو سلطان کے ابتدائی دورِ حکومت پر مشتمل ہیں جبکہ ''اورتلوارٹوٹ گئی'' کے واقعات ۱۷۸۵ء تا ۱۸۰۰ء تک کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس میں ٹیپو سلطان کے ساتھ مرہٹوں، نظام حیدر آباد اور انگریزوں کے تعلقات اور ان کے درمیان جنگوں کا تذکرہ ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے بھی یہ ناول میسور اور اس کے گردو نواح کی ریاستوں تک محدود ہے۔ اس ناول کا پلاٹ ایک اولوالعزم سپہ سالار کی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ اسے درپیش سازشوں کا مربوط قصہ ہے۔ اس ناول میں اہم تاریخی شخصیات ٹیپو سلطان، برہان الدین، سید غفار، زمان شاہ، شمس الامراء، محمد علی، میر نظام علی، ونکٹ راؤ، نانا فرنویس، پیشوا، لارڈ کارنوالس، جنرل اسٹورٹ، جنرل میڈوز، سرجان کیناوے اور جنرل ہیرس ہیں جبکہ کہانی کو مربوط بنانے اور ناول کے قالب میں ڈھالنے کے لیے بعض تخیلاتی کردار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں جین (منیرہ) لیگرانڈ، مراد علی، انور علی، فرحت، ثمینہ، تنویر، ہاشم بیگ، عطیہ، مکرم خان، ملک جہاں خان، انسپکٹر برنارڈ اور موسیو لالی شامل ہیں۔ جن اہم مقامات کا تذکرہ ناول میں موجود ہے ان میں پانڈی چری، سرنگا پٹم، کرشنا گری، نرگنڈ، منگلور، ادھونی، بنگلور، بادامی، پونا، گوالیار، ترچنا پلی، کوئمبٹور اور کابل شامل ہیں۔ پلاٹ کا خیال تاریخ کی ورق گردانی سے ابھارا گیا ہے۔ ٹیپو سلطان کے گرد پوری کہانی گھومتی ہے۔ جہاں تاریخی کردار شامل کیے گئے ہیں انہیں معاشرتی اور سماجی اعتبار سے اتنی خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے کہ حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پلاٹ، کردار نگاری، مکالمے اور منظر نگاری ہر ہر موقع پر قاری انتہائی تجسس اور ذہنی وابستگی کو شامل کر کے ناول پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ ناول نگار نے ٹیپو سلطان کے خلاف مرہٹوں اور میر نظام علی کی جس متحدہ فوج کا تذکرہ ۱۷۸۷ء، ۱۷۸۸ء پر کیا ہے بالکل درست مقام اور تاریخی اعتبار سے درست شخصیات سے منسوب ہے اس واقعہ کا تذکرہ محب الحسن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''مدھو جی بھونسلے نے جو نانا سے ملاپ کرنے کے لیے پونا آیا تھا ٹیپو کے خلاف پیشوا کی مدد کرنے کا وعدہ کیا لیکن اپنی بیماری کی وجہ سے اُسے ستمبر میں ناگپور جانا پڑا تاہم اس نے اپنے بیٹے ملیایا کو دو ہزار آدمیوں کے ساتھ وہیں چھوڑ دیا اور نانا کو یقین دلایا کہ ناگپور پہنچ کر وہ اور فوج بھیج دے گا اور جیسے ہی اس کی صحت بہتر ہوگی دس ہزار فوج لے کر وہ خود آئے گا۔ ہلکر بھی بیس ہزار فوج دس ہزار پنڈاری اور چند توپیں لے کر ٹیپو کے خلاف یلغار کے لیے تیار تھا۔ نرگنڈ کے سوال پر نانا کی پالیسی سے اگرچہ متفق نہیں تھا اور اس نے پونا آنے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم جنگ شروع ہوتے ہی اس میں شامل ہونے پر رضامند ہو گیا۔

نظام نے کرشن راؤ بلال کو جواب دیا کہ متحدہ محاذ میں شامل ہونے کے لیے وہ تیار ہے بشرطیکہ اُسے پچیس لاکھ روپے جنگ کے اخراجات کے لیے دیے جائیں اور بیجاپور کا صوبہ اور احمد نگر کا قلعہ اسے واپس مل جائے اس نے سوچا کہ پونا سے اُن شرائط کی

منظوری لی گئی تو تاخیر ہوگی۔ اُسے یہ ڈر بھی تھا کہ ممکن ہے نانا ان شرائط کو منظور ہی نہ کرے اس لیے کرشن راؤ نے اپنی ذمہ داری پر نظام کو یقین دلایا کہ اس کی شرطوں پر ہمدردی سے غور کیا جائے گا اور اُس سے درخواست کی کہ وہ یادگیر کی طرف کوچ کرے۔ نظام اس جواب سے مطمئن ہوگیا اور نومبر ۱۷۸۵ء میں وہ روانہ ہوگیا۔ نانا کے یکم دسمبر ۱۷۸۵ء کو ہری پنت کو یادگیر کی طرف نظام کی فوجوں سے مل جانے کے لیے بھیجا اور ۱۲ دسمبر کو وہ خود پونا سے چلا اور پندھار پور کے مقام پر ہری پنت کو جا پکڑا۔ یہیں پر پرشورام باہو اور رگھوناتھ راؤ کرندوار کر بھی اس سے آکر مل گئے اور سب ایک ساتھ یادگیر کی طرف بڑھے جہاں نظام ان کا انتظار کر رہا تھا۔

نانا اور نظام کے درمیان تقریباً ڈیڑھ مہینے تک گفت وشنید جاری رہی۔''[۱]

اس واقعہ کی مزید صداقت ڈاکٹر محمود حسن اپنے مضمون میں اس طرح کرتے ہیں:

''ٹیپو سلطان کی کامرانی نانا فرنویس کے لیے دل شکن تھی اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کرنے کے لئے (۱۷۸۵ء میں) اس نے بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور انگریزوں، نظام اور دوسرے مرہٹہ سرداروں سے اتحاد کا خواہاں ہوا۔

انگریزوں کے علاوہ تمام اتحادی میسور پر حملے کے لئے یادگیر کے مقام پر جمع ہوئے۔''[۲]

ناول نگار اور مورخین اس رائے پر متفق ہیں کہ انگریزوں سے معاہدے کے بعد مرہٹے اور میر نظام علی متحد ہو کر میدان جنگ میں آگئے تھے۔ مقام اور اتحادی افواج کے شرکاء کے بارے میں بھی ناول نگار اور مورخین میں اتفاق موجود ہے ذرا سا اختلاف مقام کے نام پر ہے ناول نگار نے اودگیر رقم کیا ہے جبکہ مؤرخین یادگیر مقام لکھتے ہیں۔ ان اتحادی افواج نے جس مقام پر پہلی فتح حاصل کی وہ بادامی کا ہے۔ بقول ناول نگار یہ شہر انتہائی مضبوط تھا مگر فوج محدود تھی۔ جب اتحادی افواج نے یلغار کی تو بارودی سرنگوں کی وجہ سے شہر کی فصیل تک پہنچنے سے قبل ہی خاصا جانی نقصان اٹھا چکے تھے مگر افرادی قوت کی بہتات کے پیش نظر شہر میں داخل ہو گئے۔ میسور کی افواج قلعے میں محصور رہیں۔ پانی کی قلت نے کمانداروں کو بحالتِ مجبوری ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔ (واقعات بادامی ۱۲۷ تا ۱۲۸) ان واقعات کا لفظ بہ لفظ تذکرہ محب الحسن نے یوں کیا ہے:

''جب نظام حیدر آباد چلا گیا تو اتحادی فوجیں بادامی کی طرف بڑھیں اور یکم مئی ۱۷۸۶ء کو حملہ شروع کیا۔ یہ ٹیپو کی شمالی سرحد کے ایک میدانی علاقے میں قلعہ بند شہر تھا جہاں تقریباً تین ہزار حفاظتی فوج تھی۔ ایک چھوٹی گڑھی بھی تھی۔ اس کے علاوہ شہر کے دونوں جانب دو پہاڑی قلعے بھی اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ تقریباً تین ہفتے تک اتحادی دیواروں میں شگاف ڈالنے کی انتہائی کوشش کرتے رہے لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لیے انہوں نے براہِ راست حملہ کرنے کا فیصلہ کیا اور ۲۰ مئی کی صبح کو بیس ہزار پیادوں کو ساتھ لے کر دھاوا بول دیا۔ لیکن جیسے ہی وہ آگے بڑھے میسوریوں نے سرنگیں بچھا دیں تھیں اور خندق اور پوشیدہ راستے جو بارود سے بھرے تھے بھک سے اڑ گئے اس سے ان کی بہت سی جانیں ضائع ہوئیں تاہم ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے اور وہ بڑی بہادری اور عزم کے ساتھ

۱۔ تاریخ ٹیپو سلطان/ محب الحسن/ حامد اللہ افسر عتیق صدیقی، ص ۱۲۹، ۱۳۰۔

۲۔ ٹیپو سلطان انگریزوں کے خلاف جدوجہد، مشمولہ بصائر، ڈاکٹر محمود حسین، نصیب اختر، ص ۸۲۔

آگے بڑھے اور سیڑھیوں کے ذریعے دیواروں پر چڑھ گئے۔ حفاظتی فوج نے مزاحمت کی مگر ان کو شکست ہوئی اور بھاگ کر قلعہ میں گھس گئے اتحادی فوجوں نے فراریوں کا پیچھا کیا اور قلعے میں گھسنے کی کوشش کی لیکن حملہ آور کامیاب نہیں ہو سکے۔ بڑے پتھر قلعے سے لڑھکائے گئے اور بندوقوں کی گولیاں جو حفاظتی فوج نے اُن پر برسائیں بہت ہی تباہ کن ثابت ہوئیں۔ جن سے آٹھ سو مرہٹے مارے گئے اور اتنے ہی نظام کی فوج کے آدمی ختم ہوئے میسوری صرف چار سو کام آئے۔

اگر چہ قلعہ فی الحال بچا لیا گیا تھا لیکن اس کے کمانڈر حیدر بخش نے اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا کہ وہ زیادہ دیر جما نہیں رہ سکے گا۔ شہر دشمن کے قبضے میں تھا اس لیے قلعہ کو پانی مہیا نہیں کیا جا سکے گا کیونکہ وہ شہر کے بڑے تالاب سے لایا جاتا تھا اس لیے اس نے مصالحت کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کیا۔ لیکن نانا نے جو نقصانات کی وجہ سے جھنجلایا ہوا تھا جو اسے قلعے کے محاصرے میں پہنچے تھے اس تجویز کو مسترد کر دیا اور اطاعت قبول کرنے میں اصرار کیا۔ کمانڈر پہلے تو اس پر راضی نہ ہوا لیکن پانی کی کمی کو دیکھ کر جس کی وجہ سے اس کے بہت سے آدمی موت کا شکار ہو چکے تھے اور محاصرہ کرنے والوں کے اٹل ارادے کے پیش نظر اس نے ۲۱ مئی کو غیر مشروط اطاعت اس وقت قبول کر لی جب اسے یقین دلایا گیا کہ حفاظتی فوج کے کسی آدمی کی جان نہ لی جائے گی۔

پرشورام باہو نے تجویز پیش کی کہ حیدر بخش اور چند اور آدمیوں کو جنھوں نے نرگنڈ کے معاملے میں غداری کی تھی قید کر دیا جانا چاہیے لیکن نانا اور ہری پنت نے اس کی بات نہیں مانی کیونکہ ان کے خیال میں حفاظتی فوج کو جان بخشی کی یقین دہانی کی گئی تھی اس کی خلاف ورزی ہوتی۔

بادامی پر قبضہ ہو جانے کے بعد نانا ۲۶ مئی کو پونا چلا گیا۔ فوج کی کمان اس نے ہری پنت کے سپرد کر دی۔[1]

اس واقعہ کا تذکرہ ڈاکٹر محمود حسین نے اس طرح رقم کیا ہے:

''اتحادیوں کی افواج بادامی کی طرف بڑھیں اور انہوں نے یکم مئی ۱۷۸۶ء کو حملے کا آغاز کر دیا۔ سخت مقابلے کے بعد قلعے کے کماندار نے جو بلا شبہ پانی کی کمیابی کے سبب مجبور ہو گیا تھا غیر مشروط طور پر ۲۱ مئی ۱۷۸۶ء کو قلعہ حوالے کر دیا۔[2]

اس فتح کا ذکر صاحبزادہ عبدالرسول نے اس طرح کیا ہے:

''عہد نامہ منگلور کے ایک ہفتے بعد ہی نظام اور مرہٹوں میں معاہدہ ہوا اور ۱۷۸۶ء میں انہوں نے مل کر میسور پر حملہ کر دیا۔ اتحادی افواج بادامی پر بڑھیں اور اسے فتح کر لیا۔''[3]

ان تمام آراء سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اتحادی افواج کے ابتدائی حملے میں بادامی کے مقام پر میسور کی افواج کو شکست ہوئی اور جن مورخین نے اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے وہ اس شکست کی وجہ قلعے میں پانی کی قلت قرار دیتے ہیں یعنی ناول نگار اور مورخین متفق

۱۔ تاریخ ٹیپو سلطان، محب الحسن، ص ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳۔

۲۔ ٹیپو سلطان انگریزوں کے خلاف جدوجہد مشمولہ بصائر، ڈاکٹر محمود حسین، انتخاب اختر، ص ۸۶، ۸۷۔

۳۔ تاریخ پاک و ہند، صاحبزادہ عبدالرسول، ص ۱۰۲۔

بیانات نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ناول نگار نے جس واقعہ کو خاص اہمیت دی ہے شاہ نور کا ہے جہاں کا نواب عبدالحکیم خان، حیدر علی کے زمانے میں بھی خراج دیتا تھا لیکن ٹیپو کے زمانے میں اس نے خراج کی رقم ادا نہ کی اور مرہٹوں سے ساز باز کرنے لگا۔ ٹیپو سلطان کا اہم سالار برہان الدین ایک دوسرے مقام پر مرہٹوں کا منتظر تھا مگر جب مرہٹے شاہ نور عبدالحکیم خان کی مدد کو پہنچے تو برہان الدین بھی مقابلے پر آیا۔ یہاں یہ امر توجہ طلب ہے کہ ناول نگار نے عبدالحکیم خان کے علاقے کو شاہ نور لکھا ہے جبکہ محب الحسن نے ساوانور اور ڈاکٹر محمود حسن نے سوانور نقل کیا ہے ممکن ہے کہ علاقائی زبانوں کی وجہ سے اس نام کے استعمال میں یہ فرق آیا ہو۔

ان حالات میں کہ جب برہان الدین تقریباً محصور ہو چکا تھا۔ حیدرآباد اور پونا کے حکمرانوں کا خیال تھا کہ ٹیپو سلطان کی پہلی ترجیح برہان الدین کی امداد ہوگی مگر ٹیپو سلطان نے ایک حیرت انگیز فیصلہ کیا اور ادھونی پر چڑھائی کر دی یہاں کا حاکم مہابت جنگ، نظام کا بھتیجا تھا اور سلطان ٹیپو کو یقین تھا کہ مرہٹے اور نظام اس کی مدد کو ضرور آئیں گے اور یوں وہ ان کی توجہ کو بانٹنے کا باعث ہوگا۔ ادھونی پر ٹیپو سلطان کی یلغار کا تذکرہ ایم۔ اے۔ عزیز ان الفاظ میں کرتے ہیں:

" Forced by circumstances the Sultan made a major offensive at Adhoni but Haripant and Mughal Khan were made to retreat .[۱]

اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ ڈاکٹر محمود حسین یوں بیان کرتے ہیں؛

''سلطان نے اپنی حکمتِ عملی سے اس اتحاد کو توڑنا چاہا لیکن اس کی کوششیں ناکام رہیں جب کوئی صورت باقی نہ رہی تو وہ بنگلور کی طرف چل دیا تاکہ وہاں کچھ حفاظتی تدابیر اختیار کر سکے یہاں پہنچ کر پھر اس نے تنازعات کو امن و صلح سے ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ بھی ناکام رہا آخر کار وہ ایک کثیر فوج لیکر بنگلور سے ادھونی کی طرف روانہ ہوا۔

اس کی یہ پیش قدمی اتحادیوں کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ سلطان، برہان الدین کے آڑے وقت میں اس کی مدد کے لئے پہنچے گا۔ ٹیپو سلطان کی فوج کشی کا مقصد مرہٹوں کی توجہ کو جو برہان الدین پر پورا دباؤ ڈال رہے تھے۔ اس طرف مبذول کرنا تھا۔[۲]

اس واقعہ کا تقریباً انہی الفاظ میں تذکرہ محب الحسن نے اس طرح رقم کیا ہے:

''اتحادیوں کا خیال یہ تھا کہ ٹیپو بنگلور سے برہان الدین کی مدد کے لیے کوچ کرے گا اس کے بجائے وہ کوٹی کو کمک پہنچانے کے لیے بڑھا جس کا مرہٹوں نے محاصرہ کر رکھا تھا۔ انہوں نے جب ٹیپو کے آنے کی خبر سنی تو وہاں سے ہٹ کر وہ بادامی چلے گئے۔ چنانچہ ٹیپو ان کو حیرت میں ڈال کر یکایک ادونی پہنچ گیا جس پر مہابت جنگ نے قبضہ کر لیا تھا جو بسالت جنگ کا بیٹا اور نظام کا بھتیجا تھا۔ اپنی فوجوں کو ادونی لے جانے سے ٹیپو کا مقصد حریف کی توجہ کو اس کی طرف سے ہٹانا تھا جہاں مرہٹوں نے برہان الدین کو مشکلات میں

A History of Pakistan; Dr. M.A. Aziz, Pg 93[۱]

[۲] ٹیپو سلطان انگریزوں کے خلاف جدوجہد مشمولہ بصائر، ڈاکٹر محمود حسین/ نصیب اختر، ص ۸۷۔۸۸۔

مبتلا کر رکھا تھا اور یہ مقصد بھی تھا کہ دشمن اس کی سلطنت میں اور آگے نہ بڑھ سکے۔''[۱]

صاحبزادہ عبدالرسول نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں مرقوم کیا ہے:

''سلطان نے ایک ہی جنگی چال میں ان کے اوسان خطا کر دیے اس نے اچانک ادھونی پر حملہ کر دیا۔ یہ سن کر مرہٹے بھی اس کی طرف بڑھے مگر انہیں ایسی شکست ہوئی اور ادھونی پر سلطان کا قبضہ ہو گیا۔''[۲]

مورخین اس رائے پر متفق ہیں کہ سلطان ٹیپو نے برہان الدین کی مدد کے بجائے ادھونی پر فوج کشی کی۔ یہ بات ناول نگار کے بیان کے عین مطابق ہے اس لیے ہم یہ لکھنے میں حق بجانب ہیں کہ ناول نگار حقائق کو مسخ کیے بغیر اپنی کہانی کو ترتیب دیتا رہا۔ ناول کے واقعات کے مطابق سلطان ٹیپو دریائے تنگبھدرہ کے مقام پر دریا عبور کر کے بہادر بندہ کے قلعے کا محاصرہ کر لیتا ہے۔ جنوری ۱۷۸۷ء میں جنگ مذاکرات اور قلعے کے کماندار کے قتل کے بعد یہ قلعہ فتح ہو جاتا ہے۔ اس واقعہ کا تفصیلی تذکرہ محب الحسن نے اس طرح رقم کیا ہے:

''۱۳ جنوری کو اس نے بہادر بینڈا کا محاصرہ شروع کیا اور ۸ جنوری تک تین مرتبہ اس پر گولہ باری کی مگر بہت نقصان اٹھا کر پسپا ہوا۔ اس کے بعد چند روز کے لیے جنگ بند ہو گئی اور صلح کے لیے گفت وشنید شروع ہوئی لیکن چونکہ گفتگو ناکام رہی۔ اس لیے گولہ باری پھر شروع ہو گئی۔ ۱۳ جنوری کو دیوار پر سیڑھیاں لگا کر چڑھنے کی کوشش کی گئی۔ حفاظتی فوج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر یہ دیکھ کر کہ مدد ملنے کی کوئی امید نہیں ہے اور ان کے کماندار کو ٹیپو نے گولی مار دی ہے تو انہوں نے جان کی امان اور مرہٹہ فوج میں جانے کی آزادی پا کر ہتھیار ڈال دیے۔ بہادر بینڈا بہت مضبوط اور ناقابلِ تسخیر قلعہ تھا پھر بھی ٹیپو نے اسے فتح کر لیا۔''[۳]

اس واقعہ کو ذرا اختصار سے ڈاکٹر محمود حسین نے اس طرح لکھا ہے:

''اس فتح کے بعد فوراً ہی اس (ٹیپو) نے بہادر بندہ پر جو ایک مستحکم قلعہ تھا قبضہ کر لیا۔''[۴]

ان دونوں آراء سے ناول نگار کے بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ناول نگار ٹیپو سلطان کی سفارتی کوششوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قسطنطنیہ بھیجی جانے والی سفارت کا حال یوں بیان کرتا ہے:

''دولتِ عثمانیہ اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہی تھی۔ روس کی ملکہ کیتھرین ثانی اور آسٹریلیا کے شہنشاہ جوزف ثانی، ترکی کے خلاف متحد ہو چکے تھے اور ان کی طرف سے اس امر کا اعلان ہو چکا تھا کہ وہ عثمانی سلطنت کے مغربی ممالک پر قبضہ کر کے قسطنطنیہ کے تخت پر کیتھرین کے پوتے قسطنطین کو بٹھائیں گے۔[۵]

---

[۱] تاریخ ٹیپو سلطان؛ محب الحسن، ص ۱۳۶۔

[۲] تاریخ پاک وہند؛ صاحبزادہ عبدالرسول، ص ۱۰۲۔

[۳] تاریخ ٹیپو سلطان؛ محب الحسن، ص ۱۴۲۔

[۴] ٹیپو سلطان انگریزوں کے خلاف جدوجہد مشمولہ بصائر، ڈاکٹر محمد حسین / نصیب اختر، ص ۸۷۔۸۸۔

[۵] اور تلوار ٹوٹ گئی؛ نسیم حجازی، ص ۲۲۴، ۲۲۵۔

ذرا آگے چل کر ناول نگار اس سفارت کا انجام ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''ترکی کا خلیفہ، ٹیپو کو سلطان کے لقب، چند تحائف اور نیک دعاؤں کے سوا کچھ نہ دے سکا۔''[۱]

اس واقعہ کو تقریباً ہو بہو محب الحسن نے اس طرح رقم کیا ہے:

''سفارتی مشن سلطان ترکی کی صرف سند شاہی حاصل کر سکا تھا، جس کی رو سے ٹیپو سلطان کو خود مختار بادشاہ کا لقب اختیار کرنے، اپنے سکے جاری کرنے اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوانے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ سفیروں کو سلطان اور اس کے وزیر اعظم نے ٹیپو کے لئے دوستانہ خطوط، خلعتیں اور ایک ڈھال بھی دی تھی، جو جواہرات سے مرصع تھی لیکن سفارت نہ تو تجارتی مراعات حاصل کر سکی اور نہ فوجی امداد۔

اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی کے وجود ہی کو کیتھرائن دوم، ملکہ روس اور جوزف دوم، شہنشاہ دوم، شہنشاہ آسٹریلیا کی وجہ سے شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا، جنہوں نے ۱۷۸۷ء میں عثمانی سلطنت کے یورپین صوبوں کو آپس میں تقسیم کرنے کا اور قسطنطنیہ کے تخت پر کیتھرائن کے پوتے کانسٹائن کو بٹھانے کے لیے ایک سمجھوتہ کیا تھا۔''[۲]

اس واقعہ سے مطابقت رکھتی ہوئی ایک اور روایت ڈاکٹر محمود حسین اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ٹیپو سلطان کے سفراء تقریباً تمام مقاصد میں ناکام رہے وہ ٹیپو سلطان کے فرمانروائے میسور اور ایک خود مختار بادشاہ ہونے کی سند حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے لیکن باقی مقاصد تشنۂ تکمیل رہے۔ اس موقع پر روس اور آسٹریلیا، ترکی کو جنگ کی دھمکیاں دے رہے تھے۔''[۳]

اس واقعہ کی صداقت کا اعتراف ڈاکٹر بی۔ شیخ علی اس طرح کرتے ہیں:

''سلطان عبدالحمید نے اس (ٹیپو) کو جواب میں تحریر کیا کہ'' آپ کا یہ دوست بھی انتہائی بہادری کے ساتھ اپنے اجداد کی روایات قائم رکھتے ہوئے جہاد کی راہ پر گامزن ہے، سیاہ رو روسی، جو دینی اوصاف کے راستے سے منحرف ہو گئے ہیں اور جنہوں نے مکاری کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے، وہ دن رات اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کو ذلیل کریں۔ ہماری فوجیں ان بدکردار کفار کی سرحدوں پر جمع ہو رہی ہیں۔''[۴]

ان واقعات کو اپنے خاص تناظر میں صاحبزادہ عبدالرسول نے اس طرح مرقوم کیا ہے:

''حکومتِ ترکیہ، روس کو اپنا دشمن اور برطانیہ کو اپنا دوست خیال کرتی تھی۔ چنانچہ ٹیپو سلطان کی سفارت کو کئی ماہ کے انتظار کے

---

[۱] اور تلوار ٹوٹ گئی: نسیم حجازی، ص ۲۲۵۔

[۲] تاریخ ٹیپو سلطان: محب الحسن، ص ۱۹۴۔

[۳] ٹیپو سلطان انگریزوں کے خلاف جدوجہد مشمولہ بصائر: ڈاکٹر محمود حسین، ص ۹۴۔

[۴] ٹیپو سلطان کی خارجہ پالیسی پر ایک طائرانہ نظر مشمولہ بصائر: ڈاکٹر بی۔ شیخ علی، ص ۱۷۸۔

بعد خلیفہ کی باریابی ہوئی مگر اس نے سلطان کی تجاویز کو مسترد کر دیا۔''[1]

ان آراء سے ناول نگار کے بیان کی حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے بالکل اسی طرح فرانس بھیجی جانے والی سفارت کا تذکرہ ناول نگار نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ٹیپو سلطان کے سفیروں کا شایانِ شان استقبال کیا گیا انہیں چھ گھوڑوں کی بگھی میں لے جایا گیا مگر فوجی معاہدے سے انکار کر دیا گیا۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر بی۔ شیخ علی رقمطراز ہیں کہ:

''فرانسیسیوں سے ٹیپو سلطان کے تعلقات دوستانہ تھے۔ انگریزوں کی دشمنی نے میسور اور فرانس کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیا تھا، ٹیپو کے سفراء کا شاہِ فرانس نے بہت گرم جوشی سے استقبال کیا، اس استقبال کے لئے خود بادشاہ نے اپنے قالین بھیجے تھے۔ ۱۳ اگست ۱۷۸۸ء کو ان سفراء کی شاہِ فرانس سے ملاقات ہوئی لیکن اس سفارت کی کوششوں کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔''[2]

اس واقعہ کا تذکرہ محب الحسن نے بہت تفصیل سے کیا ہے۔ ہم تحقیقی ضرورت کے پیش نظر اختصار سے واقعہ کی حقیقت ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

''پیرس پہنچنے پر بھی عزت و احترام کے ساتھ ان کو خوش آمدید کیا گیا۔ چھ گھوڑوں کی گاڑی میں انھیں لے جایا گیا، سوار ان کے آگے آگے تھے اور دور دراز اجنبی ملک سے آنے والے مہمانوں کے استقبال کے لئے کثیر تعداد میں لوگ سڑکوں پر جمع ہو گئے۔''[3]

آگے چل کر محب الحسن لکھتے ہیں:

''فرانس اس وقت ثقافتی و معاشی بحران کی گرفت میں تھا جس کے نتیجے میں زبردست سیاسی انقلاب ظہور میں آیا، اس لیے وہ کوئی نئی ذمے داری لینا نہیں چاہتا تھا چنانچہ سفیروں کو مطلع کر دیا گیا کہ ورسائی کے عہد نامے کے پیش نظر لوئی شانزدہم کے لیے ٹیپو کے ساتھ کوئی معاہدہ اتحاد کرنا ممکن نہیں ہے۔''[4]

اس واقعہ کا تذکرہ صاحبزادہ عبدالرسول نے ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:

''ٹیپو سلطان نے لوئی شانزدہم شاہ فرانس کے دربار میں ایک سفارت بھیجی اور حکومت فرانس سے ایک باقاعدہ معاہدہ کرنا چاہا۔ مگر فرانس کا شاہی خاندان اس وقت خود تنزل کی آخری حد کو پہنچ چکا تھا اور ملک پر انقلاب کے سائے پڑ رہے تھے ان حالات میں شاہِ فرانس سے امداد کی توقع عبث تھی۔''[5]

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ ٹیپو سلطان متوقع حالات سے مقابلے کے لیے جو سفارتی کوششیں کر رہے تھے ناکام

---

[1] تاریخ پاک و ہند، صاحبزادہ عبدالرسول، ص ۱۰۵۔

[2] ٹیپو سلطان کی خارجہ پالیسی پر ایک طائرانہ نظر مشمولہ بصائر، ڈاکٹر بی۔ شیخ علی ص ۱۷۸۔

[3] تاریخ ٹیپو سلطان، محب الحسن، ص ۱۲۶۔

[4] تاریخ ٹیپو سلطان، محب الحسن، ص ۱۲۹۔

[5] تاریخ پاک و ہند، صاحبزادہ عبدالرسول، ص ۱۰۶۔

ہوئیں یہاں یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ ناول نگار کی رائے اور دیگر مورخین کی رائے میں اتفاق موجود ہے۔

ناول کے صفحہ نمبر ۲۳۴ پر کرنل اسٹورٹ کے ڈنڈیگل کے قلعے پر حملے کا حال موجود ہے جس میں قلعے کا کمانڈر حیدر عباس اپنے آٹھ سو سپاہیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ توپوں کی کئی دن کی گولہ باری کے بعد عام حملے میں انگریزوں کی ناکامی کے باوجود اپنے ساتھیوں کی وجہ سے ۲۲ اگست کو قلعہ خالی کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اس واقعہ کا تفصیلی حال محب الحسن نے یوں بیان کیا ہے؛

''۵ اگست کو ایک مضبوط فوج کے ساتھ کرنل اسٹورٹ کو ڈنڈیگل کو زیر کرنے کے لیے بھیجا گیا جو ۱۲ میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ وہاں ۱۶ اگست کو پہنچ گیا۔ ڈنڈیگل کا قلعہ ایک پہاڑی کی ہموار سطح پر بنایا گیا تھا اس کی شکل تین اطراف سے عمودی تھی اور صرف مشرق کی جانب سیڑھیوں کا ایک سلسلہ تھا جس کے ذریعے اس کے اندر پہنچا جا سکتا تھا۔ پچھلے چھ برس کے اندر اس میں کافی ترقی پذیر تبدیلیاں ہوئی تھیں اور اس میں کافی مقدار میں گولہ بارود اور سامانِ رسد موجود تھا۔ قلعے کی حفاظتی فوج کو جو تقریباً آٹھ سو آدمیوں پر مشتمل تھی ایک اعلان کے ذریعے آگاہ کیا گیا کہ اگر وہ اطاعت قبول کر لیں تو انہیں اپنے ذاتی سامان کے ساتھ میسور کے کسی بھی حصے میں جانے کی اجازت ہوگی لیکن اگر انھوں نے مقابلہ کیا تو ان سب کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ کمان دار حیدر عباس نے یہ پیغام لانے والے کو جواب دیا ''اپنے کمانڈر سے کہو کہ میں اپنے سلطان کو اس بات کا کیا جواب دوں گا کہ ڈنڈیگل جیسے مستحکم قلعہ میں نے کیوں دشمن کے حوالے کر دیا؟ اس لیے دوسری بار کوئی آدمی اس قسم کا پیام لے کر آیا تو اسے توپ سے اڑا دیا جائے گا'' یہ جواب پا کر اسٹورٹ نے گولہ باری شروع کر دی اور دو دن تک گولے برسانے کے بعد وہ ایک چھوٹا سا رخنہ ہی ڈال سکا لیکن گولہ بارود چونکہ قریب قریب ختم ہو چکا تھا اور ایک ہفتہ سے پہلے رسد پہنچنے کی امید نہیں تھی اس نے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا اور میجر اسکیلے کو حکم دیا کہ وہ اس حملے کی قیادت کرے۔ برطانوی فوجوں نے بڑی بہادری اور مستقل مزاجی کے ساتھ حملہ کیا اور ۲۱ اگست کی شام قلعے میں گھسنے کی بار بار کوشش کی لیکن استحکامات بہت مضبوط تھے اور کمان دار نے اپنی بہترین فوج کے ساتھ رخنے پر پوری قوت سے مقابلہ کر کے دشمن کو پسپا کر دیا لیکن دوسرے دن انگریزوں کو یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ رخنے پر ایک سفید جھنڈا لہرا رہا ہے ہوا یہ کہ حفاظتی فوج کو دشمن کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں تھا اور انہیں یہ ڈر تھا کہیں دوسرا حملہ نہ کر دیا جائے چنانچہ انہوں نے رات میں کمان دار کے خلاف بغاوت کر دی۔ اسی وجہ سے حیدر عباس کو اطاعت قبول کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اس نے ۲۲ اگست کو قلعہ باعزت شرائط پر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔''[۱]

یہاں یہ امر حیران کن حد تک دلچسپ ہے کہ ناول نگار کا بیان اور محب الحسن کا بیان بالکل یکساں ہے۔ قلعے میں موجود فوج کی تعداد قلعے کے کمانڈر کا نام، صلح کی شرائط وغیرہ تمام ہی درست ہیں۔

ناول نگار نے سرنگاپٹم پر ۱۷۹۲ء میں اتحادی افواج کی یلغار کا حال ان الفاظ میں رقم کیا ہے:

''۵ فروری کے دن اتحادی افواج سرنگاپٹم کے شمال میں تقریباً چار میل کے فاصلے پر فرنچ راکس کے پیچھے پڑاؤ ڈال چکی تھیں۔ لارڈ کارنوالس کی فوج بائیس ہزار آزمودہ کار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ حیدرآباد کے اٹھارہ ہزار سواروں کے علاوہ کمپنی کی دو بٹالین شہزادہ

۱۔ تاریخ ٹیپو سلطان، محب الحسن، ص ۱۷۲، ۱۷۳۔

سکندر جاہ کی کمان میں تھیں اور ہری پنت کے لشکر کے علاوہ بارہ ہزار مرہٹہ سوار سرنگا پٹم کے معرکے میں حصہ لینے کے لیے جمع ہو چکے تھے۔[۱]

جب ان افواج نے حملہ کیا تو اس کا حال اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''۶ فروری کو غروبِ آفتاب کے دو گھنٹے بعد انگریزی فوج کے پیادہ دستے تین حصوں میں تقسیم ہو کر جزیرے کا رخ کر رہے تھے دریا سے کچھ دور وہ چلنے کے بجائے زمین پر رینگتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ سردی کے موسم میں دریا پایاب تھا اور حملہ آوروں کے تین ڈویژن آدھی رات کے قریب شمال مشرقی کنارے کے بعض مقامات پر پاؤں جما کر بانس کے گھنے درختوں سے اپنا راستہ صاف کر رہے تھے۔ سرنگا پٹم کے محافظوں کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا اور رات کے وقت بیرونی نشستوں سے ان کی گولہ باری زیادہ مؤثر نہ تھی۔ سلطان کی سوار فوج کے میدان میں آنے سے قبل حملہ آور چند پشتوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ جنرل میڈوز ایک ڈویژن کے ساتھ عید گاہ کے پشتے کے قریب جا نکلا جہاں سید حمید کے دستے متعین تھے۔ سید حمید اور اس کے چار سو ساتھی لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور جنرل میڈوز نے پشتے پر قبضہ کر لیا۔ اس عرصے میں انگریزی فوج کا دوسرا ڈویژن دولت باغ کے قریب شدت کی گولہ باری کا سامنا کرنے کے بعد پسپائی اختیار کر رہا تھا۔ تیسرا ڈویژن ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد مشرقی کنارے کی چند توپوں پر قابض ہو چکا تھا۔ رات کے تیسرے پہر جزیرے کے بیرونی مورچوں اور پشتوں کے محافظ ایک غیر منظم صورت میں جگہ جگہ حملہ آوروں کا مقابلہ کر رہے تھے اور اس صورت حالات سے فائدہ اٹھا کر کارنوالس کی فوج کے کئی اور دستے دریا عبور کر کے دولت باغ اور شہر گنجام کے مشرق میں کئی اہم مورچوں پر قابض ہو گئے۔ طلوعِ سحر کے قریب سلطان کے پیادہ اور سوار سپاہیوں نے ایک خونریز لڑائی کے بعد چند مورچوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔''[۲]

اس واقعہ کا تذکرہ محب الحسن نے ان الفاظ میں رقم کیا ہے:

''انگریزوں کا رات کا حملہ مجموعی طور پر کامیاب رہا۔ جزیرے کے مشرقی حصے میں انہوں نے اپنا تسلط جما لیا تھا۔ دریا کے شمال میں عید گاہ پر کاری گھاٹا کی پہاڑی پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ مرکزی ڈویژن نے کارنوالس کے تحت اور کیساری ڈویژن نے میکسول کے تحت ان فرائض کو خوبی کے ساتھ انجام دیا تھا جو انہیں سونپے گئے تھے۔''[۳]

جوابی اختتامی حملے کا حال محب الحسن نے اس طرح بیان کیا ہے:

''کم وبیش ایک گھنٹے کے بعد سلطان نے انگریزوں کو جزیرے سے بے دخل کرنے کی کوشش پھر شروع کی۔ پیدل فوج کی دو صفیں ''پیٹھ'' میں داخل ہو گئیں اور بیرونی چوکیوں میں گھس بیٹھ کر بڑے اعتماد کے ساتھ اسٹورٹ کے اصلی مورچے پر حملہ کرنے کے

---

[۱] اور تلوار ٹوٹ گئی، نسیم حجازی، ص ۳۴۰۔

[۲] ایضاً، ص ۳۴۰، ۳۴۱۔

[۳] تاریخ ٹیپو سلطان، محب الحسن، ص ۲۲۷۔

لیے بڑھیں لیکن انہیں پسپا کر دیا گیا اور انہیں واپس ہونا پڑا۔

ان لڑائیوں میں میسوری بڑی دلیری سے لڑے اور کئی بار انگریزوں کو پسپا ہونا پڑا لیکن سلطان والے گڑ گج سے اور جزیرے سے انہیں بے دخل کرنے میں وہ ناکام رہے۔''[۱]

اس واقعہ کا تذکرہ محمود حسین نے ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:

''۵ فروری ۱۷۹۲ء کو ٹیپو سلطان کے دارالحکومت پر چاروں طرف سے فوجیں بڑھیں۔ انگریزی فوج ۲۲،۰۰۰ سپاہ پر مشتمل تھی اور اس کے ساتھ ۴۴ میدانی توپیں اور ۴۲ بھاری توپیں تھیں۔ نظام کی ۱۸،۰۰۰ فوج شہزادہ سکندر جاہ کی سرکردگی میں موجود تھی اور ہری پنت ۱۲،۰۰۰ مرہٹہ سوار لیے موجود تھا۔''[۲]

مزید بیان کرتے ہیں:

''۶ فروری کی شب میں کارنوالس نے اپنی سپاہ کو میسور کے استحکامات پر فیصلہ کن ضرب لگانے کا حکم دیا۔ حملہ کامیاب رہا ٹیپو سلطان کو پرشرام اور جنرل ایبر کرومی کی آمد تک حملہ کی توقع نہیں تھی۔ اس لیے وہ اس دوران دوسرے دفاعی انتظامات مکمل کرنے میں مشغول رہا۔ آخر کار انگریزوں کے استقلال اور نقل و حمل کی تیزی نے ٹیپو کو حیرت میں ڈال دیا۔''[۳]

صاحبزادہ عبدالرسول اس جنگ کا حال یوں مرقوم کرتے ہیں:

''فروری ۱۷۹۲ء میں اتحادی افواج دوبارہ سرنگاپٹم کی طرف روانہ ہوئیں۔ قلعے داروں کی غداری کی وجہ سے راستے میں ان کی کوئی مزاحمت نہ ہوئی اور سلطان کے پایۂ تخت کا محاصرہ کر لیا گیا۔''[۴]

سرنگاپٹم پر اتحادی افواج کے حملے کا ذکر ایم۔ اے۔ عزیز اس طرح کرتے ہیں:

"Lord Cornwalis (1) himself loot the command, but the Sultan succeeded in holding his position. The combined forces numbering 52,000 besieged Seringpatam and made a night attack . The fighting continued, but a definite victory was not in sight [۵]

ان آراء کے بعد ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ناول نگار نے مختلف تاریخی حوالوں کو سامنے رکھ کر اپنے مندرجہ بالا بیانات مرتب کیے ہوں گے کیونکہ انگریزی فوج کا سالار لارڈ کارنوالس، نظام کی فوج کا سالار سکندر جاہ جبکہ ہری پنت کا لشکر بھی اس جنگ میں موجود تھا۔ فوج کی تعداد، جنگی حکمت عملی کے بارے میں ناول نگار کے بیان کی صداقت کسی نہ کسی مورخ سے ثابت ہے اس لیے ہم یہ

۱۔ تاریخ ٹیپو سلطان، محب الحسن، ص ۳۳۹۔

۲۔ ٹیپو سلطان انگریزوں کے خلاف جدوجہد مشمولہ بصائر، ڈاکٹر محمود حسین، ص ۹۸، ۹۹۔

۳۔ ایضاً، ص ۹۹۔

۴۔ تاریخ پاک و ہند، صاحبزادہ عبدالرسول، ص ۱۰۹۔

۵۔ A history of Pakistan; Dr. M.A. Aziz, Pg.93,94

رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ناول نگار نے تاریخی حقائق کو مسخ کیے بغیر اپنے حصے کا کام کیا ہے۔

اس جنگ کے خاتمے کی خاطر اتحادی افواج کی شرائط انتہائی سخت تھیں ناول نگار کے بیان کے مطابق تین کروڑ ساٹھ لاکھ فی الفور اور بقیہ ایک سال میں چار اقساط میں ادا کرنا تھا اس کے علاوہ نصف سلطنت اور اپنے دو بیٹے شہزادہ عبدالخالق (آٹھ سال) اور معز الدین (پانچ سال) کو بطور یرغمال بھیجنا شامل تھا جس پر عمل درآمد ۲۲ فروری کو ہوا۔

ان شرائط کا تذکرہ مختلف مورخین نے اپنے اپنے الفاظ میں مرقوم کیا ہے تین شرائط پر تقریباً تمام مورخین متفق ہیں۔ نصف مملکت اتحادی افواج کے حوالے کرنا، تین کروڑ تیس لاکھ روپے میں سے ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ فوری طور پر اور بقیہ تین اقساط میں ادا کرنا بطور زرِ ضمانت اپنے دو بیٹوں کو اتحادیوں کے حوالے کرنا۔ جن مورخین نے ان آراء پر اتفاق کیا ہے ان میں محب الحسن، ڈاکٹر محمود حسین، شکیل احمد ضیاء، صاحبزادہ عبدالرسول، ڈاکٹر ایم۔ اے۔ عزیز، محمد رضا خان اور انوار ہاشمی شامل ہیں جبکہ باری نے رقم تین کروڑ تیس ہزار لکھی ہے کسی نے بھی شہزادوں کا نام نہیں لکھا۔ جنگ کے خاتمے کے لیے ۲۵ فروری اور معاہدے کی تکمیل ۲۶ فروری ۱۷۹۲ء ظاہر کی ہے یہاں یہ امر توجہ طلب ہے کہ زیادہ تر مورخین تین کروڑ تیس لاکھ روپے تاوان پر متفق ہیں جبکہ باری نے تین کروڑ تیس ہزار لکھ کر اختلاف پیدا کیا ہے لیکن ان سب سے منفرد بیان ناول نگار کا ہے جس نے رقم تین کروڑ ساٹھ لاکھ روپے لکھی ہے ممکن ہے لکھتے ہوئے انہوں نے تاریخ کو سامنے نہ رکھا ہو بظاہر تیس لاکھ روپے کا فرق ہے لیکن اس زمانے کے اعتبار سے یہ ایک بڑی رقم ہے چونکہ ناول نگار کے دیگر بیانات مورخین کی رائے کے عین مطابق ہیں اس لیے اسے عددی کمزوری قرار دے کر معاف کیا جا سکتا ہے۔

میسور کی تیسری جنگ کے واقعات کا تحقیقی جائزہ لیں تو ہمارے سامنے بہت سے عوامل ناول نگار اور مورخین کے نزدیک یکساں نظر آتے ہیں۔ مثلاً ۱۷۹۹ء سے قبل ٹیپو سلطان نے افغانستان کے زمان شاہ، ترکی کے خلیفہ اور فرانس کے نپولین سے مدد چاہی۔ ساتھ ہی نظام حیدرآباد اور مرہٹوں کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ ان تمام امور کا تذکرہ ناول نگار اور مورخین کے نزدیک متفقہ طور پر موجود ہے۔ اس کے بعد جنگ کی ابتدا کے مناظر کہ جب ٹیپو سلطان انگریزوں کی افواج کو یکجا ہونے سے باز رکھنا چاہتا تھا مگر اس کے امراء گھر کے بھیدی کا کردار ادا کر رہے تھے ہر ہر لمحہ کی خبر انگریزوں تک پہنچتی تھی یوں اسے سرنگا پٹم واپس لوٹنا پڑا اور پھر نوبت سرنگا پٹم کے قلعے تک محصور ہونے پر آ گئی لیکن یہاں بھی انگریزوں کو ان غداروں کی رہنمائی حاصل تھی جو مختلف چوکیوں کا راستہ دکھا رہے تھے۔ ٹیپو سلطان کی خواہش موسم برسات شروع ہو جانے تک جنگ ٹالنے کی تھی تا کہ دریائے کاویری قدرتی حصار کا کام دے۔ فی الوقت دریائے کاویری پایاب تھا بقول ناول نگار:

''۳ مئی کے دن فصیل میں چند شگاف پیدا ہو چکے تھے اور شہر میں جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی۔ سلطان آدھی رات تک مختلف مورچوں میں گشت کرتا رہا۔ تیسرے پہر اس نے محل میں جانے کے بجائے شمالی دیوار کے ساتھ ہی ایک خیمے میں کچھ دیر آرام کیا۔ صبح کے وقت وہ نماز سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو خیمے کے دروازے کے سامنے فوج کے چند افسر اور چند ہندو سادھو اور جوتشی کھڑے تھے، ایک

افسر نے آگے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے کہا ''عالی جاہ! رات کے وقت دشمن کی مسلسل گولہ باری کے باعث شہر پناہ کے جنوب مغربی کونے میں ایک وسیع شگاف پڑ چکا ہے۔''

سلطان نے کسی توقف کے بغیر اپنا گھوڑا لانے کا حکم دیا۔ لیکن سرنگا پٹم کے مشہور جوتشی نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

''ان داتا آج کا دن آپ کے لیے بہت منحوس ہے۔ اس لیے آپ کو اپنے محل میں جا کر قیام کرنا چاہیے۔''[1]

اس واقعہ کو محب الحسن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''۴ تاریخ صبح کو اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ٹیپو نے دیوار کے شگاف کا معائنہ کیا اور اس کی مرمت کا سفر مینا کو حکم دیا۔ اس کے بعد محل میں جا کر اس نے غسل کیا۔ صبح کو ہندو اور مسلمان نجومیوں نے اسے متنبہ کیا کہ آج کا دن اس کے لیے نحس ہے۔ اس لیے وہ شام تک چھاؤنی ہی میں رہے۔''

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ناول نگار نے ہر واقعہ کو شامل کرنے سے قبل تاریخی اعتبار سے درست سمجھ لیا تھا۔ اس کے بعد ناول نگار بظاہر فرانسیسی فوجی موسیو چپوے کی اس تجویز کا تذکرہ کرتا ہے کہ ٹیپو سلطان کو سرایا چتل ڈرگ میں اپنا مستقر بنا لینا چاہیے۔ وہ اور اس کے ساتھی بقیہ فوج کے ساتھ یہاں جنگ جاری رکھیں گے لیکن میر صادق، بدرالزماں ہم زبان ہو کر ٹیپو سلطان کو یہیں رہ کر جنگ کا مشورہ دیتے ہیں کیونکہ یہ لوگ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے اس لیے ان کی خواہش تھی کہ ٹیپو سلطان یہیں رہے اس واقعہ کا تذکرہ تقریباً ہر مورخ نے نقل کیا ہے۔

ناول نگار نے اس جنگ کا آخری نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''سلطان اپنے باڈی گارڈ دستوں کے ساتھ نمودار ہوا اور اسے دیکھتے ہی شمال کی اندرونی اور بیرونی فصیلوں کے درمیان لڑنے والے مجاہدین میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی اور وہ دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ سلطان اپنے گھوڑے سے کود کر ان کی اگلی صف میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر مختلف اطراف سے میسور کے کئی دستے اس کے گرد جمع ہو کر جان کی بازی لگا رہے تھے لیکن اس دوران انگریز دونوں فصیلوں کے درمیان کئی مورچوں پر قابض ہو چکے تھے اور بلندی سے ان کی گولیاں سلطان کے جانبازوں کے لیے سخت مشکلات پیدا کر رہی تھیں۔ وہ افسر جو وطن کے غداروں کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر چکے تھے اس محاذ سے غیر حاضر تھے لیکن یہ مسئلہ اب میسور کے جانبازوں کے لئے کسی پریشانی کا باعث نہ تھا۔ ان کی عزت اور آزادی کا محافظ ان کے ساتھ تھا وہ یہ بھول چکے تھے کہ دشمن چند منٹ کے اندر ہفتوں اور مہینوں کا سفر طے کر کے سرنگا پٹم میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ یہ بھول چکے تھے کہ ان پر گولیوں کی بارش ہو رہی ہے وہ عظیم رہنما جس نے ان کے سینوں میں زندگی کے ولولے بیدار کیے تھے اب موت کے دروازے پر دستک دے رہا تھا لیکن اب موت کا چہرہ انہیں زندگی سے زیادہ حسین اور دلکش دکھائی دیتا تھا۔ سلطان ٹیپو زخمی ہو چکا تھا اور وہ اپنے سینوں کے زخموں سے بھی ایک طرح کی

---

[1] اور تلوار ٹوٹ گئی، نسیم حجازی، ص ۴۸۷۔

آسودگی محسوس کرتے تھے سلطان کا خون سرنگا پٹم کی خاک پر گر رہا تھا اور وہ اس خاک کے ہر ذرے کو اپنے خون سے سیراب کر دینا چاہتے تھے۔

دوسری گولی لگنے کے بعد شیر میسور پر نقاہت کے آثار ظاہر ہونے لگے لیکن وہ لڑتا رہا۔ میسور کے جانباز زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اندرونی خندق کے آس پاس دشمن کی لاشوں کے ڈھیر لگے تھے۔ سینکڑوں انگریز زخمی ہونے کے بعد خندق میں گر کر دم توڑ رہے تھے۔ فصیلوں کے اوپر سے دشمن کی دوطرفہ فائرنگ ہر لحظہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ میسور کے شہیدوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔ جب زخموں کے باعث سلطان کی ہمت جواب دینے لگی تو باڈی گارڈ دستے کے افسر نے کہا ''عالی جاہ! اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیں۔''

''نہیں'' سلطان نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا ''میرے لیے شیر کی زندگی کا ایک لمحہ گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

تھوڑی دیر بعد سلطان اپنے افسروں کے ساتھ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور میسور کے سپاہی اس کے پیچھے قلعے کے اندرونی حصے کی طرف سمٹنے لگے لیکن جب وہ شمالی دروازے کے قریب پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ وہاں بھی بعض مورچوں پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے۔ مسلح سپاہیوں کے علاوہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کا ایک بے پناہ ہجوم باہر نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا اور انگریز اپنی سنگینوں کی مدد سے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر رہے تھے۔ انہوں نے میسور کے سپاہیوں کو دروازے کی طرف آتے دیکھا تو پلٹ کر فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی قلعے کی فصیل کے بعض مورچوں سے بھی گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ ایک گولی سلطان کے گھوڑے کے پیٹ میں لگی اور اس نے گرتے ہی دم توڑ دیا۔ گھوڑے کے ساتھ گرتے وقت سلطان کی دستار اس کے سر سے علیحدہ ہو گئی۔ سلطان لڑکھڑاتا ہوا اٹھا لیکن ابھی وہ سنبھلنے نہ پایا تھا کہ اس کے سینے پر ایک گولی لگی اور وہ نیم جان ہو کر گر پڑا۔ پاس ہی ایک انگریز نے سلطان کی کمر سے تلوار کی مرصع پیٹی اتارنے کی کوشش کی لیکن شیر میسور میں ابھی زندگی کے آثار باقی تھے اور وہ یہ توہین برداشت نہ کر سکا۔ سلطان نے اچانک اٹھ کر تلوار بلند کی اور پوری قوت کے ساتھ اس پر وار کر دیا۔ انگریز نے اپنی بندوق آگے کر دی۔ سلطان کی تلوار بندوق پر لگی اور ٹوٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور انگریز سپاہی نے اپنی بندوق کی نالی کا سرا سلطان کی کنپٹی کے ساتھ لگاتے ہوئے فائر کر دیا اور وہ آفتاب جس کی روشنی میں اہلِ میسور نے آزادی کی حسین منازل دیکھی تھیں، ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔''[۱]

اس کیفیت کو محب الحسن نے یوں پیش کیا ہے:

''سلطان کی موجودگی نے اس کے سپاہیوں کی ہمت بڑھا دی۔ انھوں نے جم کر مدافعت کی اور دشمن کے لیباری کالم کو پیچھے ہٹنا پڑا لیکن اندرونی اور بیرونی دمدموں سے انگریزی فوج نے جب میسوریوں پر گولہ باری شروع کی تو اس کی تاب نہ لا کر وہ بھاگے

---

[۱] اور تلوار ٹوٹ گئی، نسیم حجازی، ص ۴۹۸۔

انہیں مجتمع کرنے کی ٹیپو کی کوشش ناکام رہی۔

اس جنگ کے دوران میں ٹیپو پیادہ پا رہا سپاہیوں نے جب ہمت بالکل ہار دی تو گھوڑے پر سوار ہو کر وہ دریا کے بند کے دریچے پر پہنچا۔ ولکس کا بیان ہے کہ ٹیپو اگر چاہتا تو آسانی سے فرار ہو سکتا تھا کیونکہ آبی پھاٹک قریب ہی تھا۔ دوسری طرف بٹیس کا یہ کہنا ہے کہ پھاٹک پر اتنی بھیڑ تھی کہ نکل کر شہر کی طرف جانے کا اسے راستہ ہی نہ ملا لیکن حقیقت یہ ہے کہ پھاٹک ارادی طور پر بند کر دیا گیا تھا تا کہ سلطان فرار نہ ہو سکے۔ قلعدار میر نادم پھاٹک کی چھت پر کھڑا تھا لیکن اس نے اپنے آقا کو نظر انداز کیا۔ پھر ٹیپو اس پھاٹک پر پہنچا جہاں سے قلعے کے اندرونی حصے کو راستہ جاتا تھا وہ پہلے ہی مجروح ہو چکا تھا اور پھاٹک پر پہنچنے سے قبل دوبارہ مجروح ہوا، مگر وہ بڑھتا ہی رہا۔ انگریزی فوج اندرونی اور بیرونی دمدموں سے میسوریوں پر تباہ کن گولہ باری کر رہی تھی جو بھاگنے کے لیے دروازے پر دونوں طرف سے ہجوم کر رہے تھے۔ پھاٹک سے گزرنے کی کوشش میں ٹیپو تیسری بار مجروح ہوا۔ اس مرتبہ اس کے سینے پر بائیں جانب زخم آیا تھا۔ اس کے گھوڑے نے بھی زخمی ہو کر اس کی رانوں کے نیچے دم توڑ دیا۔ خادموں نے اسے پالکی میں باہر لے جانے کی کوشش کی، لیکن راستہ مقتولین اور دم توڑتے ہوئے مجروحین سے اتنا اٹا تھا کہ یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ اس موقع پر اس کے خادم خاص راجا خان نے مشورہ دیا کہ دشمن پر وہ اپنی شخصیت ظاہر کر دے لیکن اس مشورے کو اس نے مسترد کر دیا۔ انگریزوں کا قیدی بننے سے مرنا بہتر سمجھتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد چند انگریز سپاہی پھاٹک میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے ٹیپو کی تلوار کی بیش قیمت پیٹی جھپٹ لی۔ اس وقت خون بہہ جانے کی وجہ سے اگرچہ وہ نڈھال ہو رہا تھا، تاہم اس ذلت کو برداشت نہ کر سکا۔ ایک تلوار جو قریب ہی پڑی تھی، ٹیپو نے اٹھا کر سپاہی پر وار کیا جو اس کی دستی بندوق پر پڑا۔ ایک وار اس نے ایک دوسرے سپاہی پر کیا جو کاری ثابت ہوا۔ اسی اثنا میں ایک گولی اس کی کنپٹی میں لگی اور اس کا کام تمام ہو گیا۔"[۱]

اس روایت کی روشنی میں ناول نگار کا ہر ہر بیان درست اور حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کے بعد ناول نگار نے جس واقعہ کو خاص اہمیت دی ہے وہ ٹیپو کی لاش کی تلاش کا ہے۔ اس کی لاش شمالی دروازے کے سامنے لاشوں کے انبار سے برآمد ہوئی اس کے ساتھ کچھ خواتین کی لاشیں بھی تھیں جن میں ایک ہندو لڑکی کی لاش اور شاہی خاندان کی خواتین کی لاشیں موجود تھیں۔ ٹیپو سلطان کے چہرے پر رعب وجلال موجود تھا۔ تلوار کے دستے پر اس کے ہاتھ کی گرفت اب تک سخت تھی آنکھیں کھلی تھیں اس کے جسم پر چار زخم آئے تھے اس واقعہ کا تذکرہ تقریباً تمام ہی مورخین نے بعض انگریزی روایات کے ساتھ ہی کیا ہے۔ ایک روایت بشیر الدین پنڈت کی نقل کرتے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں:

"عورتوں کی ان لاشوں میں ایک خوب صورت برہمن لڑکی کی بھی لاش ملی۔ مقامی روایت جس کی تائید انگریزی مورخین بھی کرتے ہیں یہ ہے کہ حرم سلطانی کی پردہ نشینان عفاف بھی اس آخری وقت میں آبروئے وطن وملت کی خاطر جان دینے کے لیے

---

[۱] تاریخ ٹیپو سلطان: محب الحسن، ص ۳۳۲۔

میدان جنگ میں آ گئی تھیں۔ چنانچہ ٹیپو سلطان کی لاش کے نزدیک کئی ایک لاشیں عورتوں کی تھیں جن کے قیمتی کپڑوں سے معلوم ہوتا تھا کہ حرمِ سلطانی سے تعلق رکھتی ہیں'' (سرنگا پٹم از کانسٹنس پارسنس؛ ص ۸۶) میجر لسن جس نے اس جنگ میں حصہ لیا تھا لکھتا ہے کہ سلطان کی شہادت سے پہلے سلطانی کا محاصرہ کر لیا گیا تھا۔ وہیں جنرل بیرڈ کو سپہ دار سے پتا چلا کہ ٹیپو سلطان قلعے کی اندرونی فصیل کے بڑے دروازے کے پاس زخمی پڑا ہوا ہے۔ ''ہم دروازے پر پہنچے۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی بے شمار لاشیں پڑی تھیں تمیز کرنا مشکل تھا۔ آخر کار مشعلیں منگوائی گئیں۔ اسی تلاش میں ہم کو یہاں راجا خان (سلطان کا ملازم) ملا جو مجروح تھا۔ دریافت پر اس نے وہ جگہ بتائی جہاں سلطان گھوڑے پر سے گرا تھا یہاں تلاش کرنے پر سلطان کی لاش مل گئی۔ جس وقت سلطان کی لاش ملی سلطان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ جسم اس قدر گرم تھا کہ مجھے اور کرنل ولزلی کو دھوکہ ہو گیا کہ سلطان ابھی زندہ ہے۔ نبض دیکھی گئی تو ساکت تھی۔ سلطان کو گولی کے چار زخم آئے تھے۔ تین جسم پر اور ایک سیدھے کان میں۔''[1]

ان حقائق کے بعد ہم ناول نگار کے بیان کردہ تدفین کے اس منظر کا حال بیان کرتے ہیں کہ جب ٹیپو سلطان کا جنازہ لال باغ کی طرف روانہ ہوا۔ انتہائی حبس کی کیفیت تھی بادل گھر کر آ رہے تھے ساتھ ہی بادل گرجنے اور بجلی چمکنے سے انتہائی خوف و ہراس کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی توپوں اور بندوقوں سے داغے جانے گولے بے آواز ہو چکے تھے۔ ہندو، مسلمان سبھی اس حریت پسند کے جنازے میں عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے سرِ تسلیم خم کیے تھے۔ تدفین کے بعد بادل گرجنے لگے بارش برسی اور دریائے کاویری میں طغیانی آ گئی اس دن کا ٹیپو کو انتظار تھا مگر افسوس وہ اس دن کو دیکھنے سے قبل ہی عدم کی منزل اختیار کر چکا تھا اس منظر کو قاری بشیر الدین نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''جنازہ کے ہمراہ سلطان کے اعیان و امراء اور پیچھے سلطان کا دوسرا شہزادہ برہنہ سر گھوڑے پر سوار تھا۔ جنازہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ راستے میں ہزار ہا لوگ انتہائے غم سے نالاں و گریاں تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ سینکڑوں آدمی (فرطِ غم سے) جنازے کے آگے آ کر لیٹ جاتے تھے۔ بلا تفریق مذہب ہندو اور مسلمان عورتیں سر پر مٹی ڈال کر ماتم کرتی تھیں۔ (کارنامہ حیدری ص ۹۲۶) آسمان پر سیاہ ڈراؤنے بادل چھائے ہوئے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک قسم کی گہری اور مہیب آواز آتی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ آسمان پر کچھ ہو رہا ہے۔ فضا کے بھیانک پن سے دلوں پر ایک رعب چھایا ہوا تھا خوف کی وجہ سے سر کو اوپر اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی اسی حالت میں جنازہ لال باغ تک پہنچا۔ قلعے سے ماتمی توپیں چھوٹ رہی تھیں مگر ان کی آواز لوگوں کی گریہ و زاری میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ تمام آسمان پر بجلیاں ایک گوشے سے نکل کر دوسرے گوشے کی طرف پیہم جا رہی تھیں۔ جنازہ عین مقبرہ کے روبرو پہنچا۔ بینڈ کا بجنا تھم گیا۔ خطیب اور دوسرے لوگ صفیں باندھ کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ خطیب کی آواز نہایت زوردار تھی جیسے ہی اس کی زبان سے تکبیر کہنے کے لیے لفظ اللہ نکلا ایسا معلوم ہوا کہ آسمان ٹوٹ کر زمین پر گر رہا ہے۔ ایک ہیبت

---

[1] اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے مشمولہ بصائر قاری بشیر الدین جنت، ص ۲۳۳۔

ناک کڑا کے کے ساتھ بجلی چمکی اور ایک زوردار روشنی سے سب کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ زبردست گرج نے لوگوں کے دلوں کو دہلا دیا اور یہ معلوم نہیں ہوا کہ خطیب کی زبان سے اللہ کے بعد کوئی لفظ نکلا بھی یا نہیں۔ نماز ختم ہوئی لاش کو اس کی آخری آرام گاہ میں رکھا گیا۔ جوں ہی لاش رکھ کر اسلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا گیا پھر ایک بجلی چمکی۔ زوردار کڑک ہوئی اور لوگوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کے بعد بجلی اور گرج کا ایک مہیب سلسلہ شروع ہو گیا اس وقت تک بارش کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں اترا۔ بجلی کی چمک سے زمین اور آسمان ایک ہو رہے تھے اور لوگوں کی نظریں خوف و ہراس سے اِدھر اُدھر نہ ہٹتی تھیں اس وقت ظاہر ہو رہا تھا کہ قدرت کے آگے انسانی طاقت کتنی حقیر ہے۔ درحقیقت آفرینندہ خلق کی آواز اس وقت سنائی دے رہی تھی۔

فوج کو حکم دیا گیا کہ آخری سلامی اتارے۔ اِدھر بندوقیں چھوٹیں اور اُدھر آسمان سے ہزار ہا توپیں چھوٹنی شروع ہو گئیں جن کی آواز میں بندوقوں کی آواز بالکل دب کر رہ گئی اور یہ معلوم نہیں ہوا کہ خیر کے بعد جو بینڈ بجایا گیا وہ کس قسم کا تھا۔ گویا بینڈ کی آواز حقیقت میں آسمانی آوازوں کا منہ چڑا رہی تھی۔'' میجر بٹسن جو تجہیز و تکفین کے موقع پر موجود تھا لکھتا ہے کہ اس سانحہ کو دوبالا کرنے کے لیے نہایت ہی سخت اور مہیب طوفان آیا۔ بارش، گرج اور بجلی غضب ڈھا رہی تھی۔ انگریزی کیمپ میں بجلی گری۔ جس سے دو افسر اور چند سپاہی ہلاک اور بہت سے زخمی ہو گئے۔'' (بحوالہ تاریخ سلطنت خداداد، ص ۴۲۳) سرنگا پٹم کے بڑے بوڑھوں کی زبان پر عرصے تک یہ بات رہی کہ ایسا سخت طوفان انھوں نے اپنی عمر میں نہ کبھی دیکھا تھا نہ کبھی سنا جیسا کہ سلطان کی تدفین کے دن آیا۔ اتنی بجلیاں گریں کہ جن کا حساب نہیں۔ در و دیوار لرز رہے تھے۔ دریائے کاویری جواب تک پایاب تھا اس میں یکا یک ایسی طغیانی آئی کہ جس کے جوش و خروش کو دیکھ کر دلوں پر ہیبت طاری ہوتی تھی اور انہیں یہ حسرت تھی کہ یہ طغیانی ایک دن پہلے کیوں نہیں آئی کہ حملہ ہو ہی نہیں سکتا۔''[۱]

اس کے بعد ناول نگار نے سرنگا پٹم کی بربادی اور لوٹ مار کا تذکرہ کیا ہے اسے بھی مختلف مورخین نے درست ثابت کیا ہے۔ بعض انگریز افسروں نے اس لوٹ مار کے بارے میں یہاں تک لکھا ہے کہ اس سے زیادہ لوٹ مار ممکن نہ تھی جتنی ۴ اور ۵ مئی کی رات کو کی گئی۔ اس کے بعد ناول نگار نے شہزادہ فتح حیدر کی طرف سے انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے کے فیصلے کا بیان لکھا ہے مگر کچھ عرصہ بعد ہتھیار پھینک دینے کی کیفیت کو ان الفاظ میں رقم کیا ہے:

''سلطان کی شہادت سے چھ دن بعد شہزادہ فتح حیدر نے جنرل ہیرس کے وعدوں اور قمر الدین، پورنیا اور میر غلام علی کے مشوروں سے متاثر ہو کر ہتھیار پھینک دیے۔''[۲]

اس واقعہ کو محب الحسن نے ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:

''فتح حیدر کو ڈھونڈیا اور دوسرے افسروں نے جو اس کے باپ کے وفادار رہے تھے، جدوجہد جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا، لیکن ہیرس کی مصالحت آمیز باتوں اور اس کے افسروں کی اس یقین دہانی کے پیشِ نظر کہ اس کے باپ کی سلطنت اسے واپس کر دی۔

---

[۱] اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے، مشمولہ بصائر، قاری بشیر الدین چشتی، ص ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷۔

[۲] اور تلوار ٹوٹ گئی، نسیم حجازی، ص ۵۳۴۔

جائے گی، فتح حیدر نے اپنے کوانگریزوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔"[۱]

اس واقعہ اوراس سے قبل بیان کردہ دیگر واقعات اوران کے ثبوت میں مختلف راویوں کی روایات پیش کرنے کے بعد ہماری یہ دلیل کہ ناول نگار نے اپنے ناول کا پلاٹ ترتیب دیتے ہوئے تاریخ برصغیر کے اس عظیم سپوت کو اپنا موضوع بنایا ہے جس کی جرأت وشجاعت اورموت سے بے خوفی رہتی دنیا تک بے مثال رہے گی۔ ٹیپو سلطان کی شخصیت کارناموں اوراس کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے نسیم حجازی نے تاریخی حقائق کو مدنظر رکھا البتہ بعض مواقع پر اختلافی روایات میں سے جسے زیادہ مستند اوردرست مانا اپنی کہانی کے لیے چن لیا۔ ناول کے تخیلاتی کردار معاشرے کے حقیقی کردار معلوم ہوتے ہیں ان کا رہن سہن، بول چال یہاں تک کہ ان کی ذہنی صلاحیتیں اورشعوری کیفیات بھی معاشرتی عکاسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ کہانی کا پلاٹ، کردار نگاری، حتیٰ کہ جغرافیائی اور موسمی حالات تک کے تبصرے میں ابہام سے کام نہیں لیا حالانکہ اکثر تاریخی ناول نگاروں سے یہی شکایت رہتی ہے کہ وہ تاریخی کرداروں اوران کے زمانے نیز جغرافیائی حالات کا تعین کرنے میں کہانی لکھتے لکھتے خیال نہیں رکھتے مگر تمام تر تاریخی حقائق کا مطالعہ کرنے کے بعد نسیم حجازی کا ناول "اور تلوار ٹوٹ گئی" تحقیقی اعتبار سے انتہائی معتبر روایات پر مشتمل ہے اور تاریخی حقائق کو ناول کا موضوع بنانے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ تاریخی حقائق کو اس فن کاری کے ساتھ برتنا جہاں ایک طرف نسیم حجازی کی دیانت داری کی دلیل ہے وہیں ان کی فن کاری کا ثبوت بھی ہے۔

۱۔ تاریخ ٹیپو سلطان؛ محب الحسن، ص ۳۳۵۔

پانچواں باب

نسیم حجازی کے ناول۔ فن کی کسوٹی پر

تاریخی ناول نگاری کے فنی تقاضے اور نسیم حجازی

ناول ریت یا مٹی کا گھروندا نہیں جسے وقتی طور پر بنا لیا گیا ہو جب تک جی چاہا کھیلا اور پھر توڑ کر پھینک دیا یا موسم کے تغیر نے اسے ختم کر دیا۔ یہ ایک ادبی مرقع ہے جو کسی معاشرے یا افعال کا بیان کہا جا سکتا ہے جسے بیان کرنے کے لیے کہانی کا پلاٹ، کردار، مناظر اور مکالمے ہوتے ہیں کسی خاص مقصد یا شعور کو بیدار کرنے کے لیے ناول لکھا جاتا ہے مگر مقصد براہِ راست بیان نہیں کیا جاتا بلکہ کرداروں کی زبان سے ایسی کیفیت اور ماحول تیار کیا جاتا ہے جہاں ناول نگار اپنی بات بڑے سلیقے سے کرداروں کی زبان سے ادا کرواتا ہے۔ جس کے لیے مکالموں کی زبان، ادائیگی اور مناظر سے مناسب طور پر کام لیتا ہے ناول حقیقت پسندی کا اظہار ہے معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں اور طبقات کے درمیان ہونے والے معاملات کو اس ڈھنگ سے پیش کرنا کہ دوسرے افراد کی معلومات میں اضافے کا باعث ہوں یا ان کے رہن سہن پر اثر انداز ہوں بصورت دیگر ان کی شعوری بیداری اور ذہنی پختگی کا ذریعہ بن سکے۔ ایک خیال یہ ہے کہ ناول اس زمانے کی زندگی اور معاشرے کی عکاسی کرے جب وہ تخلیق کیا ہو۔ لیکن اس طرح ناول وقتی ضرورت اور اپنے زمانے کی پیش کش بن کر رہ جائے گا ماضی کی حقیقتیں مستقبل کو بنانے کے لیے کارآمد ہو سکتی ہیں۔ انسان ترقی اور انحطاط کی وجوہات کو سمجھ کر مستقبل کی بہترین انداز میں تیاری کر سکتا ہے بعض مواقع پر زندگی کی موجودہ رفتار اور روز افزوں ترقی کو مدِ نظر رکھ کر مستقبل کے خدوخال اور معاشرے کی نئی روش کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے الغرض ناول موضوعات کے اعتبار سے بھرپور اور جامع تحریروں کو اپنے اندر سمیٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ناول کا پلاٹ کہانی کے خدوخال واضح کرتا ہے لیکن اسے پھیلانے اور پیش کرنے کے لیے کرداروں کی اشد ضرورت ہوتی ہے جس کے لیے کرداروں کا انداز، رہن سہن اور گفتگو اس طرح کی ہو کہ قاری اسے محسوس کر سکے اور اگر ناول نگار انہیں زندہ، چلتا پھرتا محسوس کرا دے تو یہ کامیابی کی معراج ہے ساتھ ہی مکالموں کی ادائیگی اُن کے معاشرتی منصب کے مطابق ہونی چاہیے یہی حقیقت پسندی ناول کو دلچسپ اور قاری کے لیے پُر اثر بنائے گی۔ ناول کے لیے ضروری ہے کہ اس کی زبان موضوع اور کردار سے بھی مطابقت رکھتی ہو اور اپنے عہد کی بھی عکاسی ہو۔ ان تمام اصولوں کو ملحوظِ خاطر رکھ کر ناول نگاری کے فنی تقاضوں کے مطابق اُردو ناولوں کو پرکھیں تو بے شمار ناول اس معیار کے مطابق ہوں گے۔ جس پہلو نے اردو ناول نگاری میں کچھ کمزوری پیدا کی ہے وہ تاریخی ناول نگاری کا شعبہ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اردو میں ناول نگاری کا آغاز ہوتے ہی تاریخی ناول نگاری کا رجحان بھی پیدا ہو گیا لیکن یہ تعجب کی بات نہیں کیونکہ انگلستان میں بھی ناول نگاری کی ابتدا ہی میں تاریخی ناول نگاری بھی سامنے آ گئی تھی البتہ غیر منقسم ہندوستان کے معاشرتی اور سیاسی حالات بالکل مختلف تھے یہاں ناول نگاری کی ابتدا غیر شعوری طور پر بعض مصلحت

اندیشوں کے زیرِ قلم ہوئی تھی ان میں مولوی نذیر احمد کا قصہ ''مراۃ العروس'' بعض گھریلو ضرورتوں کے پیشِ نظر مرتب کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب کو یہ بھی خدشہ تھا کہ جس انگریزی تعلیم کے پروردہ بن کر وہ لوگوں کو اس کی طرف راغب کر رہے ہیں ایسی انگریزی تعلیم کے ساتھ وہاں کا کلچر بھی آرہا ہے۔ جس سے اپنی تہذیب وثقافت کو بچانے کے لیے کچھ کرنا چاہیے یہی وجہ ہے کہ اصلاحی روایات، نیکی و بدی کے تصور کو اجاگر کر کے مولوی نذیر احمد اپنا معاشرتی کردار ادا کر رہے تھے۔ دوسری طرف عبدالحلیم شررؔ نے تاریخی ناول نگاری کے ذریعے اسلام کے دورِ زریں کو پیش کرنے کی کوشش کی جس میں انھوں نے تاریخی حقیقتوں سے انحراف کی راہ بھی اختیار کی جو کسی طور قابلِ معافی نہیں کیونکہ تاریخی ناول نگاری کے لیے بھی وہی اصول وضوابط ہیں جو دیگر اقسام کے ناولوں کے لیے ہیں بلکہ یہ صنف اور زیادہ مشکل ہے کیونکہ اس میں مزید احتیاط کی ضرورت ہے۔ تاریخی شخصیات کی شمولیت ان کا عہد اور اس عہد کے واقعات کو انتہائی باریک بینی سے پیش کرنا پڑتا ہے پھر اس زمانے کے رسم ورواج عادات واطوار اور گفتگو کے رائج طریقوں سے واقفیت کے علاوہ اس عہد کے تمدن، طریق بود و ماند، لباس، اشیاء، ظروف اور فنِ تعمیر کی شدبد ہونا بھی ضروری ہے اس علاقے کے جغرافیائی وموسمی حالات اور پھر کہانی میں ان کے استعمال میں انتہائی ہوشیاری سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ ماضی کے واقعات جو تاریخ کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں وہ محض چند ناموروں اور فاتحین سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ محض خارجی معلومات کی بنا پر کسی تاریخی موضوع کو ناول کے قالب میں ڈھالنے کے لیے تخیلات کا سہارا لینا پڑتا ہے اور پھر جس زمانے کا یہ واقعہ ہو اس زمانے میں نقل وحمل کے ذرائع اور ان کے لیے استعمال ہونے والے راستوں کی نوعیت کا تعین کرنا اور اپنے قاری کو تصور کی دنیا میں لے جانا سحر انگیزی سے کم نہیں کیونکہ الفاظ کے استعمال کے ذریعے قاری کو ذہنی اور شعوری طور پر ماضی کے پردوں کے پیچھے لے جانا ایک مشکل کام ہے۔ مورخ محض تاریخی حقائق پیش کرتا ہے جو چند اشخاص کے واقعات سے بڑھ کر اور کچھ نہیں لیکن تاریخی ناول نگار ماضی کے اس معاشرے یا عہد کو زندہ کر کے خارجی اور داخلی کیفیت کو دوبارہ سے زندہ کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہے جہاں ٹھہر ٹھہر کر چلنے اور ناقدین کی نوکِ قلم کی چبھن سے بچنے کے لیے محتاط ہونا پڑتا ہے گویا تاریخی ناول نگار اپنے تخیل، زورِ قلم اور قدرتِ بیان سے تاریخ کے ان بظاہر خشک، فرسودہ اور مردہ واقعات میں ایسی جان ڈال دیتا ہے کہ زندگی کا وہ مرقع نہ صرف اپنے متعلقہ زمانے کے دستور کے مطابق ہوتا ہے بلکہ اس میں خود وہ زمانہ چلتا پھرتا اور جیتا جاگتا نظر آتا ہے یعنی تاریخی ناول کا مقصد ماضی کی تدوین اور کسی خاص دور کی کامل عکاسی ہے اس لیے تاریخی ناول نگار کو پلاٹ ترتیب دیتے ہوئے کردار اور ان کے ادا کروائے جانے والے مکالموں اور اُن مناظر کے لیے ماحول سازگار بنانا چاہیے جو اس کے دور کے نہیں بلکہ ماضی کے واقعات پر مبنی ہیں۔ یہاں اس امر کو سمجھ لینا چاہیے کہ بعض تاریخی حقیقتوں کے علاوہ تخیل کی رنگ آمیزی کے بغیر ناول نگار کے لیے یہ بات کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ ماضی کے کسی زمانے کی ایسی تصویر پیش کر سکے جس سے قاری کی نگاہوں کے سامنے اس دور کی حقیقی شبیہ آجائے تاریخی ناول نگار تاریخ سے حقائق لیتا ہے اور تخیل کی مدد سے ان کے ساتھ وہ تمام جزئیات بھی شامل کرتا ہے جو تاریخی حقائق پر اثر انداز ہوئے بغیر تصویر میں زندگی کا رنگ بکھیر دیں اور ماضی کے متعلقہ دور کا نقش مکمل

ہو جائے۔ اس میں تاریخ اور تاریخی ناول دونوں کے انداز اور طریقہ کار میں خاصا فرق ہے جبکہ تاریخی ناول ہر زمانے میں اپنی ایک انفرادیت اور اہمیت رکھتا ہے کیونکہ تاریخ کی شمولیت اور تخیل کی کارفرمائی اس کی جاذبیت اور دلچسپی کو بڑھا دیتی ہے وہ ماضی کا آئینہ ہے اور اس عہد کو زندہ اور جاوید دکھانے کے لیے حاشیہ لگایا جا سکتا ہے ماضی کی بہت سی حقیقتیں تاریخ کا حصہ ہیں لیکن ان میں دلچسپی اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک رومان انگیزی اور سحر آفرینی کا سہارا لے کر تاریخی ناول کے قالب میں نہ ڈھال دیا جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ مورخ نے صفحات خالی چھوڑے ہوں یا رنگ آمیزی کی گنجائش موجود ہو اگر تاریخی شخصیات اور زمانہ روز روشن کی طرح عیاں ہو تو وہاں قلم اٹھانے سے کیا فائدہ۔

اگر ان اصولوں کو بنیاد بنا کر اردو کی تاریخی ناول نگاری پر نظر کی جائے تو بعض وقتی ضرورتوں کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا جیسا کہ عبدالحلیم شرر کا نظریہ فن تھا کہ ان کے دور میں عوام الناس کو ماضی کا دور عروج یاد دلا کر اُن میں امنگ اور حوصلہ مندی پیدا کی جائے ساتھ ہی ایسے رومانی قصے بھی خواہ وہ تصرف ہی ہوں شامل کر لیے جائیں جن سے عروج پر پہنچی ہوئی قوم یا دور کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آ جائے نہ کہ ایسے انگریزی تراجم یا قصے ناول کے رنگ میں پیش کیے جائیں جن میں مغرب کی معاشرت اور رہن سہن جو ہمارے ہم وطنوں کے لیے بالکل اجنبی ہے پیش کیا جائے۔ ابتدا میں شرر نے تاریخی موضوعات سے ہٹ کر لکھنے کی کوشش کی جو مقبول عام نہ ہو سکی اس لیے انھوں نے تاریخ کے واقعات کو ناول کی فنی ضرورتوں کے مطابق ڈھال کر پیش کیا اس کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ عوام کے ہر طبقہ ہائے زندگی کی تاریخ سے دلچسپی بڑھتی گئی اور شرر کے ساتھ ساتھ دیگر ناول نگار بھی ان کے مدمقابل یا ہم عصر بن کر سامنے آئے یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شرر بنیادی طور پر رومانی ناول۔ اور وہ بھی عوامی ذوق کے پیش نظر ان کی تاریخ کے کسی درخشاں حصے سے متعلق ناول۔۔ کے حق میں ہیں اور اسی کو دلوں کی افسردگی ختم کر کے جوش اور ولولہ پیدا کرتے ہوئے روشن مستقبل کی راہوں پر گامزن کرنے کا واحد کامیاب نسخہ تصور کرتے ہیں ان کے نزدیک تاریخی واقعات کا سچا ہونا ضروری ہے لیکن قصے میں دلچسپی اور رنگ آمیزی کی خاطر تفصیلی صحبتوں کا ذکر اور ان میں تصرف و اضافہ ناگزیر ہے۔''[۱]

اس کی وجہ وہ عوامی ذوق و شوق رہا ہو جو ناولوں کے اس قاری کی بدولت پروان چڑھا جو دلگداز کے شماروں میں اقساط کی صورت میں پڑھ رہا تھا ایک قسط میں تحیر اور استعجاب کے ساتھ ساتھ عشق و محبت اور لطف و انبساط کو جمع کرنا تمام تر تاریخی حقیقتوں کے ساتھ ممکن نہ تھا اس لیے انھوں نے اپنے نظریہ فن، قاری کی خوشی، دلچسپی اور انہماک کو ملحوظ خاطر رکھ کر ناول نگاری کی جبھی تو پروفیسر عبدالسلام نے یہ رائے قائم کی:

''انھوں (شرر) نے اپنے گردو پیش کے زمانے اور اپنے وطن کی تاریخ کو چھوڑ کر عرب، ایران اور ترکی کے قصے بیان کیے

---

[۱] شرر کے تاریخی ناول۔ تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ص ۳۶۔

اور پھر سینکڑوں سال پرانے۔انہوں نے اس دور کی معاشرت اور اس زمانہ کے لوگوں کے عادات واطوار سے واقف ہونے کی کوشش نہیں کی۔انہوں نے اس دور کے ادب اور تہذیبی کتابوں کے بجائے صرف تاریخ کے سرسری مطالعے پر اکتفا کی۔''[۱]

یہی وجہ ہے کہ وہ فنی تقاضوں پر پورے نہیں اترتے اور وہ اس دور کے مروجہ فنی معیار سے بھی کم تر نظر آتے ہیں اس رائے کا اظہار ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''شرر نے بجائے اس کے کہ سرشار کی پیش کی ہوئی روایات کو آگے بڑھاتے، ناول کو دلچسپ کہانی اور پلاٹ تو عطا کیا لیکن کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کے اعتبار سے اس کو اور پیچھے لے گئے اور نہ جذبات کی عکاسی سے ہی کچھ غرض رکھی۔اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی افتادِ طبع ہے جس پر ان کی عالمانہ ذہنیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا (شرر اپنے معاشرتی ناولوں میں بھی پس منظر کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی اور جذبات کی عکاسی سے قاصر ہیں)۔''[۲]

مگر اس کے برخلاف ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ پلاٹ نگاری کے کامیاب انداز کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''شرر کے ہاں پلاٹ سازی کا ایک واضح تصور موجود ہے۔وہ اپنے ناول میں کہانی کے واقعات میں تنظیم، ربط وضبط، دلچسپی اور تجسس کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔بہت کم ناول ایسے ہوں گے جن میں شرر کا پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہوگا۔ورنہ عام طور پر ان کے ناولوں کے پلاٹ چست اور گٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔''[۳]

اس سب کے باوجود یہ بات تو ایک حقیقت ہے کہ نقشِ اول نقشِ ثانی سے بہتر نہیں ہوسکتا۔شرر جن حالات اور جس معاشرے میں تخلیقی کام کر رہے تھے وہاں فنی تقاضوں اور ادبی اعتبار سے معیار کی اہمیت ضرور تھی مگر کچھ معاشرتی ضرورتیں اور کچھ قارئین کے تقاضے پیش نظر رہے ہوں گے۔اس لیے اگر عبدالحلیم شرر کو ابتدائی تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہوئے ان میں موجود خامیوں کو دور کرنے کی ذمہ داری بعد کے آنے والے ناول نگاروں پر ڈالی جائے تو بہتر ہوگا۔

محمد علی خان طبیب، شرر کے ہم عصر اور ایک لحاظ سے مدمقابل کہے جاسکتے ہیں۔وہ طبقہ جو شرر سے مخاصمت رکھتا تھا طبیب کے ناولوں کو نہ صرف پسند کرتا تھا بلکہ اعلیٰ مذاق اور معراج کمال تک پہنچا دیتا تھا حالانکہ طبیب کے نزدیک بھی ناول نگاری کا مقصد اسلاف کے کارہائے نمایاں کو موجودہ نسل کے سامنے پیش کر کے ان میں ولولہ، جوش اور یگانگت کو فروغ دینا تھا۔اس ظاہری مقصد کے علاوہ شرر اور طبیب میں کوئی اور صفت مشترک نہ تھی شرر لکھنؤ کی آراستہ اور مسجع عبارت سے اپنی تحریر کو ادبی شہ پارہ بنانے پر قدرت رکھتے تھے لیکن طبیب کو زبان وبیان پر یہ قدرت حاصل نہ تھی اس کے یہاں ناول نگاری کے اعتبار سے خاصے سقم موجود ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ فن ناول نگاری کے تقاضوں سے واقف ہی نہ تھے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں کا تبصرہ ان الفاظ پر مشتمل ہے:

۱۔ اُردو ناول بیسویں صدی میں، پروفیسر عبدالسلام، ص ۵۳۔

۲۔ اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء، ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں، ص ۱۰۹۔

۳۔ اردو میں تاریخی ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۱۸۵۔

''جہاں تک طبیب کے تاریخی ناولوں کا تعلق ہے ان میں کرداروں کے نام تاریخی ہیں سرسری طور پر کچھ تاریخی واقعات شامل کر لیے گئے ہیں اس کے علاوہ اور کچھ تاریخی نہیں۔ ماحول اور پس منظر کو تاریخی ہونے سے نہ کچھ غرض ہے نہ کرداروں کو حکیم صاحب اپنے تاریخی ناولوں کا نسخہ کچھ اپنی ہی ترکیب سے تیار کرتے ہیں جس میں بے پناہ عشق و عاشقی کے ساتھ پند و نصائح کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔''[۱]

یہی وجہ ہے کہ وقت کی اڑتی دھول میں طبیب کے ناول کھو گئے حالانکہ شرر کے ناولوں کو بر سبیل تذکرہ ہی سہی یا خامیوں کی خاطر زیر بحث ضرور لایا جاتا ہے اسی زمانے میں موہن لال نے بھی طبع آزمائی کی وہ موضوعات میں حقیقت پسندی کے قریب تک تو گئے مگر فنی اعتبار سے کوئی اضافہ نہ کر سکے۔ ان کے انداز نگارش میں ڈرامائی رنگ جھلکتا ہے تاریخی ناول نگاری کے فن میں علامہ راشد الخیری نے زبان و بیان کے اعتبار سے بلند پایہ روایت کو برقرار رکھا لیکن اُن کی پلاٹ سازی مرکب یا دہرے پن کا شکار ہو کر انتہائی کمزور ہو گئی ہے تاریخی اور رومانوی واقعات کو مربوط نہ کر سکے یہی وجہ ہے کہ اگر تاریخی واقعات الگ بھی کر دیے جائیں تو بھی کہانی کی دلچسپی برقرار رہتی ہے کردار نگاری میں مولوی نذیر احمد کے مقلد نظر آتے ہیں۔ اُن کے کردار ایک جیسی صفات کے مالک یا اکثر و بیشتر اسم با مسمّٰی ہیں۔ ان کے کرداروں میں مثالیت پسندی ہے۔ وہ سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں ہیروئنیں حسن و جمال کا مجسمہ اور ہیرو بہادری اور جواں مردی کا شاہکار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی ناول نگاری میں فنی اعتبار سے علامہ صاحب بھی کوئی اضافہ نہ کر سکے البتہ صادق حسین صدیقی سردھنوی نے بھی تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کی۔ انہوں نے پلاٹ کی تعمیر پر زیادہ توجہ نہیں دی صرف کہانی شروع کرنے اور اختتام کو تو مدنظر رکھا لیکن تحیر، تجسس اور انہماک پیدا کرنے کے لیے کن خصائص کا ہونا ضروری ہے وہ ان کے یہاں ناپید ہے البتہ کردار سازی میں اور خاص طور پر تاریخی کرداروں کو پیش کرنے میں بڑی محنت سے کام لیا ہے ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ رقمطراز ہیں:

''صادق حسین صدیقی کے ناولوں میں دو قسم کے کردار ملتے ہیں خالص تاریخی کردار مثلاً حضور ﷺ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے ساتھ ساتھ خالدؓ بن ولید، صلاح الدین ایوبیؒ، یزدجرد رستم وغیرہ۔ دوسری طرف ان کے افسانوی کردار ہیں جن سے وہ قصے میں رنگینی اور دلچسپی پیدا کرنے کا کام لیتے ہیں۔ جہاں تک پہلی قسم کے کرداروں کا تعلق ہے صدیقی کے ہاں یہ کردار اپنے پورے تاریخی طمطراق اور شان و شوکت اور رعب داب سے جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ ان کرداروں کو پڑھ کر ہمارے احترام میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی، نہ یہ تاریخی کردار ہی کہیں مسخ ہوتے نظر آتے ہیں ان کے رویے، گفتگو سب تاریخی پس منظر کی حامل ہے لیکن صادق صدیقی میں بھی تاریخی ناول نگاروں کا یہ نقص موجود ہے کہ یہ بعض تاریخی کرداروں کو اپنے عہد کے انسانوں کی خصوصیات عطا کر دیتے ہیں۔ انتہائی معزز اور محترم ہستیوں کو چھوڑ کر بعض عظیم سپہ سالاروں اور فاتحین کے کردار اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ وہ اپنے دور کے انسانوں سے زیادہ بلند معلوم نہیں ہوتے۔''[۲]

۱۔ اُردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء: ڈاکٹر نزہت سمیع الزمان، ص ۱۲۷۔

۲۔ اُردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۳۵۹۔

دوسری جنگ عظیم اور تقسیم برصغیر کے دوران تاریخی ناول نگاری ایک بار پھر زور شور کے ساتھ منظر عام پر آئی اس زمانے میں اہم ترین نام ایم۔ اسلم کا ہے جن کے ناول تاریخی عنوانات کے ساتھ رومانی واقعات کو اپنے جلو میں لیے قارئین کو محظوظ کرتے رہے یہ الگ بات کہ انھوں نے پلاٹ کے رموز کو خوب سمجھا خیر وشر کی کش مکش کو ابتدا سے انتہا تک پیش کرنے کی صلاحیت کو منوایا۔ کہانی میں تجسس اور انہماک کو برقرار رکھنا ان کی فنی کامیابی کی دلیل ہے لیکن تاریخی موضوعات کو اتنے تاخیر سے شروع کرتے تھے کہ ناول کا ابتدائی بڑا حصہ رومانی یا تخیلاتی کرداروں کے گرد گھومتا رہتا ہے موضوعات کے انتخاب میں اکثر اسلام کے ابتدائی دور عروج اور ہندوستان پر مسلمانوں کے اولین دور کو منتخب کیا۔ کردار نگاری کے فن میں بھی کچھ ترقی نظر آتی ہے مگر بہت زیادہ لکھنے کی وجہ سے ادبیت متاثر ہوتی چلی گئی پھر اُن کے ناولوں کو فلمی سند کی غرض وغایت نگل گئی اور رہی سہی ناول نگاری بھی جاتی رہی۔

تقسیم برصغیر کے بعد فسادات کے موضوع پر بے شمار اہل قلم طبع آزمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک انسانی المیہ تھا اور ہر اہل قلم کو اپنے گردوپیش سے اتنی کہانیاں ضرور مل گئیں کہ جنھیں بنیاد بنا کر عوام کے دل میں تڑپ اور رقت پیدا کی جاسکے لوگ مضطرب اور بے چین تھے اپنے زخموں کو کریدتے ہوئے ان ناولوں کو پڑھتے ایک آہ بھرتے رہے۔ اس طرح فسادات کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا۔

قرارداد پاکستان کی منظوری نے تحریک پاکستان کو جلا بخشی مسلمانان ہند ایک الگ وطن کے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتا دیکھنے کے لیے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے اس زمانے میں انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف لانے اور اپنے اندر موجود سازشی عناصر سے ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی ساتھ ہی ہندو فسطائیت کا چہرہ بے نقاب کرنے اور اس کے متحدہ ہندوستان کے خواب کو چکنا چور کرنے کے لیے ایک کاری ضرب کی ضرورت تھی جسے محسوس کرتے ہوئے نسیم حجازی نے اپنے افسانے شودر کے تصور کو ''انسان اور دیوتا'' کے بڑے موضوع کی شکل میں پیش کیا تو مسلمانوں میں جذبۂ جہاد، حریت پسندی، اطاعت، نظم وضبط اور سازشوں سے ہوشیار رہنے کے لیے داستانِ مجاہد، محمد بن قاسم اور آخری چٹان جیسے معرکۃ الآراء ناول رقم کیے ان ناولوں میں جہاں تاریخ اسلام کے واقعات کو تخیل کا سہارا لے کر بعض فرضی کرداروں کے ذریعے ابھارا گیا ہے وہیں ناول نگاری کے فنی تقاضوں کو بروئے کار لا کر انھیں دلچسپ اور مؤثر بنانے کی کوشش بھی کی گئی ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ رقم کرتے ہیں:

''شرر کی نسبت نسیم حجازی کے ہاں پلاٹ سازی کا زیادہ فنکارانہ شعور ملتا ہے۔ کہانی لکھنا اور اس کہانی میں تاریخی واقعہ کو اس طرح شامل کرنا کہ کہیں بھی تاریخ کہانی سے الگ نظر نہ آئے یہ نسیم حجازی کے ناولوں کے پلاٹ کی خوبی ہے نسیم حجازی کے ناولوں میں واقعات کی ترتیب وتنظیم پر خاص توجہ ملتی ہے۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں لکھتے جس سے ان کے قصے کی روانی میں فرق پڑے۔''[1]

اس کے علاوہ نسیم حجازی کی کردار نگاری کے بارے میں ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ لکھتے ہیں:

''نسیم حجازی ایک طرف تو تاریخی شخصیات کو کردار کی صورت میں پیش کرتے ہیں دوسرے بعض فرضی کردار تراشتے ہیں۔ ان

---

[1] اُردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۲۴۹۔

کرداروں کی مدد سے نسیم حجازی کسی دور کی تہذیب و معاشرت کو پیش کرنے میں مدد لیتے ہیں۔ یہ کردار مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔''[۱]

اس کے علاوہ نسیم حجازی نے مکالمہ نگاری پر خصوصی توجہ دی انھوں نے شخصیت کے خدوخال اور منصب کو اس کے منہ سے ادا کیے جانے والے مکالموں کے ذریعے موزوں اور مناسب طور پر منتخب کر کے پیش کیا ہے ان کے یہاں بڑے جملے یا تقاریر معاملے اور موقع کی مناسبت سے ہوتی ہیں کسی مجمع یا مسجد وغیرہ میں تقریر کے ذریعے موزوں اور مناسب طور پر منتخب کر کے پیش کیا ہے۔ مراسلے کے ذریعے طویل انداز گفتگو گراں اور غیر موزوں نہیں ہوتا جبکہ منظر نگاری کو اجاگر کرنے کے لیے وہ اس علاقے کے تمام تر جغرافیائی اور موسمی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مناظر ابھارتے ہیں جو اُن کی اعلیٰ فنی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر ممتاز احمد خان رقمطراز ہیں:

''وہ (نسیم حجازی) شرر سے زیادہ معتبر ٹھہرائے گئے ہیں۔ اگر ان کے لیے یہ طے بھی کر لیا جائے کہ ان کے ناولوں میں فنی نقائص ہیں تب بھی ایک خاص قسم کے یا ایک خاص ڈھب کے ناولوں کے حوالے سے تاریخ ادب اُردو میں ان کا مقام مسلم رہے گا۔''[۲]

اس اعتراف کے باوجود کہ شرر کے بعد اردو کی تاریخی ناول نگاری میں نسیم حجازی کا مقام مسلّم ہے اُن چھوٹی چھوٹی خامیوں کو نظر انداز کرنے کی ضرورت ہے جنھیں پکڑ کر یا وجہ بنا کر تاریخی ناول نگاری کے فن کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے یہ غیر منصفانہ عمل ہے کیونکہ خامیوں سے پاک کوئی چیز نہیں ہمارے یہاں لکھے جانے والے معاشرتی ناولوں میں بھی کچھ نہ کچھ خامیاں ہوتی ہیں لیکن انھیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے جبکہ تاریخی ناول نگاروں کو بڑی باریک چھلنی سے گزارا جا رہا ہے اس طریقے کو ختم کر دیا جائے تو نسیم حجازی کے ناولوں کے پلاٹ، کردار، منظر، مکالمے اور اسلوب خاصے مؤثر نظر آئیں گے اور ان کا فن تنقید کے مروجہ معیار کے قریب قریب ہوگا۔ اس سلسلے میں جس بات کو مقدم رکھنے کی ضرورت ہے وہ تاریخی ناول نگاری کی بنیادی اور فنی مشکلات ہیں اگر اس مشکل سے کوئی عہدہ برآ ہونے میں خاصی حد تک کامیاب ہو گیا ہے تو ہمارے اہل نقد اور کیا چاہتے ہیں؟

---

[۱] اُردو میں تاریخی ناول؛ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۱۵۷۔

[۲] آزادی کے بعد اردو ناول؛ ڈاکٹر ممتاز احمد خان، ص ۱۵۸۔

داستان مجاہد کا تنقیدی جائزہ

داستان مجاہد:

اس ناول کا خلاصہ اور واقعات کا تحقیقی جائزہ پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ یہاں ناول کے پلاٹ، کردار، منظر نگاری اور مکالموں کے فنی پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے گا۔

پلاٹ:

داستان مجاہد کا پلاٹ ربط و تسلسل اور دلچسپی کے اعتبار سے ایک بہترین کاوش ہے۔ قاری کے لیے دلچسپی اور تجسس کا ایسا سامان مہیا کیا گیا ہے کہ وہ اس میں کھو جاتا ہے۔ سہولت کے اعتبار سے نسیم حجازی نے اسے پندرہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ جو قصے کو ابتدا سے انتہا کی طرف لے جاتے ہیں اور قاری کو لیے جاذبیت اور دلچسپی کا ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ وہ منہمک ہوتا چلا جاتا ہے اور کرداروں، واقعات اور حالات سے واقفیت کا متلاشی و متجسس ہو کر مزید انہماک سے خود کو ناول کا ایک حصہ سمجھ بیٹھتا ہے۔ ناول نگاری قاری کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے قدم قدم پر حیرت و استعجاب، امید و بیم، تجسس اور تذبذب کو ابھارتا ہے۔ ناول کے ابتدائی باب میں قصے کی ابتدا ایک خاندان کے تعارف اور اگلے باب میں اس گھرانے میں شامل ہونے والی ایک لڑکی عذرا کے کردار کی شمولیت سے ہوتی ہے۔ یہاں ان کا مکمل تعارف اور خاندانی حسب و نسب تفصیلاً بیان کر دیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں ان بچوں کی گھریلو تربیت کا تذکرہ کر کے اُس عہد کی ضرورت کے پیش نظر حربی و فوجی تربیت کی غرض سے مکتب میں ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھتے دکھایا گیا ہے۔ یوں چوتھا باب مکمل ہوتے ہوتے ناول نگار کے تخیلاتی کرداروں کے ساتھ ساتھ تاریخی کردار بھی شروع ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی عشق و محبت کی وہ کہانی بھی شروع ہو جاتی ہے جو مسرت و شادمانی کے ساتھ ساتھ ہجر و وصال کے صدمات بھی ساتھ لیے ہوئے ہے۔ پانچویں باب میں ایک کردار نعیم تعلیم و تربیت سے فراغت کے بعد رخصت پر اپنے گھر آتا ہے تو اسی دوران بڑا بھائی بھی میدانِ جہاد سے رخصت لے کر گھر آ پہنچتا ہے۔ بظاہر گھر کی خوشیاں دوبالا ہونی چاہئیں لیکن عبداللہ واپسی پر اپنی ماں کے نام اپنے ماموں اور عذرا کے ولی سعید کا رقعہ بھی لایا تھا جس میں عبداللہ سے عذرا کی شادی کرنے کا ذکر تھا۔ یہ وہ کیفیت ہے جو نعیم کے لیے ایک ناکردہ گناہ کی سزا کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ بظاہر مجاہدانہ عزم و استقلال کا یہ پیکر دل کی کیفیت سے مجبور ہو جاتا ہے اور حزن و ملال کا پیکر نظر آتا ہے۔ بڑا بھائی یہ کیفیت محسوس کر کے ماموں کے نام ایک خط تحریر کرتا ہے جس میں عذرا کی شادی نعیم سے کر دینے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ اب قاری کے لیے انتہائی تجسس کی کیفت پیدا ہو جاتی ہے مگر ناول نگار قصے کو طول دینے کے لیے حالات و واقعات میں نئی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ چھٹے باب میں ناول کا ہیرو اپنے گھر اور امیدوں کی آماجگاہ سے ہزاروں کوس دور سندھ کے محاذ کی جانب رواں دواں ہے۔ دوران جہاد ماموں کی شہادت اور قبر میں بھائی کا خط ڈالنے پر محمد بن قاسم، نعیم کو ایک بہانے سے بصرہ روانہ کرتا ہے۔ ساتویں باب میں اس کے دشمن ابنِ صادق کے آدمی اسے گرفتار کر کے نامعلوم مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔ یہاں قصہ ایک نئی کروٹ لیتا ہے اور

ابنِ صادق کی قید کے دوران زلیخا کی مدد سے اس کا فرار ہونا اور اسی دوران زلیخا کا خود کشی کر لینا اس کے غموں میں مزید اضافہ اور قاری کے لیے مزید انہماک کا باعث بنتا ہے۔ آٹھویں باب کے آغاز میں زندگی ایک بار پھر اس قدر قریب آ جاتی ہے کہ عشق محض ایک قدم کے فاصلے پر تھا مگر نعیم انتہائی خودداری کا ثبوت دیتے ہوئے ایثار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اگلے روز دونوں بھائیوں کی ملاقات ہوتی ہے اور پھر نعیم ترکستان کی جانب جہاد کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ قاری کی دلچسپی ان تین کرداروں نعیم، عبداللہ اور عذرا کے ساتھ ساتھ رواں دواں رہتی ہے۔ نویں باب میں نعیم کو ترکستان کے محاذ پر جہاد میں سرگرداں دکھایا گیا ہے جہاں ایک بار پھر اس کا دشمن ابنِ صادق مل جاتا ہے۔ جسے گرفتار کرنے کی کوشش میں وہ زخمی ہو کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ دسویں باب میں زخمی حالت میں نرگس سے ملاقات اور پھر اسی دلی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے جس سے ابھی جانبر بھی نہ ہوا تھا۔ اس آگ کو دل میں لگائے صحت مند ہو کر اپنی فوج میں جا شامل ہوتا ہے۔ قاری انتہائی استعجاب سے اس کیفیت کو محسوس کرتا ہے کہ خوبرو اور نوجوان لڑکی اس مجاہد کے قلبِ حزیں کو قابو کرنے کا باعث تو بنتی ہے مگر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے رشتے قریب آ کر اس قدر دوری کیوں اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے دل و دماغ میں جہاد میں شریک ہو کر جامِ شہادت پینے کی تمنا زیادہ ہے یا اپنے محبوب کو پا لینے کی۔ گیارھویں باب میں جہادی سرگرمیوں میں مصروف نعیم کو چینی بادشاہ کے حرم کی ایک کنیز اپنی جانب راغب کرنے میں ناکامی کے بعد اپنے حُسن کو لعن طعن کرتی ہے۔ یہاں قاری کے لیے یہ نقطہ ابھر کر سامنے آتا ہے کہ محض حسن و رعنائی اس مجاہد کا دل جیتنے کا باعث نہیں بن سکتی بلکہ ایمان کی گرما دینے والی وہ کیفیت جو مجاہدوں کو مطلوب ہے اس کی شریکِ حیات میں ہونی چاہیے۔ بارھویں باب میں نعیم کی وہ دلی آرزو اور تمنا پوری ہوئی۔ جو زندگی میں دو مرتبہ اس کے بہت قریب آ کر اس سے روٹھ گئی تھی۔ ابھی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر چند دن بھی نہ گزارے تھے کہ ایک بار پھر طویل سفر کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ تیرھویں باب میں بظاہر موت اس کے بہت قریب آ کر ٹل گئی اور یوں کہا جائے کہ قاری کی خواہش بھی یہی تھی۔ جس کے عین مطابق ناول نگار نے حیلہ تراش کر وہ کر دیا جو قاری چاہتا تھا۔ پھر قاری کی خواہش کے مطابق ابنِ صادق کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی ایک ناکام کوشش دکھائی۔ جس کی ناکامی قصے کو مزید طول دینے اور دلچسپی کو برقرار رکھنے کا باعث بنتی ہے۔ چودھویں باب میں وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے لیکن ناول نگار کی چابک دستی اور کمال ہوشیاری قاری کو اس کا احساس نہیں ہونے دیتی اور بالآخر ابنِ صادق اپنے انجام کو اور نعیم اپنے صلے کو پہنچتا ہے۔ پندرھواں اور آخری باب انتہائی رقت انگیز ہے۔ قاری کو جا بجا احساس ہوتا ہے کہ زندگی کہیں آخری ہچکی نہ لے لے مگر امید و بیم کی وہ ڈور جو ناول کے آغاز سے قصے کا ربط قائم رکھے ہوئے تھی۔ دو بچھڑے ہوؤں کو ایک دوسرے سے ملانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ نعیم اور عذرا ایک دوسرے سے ملتے ہیں عمر بھر کا ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے زندگی آزادی چاہتی ہے اور پھر وہی بچپن کی یادیں اور مٹی کے گھروندے اور انجام بالخیر اور یوں قصے کا اختتام ہوتا ہے۔

ناول کے تیرھویں اور چودھویں باب میں وقت کو جس تیزی سے گزارا گیا وہ پلاٹ میں ایک جھول محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ اس سے قبل بھی دسویں باب میں جبکہ نعیم خون بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوش ہو جاتا تھا۔ نرگس کی صورت اور خد و خال کا تعین کرنے

میں اس قدر مشاق دکھایا گیا ہے جو قرین قیاس نہیں اگر یہی کیفیت ہوش میں آنے کے بعد پیدا کی جاتی تو ناول مزید دلچسپ ہو سکتا تھا۔ ساتھ ہی چھٹے باب میں ابنِ عامر کی تقریر پھر تلاوت کلام پاک اور نعیم کی طویل تقریر ناول کے فن کو دلچسپی سے نکال کر مقصدیت کی جانب لے جاتی ہے۔ یہی چیزیں مختصر انداز میں کرداروں کے ذریعے پیش کی جائیں تو زیادہ بہتر تھا مگر ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ رقمطراز ہیں کہ:

''نسیم حجازی سیدھے سادھے واقعات کو دلچسپ اسلوب میں پیش کرنے کے لیے ڈرامائی حالات پیدا کرتے ہیں۔ واقعات جس رفتار پر جا رہے ہوتے ہیں۔ اس میں اچانک کوئی ایسی تبدیلی رونما ہوتی ہے جس سے واقعات کا رخ بدل جاتا ہے۔ وہ قصے میں ایسے نشیب و فراز پیدا کرتے اور اس طرح اُتار چڑھاؤ دکھاتے ہیں کہ تجسس اور دلچسپی میں ہر آن اضافہ ہوتا ہے۔ واقعات میں مسلسل نشو و نما اور ارتقاء جاری رہتا ہے۔ حق و باطل کے معرکے ہوں یا عشق و محبت کی سرگرمیاں کہیں بھی واقعات کے بہاؤ میں فرق نہیں آتا۔''[۱]

اسی وجہ سے تاریخی ناول نگار کے طور پر نسیم حجازی کا بہتر مقام متعین کرتے ہوئے ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں رقمطراز ہیں:

''نسیم حجازی کے ناول شرراور ان کے تمام مقلدوں سے مختلف ہیں۔ ان کے ناولوں کے پلاٹ کردار اور مکالمہ دوسری طرز کے ہیں۔ نسیم حجازی کے یہاں ایک توازن نظر آتا ہے۔ جو ان سے پہلے کے تاریخی ناول نگاروں کے یہاں نہیں ملتا۔ انہوں نے پلاٹ کی ترتیب و تنظیم میں سلیقہ سے کام لیا ہے۔ اس میں اسکاٹ اور ڈوما کا اثر دکھائی دیتا ہے۔''[۲]

کردار:

اس ناول کے تین اہم کردار ہیں جو ناول نگار کے تخیلاتی ہیں۔ تمام تر کہانی انہی کرداروں کے گرد گھومتی ہے اور تاریخ کے واقعات میں موجود خلا کو اس خوبی کے ساتھ ان کرداروں کے ذریعے پُر کیا گیا ہے کہ یہ تاریخی کردار معلوم ہوتے ہیں ان میں سب سے اہم کردار نعیم کا ہے جو ناول کا ہیرو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ناول نگار نے اس کا تعارف کچھ اس طرح کروایا کہ وہ مجاہدانہ اوصاف اپنے بزرگوں کے خون سے اپنے خون میں محسوس کر رہا تھا۔ ابتدائی تربیت سے فوجی تربیت تک اس کا کردار عام سا معلوم ہوتا ہے۔ گو کہ بچپن کا وہ زمانہ جب وہ عذرا کا ہاتھ پکڑ کر پانی میں اتر گیا اور پھر اس کے جرم کی سزا بڑے بھائی کو ملی۔ یہاں احساس ذمے داری نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے مگر بڑے بھائی کی شادی کے موقع پر اپنی محبت قربان ہوتے دیکھ کر اس کے کردار میں جو بے صبری آتی ہے وہ پایۂ لغزش معلوم ہوتی ہے کیونکہ ناول نگار نے ابتدائی طور پر نعیم کا جو کردار بنانے کی کوشش کی تھی وہ دورِ جوانی تک پہنچتے پہنچتے یوں ڈگر سے کیسے ہٹ گیا پھر نعیم کے کردار میں وہی ابتدائی پختگی، جواں مردی اور ہمت اس موقع پر نظر آتی ہے جب اسے ابنِ صادق کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ بظاہر زلیخا سے محبت ایک وقتی فیصلہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن فرار کے بعد خود اس کے ساتھ جانے کے بجائے ایک غلط فیصلہ تھا

۱۔ اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۷۴۹۔

۲۔ اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء: ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں، ص ۱۷۰۔

البتہ زلیخا کی موت نعیم کے دل میں اپنی جگہ بنا گئی مگر چند ہی دنوں کے بعد عذرا اور عبداللہ کی شادی کے موقع پر گھر سے باہر رہنا اور صبح کو عذرا سے ملے بغیر جانا ثابت قدمی نہیں بلکہ احساس شکست کا وہ پہلو ہے جو ایک مجاہد کو زیبا نہیں۔ نرگس کا ملنا اور شادی ہونا ایک دل پھینک عاشق کی طرح کا معاملہ نظر آتا ہے البتہ اس کے بعد بحیثیت ایک دوست اس کے کردار میں وہی مجاہدانہ اوصاف نظر آتے ہیں جو سلیمان کے دربار میں اس کی پیشی کے وقت دیکھے جا سکتے ہیں۔ ناول کے اختتام تک عذرا کی یاد کو دل سے لگائے رکھنا اور مجاہدانہ ذمے داریوں کو پورا کرنا کردار کے دو ایسے روپ ہیں جو بین بین ایک ساتھ چلے ضرور مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ البتہ نعیم کے مجاہدانہ اوصاف کے بارے میں ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے:

''ان کے کردار بچپن سے بڑھاپے تک کے مراحل طے کرتے آتے ہیں۔ کرداروں کا تعارف کرواتے ہوئے نسیم حجازی جن صفات کا ذکر کرتے ہیں یہ کردار بعد میں اس کے مطابق پورا بھی اترتے ہیں۔''[۱]

ناول کا دوسرا اہم کردار عذرا کا ہے۔ یہ ایک روایتی مشرقی نسوانیت کا پیکر معلوم ہوتی ہے۔ جس نے اطاعت و فرمانبرداری کو اپنے لیے فرض جانا اور حالات کو تقدیر کا فیصلہ۔ جیسی خود کی تربیت ہوئی ویسی ہی اپنی نسل کی کرنی چاہی۔ بظاہر کامیاب کردار، کہانی کی ضرورتوں کے عین مطابق ہے البتہ ناول کی ضرورتوں پر پورا نہیں اترتا۔ عشق و محبت محض تاثراتی جس کا کوئی بیان نہیں جس کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں اور پھر روایتی مشرقیت نے کردار کو مزید کمزور بنایا ہے۔ کہیں کہیں ناول نگار نے کچھ جان ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً تیراندازی میں مشغول دکھا کر اور عبداللہ کی آمد کے موقع پر بچے کے ساتھ لیٹے ہونے کے مناظر نے ناول کے اختتام پر نعیم اور عذرا کی خاموشی عذرا کے کردار کو مزید دبا دیتی ہے۔

تیسرا اہم کردار ابنِ صادق کا ہے۔ ناول کے اعتبار سے یہ وطن کا کردار ہے۔ خاصا جاندار ہے چالاکی، ہوشیاری اور عیاری اس میں جابجا موجود ہے۔ بہروپ بدلنے میں یہ طاق ہے یہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔ اس جیسے کردار ہر معاشرے میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ قاری کے لیے کراہیت کا باعث ہو مگر ناول کی دلچسپی کے لیے اس کی ضرورت اور اہمیت مسلم ہے۔ ابن صادق کا کردار ہر موقع پر بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ خاص طور پر ایران کے علاقے میں موجود غیر آباد قلعے میں اس کا کردار انتہائی نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے جبکہ وسط ایشیاء کے علاقے میں اپنی جان بچانے کے لیے اس نے جو طریقہ اختیار کیا۔ وہاں کردار نگاری اپنی کامیابی کی معراج تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر اس کا انجام انتہائی کمزور انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر اسے کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے سزائے موت دی جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔

ناول کے دیگر کردار اس قدر تاثراتی نہیں بلکہ ان میں سے بعض تو محض سطور تک محدود ہیں مثلاً یاسمین اور زبیر کا کردار جبکہ صابرہ اور سعید کے کردار کچھ حد تک ناول میں اپنی جگہ بناتے ہیں۔ اس کے برعکس عبداللہ اور نرگس کے کردار خاصی حد تک ناول میں اثر

---

[۱] اردو میں تاریخی ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۳۵۷۔

انگیزی کا باعث بنتے ہیں مگر وہ تاثر نہیں بنا پاتے جو نعیم، عذرا اور ابنِ صادق کے کردار بنا چکے ہیں۔ تاریخی کرداروں میں قتیبہ اور محمد بن قاسم کے کردار تاریخی ہیں اور خاصی حد تک تخیل کی کارفرمائی سے بچے ہوئے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ داستان مجاہد کے کردار ناول کے کرداروں کی طرح ڈھل گئے ہیں گو کہیں کہیں کوئی کمزوری موجود ہے تو یہ تو ہر ناول نگار کے یہاں مل جائے گی۔

مکالمے:

ناول کے پلاٹ اور کرداروں کے ساتھ ساتھ مکالمے بھی ناول کے فنی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں بڑے معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں کیونکہ ان کے ذریعے کرداروں کی شخصیت اور نفسیاتی پہلوؤں کو بہتر انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ داستان مجاہد کے مکالمے زبان و بیان کردار سے مطابقت اور تاثر قائم کرنے کے حوالے سے بہت جاندار ہیں۔ بعض موقعوں پر تو مکالموں کی ادائیگی ناول کو انتہائی ڈرامائی بنا دیتی ہے مثلاً ظہیر کے یاسمین سے رخصت ہوتے وقت کے مکالمے انتہائی جاندار ہیں۔ مثال کے طور پر:

''ظہیر کے سامنے یاسمین تھی، فقط یاسمین، حسن و لطافت کا پیکر، رنگ و بو کی دنیا۔ پھر اچانک اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہوگئی اور وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''یاسمین یہ فرض ہے۔''

''آقا مجھے معلوم ہے۔'' یاسمین نے جواب دیا۔

''میرے آنے تک حنیفہ تمہارا خیال رکھے گی۔ تم گھبرا تو نہ جاؤ گی۔''

''نہیں، آپ تسلی رکھیں۔''

''یاسمین مجھے مسکرا کر دکھاؤ۔ بہادر عورتیں ایسے موقع پر آنسو نہیں بہایا کرتیں۔ تم ایک مجاہد کی بیوی ہو۔''

شوہر کے حکم کی تعمیل میں یاسمین مسکرادی لیکن اس مسکراہٹ کے ساتھ ہی آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔

''آقا مجھے معاف کرنا۔'' اس نے جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''کاش میں نے بھی ایک عرب ماں کی گود میں پرورش پائی ہوتی۔'' یہ فقرہ ختم کرتے ہوئے انتہائی کرب کی حالت میں اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے بازو ایک بار پھر ظہیر کی طرف پھیلا دیے لیکن آنکھیں کھولنے پر معلوم ہوا کہ محبوب شوہر جا چکا ہے۔''[۱]

جبکہ زلیخا کی خودکشی اور موت کے قریب اس کے ادا کردہ مکالمے انتہائی تاثراتی ہیں ملاحظہ کیجیے:

''میں آپ کو اپنا سمجھتی ہوں لیکن آپ مجھ سے نزدیک بھی ہیں اور دور بھی۔''

زلیخا کے یہ الفاظ نعیم کے دل میں اتر گئے۔ اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ اس نے کہا ''زلیخا اگر تم مجھے اپنا بنانا چاہتی ہو تو اس کا ایک ہی

---

[۱] داستان مجاہد، نسیم حجازی، ص ۷۱۔

طریقہ ہے۔''

زلیخا کا ملول چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ مایوسی کی تاریکی میں مرجھائے ہوئے پھول اس امید کی روشنی کے تصور نے تروتازگی پیدا کر دی۔ اس نے بے قرار ہو کر پوچھا:

''بتایئے وہ کون سا راستہ ہے۔''

''زلیخا! میرے آقا کی غلامی قبول کر لو۔ پھر تم میں اور مجھ میں کوئی فاصلہ نہیں رہے گا۔''

''میں تیار ہوں لیکن آپ کا آقا مجھے اپنی غلامی میں لے لے گا؟''

''ہاں وہ بہت رحیم ہے۔''

''لیکن میں تو چند لمحات کے لیے زندہ ہوں۔''

''اس بات کے لیے طویل مدّت کی ضرورت نہیں زلیخا کہو!''

''کیا کہوں؟'' زلیخا نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

نعیم نے کلمہ شہادت پڑھا اور زلیخا نے اس کے الفاظ دہرا دیے۔ زلیخا نے پھر ایک بار پانی مانگا اور پینے کے بعد کہا۔ ''میں محسوس کرتی ہوں کہ میرے دل سے ایک بوجھ اتر چکا ہے۔''[۱]

ایسے بہت سے مواقع آئے جب مکالمہ نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ پلاٹ اور کردار نگاری کو اجاگر کرنے میں مکالمے بڑے کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ اعتراف کرتے ہیں:

''ان کے مکالموں سے ان کے کرداروں کی انفرادیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ مکالمے کرداروں کی شخصیت سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مکالموں کے ذریعے کرداروں کی نفسیاتی اور داخلی کشمکش کی کیفیت کو بڑی فنی مہارت سے ابھارا ہے۔ مکالموں سے ان کے کرداروں کی شخصیت کو تصوراتی تشکیل و تعمیر میں بڑی مدد ملی ہے۔''[۲]

منظر نگاری

داستان مجاہد میں منظر نگاری انتہائی پُر اثر اور دل نشیں ہے یہی وجہ ہے کہ قاری اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ خود اس کو اس کا حصہ سمجھتا ہے ورنہ کم از کم اس منظر کو محسوس ضرور کر لیتا ہے مثلاً جب نعیم، زلیخا کے قافلے سے مل جانے کے لیے رواں دواں تھا تو اسے ایک دلدوز منظر نے ٹھہرالیا اس مقام پر منظر نگاری انتہائی عروج پر نظر آتی ہے۔ ناول کی تحریر کے مطابق:

'' راستے میں ایک عجیب و غریب منظر دیکھ کر اس کے خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ ریت پر چند گھوڑوں اور انسانوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بعض ابھی تک تڑپ رہے تھے۔ نعیم نے گھوڑے سے اُتر کر دیکھا تو معلوم ہوا ان میں سے بعض

۱۔ داستان مجاہد: نسیم حجازی، ص ۱۱۳، ۱۱۴۔

۲۔ اردو میں تاریخ ناول نگاری: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۲۵۶۔

ابھی تک تڑپ رہے تھے۔ ان میں سے بعض وہ تھے جنھیں اس نے زلیخا کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ اس وقت نعیم کے دل میں پہلا خیال زلیخا کا تھا۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا ایک زخمی نے پانی مانگا۔ نعیم نے جلدی سے گھوڑے پر سے چھاگل کھول کر پانی پلایا۔ وہ اپنے دھڑکتے دل کو ایک ہاتھ سے دبا کر پوچھنے کو تھا کہ زخمی نے ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کیا اور کہا:

''ہمیں افسوس ہے کہ ہم اپنا فرض پورا نہ کر سکے۔ ہم آپ کے حکم کے مطابق اپنی جانیں بچانے کے بجائے ان کی جان کی حفاظت کے لیے آخر دم تک لڑتے رہے لیکن وہ بہت زیادہ تھے۔ آپ ان کی خبر لیں!''

یہ کہہ کر اس نے پھر اپنے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ نعیم جلدی سے اس طرف بڑھا۔ چند لاشوں کے درمیان زلیخا کو دیکھ کر اس کا دل کانپنے لگا۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ وہ مجاہد جو آج تک نازک سے نازک صورت حالات کا مقابلہ نہایت خندہ پیشانی سے کرنے کا عادی تھی یہ ہیبت ناک منظر دیکھ کر کانپ اٹھا۔

''زلیخا! زلیخا! تم۔۔۔۔۔۔!''

زلیخا میں ابھی کچھ سانس باقی تھے۔ ''آپ آگئے؟'' اس نے نحیف آواز میں کہا۔''[۱]

اس کے علاوہ شادی کے بعد عبداللہ کا عذرا سے رخصت ہونا عرب کی مروجہ روایات کے عین مطابق منظر نگاری کی اعلیٰ مثال قرار دی جا سکتی ہے۔ والیٔ اسپین کے دربار میں نعیم اور ابنِ صادق کی ملاقات کا منظر بھی ایک تاثراتی کیفیت پیش کرتا ہے۔

ناول نگار نے اس منظر کو کہ جب نعیم، ابن صادق اور گورنر کی گفتگو تلخ کلامی میں بدل گئی یوں پیش کیا ہے:

''ابنِ صادق نے کہا۔'' آپ فوراً اسے گرفتار کر لیں اور آج ہی میری عدالت میں پیش کریں۔''

''میں ایک سالار کو کسی ثبوت کے بغیر گرفتار نہیں کر سکتا۔ آپ ایک دوسرے کے ساتھ پہلی ہی ملاقات میں اس طرح آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے درمیان کوئی پرانی رنجش ہے اور اس صورت میں اگر یہ مجرم بھی ہوں تو بھی میں ان کا مقدمہ آپ کے سپرد نہیں کروں گا۔''

''آپ کو معلوم ہے کہ میں اسپین کا عامل ہوں۔''

''ٹھیک۔ لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ میں اسپین کے مفتیِ اعظم کے علاوہ اور کچھ بھی ہوں۔''

نعیم نے کہا۔'' یہ نہیں جانتے میں بتا دیتا ہوں۔ آپ امیر المومنین کے دوست قتیبہؒ بن مسلم، محمدؒ بن قاسم، اور ابنِ عامرؒ کے قاتل ہیں۔ ترکستان کی بغاوت آپ کی کرم فرمائی کا نتیجہ تھی اور آپ وہ سفاک انسان ہیں جس نے اپنے بھائی اور بھتیجی کے قتل سے بھی دریغ نہیں کیا لیکن اس وقت آپ میرے مجرم ہیں۔'' یہ کہہ کر نعیم نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ نیام سے تلوار نکالی اور اس کی نوک ابنِ صادق کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔'' میں نے تمھیں بہت تلاش کیا لیکن تم نہ ملے آج قدرت خود ہی تمھیں یہاں لے آئی تم امیر المومنین کے

---

[۱] داستان مجاہد، نسیم حجازی، ص ۱۱۱، ۱۱۲۔

دوست ہو انہیں تمھارے اس انجام سے صدمہ تو بہت ہوگا لیکن اسلام کا مستقبل مجھے خلیفہ کی خوشی سے زیادہ عزیز ہے۔'' یہ کہہ کر نعیم نے تلوار اوپر اٹھائی۔ ابنِ صادق بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ موت سر پر دیکھ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ نعیم نے یہ حالت دیکھ کر تلوار نیچے کر لی اور کہا۔ ''اس تلوار سے میں سندھ اور ترکستان کے مغرور شہزادوں کی گردنیں اڑا چکا ہوں۔ میں اسے تم ایسے ذلیل اور بزدل انسان کے خون سے تر نہیں کروں گا۔'' نعیم نے تلوار نیام میں ڈال لی اور کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

ایک فوجی افسر کی مداخلت نے اس سکوت کو توڑا۔ اس نے آتے ہی والیٔ سپین کی خدمت میں ایک خط پیش کیا۔ والیٔ اسپین نے جلدی سے خط کھولا اور دو تین مرتبہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پڑھنے کے بعد نعیم کی طرف دیکھا اور کہا:

''آپ کا نام زبیر نہیں نعیم ہے تو اس خط میں آپ کے متعلق بھی کچھ ارشاد ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے نعیم کی طرف خط بڑھا دیا۔ نعیم نے خط پڑھنا شروع کیا۔

یہ خط امیر المومنین عمرؒ بن عبدالعزیز کی طرف سے تھا۔ والیٔ اسپین نے تالی بجائی۔ چند سپاہی نمودار ہوئے۔

''اسے گرفتار کرلو!'' اُس نے ابنِ صادق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ابنِ صادق کو وہم تک بھی نہیں تھا کہ اس کے مقدر کا ستارہ طلوع ہوتے ہی سیاہ بادلوں میں چھپ جائے گا۔''[1]

پرتگال سے اپنے گھر تک کا سفر اور نعیم کی راہ میں رکاوٹیں، طوفان وغیرہ منظر نگاری کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔

---

[1] داستان مجاہد، نسیم حجازی، ص ۲۲۹، ۲۳۰۔

محمد بن قاسم کا تنقیدی جائزہ

محمد بن قاسم:

اس سے قبل محمد بن قاسم کا خلاصہ اور تحقیقی تجزیہ پیش کیا جا چکا ہے۔ جہاں ہم نے کہانی، اس کی نوعیت اور تاریخی اعتبار سے حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔ اب فنی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے پلاٹ، کردار، منظر نگاری اور مکالموں پر تبصرہ کرتے ہیں۔

پلاٹ:

محمد بن قاسم کا پلاٹ سادہ، دلچسپ مگر مربوط ہے۔ قاری کی دلچسپی کی خاطر کہانی میں اتار چڑھاؤ اور تجسس پیدا کیا گیا تا کہ انہماک برقرار رہ سکے۔ نسیم حجازی نے ناول کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس سہولت کی وجہ موضوع کی وسعت ہو سکتی ہے۔ پہلے حصے کو ذیلی موضوعات اور دوسرے حصے کو ۱۲ موضوعات میں تقسیم کیا گیا ہے پلاٹ کو قاری کی دلچسپی کے پیش نظر کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ اسلام کے عظیم سپہ سالار محمد بن قاسم کو سندھ پر حملہ آور ہونے کے لیے ایسا ماحول فراہم کیا گیا جس کی ضرورت تھی۔ سراندیپ کے ساحلوں پر عرب تاجروں کی بستی میں سلمیٰ کے کردار کو اس طرح اجاگر کیا گیا کہ مقامی ماحول اور عربی روایات کو انفرادیت کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔ کہانی کو دلچسپ بنانے کے لیے اسلام کے نور کو پھیلنے کا موقع دینے اور دنیا سے متعارف کرواتے دکھایا گیا ہے۔ ابوالحسن کے جہاز کی آمد اور سراندیپ کے راجا کا اسلامی حکومت سے تعلقات استوار کرنا اور دیگر فنگی کے واقعات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ دائرہ اسلام میں آنے کے بعد سلمیٰ اور ابوالحسن کی شادی اس کہانی میں عشق و محبت کو پروان چڑھاتی ہے۔ تخیلاتی کرداروں کے ساتھ ساتھ تاریخی حالات بھی بین بین چلتے ہیں۔ ابوالحسن کی روانگی اور اس کا لاپتا ہو جانا ایک معمہ ضرور تھا مگر کہانی کو تجسس آمیز بنانے کے لیے عرب خاندانوں کے قافلے کا روانہ ہونا اور سراندیپ کے راجا کے بھیجے ہوئے تحائف اور حفاظتی جہازوں کی روانگی پلاٹ کا ایسا کامیاب منظر ہے کہ قاری ناول نگار کے قلم سے لکھی ہوئی تحریر کے بجائے تصویروں کو دیکھتا ہے۔ دیبل کے مقام پر جہازوں کا لٹ جانا، مسافروں کا قیدی بن جانا تاریخی حقائق اور مسلمان حملہ آوروں کی آمد کا باعث ضرور ہے مگر نسیم حجازی کی چابکدستی قاری کو ذہنی طور پر اس طرح تیار کرتی ہے کہ وہ بھی یہی چاہتا ہے۔

ناول کے دوسرے حصے کا پہلا موضوع حجاج کے دربار میں عرب کی اس بیٹی کی پکار کی گونج سے ہوتا ہے کہ جب زبیر کے توسط سے تمام حالات اس کے علم میں آتے ہیں۔ اس دوران حجاج، قتیبہ کے ایک کم سن سالار سے طنزیہ گفتگو کرتا دکھایا گیا ہے لیکن بہت جلد جنگی حکمت عملی سے متاثر ہو کر فوجی مشیر کی حیثیت سے دمشق بھجوانا چاہتا ہے مگر سندھ کے حالات ایک نئے محاذ جنگ کو کھولنے کے لیے گدگداتے ہیں۔ اپنی بیٹی سے ابنِ قاسم کی شادی کرنے کے بعد اسے زبیر کے ہمراہ دمشق روانہ کرتا ہے۔ اگلے موضوع میں محمد بن قاسم اور زبیر دربارِ خلافت میں پیش ہو کر خلیفہ اور دیگر مقتدر شخصیات کو سندھ پر حملہ کرنے کے لیے اصولی طور پر تیار کر چکے تھے۔ اسی دوران ایک حربی نمائش میں ان دونوں کی شرکت کا فیصلہ کیا گیا تا کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر عوام الناس کو جہاد میں شرکت پر آمادہ کیا جا سکے۔

تیسرے موضوع میں حربی نمائش میں تیراندازی، شمشیرزنی اور نیزہ بازی و دیگر مقابلوں میں عوام کی دلچسپی اپنے عروج پر تھی۔ شمشیرزنی کے مقابلے میں صالح کو زبیر کے ہاتھوں شکست کا سامنا ہوا تو ولی عہد سلیمان محمد بن قاسم سے نیزہ بازی کے مقابلے میں ناکام رہا نوجوانوں کا جوش وخروش اپنے ہم عمروں کی کامیابی کو دیکھ کر بامِ عروج پر تھا خلیفہ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر زبیر کو سندھ کے حالات اور عرب کی اس بیٹی کا خط سنانے کا مشورہ دیا جس کے نتیجے میں لوگ جہاد میں شرکت پر جوق در جوق شامل ہونے لگے۔ مختصر فوجی تربیت کے بعد یہ قافلہ بصرہ کی طرف روانہ ہوا۔ چوتھے موضوع میں دمشق سے فوج کی روانگی اور پھر بصرے سے مزید مجاہدین کی شمولیت کے ساتھ یہ قافلہ شیراز کے راستے ہوتا ہوا مکران پہنچا۔ جہاں اسے اطلاع ملی کہ دیبل کے راستے ہی میں اسلامی افواج کو روکنے کے لیے بھیم سنگھ بارہ ہزار افواج کے ساتھ مقابلے کا منتظر ہے۔ جنگی حکمت عملی تیار ہوئی اور فوج کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد پہلے قلعے کو فتح کیا گیا اور پھر فوج سے مقابلہ کیا گیا جو مسلمانوں کی کامیابی پر منتج ہوا۔ اگلا موضوع زخمیوں کی تیمارداری اور ان کے ساتھ حسن سلوک پر مشتمل ہے اسی دوران زبیر اور ناصرالدین کا نکاح ہوا اور پھر اسلامی فوج کے سلوک سے متاثر ہو کر بھیم سنگھ راجا داہر کو حقیقت حال سے آگاہ کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ چھٹے موضوع کا عنوان صبح کا ستارہ ہے۔ ناول نگار کی انتہائی دلچسپی اور رقت انگیزی ان جملوں پر محیط ہے جو محمد بن قاسم دیبل کے محاذ پر صبح کے ستارے کو دیکھ کر ادا کرتا ہے کہ ''میری زندگی اس ستارے کی مانند ہے جو نئے دن کا پیغام اور امید کا استعارہ ہے۔ مگر افسوس اس کا دورانیہ بہت کم ہے۔'' دیبل کی فتح اور اہلیانِ دیبل کے ساتھ بہترین برتاؤ بہت سے لوگوں کو دائرہ اسلام میں لانے کا باعث ہوا اور یوں اسلامی افواج تعداد میں اضافے کے ساتھ آگے کی جانب روانہ ہوئیں۔ ساتویں موضوع میں دیبل اور برہمن آباد کے درمیان محمد بن قاسم کی کامیابیوں کا تذکرہ ہے البتہ اسی دوران بھیم سنگھ کا راجا داہر کے دربار میں پہنچنا اور حقیقت حال سے اسے آگاہ کرنا اس کے مصائب میں مزید اضافے کا باعث بنا اسے اور اس کے باپ کو ایک زمین دوز کوٹھری میں قید کر دیا گیا جہاں ابوالحسن بھی موجود تھا۔ اگلے موضوع میں اسلامی افواج کا دریائے سندھ عبور کرنا اور راجا داہر کا عظیم الشان فوجی تیاری کے ساتھ مقابلے میں آنا دکھایا گیا ہے۔ میدانِ جنگ میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی راجا داہر مردانہ وار لڑتا ہوا مارا گیا اور ایک کثیر تعداد میں اس کے فوجی بھی قتل ہوئے۔ باقی افواج نے فرار میں مصلحت جانی۔ اس موقع پر سعد عرف منگو کا شدید گھائل ہو جانا اور بھیم سنگھ کا زخمی حالت میں ابوالحسن کے ہمراہ پہنچ جانا قاری کو ناول کی گہرائیوں میں انہماک کے ساتھ شامل رکھنے کا باعث کہا جا سکتا ہے پھر محمد بن قاسم زہرہ اور ناہید کو بھی بلوا لیتا ہے مگر ابوالحسن جانبر نہیں ہوتا۔ نویں موضوع میں اسلامی افواج کی برہمن آباد میں آمد اور محل پر قبضے کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔ اس دوران لاڈھی رانی کا ارور میں اپنے بیٹے کی جاں بخشی کا پیمان حاصل کرنا اور خود ارور جا کر اسے سمجھانا اور ناکام رہنا بیان کیا گیا ہے۔ اسلامی افواج کی ارور پہنچنے کی اطلاع سندھ کی افواج میں بھگدڑ کا باعث بنی۔ خود راجا داہر کا بیٹا بھی فرار ہوا اور اسلامی افواج سندھ کے آخری سرے ملتان کی طرف روانہ ہوئیں۔ دسویں موضوع میں قاری کا انہماک معراج کی بلندیوں کو چھونے لگتا ہے کیونکہ ملتان کی فتح کے بعد ابنِ قاسم کا ارور واپس آنا جہاں پہلے حجاج اور پھر ولید کی موت کی خبر کا ملنا اور سلیمان کا بحیثیت امیر نامزدگی

دکھائی گئی ہے اور پھر وہی ہوا جس کا خوف قاری کے دل میں بہت پہلے سے پروان چڑھ رہا تھا۔سلیمان امارت حاصل کرتے ہی محمد بن قاسم کی برطرفی کے احکامات صادر کرتا ہے جنہیں وصول کرنے کے بعد ابنِ قاسم اطاعتِ امیر کا ثبوت دینے اور سندھ کے عوام اسے عتاب سے بچانے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے سردار اور مذہبی رہنما نئے حاکم یزید بن ابو کبشہ سے ملاقات کر کے بظاہر مطمئن ہو جاتے ہیں۔اگلے موضوع میں وہ سفارتی کوششیں دکھائی گئی ہیں جو محمد بن قاسم کی جان بچانے کے لیے ممکن ہو سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ اسے یہیں رہنے کی پیش کش کی گئی مگر اس نے اس موقع پر بھی دعوت وتبلیغ کا کام جاری رکھا اور خود کو ایک مطیع و فرمانبردار شخص ثابت کیا بالآخر سندھ کا یہ ستارہ دوپہر کے وقت دمشق کے لیے روانہ ہوا۔ بارھویں اور آخری موضوع میں انتہائی تجسس اور رقت انگیزی قاری پر طاری ہو جاتی ہے وہ پڑھنے سے زیادہ خود کو ناول کا ایک حصہ سمجھتا ہے اس کی تمام تر جذباتی وابستگی اور ہمدردی محمد بن قاسم کے ساتھ ہوتی ہے کیونکہ ناول نگار نے اپنے پلاٹ کا اختتام اس قدر کامیاب طریقے سے کیا ہے کہ بعض چھوٹی موٹی خامیاں چھپ کر رہ گئیں ہیں محمد بن قاسم کا روانہ ہونا بصرے کے قریب فرار کے بجائے محدود اجازت حاصل کرنا۔ اپنی بیوی سے ملاقات کرنا اور پھر قید خانے میں چلے جانا جبکہ دوسری طرف زبیر مدینہ اور پھر دمشق کا سفر کرتا ہے اور پھر ایک ناممکن اور لا حاصل مقصد کی تکمیل کے لیے اپنا سکون چین قربان کر دیتا ہے۔موت کے پروانے کی منسوخی حاصل تو کرتا ہے مگر اس وقت تک اہلیان شہر ابنِ قاسم کا جنازہ اپنے کاندھوں پر لیے جا رہے تھے۔ ناول بظاہر ختم ہو جاتا ہے مگر قاری کا غور وخوض ختم نہیں ہوتا۔ یہی وہ کامیابی ہے جو پلاٹ میں ہونی چاہیے اور جسے نسیم حجازی نے برقرار رکھا ہے۔اسی لیے ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ معترف ہیں کہ:

''نسیم حجازی کے ناولوں کے پلاٹ سیدھے سادے ہوتے ہیں لیکن نسیم حجازی کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ نہایت ہنرمندی اور فنکارانہ مہارت سے اسے دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں اس کے لیے وہ تجسس کا حربہ بھی استعمال کرتے ہیں۔''[1]

یہی سب کچھ محمد بن قاسم کے پلاٹ میں موجود ہے۔ البتہ نسیم حجازی کا خطیبانہ ڈھنگ جو طوالت پر مبنی ہوتا ہے پلاٹ کو کچھ کمزور بناتا ہے۔مثلاً مکران کے بعد اپنی افواج سے خطاب اور ایسے ہی دوسرے مواقع پر موجود تقاریر پلاٹ میں جھول پیدا کرتی ہیں بعض اوقات بہت چھوٹے مگر انتہائی پراثر جملے بھی استعمال ہوتے ہیں جو اس جھول کو کم کر دیتے ہیں مثلاً دیبل کے محاذ پر صبح کے ستارے کو منظر دیکھ کر جو جملے ادا کیے گئے اس کی بازگشت ناول کے اختتام تک قاری کو مسحور رکھتی ہے پھر زبیر کا مسلسل سفر کی کیفیت میں نہر کے کنارے ٹھنڈی چھاؤں میں سونے کی خواہش کرنے والے جملے انتہائی پُراثر ہیں جو پلاٹ کو استحکام بخشتے ہیں۔

کردار:

اس ناول کے دو اہم ترین کردار ناہید اور زبیر ہیں۔ ناہید کا کردار ناول کا بنیادی اور اہم ترین کردار ہے۔ کہانی کا تانا بانا اسی کردار کے گرد بُنا گیا ہے اور اس تمام تر تاریخی واقعہ کی ذمے داری اسی کردار پر ہے جس کی بدولت مسلمان سندھ پر حملہ آور ہوئے

---

[1] اردو میں تاریخی ناول،ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ،ص ۳۴۸ ۔

جرات مندی، دلیری اور شجاعت کا پیکر یہ کردار تمام تر نسوانی خوبیوں کے باوجود مجاہدانہ صفات سے آراستہ ہے۔ البتہ عشق ومحبت میں اس کا انداز بھی مشرقی ہے اور چونکہ ناول تاریخ اسلام کے واقعات کو مربوط کر کے مرتب کیا گیا ہے۔ اس لیے اسلامی حمیت، احکامات خداوندی کی پابندی مثلاً حجاب وغیرہ اس کردار میں سرایت کر گئے ہیں ناول کے مکمل مطالعے میں اس کردار میں کسی قسم کا جھول سامنے نہیں آتا زبیر کا کردار حجازی روایات کا امین اور اسلامی اقدار کا پیکر کہا جا سکتا ہے۔ اس کی جواں مردی اور شجاعت روایتی ہے۔ عشق و محبت کے اظہار میں وہ بھی مشرقی انداز کو بالاتر رکھتا ہے۔ اپنے کردار کو اجاگر کرنے اور بہترین انداز میں زبیر کو پیش کرنے میں ناول نگار خاصی حد تک کامیاب ہے۔ اپنے حبیب سے انتہائی محبت کے اظہار کے لیے سندھ سے مدینہ، پھر دمشق اور واسط کا سفر کرنا اس کردار کو ناول میں انتہائی اجاگر کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ ناول کا ایک اور کردار ابوالحسن ہے جو سراندیپ میں اسلام کی روشنی پھیلانے کے ساتھ ساتھ ناول کے تقریباً پہلے حصے پر چھایا ہوا ہے اور دوسرے حصے میں بھی بہت مختصر وقت کے لیے ہی سہی اس کی موجودگی اس کردار کو دوبالا کرتی ہے۔ صالح اور سلیمان کے کردار خود پسند اور منتقم مزاج دکھائے گئے ہیں۔ ناول نگار نے محمد بن قاسم کو موت کی سزا دلوانے کے لیے جو جواز تراشے ہیں وہ ان دونوں کرداروں کو منفرد بناتے ہیں اور قاری ان دونوں کرداروں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھتا۔ ناول کا اہم ترین کردار محمد بن قاسم جس کا تعارف ناول نگار نے انتہائی حیرت واستعجاب کے عالم میں کرایا ہے لیکن ناول کے اختتام تک اس کردار کو اس قدر متحرک، اطاعت گزار اور فرمانبردار دکھایا ہے جو ذاتی خواہشات پر اجتماعی ذمے داریوں کو فوقیت دیتا ہو۔ کردار ابنِ قاسم انتہائی موثر ہے۔ قاری کی دھڑکنیں اس کے قدموں کے ساتھ چلتی ہیں اور وہ ہمدردیاں بھی حاصل کرتا ہے۔ ناصر الدین اور زہرہ کا کردار ناول کی ضرورتوں کے عین مطابق ہے اور منگو کے کردار نے ناول کو اور بالخصوص کردار نگاری کو بڑی تقویت دی ہے۔ ناول محمد بن قاسم ایک ضخیم ناول ہے اور اس میں بہت سے چھوٹے بڑے کردار ہیں جو ناول میں کسی خاص موقع کی مناسبت سے آئے ہیں اور ان کا اپنا ایک مقام ہے۔ کسی کردار کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ زائد ہے۔ اس لیے ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں رقمطراز ہیں:

''قاری کو اگرچہ محمد بن قاسم کا انجام پہلے سے معلوم ہوتا ہے لیکن مصنف نے جس طریقے سے اس واقعے کو پیش کیا ہے، اس سے اس ٹریجڈی کا اثر دوچند ہو گیا ہے۔''[۱]

لیکن بڑے تاریخی کرداروں کے حوالے سے وہ اعتراض کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''حجاج بن یوسف اور محمد بن قاسم دونوں تاریخ کی عظیم شخصیتیں ہیں۔ اس قسم کی شخصیتوں کی تصویر کشی اور ان کے مکالمے وغیرہ اس قسم کے ہونے چاہیے کہ ان کی خوبیاں اور خامیاں تو واضح ہوں لیکن کسی قسم کا چھوٹا پن نہ ظاہر ہونا چاہیے۔ اپنی تمام خامیوں کے باوجود ان کرداروں کو تاریخی اعتبار سے مرعوب کن ہونا چاہیے۔ حجاج بن یوسف کا کردار قاری پر کوئی تاثر نہیں چھوڑتا ہے۔''[۲]

۱۔ اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء، ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں، ص ۳۰۲۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۰۷، ۳۰۸۔

ہمیں نزہت سمیع الزماں کی اس رائے سے اختلاف ہے کیونکہ حجاج بن یوسف کے کردار کو اس قدر بارعب بنایا گیا ہے کہ سلیمان اور صالح کو اس کی زندگی میں اس کے خلاف حرف شکایت زبان پر لانے کی جرأت نہ ہو سکی تھی۔ مزید یہ کہ دیبل کے محاذ پر گنبد اور پھریرے کو زمین دوز کرنے کے لیے حجاج کی آخری ہدایات بھی کارآمد ثابت ہوئیں۔

مکالمے:

ناول کے مکالمے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں جہاں کردار اجاگر ہوتے ہیں وہیں ناول میں تاثر اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔ قاری کو یہی مکالمے یاد رہ جاتے ہیں۔ مثلاً ابوالحسن کے جہاز کی آمد کے موقع پر ابوالحسن اور سلمیٰ کے درمیان جو مکالمے ادا ہوئے ناول نگار نے انہیں یوں رقم کیا ہے:

''ابوالحسن نے پوچھا۔'' کیا تم عرب ہو؟''

لڑکی نے ایک طرف سر جھکا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بالوں کا پانی نچوڑتے ہوئے جواب دیا۔'' ہاں! میں عرب ہوں، ایک مدت سے ہم عربوں کے جہاز کی راہ دیکھا کرتے تھے۔ میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ آپ کیا مال لائے ہیں؟''

ایک عرب لڑکی کو اس لباس میں دیکھنا ابوالحسن اور اس کے ساتھیوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

لڑکی نے اپنے سوال کا جواب نہ پا کر پھر پوچھا،'' میں پوچھتی ہوں آپ کیا مال لائے ہیں؟ آپ حیران کیوں ہیں کیا عرب عورتیں تیرنا نہیں جانتیں۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ اچھا میں خود دیکھ لیتی ہوں۔''

ابوالحسن نے کہا۔'' ٹھہرو ہم گھوڑے لائے ہیں میں تمھیں خود دکھاتا ہوں لیکن میں حیران ہوں کہ اس جزیرے کے عرب ابھی تک زمانہ جاہلیت کے عربوں سے بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا انھیں انسانوں کا سا لباس پہننا اور مردوں سے حیا کرنا کسی نے نہیں سکھایا؟''

لڑکی کا چہرہ غصے سرخ ہو گیا۔ اس نے جواب دیا۔'' کیا یہ انسانوں کا لباس نہیں؟''

''نہیں! معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے گھر تک اسلام کی روشنی ابھی تک نہیں آئی۔'' یہ کہہ کر ابوالحسن نے ایک جبہ اٹھایا اور لڑکی کے کندھوں پر ڈال کر بولا۔'' اب تم ہمارا جہاز دیکھ سکتی ہو۔''[1]

اور پھر ابوالحسن کی دوبارہ آمد کے موقع پر عشق کی جلتی ہوئی آگ اور ہجر کے گزرے ہوئے لمحات، شادی اور اس موقع پر ادا ہونے والے مکالمات اور سب سے جاندار محمد بن قاسم کا وہ مکالمہ جو اس نے دیبل کے محاذ پر ادا کیا اور زبیر کے وہ مکالمے جو اس نے دمشق اور واسط کے درمیان سفر کے دوران ادا کیے ناقابلِ فراموش ہیں۔ محمد بن قاسم کے ادا کردہ مکالمے تو اس قدر پر اثر ہیں کہ ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں ان پر رائے دیتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

---

[1] محمد بن قاسم، نسیم حجازی، ص ۱۵۔

''ناول نگار نے جا بجا محمد بن قاسم کے کردار کے متعلق اشاریت اور ایمائیت سے کام لیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ پر سندھ میں اپنی فتوحات کے دوران محمد اپنے دوست سے کہتا ہے ''زبیر مجھے اس ستارے کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ اس کی زندگی جس قدر مختصر ہے اسی قدر اس کا مفہوم بڑا ہے۔ دیکھو یہ دنیا سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے میری عارضی زندگی پر اظہار تاسف نہ کرو۔ قدرت نے مجھے سورج کا ایلچی بنا کر بھیجا تھا اور میں اپنا فرض پورا کر کے جا رہا ہوں کاش میں بھی اس ملک میں آفتاب اسلام کے طلوع سے پہلے صبح کے ستارے کا فرض ادا کر سکوں۔''[۱]

منظر نگاری:

ناول میں منظر نگاری کو خاصی توجہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جا بجا ایسے مناظر پیش کیے گئے ہیں جو حقیقت اور قیاس کے مطابق ہیں مثلاً سراندیپ کے جس زرخیز علاقے کی منظر کشی کی گئی ہے وہ سری لنکا کے موجودہ جغرافیائی حالات کے عین مطابق ہے۔ اس کے بعد عرب تاجروں کے جہاز کی آمد پر ایک عرب لڑکی کا پانی میں غوطے لگانے کا جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ اکثر سمندر پر غوطہ خوروں کی مشاقی کا آئینہ دار ہے اور منظر کشی کا بہترین نمونہ ہے۔ ناول نگار کے الفاظ میں اس منظر کو ملاحظہ کیجیے۔

''بندرگارہ کے قریب، عورتیں اور بچے کشتیوں پر سوار ہو کر اور چند تیرتے ہوئے لوگ جہاز کے استقبال کو نکلے۔ ایک کشتی پر ابوالحسن کو جزیرے کی سیاہ فام اور نیم عریاں عورتوں کے درمیان ایک اجنبی صورت دکھائی دی۔ اس کا رنگ سرخ، سفید اور شکل وصورت جزیرے کے باشندوں سے بہت مختلف تھی۔ دوسری کشتیوں سے پہلے جہاز کے قریب پہنچنے کے لیے وہ اپنی کشتی پر کھڑی دو تنومند ملاحوں کو جو کشتی کے چپو چلا رہے تھے ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی۔

یہ کشتی تمام کشتیوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی جہاز کے ساتھ آ لگی۔ لڑکی نے ابوالحسن کی طرف دیکھا اور اس نے بیباک نگاہوں کو جواب دینے کے بجائے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ابوالحسن کے ساتھیوں کو بھی عورتوں کا نیم عریاں لباس پسند نہ آیا۔ حسین لڑکی نے جہاز والوں کی بے اعتنائی کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے سراندیپ کی زبان میں کچھ کہا لیکن جہاز پر سے کوئی جواب نہ آیا۔

اچانک ابوالحسن نے کسی کی چیخ پکار سن کر نیچے دیکھا۔ کشتی سے آٹھ دس گز کے فاصلے پر وہی خوبصورت لڑکی پانی میں غوطے کھا رہی تھی اور کشتی والے اس کی چیخ پکار کے باوجود سخت بے اعتنائی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ابوالحسن نے پہلے رسی کی سیڑھی پھینکی لیکن جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ لڑکی کے ہاتھ پاؤں جواب دے رہے ہیں اور وہ سیڑھی تک نہیں پہنچ سکتی تو وہ کپڑوں سمیت سمندر میں کود پڑا لیکن لڑکی اچانک پانی میں غائب ہو گئی اور وہ پریشان ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں بہت سی کشتیاں جہاز کے گرد جمع ہو چکی تھیں اور جزیرے کے باشندے قہقہے لگا رہے تھے۔

ابوالحسن نے تین مرتبہ غوطہ لگانے کے بعد دلبرداشتہ ہو کر سیڑھی کی رسی پکڑ لی اور جہاز پر چڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اوپر سے

---

[۱] اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء، ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں، ص ۳۰۵۔

اس کا ساتھی چلانے لگا۔ ''وہ ادھر ہے، جہاز کے دوسری طرف۔ وہ ڈوب رہی ہے۔ شاید کسی مچھلی نے پکڑ رکھا ہے۔''

مقامی مردوں اور عورتوں نے پھر قہقہہ لگایا۔ ابوالحسن لڑکی کے جہاز کی دوسری طرف پہنچنے کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ تشویش اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس نے جلدی سے پھر غوطہ لگایا اور جہاز کے نیچے سے گزرتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا، اوپر سے اس کا وہی ساتھی شور مچا رہا تھا:

''وہ ڈوب گئی۔ اسے مچھلی نگل گئی۔''

ابوالحسن مایوس ہو کر پھر دوسری طرف پہنچا۔ اس دفعہ لوگوں کے قہقہوں میں اس کے ساتھی بھی شریک تھے اور ایک عرب نے کہا۔ ''آپ آ جائیے! وہ آپ سے بہتر تیر سکتی ہے۔''

ابوالحسن نے کھسیانہ ہو کر سیڑھی پکڑ لی لیکن ابھی ایک ہی پاؤں اُوپر رکھا تھا کہ کسی نے اس کی ٹانگ پکڑ کر پانی میں گرا دیا۔ اس نے سنبھل کر اِدھر اُدھر دیکھا تو لڑکی تیزی سے سیڑھی پر چڑھ رہی تھی۔

ابوالحسن جہاز پر پہنچا تو اس کے ساتھی پریشان سے ہو کر جزیرے کی لڑکی کے قہقہے سن رہے تھے۔۔۔۔۔''[1]

حجاج اور محمد بن قاسم کی ملاقات کا منظر بھی انتہائی دلچسپ ہے جبکہ اہلیان سندھ کا محمد بن قاسم سے والہانہ عقیدت کا اظہار اور اس کا مجسمہ تراشنے کا منظر کیفیت کے عین مطابق اور ناول کی رعنائی کو برقرار رکھنے کا باعث ہے۔ اسی طرح محمد بن قاسم کا اپنی بیوی سے ملاقات کا آخری منظر قاری کے لیے انتہائی رقت انگیز اور صبر آزما کیفیت کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ زبیر کا طویل اور تھکا دینے والا سفر اور بالخصوص واسط کے شہر میں داخل ہونے کے بعد جنازہ دیکھ کر بے ہوش ہو جانے کا موقع منظر کشی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ مثلاً:

''شہر کے مغربی دروازے پر آدمیوں کا ہجوم دیکھ کر زبیر نے گھوڑے کی باگ کھینچی اور چند نوجوانوں کے کندھوں پر کسی کا جنازہ دیکھ کر اتر پڑا۔ ٹانگوں میں اس کا بوجھ سہارنے کی طاقت نہ تھی۔ پھر بھی اس نے ہمت کر کے ایک عرب سے پوچھا۔ ''صالح کہاں رہتا ہے؟''

عرب نے سوال کیا۔ ''خلیفہ نے اب کس کے قتل کا حکم بھیجا ہے؟''

زبیر نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے عرب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

''یہ جنازہ کس کا ہے؟''

عرب نے جواب میں کہا۔ ''تم نے فاتح سندھ کا نام سنا ہے؟''

زبیر کے ہاتھوں سے گھوڑے کی باگ چھوٹ گئی اور لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک نوجوان ''زبیر! زبیر!'' کہتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے قریب بیٹھ کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ درد بھری آواز میں کہہ رہا تھا ''زبیر اُٹھو۔ جلدی کرو۔ عمادالدین محمدؒ بن قاسم کا جنازہ جا رہا ہے۔''

---

[1] محمد بن قاسم، نسیم حجازی، ص ۳۹۷، ۳۹۸۔

زبیر بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا۔ ''محمدؒ! میں اب سو جانا چاہتا ہوں۔۔۔کسی ندی کے کنارے۔۔۔کسی درخت کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں۔۔۔اور جب تک میں خود نہ اٹھوں مجھے جگانا مت۔۔۔۔۔۔'' [1]

---

[1] محمد بن قاسم، نسیم حجازی، ص ۱۴،۱۳،۱۲۔

آخری چٹان کا تنقیدی جائزہ

ناول آخری چٹان کا خلاصہ اور تاریخی اعتبار سے تحقیقی جائزہ پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ جس میں اُن تاریخی شخصیات، عہد، جغرافیائی حالات اور اس معاشرے کے خدوخال کا تجزیہ تحقیقی اعتبار سے ثابت کیا ہے۔ تاریخی ناول نگاری کے فن میں ان امور کی بڑی اہمیت ہے لیکن ناول نگاری کے تقاضوں کے پیش نظر ہم اسے فنی اعتبار سے پرکھیں گے کہ ناول کا پلاٹ، کردار نگاری، منظر نگاری اور مکالموں وغیرہ کے استعمال میں نسیم حجازی کہاں تک کامیاب رہے۔

پلاٹ:

''آخری چٹان کا پلاٹ سادہ، انتہائی متجسس دلچسپ اور مربوط ہے۔ ناول نگار نے سہولت کے پیش نظر اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے کے عنوانات چھ ہیں جبکہ دوسرا حصہ آٹھ ذیلی موضوعات پر مشتمل ہے تیسرے حصہ کو دس عنوانات کے تابع کیا گیا ہے۔ ان عنوانات کا تعلق کہانی کی انفرادیت سے نہیں۔ کہانی ایک اجتماعی تاثر رکھتی ہے اگر کسی عنوان کو الگ سے پڑھا جائے تو بنا سیاق وسباق سمجھنا مشکل ہے ناول نگار نے اپنے پلاٹ کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ناول کا آغاز صلیبی جنگوں کے اس عہد میں دکھایا گیا ہے جب صلاح الدین ایوبی کی زیر قیادت افواج بیت المقدس کی جانب رواں دواں ہیں۔ یہاں قاری کی بنیادی معلومات کی خاطر اسلام کا ابتدائی زمانہ بھی پیش کیا ہے۔ بظاہر کہانی بیت المقدس کی فتح سے منسوب ہے لیکن دل کی دھڑکنوں اور رشتوں کی لطافت اس کیفیت پر غالب ہے۔ اپنی بیمار بیوی کا خیال اور اسے اس نوید کو پہنچانے کی خواہش کہ بیت المقدس پر اسلام کا پھریرا اسی نے نصب کیا تھا، یوسف بن ظہیر کو تمام خطرات سے بالاتر کر دیتی ہے۔ وہ اس خواہش میں تو کامیاب ہوا مگر اپنے جیون ساتھی کو یہ خبر نہ سنا سکا۔ کہانی کو مربوط کرنے کے لیے یوسف بن ظہیر کے بیٹے طاہر بن یوسف کا کردار پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے عہد طفلی کو دورِ شباب میں داخل ہوتے دکھایا گیا ہے بظاہر چند سطور کے ذریعے اس کا تعارف پیش کیا ہے مگر زندگی کے اس بڑے دور کا احاطہ کرنے میں ناول نگار نے کمزوری دکھائی ہے۔ اس کے باوجود بغداد میں اس کی سکونت وہاں کے حالات سے واقفیت اور امرائے سلطنت سے تعلقات استوار کرنے میں اس کے لیے وہ تمام سامان فراہم کر دیے جن کی ضرورت تھی پھر صلاح الدین ایوبی کی تلوار اس کی عزت وتوقیر کا سبب بنی۔ جہاں بلندیاں طاہر کی منتظر تھیں وہیں راہ سے ہٹا دینے والے بھی آئے اور پھر انس والفت کی خواہش لیے وزیر اعظم کے محل کی ایک حسین دوشیزہ اپنا دل مجاہد کے قدموں میں نثار کرنے کے لیے اپنی حدوں سے باہر نکل آئی۔ یہاں پلاٹ انتہائی دلچسپ اور قاری کو مکمل طور پر گرفت میں لے لیتا ہے اب قاری اپنی دلی اور دماغی خواہش کے مطابق تمام تر ہمدردیاں طاہر بن یوسف سے وابستہ کر لیتا ہے۔ بطور سفیر تاتاریوں کے علاقے میں جانا اور واپسی پر اپنے ہمراہیوں کی غداری کی بدولت گرفتار ہو جانا۔ پلاٹ میں تجسس پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے پھر سزائے موت کا سنایا جانا قاری کے لیے امید وبیم کی ایسی راہ تلاش کرتا ہے کہ ناول نگار کا قلم اپنے ہیرو کی جان بچانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اپنی حیرت انگیز کامیابیوں کی داستانیں رقم کرتا ہوا ہیرو ایک بار پھر بغداد جا پہنچتا ہے پھر جلال الدین کے ساتھ ہم

رکاب رہا۔ یہاں تک کہ غداروں کی غداریاں خون ناحق بہاتی رہیں اور پھر وہ چٹان پگھل گئی کہ جسے دیکھ کر لوگ جیتے تھے۔ قاری انتہائی رقت انگیز کیفیت سے دوچار ہوتا ہے گو کہ اس سے قبل بھی یہ حالت قاری پر گزر چکی تھی کہ جب صفیہ اپنے فرض اور محبت سے مجبور ہو کر اپنی جاں جانِ آفرین کے سپرد کر دیتی ہے۔ غازی اور ان پُراسرار بندوں کا یہ گروہ بغداد میں اپنے دشمنوں کو انتقام کے ذریعے موت کی نیند سلا دیتا ہے اور پھر اُن پہاڑی اور دشوار گزار راستوں سے گزرتے ہوئے کہ جہاں صفیہ دفن تھی طاہر بن یوسف ایک بار پھر بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کے واقعات ناول نگار نے قاری کی دلچسپی کی خاطر رقم کیے ہیں۔ ناول نگار نے جس کمالِ ہوشیاری سے ناول کا پلاٹ مرتب کیا وہ قاری کے لیے تمام تر دلچسپیوں کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایک طرف تاریخ کی جولانیاں ہیں تو دوسری طرف معاشرتی حقیقتیں کہ جن کے درمیان رہ کر انسان زندگی کی راہوں پر گامزن رہتا ہے پھر وہ خدشات جو اُسے مستقبل سے ناامید کر دیتے ہیں ایک جیتی جاگتی زندگی کا خاصہ ہیں۔ دوسری طرف انسانی ذہن کی پرواز ہے کہ جو ایک خاص حد تک ہی ہو سکتی ہے اور اس محدودیت کی بنا پر بعض اہم فیصلے سرزد ہو جاتے ہیں کہ پھر پچھتاوا ہے لیکن واپس لوٹنے کا راستہ نہیں یہی کچھ اس ناول میں طاہر بن یوسف کے کردار میں دکھائی دیتا ہے کہ پہلے وہ صفیہ سے متعارف ہے مگر ثریا کو دل دے بیٹھا۔ اس کے بعد کی کیفیت جو ناول نگار کے قلم کی روانی میں بہتی چلی گئی وہ فطرت کے خلاف ہے کہ ثریا اور صفیہ، طاہر کا دامن تھام کر زندگی کی راہوں پر گامزن رہ سکیں گی۔ فطرت کے خلاف کسی کام کو کر جانے سے بہتر اس سے چھٹکارا پا جانا تھا اور نسیم حجازی نے صفیہ کی موت کو دکھا کر یہ کام پورا کر دیا۔ ناول کے واقعات میں ربط و تسلسل اور انہماک کا یہ عالم ہے کہ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ اس کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''نسیم حجازی کے ناول میں واقعات کی ترتیب و تنظیم پر خاص توجہ ملتی ہے۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں لکھتے جس سے ان کے قصے کی روانی میں فرق پڑے۔''[1]

اصل میں بات تاریخ کے اس موضوع کو منتخب کرنے کی بھی ہے کیونکہ نسیم حجازی نے ایسے موضوعات اختیار کیے ہیں جو کسی معاشرے کا مرثیہ کہے جا سکتے ہیں اور ان میں موضوع کی وسعت، ناول نگار کی روانی قاری کی دلچسپی کو قرار رکھنے کے ساتھ ساتھ ان میں انہماک اور تجسس بھی پیدا کرتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی رقمطراز ہیں:

''حق و باطل اور فتح و شکست کے اس معرکے میں ناول نگار نے مجاہدین کی شجاعت کے ساتھ ساتھ سلاطین کی خساست کو جس خوبی سے واضح کیا ہے اس سے حقائق کی عبرتناکی بہت بڑھ جاتی ہے اور قانونِ قدرت کی سبق آمیزی نمایاں ہوتی ہے۔ دولت و اقتدار کی نہیں۔ یہ واقعہ انفرادی کارناموں اور اجتماعی ناکارگی کے درمیان ایک حقیقت پسندانہ توازن پیدا کرتا ہے۔''[2]

کردار:

اس ناول کے بہت سے اہم کردار ہیں جو اپنی حیثیت، منصب اور اپنی ضرورت کے مطابق اپنے آپ کو متعارف کراتے ہیں

---

[1] اردو میں تاریخی ناول؛ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۴۷۹۔

[2] نسیم حجازی کا فن مشمولہ سیارہ؛ ڈاکٹر عبدالمغنی، پٹنہ، جلد ۵۶، ص ۳۳۔

اپنی حرکات وسکنات کے ذریعے قاری کے دل میں اپنے لیے ہمدردی کا گوشہ حاصل کر جاتے ہیں یا پھر نفرت کی گھائیوں سے گزرتے ہوئے محیط غاروں میں کھو جاتے ہیں۔ ناول کا سب سے اہم کردار طاہر بن یوسف ہے اس کردار کو متعارف کرانے سے قبل ناول نگار نے اس کے حسب ونسب کا خاص خیال رکھا ہے۔ یہ ایک ایسے باپ کا بیٹا ہے کہ جس نے صلیبی جنگوں میں صلاح الدین ایوبی کی تلوار بطور انعام حاصل کی اور جس کی تربیت ایک نامی گرامی عالم کی زیرِ نگرانی مدینے کی عظیم آبادی میں ہوئی بظاہر اسے بغداد کی فوج میں اعلیٰ عہدہ مل سکتا تھا لیکن ناول نگار ایک طرف اس کی بہادری تو دوسری طرف خداداد صلاحیتوں کے ساتھ اسے اسلام کا بے باک سپاہی بناتا ہے۔ ایک ایسا نڈر اور جانباز غازی کہ جس کا عزم وحوصلہ پہاڑوں سے زیادہ بلند، قوت تسخیر چٹانوں سے زیادہ سخت، مشاہدہ سمندر کی گہرائیوں میں چھپے موتیوں کو تلاش کر لے۔ اس کردار کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق ہر جگہ پیش کیا ہے وہ بحیثیت سفیر ایک کامیاب شخص ہے تو میدانِ جنگ میں اس کی کارکردگی ناقابلِ یقین حد تک مجاہدانہ ہے اور جب انسانی جذبات سے مغلوب ہو کر کسی حسین نازنین سے ہمکلام ہو تو اس کی جذباتی کیفیت عالم آشکار ہوتی ہے اور یہاں بھی وہ عشق ومحبت کے میدان میں اپنے کردار کی بلندی کو قائم رکھتا ہے۔ قاری کی تمام تر ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں بعض مواقع پر اس کی کردار نگاری میں کچھ جھول نظر آتا ہے وہ مواقع اس کے خطیبانہ انداز میں متعارف ہونے کے ہیں۔ اس کی تقریریں طویل اور جذباتی ہیں مگر ایسے معاشرے میں جہاں دکھاوا اور بناوٹ اپنے عروج پر ہو ان کی افادیت نہیں ہوتی اس کے باوجود ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ مصر ہیں:

''یہ ہیرو نسیم حجازی کا آدرش ہے۔ وہ ہیرو سے لمبی لمبی تقریریں کرواتا ہے اور وہ اپنے خیالات کا اظہار ان تقریروں میں کرتے ہیں۔ اسلامی حمیت وغیرت کے مقام پر یہ شخص قوم کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرتا اور انہیں خوابِ غفلت سے جگاتا ہے۔''[1]

طاہر کے کردار کو اجاگر کرنے کے لیے اس کے دوستوں عبدالملک اور عبدالعزیز کے کردار کا بڑا ہاتھ ہے اسی وجہ سے ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''اس (آخری چٹان) میں ہیرو اور اس کے رفیقوں کی مؤثر کردار نگاری کے ساتھ ساتھ واقعات کا اتار چڑھاؤ اسے کمالِ فن کا ایک نمونہ بھی بنا دیتا ہے۔''[2]

ناول کا ایک اور کردار ثریا کا ہے جس سے طاہر کی ملاقات غیر متوقع اور اچانک تھی اور چونکہ

؎ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

اس لیے ناول کی کردار نگاری بنا نسوانی کرداروں کے کیسے مکمل ہو سکتی تھی۔ ثریا کی ہمت اور حوصلہ اور جواں مردی نے طاہر کو اس کا گرویدہ بنا دیا پھر اس کی خطیبانہ صلاحیتیں طاہر کے مقصدِ حیات اور مقصدِ جہاد میں کارآمد اور کارگر رہیں یہ عجیب اتفاق ہے کہ نسیم حجازی جب بھی

---

[1] اردو میں تاریخی ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۵۴۲۔

[2] نسیم حجازی کا فن، مشمولہ سیارہ، ڈاکٹر عبدالمغنی، ص ۴۴۔

کسی ہیروئین کا تعارف کراتے ہیں اس میں دنیا کی وہ تمام خوبیاں جمع کر دیتے ہیں جو اس کے کردار کو مثالی بنا دیتی ہیں چہرے کے خد و خال سے لے کر حسن کے ہر معیار تک اور عادات واطوار سے چال ڈھال تک ان کی ہیروئینیں ہر اعتبار سے مکمل نظر آتی ہیں۔ ہیرو سے اس کی ملاقات غیر متوقع حالات میں ہوتی ہے اندھیرا ہو یا آنکھوں تلے اندھیرا چھا جائے ہیروئین کے خد و خال ہیرو کے دل و دماغ پر انتہائی مکمل بنتے ہیں ایک اور متوازی کردار صفیہ کا ہے یہ بھی حسن و جمال کا شاہکار ہے۔ ہمدرد اور غمگسار، دکھاوٹی معاشرے میں مجاہدوں سے جذباتی لگاؤ رکھنے والی یہ بھی مجاہد کے قدموں میں اپنے دل کا نذرانہ پیش کرتی ہے اور اسے اپنا بنانے کے لیے زندگی داؤ پر لگا دیتی ہے۔

ناول کا اہم ترین کردار جلال الدین خوارزم شاہ کا ہے۔ جسے مصمم ارادے کی بدولت نا قابلِ تسخیر شخصیت کے روپ میں ناول نگار نے پیش کیا ہے۔ جرأت مندی اور حوصلہ مندی اس کی شخصیت کا منفرد اعزاز ہے وہ سخت سے سخت حالات میں انتہائی ذہنی وجسمانی کارکردگی سے خود کو منواتا ہے اسے چٹان سے تشبیہ دے کر ناول نگار نے درست انداز اختیار کیا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر عبد المغنی رقم طراز ہیں:

''سلطان جلال الدین کی نفسیات کا تجزیہ بھی ایک خاص چیز ہے اور اس کے مظاہر بہت پُر اثر ہیں واقعہ یہ ہے کہ سلطان کی شخصیت ایک عظیم الشان المیے کا موضوع بنتی نظر آتی ہے اور اس کے تمثیلی عناصر نمایاں ہو کر افسانے کی عظمت میں بے پناہ اضافہ کرتے ہیں۔''[1]

ناول کے دیگر کردار چونکہ محدود طور پر قاری کو محصور کرتے ہیں اس لیے اُن کا تذکرہ ہم مختصراً کرتے ہیں مثلاً وزیر اعظم افتخار الدین جو اپنے تدبر اور فہم وفراست کے اعتبار سے اہلِ بغداد اور دیگر لوگوں کے لیے ایک معمہ تھے کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن خود کو محدود پاتے تھے۔ علاؤ الدین خوارزم شاہ کے کردار کو ضدی، خود سر مگر انتہائی ڈرپوک شخص کے روپ میں پیش کیا گیا ہے جس کی بنا پر وہ قاری کی کوئی ہمدردی حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ مہلب بن داؤد کا کردار چالاک، عیار فرد کے روپ میں سامنے آتا ہے جو منافقانہ رنگ ڈھنگ میں رچا بسا ہے البتہ اس کا انجام دکھا کر قاری کو ذہنی تسکین فراہم کی گئی ہے۔ شمس الدین التمش مسلمانوں کا دوست مگر اپنے حالات سے مجبور ایک خوفزدہ بادشاہ کے انداز میں سامنے لایا گیا ہے سکینہ کا کردار ایک روایتی شہزادی کا ہے جو ہر شے کو سونے چاندی کی چمک دمک میں دیکھنے کی عادی ہو قاسم اس عہد کے نوجوانوں کا نمائندہ معلوم ہوتا ہے جو منصب و دولت کے پیشِ نظر غلط اور صحیح کی تمیز نہ رکھتے ہوں گے۔

جس کردار نے ناول کا مکمل احاطہ کیا ہے وہ چنگیز خاں کا ہے کہ جس کا رعب وجلال، دبدبہ اور ہیبت وسفا کی انسانی ذہنوں پر غالب تھی۔ جس کی قوت کے سامنے پہاڑوں کی بلندی ہیچ تھی تو سمندروں کی گہرائی انتہائی معمولی معلوم ہوتی تھی وہ اپنے خیالات کو حقیقت کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا اور ویسا کر جانے کی ہمت رکھتا تھا۔ ایک بہادر تھا اور دوسرے بہادروں کا معترف خاص طور پر جلال الدین کے دریائے سندھ عبور کر جانے کے بعد اُس نے بہادری وشجاعت کے لیے جو الفاظ ادا کیے وہ اُس کی بلند خیالی کا اعتراف ہیں۔

---

[1] نسیم حجازی کا فن مشمولہ سیارہ، ڈاکٹر عبد المغنی، ص ۴۴۔

تیمور ملک کا کردار انتہائی نا مصائب حالات میں حوصلہ مندی اور ڈٹے رہنے والے فرد کا منہ بولتا ثبوت ہے جبکہ ہلاکو خاں نے آخری خلیفہ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ اس کی شخصیت اور رتبے کے عین مطابق ہے۔ ایک اور کردار جو انسانی سوچ وفکر اور زندگی کو دوسری طرح دیکھنے سے متعلق ہے عبدالرحمان کا ہے۔ معاشرے کے ایسے کرداروں کا آئینہ دار ہے جو زندگی سے پیار کرتے ہیں۔

نسیم حجازی کردار نگاری پر خاص توجہ دیتے ہیں تاریخی کرداروں کے ساتھ اپنے تخیلاتی کرداروں کو اس طرح ہم آہنگ کر دیتے ہیں کہ دونوں ہی تاریخی معلوم ہوتے ہیں۔ کردار نگاری کے مزاج کو اس خوبی سے سمجھتے اور پھر پیش کرتے ہیں کہ قاری پر تاثر قائم ہوتا ہے اسی وجہ سے ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ لکھتے ہیں:

''ان کے کردار بچپن سے بڑھاپے تک کے مراحل طے کرتے آتے ہیں۔ کرداروں کا تعارف کرواتے ہوئے نسیم حجازی جن صفات کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ کردار بعد میں اس کے مطابق پورا بھی اترتے ہیں۔''[1]

مکالمے:

ناول نگار کے لیے اور خاص طور پر تاریخی ناول نگار کے لئے مکالمہ نگاری ایک مشکل کام ہے کیونکہ جب دو تاریخی شخصیات آپس میں محوِ گفتگو ہوں تو اُن میں حدادب اور رتبے کا لحاظ رکھنا موقع محل کے اعتبار سے الفاظ کا استعمال کرنا ناول نگار کے امتحان کے مترادف ہے کیونکہ عام افراد کی گفتگو اور اہم شخصیات کی گفتگو میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ ہر جگہ ایک ہی جیسا انداز اختیار نہیں کیا جاسکتا جہاں رومانی ماحول ہو وہاں گفتگو میں انتہائی لوچ ہونا چاہیے۔ آخری چٹان کے مطالعے میں یہ بات بدرجہ اتم موجود ہے کہ نسیم حجازی نے موقع محل کی مناسبت سے مکالمے ادا کرائے ہیں مثلاً وزیر اعظم اور طاہر بن یوسف کی پہلی ملاقات کے مکالمے:

''افتخار الدین نے اس سے چند سوالات پوچھے۔'' تم بغداد میں کب آئے؟ کہاں سے آئے اور کیا مقصد لے کر آئے ہو؟''

طاہر نے ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا'' مجھے آئے ہوئے تین مہینے دس دن ہوئے ہیں، میں مدینے سے آیا ہوں اور میرا مقصد خدمتِ اسلام ہے۔''

''بہت نیک مقصد ہے۔'' وزیر اعظم نے بے اعتنائی کے ساتھ کہا۔'' لیکن یہ مقصد آپ دولت عباسیہ کی خدمت سے حاصل کرنا چاہتے ہیں یا کسی خُفیہ انجمن کے رُکن بن کر؟ میں نے سنا ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی تلوار کی بدولت بغداد کے عوام آپ کا بہت احترام کرتے ہیں۔۔۔۔''

''یہ اس مردِ مجاہد کی تلوار کا احترام ہو سکتا ہے۔ میں ابھی اپنے آپ کو کسی عزت کا حق دار نہیں سمجھتا۔ رہا دولتِ عباسیہ کی خدمت کا سوال تو میں عرض کرتا ہوں کہ اگر میرے دل میں یہ جذبہ نہ ہوتا تو میں اپنا مستقبل بغداد سے وابستہ نہ کرتا۔ میں دولتِ عباسیہ کی صحیح خدمت اسلام کی خدمت سمجھتا ہوں۔''

---

[1] اُردو میں تاریخی ناول؛ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۷۵۲۔

''صحیح خدمت سے آپ کی مراد کیا ہے؟''

طاہر نے اس سوال پر اچانک محسوس کیا کہ اس جہاندیدہ آدمی سے گفتگو کرتے ہوئے اسے بہت زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔ اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ''بیرونی خطرات کا اندازہ لگاتے ہوئے بغداد کی مدافعانہ قوت کو مضبوط کرنا دولتِ عباسیہ کی صحیح خدمت سمجھتا ہوں۔''

افتخارالدین نے کہا ''کیا تمھارے خیال میں محمد شاہ خوارزم کے واپس لوٹ جانے سے بیرونی خطرات ٹل نہیں گئے؟''

''لیکن چنگیز خاں کا خطرہ دن بدن بڑھ رہا ہے۔''

افتخارالدین نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ہمارے لیے نہیں خوارزم شاہ کے لیے!''

''کیا آپ تاتاریوں کے طوفان کے مقابلے کے لیے خوارزم شاہ کو تنہا چھوڑ دیں گے؟''

''یہ حالات پر منحصر ہے۔۔۔۔۔ ابھی تک خوارزم شاہ نے ہم سے معافی نہیں مانگی۔۔۔ نہ اعانت طلب کی ہے اور نہ ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ چنگیز خاں چند تاجروں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے خوارزم پر چڑھ دوڑے گا کیونکہ وہ تاجر زیادہ تر بخارا کے مسلمان تھے۔''

''لیکن میں نے سُنا ہے کہ سلطنتِ خوارزم کے ساتھ دولتِ عباسیہ کے سیاسی تعلقات پھر بحال ہو گئے ہیں اور ان کا سفیر یہاں آ پہنچا ہے''

افتخارالدین نے جلدی سے سوال کیا۔ ''کیا تم خوارزم کے سفیر سے ملے ہو؟''

طاہر کو پھر ایک بار یہ احساس ہوا کہ اس نے تدبر کا ثبوت نہیں دیا۔ اس نے جواب دیا۔ ''نہیں، مجھے اس سے کیا کام!''[۱]

ناول نگار نے چنگیز خاں کی شخصیت کا جو تصور ابھارنے کی کوشش کی ہے اور جس سے سفاکی اور ظلم و ستم کی داستانیں منسوب کیں ہیں اس کے مکالموں کا انداز دیکھیے :

''چنگیز خاں بخارا کی عظیم الشان مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے گھوڑے سے اترا۔

''یہ تمھارے بادشاہ کا گھر ہے؟'' اس نے ایک شخص سے سوال کیا۔

''نہیں، یہ خدا کا گھر ہے۔''

چنگیز خاں مسجد کے اندر داخل ہوا اور اس نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میری افواج تھکی ہوئی ہیں۔ انھیں خوراک اور آرام کی ضرورت ہے۔ ان کے لیے اپنے اپنے گھروں کے دروازے کھول دو اور اس قسم کی کشادہ عمارتیں میرے گھوڑوں کے لیے خالی کر دو اور ان کے لیے چارا مہیا کر دو۔ یاد رکھو تم خدا کے قہر سے ڈرتے ہو اور میں تمھارے لیے خدا کا قہر بن کر آیا ہوں۔''[۲]

۱۔ آخری چٹان، نسیم حجازی، ص ۶۲، ۶۳۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۱۸۔

ایک اور موقع پر مکالموں کا ایک طویل سلسلہ جلال الدین اور اس کے باپ علاؤ الدین خوارزم شاہ کے درمیان ہے۔ یہ مکالمے اس قدر پُر اثر ہیں کہ قاری ان میں مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ مکالموں کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''ایک لمحے کے لیے باپ اور بیٹا ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے، خوارزم شاہ نے کہا۔'' جلال! گھوڑے سے نہیں اترو گے؟''

''نہیں، مجھے بہت دور جانا ہے۔ میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''تو تم میری مدد کے لیے نہیں آئے؟''

''اس ویران جگہ پر آپ کو کیا خطرہ ہے۔ میں موت کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ موت سے بھاگنے والوں کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

خوارزم شاہ نے آگے بڑھ کر جلال الدین کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''نہیں نہیں، میں تمھیں نہیں جانے دوں گا۔ زمین میرے لیے تنگ ہو چکی ہے۔ تم میرا آخری سہارا ہو۔ چلو میں تمھیں اپنا خیمہ دکھاتا ہوں، وہ تیروں سے پٹا پڑا ہے۔ آج ساری دُنیا میری دشمن ہے۔ کیا میرا بیٹا بھی میرا ساتھ نہیں دے گا۔''

جلال الدین نے جواب دیا۔'' کاش آپ نے دنیا کے ساتھ کوئی بھلائی کی ہوتی۔ آپ کی وجہ سے ملک کو ایک وحشی حقیر دشمن کی غلامی نصیب ہوئی۔ آپ نے صرف اپنی جان کے خوف سے سارا ملک بھڑیوں کے سپرد کر دیا۔ قوم آپ کی غلطیوں کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ مسلمان آپ کی وجہ سے تاتاریوں کے ہاتھوں اپنی بہو بیٹیوں کی بے حرمتی دیکھ رہے ہیں۔ آپ آج انہیں یہ پیغام بھیجتے ہیں کہ وہ آ کر آپ کے خیمے پر پہرہ دیں، لیکن کس منہ سے؟''

''جلال! جلال! میں تمھارا باپ ہوں!''

''کاش! میں آپ کے گھر پیدا ہونے کی بجائے ایک غریب لیکن بہادر آدمی کے گھر پیدا ہوا ہوتا!''

''جلال! میرا دل نہ دکھاؤ۔''

''کاش! آپ کے پہلو میں دل ہوتا لیکن قدرت نے وہاں گوشت کا ایک بے جان لوتھڑا رکھ دیا ہے۔''

''آخر ان باتوں سے تمھارا مطلب کیا ہے؟''

''کچھ نہیں آپ کے ساتھ میری آخری ملاقات ہے اور میں آپ کے پاس یہ درخواست لے کر آیا ہوں کہ خزانہ میرے حوالے کر دیجیے۔ میں چاہتا ہوں کہ بخارا اور سمرقند کے خزانوں کی طرح وہ بھی تاتاریوں کے قبضے میں نہ آ جائے۔ مجھے تازہ افواج تیار کرنے کے لیے ایک ایک کوڑی کی ضرورت ہے۔''

''تو تمھارا خیال ہے کہ تم تاتاریوں کے ساتھ لڑ سکتے ہو۔''

''میرا شروع سے یہ خیال تھا لیکن آپ نے میرا راستہ روکے رکھا!''

''جلال! تا تاریوں کے ساتھ لڑنے کا خیال ایک جنون ہے اور میں اس مصیبت میں اپنی رہی سہی پونجی سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ خدا کے لیے میرا ساتھ دو۔ مجھے اپنی جان سے زیادہ تمھاری جان عزیز ہے۔ اس آسمان کے نیچے ایسی جگہیں ہیں جہاں ہم آرام سے باقی زندگی گزار سکتے ہیں۔ ہم مصر چلے جائیں گے۔ اُندلس چلے جائیں گیا۔''

''میں بزدلوں کی زندگی بسر کرنے والوں کا ساتھ دینے کی بجائے بہادروں کی موت مرنے والوں کا ساتھ دوں گا۔ وہ قوم جو آپ کے تخت وتاج کے لیے خون بہاتی رہی، آج اسے میرے خون اور پسینے کی ضرورت ہے۔ میں اسے پیٹھ نہیں دکھا سکتا۔''

''لیکن ان پانچ ہزار سپاہیوں سے تم کیا کر سکو گے؟ تا تاری ریت کے ذرّوں سے بھی زیادہ ہیں۔''

''ایسے موقعوں پر ایک سپاہی فتح اور شکست سے بے نیاز ہو کر میدان میں کودنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میں اپنا فرض پورا کروں گا۔ فتح اور شکست خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن جیتے جی شکست کا اعتراف ایک مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر میں ان پانچ ہزار سپاہیوں کو بہادروں کی موت مرنا سکھا دوں تو ساری قوم جی اُٹھے گی۔ آپ مصر جائیے۔ مجھے اس خزانے کی ضرورت نہیں۔ میں پیٹ پر پتھر باندکر اور جسم پر چیتھڑے اوڑھ کر لڑوں گا اور مجھے یقین ہے کہ قوم میرا ساتھ دے گی!''

جلال الدین نے باگ کھینچ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

''جلال الدین ٹھہرو! مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ یہاں میرا کوئی نہیں، مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔''

جلال الدین نے گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔''چلیے!''

''لیکن کہاں؟''

''موت کے پیچھے۔ آزادی کی تلاش میں!''

''نہیں نہیں۔ بیٹا میرا کہا مانو، ہم تا تاریوں سے نہیں لڑ سکتے!''

''خدا اور رسول ﷺ کے احکام سے زیادہ میرے لیے آپ کا حکم مقدم نہیں۔ ہماری منزل اور راستے مختلف ہیں۔ خدا حافظ!''[۱]

عشق ومحبت کے راستے جب ابتدائی منازل کو طے کر چکے ہوں تو محبت کرنے والے ایک دوسرے کا دامن تھام لینا چاہتے ہیں۔ حالات، مسائل اور مجبوریاں راہِ الفت میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ دودھڑکتے ہوئے دلوں کی آواز یوں سنائی دیتی ہے:

''میں (صفیہ) آپ کو اپنا قاضی بناتی ہوں۔ آپ سے اپنے متعلق فتویٰ پوچھتی ہوں۔ اگر میں نے اس کیچڑ میں پلنے والے کیڑوں کی بجائے اپنی محبت کے لیے ایک انسان تلاش کرنے میں کوئی جرم کیا ہے تو بتائیے میری سزا کیا ہے؟ آپ کہتے تھے کہ ترکستان

---

[۱] آخری چٹان، نسیم حجازی، ص ۳۲۳،۳۲۶۔

کے میدان خطرناک ہیں لیکن کاش آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ عورت جسے چاہتی ہے اس کے ساتھ تیروں کی بارش میں بھی خوش رہ سکتی ہے لیکن اس کے بغیر اسے سونے کے محل بھی قید خانہ معلوم ہوتے ہیں۔''

وہ رو رہی تھی۔

طاہر یہ محسوس کر رہا تھا کہ دنیا کے تمام عناصر کی قوت تسخیر سمٹ کر اس لڑکی کے وجود میں آ گئی ہے۔ اس نے پہلی بار اس کے حسین چہرے کی طرف غور سے دیکھا جس میں ہزاروں بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ طاہر ضبط نہ کر سکا۔

''صفیہ! صفیہ!! کاش مجھے پہلے سے معلوم ہوتا، مجرم تم نہیں میں ہوں۔ قراقرم جانے سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ تم مجھے اس حد تک قابلِ توجہ سمجھتی ہو لیکن اس سفر میں۔۔۔۔۔۔!'' طاہر یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گیا۔

صفیہ جیسے گہرے پانی میں غوطہ لگا کر سانس لے رہی ہو۔ طاہر کے منہ سے اپنا نام سن کر وہ پھر امید کا چھوٹا ہوا دامن پکڑ رہی تھی۔ ''بتائیے اس سفر میں کیا ہوا؟ بتائیے؟''

''میں ایک لڑکی سے شادی کا وعدہ کر چکا ہوں۔''

طاہر کا خیال تھا کہ وہ یہ الفاظ سننے کے بعد اس پر حقارت سے ایک نگاہ ڈالنے کے بعد بھاگ جائے گی لیکن اسے جنبش تک نہ ہوئی۔ نفرت اور حقارت کی بجائے اس کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ تھی۔ تلخ ہونے کی بجائے اس نے میٹھی اور دل کش آواز میں کہا۔ ''تو تم مجھ سے نفرت نہیں کرتے؟''

''میں تم سے کیسے نفرت کر سکتا ہوں!''

''کیا وہ خوبصورت ہے؟''

''ہاں!''

''یقیناً مجھ سے کہیں زیادہ خوب صورت ہوگی؟''

''نہیں، مجھے معلوم نہیں۔''

''اگر آپ اس کے ساتھ شادی کا وعدہ نہ کر چکے ہوتے تو کیا پھر بھی میری التجائیں ٹھکرا دیتے اور مجھے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتے؟''

''ہاں۔ موجودہ حالات میں فرض مجھے انکار پر مجبور کرتا۔ میں میدان میں تمھاری حفاظت کرنے کی بجائے اس شہر اور ملک کی چار دیواری پر پہرہ دینا زیادہ آسان سمجھتا ہوں۔''

''اس کا نام کیا ہے؟''

''ثریا''

''کہاں ہے وہ؟''

''بلخ میں۔''

''اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی طرح بغداد میں بھی اس کی ایک بہن آپ کو چاہتی ہے تو کیا وہ اسے اپنی حق تلفی سمجھے گی؟''

''نہیں، وہ حسد سے بہت بلند ہے!''

''ایک عورت دوسری عورت کی مجبوریاں سمجھ سکتی ہے۔ آپ اس کے ساتھ شادی کر لیں۔ میں اس امید پر زندہ رہوں گی کہ میں کسی دن اس سے رحم کی بھیک مانگ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں گی اور ہم دونوں اپنے لیے آپ کا دامن کشادہ پائیں گی۔ میں اس کی لونڈی بن کر بھی گزارہ کر لوں گی۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ آپ مجھ سے نفرت تو نہیں کرتے۔ یہ میرے لیے بہت بڑا انعام ہے۔ بہت بڑا سہارا ہے۔ اس مضبوط چٹان پر کھڑی ہو کر میں ساری دُنیا کے ساتھ لڑ سکتی ہوں۔ میں اب چچا، چچی اور قاسم کو جواب دے سکتی ہوں مجھے کسی کا خوف نہیں۔''

طاہر نے کہا: ''صفیہ! میں وعدہ کرتا ہوں کہ ترکستان سے فارغ ہوتے ہی یہاں آؤں گا۔ اس وقت تک میرے متعلق شاید تمھارے چچا کی رائے بھی بدل جائے اور میں بہت بڑے انعام کے لیے دامن پھیلا سکوں۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میری محبت کے آسمان پر ہر وقت دو ستارے جگمگاتے رہیں گے۔ میری نگاہوں میں تمھارا اور ثریا کا درجہ ایک ہوگا۔''

''میں آپ کے دامن کی گرد بن کر بھی آپ کے ساتھ رہوں گی۔ بلخ میں رہنے والی بہن کو میرا سلام دیجیے اور اس کے پاس میری ایک نشانی لیتے جائیے۔'' صفیہ نے انگوٹھی اُتار کر طاہر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: ''میں آپ دونوں کا انتظار کروں گی۔ اگر آپ نے دیر کی تو شاید قدرت مجھے آپ کے پاس لے آئے۔ دنیا کی کوئی خلیج ایسی نہیں جسے محبت کی کشتی میں بیٹھ کر عبور نہ کیا جا سکے۔''[1]

مکالمہ نگاری کی خصوصیات کا تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر احسن فاروقی رقمطراز ہیں:

''مکالمہ ہی کے ذریعہ سے کردار کے ارادے، احساسات، جذبات وغیرہ ظاہر ہوتے ہیں اور مختلف معاملات پر ان کی رایوں (آراء) کا پتا چلتا ہے۔ دو کرداروں کی فطرتوں کے اختلافات بھی مکالمہ ہی کے ذریعہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔''[2]

اگر اسی کو معیار سمجھا جائے تو ناول کے اکثر مقامات پر مکالموں کی ادائیگی میں نسیم حجازی خاصی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ لکھتے ہیں:

''ان کے مکالموں سے ان کے کرداروں کی انفرادیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ مکالمے کرداروں کی شخصیت سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مکالموں کے ذریعے کرداروں کی نفسیاتی اور داخلی کشمکش کی کیفیت کو بڑی فنی مہارت سے

---

[1] آخری چٹان، نسیم حجازی، ص ۳۶۰، ۳۶۱۔

[2] ناول کیا ہے؟، ڈاکٹر احسن فاروقی، ص ۳۵۔

ابھارا ہے مکالموں سے ان کے کرداروں کی شخصیت کی تصوراتی تشکیل و تعمیر میں بڑی مدد ملی ہے۔''[۱]

منظر نگاری:

ناول نگار کے پاس ماحول، حالات یا موقع کو پیش کرنے کے لیے کوئی ایسا طریقہ نہیں ہوتا کہ جسکے ذریعے قاری کو کچھ دکھایا جا سکے۔ الفاظ کے ذریعے ایسا تاثر قائم کیا جاتا ہے کہ تمام تر کیفیت نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے اور قاری شعوری طور پر دیکھی ہوئی کسی چیز یا ماحول سے اُس موقع یا کیفیت کو محسوس کرتا ہے کیونکہ زندگی میں لاتعداد ایسے واقعات گزر چکے ہوتے ہیں یا سنے ہوئے ہوتے ہیں جو ناول نگار کے پیش کردہ مناظر سے مماثل ہو جائیں۔ کبھی یہ منظر لہلہاتے ہوئے پھولوں یا درختوں کے جھنڈوں کے ہوتے ہیں تو کبھی پہاڑوں کی دلفریب وادیوں اور گھاٹیوں کے یا پھر دریاؤں، صحراؤں وغیرہ کے کبھی کبھی کسی خاص موقع پر انسانوں سے متعلق ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے اس کیفیت کو پیش کرنے میں ناول نگار کی ہنرمندی ناول کی کامیابی کا باعث بنتی ہے آخری چٹان میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ جنہیں محسوس کر کے قاری اُس منظر کو لاشعوری طور پر اپنی نگاہوں کے سامنے محسوس کرتا ہے ہمارے بہت سے قارئین نے مغلیہ طرز تعمیر کے نمونے شاہی محلات اور باغات دیکھے ہوں گے اس لیے جب ناول نگار نے اس منظر کو پیش کیا تو انہیں کوئی حیرت نہ ہوئی ہوگی کیونکہ تمام تر منظر اُن کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا ہوگا:

''وزیر اعظم سے دوبارہ مصافحہ کرنے کے بعد طاہر قاسم کے ساتھ محل سے نیچے اترا۔ محل کے وسیع صحن میں سنگِ مرمر کی سڑک کے دونوں طرف صاف شفاف پانی کے تالابوں میں فوارے چھوٹ رہے تھے اور ان تالابوں کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں سبز گھاس کے پلاٹ تھے۔ ایک ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد چند سیڑھیاں اتر کر یہ سنگ مرمر کی سڑک ایک دلکش باغ سے گزرتی تھی اور تالابوں کا پانی دو آبشاریں بناتے کے بعد دو تنگ اور تیز رفتار نہروں میں تبدیل ہو جاتا تھا، پھر ان نہروں سے دائیں بائیں کئی اور شاخیں نکل کر باغ کو سیراب کرتی تھیں۔ وہ میدان جس میں پولو اور گھوڑ دوڑ ہوتی تھی، محل کے اس حصے کے عقب میں تھا اور طاہر اسی طرف سے محل میں داخل ہوا تھا۔

دوسری ڈیوڑھی پہ باغ ختم ہو جاتا تھا اور اس سے باہر ایک وسیع چار دیواری کے اندر وزیر اعظم کے خادموں کے مکانات اور ایک بہت بڑا اصطبل تھا۔''[۲]

انسان جب دنیاوی مسائل میں گھر جاتا ہے تو اپنے خدا سے مدد کا طالب ہوتا ہے اس موقع پر اس کی انکساری قابل دید اور پھر اپنے معبود سے مدد کی توقع اسے متکبر بنا دیتی ہے، تاجروں کے قتل کے بعد جب سفیر بھی قتل ہو گئے تو چنگیز خاں نے یہ انداز اختیار کیا:

''وہ یہ واقعہ سن کر اٹھا اور ایک پہاڑی پہ چڑھ کر دیر تک سورج کے سامنے سر بسجود رہا اور پھر بلند آواز میں پکارا۔ ''فلک لازوال پر دو سورج نہیں اور اس زمین پر دو خاقان نہیں ہوں گے!''[۳]

۱۔ اردو میں تاریخی ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۱۵۷۔

۲۔ آخری چٹان، نسیم حجازی، ص ۶۶، ۶۷۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۳۳۔

ایک اور موقع کی منظر نگاری حقیقت سے اس قدر قریب ہے کہ جس سے منسوب بے شمار واقعات مل سکتے ہیں ماں کی ممتا!

''ایک حاملہ عورت نے چتا کے سامنے گر کر بچہ جن دیا اور تولائی نے کہا۔'' دیکھو، دشمن کی عورتیں ہمارے مقابلے کے لیے ایک نئی فوج تیار کر رہی ہیں!''

ایک تاتاری نے آگے بڑھ کر بچے کے سر پر پاؤں رکھ کر مسلنے کی کوشش کی لیکن ماں کی ممتا موت کے سامنے بھی خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے لڑکے کو پکڑ کر کلیجے سے لگا لیا۔ اسے بچے سمیت آگ میں دھکیل دیا گیا۔ وہ آخری دم تک اپنے جگر کے ٹکڑے کو بازوؤں میں چھپا چھپا کر آگ کے شعلوں سے بچانے کی کوشش کرتی رہی۔''[1]

نسیم حجازی کے اس ناول یعنی آخری چٹان کی ڈرامائی تشکیل سلیم احمد نے کی اور اسے ٹیلی ویژن پر پیش کیا ناظرین نے جس منظر کو بار بار دیکھنے کی خواہش کی وہ جلال الدین کا دریائے سندھ میں چھلانگ لگا کر دوسرے کنارے پر جانے کا ہے یہ ایک ناقابلِ یقین منظر ہے جسے ناول نگار نے اس طرح پیش کیا ہے:

''سلطان نے بھاری زرہ اُتار کر پھینک دی۔ گھوڑے کو آگے بڑھایا اور ایک لمحہ خوف ناک لہروں کو دیکھنے کے بعد ایڑ لگا دی۔ تیمور ملک نے چند آدمیوں کے سوا باقی سپاہیوں کو دریا میں کودنے کا حکم دیا۔

جب اپنی باری آئی تو تیمور ملک کی نگاہ طاہر پر پڑی۔ وہ چند قدم کے فاصلے پر گھوڑے کی گردن پر سر ٹیکے ہوئے تھا۔ اس کی زرہ میں چند تیر اٹکے ہوئے تھے اور اس کا وفادار نوکر زید نیزے کے ساتھ دو تاتاریوں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تیمور ملک گھوڑا بڑھا کر آگے بڑھا اور تاتاریوں میں سے ایک کی گردن اڑا دی۔ دوسرے تاتاری کو زید گرا چکا تھا۔ اتنی دیر میں چند اور تاتاری پہنچ گئے تیمور ملک نے طاہر کو کھینچ کر اپنے گھوڑے پر ڈالتے ہوئے زید اور باقی سپاہیوں کو دریا میں کودنے کا حکم دیا اور خود بھی اپنے گھوڑے کو چٹان کے سرے پر لے جا کر ایڑ لگا دی۔ عبدالملک دریا کے کنارے تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا لیکن جب طاہر کو تیمور کی حفاظت میں دیکھا تو اس نے بھی چھلانگ لگا دی۔ چنگیز خاں نے خوارزم شاہ کو زندہ پکڑنے کی نیت سے اپنے سپاہیوں کی معمولی تعداد چٹان پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی تھی۔ جب تاتاری چٹان کے اوپر کھڑے ہو کر دریا کی طرف اشارہ کر کے چلانے لگے تو وہ بھاگتا ہوا چٹان پر چڑھا۔۔۔ جلال الدین کے اکثر ساتھی تاتاریوں کے تیروں اور بعض دریا کی تند و تیز موجوں کا شکار ہو چکے تھے لیکن جلال الدین تیروں کی زد سے بہت دور جا چکا تھا۔ وہ دوسرے کنارے پہنچ کر ایک ٹیلے پر چڑھا اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

چنگیز خاں نے اپنے بیٹوں اور سرداروں سے مخاطب ہو کر کہا۔'' خوش نصیب ہے وہ باپ جس کا بیٹا جلال الدین جیسا ہو اور مبارک ہیں وہ مائیں جو ایسے شیروں کو دودھ پلاتی ہیں۔''[2]

انسانی جذبات و احساسات ناقابلِ بیان ہوا کرتے ہیں جب کوئی چاہنے والا اپنے محبوب کو نہ پا سکے تو اس کی تلاش و جستجو میں اپنی جان کا

---

[1] آخری چٹان، نسیم حجازی، ص ۳۷۶۔

[2] ایضاً، ص ۳۹۹، ۴۰۰۔

نذرانہ تک پیش کر دیتا ہے بظاہر یہ ڈرامائی اور افسانوی واقعات معلوم ہوتے ہیں مگر فلک نے بارہا ایسے مناظر دھرتی پر ہوتے ہوئے دیکھے ہیں۔

''صفیہ پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ سعید اسے پانی پلا رہا تھا۔ طاہر کو دیکھا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ گھوڑے سے کود پڑا۔ صفیہ چند قدم آگے بڑھی لیکن آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھی کہ طاہر نے بھاگ کر اسے اپنے بازوؤں کا سہارا دیا آہستہ سے زمین پر لٹا دیا۔

''صفیہ! تم یہاں کیوں آئیں؟'' طاہر نے درد بھری آواز میں کہا۔

صفیہ نے اپنے چہرے پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ''اب ان باتوں کا وقت نہیں دیکھیے، یہ ندی کس قدر چھوٹی ہے لیکن اس کا پانی کس قدر شفاف ہے۔ دریائے دجلہ بہت بڑا ہے لیکن میں اس کے گدلے پانی سے اکتا گئی تھی۔ آپ کے گاؤں کے نخلستانوں میں بالکل اسی قسم کی ندیاں بہتی ہوں گی۔ ٹھنڈے میٹھے اور شفاف پانی کی ندیاں۔ میں ان کی تلاش میں یہاں پہنچ گئی۔''

طاہر کے چند ساتھی اس کے قریب آ پہنچے لیکن عبدالملک انہیں لے کر ایک طرف ہو گیا۔

صفیہ نے کہا۔'' آپ مغموم کیوں ہیں۔ میری طرف دیکھیے۔ میں خوش ہوں۔ ہاں، میں اس ندی کے متعلق کہہ رہی تھی۔ اگر میں مر جاؤں تو مجھے اس ندی کے کنارے چھوڑ جائیے۔''

''نہیں نہیں، صفیہ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ تمھارے زخم معمولی ہیں۔ میں تمھیں ان نخلستانوں میں لے جاؤں گا جن میں ٹھنڈے، میٹھے اور شفاف پانی کی ندیاں بہتی ہیں۔ اب حوادث کے طوفان کی کوئی لہر ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکے گی!''

صفیہ نے کہا۔ ''ہم ہر صبح گھوڑوں پر سوار ہو کر صحرا کی طرف سیر کے لیے جایا کریں گے!''

''ہاں صفیہ! میں وعدہ کرتا ہوں۔''

''اور میں آپ کے ساتھ نیزہ بازی کی مشق کیا کروں گی اور پھر میں نخلستانوں میں پھول تلاش کیا کروں گی اور جب آپ لڑائی پر جایا کریں گے تو میں ریت کے ٹیلوں پر چڑھ کر آپ کی راہ دیکھا کروں گی!''

''ہاں صفیہ!''

صفیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے ہچکی لیتے ہوئے کہا:۔

''اب مجھے موت کا کوئی غم نہیں۔ آپ میرے ہیں! آپ میرے ہیں!!'' اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''صفیہ! صفیہ!!'' طاہر نے آب دیدہ ہو کر کہا۔

صفیہ نے آنکھیں کھولیں لیکن کوئی جواب نہ دیا طاہر نے عبدالملک کو آواز دی۔ وہ بھاگتا ہوا آگے بڑھا۔ طاہر نے کہا۔'' اسے غش آ گیا ہے۔ پانی لاؤ!''

پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد صفیہ کے چہرے پر کچھ تازگی آ گئی۔ اس نے نحیف آواز میں کہا۔ ''شاید میں سو گئی تھی۔ اس نخلستان میں۔۔۔۔۔۔ شفاف پانی کا چشمہ پھوٹ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ میں وہاں کھڑی تھی۔۔۔۔۔۔ اور آپ گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے۔ کہیں۔۔۔۔۔۔ بہت۔۔۔۔۔۔ دور'' اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر نیلاہٹ چھا رہی تھی۔۔۔۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ ''آپ دیر نہ لگائیں۔ فوج یہاں سے۔۔۔۔۔۔ ایک منزل۔۔۔۔۔۔ دور۔۔۔۔۔۔!''

عبدالملک نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا اور پھر طاہر کی طرف دیکھا، اور انا للہ و انا الیہ راجعون کہہ کر سر جھکا دیا۔ طاہر دنیا و مافیہا سے بے خبر اس محبت و وفا کے پیکرِ مجسم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عبدالملک نے صفیہ کے چہرے پر اپنا رومال ڈال دیا اور طاہر کو بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ''طاہر اٹھو! حوصلے سے کام لو!''

طاہر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عبدالملک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ عبدالملک نے آنسو بھرتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیا۔ طاہر بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں لینے لگا۔

عبدالملک نے کہا۔ ''طاہر! شاید دنیا میں کوئی انسان اس قابل نہ تھا جس کے لیے وہ زندہ رہتی!''

تھوڑی دیر بعد طاہر کے ساتھی ندی کے کنارے اس کی لاش کو پتھروں کے انبار کے نیچے دفن کر چکے تھے۔ طاہر نے چند جنگلی پھول چنے اور صفیہ کی قبر پر بکھیر دیے۔''[1]

نسیم حجازی نے معاشروں کے زوال پذیر ہونے کے اسباب کا بغور جائزہ لیا ہے بغداد کی تباہی کا ذمہ دار وہ ان مناظروں کو قرار دیتے ہیں کہ جن کے ذریعے شیعہ اور سنی علما ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے تھے یہ مناظرے کئی کئی دن چلتے تھے اور ان کا انجام دونوں گروہوں کی آپس کی لڑائی پر ہوتا ہے۔ طاہر بن یوسف کا ملازم زید بھی ایک ایسا ہی مناظرہ دیکھنے گیا اور ان دو گروہوں کی چپقلش کا شکار ہو کر اپنے چہرے کو تڑوا کر واپس آیا۔ ان مناظروں کی منظر کشی اس قدر خوب کی گئی ہے کہ ڈاکٹر شفیق احمد مرقوم کرتے ہیں:

''آخری چٹان'' میں نسیم حجازی نے بغداد کے گلی کوچوں میں مناظرہ بازی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ منظر نگاری کی انتہا پر پہنچا ہوا ہے جبکہ اس کے پس منظر میں واقعاتی مزاح کی جو تصویر نسیم حجازی نے بنائی ہے وہ بھی لاجواب ہے۔''[2]

---

[1] آخری چٹان، نسیم حجازی، ص ۳۴۸ تا ۳۴۹۔

[2] نسیم حجازی بحیثیت تاریخی ناول نگار، مشمولہ سیارہ، ڈاکٹر شفیق احمد، شمارہ ۴۵، ص ۱۰۰۔

خاک اور خون کا تنقیدی جائزہ

اس ناول کا خلاصہ اور واقعات کا تحقیقی جائزہ پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ اب اس ناول کے پلاٹ، کردار، منظر نگاری اور مکالموں کے فنی پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے گا۔

پلاٹ

ناول خاک اور خون کا پلاٹ سادہ مگر انتہائی دلچسپ ہے کیونکہ قاری انتہائی یکسوئی کے ساتھ تمام تر توجہ اور انہماک کے ساتھ اس میں کھو جاتا ہے۔ کہانی میں مختلف مقامات پر کشمکش اور اتار چڑھاؤ کے ذریعے تجسس پیدا کیا گیا ہے جو دلچسپی میں مزید اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ پلاٹ کی ترتیب انسانی زندگی کے خدوخال سے مرتب کی گئی ہے۔ ناول نگار نے ابتداً ان کرداروں کا بچپن پیش کیا ہے جو پلاٹ کے مرکزی کردار ہیں پھر معاشرے کے مختلف طبقات کا تعارف پیش کر کے پلاٹ کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ زندگی کا جیتا جاگتا روپ قاری کے سامنے آ جائے۔ جو بات تقسیم برصغیر کا باعث ہوئی اس پہلو کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ گاؤں کے واقعات کی ترتیب سلیم کے بچپن کے دور سے شروع ہوتی ہے کہ جب تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی سبھی بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے اسکول سے فارغ ہونے کے بعد دیگر مشاغل میں ان کی دلچسپیاں دکھائی گئی ہیں دورِ طالب علمی، پرائمری سے سیکنڈری تک بڑھتا ہے۔

دوسری طرف، گاؤں کے لوگوں کا رہن سہن اور ان کے درمیان تعلقات کی نوعیت، ساتھ ہی ان کے مشاغل کا حال پیش کیا گیا ہے۔ اسکول سے واپسی پر بچوں کے درمیان ہونے والا جھگڑا اور پھر اس میں گاؤں کے بڑوں کی شرکت، تعلقات اور ان کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ تعلیم کے ایک دور کا خاتمہ طالب علموں کو بکھیر دیتا ہے سوائے چند کے باقی تمام اپنی عملی زندگیوں کا آغاز کرتے ہیں۔ سلیم اعلیٰ تعلیم کے حصول میں کوشاں ہے ساتھ ہی تحریک پاکستان کے مختلف ادوار کا حال بھی ناول نگار نے اس خوبصورتی سے سمویا ہے کہ ربط و تسلسل کی بہترین کوشش کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات اور ان کے نتیجے میں بننے والی کانگریسی حکومتوں کا متعصبانہ رویہ، ان کے خاتمے پر مسلمانوں کا یومِ نجات منانا اور پھر ۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان کی منظوری بھی پلاٹ میں اس خوبصورتی سے شامل ہے کہ معاشرتی اور سیاسی حالات یکجا ہو گئے ہیں۔ سلیم دورِ طالب علمی میں اپنے مضامین لکھ کر جدوجہد پاکستان میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتا ہے تو بعض دیگر دوست تقریروں کے ذریعے اپنا حصہ ادا کر رہے تھے لیکن نوجوانوں کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو تقسیم برصغیر کی مخالفت کر رہا تھا یہی نہیں مسلمان علماء کا ایک طبقہ ایک ہاتھ میں قرآن لیے دوسرے ہاتھ سے اپنے مسلمان بھائیوں کو غلامی کا طوق پہنانے میں مصروف تھا، یہ وہ موقع تھا کہ جب طالب علموں کو میدانِ عمل میں آنا پڑا۔ قریہ قریہ، بستی بستی جلسوں کے ذریعے مسلم لیگ کے مقاصد اور آزادی کی تحریک کے اغراض سے عوام الناس کو باخبر کیا جانے لگا۔ اس دوران فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑے۔ سلیم کا گاؤں ان سے محفوظ رہا ابتدائی اعلان آزادی کے مطابق ضلع گورداسپور پاکستان میں شامل ہونا تھا اس لیے مسلمانوں نے اپنے سکھ اور ہندو بھائیوں کو امن و امان برقرار رکھنے کی یقین دہانی کرائی لیکن پھر ریڈکلف ایوارڈ کے اعلان نے حالات

کا نقشہ بدل دیا۔ وہ کالج سے گاؤں اپنی چچازاد کی شادی میں شرکت کے لیے آیا تھا کہ اسے مختلف حادثات سے دو چار ہونا پڑا۔ پہلے اپنے والد کے اچانک زخمی ہونے اور پھر شہادت پا جانے کے بعد انہیں اپنے گاؤں پر بلوائیوں کے حملے کا علم ہوا۔ جب وہ گاؤں پہنچے تو غیر مسلح مسلمان تہ تیغ کیے جا رہے تھے۔ سلیم اور مجید نے انتہائی ہوشیاری سے کچھ ہتھیاروں پر قبضہ کیا اور پھر ایک مورچہ سنبھال لیا یوں لڑائی طول پکڑ گئی بلوائیوں کو وقتی طور پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اگلے روز صبح سویرے بلوائی فوج اور پولیس کی مدد کے ساتھ اس گاؤں پر حملہ آور ہوئے سہ پہر تک مقابلہ جاری رہا یہاں تک کہ لڑنے والے زخمی ہوئے اور بے ہوش ہو گئے۔ بلوائیوں نے پوری حویلی کو نذر آتش کر دیا ہوش آنے پر مجید سلیم اور داؤد پھر مجتمع ہوئے اور جلے ہوئے ملبے کی راکھ ایک رومال میں باندھ کر پاکستان کی جانب روانہ ہوئے یہاں پلاٹ اس قدر جاندار اور دلچسپ ہے کہ قاری اشک بار آنکھوں کے ساتھ اس کے مطالعے کو جاری رکھتا ہے اور چونکہ یہ واقعات اس قدر حقیقی ہیں کہ تصویریں خود بخود آنکھوں کے سامنے بنتی رہتی ہیں یہ لٹا پٹا قافلہ آگے کی جانب رواں دواں تھا بہت سے لوگ اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے اور پھر بعض مقامات پر رکاوٹوں سے بھی سامنا پڑا ایک نہری پل کو عبور کرنے کے لیے انھوں نے ڈوگرہ سپاہیوں کو موت کی نیند سلا دیا مگر لاہور کے قریب پہنچ کر بھی پُل پر سے دریا پار کرنا ممکن نہ تھا۔ کشتیوں کے ملاح کثیر رقم کا مطالبہ کر رہے تھے اس موقع پر سلیم نے کینہ اور لالچ ختم کر کے اور اخوت پیدا کر کے ملاحوں کو راضی کر لیا پھر اسے عصمت کے خاندان کا خیال آیا۔ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اس کے گاؤں پہنچا تو ان کی حویلی میں لاشوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ عصمت کی ماں اور بھائی انتہائی افسوسناک حالت میں قتل کیے گئے تھے۔ انہوں نے تلاش جاری رکھی اور اس حویلی تک جا پہنچے جہاں مسلمان لڑکیاں بے آبرو کی جا رہی تھیں۔ ڈرامائی انداز میں تمام لوگوں کو یرغمال بنا لیا پھر مسلمان لڑکیوں کو چھڑا کر خاصے ہتھیاروں پر قبضہ کر لینے کے بعد اس حویلی کو آگ لگا دی اور پھر اسی مقام پر واپس پہنچے۔ لوگ دریا عبور کرتے رہے اسی دوران داؤد بھی شہادت کی منزل کو پا گیا۔ سلیم بیمار ہو گیا بلوائیوں کے حملے اس مقام پر بھی ہو رہے تھے کہ بلوچ رجمنٹ کے ایک چھوٹے سے دستے نے تمام مہاجرین کو بحفاظت پاکستان پہنچایا۔ جہاں پہنچ کر سلیم کشمیر کے محاذ پر چلا گیا زخمی حالت میں وہ اسپتال لایا گیا اس کی ٹانگ کاٹ دی گئی اور پھر وہ صحت یاب ہو کر عصمت کے گھر آ گیا اس کی شادی عصمت سے ہوئی ناول کا خاتمہ اس مقام پر ہوتا ہے کہ جب مجید اپنی بٹالین کے ساتھ سلیم کو سلامی دیتا ہوا کشمیر کے محاذ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ انتہائی مضبوط اور مستحکم ہے بہترین انداز میں پلاٹ کی تعمیر اور ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے حالانکہ اسی موضوع پر دیگر ناول نگاروں کا موازنہ کیا جائے تو انھوں نے تحریک پاکستان کے مختلف تاریخی واقعات کو قلمبند تو کیا ہے مگر فسادات کے موضوع سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے مثال کے طور پر خدیجہ مستور نے اپنے ناول آنگن میں تحریک پاکستان کے تمام واقعات کو تاریخی حقائق کے مطابق پیش کیا ہے اور اپنے کرداروں کے ذریعے وہ کچھ کہلوانے کی کوشش کی ہے جو جدوجہد پاکستان کی آواز کہے جا سکتے ہیں مثلاً جمیل جنگ عظیم دوئم کے لیے پروپیگنڈا مہم کا شعبہ اختیار کرتے ہیں تو شمیم مسلم لیگ کے مظلوم کارکن کا روپ دھارتی ہے اور بڑے چچا کانگریس کے حامی ہیں اس سب کے باوجود فسادات کے موضوع سے اس خوبی کے ساتھ خود کو الگ کیا کہ

ہجرت کے معاملے کو ہوائی جہاز کے سفر کے ذریعے محض چند سطور تک محدود کر دیا اس کے مقابلے میں عبداللہ حسین نے اپنے ناول اداس نسلیں میں تحریک پاکستان کے موضوع کو بڑی خوبصورتی سے سمونے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے پلاٹ میں بھی فسادات کا موضوع اتنے بھرپور اور مضبوط انداز میں موجود نہیں جتنی اس کی ضرورت تھی جبکہ قرۃ العین حیدر کا ناول آگ کا دریا بھی ہجرت کے موضوع پر ہونے کے باوجود محض چند مثالوں تک فسادات کے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے یا دوسرے لفظوں میں ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی بے بسی کا نوحہ کہا جا سکتا ہے، ان کے برعکس نسیم حجازی نے خاک اور خون کے پلاٹ کا کثیر حصہ فسادات کے موضوعات کے لیے مختص کیا اور انھوں نے واقعات کے فنی امکانات سے پورا فائدہ بھی اٹھایا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر ممتاز منگلوری لکھتے ہیں:

''جزئیات کی احسن ترتیب اور ان میں منطقی ربط کا دوسرا نام پلاٹ ہے۔ ہر ناول نگار کے ذہن میں بنیادی طور پر اپنے ناول کا ایک خمیر موجود ہوتا ہے اور وہ ناول لکھنے سے پہلے اپنے لیے واقعات کی ترتیب کا بنیادی خاکہ ضرور مرتب کر لیتا ہے، جو ناول کی تکمیل تک بسا اوقات کئی صورتیں بدلتا ہے۔ جزئیات کی عمدہ ترتیب سے پلاٹ میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے، حقیقت کا رنگ بھی گہرا ہوتا ہے اور مطلوبہ ماحول بھی بنتا ہے۔''[۱]

یہی وجہ ہے کہ نسیم حجازی نے خاک اور خون کے پلاٹ کو ترتیب دیتے ہوئے معاشرے اور طبقات کے فرق کو ان کے ذہنی شعور کے مطابق پیش کیا ہے پھر اس کشمکش کا اظہار ہے جو اقتدار کی رسہ کشی کہی جا سکتی ہے جس کے نتیجے میں رونما ہونے والے حادثات پیش کیے ہیں جو تاریخ انسانی کے لیے ایک عظیم المیہ اور حقوق انسانی کے نام پر ایک دھبا کہے جا سکتے ہیں پلاٹ کا استحکام اور ربط و تسلسل اس قدر کامیاب ہے کہ اس موضوع پر لکھے جانے والے کسی بھی ناول سے اس کا موازنہ نہ کیا جا سکتا ہے۔

کردار:

ناول کی کامیابی کے لیے کردار نگاری کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ کرداروں کی حرکات و سکنات، بول چال، رہن سہن قاری کے ذہن میں اپنی جگہ بناتے ہیں۔ کردار نگاری جس قدر خوب صورت ہوگی ناول اسی قدر جاندار اور مضبوط کہا جائے گا کیونکہ واقعات کی ترتیب کرداروں کی حیثیت، منصب اور ان کے شعور کے مطابق ہونی چاہیے۔ بول چال کے الفاظ یا انداز کلام کردار کے ذہنی اور معاشرتی مقام کے مطابق ہونا چاہیے۔ ناول خاک اور خون کے بہت سے کردار اپنی مثال آپ ہیں ان میں سب سے اہم سلیم کا کردار ہے۔ اس کردار کی تعمیر میں ناول نگار نے اسے بچپن کی معصوم حرکات سے پختگی کی عمر میں سنجیدگی اور متانت کے روپ میں پیش کیا ہے اس کو ابتدا میں گھڑ سواری کا شوقین، بہادر اور باحوصلہ دکھایا گیا ہے۔ اگرچہ یہ کردار ہماری داستانوں کے دیگر کرداروں کی طرح سرتا پا مثالیت کے رنگ میں تو نہیں ڈوبا ہوا البتہ عمومی زندگی گزارتے ہوئے اس کے جن رویوں کو واضح کیا گیا ہے۔ وہ عام انسانوں میں ذرا مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ یہ کردار پورے طور پر مثالی اس لیے نہیں کہ داستانوں کے کرداروں کی طرح یہ مشکل پر آخر کار قابو نہیں پا سکتا۔

۱۔ شہر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ص ۳۷۔

نہ یہ کسی ملک کا بادشاہ ہے، نہ جن اور پریاں اس کے تابع ہیں اور نہ اس سے کسی اور طرح کے مافوق الفطرت کارنامے انجام پاتے ہیں لیکن یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ بیک وقت شاعر بھی ہے اور افسانہ نگار بھی سپاہی بھی ہے اور مفکر بھی۔ اس کے علاوہ انسانی زندگی کو جن پسندیدہ اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان سب سے متصف ہے اور اس کردار میں کوئی ایسی کمزوری یا خرابی بھی نہیں جو انسانی زندگی کے تقاضوں کا لازمہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کردار کی زندگی میں کچھ واقعات ایسے ضرور ہیں جو اسے مثالی کردار کا روپ دے دیتے ہیں مثلاً عام لڑکوں کے برعکس یہ اسکول میں کبھی مار نہیں کھاتا اور اگر اس سے کوئی غلطی سرزد بھی ہوتی ہے تو محض ڈانٹ ڈپٹ پر معاف کر دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ خیال گزرتا ہے کہ شاید سلیم کے بچپنے سے اس سے وہ تمام امیدیں وابستہ کر لی گئیں جن پر یہ کردار آگے چل کر پورا اترا۔ عقل و دانش کے معاملے میں بھی بعض اوقات یہ کمسن بچہ مافوق الفطرت انداز میں ہمارے سامنے آتا ہے مثلاً جب ایک مرتبہ اس کے چچازاد بھائی مجید نے اسے اسکول جانے سے روکا ہے اور بات یہاں تک بڑھی کہ مجید نے سلیم کو ایک چپت رسید کر دیا تو بچپنے کے باوجود سلیم کا رویہ کسی بہت بڑے فلسفی کے رویے سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ مثلاً نسیم حجازی لکھتے ہیں:

''سلیم چند لمحے اپنی جگہ پر کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ پہلا چپت تھا جو اس نے مجید کے ہاتھ سے کھایا تھا لیکن اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور اس کی نگاہیں مجید کے چہرے پر مرکوز تھیں سلیم اچانک مڑا اور کسی سے بات کیے بغیر اسکول کی طرف چل دیا۔ گاؤں کے دوسرے لڑکے جلال، بشیر، رام لال اور گلاب سنگھ اس کے پیچھے چل دیے[۱]

غور کریں تو معلوم ہوگا کہ سلیم کا یہ نفسیاتی جذبہ اس کی کمسنی کے پس منظر میں کتنا بڑا واقعہ ہے۔ وہ لڑکا جو صرف گالی دینے پر اپنی تختی سے دوسرے لڑکے جلال کا سر پھوڑ دیتا ہے۔ وہ سلیم جو ذرا سی بات پر موہن سنگھ اور اس کے ساتھیوں کا بھرکس نکال دیتا ہے۔ وہ سلیم جس کی رائفل کی گولیاں دشمنوں کے سینے میں اترتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتیں، وہی سلیم اپنی زندگی کے پہلے چپت پر صبر و استقلال کا رویہ اپناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نفسیاتی حربہ جو اس نے اختیار کیا اس کی عمر کے اعتبار سے اس کے ردِعمل کو مثالیت کا رنگ دیتا ہے۔ ناول کے اختتام پر اس نے جو کتاب یا پیغام مرتب کیا وہ اس کے بچپن کی جبلت کا آئینہ دار ہے۔ وہ بچپن ہی سے کہانیاں سنانے والا تھا تو ناول نگار نے دورِ شباب میں قوم کا درد اس کے دل و دماغ میں جاگزیں کر دیا۔ انسانی فطرت کے مطابق عشق و محبت اور حسن شناسی سلیم کے مزاج میں بھی شامل تھی وہ عصمت سے نہ صرف محبت کرتا ہے بلکہ اس کی خاطر بڑے بڑے خطرات سے کھیل جانا چاہتا ہے۔

ناول کا دوسرا کردار عصمت کا ہے۔ جس کی تعمیر بھی بچپن کی معصوم اداؤں سے عہدِ شباب کے باہوش اور ولولہ انگیز دور تک کی گئی ہے۔ اسے بچپن سے کہانیاں سننے کا شوق اس شہزادے کا متلاشی و متمنی بنا دیتا ہے جو اسے اپنا لے تمام تر مشرقی روایات اور پنجاب کی مخصوص اقدار کی پاسدار عصمت زندگی کے کئی مواقع پر خود کو طوفان اور بھنور میں محسوس کرتی ہے مگر کہانیوں کی طرح اس کا شہزادہ اسے تمام مصیبتوں سے چھٹکارا دلا کر خوشگوار چھاؤں میں بٹھا دیتا ہے۔ وہ سلیم کی ہر ادا کی متوالی اور اس کے ہر روپ کی پوجا کرنا اپنا فرض

---

[۱] خاک اور خون، نسیم حجازی، ص ۳۴۔

جاتی ہے یہاں تک کہ سلیم کی معذوری بھی اسے مستقبل کا ساتھی بنانے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ اس سب کے باوجود یہ اپنی نیکی، طبعی شرافت اور خدمت کے باوجود صفیہ اور ثریا کے مقابلے میں بے جان کردار ہے۔ اس میں نہ زندگی کی ہماہمی ہے اور نہ شوخی اور جانداری۔ مرکزی کردار ہونے کے باوجود اس کردار میں ایک ٹھہراؤ، سکون اور سادگی ہے۔ نہ اسے عشق میں مضطرب پاتے ہیں اور نہ اس کی آنکھوں میں وفا کے دیپ جلتے ہیں۔ نہ یہ کردار عہد و پیماں کرتا نظر آتا ہے اور نہ سلیم سے وفاؤں کی بھیک مانگتا ہے۔ اس کی شوخی و طراری بھی زیادہ سے زیادہ اس بات تک محدود ہے کہ وہ سلیم کے سامنے اپنے چھوٹے بھائی امجد کو کٹر کانگریسی کہہ دے اس طرح دیکھا جائے تو یہ کردار خاک اور خون کا دوسرا مرکزی کردار ہونے کے باوجود بے جان ہے لیکن اس کردار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اپنے عہد، تہذیب، معاشرت اور مذہبی اصولوں کی پاسداری کرتا ہے اور دیکھا جائے تو حقیقت نگاری کے تمام تقاضوں پر پورا اترتا ہے اگر نسیم حجازی اس کردار کی پیشکش میں ان رویوں کی عکاسی کرتے جن کا تقاضا مغربی ناقدین کرتے ہیں تو شاید یہ کردار شوخ و طرار تو ہوتا لیکن اس کا اپنی معاشرت سے رشتہ منقطع ہو جاتا۔ اس لیے کہ پنجاب کے مسلمان سختی سے پردے کے پابند ہونے کی وجہ سے جس زندگی کے عادی ہیں، ان کے تقاضوں پر یہ کردار پورا اترتا ہے اور یوں اس میں حقیقت نگاری کا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

ناول کا ایک کردار مجید ہے جو سلیم کا عزیز ہی نہیں ایک بہترین دوست بھی ہے ان دونوں کے دکھ اور خوشیاں ایک جیسی ہیں۔ ایک قوم کے لیے عملی جہاد میں حصہ لیتا ہے تو دوسرا مجاہدین کی تیاری میں۔ مجید نے اپنا سب کچھ لٹا دیا مگر آزاد فضاؤں میں سانس لینے کے خواب کو حقیقت کا روپ دیا یہیں تک نہیں بلکہ غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے کے لیے عملی طور پر نکل گیا۔ ناول کے بعض کردار انتہائی متاثر کن ہیں لیکن ان کا دائرہ اثر محدود ہے ان کی حرکات و سکنات کے ذریعے ناول نگار نے حقیقی زندگیوں کو جیتا جاگتا دکھایا ہے۔ ان میں رمضان کا دیہاتی کردار جو بے وقوفی کی حد تک سادہ ہے مگر اس کی ضعیف الاعتقادی گاؤں کے ماحول میں لوگوں کو مسکرانے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس کی یہ سادگی بھولپن کی حد تک دلچسپ ہے اسٹیشن پر جب وہ بہت سی ہانڈیاں لے آیا اور ٹکٹ بابو وزن کی زیادتی پر رقم کا مطالبہ کرتا رہا تو اس نے ایک ایک کر کے تمام ہانڈیاں توڑ ڈالیں تو دوسری طرف اس کی چھت پر بیل چڑھ جانے کا معاملہ اور اس کے پیر کی حرکات و سکنات محفل کو باغ و بہار بنانے کا باعث بنتی تھیں۔

ہندو کرداروں کو ان کی دھوکا دہی اور بزدلانہ حرکات کی وجہ سے خاصے موثر انداز میں پیش کیا ہے جبکہ سکھوں کے کردار انتقامی ذہنیت کے مالک اور بنا کچھ سوچے سمجھے حد سے گزر جانے والے پیش کیے ہیں۔ عیسائیوں کو ان کے مصالحانہ کردار میں پیش کیا ہے۔ اس سب کے باوجود تمام تر ذہنی اور مذہبی وابستگی سے بالاتر دوستیوں کے بندھن میں بندھے وہ سکھ کردار بھی ہیں جو حقیقت شناس ہی نہیں انسان دوست بھی ہیں۔ جن میں مہندر سنگھ اور روپا کے کردار اپنی انسان دوستی اور حقیقت پسندی کا آئینہ دار کہے جا سکتے ہیں۔ ناول نگار نے تاریخی کرداروں کو ان کی اصل صورت ہی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جن میں بھیم سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ کے کردار اپنی مسلم دشمنی کا منہ بولتا ثبوت نظر آتے ہیں تو نہرو اور گاندھی کی شخصیات بغل میں چھری رکھ کر رام رام کا راگ الاپنے کا انداز لیے ہوئے ہیں

ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی تمام تر مسلم نوازی کے باوجود نیشنلسٹ نظریات کے طفیل مسلمانوں کو غیر ارادی طور پر ایک غلامی سے نکال کر دوسری غلامی کی طرف لے جاتے نظر آتے ہیں۔ محمد علی جناح، لیاقت علی خان اور سہروردی کے کردار ثابت قدمی اور ایفائے عہد کی پاسداری کے علمبردار ہیں۔ وہ ظلم سہہ کر مسکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو اپنے مظلوم بھائیوں کو صبر کی تلقین کرتے دکھائی دیتے ہیں اگر مجموعی طور پر نسیم حجازی کی کردار نگاری کا جائزہ لیں تو وہ اپنے ہیرو کو خاص طور سے اور عام طور پر اپنے تمام پسندیدہ کرداروں کو غیر معمولی صلاحیت اچانک دکھاتے ہیں ان کے ان پسندیدہ کرداروں میں حد سے زیادہ خود اعتمادی بھی ہوتی ہے۔ ان کے تخلیق کردہ کردار ناول کا حصہ ہونے کے باوجود تاریخ سے زیادہ روزمرہ زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ حالانکہ ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں کا خیال ہے:

''کردار ناول نگار کے اپنے نظریات، قدریں یا اچھے برے تصورات ہوتے ہیں جن کو وہ انسان کے قالب میں پیش کر دیتا ہے چونکہ ناول نگار ان کرداروں کا خالق ہوتا ہے اس لیے ان کی تخلیق میں ان کا مشاہدہ، تجربہ اور افتادِ طبع شامل ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ناول نگار کے کردار زندگی کے عام کرداروں سے ملتے جلتے ہونے کے باوجود مختلف ہوتے ہیں۔''[1]

جبکہ ایسا نہیں ہے ناول نگار کا منصب یہی ہے کہ وہ کرداروں کو جیتا جاگتا پیش کرے اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ڈاکٹر شفیق احمد رقمطراز ہیں:

''خاک اور خون'' کے مرکزی کردار، سلیم کے گاؤں میں موجود بعض مزاحیہ کرداروں مثلاً ''رمضان'' وغیرہ کو نسیم حجازی نے جس انداز میں پیش کیا ہے وہ نسیم حجازی کے سحر طراز قلم کا حصہ ہے۔''[2]

یہی وجہ ہے کہ ان کی کردار نگاری خاصی مضبوط اور جاندار ہے۔ جس قسم کا معاشرہ اور اس میں رہنے بسنے والوں کو پیش کرنا چاہتے ہیں اس میں خاصے کامیاب ہیں۔

مکالمے:

مکالمے کرداروں کی حیثیت اور معاشرے میں ان کے مقام کو متعین کرنے میں مددگار ہوتے ہیں کیونکہ جس حیثیت کا فرد ہوگا اسی قسم کی گفتگو کرے گا۔ بچے سے معصومانہ الفاظ اور حرکات کا ہونا ایک فطری عمل ہے تو صنفِ نازک سے شرم و حیا اور نازک مزاجی کا انداز اختیار کرانا ایک بنیادی ضرورت ہے۔ نسیم حجازی اپنے ناولوں میں مکالموں کی ادائیگی ان کے زبان و بیان اور جس کردار سے وہ ادا کرائے جا رہے ہیں ان پر خاصی توجہ دیتے ہیں نسیم حجازی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ خاصے طویل مکالمے اور بعض مواقع پر لمبی لمبی تقاریر کو شامل کرتے ہیں لیکن خاک اور خون کا یہ وصفِ خاص ہے کہ سوائے ان چند تقاریر کے جو بعض مباحثوں یا سیاسی جلسوں کے توسط سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ خاک اور خون میں طویل مکالمے نہیں آتے اور جہاں کہیں تقاریر آتی ہیں تو اس کا جواز بھی فراہم کر دیا گیا ہے اور سب سے بڑا جواز برِعظیم کے طول و عرض میں موجود سیاسی تغیرات ہیں اور چونکہ سیاسی بیداری نے ہر خاص و عام کو متاثر کیا اس

---

[1] اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء: ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں، ص ۱۲۱۔

[2] نسیم حجازی بحیثیت تاریخی ناول نگار مشمولہ سیارہ: ڈاکٹر شفیق احمد، جلد ۱۵، شمارہ ۳۱، ص ۱۰۰۔

لیے ان تقاریر اور طویل مکالموں کی گنجائش تسلیم کی جا سکتی ہے۔ یوں بھی ناول میں مختصر مکالمہ نویسی سے کام لیا گیا ہے اور ان کا یہ اختصار کسی طرح تشنگی کا سبب بھی نہیں بنتا اور کرداروں کا انداز فکر اور ان کی سوچ کے مختلف رخ بھی سامنے آتے ہیں۔ مثلاً سلیم اور مجید کے درمیان مکالموں کا انداز ملاحظہ کیجیے:

''مجید نے لگام ایک ٹہنی کے ساتھ باندھ دی اور سلیم سے پوچھا۔ ''یہاں کیا دکھاؤ گے مجھے؟''

سلیم نے کہا۔ ''پہلے وعدہ کرو کہ تم انھیں مارو گے نہیں!''

''کیسے؟''

''یہ پھر بتاؤں گا، پہلے وعدہ کرو!''

''اچھا میں انھیں نہیں ماروں گا۔''

''یہ بھی وعدہ کرو کہ تم انھیں اٹھا کر گھر نہیں لے جاؤ گے!''

''اچھا''۔[۱]

اسی طرح ایک اور مثال دیکھیے۔ یہاں بھی مکالمہ نگاری کا اختصار نظر آتا ہے۔

''ایک دن شیر سنگھ اپنے بھائیوں اور باپ کے ساتھ کھیت میں چارا کاٹ رہا تھا کہ افضل اپنی گھوڑی بھگاتا ہوا قریب سے گزرا۔ شیر سنگھ اپنا کام چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر گھوڑی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بھائی بھی کام چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

شیر سنگھ کے باپ اندر سنگھ نے کہا ''کیا دیکھتے ہو شیر سنگھ! تم نے گھوڑی کبھی نہیں دیکھی''

شیر سنگھ نے کہا۔ ''باپو! یہ گھوڑی بڑی اچھی ہے۔''

اندر سنگھ نے کہا۔ ''افضل کو اس گھوڑی پر بڑا گھمنڈ ہے۔ اس نے تمھیں دکھانے کے لیے گھوڑی کو تیز کیا تھا۔''

شیر سنگھ نے کہا ''باپو! ایک دن میں اپنے گھوڑے پر شہر کی طرف جا رہا تھا۔ افضل میرے پاس سے گھوڑی کو سرپٹ دوڑاتا ہوا گزر گیا۔ وہ میری طرف مڑ مڑ کر دیکھتا اور ہنستا تھا۔''

اندر سنگھ درانتی زمین پر پھینک کر کھڑا ہوا گیا اور پھر اپنی چادر اٹھا کر کندھے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''شیر سنگھ، افضل کا بھائی اگر تحصیل دار ہو گیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ میں تمھیں ایسی دس گھوڑیاں خرید کر دے سکتا ہوں میں آج ہی رقم کا بندوبست کرتا ہوں۔''[۲]

مذکورہ مکالمے نہ صرف اپنے اختصار کی وجہ سے قابلِ توجہ ہیں بلکہ اس میں اچھے مکالمے کی چند اور خوبیاں بھی موجود ہیں مثلاً اس سے کرداروں کی نفسیات پر روشنی پڑتی ہے۔ اندر سنگھ کے بارے میں یہ پتا چلتا ہے کہ وہ ایک ان پڑھ انسان ہے اور اپنے کھیت بیچ کر یا لوگوں سے قرض لے کر محض انا کے مسئلے کی بنا پر گھوڑی خرید لیتا ہے۔ اس کے علاوہ مکالمے میں یہ خوبی بھی ہے کہ کردار اپنی حیثیت کے

---

[۱] خاک اور خون، نسیم حجازی، ص ۱۵۔

[۲] ایضاً، ص ۶۵،۶۶۔

مطابق زبان بولتے نظر آتے ہیں۔ شیر سنگھ چونکہ سکھ ہے اس لحاظ سے جملے میں باپ کی جگہ باپو کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کرتا ہے کہ یہ جملہ بولنے والا مسلمان نہیں ہے۔ ان کے مختصر مکالموں میں بعض اوقات مزاحیہ رنگ بھی آ جاتا ہے اور طنز کے تیر بھی چلتے ہیں اور جہاں نسیم حجازی مزاحیہ یا طنزیہ اسلوب اختیار کرتے ہیں وہاں مکالموں کی اثر آفرینی لطافت اور دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً سلیم پہلی بار تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو الطاف نے اس کی شاعری پر طنزیہ انداز میں کہا:

''سلیم صاحب! پاکستان کے متعلق تقریر کریں گے یا کوئی قصیدہ سنائیں گے۔''

آفتاب نے فوراً جواب دیا۔ ''سلیم صاحب ملت فروشوں کا مرثیہ پڑھیں گے۔'' [۱]

اس کے علاوہ وہ مکالمات بھی بڑے دلچسپ ہوتے ہیں جہاں راز و نیاز کی گفتگو کی جائے اور بعض بہت اہم اور حساس مسائل کو موضوع بنایا جائے۔ مثلاً ارشد کی والدہ نے سلیم اور عصمت کے جوڑے اور ان دونوں کی شادی کا ذکر کیا تو ڈاکٹر شوکت جواب دیتے ہیں:

''بس وہی عورتوں والی بات، بچہ ابھی گود میں ہوتا ہے اور شادی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں!''

وہ بولی۔ ''ذرا دیکھو تو اٹھ کر، یہ جوڑا کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے میں تو کہتی ہوں دو تین برس کے بعد بات پکی ہو جائے۔ آج کل اوّل تو اچھے خاندان نہیں ملتے اور اگر خاندان مل جائے تو لڑکے آوارہ ہوتے ہیں!''

ڈاکٹر صاحب نے قدرے نرم ہو کر کہا۔ ''بھئی خاندان تو بہت اچھا ہے، اب لڑکے کو بھی اچھی تعلیم دلوائیں تو دیکھا جائے گا!''

''وہ کوئی نادار تھوڑے ہیں۔ اس کی ماں کہتی ہے کہ ہم اپنے لڑکے کو اچھی تعلیم کے لیے ولایت بھیجیں گے!''

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بھئی اگر وہ ولایت سے ہو آیا تو پھر تم کوئی توقع نہ رکھنا۔ پھر وہ نہ ان کا نہ ہمارا۔'' [۲]

ان مکالمات کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بطن سے کرداروں کے احساسات، جذبات، ان کے رویے، ان کی نفسیات اور ان کے معاشرتی تعلقات کی وضاحت ہوتی ہے۔ ان میں عہد کے مسائل کے بارے میں لوگوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت اور زبان و بیان کی اہمیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں مکالموں کی اہمیت کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''مکالموں کے لیے ضروری ہے کہ وہ برجستہ اور مناسب ہوں۔ کردار کی شخصیت، اس کی خصوصیات، اسکے رتبہ اور ماحول سے مطابقت رکھتے ہوں، پُرتصنع نہ ہوں، عام زندگی کی گفتگو سے مناسبت رکھتے ہوں۔'' [۳]

اس رائے کو مدنظر رکھ کر نسیم حجازی کے مکالموں کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ نسیم حجازی کے مکالمے اس اصول کے عین مطابق ہیں۔

منظر نگاری:

ناول نگار اپنے قلم کا سہارا لے کر کہانی کے واقعات کو اس انداز میں پیش کرنے میں کامیاب ہو جائے کہ وہ مناظر جنہیں وہ

۱۔ خاک اور خون: نسیم حجازی، ص ۲۲۲، ۲۲۳۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۸۳۔

۳۔ اُردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء، ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں، ص ۱۶، ۱۲۔

پیش کر رہا ہے حقیقت کے اس قدر قریب معلوم ہوں کہ قاری کو پڑھتے ہوئے اپنی نظروں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آئیں یا دوسرے لفظوں میں الفاظ کے ذریعے تصویریں بنادے اور تصویریں بھی جیتی جاگتی۔ موضوع اور حالات کا عمل دخل اور اس کی بہترین عکاسی ناول نگار کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ ناول خاک اور خون کا موضوع تقسیم برصغیر کے واقعات کا آئینہ دار ہے اور یہ واقعات نصف صدی پہلے کے ہیں اور ابھی اس تسلسل کے کچھ لوگ زندہ ہیں جو ان واقعات کے چشم دید گواہ ہیں اس لیے جب یہ واقعات ان کے سامنے آتے ہیں تو وہ آنکھیں بند کر کے ان مناظر کو خوب خوب محسوس کرتے اور ایک آہ بھر کر ان کی حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ فسادات کے حوالے سے جب اس منظر کو کسی بھی ایسے شخص کے سامنے پیش کیا جائے جو اس تکلیف دہ کیفیت سے گزر چکا ہے تو وہ اس کے بالکل درست ہونے پر گواہی دیتا ہے اور کیوں نہ دے معاشروں کی بنیاد اعتماد پر قائم ہے لیکن جہاں عصبیت اپنا رنگ جما لے تو یہ کیفیت سامنے آتی ہے بقول ناول نگار:

''رمضان نے کہا۔ ''تم سب یہاں کیا کر رہے ہو، گاؤں پر حملہ ہو چکا ہے۔ سنو! رحمت علی کی حویلی کی طرف گولیاں چل رہی ہیں۔ جاؤ، انھیں روکو۔ آج تک باہر کے کسی بدمعاش کو اس گاؤں میں دم مارنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ آج تمھاری بہو بیٹیاں بدمعاشوں کی گالیاں سن رہی ہیں اور تم یہاں بیٹھ کر شراب پی رہے ہو۔ ایسے موقعوں پر مرد گھروں میں نہیں بیٹھا کرتے۔ یہ گاؤں کی عزت کا سوال ہے۔ پچھمن سنگھ انہیں نکالو!''

ایک سکھ نے آگے بڑھ کر رمضان کی داڑھی پکڑ لی اور دوسرے قہقہے لگانے لگے۔

پچھمن سنگھ نے کہا۔ ''بھئی جو کرنا ہے، جلدی کرو۔''

ایک سکھ نے کہا۔ ''کیوں بھئی تیرا جھٹکا کریں یا تجھے ذبح کریں؟''

رمضان کی بیوی چلائی۔ ''اسے چھوڑ دو، اسے چھوڑ دو۔ خدا کے لیے پچھمن سنگھ تم نے اسے بھائی بنایا تھا!''

دوسرے سکھ نے کہا۔ ''مارو اس بڑھیا کو!'

رمضان نے کہا۔ ''دیکھو بھئی بوڑھے آدمی سے ایسا مذاق اچھا نہیں ہوتا!''

ایک سکھ نے کرپان بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''تجھ سے مذاق کرنے والے کی ایسی تیسی۔'' لیکن پچھمن سنگھ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ ''بھئی یہاں نہیں۔ اسے باہر لے جاؤ!''

رمضان کی بیوی چیختی چلاتی آگے بڑھی لیکن پچھمن سنگھ نے اسے زور سے دھکا دیا اور وہ چند قدم دور جا گری۔ تین سکھ رمضان کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے حویلی کے صحن میں لے گئے اور دو وہیں رہے۔ رمضان کی بیٹی نے آگے بڑھ کر پچھمن سنگھ کی بیوی کا بازو پکڑ لیا۔ ''چچی! تم نے مجھے بیٹی بنایا تھا۔ میرے ابا کو بچاؤ۔'' رمضان کی بہو نے کہا۔ ''ماسی! ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو معاف کر دو تم کہا کرتی تھیں کہ علم دین تمھارا پوتا ہے۔ جب یہ پیدا ہوا تھا تو تم نے گڑ بانٹا تھا۔ ہمیں بچاؤ ماسی!''

پچھمن سنگھ کی بیوی پھر بھی ایک عورت تھی، اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔''میری کون سنتا ہے۔اب تم دونوں امرت چکھ لو۔بھابی تم بھی امرت چکھ لو!''

لڑکیاں سہم کر دیوار سے لگ گئیں۔

ایک سکھ نے کہا۔''تم فکر نہ کرو، ہم انھیں امرت چکھالیں گے!''

باہر حویلی کے صحن میں رمضان فریاد کر رہا تھا۔''پچھمن سنگھ میں نے کیا کیا ہے۔تمھاری آنکھیں کیوں بدل گئیں۔میں وہی رمضان ہوں۔تم میری ہر بات پر ہنسا کرتے تھے۔پچھمن سنگھ یاد ہے، جب میں بیمار ہو گیا تھا تو تم کہتے تھے اگر رمضان مر گیا تو گاؤں سونا ہو جائے گا۔آج معلوم ہوتا ہے کہ تم سچ مچ مار ڈالو گے۔خدا کے لیے بتاؤ میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے۔اگر تمھیں اب میرا گاؤں میں رہنا پسند نہیں تو میں کہیں چلا جاتا ہوں۔میرے بیل لے لو، میری بھینسیں لے لو، ساون! صوبہ سنگھ! میں نے تمھارا ابھی کچھ نہیں بگاڑا۔۔۔میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔تمھیں میری ہر بات پر ہنسی آیا کرتی تھی۔آج کیوں نہیں ہنستے تم، آج تمھیں کیا ہو گیا؟ میرے بچوں کو چھوڑ دو، ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔پچھمن سنگھ! بھائی پچھمن سنگھ! نہیں! نہیں! خدا کے لیے۔۔۔۔۔''

ایک سکھ نے کرپان ماری اور رمضان کا سر دھڑ سے علیحدہ ہو گیا۔رمضان کی لڑکی چیخیں مارتی ہوئی باہر نکلی۔ایک سکھ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔اس کی بیوی اور بہو بھی باہر نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں لیکن دو سکھوں نے ان کا راستہ روک رکھا تھا۔کسی نے باہر سے حویلی کے دروازے کو دھکا دیتے ہوئے آواز دی۔''باپو دروازہ کھولو!''

پچھمن سنگھ نے آگے بڑھ کر کنڈی کھولی اور اس کا لڑکا ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔اس نے کہا۔''باپو، جلال مجھ سے بچ کر بھاگ آیا ہے۔اس نے میری کرپان چھین لی ہے!''

سکھوں نے اس پر قہقہہ لگایا۔پچھمن سنگھ نے برہم ہو کر کہا۔''جلال نے تمھاری کرپان چھین لی ہے۔بے حیا کہیں ڈوب مرو!''

لڑکے نے کہا۔''باپو میں نے وار کیا تو اس نے نالے میں چھلانگ لگا دی۔میں نے اس کا پیچھا کیا تو میرے کیس کھل گئے اور وہ کرپان چھین کر بھاگ گیا!''

ایک سکھ نے ہنستے ہوئے کہا۔''اب تک وہ پاکستان پہنچ چکا ہو گا!''

نہیں، وہ اسی طرف آیا ہے۔شاید اپنے گھر میں چھپا ہوا ہو۔۔۔۔میں دیکھتا ہوں!''

پچھمن سنگھ نے کہا۔''بھگت سنگھ اس کے ساتھ جاؤ!

''میں بھی اس کے ساتھ جاتا ہوں۔''ایک اور سکھ نے کہا۔

پچھمن سنگھ کے لڑکے کے ساتھ دو سکھ دیوار پھاند کر رمضان کے گھر میں داخل ہوئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آگئے۔۔

پچھمن سنگھ نے کہا۔''ہمارا فیصلہ ہو چکا ہے۔جلال کی بیوی کے لیے ہم تمھیں دو سو اور بہن کے لیے تین سو دیتے ہیں اور اس

بڑھیا کے لیے ساون سنگھ سے پندرہ بیس روپے لے لو!''

کچھمن سنگھ نے کہا۔''بس اب جلدی سے پیسے نکالو، ورنہ جتھے والے آ گئے تو نیلامی میں ان کی قیمت بڑھ جائے گی اور میرے ہاتھ بھی کچھ نہیں آئے گا!''

کچھمن سنگھ کے لڑکے نے کہا۔''باپو! جلال کی بہن کو میں اپنے پاس رکھوں گا!''

جلال اپنے مکان اور کچھمن سنگھ کی حویلی کی درمیانی دیوار کے ساتھ شیشم کے گھنے درخت کی شاخوں میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہ کرپان تھی جو اس نے کچھمن سنگھ کے لڑکے سے چھینی تھی۔ اپنے باپ کی لاش دیکھنے اور سکھوں کی باتیں سننے کے بعد کئی بار اس کے دل میں آئی کہ وہ درخت سے حویلی میں چھلانگ لگا کر اُن پر جھپٹ پڑے لیکن ہر بار اس کی ہمت جواب دے جاتی۔

کچھمن سنگھ کو اپنے پڑوسی کے گھر کی آبرو کی قیمت مل چکی تھی اور وہ اطمینان سے نوٹ گن رہا تھا۔''[1]

ایک اور منظر جسے ہم نے منتخب کیا ہے۔ پنجاب میں ہونے والی قتل و غارت گری کا نہ صرف منہ بولتا ثبوت بلکہ انتہائی متاثر کن کیفیت کا غماز ہے:

''ڈاکٹر شوکت کے مکان سے باہر بھی کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ صحن کے پھاٹک کا دروازہ کھلا تھا لیکن سلیم کی آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ چند ثانیے وہ پھاٹک کے سامنے کھڑا رہا۔ پھاٹک سے آگے صحن میں بھی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ سلیم کی آنکھوں کے سامنے شاہراہ حیات کی آخری مشعل بُجھ چکی تھی۔ اس کے آسمان کے ستاروں کی گردش میں ایک ٹھہراؤ آ چکا تھا۔ آس پاس بکھری ہوئی لاشوں کا سکوت اس کے لیے آگ کے شعلوں، بندوقوں کے شور اور تلواروں کی چمک سے زیادہ بھیانک تھا۔ اس کی زبان گنگ تھی لیکن دل کی خفیف دھڑکنیں، ''عصمت! عصمت! عصمت!!!'' پکار رہی تھیں۔ عصمت کے نام میں ابھی تک زندگی کی حرارت تھی۔ سلیم کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ ہلنے لگے۔''عصمت! عصمت!!'' وہ اچانک بلند آواز میں چلایا اور بھاگتا ہوا صحن میں داخل ہو گیا۔ چند کُتے جو ایک لاش کو جھنجوڑ رہے تھے، اچانک بھاگ کر صحن سے باہر نکل گئے۔ سلیم نے تھیلے سے ٹارچ نکالی اور جُھک جُھک کر صحن اور برآمدے میں بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھنے لگا۔ مسلمانوں کے ساتھ کہیں کہیں سکھوں کی لاشیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ اچانک سلیم کے ہاتھ میں اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی ٹارچ کی روشنی ایک چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ امجد کی لاش برآمدے کے ستون کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بازو دھڑ سے علیحدہ تھے۔ شاہ رگ اس طرح کٹی ہوئی تھی جیسے اُسے لٹا کر ذبح کیا گیا ہو۔ دونوں باچھیں جبڑوں کے کونوں تک چیر دی گئی تھیں لیکن اس کی کشادہ پیشانی، اس کی خوبصورت ناک، اس کی آنکھیں جو ابھی تک کھلی تھیں، یہ کہہ رہی تھیں۔''مجھے غور سے دیکھو، میں امجد ہوں، میں عصمت اور راحت کا بھائی ہوں، میں وہ معصوم مسکراہٹ ہوں جسے زندگی کے ہونٹوں سے نوچ لیا گیا ہے!''

---

[1] خاک اور خون: نسیم حجازی، ص ۳۹۸۔۴۰۲۔

برآمدے سے آگے کمرے کے دروازے کا ایک کواڑ ٹوٹا ہوا تھا۔ دہلیز سے باہر اور اندر چند اور لاشیں پڑی تھیں عورتیں اور بچوں کی لاشیں۔ سلیم کانپتے ہوئے ہاتھ سے ان پر روشنی ڈال رہا تھا۔ عورتیں زیادہ تر عمر رسیدہ تھیں۔ سلیم نے ٹارچ بجھا دی۔ اس کے منہ سے درد کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی ''عصمت! راحت!!'' اس کے جواب میں ایک مکان کی چھت سے کتے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

داؤد نے کہا۔ ''چلو اندر دیکھیں''

سلیم بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ داؤد نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے گیا۔ کمرے میں ان عورتوں کی لاشیں تھیں جنھیں سلیم نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ اس سے آگے بیٹھک میں کھلنے والا دروازہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ سلیم کے دل و دماغ کے وہ حصے مفلوج ہو چکے تھے جنھیں درد کا احساس ہوتا ہے، اب اس کے لیے کوئی چیز بھیانک نہ تھی۔ اس نے اچانک داؤد کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور بیٹھک میں داخل ہوا۔ بیٹھک میں کوئی نہ تھا۔ فرش کی دری پر کہیں کہیں خون کے دھبے تھے۔ بغل کے کمرے کا دروازہ بھی ٹوٹا ہوا تھا اور اس کی دہلیز کے آگے سکھوں کی دو لاشیں پڑی تھیں۔ ایک کونے میں ایک اور لاش پڑی تھی۔ سلیم نے ایک ہی نظر میں اسے پہچان لیا اور دوسری نظر دیکھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ عریانی، بے بسی اور مظلومیت کی یہ تصویر زبانِ حال سے کہہ رہی تھی۔ ''میری طرف مت دیکھو! میرے قریب مت آؤ۔ دنیا کے تمام چراغ بجھا دو۔ سورج، چاند اور ستاروں سے کہو کہ وہ ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جائیں تاکہ مجھے کوئی اس حال میں نہ دیکھ سکے۔''

سلیم نے داؤد کو دھکا دے کر باہر نکال دیا اور باقی آدمیوں سے جو ابھی تک بیٹھک میں کھڑے تھے، کہا۔ ''تم یہیں رہو!''

ایک لمحہ توقف کے بعد اس نے لاش کی طرف پیٹھ کر کے ٹارچ جلائی۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کا ایک صندوق کھلا پڑا تھا لیکن وہ خالی تھا۔ چند کپڑے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے لیکن سلیم ان میں اپنے مطلب کی کوئی چیز تلاش نہ کر سکا۔ صندوق کے ساتھ ایک پلنگ پر پرانی دری بچھی ہوئی تھی۔ سلیم نے دری اٹھالی اور ٹارچ بجھا کر تاریکی میں ٹٹول ٹٹول کر پاؤں رکھتا ہوا پیچھے مڑا، اچانک اس کے پاؤں سے کوئی شے لگی اور وہ جھک کر ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا۔ لاش کے بازو اور سر کے بالوں کو چھونے کے بعد اس نے دری کو اس کے اوپر ڈال دیا۔

اس کے بعد وہ کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ باہر نکلنے کے ارادے سے اس نے ٹارچ دوبارہ جلائی لیکن اس کے دل میں اچانک یہ خیال آیا، شاید یہ کوئی اور ہو۔ شاید میں نے پہچاننے میں غلطی کی ہو۔ اس نے جھک کر کانپتے ہوئے ہاتھ سے دری کا ایک سرا اٹھا کر چہرے پر روشنی ڈالی۔ یہ وہی تھی۔ عصمت اور راحت کی ماں۔۔۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، اس کا چہرہ بری طرح نوچا گیا تھا۔ امجد کی طرح اس کی آنکھیں بھی کھلی تھیں، ان میں ایک التجا تھی۔ ایک پیغام تھا۔۔۔ یہ پتھرائی ہوئی آنکھیں قوم کے بیٹوں سے کہہ رہی تھیں:۔

''میں تمھاری غیرت ہوں۔۔تم میری عصمت کی قسم کھا سکتے ہو، میں وہ بہن ہوں، جس نے دمشق کے ایوانوں پر لرزہ طاری کر دیا تھا محمدؒ بن قاسم کی تلوار کو میں نے بے نیام کیا تھا۔سندھ میری خاطر فتح ہوا تھا۔ میں وہ ماں ہوں جس نے محمود غزنویؒ کو دودھ پلایا تھا۔سومنات کے بت توڑنے والے مجاہد کو میں نے لوریاں دی تھیں۔ میں وہ بیٹی ہوں جس کی رگوں میں تیمور کا خون ہے۔ لال قلعہ میرے لیے تعمیر ہوا تھا۔ میں نے اس سرزمین پر صدیوں تک تیری فتح ونصرت کے گیت گائے ہیں۔اے قوم! دیکھ میں کون ہوں!!''[1]

انسانی رشتوں کی جذباتی محبت تقدیر کے فیصلوں کو وقتی طور پر ماننے سے انکار کر دیتی ہے انسان جب اس کیفیت سے دوچار ہوتا ہے تو دیوانوں کی طرح خواب وخیال کی باتیں کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا ہے وہ حقیقت نہ ہو انتہائی مایوسی کی اس کیفیت سے اکثر مواقع پر سامنا پڑتا ہے جب ہمارا کوئی عزیز ہم سے غیر متوقع طور پر اچانک چھن جائے ذرا اس کیفیت کو طاری کر کے اس منظر میں کھو جائیے:

''باتیں ہو رہی تھیں کہ کسی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''ادھر دیکھیے ،شاید وہ آرہے ہیں!''

سلیم کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔اُسے تین فرلانگ کے فاصلے پر دھان کے کھیتوں میں ایک سوار دکھائی دیا۔گھوڑا معمولی رفتار سے آ رہا تھا۔سلیم نے انتہائی کرب کی حالت میں اپنا سر جھکا لیا۔سوار نے قریب پہنچ کر گھوڑا روکا،لوگ بھاگ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔۔۔ یہ امیر علی تھا اور اُس کی گود میں ایک لاش تھی۔داؤد کی لاش۔!''

لوگوں نے لاش کو اتار کر زمین پر ڈال دیا۔امیر علی نیم حواسی کی حالت میں گھوڑے سے اتر کر ایک لمحہ زین کے ساتھ سینہ لگائے کھڑا رہا۔سلیم نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔''امیر علی! امیر علی!!''امیر علی کچھ کہے بغیر دو قدم پیچھے ہٹا اور لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گر پڑا۔اس کا قمیص خون میں بھیگا ہوا تھا۔اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ایک نوجوان لڑکی دھاڑیں مارتی ہوئی آگے بڑھی اور امیر علی کا سر اپنی گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔

سلیم نے داؤد کی طرف دیکھا۔اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کہہ کر وہ امیر علی کی طرف متوجہ ہوا اور ہجوم کو اِدھر اُدھر ہٹا کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔اس کی نبض پر ہاتھ رکھنے کے بعد سلیم نے جلدی سے اس کی قمیص اُٹھا کر دیکھی۔اس کے پیٹ اور سینے میں گولیوں کے تین زخم تھے۔سلیم نے دوبارہ نبض پر ہاتھ رکھا۔پھر اس کی آنکھیں کھول کر دیکھیں اور ارد گرد جمع ہونے والوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔''اس کا یہاں تک پہنچنا بھی ایک معجزہ تھا۔''

جب آدمی دریا کے کنارے سے ذرا دور ہٹ کر قبریں کھود رہے تھے،امیر علی کی نوجوان بیوی سب کو یہ سمجھا رہی تھی۔''وہ نہیں مرا، وہ زندہ ہے۔تم سب پاگل ہو گئے ہو۔خدا کے لیے! اسے اچھی طرح دیکھو۔ تمھیں کیا ہو گیا۔تم زندوں کو دفن کر رہے ہو۔''وہ سلیم کا بازو پکڑ کر اسے کھینچتی ہوئی اپنے شوہر کی لاش کے پاس لے گئی۔''بھائی! تم اچھی طرح دیکھو، یہ تو پاگل ہو گئے ہیں۔یہ زندہ ہے، میرا

---

[1] خاک اور خون، نسیم حجازی، ص ۳۸۸ تا ۳۹۱۔

شوہر زندہ ہے۔ اسے کوئی نہیں مار سکتا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو میری بہن! وہ زندہ ہے۔ شہید مرا نہیں کرتے۔''

جب داؤ دا اور امیر علی کو دفن کر دیا گیا تو سلیم کچھ دیر بے حس و حرکت ان کی قبروں کے پاس کھڑا رہا۔ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''داؤد آپ کا بھائی تھا؟''

''داؤ دا اور امیر علی دونوں میرے بھائی تھے۔'' سلیم یہ کہہ کر قبروں کے پاس ایک جھاڑی کے نیچے نڈھال سا ہو کر بیٹھ گیا۔''[۱]

یہ ناول جہاں فسادات کے تلخ تجربات کا آئینہ دار ہے وہیں ایک معاشرے کی داستان بھی ہے جہاں خاندانوں کو بچپن سے ایک ساتھ پلتے بڑھتے دکھایا گیا ہے۔ یہ بچے اپنی معصوم حرکات سے جو گل کھلاتے ہیں وہ کبھی کبھی ان کے غیر متوقع سزا کے موجب بن جاتے ہیں۔ جہاں یہ کیفیت افسوسناک ہے وہیں دلچسپ اور حقیقی معلوم ہوتی ہے۔

''پیپل کے درخت کے نیچے پہنچ کر لڑکوں نے اپنے بستے زمین پر رکھ دیے۔ مجید اور جلال نے داؤد کو سہارا دینے کے لیے ایک دوسرے کی کلائیاں پکڑ لیں۔ ایک لڑکا ان کے قریب زمین پر ہاتھ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ داؤد نے ایک پاؤں اس کی پیٹھ پر رکھا اور دوسرا پاؤں مجید اور جلال کی کلائیوں پر رکھ دیا۔ پھر اس نے دونوں پاؤں اُن کی کلائیوں پر رکھ دیے۔ بوجھ سے جلال کی کمر جھک رہی تھی لیکن مجید نے اُس کی کلائیاں پکڑ رکھی تھیں۔

جلال کہہ رہا تھا۔''داؤد جلدی کرو!''

داؤد نے مجید اور جلال کے سروں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن ابھی درخت کی شاخ پر ہاتھ نہیں ڈالے تھے کہ جلال اپنی جگہ سے ہل گیا۔

''جلال کے بچے تم۔۔۔۔'' داؤ دا اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا اور پیٹھ کے بل گرا لیکن گرتے ہی اٹھ بیٹھا۔ لڑکے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہے تھے۔ داؤد نے اپنی پگڑی جواب ڈھیلی ہو چکی تھی، اتار کر پھینک دی اور بھاگ کر دونوں ہاتھوں سے جلال کے کان پکڑ لیے۔

مجید نے جلدی سے آگے بڑھ کر جلال کو چھڑاتے ہوئے کہا۔'' داؤد یہ تمھارا قصور ہے، تمھیں اتنی دیر نہیں لگانی چاہیے تھی۔ اب ہم پھر تمھیں سہارا دیتے ہیں۔ اب کے زیادہ بوجھ مجھ پر رکھنا۔''

داؤد دوبارہ ہمت آزمائی کے لیے تیار ہو گیا۔ تاہم اُس نے کہا۔'' جلال کے بچے! اگر اب کی بار تم نے مجھے گرایا تو تمھیں طوطا نہیں ملے گا۔''

اس مرتبہ جلال میں ذمے داری کا احساس نسبتاً زیادہ تھا۔ داؤد کسی اور حادثے کے بغیر درخت پر چڑھ گیا۔

۱۔ خاک اور خون: نسیم حجازی، ص ۵۴۵، ۵۴۶۔

درخت کا درمیانی تنا جس میں داؤد کے اندازے کے مطابق جا بجا طوطوں کے گھونسلے تھے، بہت موٹا تھا لیکن اس کی شاخیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ داؤد ان شاخوں سے سیڑھیوں کا کام لے کر تنے کے گرد چکر لگاتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔

ایک سوراخ سے دو طوطے اڑے۔ داؤد نے خوش ہو کر اندر ہاتھ ڈالا اور تھوڑی دیر تک تلاش کرنے کے بعد کہا۔ ''اس کے اندر کچھ بھی نہیں، میرے خیال میں بچے بڑے ہو کر اُڑ گئے ہیں۔''

لڑکوں کو مایوسی ہوئی۔ سلیم نے کہا۔ ''داؤد اوپر بہت سے سوراخ ہیں، ان میں بچے ضرور ہوں گے۔ تم اچھی طرح دیکھو!!''

مجید نے جواب دیا۔ ''تم فکر نہ کرو۔''

ایک اور سوراخ سے طوطا اڑا اور داؤد اندر ہاتھ ڈال کر چلا اٹھا۔ ''مل گئے! مل گئے!! دو! نہیں تین۔'' اس نے یکے بعد دیگرے تین بچے نکال کر ٹہنی پر رکھ دیے اور انہیں غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ ''ان میں سے کسی کے گلے میں بھی دھاری نہیں اور یہ بہت چھوٹے ہیں۔ ان کے پر ابھی اچھی طرح نہیں نکلے۔''

چند لڑکے انھیں حاصل کرنا ہی اپنے لیے کافی سمجھتے تھے۔ لیکن سلیم نے نیچے سے آواز دی۔ ''دیکھو! داؤد انہیں وہیں رہنے دو۔ یہ بہت چھوٹے ہیں۔ یہ مر جائیں گے۔''

داؤد نے تینوں بچے گھونسلے میں رکھ دیے اور کہا۔ ''میں اور اوپر دیکھتا ہوں۔'' ایک اور گھونسلے میں داؤد کو دو بچے ملے لیکن اسے کسی کے گلے میں دھاری نظر نہ آئی۔ تاہم یہ کافی بڑے تھے۔ نیچے لڑکے اپنی جھولیاں تانے کھڑے تھے لیکن داؤد نے کہا۔ ''میں واپسی پر انھیں اپنی جھولی میں ڈال لاؤں گا، ابھی اوپر اور گھونسلے ہیں۔''

چوٹی کے قریب پہنچ کر داؤد کو ایک اور گھونسلا دکھائی دیا اور وہ چلایا۔ ''مجید اوپر دیکھو چوٹی پر کسی بڑے جانور کا گھونسلا ہے۔''

مجید نے تھوڑی دیر غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ ''یار یہ بہت بڑا گھونسلا ہے کہیں چیل کا تو نہیں؟''

جلال نے کہا۔ ''داؤد میری ماں کہتی تھی کہ چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے۔''

مجید نے کہا۔ ''تم کیا بکتے ہو۔ بھلا چیل سونا کہاں سے لاتی ہے؟''

جلال نے کہا۔ ''سچ کہتا ہوں مجید اماں کہتی تھی کہ چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے۔'' مجید نے کہا۔ ''اگر نہ ہوا تو؟''

جلال کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا لیکن سلیم نے کہا۔ ''ہاں مجید! جلال جھوٹ نہیں کہتا۔ چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے۔ تمھیں وہ کہانی یاد نہیں؟ ایک رانی نہا رہی تھی، اس نے اپنا ہار اُتار کر مکان کی چھت پر رکھ دیا اور چیل اسے لے کر اڑ گئی۔ ایک آدمی جنگل میں لکڑیاں کاٹنے گیا تو اُسے چیل کے گھونسلے میں سونے کا ہار مل گیا۔ وہ ہار اٹھا کر راجا کے پاس لے گیا اور راجا نے اُسے بہت سا انعام دیا۔''

جلال نے کہا۔ ''دیکھو میں نہیں کہتا تھا کہ چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے۔''

مجید نے داؤد کو آواز دی۔ ''دیکھو داؤد شاید تمھیں بھی ہار مل جائے۔''

لیکن داؤد سلیم کی کہانی سن چکا تھا۔ اُسے اب کسی مشورے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تیزی سے چوٹی کی طرف چڑھ رہا تھا۔ اب اس کی نگاہ میں دھاری والے طوطے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔۔۔۔ داؤد سونے کے ہار کے لیے ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھا۔ لیکن جونہی اُس نے گھونسلے کے قریب پہنچ کر ہاتھ بلند کیا، گھونسلے میں پھڑ پھڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور ایک چیل اس کے سر پر جھپٹا مار کر ایک طرف اُڑ گئی۔ داؤد نے زندگی میں پہلی بار سر کے بالوں کی ضرورت محسوس کی۔ وہ ابھی اپنے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا کہ چیل نے دوسری بار فضا میں غوطہ لگایا اور اس کے سر میں پنجے گاڑ کر بیٹھ گئی۔ داؤد نے زور سے ہاتھ مار کر اسے پھر ایک بار اڑا دیا اور تیزی سے نیچے اترنے لگا لیکن چیل اس پر بار بار جھپٹ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں داؤد چوٹی کی پتلی اور خطرناک ٹہنیوں سے اُتر کر قدرے مضبوط شاخوں پر پاؤں رکھ چکا تھا لیکن اتنی دیر میں مادہ چیل کی چیخیں سن کر نر بھی اس کی مدد کے لیے پہنچ چکا تھا اور وہ دونوں یکے بعد دیگرے اس پر جھپٹ رہے تھے اور اُن کے ٹھونگوں اور پنجوں کا ہدف داؤد کی استرے سے مُنڈی ہوئی چمکدار کھوپڑی تھی۔ نیچے اس کے ساتھی قہقہے لگا رہے تھے اور وہ اوپر سے چلا رہا تھا۔ ''جلال کے بچے تمھاری ماں نے چیل کے گھونسلے میں سونا۔۔۔۔'' چیل نے اس کے سر پر جھپٹا مارا اور وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔

مجید بار بار کہتا۔ ''آئی، آئی! چیل آئی!!''

اور داؤد اپنے ایک ہاتھ سے ٹہنی پکڑ کر دوسرے ہاتھ اور بازو کو اپنے سر اور آنکھوں کے لیے ڈھال بنا لیتا۔ پھر وہ تیزی سے چند قدم نیچے آ جاتا۔ مجید پھر چلایا۔

''اب دوسری آئی!''

داؤد نے گرتے، سنبھلتے، چیختے، چلاتے درخت کی نچلی ٹہنی پر پہنچ کر زمین پر چھلانگ لگا دی۔ اس کے سر میں چیلوں کے پنجوں اور ٹھونگوں کے نشان تھے اور کہیں کہیں سے خون بھی رس رہا تھا۔ لڑکوں کے قہقہے اب بند ہو چکے تھے۔ داؤد تھوڑی دیر بے حس و حرکت زمین پر بیٹھا اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ ''جلال کے بچے تم بھی ہنستے تھے!''

جواب نہ پا کر اس نے مڑ کر چاروں طرف دیکھا، جلال وہاں نہ تھا۔ رام لال نے ایک طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ارے جلال وہ جا رہا ہے!''

''کہاں؟'' داؤد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

داؤد چلایا۔ ''ٹھہرو! جلال کے بچے!''

لیکن جلال بغل میں بستہ دبائے سرپٹ بھاگا چلا جا رہا تھا اور اس کی رفتار یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اپنے گاؤں میں پہنچے بغیر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھے گا۔[1]

---

[1] خاک اور خون، نسیم حجازی، ص ۳۹، ۴۳۔

طوطے کے بچے پکڑنے اور اس کے بجائے چیل کے گھونسلے میں ہاتھ ڈالنے اور سونے کی لالچ میں مبتلا ہونے اور اس پر چیلوں کے رویے کو جس تفصیل اور حقیقی انداز میں پیش کیا ہے وہ مشاہدے کی باریکی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ یہ منظر شاذ ہے اور صرف وہی اسے بیان کر سکتا ہے جسے اس سے واسطہ پڑا ہو۔ ذرا اس منظر کو دیکھیے :

''مجید نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے ادھر دیکھو! چودھری رمضان بابو کے ساتھ جھگڑ رہا ہے۔''

سلیم نے چودھری رمضان کو بابو کے ساتھ گرما گرم بحث کرتے دیکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن مجید نے اُسے بازو سے پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ ''ارے ٹھہرو ذرا باتیں سننے دو۔''

بابو کہہ رہا تھا۔ ''تم کو ساڑھے تین روپے دینے پڑیں گیا۔ میرے ساتھ زیادہ باتیں مت کرو۔''

چودھری رمضان نے جواب دیا۔ ''وہ جی اگر تمھیں تین روپے دینے تھے تو میں ٹکٹ کیوں لیتا؟''

''ارے میں ٹکٹ کی بات نہیں کرتا۔ تمھارے سامان کا وزن زیادہ ہے۔ میں اس کا کرایہ مانگتا ہوں۔''

رمضان نے جواب دیا۔ ''خدا کی قسم! یہ تمام ہانڈیاں دوسروں کی ہیں میں نے اپنے گھر کے لیے صرف ایک خریدی تھی۔''

''مجھے اس سے کیا واسطہ کہ تم نے اپنے لیے ایک ہانڈی خریدی ہے، یا سب خریدی ہیں۔ یہ بوری تمھاری ہے اور اس میں جتنا سامان ہے، میں اس کا کرایہ تم سے وصُول کروں گا۔''

''دیکھو بابو جی! میں نے ایک بار آپ سے کہا ہے کہ میں پسرور کے قریب اپنے رشتہ داروں کو ملنے گیا تھا۔ گاؤں کی عورتوں نے کہا کہ پسرور کی ہانڈیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ ہمارے لیے ضرور لیتے آنا۔ نجی، سنتی، ہرنام کور، بھاگو تیلن، رحمت بی بی، ریشمے جولاہی اور پڑوس کی کئی عورتیں میرے گرد ہو گئیں۔ وہ مجھے پیسے دینا چاہتی تھیں لیکن میں نے سوچا، گاؤں کی مائیں بہنیں ہیں اگر ایک دو روپے خرچ بھی ہو گئے تو کوئی بات نہیں۔ بابو جی! میں نے کوئی بُرا کام نہیں کیا۔ آپ خود سوچیں، اگر آپ میرے گاؤں کے رہنے والے ہوں اور آپ کی ماں مجھے یہ کہے کہ چودھری رمضان! میرے لیے پسرور سے ایک ہانڈی لے آنا، تو مجھے انکار کرتے ہوئے شرم نہ آئے گی؟''

''بس چپ رہو۔'' بابو نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''کرایہ نکالو!''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ ہانڈیوں کا کرایہ اُن کی قیمت سے تین گنا زیادہ ہوتا ہے؟''

''بس آج تمھیں معلوم ہو گیا نا۔ آئندہ تم ایسی غلطی نہیں کرو گے۔''

''بابو جی! اگر تمھیں خدا نے کسی کے ساتھ نیکی کرنے کی توفیق نہیں دی تو دوسروں کو کیوں منع کرتے ہو؟''

''مذاق مت کرو میں ڈیوٹی پر کھڑا ہوں۔''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ڈپٹی کے اُوپر کھڑے ہو، ورنہ میں نہ لاتا یہ ہانڈیاں۔''

لوگ ہنس رہے تھے اور بابو کا پارہ چڑھ رہا تھا۔ وہ چلایا۔ ''زبان بند کرو اور پیسے نکالو۔''

رمضان نے اور زیادہ پریشان ہو کر کہا۔ ''بابو جی! تم خوامخواہ ناراض ہوتے ہو اگر میری بات پر یقین نہیں آتا تو ہانڈیوں کی بوری یہاں رکھ لو، گاؤں کی عورتیں خود لینے آ جائیں گی۔ اُن سے دو دو آنے لے لینا۔ تمھاری رقم پوری ہو جائے گی۔۔۔ ورنہ میرا ٹکٹ واپس دے دو میں یہ ہانڈیاں پسرور چھوڑ آتا ہوں۔''

''تم کسی جنگل سے تو نہیں آئے؟''

''بابو جی! پسرور شہر ہے جنگل نہیں۔''

عمر رسیدہ اسٹیشن ماسٹر یہ تماشا دیکھ کر آگے بڑھا اور اُس نے نرمی سے رمضان کو محکمہ ریلوے کے قواعد وضوابط سمجھانے کی کوشش کی۔

چودھری رمضان نے فریاد کے لہجے میں کہا۔ ''بابو خدا کی قسم! گاڑی میں اتنی بھیڑ تھی کہ میں سارا راستہ یہ بوری اپنی گود میں رکھ کر لایا ہوں۔ ہانڈیوں کی قیمت میں نے دی، ٹکٹ کے پیسے میں نے دیے۔ تکلیف میں نے اٹھائی، اب آپ ہی بتایئے اگر ساڑھے تین روپے اس بابو کو دے دوں تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟

''فائدہ یہ ہوگا کہ تم جیل نہیں جاؤ گے اور تمھاری عزت بچ جائے گی۔''

چودھری رمضان کچھ سوچ کر بولا۔ ''بابو جی میں نے کوئی چوری کی ہے جیل جاؤں گا؟ یہ لو ساڑھے تین روپے اور ایسی تیسی ان ہانڈیوں کی۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ساڑھے تین روپے گن کر بابو کو دے دیے۔ پھر جھک کر بوری کھولی اور ایک ہانڈی نکال کر فرش پر مارتے ہوئے بولا۔ ''یہ مائی نجی کی''

پھر اس نے دوسری اٹھا کر پھینکی اور کہا۔ ''یہ نتی کی'' اس طرح اس نے یکے بعد دیگرے باقی ہانڈیوں کو توڑتے ہوئے کہا۔

''یہ ہرنام کور کی، یہ بھاگو تیلن کی، یہ رحمت بی بی کی، یہ ریشمے جولاہی کی، یہ جلال کی ماں کی!''

جوں جوں ہانڈیاں کم ہو رہی تھیں اُس کا جوش اور غصہ زیادہ ہو رہا تھا۔

سلیم، مجید اور دوسرے لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ چودھری رمضان نے آخری ہانڈی اٹھائی تو اسے بروقت کسی کا نام یاد نہ آیا۔ اس نے بابو کی طرف غضب ناک ہو کر دیکھا اور ''یہ بابو کی ماں کی'' کہتے ہوئے زمین پر دے ماری۔''[۱]

جب انسان کسی مقصد کے حصول کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دے یہاں تک کہ اپنے خاندان اور اپنے جسم کے اعضا تک کو گھائل کر لے تو اس کے اس استقلال کو خراج عقیدت بھی پیش کیا جانا چاہیے اور ایسا ہوتا بھی ہے اسی لیے ناول نگار نے یہ کیفیت پیدا کی ہے جس میں خراج عقیدت کے ساتھ دلی جذبات اور ملک وقوم سے والہانہ عقیدت کا اظہار ملتا ہے:

''سڑک کے کنارے پہنچ کر وہ دیر تک فوجی لاریوں، ٹرکوں اور جیپ کاروں کا قافلہ دیکھتے رہے۔

۱۔ خاک اور خون، نسیم حجازی، ص ۴۸۰ تا ۴۸۳۔

''بھائی جان! آپ تھک جائیں گے، میں کرسی لاتی ہوں۔''

راحت یہ کہہ کر اندر سے بید کی ایک کرسی لے آئی۔ سلیم پھاٹک سے ایک قدم آگے سڑک کے کنارے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ارشد اُس کے قریب کھڑا تھا اور راحت اور عصمت صحن کے کنارے پودوں کی باڑ کی اوٹ میں کھڑی سڑک کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

سڑک کے کنارے لوگ سپاہیوں کو دیکھ کر خوشی کے نعرے لگا رہے تھے۔ ٹرک اور لاریاں گزر گئیں۔ ارشد ہسپتال جانے کی تیاری کرنے کے لیے اندر جا چکا تھا۔ سلیم اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ سڑک پر کچھ دور پیادہ سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی آہٹ سنائی دی اور وہ غیر شعوری طور پر اپنے منہ میں لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ دہرانے لگا۔

سپاہی قریب آ گئے۔ عصمت اور راحت نے جلدی جلدی صحن میں اُگے ہوئے پودوں سے چند پھول توڑے اور سپاہیوں کے راستے میں پھینک دیے۔

سپاہیوں کے چند دستے گزر گئے۔ آخری دستہ دروازے کے قریب پہنچا تو ساتھ آنے والے افسر نے اچانک گرجتی ہوئی آواز میں کہا ''ہالٹ''۔۔۔ سپاہی رک گئے۔

''رائٹ ٹرن''۔۔۔ سپاہیوں نے دائیں طرف منہ پھیر لیے۔ افسر ''اسٹینڈ ایٹ ایز'' کہہ کر سیدھا سلیم کی طرف بڑھا۔

سلیم اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔ یہ مجید تھا۔

اُس نے آتے ہی کہا۔ ''سلیم! یہ وہ بجلیاں ہیں جن کی تمھیں تلاش تھی۔ ہم وہاں جا رہے ہیں جہاں سے تم آئے ہو۔ تم لوگوں نے کشمیر میں جو کام شروع کیا تھا، وہ ان کے ہاتھوں پورا ہوگا۔''

''تم ابھی جا رہے ہو؟''

''ہاں! کوئی ایک گھنٹہ تک ہماری بٹالین روانہ ہو جائے گی۔''

سلیم نے صحن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ادھر کھڑی تمھیں دیکھ رہی ہیں۔''

مجید نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ ''بھائی جان! کل امینہ کا خط آیا تھا۔ شاید وہ ایک ہفتے تک آپ کو دیکھنے کے لیے آ جائے۔''

عصمت نے کہا۔ ''انھوں نے مجھے بھی خط لکھا ہے۔''

''میں اس کے خط کا جواب نہ لکھ سکا اور اب تو شاید مجھے فرصت بھی نہ ملے۔ آپ اسے لکھ دیں کہ میں یہاں سے جا چکا ہوں اور آپ کی وہ کتابیں جو میں اس دن لے گیا تھا گم ہو گئی ہیں۔ کوئی مجھ سے پوچھے بغیر لے گیا ہے۔ ان کے بدلے میں آپ کو مہاراجا کشمیر کے باغ کے سیب بھیج دوں گا۔''

''اور کشمیر کی فتح کی خوش خبری بھی۔''

''ہاں! وہ بھی''

عصمت نے کہا۔''بھائی جان! اس کے بدلے آپ میری ساری کتابیں لے جائیں۔''

راحت جواب تک خاموش کھڑی تھی، بولی۔''آپ میرے لیے کشمیر سے کیا لائیں گے؟''

''تمھارے لیے؟''مجید نے کچھ سوچ کر کہا۔''تمھارے لیے زعفران کے پھول لاؤں گا۔''

مجید، عصمت اور راحت کو خدا حافظ کہہ کر پھر سلیم کے قریب آ گیا اور بولا۔''سلیم! میری کمپنی تمھیں سلامی دینا چاہتی ہے۔''

''نہیں! نہیں!!''سلیم نے چونک کر کہا۔

مجید نے کہا۔''یہ اس لیے نہیں کہ تم میرے بھائی ہو، بلکہ اس لیے کہ تم قوم کے وہ سپاہی ہو جس نے ہزاروں انسانوں کی جان بچائی ہے۔ یہ سپاہی اس شخص کو سلامی دینا چاہتے ہیں جو راوی کے کنارے بخار سے نڈھال اور زخموں سے چُور رہونے کے باوجود بھی لڑ رہا تھا یہ سلامی ان زخموں کے لیے ہے جو تم نے جہاد کشمیر میں کھائے ہیں۔ سلیم یہ سب تمھیں جانتے ہیں۔ میں ان سب کو تمھارا پیغام سنایا کرتا ہوں۔''

اور جب سلیم کھڑا ہو کر ان جانبازوں کی سلامی لے رہا تھا جن کے چوڑے چکلے سینوں پر ایک قوم کی تقدیر لکھی ہوئی تھی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔

مجید نے مارچ کرنے کا حکم دیا۔۔۔سڑک پر سپاہیوں کے پاؤں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔۔۔۔سپاہیوں کا دستہ گزر گیا۔ آہستہ آہستہ ان کے قدموں کی آہٹ کم ہوتی گئی۔ سلیم کے دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں:۔

''بڑھے چلو۔۔۔۔۔۔بڑھے چلو۔۔۔۔۔۔بڑھے چلو۔۔۔۔۔۔اس کی آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسو۔۔۔ یہ ایک شاعر، ایک ادیب، ایک سپاہی اور ایک انسان کی آخری پونجی تھی، جسے وہ اپنی قوم کے نوجوانوں پر نچھاور کر رہا تھا۔''[۱]

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی رقمطراز ہیں:

''ناول نگار اپنے ماحول دو طرح سامنے لاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ سماج کے بازاروں، کلبوں، سڑکوں وغیرہ کی حالت پیش کرتا ہے دوسرے یہ کہ مناظر قدرت کو پیش کرتا ہے جن میں جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں وغیرہ کی تصویریں ہمارے سامنے لائی جاتی ہیں ان دونوں حالتوں میں ناول نگار اپنی قوت واقعہ نگاری دکھاتا ہے۔''[۲]

اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''واقعہ نگاری کی قوت بھی پیدائشی ہوتی ہے اور صحیح ادبی ذوق رکھنے والا ناول نگار واقعات و مناظر کو کردار کی فطرت سے ملا کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ ناول میں ایک نئی زندگی آ جاتی ہے۔

۱۔ خاک اور خون: نسیم حجازی، ص ۶۳۸ تا ۶۴۰۔

۲۔ ناول کیا ہے: ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص ۳۳۔

بیانات کی خوبی تاریخی ناولوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے اس قسم کے ناولوں کا پہلا مقصد کسی خاص زمانہ کو پھر سے زندہ کر دینا ہوتا ہے اس لیے ناول نگار کی کامیابی اس پر منحصر ہے کہ وہ اپنی قوتِ بیان سے کسی اہم تاریخی واقعہ کا صحیح نقشہ کھینچ سکے وہ متعدد تاریخی واقعات کی بابت مختلف تاریخ نگاروں سے معلومات حاصل کرتا ہے اور پھر ان واقعات کو اپنی قوت تخیل کے ذریعہ ایک نئی زندگی بخشتا ہے۔''[1]

یہی وجہ ہے کہ نسیم حجازی نے خاک اور خون کی منظر نگاری میں ان امور کا خاص خیال رکھا اور ہم جس بات کو پہلے بھی پیش کر چکے ہیں کہ ابھی اس نسل کے کچھ لوگ زندہ ہیں جنہوں نے ان واقعات کو بہ چشم خود دیکھا تھا وہ ان واقعات اور ان کی عکاسی کا حال پڑھ کر ان میں گم ہو جاتے ہیں۔

نسیم حجازی کا ناول خاک اور خون فنی اعتبار سے ایک مکمل ناول ہے ہر موقع پر ان تمام فنی لوازمات کو پورا کرتے ہوئے پیش کیا گیا ہے جو کامیاب ناول نگاری کے لیے ضروری ہیں۔ ناول کا پلاٹ انتہائی مضبوط اور بہترین ربط و تسلسل کا نمونہ ہے۔ جغرافیائی اور موسمی حالات کا اس قدر حسین امتزاج پیش کیا ہے کہ وہ تاریخی حقیقت کے ساتھ ساتھ کہانی کے کلائمکس کو برقرار رکھنے کا باعث ہے۔ کردار نگاری میں حد درجہ کی احتیاط سے کام لیا ہے البتہ سلیم کے کردار کو پیش کرتے ہوئے اپنی جذباتی وابستگی اور ہیرو کا اسم با مسمیٰ دکھانے کی کوشش سے تعبیر ہے اسی طرح ''خاک اور خون'' کے مرکزی کردار، سلیم کے گاؤں میں موجود بعض مزاحیہ کرداروں مثلاً ''رمضان'' وغیرہ کو انہوں نے جس انداز میں پیش کیا ہے وہ نسیم حجازی کے سحر طراز قلم کا حصہ ہے۔ درحقیقت نسیم حجازی نے خاک اور خون کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر حصے میں کہانی ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی ہے یہ ایک گاؤں کی پوری زندگی کی داستان ہے۔ سلیم جو ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے یہیں سے لڑکپن اور جوانی کی منازل میں داخل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کہانی آگے بڑھتی ہے۔ سلیم کے ساتھ زندگی میں جو واقعات پیش آئے اس کے ساتھ جن لوگوں کا واسطہ رہا اور لوگوں کے ساتھ جو جو باتیں پیش آئیں، یہ اس کی مکمل داستان ہے۔ سلیم کی کہانی لکھی جارہی ہے اس لیے اس پر جو بیتی اسی کے بیان میں ان فسادات کا ذکر بھی آتا جاتا ہے جو اس کے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے کر تباہ و برباد کر گئے۔ اس کے تمام عزیزوں، رشتہ داروں اور والدین تک کو اس سے چھین کر اسے دنیا میں تنہا چھوڑ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ سلیم کا یہ کردار مزید اجاگر ہو کر سامنے آتا ہے۔ جب وہ اپنی کتاب ''اے قوم'' میں قومی حمیت جوش و ولولے کو دردمندانہ انداز میں پیش کرتا ہے اصل میں یہی شعور خود نسیم حجازی میں موجود ہے وہ قوم کی بدحالی پر آنسو بہاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے ناول کا نام خاک اور خون رکھا اور وہ بڑی خوبی سے اس عنوان کو ناول میں سموئے ہیں اس طرح کہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا اس کے سوا کوئی عنوان ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح نسیم حجازی کے یہاں سیاسی، معاشرتی و معاشی شعور بڑی شدت کے ساتھ ملتا ہے انہوں نے ہجرت اور مہاجرین کے کیمپ کے ماحول کی نہ صرف اذیت ناکی بلکہ عبرتناکی کی

---

[1] ناول کیا ہے؛ ڈاکٹر احسن فاروقی، ص ۳۳۔

ایسی تصویریں پیش کی ہیں جسے دیکھ کر قاری لرز اٹھتا ہے۔ اس ماحول کی عکاسی میں نسیم حجازی نے سادگی و روانی کے ساتھ حقائق کو پیش کر کے فسادات کے المیے کو زندہ کر دیا ہے۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ ان کی نثر ان کے موضوع کے مطابق علمیت، تاریخ، فلسفہ اور روزمرہ کے مسائل کے مطابق ایک خاص آہنگ اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول ایک خاص عہد کے عکاس ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کے بیان میں حقیقت کا لب ولہجہ بھی مخصوص ہوتا ہے۔

یوسف بن تاشفین کا تنقیدی جائزہ

ناول کا خلاصہ اور اس میں موجود حقیقتوں کو تاریخی روایات کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ہم ناول کے معیار، اس کے فنی پہلوؤں، ناقدین کے خیال میں تاریخی ناول کے خدو خال کا لحاظ رکھتے ہوئے پیش کریں گے جس کے لیے ناول کا پلاٹ، کردار نگاری، منظر نگاری اور مکالموں کا تجزیہ رقم کیا جائے گا۔

پلاٹ:

یوسف بن تاشفین کا پلاٹ سادہ اور دلچسپ ہے اس میں تاریخی حقائق کے ساتھ ساتھ بعض تخیلاتی کرداروں کے ذریعے اس عہد کی معاشرت کو اس خوبی سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری کا انہماک پلاٹ کے تجسس اتار چڑھاؤ کی بدولت ہر لحہ برقرار رہتا ہے۔ نسیم حجازی نے ناول کو بظاہر اکیس حصوں میں تقسیم کیا ہے اور انہیں کوئی نہ کوئی عنوان بھی دیا ہے۔ یہ عنوان ناول کو مربوط رکھ کر وقتی ضرورت کے پیش نظر ہیں اگر کسی خاص حصے کو الگ کرلیا جائے تو کہانی سمجھنا ناممکن ہے کیونکہ ناول کو آغاز سے اختتام تک پڑھے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔ ناول کا آغاز پلاٹ کی ترتیب کے مطابق اسپین کی اس معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ جب دو طبقات پیدا ہو چکے تھے ایک ملک کو تقسیم در تقسیم کر کے طوائف الملو کی کا باعث بن رہا تھا تو دوسرا اس طوائف الملو کی کو ختم کر کے اتحاد و استحکام کے لیے کوشاں تھا۔ عبدالمنعم کے خاندان کا تعارف بچوں کا ذہنی شعور اور مدینۃ الزہرا میں رہنے والے بچوں سے ان کی ملاقات ربط و تسلسل کے ساتھ کہانی کو آگے بڑھانے کی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ عبدالمنعم اور اس کا ہم زلف ابو صالح اس عہد کے رؤسا میں شمار کیے جاتے تھے۔ ناول نگار نے تاریخی تسلسل کے پیش نظر تمام ملوک الطوائف کا تعارف پیش کیا ہے پھر معتضد کی ہوسِ ملک گیری اور عیسائیوں کی سازشوں کا حال بیان کیا ہے۔ معتضد کی موت کے بعد معتمد کا اشبیلیہ کے حکمران کی حیثیت سے فائز ہونا پلاٹ کی دلچسپی اور اس میں جان پیدا کرتا ہے کیونکہ اس سے منسوب دو اور شخصیات ہیں ایک ابن عمار کی اور دوسری ملکہ رمیکیہ کی جو دونوں ہی کم نسب اور چھوٹے خاندان کے ہونے کے ساتھ ساتھ گھٹیا ذہن کے مالک ہیں مگر یہ کردار پلاٹ کو مضبوط تر بناتے ہیں قاری کے لیے تاریخی حقائق پیش کرنے کے بعد انہماک اور دلچسپی کا سامان اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ وہ خود کو اس کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں، مظلوموں کے ساتھ شامل ہو جاتی ہیں اس مقام پر جب کہ قاری اس میں کھو چکا ہے ہمارے خیال میں قرطبہ پر مامون کا محاصرے والا موقع سمجھنا چاہیے عبدالملک کی مدد کو بطلیوس کا حاکم اپنی افواج کے ساتھ آیا مگر اشبیلیہ کی افواج کی آمد نے اور الفانسو کے بروقت مدد پر نہ پہنچنے کی بدولت مامون کو محاصرہ اٹھا کر بھاگنا پڑا۔ اشبیلیہ کی افواج دوستی کے نام پر آئیں تھیں مگر دھوکے کے ذریعے قرطبہ پر قابض ہو گئیں۔ عبدالمنعم اپنے گھر آتا ہے تو اُسے نیا کوتوال گرفتار کر کے لے جانا چاہتا ہے۔ وہ اس موقع پر ذرا سی مہلت پا کر اپنے بیوی بچوں کو غرناطہ سے چلے جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ جب اُسے قصر زہرا میں نئے گورنر عباد کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو وہ بیعت کرنے سے انکار کر دیتا ہے یوں اُسے قید ہونا پڑتا ہے۔ غرناطہ میں سعد، حسن اور احمد فنون حرب میں اپنی مشاقی میں پیش پیش تھے۔ ادھر قرطبہ کے عوام میں ایک بار پھر بے چینی

پیدا ہوتی ہے اس مرتبہ بغاوت کے سرغنہ نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے علاوہ عباد کو قتل کر دیا اور اہل قرطبہ سے مامون کی بیعت نہ کرنے کی جرم کی پاداش میں طلیطلہ کے قید خانے میں بھیج دیا گیا۔ سعد قرطبہ میں داخلے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ ایک جگہ شہر سے باہر اس کی ملاقات پرانے دوست ادریس سے ہوتی ہے جس کے تعاون سے ایک لکڑہارے کا بھیس بدل کر قرطبہ میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں الماس کی مدد سے اس کی ماں اور بہن کو نکال لاتا ہے لیکن اپنے باپ کا پتا حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ ادریس اشبیلیہ چلا جاتا ہے سعد غرناطہ جا کر قاضی ابوجعفر کے مشورے پر ایک مکتب میں معلم کے فرائض انجام دینے لگتا ہے۔ ابن عکاشہ، عبدالمنعم کے اہل خانہ کے قرطبہ نہ آنے پر ان کی جائیداد ضبط کر لیتا ہے۔ مامون کی موت کے بعد معتمد ایک بار پھر قرطبہ پر قبضہ کر لیتا ہے ابن عکاشہ قتل ہو جاتا ہے۔ عبدالمنعم کی جائیداد ان کے ملازم الماس کو واپس دے دی جاتی ہے۔ کہانی کے تسلسل اور ربط کا یہ عالم ہے کہ ناول نگار تاریخی حقائق کو ایک لڑی میں پروتا جاتا ہے اسی دوران مرسیہ پر ابن عمار قبضہ کر لیتا ہے ادھر الفانسو خراج کی رقم میں اضافے کا مطالبہ کرتا ہے اس موقع پر دونوں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں اندلس کے ہر علاقے کے رضا کار معتمد کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے آتے ہیں مگر ابن عمار اس جنگ کو شطرنج کی ایک چال کے ذریعے ٹال دیتا ہے۔ سعد اور حسن اشبیلیہ پہنچتے ہیں یہاں پلاٹ اس قدر متجسس ہے کہ قاری اس میں غرق ہو چکا ہے۔ سعد جس وقت معتمد کے دربار میں داخل ہوتا ہے اور پھر وہاں سے فرار ہوتا ہے ایک حیران کن حقیقت اور داستانوں کے دیومالائی قصوں کی طرح کا ہے مگر قاری کی تمام تر ہمدردیاں اور دعائیں سعد کے ساتھ ہیں، یہی کامیاب پلاٹ نگاری ہے۔ فرار ہونے کے بعد ادریس کے گھر سعد کا پہنچنا اور پھر اس رومانوی حصے کا آغاز جو ایک معاشرت کا عکاس اور تخلیق کائنات سے انسانی قلب میں جاگزیں ہونے والے خیالات کی پیش کش ہے کہ عورت و مرد اور سن بلوغت میں حسن و دلفریبی محل کی خوشیوں سے کانٹوں کا بستر تک اور زندگی کے ایک لمحے سے طویل عمری تک موجود ہوتی ہے یہی وہ موقع ہے کہ ادریس کی بہن ایک محسنہ کے ساتھ ساتھ دو دھڑکتے ہوئے دلوں کا ایک حصہ بن گئی۔ جہاں یہ دونوں ایک جان دو قالب کا روپ دھار گئے مگر حسن و محبت کے دشمن مورچوں سے نکل آئے۔ زیاد میمونہ کے لیے شہزادے کا پیغام لاتا ہے اور نہ ماننے کی صورت میں ادریس کو قید کر لینے اور اسے اغوا کر لینے کی دھمکی دیتا ہے۔ مگر چال الٹ جاتی ہے وہی بگھی جس میں میمونہ کو جانا تھا سعد، میمونہ کو لے کر غرناطہ کے لیے روانہ ہوتا ہے راستے میں ادریس کی جان بچانے کا مشن پورا ہوتا ہے۔ ادریس غرناطہ آ کر بتاتا ہے کہ سعد بیغہ جا چکا ہے جہاں قاضی ابوالولید کے گھر کے سامنے علما کا ایک بڑا جلسہ قاضی ابوجعفر کی سربراہی میں ہو رہا تھا جس میں متفقہ رائے یہ طے ہوتی ہے کہ علما کا وفد ملوک الطوائف کے پاس جا کر انہیں متحد اور منظم رہنے کی تلقین کرے اس رائے سے سعد کو اختلاف تھا۔ جلسے کے اختتام پر قاضی ابوجعفر، سعد کو افریقہ جا کر مرابطین کے امیر یوسف کے پاس جانے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ انہیں وقت پر اندلس آ کر مسلمانوں کی مدد پر آمادہ کیا جا سکے۔ سعد واپسی پر غرناطہ پہنچتا ہے تو غرناطہ کی حکومت اس کے خیالات سے آگاہ ہو کر اسے گرفتار کر لینا چاہتی ہے وہ بہت جلدی میں سبتہ پہنچتا ہے جہاں پہنچ کر اسے کافی انتظار کے بعد گھر کے حالات معلوم ہوتے ہیں جس کے مطابق اُس کی روانگی کے بعد ادریس، اس کے بھائی اور

ساتھیوں کو گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ سعد اپنے گھر سے باخبر ہونے کے بعد سبتہ میں انتظار کے بجائے امیر یوسف سے صحرا میں ملنے کا ارادہ کرتا ہے راستے میں غیر متوقع حادثے نے اس کی ملاقات سیر بن ابوبکر سے کرادی اور پھر یہ دونوں امیر یوسف سے جا ملے جہاں سعد اپنے آنے کا مقصد بیان کرتا ہے۔ قیام کے دوران میمونہ اور ابوصالح کے خطوط کی بدولت وہ اپنے گھر اور اندلس کے حالات سے واقفیت پاتا ہے۔ حسن اور احمد گھر سے دور جہاد کی تیاریوں میں مصروف تھے تو طوائف الملوک اپنی کمزوریوں کی بدولت الفانسو کے شکنجے میں کسے جاتے تھے۔ ابن عمار زندگی بھر کی وفاداریوں کے بعد لغزش کا شکار ہوتا ہے وہی شاعری جو اسکے عروج کا باعث تھی معتمد کے ہاتھوں اس کے قتل کا باعث بنتی ہے۔ یحیٰی القادر، الفانسو کی خواہشات کی تکمیل کے لیے ٹیکسوں کا بوجھ بڑھاتا رہتا ہے عوام کی بے چینی دبانے کے لیے انہیں قید خانوں میں ڈال دیا جاتا ہے پرانے قیدیوں کو ایک سرحدی قلعے میں بھیج دیا جاتا ہے جن میں عبدالمنعم بھی شامل تھا۔ احمد، قاضی ابویعقوب کے نام خط لے کر طلیطلہ میں ان کا گھر تلاش کرتا ہے جہاں اس کی ملاقات ابویعقوب کی بیٹی طاہرہ اور ملازم علی سے ہوتی ہے جن کے ساتھ وہ رضا کاروں سے ملنے کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ راستے میں قسطلہ کے سپاہیوں سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے علی شہید ہو جاتا ہے احمد رضا کاروں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اہل طلیطلہ بغاوت کر دیتے ہیں رضا کاروں کی بروقت مدد کی سے قسطلہ کے سپاہی اور اور یحیٰی فرار ہو جاتے ہیں اس سرحدی چوکی پر جہاں عبدالمنعم قید تھا سپاہی الفانسو کی فوج کے خلاف ڈٹ جاتے ہیں قیدیوں کو بھی ہتھیار دیے جاتے ہیں ادھر احمد ایک لشکر کے ساتھ مدد کو پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات اپنے باپ سے ہوتی ہے۔ قاضی ابویعقوب اپنی بیٹی کی شادی احمد کے ساتھ کر دیتے ہیں عبدالمنعم غرناطہ کا رخ کرتا ہے۔ پلاٹ کے ربط و تسلسل کا یہ عالم ہے کہ تاریخی واقعات اور تخیلاتی کرداروں کا حسین امتزاج ایک لڑی کی مانند مربوط انداز میں قاری کو متحیر رکھتا ہے۔ الفانسو کی افواج اکثر علاقوں پر قابض ہو رہی تھیں عوام کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی رضا کار محدود کاروائیاں کر رہے تھے کہ معتمد کے دربار میں ملوک الطوائف کے اجلاس کے ذریعے امیر یوسف سے امداد کی درخواست کا فیصلہ ہوا علما اور ملوک الطوائف کا وفد امیر یوسف سے ملا مگر ملاقات کا اختتام سرد مہری پر ہوا ملوک الطوائف جس بندرگاہ پر فوجیں اتارنا چاہتے ہیں امیر یوسف اس کے برعکس مقام پر فوجیں اتارنا مناسب خیال کرتا تھا۔ بالآخر علما اور فقیہوں کی مداخلت امیر یوسف کی یہ رکاوٹ دور کرنے کا باعث بنی امیر یوسف اپنے بیٹے کی علالت اور سمندری سفر کی ناہمواری کے باوجود جزیرۃ الخضراء پہنچا جہاں سے اشبیلیہ اور پھر زلاقہ کے مقام پر الفانسو کی افواج کے سامنے جا پہنچا۔ جنگ کا نقشہ تغیر پذیر رہا مگر فتح مسلمانوں کو نصیب ہوئی۔ الفانسو نے اس تفرقے بازی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی مگر امیر یوسف کی بروقت مداخلت نے عیسائیوں کے خواب چکنا چور کر دیے امیر یوسف سیر بن ابوبکر کو اپنا نائب بنا کر واپس چلا گیا ابن ابوبکر نے ملوک الطوائف کی حکومتوں کا خاتمہ کر دیا معتمد بھی گرفتار ہو کر افریقہ پہنچا دیا گیا۔ ناول کے بنیادی کردار سعد نے اپنی شریک حیات میمونہ سے کیا ہوا وعدہ یاد دلایا اور آزادی کا سورج تمام تر روشنیوں کے ساتھ طلوع ہوا۔

نسیم حجازی اپنے ناول کے پلاٹ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ تاریخی واقعات اور اس عہد کی معاشرت کو اس طرح مربوط

کر دیا جائے کہ حقیقت کا گماں ہو لیکن اس سے کہیں آگے وہ اس طرح تانا بانا تیار کرتے ہیں کہ قاری کی دلچسپی کسی لمحے کم نہ ہوا سے ذہنی وشعوری طور پر کہانی کا حصہ بنا دیتے ہیں یہ وجہ ہے کہ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ اعتراف کرتے ہیں کہ:

''یوسف بن تاشفین میں بھی ان کی گرفت پلاٹ پر بڑی مضبوط ہے کوئی واقعہ فالتو نظر نہیں آتا ہر واقعہ دوسرے واقعہ کا منطقی ردعمل نظر آتا ہے۔ واقعات میں خواہ مخواہ کا پھیلاؤ تو نہیں ہے نہ وہ ادھر ادھر کی باتوں اور فضول جزئیات میں وقت ضائع کرتے ہیں۔''[۱]

کیونکہ ناول کے پلاٹ کو کسی قدر مستحکم اور جاندار ہونا چاہیے اور ناول نگار کے سامنے وہ مقاصد اور نقطۂ نظر ہو جس کے تحت وہ ناول تحریر کر رہا ہے علی عباس حسینی رقمطراز ہیں:

''قصہ کی ساری دلچسپیاں اسی کی ترتیب پر مبنی ہیں۔ اسے جاننا چاہیے کہ وہ کیوں کر قصہ چھیڑے گا ناظر کی دلچسپی کس کس طرح بڑھائے گا اور اس دلچسپی میں مدوجزر کہاں کہاں پیدا کرے گا۔ اسے، قصہ اس طرح کہنا ہے کہ وہ موثر رہے۔''[۲]

نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں کے موضوعات کا مقصد تحریر بالکل واضح ہو جاتا ہے وہ اپنے موضوع کا انتخاب اس طرح کرتے ہیں کہ زوال پذیر معاشرے کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ ان عوامل کو بھی پیش کرتے ہیں جو اس تباہی کا باعث بنے چونکہ ان کے سامنے امت کا اتحاد اور اتحاد کی بدولت اقتدار کا حصول ہے جو باعزت اور سر اٹھا کر جینے کی اصل منزل ہے اگر اس نقطے کو سامنے رکھ کر ان کے پلاٹ پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

۱۔ اردو میں تاریخی ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۵۰۔۵۱، ۷۵۔

۲۔ اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی عباس حسینی، ص ۶۱۔

کردار:

پلاٹ کے ذریعے کہانی کی ترتیب اور مقاصد سامنے آتے ہیں لیکن دلچسپی برقرار رکھنے اور قاری کو محظوظ کرنے کے لیے کردار نگاری کا سلیقہ جاننا اور اسے بہترین انداز میں برتنا بھی ضروری ہے ناول کے اہم ترین کردار سعد اور میمونہ کے ہیں جن کا تعارف ناول نگار نے ابتدا ہی میں کسی نہ کسی طور کرا دیا ہے۔ سعد کے کردار کو اندلس کے معاشرتی حالات کے مطابق ڈھالنے کے لیے اس کی حربی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ شعلہ بیانی اور عمیق مطالعہ کے شوق سے سنوارا گیا ہے۔ بظاہر ایک انسان کس قدر باہمت، باحوصلہ اور نڈر رہو سکتا ہے وہ سب کچھ تو سعد میں موجود ہے مگر معتمد کے دربار میں اس کی تقریر اور پھر وہاں سے فرار کی کیفیت اس کی بشری خوبیوں سے آگے بڑھ کر اُسے داستانوں کا مافوق الفطرت کردار بنا دیتی ہے اگر اس موقع کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو پورے ناول میں سعد کا کردار خاصہ مناسب ہے۔ دل و دماغ میں عشق کی وہ گرمی جو کسی نسوانی حسن کے پیکر کو دیکھ کر پیدا ہونی چاہیے مگر لحاظ و مروت اور اسلامی اقدار کی پاسداری ہر موقع پر موجود ہے سعد کی جواں مردی اور حوصلہ مندی اُسے اندلس کے نجات دہندہ کے روپ میں پیش کرتی ہے۔ دوسرا اہم کردار میمونہ کا ہے کہ جس کی ہمدردی اور محبت بچپن کے اس کے معصوم دور سے وابستہ ہے کہ جب کوئی انسانی دل کی تیز دھڑکنوں کا مطلب نہیں سمجھتا۔ میمونہ اور سعد کے درمیان ہجر و وصال کے اتنے مواقع آئے کہ انکا ملاپ ناممکن دکھائی دیا مگر ناول نگار نے ایسے حالات پیدا کیئے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے مل گئے۔ قوم کا اجتماعی شعور میمونہ کے ذہن میں جاگزیں ہے یہی وجہ ہے کہ وہ قوم کی سربلندی کی خاطر جدائی و ہجر کے انگاروں پر لوٹتی رہی ہے مگر زبان سے کچھ نہیں کہتی۔

ناول کے دو اور کردار احمد اور طاہرہ کے ہیں جنہیں ملانے اور رشتۂ ازدواج میں منسلک کرنے کے لیے ہجر کی تلخیاں سامنے نہیں آئیں۔ عبدالمنعم کا کردار ایک ثابت قدم حوصلہ مند انسان کا کردار ہے کہ جس نے اپنی جوانمردی سے اپنی زندگی کو سنوارا اور یہی تربیت اپنے بیوی بچوں کو دی تاکہ ملک وملت کی تعمیر میں وہ اپنا کردار ادا کر سکیں۔ معتمد کا کردار ایک تاریخی کردار ہے نسیم حجازی نے کوشش کی ہے کہ اس کی شخصیت کا وہی روپ پیش کیا جائے جو تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔ یہ بہادر اور باہمت شخص ہے مگر حسن سے شیفتگی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ منتقم مزاج اس قدر کے اپنے رفیق ابن عمار کے قتل سے گریز نہ کیا۔ ملکہ رمیکیہ کا کردار ایک خود پسند عورت کا پیکر ہے وہ اپنے حسن کی قیمت جانتی ہے اس لیے اپنی ناز و ادا اور ابرو کے اشارے سے اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتی ہے۔ خواہ وہ کسی قدر بے جا ہی کیوں نہ ہو مگر یہ اچھی بات ہے کہ ناول نگار نے اس کو تعمیری مراحل سے اس طرح گزارا ہے کہ قاری اس کی ذہنی کیفیت کو اس کے خاندانی پستی کے عین مطابق سمجھ لیتا ہے۔ یحیٰی القادر اقتدار کی ہوس کا شکار ہے اس کردار کے ذریعے اندلس کے ان ضمیر فروشوں کی تصویر سامنے آجاتی ہے کہ جو ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے اجتماعیت کے حقوق کا سودا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ الفانسو کا کردار اپنے مقصدِ حیات کے عین مطابق ہے کہ جو افراتفری اور تفرقے بازی سے فائدہ اٹھا کر صلیب کا جھنڈا لہرانا چاہتا ہے وہ بیک وقت چالاکی و عیاری ہر دو طریقوں سے کام لیتا ہے۔ وہ ذات کے تصور سے بالاتر جنگ زلاقہ میں شکست کھانے کے بعد بھی اپنی

فوج منظم کرتا ہے اور ایک بار پھر مسلمانوں کے مقابلوں پر آتا ہے۔

امیر یوسف بن تاشفین کا کردار پختہ و مصمم ارادے کا آئینہ دار ہے اسلام نے تقویٰ کی جو شرائط پیش کی ہیں ان کے قریب تر رہ کر یہ شخص اسلام کے پرچم کو سربلند رکھنا چاہتا ہے۔ وعدے کا پابند اور ایمان کی پختگی سے بھرپور اس کی شخصیت حشمت و عظمت کا مینار ہے۔ سیر بن ابوبکر کا کردار انتہائی سخت حالات میں جینے کی آرزو لیے بیدار ہوتا ہے جبکہ اس کے مزاج کی سختی اس کی شخصیت کا روپ دکھائی دیتی ہے جسے حکم سنانا اور عمل کرنا کہا جاتا ہے اور جب ایسا شخص حاکم بن جائے تو وہ حکم دینا اور اس پر عمل کرنا دیکھنا چاہتا ہے۔ ابن عمار کا کردار انتہائی دلچسپ اور پُر اثر ہے۔ غربت اور مفلسی نے جب اقتدار کی مسند تک پہنچا دیا تو اپنی حقیقت بھول بیٹھا۔ نتیجتاً قتل کر دیا گیا حالانکہ بڑی خوبیوں کا مالک تھا اپنے دشمن کے عزائم کو اپنی چالاکی سے خاک میں ملا دینا اسے خوب آتا تھا۔ یوں تو ناول میں بہت سے دوسرے کردار بھی ہیں لیکن ہم مندرجہ بالا چند کرداروں کے بارے میں اپنی رائے پر اکتفا کریں گے۔ ناول کے سب سے اہم کردار یعنی سعد کے کردار کے بارے میں ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ کی یہ رائے بہت خوب ہے:

''یہ ہیرو نسیم حجازی کا آدرش ہے۔ وہ ہیرو سے لمبی لمبی تقریریں کرواتا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار ان تقریروں میں کرتے ہیں۔ اسلامی حمیت و غیرت کے مقام پر یہ شخص قوم کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرتا اور انہیں خوابِ غفلت سے جگاتا ہے۔''[۱]

لیکن اس سے آگے اگر ناول کے دیگر کرداروں کا جائزہ لیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نسیم حجازی کا فن کامیابی کی معراج تک پہنچ گیا ہے کیونکہ ڈاکٹر احسن فاروقی کی رائے یہ ہے کہ:

''کردار زندگی کے جیتے جاگتے نقشے ہوں اور ناول پڑھنے والا ان کو بالکل ویسا ہی سمجھے جیسا کہ وہ اپنے ملنے والوں یا دوستوں کو سمجھتا ہے یا ان سے ہمدردی اور نفرت کر سکتا ہے اور ناول کے ختم کرنے کے بعد بھی ان کا تصور کر کے مزے لیتا رہے۔''[۲]

اگر ڈاکٹر صاحب کی اس رائے کو معیار بنا لیا جائے تو ہم قارئین کو دعوے کے ساتھ دعوت دیں گے کہ وہ یوسف بن تاشفین کا مطالعہ کریں۔

مکالمے:

ناول میں مکالموں کی اہمیت ایک ایسی حقیقت ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ پلاٹ اور کرداروں کو جاندار بنانے اور ان کے ذریعے تاثر قائم کرنے میں مکالموں کی ادائیگی مسلّم ہے پھر کرداران کی شخصیت یا تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر بھی مکالموں کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ بچے کے منہ سے کیا الفاظ ادا ہونے چاہئیں اور سپاہی کا لب و لہجہ کیسا ہونا چاہیے اور حکمران کس طرح گفتگو کرتا ہے ان باتوں کا خیال رکھ کر اگر مکالمے ادا کیے جائیں تو کردار اجاگر ہوتے ہیں نسیم حجازی نے اپنے اس ناول میں بھی مکالموں پر خاص توجہ دی ہے مثلاً ادریس اور میمونہ گڑیا اتارنے کے مسئلے پر جو مکالمے ادا کرتے ہیں وہ معصوم اور بچکانہ ذہنیت کی مثال ہے:

۱۔ اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۵۲۔

۲۔ ناول کیا ہے: ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ص ۲۳، ۲۴۔

''دیکھو میں تیر کے ساتھ نشانہ کرتا ہوں۔ ابھی نیچے آجائے گی۔ یہ کہتے ہوئے ادریس نے گڑیا کا نشانہ کرنے کی کوشش کی لیکن میمونہ بھاگ کر اس کے بازو کے ساتھ لپٹ گئی۔ ''نہیں نہیں میری گڑیا پر تیر مت چلاؤ!'' [1]

ایک اور مقام پر عبدالمنعم کی گرفتاری کے وقت اپنی بیوی سے گفتگو کرنے کا انداز ملاحظہ کیجیے:

''ممکن ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہو لیکن میں تم سے توقع رکھتا ہوں کہ ان بچوں کو تمھارا پہلا اور آخری سبق یہ ہوگا کہ ایک مسلمان کا مقصد اس کی زندگی سے بڑا ہے۔''

بیوی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میرے آقا! اس سبق کی مجھے بھی ضرورت تھی۔'' [2]

یہاں جو تاثر ابھر کر سامنے آتا ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان گفتگو کس قدر جذباتی ہوتی ہے۔ موقع اور محل کے اعتبار سے الفاظ کیسے ہونے چاہییں یہ سب کچھ ان مکالموں میں موجود ہے۔ شادی کے بعد نو بیاہتا جوڑے کی گفتگو جذبات سے کس قدر بھرپور ہوتی ہے اس کا ایک انداز ملاحظہ ہو کہ جب احمد، طاہرہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

''طاہرہ میں جا رہا ہوں۔ تم اس دن کے لیے دعا کیا کرو جب کہ ہر احمد اپنی طاہرہ کو یہ پیغام دے رہا ہو کہ آج اندلس آزاد ہے۔ اب ہمیں کسی طوفان کی موجیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کریں گی!''

وہ بولتا جا رہا تھا اور طاہرہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوتی گئیں۔ احمد نے کہا۔

''طاہرہ! میں تمھاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا!''

طاہرہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میں قوم کی ہر طاہرہ کی طرف سے آپ کو ہدیہ تشکر پیش کر رہی تھی۔'' [3]

چونکہ مکالمہ نگاری کردار کی حیثیت کا تعین کرتی ہے اس لیے ذرا اس مقام پر گفتگو کا انداز ملاحظہ کیجیے کہ جب ایک حکمران دوسرے حکمران کے نمائندوں سے معلومات چاہتا ہے تو تدبر، فراست، جہاندیدہ پن ان مکالموں کا طرۂ امتیاز ہے کہ جب امیر یوسف سوال کرتا ہے:

''اب میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری فوج کے لیے سمندر عبور کرنے کے بعد اندلس کی کونسی بندرگاہ پر اترنا موزوں ہوگا؟''

ابن زیدون نے جواب دیا۔ ''اندلس کے مسلمانوں کی خواہش ہے کہ وہ جبل الطارق کی بندرگاہ پر آپ کا استقبال کریں!''

''اور اگر میں کسی اور بندرگاہ پر اترنا زیادہ مفید سمجھوں تو؟''

---

[1] یوسف بن تاشفین، نسیم حجازی، ص ۹۰۔

[2] ایضاً، ص ۲۸۹۔

[3] ایضاً، ص ۳۱۰۔

ابن زیدون نے جواب دیا۔ ''ہمیں صرف جبل الطارق کی بندرگاہ آپ کے حوالے کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔'' [۱]

جب حاکمیت محکومیت میں بدل جائے اقتدار کا سورج غروب ہو جائے اور انسان خود کو ظالم لہروں کے آسرے پر چھوڑ دے تو اس قسم کے مکالمات ادا ہوتے ہیں:

''ملکہ رمیکیہ جہاز کے کونے میں کھڑی عظیم الشان محل کی طرف دیکھ رہی تھی اور جب اس محل اور اس کی آنکھوں کے درمیان آنسوؤں کے پردے حائل ہونے لگے تو اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں اپنے شوہر سے کہا۔ ''کیا ہم پھر یہاں نہیں آئیں گے؟ کیا وحشی ہم پر اشبیلیہ کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیں گیا اور کیا وہ محفلیں ہمیشہ کے لیے اجڑ چکی ہیں؟''

''ملکہ رمیکیہ ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں جس چراغ کا تیل ختم ہو چکا ہو وہ آنسوؤں سے نہیں جلا کرتا۔'' [۲]

اس ناول کے مکالموں کو پڑھنے کے بعد ڈاکٹر رشید احمد کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے:

''مکالموں کی زبان آسان اور سادہ ہوتی ہے جملے چھوٹے چھوٹے اور آسان فہم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں عام طور پر مکالمے چست ہوتے ہیں ان کے یہاں کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان کے کرداروں کے منہ میں نسیم حجازی کی زبان ہے۔'' [۳]

کیوں کہ علی عباس حسینی کا خیال ہے:

''وہ اپنے کرداروں کی زبان سے جو کچھ اس کا جی چاہے جو وہ ضروری سمجھے یا جو امور اہم جانے ادا کر سکتا ہے۔ اس کا صحیح اور بروقت استعمال بڑی کامیابی ہے۔'' [۴]

اس لیے اگر یوسف بن تاشفین کے مکالموں پر غور کیا جائے تو اکثر مقامات پر وہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ نسیم حجازی کی یہی خوبی انہیں ایک بہترین تاریخی ناول نگار بناتی ہے۔

منظر نگاری:

ناول نگار کے پاس دکھانے کے لیے تصویریں تو موجود نہیں ہوتیں لیکن کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ کے ذریعے قاری کے دل و دماغ پر ایسی تصویر بنا سکتا ہے کہ کامیاب منظر نگاری بن جائے۔ کہانی میں ایسے موقعے بارہا آتے ہیں کہ کیفیات کے ذریعے اُس موقع کی منظر نگاری کو اجاگر کیا جا سکے اگر برمحل انداز میں اس منظر کو قاری کے دماغ تک کامیابی سے پیش کر دیا جائے تو اسے کامیاب منظر نگاری کہہ سکتے ہیں۔ یوسف بن تاشفین میں اکثر مقامات پر ایسی منظر نگاری پیش کی گئی ہے۔ مثلاً حصن اللبط کے قلعے پر کامیابی کے بعد جب شہدا کی تدفین کا مرحلہ درپیش تھا تو چشم فلک نے یہ منظر دیکھا:

---

[۱] یوسف بن تاشفین، نسیم حجازی، ص ۳۳۸۔

[۲] ایضاً، ص ۳۷۷، ۳۷۸۔

[۳] اردو میں تاریخ ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۲۵۷۔

[۴] اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی عباس حسینی، ص ۶۵۔

''اس نے عبدالمنعم اور حسن کی لاشیں اپنے ہاتھ سے لحد میں اتاریں۔ حسن کے ہاتھ کی انگلیاں ابھی تک تلوار کے قبضے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک سپاہی نے تلوار علیحدہ کرنے کی کوشش کی لیکن احمد نے آگے بڑھ کر ہچکیاں لیتے ہوئے کہا ''نہیں نہیں، میرے بھائی کا زیور نہ چھینو!! اسے تلوار سے زیادہ کسی چیز سے محبت نہ تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں تلوار کے ساتھ شادی کر چکا ہوں۔''

حسن کو اس کی تلوار کے ساتھ دفن کیا گیا۔''[۱]

ایک اور مقام پر منظر نگاری کا انداز ملاحظہ کیجیے:

''اندلس کے علما اور حکمرانوں کے نمائندے افریقہ میں اس درویش حکمران کا دربار دیکھ رہے تھے جسے قدرت نے ان کی نجات کے لیے منتخب کیا تھا۔ امیر یوسف بن تاشفین ایک کشادہ کمرے میں کھجور کی چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے حریر واطلس کے بجائے اون کے کھردرے کپڑے کی قبا پہن رکھی تھی لیکن اس کے باوجود وہ رعب وجلال اور سطوت کا ایک پیکر مجسم نظر آتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں بیک وقت ایک شیر کی جسارت اور ایک بچے کی معصومیت تھی۔''[۲]

یہاں پر ایک ایسے حکمران کے دربار کا منظر پیش کیا گیا ہے جس کے دل میں خوفِ خدا اور جواب دہی کا تصور موجزن ہے اگر اس بات کو سمجھ لیا جائے کہ منظر نگاری موقع، حالات اور شخصیات کے رتبے کے مطابق پیش کی جائے ساتھ ہی جغرافیائی اور موسمی حالات کو بھی مد نظر رکھ لیا جائے تو یقیناً کامیاب ہوگی کیونکہ ڈاکٹر احسن فاروقی کی رائے ہے کہ:

''ناول نگار واقعات و مناظر کو کردار کی فطرت سے ملا کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ ناول میں ایک نئی زندگی آجاتی ہے۔''[۳]

اور اس فن کو برتنے کا سلیقہ نسیم حجازی کو خوب آتا ہے۔ اگر ہم ناول کے کرداروں اور مناظر کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ سلیقہ بدرجہ اتم ملے گا۔ سعد کی شخصیت کو بحیثیت، ہیرو مضبوط اعصاب، جرأت مند، نڈر اور بے باک سپاہی کے روپ میں اس طرح تیار کیا گیا کہ جب وہ معتمد کے دربار سے فرار ہوتا ہے تو اس کی یہی صفات اس کے کام آتی ہیں پھر کامیابی کی راہ گزر اتنی مستحسن بنا دی گئی کہ وہ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اسے منظر نگاری کی بہترین مثال سمجھنا چاہیے اس کے علاوہ بے شمار مقامات پر منظر نگاری انتہائی ماہرانہ نظر آتی ہے۔ جب سعد امیر یوسف کی تلاش میں ساحل پر اترتا ہے اور پھر سیر بن ابوبکر سے ملاقات سے لے کر امیر یوسف کے پڑاؤ تک پہنچنے کا منظر تمام تر جغرافیائی حقیقتوں کے ساتھ موجود ہے اگر اس منظر پر غور کیا جائے کہ جب معتمد اور اس کے اہلِ خانہ جہاز پر سوار افریقہ کی طرف جانے کے لیے تیار ہیں تو اس موقع کی گفتگو میں مایوسی، بے بسی اور پچھتاوے کی کیفیت حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ غرض یہ کہ نسیم حجازی ناول کے ہر فن کی طرح منظر نگاری پر بھی مکمل توجہ دیتے ہیں۔

۱۔ یوسف بن تاشفین، نسیم حجازی، ص ۴۵۳۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۲۶۔

۳۔ ناول کیا ہے، ڈاکٹر احسن فاروقی، ص ۳۳۰۔

معظم علی کا تنقیدی جائزہ

معظم علی:

اس ناول کا خلاصہ اور واقعات کا تحقیقی جائزہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے جہاں ہم نے ناول، اس کی نوعیت اور تاریخی اعتبار سے روشنی ڈالی ہے۔ اب فنی پہلوؤں کا جائزہ پیش نظر ہے۔

پلاٹ:

معظم علی کا پلاٹ سادہ اور قاری کے نقطۂ نظر سے اس میں تجسس کا عنصر ہے۔ ناول نگار نے جہاں بہت سے تاریخی واقعات کو اپنے کرداروں کے ساتھ مربوط کر کے پیش کیا ہے وہیں بعض واقعات کو برسبیل تذکرہ قاری کی معلومات کی خاطر پیش کر دیا ہے بظاہر ناول کو اکیس ابواب میں تقسیم کیا ہے اور اپنے دوسرے ناولوں کی طرح انھیں کوئی ذیلی عنوان نہیں دیا بلکہ ترتیب سے پہلا، دوسرا اور اکیسواں باب کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ناول تاریخی عہد کے حوالے سے چار دہائیوں پر مشتمل ہے اس لیے ایک فرد کے بچپن سے شہادت تک کے واقعات تاریخی حوالوں سے ترتیب دے کر رقم کیے گئے ہیں ناول کا آغاز مرشد آباد کے قید خانے میں معظم علی کے خیالات سے ہوتا ہے اور پھر ناول نگار نے قاری کی معلومات کے پیش نظر معظم علی کا بچپن، مرشد آباد کے حالات، ملک کا سیاسی منظر نامہ اور اس میں بنگال کی آزاد ریاست کے خدوخال اور معظم علی کا ملک کے موجود حالات سے شاکی ہونا بتایا گیا ہے۔ بچپن سے محبت کے وہ معصوم انداز جو دل کی گہرائیوں میں عشق کی منزل تک جا پہنچتے ہیں اور جن میں بچھڑ جانے کا دھڑکا موجزن ہوتا ہے۔ قاری کے لیے انہماک اور پلاٹ کی مضبوطی کی اہم دلیل کے طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ قید خانے کی رہائی سے قبل ہی ناول کے مختلف کرداروں کا تعارف ہمارے سامنے آتا ہے جن میں اکبر خان ایک ایسا کردار ہے جو قاری کی ہمدردیاں سمیٹنے کے ساتھ ساتھ دو خاندانوں کے درمیان روابط کا باعث بنتا ہے۔ بظاہر بنگال میں علی وردی خان کی مضبوط حکومت اس کی موت کے محض ایک سال بعد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے اور وہ غدارانِ وطن جو علی وردی خان کے دور حکومت میں سر اٹھانے کی ہمت نہ رکھتے تھے یکدم سازشوں کا جال بچھانے میں مصروف ہو گئے۔ نواب سراج الدولہ کی شکست اور میر جعفر کی تخت نشینی، بنگال کی تباہی کا پیغام لائی۔ ناول کا اہم کردار معظم علی قید خانے سے آزاد ہونے کے بعد مرشد آباد کے تباہ حال معاشرے پر نظر ڈالتا ہے۔ جہاں اس کی ماں آخری سانسیں لے رہی تھی اور اس کی محبت فرحت بے یار و مددگار غریب الوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دی گئی۔ اس نے اپنا مسکن اودھ میں قائم کیا اور تجارت کے شعبے کو اختیار کیا مگر دل میں لگی آگ چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھی اس لیے اس نے فرحت اور اس کی ماں کی تلاش میں دہلی اور حیدرآباد دکن تک کا سفر کیا مگر وہ جن کی تلاش تھی وہ تو اسی گھر کے ایک چھوٹے سے حصے میں انتہائی بے کسی کی زندگی گزار رہے تھے پھر فرحت اور اس کی ماں کو اپنے پُرتعیش مکان میں لا کر فرحت سے نکاح پڑھوالیا۔ تاریخی اعتبار سے یہ وہ عہد ہے جب احمد شاہ ابدالی اپنی افواج کے ہمراہ مرہٹوں سے مقابلے کے لیے پانی پت کے مقام پر آ پہنچا۔ ناول نگار نے ان واقعات کو جس دلچسپی سے پیش کیا ہے اس میں پلاٹ

نگاری انتہائی کامیاب انداز میں قاری کے انہماک کو برقرار رکھتی ہے اور وہ ناول کے ورق پلٹنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد معظم علی کو اودھ کی حکومت چین سے نہیں بیٹھنے دیتی اور محسوس کرتی ہے کہ معظم علی کی نکتہ چینی عوام الناس کو بغاوت پر اکسانے کا باعث بنے گی اور پھر وہ دن آتا ہے کہ جب اسے محل بلا کر اودھ چھوڑ دینے کا مشورہ دھمکی کے انداز میں دیا جاتا ہے یوں بھی یہاں کے حالات اور موجودہ مصروفیات اس کے مزاج کے مطابق نہ تھیں۔ ایک بار پھر حیدر آباد دکن سے ہوتا ہوا سرنگا پٹم کا رخ کرتا ہے۔ اس دوران اکبر خان کی شادی بلقیس سے ہو جاتی ہے ناول کا یہ دوسرا کردار ہے جو ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہے۔ جن کی ابتدائی سوچ ایک تھی مگر گزرتے ہوئے وقت نے ان کی سوچوں میں تبدیلی پیدا کی تھی۔ معظم علی نے سرنگا پٹم میں مستقل قیام کا فیصلہ کیا اور وہاں نوجوانوں کی فوجی تربیت گاہ میں اپنی خدمات وقف کر دیں۔ اس کے بیٹے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے اسی تربیت گاہ سے فوجی تربیت حاصل کر کے سرنگا پٹم کی جغرافیائی حدود کے تحفظ میں اپنا خون پیش کر رہے تھے۔ یہ وہ دور ہے جب سلطنت خداداد میسور پر دشمن کی نظریں گڑی تھیں وہ ہندوستان کی تسخیر میں اسے اپنی سب سے بڑی رکاوٹ جانتی تھیں۔ حیدر علی کو منظر نامے سے ہٹانے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ نظام اور مرہٹوں کا اتحاد سہ طرفہ محاذ کھول چکا تھا۔ پھر اپنوں کی سازشوں کا جال بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کا باعث بنا۔ حیدر علی کا لے پالک ایاز خان پیش پیش تھا کہ جس نے ساحلی علاقوں پر انگریزی افواج کو خوش آمدید کہنے کا فیصلہ کیا۔ معظم علی کے بیٹے صدیق علی اور مسعود علی ایک ناگہانی صورت حال سے دوچار ہوئے۔ مگر رگوں میں دوڑتا مجاہد خون جوش میں آیا مگر سامان رسد کی عدم دستیابی اور دشمن کی انتہائی تیاری نے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔ عورتوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کے پیش نظر پا بہ زنجیر ہو کر بھی مقابلے پر اتر آیا۔ انگریز افواج کی گولیاں صدیق علی کو بعد میں لگیں پہلے رضیہ نے جام شہادت نوش کیا۔ یہ واقعات اس قدر مربوط، دلگداز اور رقت انگیز ہیں کہ قاری خود بھی کھلے ہوا میں لہرانے لگتا ہے اور اس کے جذبات چہرے پر اس قدر نمایاں ہوتے ہیں کہ جیسے وہ خود اس وقت اس واقعے کا ایک کردار ہو۔ اس دوران حیدر علی کی موت اور ٹیپو سلطان کی محاذوں پر مصروفیات ربط و تسلسل کے ساتھ پیش ہوئی ہیں۔ اس موقع پر معظم علی کو تربیت گاہ سے میدان جنگ میں جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ وہ اس قلعے کو دوبارہ فتح کرتا ہے جہاں اس کے بیٹے اور ایک گمنام لڑکی دیگر بہت سے شہیدوں کے ساتھ دفن تھی وہ قیدیوں اور بیماروں سے حالات سنتا ہے اور پھر رضیہ کے بہت سے خدوخال اس کے دماغ میں بنتے ہیں مگر وہ نہیں جانتا کہ لڑکی کون تھی کہاں سے آئی تھی اور کیوں اسکے بیٹے کے سامنے کھڑے ہو کر گولیوں کی بوچھاڑ روکنے کی کوشش کر گئی اور پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔ پھر معظم علی، غازی خان کی افواج کے ساتھ بڈنور کی بیرونی فصیل کے سامنے کھڑا تھا اور فرانسیسی فوجیوں کی ناکام مشن کی تکمیل کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ گولیاں سینے اور رانوں میں پیوست ہو جاتی ہیں مگر کام کو پایہ تکمیل کو پہنچا دیتا ہے۔ شدید زخمی حالت میں اپنے بیٹے کو ایک خط لکھواتا ہے جس میں اپنی بیوی کو وصیت کرتا ہے کہ بچوں کو شوق شہادت کا درس دینا، جہاد کے لیے ان کی رہنمائی کرنا اور جو ادھورا کام میں نے چھوڑا ہے اسے پورا کرنا۔ فرحت یہ خط پڑھ کر آبدیدہ ہوتی ہے مگر نئی ذمے داریوں کا خیال اس کو حوصلہ مند کر دیتا ہے۔ ناول کا پلاٹ انتہائی دلچسپ طریق

پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس لیے قاری کی دلچسپی کسی لمحے کم نہیں ہوتی اگر دہلی کی جامع مسجد میں معظم علی کا خطاب اور فرحت کے نام اس کے آخری خط کی طوالت کو کچھ کم کیا جاتا تو مزید دلچسپی پیدا ہو سکتی تھی۔ پلاٹ کی ترتیب کے حوالے سے علی عباس حسینی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ:

''اسے قصہ اس طرح کہنا ہے کہ وہ مؤثر رہے اور اس مقصد و غرض کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جس کے لیے وہ ناظر کو زحمت دینا چاہتا ہے۔''[۱]

اور پھر جب تاریخی ناول نگار اپنے پلاٹ بُنتا ہے تو تاریخی واقعات کی ترتیب اور اپنے تخیلاتی کرداروں کے ذریعے واقعات میں ایسا ربط و تسلسل پیدا کرتا ہے کہ وہ عہد سامنے آ جائے انہی حقائق کو بیان کرنے کی اہمیت ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ نے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے:

''کہانی لکھنا اور اس کہانی میں تاریخی واقعہ کو اس طرح شامل کرنا کہ کہیں بھی تاریخی کہانی سے الگ نظر نہ آئے یہ نسیم حجازی کے ناولوں کے پلاٹ کی خوبی ہے۔''[۲]

کیونکہ انہیں کہانی کہنے کا فن آتا ہے اور وہ قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنا جانتے ہیں اور یہی ایک کامیاب فنکار کی پہچان ہے۔ بقول علی عباس حسینی:

''وہ ناظر کو بہت ہی آہستہ آہستہ باتوں میں لگا کر اپنے راستے پر لے آتا ہے اور ایک غیر محسوس طور پر اس کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔''[۳]

اگر ناول کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انہیں کہانی کہنے، قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے، منہمک رکھنے اور کہانی میں ایسا اتار چڑھاؤ پیدا کرنے جس سے تجسس پیدا ہوتا ہے کا سلیقہ آتا ہے چونکہ معظم علی کا پلاٹ ایک ایسے مقام پر کہانی کے اختتام کا باعث بنتا ہے کہ جب ٹیپو سلطان اپنے دورِ حکومت کے ابتدائی عہد میں اپنے دشمنوں سے نبرد آزما تھا اس لیے اس کے بعد ایک اور ناول کی ضرورت تھی جسے ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' مرتب کر کے پورا کیا گیا۔

کردار نگاری:

''اس ناول کے دو اہم ترین کردار معظم علی اور فرحت کے ہیں جو ناول کی ابتدا سے اختتام تک پوری کہانی پر چھائے ہوئے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے نصف اوّل میں بنگال کے دارالحکومت مرشد آباد کے ایک متمول خاندان کی لڑکی فرحت سے متوسط درجے کے ایک خاندانی فرد معظم علی کی محبت پروان چڑھتے دکھائی گئی ہے۔ جس چیز نے معظم علی کے کردار کو منفرد اور اہم ترین بنایا ہے وہ اس کا سیاسی شعور ہے۔ بچپن سے جوانی تک کے دور میں کتابوں کے مطالعے کی بدولت اپنے معاشرے اور ماحول کا گہرا جائزہ لینے کے بعد معظم علی کا فوج میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ اس کی شخصیت کو ممتاز کرنے کا باعث بنا لیکن چونکہ وہ کوئی ڈرپوک اور بزدل شخص نہیں تھا اس

۱۔ اردو میں ناول کی تاریخ و تنقید: علی عباس حسینی، ص ۶۱۔

۲۔ اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۷۴۹۔

۳۔ اردو میں ناول کی تاریخ اور تنقید، علی عباس حسینی، ص ۶۲۔

لیے انتہائی ہوشیاری اور سمجھداری سے ایک گھر کو قلعے میں تبدیل کر دیا اور مرہٹوں کی یورش کو انتہائی ہوش مندی سے ناکام بنا دیا بعد ازاں پانی پت کے مقام پر ابدالی کی افواج کے ساتھ اس کی کارکردگی اور پھر دہلی کی مسجد میں امت کے اتحاد کی خاطر اس کی تقریر ان خیالات کی عکاس ہے جو اس کے ذہنی شعور اور سیاسی سوجھ بوجھ کی وجہ سے اس میں بیدار ہوئے تھے۔ میسور کی ریاست میں اس کی حیثیت تربیت گاہ کے منتظم کی سہی مگر قوم کی آزادی اور اسلام کی سربلندی کے لیے اس کی کوششیں اس کے کردار کو امتیاز بخشتی ہیں۔ اپنے بچوں کی بہترین تربیت اور زندگی کے آخری ایام میں شوقِ شہادت اسے میدانِ جنگ تک لے جاتا ہے۔ جہاں اپنے علاقوں پر اسلام کے پرچم کی سربلندی کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے دوسرا اہم کردار فرحت کا ہے جو بظاہر خاندانی فرق کی بنا پر معظم علی سے محبت تو ضرور کرتی ہے مگر والدین کی اطاعت اور خوشنودی کے لیے اپنے عشق کو قربان کر دینے کے لیے تیار تھی اور جب ایک موقع ایسا آیا تھا اس نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اطاعت و فرمانبرداری کا ثبوت دیا۔ انتہائی خراب حالات میں معظم علی سے اپنی وابستگی کو برقرار رکھنا چاہا مگر غریب الوطنی اس کا مقدر تھی ایک کمزور پہلو اس کے کردار کا اس وقت سامنے آتا ہے کہ جب وہ اسی حویلی میں رہتے ہوئے جو معظم علی کی ملکیت تھی کیوں اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ ناول نگار اس موقع کی کوئی مناسب توضیح پیش کرنے میں بھی ناکام ہے البتہ اپنی اس اطاعت و فرمان برداری کا ثبوت ہر لمحہ دیا جو اسے اپنے والدین سے وراثت میں ملا تھا اپنے دو بیٹوں کی شہادت کی خبر جس صبر و استقامت سے سنی وہ اس کے کردار کی مضبوطی کا منہ بولتا ثبوت ہے جبکہ شوہر کی شہادت اور اس کا آخری خط اس کے لیے نئے عزم و حوصلے کا باعث بنا چونکہ یہ کردار ناول کے اختتام تک زندہ رہتا ہے اور نسیم حجازی کے دوسرے ناول ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' میں کافی دیر تک چلتا ہے اس لیے اس کے مزید اوصاف آئندہ پیش کیے جائیں گے۔

اس ناول کے تاریخی کردار علی وردی خان، سراج الدولہ، احمد شاہ ابدالی، نظام حیدرآباد، نواب شجاع الدولہ، سلطان حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے ہیں۔ بعض دیگر کردار بھی ہیں مگر ہم چند ایک پر تبصرہ کریں گے۔ علی وردی خان کی ذہانت اور ہوش مندی تقریباً دس سال تک بنگال کو جنگوں سے دور رکھے رہی مگر اس کے دربار میں پلنے والے باغی عناصر اس کے نواسے سراج الدولہ کے لیے مشکلات کھڑی کرتے رہے گو کہ اس کا دورِ حکومت انتہائی مختصر ہے اور اس کی شکست کا باعث اس کے اپنوں کی غداری ہے اس کے باوجود اس کی شخصیت میں اپنے محسنوں کے لیے اعتراف کا جذبہ موجزن ہے۔ احمد شاہ ابدالی کا کردار جنگی حکمتِ عملی، امتِ مسلمہ کے اتحاد اور اسلام کی سربلندی کے لیے جذبۂ جہاد سے سرشار شخصیت کے روپ میں پیش کیا گیا ہے جبکہ شجاع الدولہ کا کردار انتہائی خود پسند اور متکبرانہ مزاج کا آئینہ دار ہے وہاں ظاہری رکھ رکھاؤ تو موجود ہے مگر حقیقی انسانیت کا فقدان ہے۔ نظام دکن نے زندگی کے ہر موڑ پر اپنی سلطنت کی وسعت کو ترجیحی انداز میں مقدم رکھا اسلامی مملکت کی تعمیر کے بجائے وہ ذاتی منفعت کی خاطر کبھی انگریزوں اور کبھی مرہٹوں سے ساز باز کرتا دکھائی دیتا ہے حیدر علی کی اولوالعزمی اور غیر ملکی سامراج سے چھٹکارا پانے کی خواہش اس کی شخصیت کا انفرادی وصف ہے وہ مرہٹوں اور نظام سے اتحاد کر کے انگریز تاجروں سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا وہ زندگی کے آخری ایام تک اندرونی اور بیرونی

سازشوں سے نبرد آزما رہا۔ اس کا کردار انتہائی جاندار اور مستحکم ہے۔ ٹیپو سلطان کا کردار اپنی اوائلِ عمری سے نڈر اور بے خوف دکھایا گیا ہے۔ جنگی مہارت اور حکمتِ عملی اس میں موجود اضافی جوہر تھے جب وہ پانی پت کی لڑائی کا نقشہ بنوا کر اپنے نشانات کے ذریعے بہترین جنگی حکمتِ عملی کا اعتراف کرتا ہے تو بظاہر وہ اپنے ذہین و فطین ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ مختلف محاذوں پر اس کی کارکردگی اور انگریز جہاندیدہ جرنیلوں کو شکست دینے کی صلاحیت، نظام سے صلح کے موقع پر اس کا انداز اس میں موجود سیاسی و حربی شعور کا منہ بولتا ثبوت ہیں یہ کردار بھی تفصیل سے ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' میں پیش کیا جائے گا۔

اس ناول کے دیگر کردار زیادہ اہم نہیں لیکن اپنی کسی نہ کسی خوبی کی وجہ سے اپنی حیثیت متعین کراتے ہیں۔ مثلاً صابر جوان کا خاندانی گھریلو ملازم ہے ناول کی ابتدا سے انتہا تک موجود رہتا ہے اس کی ایمانداری خاندان سے لگن اسے ملازم کے بجائے گھر کے فرد کا مقام دیتی ہے انتہائی فرض شناسی اس کے کردار کی انفرادیت ہے۔ اسد خان کا کردار ایک سفیر کے انداز میں متعارف ہوا مگر ناول کے آخری حصے پر چھایا ہوا ہے۔ اکبر خان کا کردار حادثاتی طور پر ناول میں داخل ہوا مگر اپنی بے پناہ محبت، خلوص اور دوستی کی بنا پر خاندان کے فرد کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ بلقیس بظاہر لڑکپن میں اپنی محدود سوچ اور بے شمار سوالات کی بنا پر متعارف ہوئی مگر جلد ہی خاندان کا حصہ بن گئی مسعود علی اور صدیق علی ایک مجاہد باپ کے بیٹے ہیں اپنے کردار، عمل اور مشکل حالات میں حوصلہ مندی کی بدولت خود کو ایک مجاہد ثابت کرتے ہیں جبکہ رضیہ کا کردار بہت مختصر عرصے کے لیے ناول میں آیا لیکن قاری کی بیشتر ہمدردیاں سمیٹ لے گیا۔

میر جعفر کا کردار سازشی ذہنیت اور تخت و تاج کی ہوس کا آئینہ دار ہے اسی طرح ایاز خان ذاتی خواہشات کی خاطر ملک و قوم سے غداری تک کر جاتا ہے، ساتھ ہی میر حبیب کا کردار ہے جہاں ذاتی منفعت اس کی گھٹی میں پڑی ہے وہیں اس کی شخصیت کا دوسرا روپ ہمدردی، انسان دوستی بھی نظر آتا ہے۔ مختصراً یہ کہ ناول کے تمام ہی کردار جن کا تذکرہ ہم نہ بھی کر سکے ہوں اپنی اہمیت اور مقصدیت کے پیشِ نظر ناول کی ضرورت کہے جا سکتے ہیں اور انہی تمام کرداروں کی بدولت ناول کے پلاٹ کو تقویت ملتی ہے۔ معظم علی کی کردار نگاری کے بارے میں ڈاکٹر رشید گوریجہ رقمطراز ہیں کہ:

''تاریخی ناولوں میں سب سے مشکل کام تاریخی کرداروں کی پیش کش ہے نسیم حجازی کے یہاں یہ تاریخی کردار بھی اپنی پوری تاریخی عظمت یا ذلت سمیت ہمارے سامنے آتے ہیں مثلاً معظم علی میں نواب سراج الدولہ کا کردار پوری عظمت سمیت ہمارے سامنے آتا ہے۔''[۱]

یہی وجہ ہے کہ نسیم حجازی کردار نگاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے وہ موقع محل کی مناسبت سے اپنے کام کو بہترین انداز میں پیش کرتے ہیں جب وہ تاریخی کردار پیش کریں تو ماحول اس لحاظ سے تاریخی ہوگا لیکن جب تخیلاتی کردار پیش کرتے ہیں تو بھی ان کا فن معراج کی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے جس کا اعتراف ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

---

[۱] اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۷۵۳۔

''نسیم حجازی ایک طرف تو تاریخی شخصیتوں کو کردار کی صورت میں پیش کرتے ہیں دوسرے بعض فرضی کردار تراشتے ہیں ان کرداروں کی مدد سے نسیم حجازی کسی دور کی تہذیب و معاشرت کو پیش کرنے میں مدد لیتے ہیں۔ یہ کردار مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔''[۱]

مکالمے:

ناول کا تعلق پڑھنے سے ہے اور مکالموں کے ذریعے تاثر پیدا کیا جاتا ہے جو کردار کو بھی اجاگر کرتا ہے اور ناول کی ہیئت اور موضوع میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ تاریخ کے کردار اپنی شخصی خوبیوں یا خامیوں کے اعتبار سے یاد رکھے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کے مکالمے ہی اُن کی شخصیت کے عکاس ہوتے ہیں۔ ناول معظم علی میں جا بجا ایسے مکالمے ادا کیے گئے ہیں جو تاریخی حقائق اور کردار نگاری ہر دو اعتبار سے یکساں مفید ہیں۔ مثلاً میر جعفر کے کردار کو میر مدن اور معظم علی کے ان مکالموں سے نمایاں کیا گیا ہے:

''کوئی ایک گھنٹہ بعد معظم علی، میر مدن کے مکان کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ میر مدن نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اسے اپنے سامنے بٹھانے کے بعد کہا ''معظم علی! میں کسی تمہید کے بغیر تمھارے ساتھیوں کے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔''

معظم علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔'' میرے ساتھی میر جعفر کی بزدلی اور بے غیرتی کا کفارہ ادا کر چکے ہیں اور میں مرشد آباد کی ماؤں اور بہنوں کے لیے یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ حکومت کی بے حسی اور نااہلیت کے باعث ان کے تین سو بیٹے، بھائی اور شوہر ہلاک ہو چکے ہیں۔''[۲]

جب معظم علی میر حبیب کی قید سے فرار ہو کر علی وردی خان کے پاس پہنچا اور چاہتا تھا کہ میر حبیب کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے علی وردی خان نے اس رائے سے بظاہر اتفاق نہ کیا اسے چھ ماہ کی چھٹی دے کر رخصت کیا تو علی وردی خان اور سراج الدولہ کے درمیان یہ یادگار مکالمے ہوئے:

''معظم علی باہر نکل گیا اور علی وردی خان سراج الدولہ کی طرف دیکھنے لگا۔

سراج الدولہ نے کہا'' جہاں پناہ! گستاخ ہونے کے باوجود وہ ایک اچھا سپاہی ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ چھ ماہ کے بعد بھی شاید ہماری فوج میں دوبارہ آنا پسند نہ کرے۔''

علی وردی خان مسکرایا۔'' وہ محمود علی کا بیٹا ہے مجھے یقین ہے کہ اس وقت بھی اگر ہمیں کسی محاذ پر جانا پڑے تو وہ گھر جانے کی بجائے ہماری اگلی صف میں لڑنا پسند کرے گا تم جاؤ اور اسے عزت و احترام کے ساتھ رخصت کرو کسی دن وہ تمھارے ترکش کا بہترین تیر ثابت ہوگا۔''

---

[۱] اردو میں تاریخی ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۵۳۔ ۷۵۔

[۲] معظم علی، نسیم حجازی، ص ۱۰۶۔

سراج الدولہ نے کہا۔ ''تو آپ اس سے خفا نہیں ہوئے ؟''

علی وردی خان نے مغموم لہجے میں کہا۔ ''خفا؟ ایک بوڑھا اپنی لاٹھی سے، ایک سپاہی اپنی تلوار سے، ایک مصنف اپنے قلم سے اور ایک فرمانروا اپنے عصائے حکمرانی سے کیونکر خفا ہو سکتا ہے۔ ہاں مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ جب وہ انتہائی اشتعال کی حالت میں بول رہا تھا تو میں نے آگے بڑھ کر سینے سے کیوں نہ لگالیا۔ کاش! میرے اسلحہ خانے میں اس قسم کی تلواریں اور بھی ہوتیں اور میں ہر محاذ پر ہر دشمن کو للکار سکتا۔ لیکن جب تمھارا وقت آئے گا تو مجھے یقین ہے کہ بنگال کے حالات اس سے مختلف ہوں گے۔ معظم علی جیسے نوجوانوں کے دل کی دھڑکنوں میں ایک نئی قوم جنم لے گی تم جاؤ اور بخشی سے کہا کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو قید کے زمانے کی پوری تنخواہ ادا کر دی جائے۔ ہم ایک ہفتہ تک مرشد آباد پہنچ جائیں گیا اور وہاں میں کوشش کروں گا کہ اسے تمھاری محافظ فوج کا کماندار مقرر کر دیا جائے۔''[۱]

اننت پور کے قلعے میں محصور حالت میں صدیق علی، رضیہ کو قلعے کی طرف آتا دیکھ کر اضطراب کی کیفیت میں جو گفتگو کرتا ہے وہ مکالمے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں:

''صدیق علی نے آگے بڑھ کر کہا: ''رضیہ تم نے بہت برا کیا۔ اس قلعے میں چار سو عورتیں اور بچے پہلی ہی پناہ لے چکے ہیں اور خدا معلوم اس کی دیواریں کب تک دشمن کی گولہ باری کے سامنے ٹھہر سکیں۔''

رضیہ نے جواب دیا۔ ''میں اس قلعے میں پناہ لینے نہیں آئی آپ میرا نام اپنے سپاہیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔''[۲]

نسیم حجازی کے یہ مکالمے اپنی مثال آپ ہیں یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر رشید گوریجہ اعتراف کرتے ہیں کہ:

''ان کے مکالموں سے ان کے کرداروں کی انفرادیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ مکالمے کرداروں کی شخصیت سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مکالموں کے ذریعے کرداروں کی نفسیاتی اور داخلی کشمکش کی کیفیت کو بڑی فنی مہارت سے ابھارا ہے مکالموں سے ان کے کرداروں کی شخصیت کی تصوراتی تشکیل و تعمیر میں بڑی مدد ملی ہے۔''[۳]

منظر نگاری:

ناول نگار کاغذ پر حرف لکھتا ہے اور ان کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں منظر اجاگر ہو جائے یہی ناول نگار کی کامیاب منظر نگاری ہوتی ہے نسیم حجازی منظر نگاری کے فن کو کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں مثلاً جب معظم علی بنگال میں میر جعفر کی غداری اور سراج الدولہ کی شکست کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے تو گھر کی بربادی و ویرانی کا منظر نسیم حجازی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

'' روشن کمرے کی طرف قدم اٹھاتے وقت معظم علی کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں یہ وہ گھر تھا جہاں ہر وقت مسرت کے قہقہے اس کا

۱؎ معظم علی: نسیم حجازی، ص ۱۶۹۔

۲؎ ایضاً، ص ۵۲۲۔

۳؎ اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۵۵۶

استقبال کیا کرتے تھے۔ بجلی چمکی اور اسے بالائی منزل قبرستان سے زیادہ اداس اور سنسان دکھائی دی۔ اس نے نوکر کو پکارنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی پھر وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور برآمدے سے گزرنے کے بعد کونے کے کمرے میں داخل ہوا۔ چند ثانیے وہ بے حس و حرکت کمرے کے درمیان کھڑا رہا۔ اس کی ماں آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹی ہوئی تھی چراغ کی مدہم روشنی میں اس کا رنگ بے حد زرد معلوم ہوتا تھا۔ وہ عورت جس کی صحت پر پڑوس کی نوجوان لڑکیاں رشک کرتی تھیں، اب ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک سن رسیدہ عورت اس کے بستر کے قریب بید کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی، وہ معظم علی کو دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کر ایک طرف ہٹ گئی اور سسکیاں لینے لگی۔

''معظم علی! بیٹا تمھارا گھر لٹ چکا ہے۔'' اس کی آہیں سسکیوں اور سسکیاں چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ آمنہ نے آنکھیں کھولیں معظم علی ''امی جان!'' کہتا ہوا آگے بڑھا ماں نے ہاتھ پھیلا دیے اور اس نے بستر کے قریب دوزانو ہو کر اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ آمنہ معظم علی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے۔ چیخیں ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا سارا جسم لرز رہا تھا اس نے کہا۔

''میرے بیٹے! میرے لال تم اس طوفان سے آئے ہو۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے میں صرف تمھارا انتظار کر رہی تھی۔''[1]

اننت پور کے قلعے پر انگریزوں کی یلغار کے بعد کا منظر جس میں وحشت و بربریت کا طوفان اٹھایا گیا منظر نگاری کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے:

''عورتوں اور بچوں کی چیخوں کے ساتھ انگریزوں کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔

صدیق علی یہ جگر خراش منظر برداشت نہ کر سکا وہ جھپٹ کر آگے بڑھا اور اپنے راستے کے ایک سپاہی کو دھکا دے کر گرانے کے بعد آنکھ جھپکنے کی دیر میں ایک انگریز افسر پر پل پڑا جو ایک نوجوان لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا۔ اس نے ایک ہی مکّے سے اسے نیچے گرا دیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ سپاہیوں نے بندوقوں کے کندے مار مار کر اسے علیحدہ کیا اور اس کے ہاتھ ایک رسی سے جکڑ دیے۔ اتنی دیر میں صدیق علی کے چند ساتھی انگریز سپاہیوں کے ہاتھوں سے سنگینیں چھین کر چھ آدمیوں کو ہلاک کر چکے تھے انگریزوں نے اس کے جواب میں قتل عام شروع کر دیا اور آن کی آن میں پچاس قیدی موت کے گھاٹ اتار دیے۔ اس وحشیانہ قتل عام کے دوران کئی عورتیں اور لڑکیاں دشمن کی وحشت اور بربریت سے بچنے کے لیے قلعے کے کنویں میں چھلانگ لگا کر جانیں دے چکی تھیں۔

انگریز کمانڈنٹ نے صورت حالات پر قابو پاتے ہی بقیۃ السیف قیدیوں میں سے بیس آدمی علیحدہ کیے اور ان کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر فصیل کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ صدیق علی ان کے درمیان کھڑا تھا اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ دیوار

---

[1] معظم علی، نسیم حجازی، ص ۲۰۵۔

سے چند قدم دور قیدیوں کے سامنے کھڑا ہو گیا رضیہ چند قدم عورتوں کے ساتھ پشت بہ دیوار قیدیوں سے تھوڑی دور کھڑی سکتے کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہی تھی انگریز کمانڈنٹ نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور سپاہیوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں۔

رضیہ اچانک عورتوں کے ہجوم سے نکل کر بھاگی اور ''صدیق صدیق'' کہتی ہوئی بندوقوں کی زد میں آ گئی اس کے ساتھ کمانڈنٹ نے ''فائر'' کہہ کر ہاتھ نیچے کر دیا۔ بندوقوں کے مہیب دھماکوں کے ساتھ ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ رضیہ، صدیق علی سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر گری اٹھی، پھر گری اور اس کے بعد زمین پر رینگتی ہوئی صدیق علی کی لاش سے لپٹ گئی۔''[1]

ناول نگار کے قلم نے ایک اور منظر اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری دم بخود اس منظر کو آنکھوں سے دیکھتا ہوا محسوس کرتا ہے:

''معظم علی فصیل سے کوئی تیس چالیس قدم دور ایک زخمی سپاہی کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ دو فرانسیسی جوان جن میں سے ایک کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل تھی اور دوسرا اپنے بازؤں میں ایک بارودی گولہ تھامے ہوئے تھا بے تحاشہ فصیل کی طرف بھاگ رہے ہیں ان کے پیچھے فرانسیسی سپاہیوں کا ایک دستہ فصیل کے مورچوں پر گولیاں برساتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ معظم علی بلند آواز میں چلایا ''دشمن کو اپنی طرف متوجہ رکھو۔'' اور اس کے ساتھیوں نے پلٹ کر فصیل پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ غازی خان اور فوج کے دوسرے افسر دم بخود ہو کر فرانسیسی جانبازوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بارودی گولے کے بوجھ کے باعث فرانسیسی سپاہی اپنی دوڑ کا آخری مرحلہ بڑی مشکل سے طے کر رہا تھا اور دوسرا جس کے ہاتھ میں مشعل تھی، چند قدم بھاگ کر اپنے ساتھی سے آگے نکل جاتا اور پھر اچانک زمین پر لیٹ کر اس کا انتظار کرتا۔ فصیل سے آٹھ دس قدم دور یہ دونوں یکے بعد دیگرے زخمی ہو کر گر پڑے ایک ثانیے بعد ان میں سے ایک دوبارہ اٹھا اور گولہ اٹھا کر فصیل کے ساتھ جا گرا۔ پھر اس نے گولے کو فصیل کے شگاف کے اندر دھکیل دیا اور زمین پر رینگتا ہوا واپس مڑا اپنے گرے ہوئے ساتھی کے قریب پہنچ کر اس نے جلتی ہوئی مشعل اٹھائی اور دوبارہ مڑ کر فصیل کی طرف رینگنے لگا لیکن اچانک اس کے سر میں گولی لگی اور وہ بے حس و حرکت لیٹ گیا۔

معظم علی اچانک اٹھ کر پوری رفتار سے بھاگا اور پھر اچانک زمین پر منہ کے بل لیٹ گیا پھر چند قدم اٹھ کر بھاگا اور دوبارہ لیٹ گیا تیسری کوشش میں وہ فرانسیسی سپاہی کے ہاتھ سے گری ہوئی مشعل اٹھا چکا تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے اس کی ران اور اس کے سینے میں دو گولیاں لگیں لیکن وہ گرتے پڑتے بارودی گولے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ فصیل کے شگاف کے اندر سمٹنے کے بعد وہ اوپر سے آنے والی گولیوں کی زد سے محفوظ تھا اس نے جلتی ہوئی مشعل بارودی گولے کے فیتے پر رکھ دی پھر اپنی رہی سہی قوت بروئے کار لاتے ہوئے فصیل کے شگاف سے باہر نکلا اور بھاگنے لگا۔

اتنی دیر میں فصیل کے مورچوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ فصیل سے بیس گز دور معظم علی گر پڑا اسی کے ساتھ ہی ایک زبردست دھماکہ سنائی دیا۔ دھوئیں اور گرد کے بادل اڑے اور میسور کے سپاہی قلعے کی مشرقی دیوار میں ایک چھوٹے شگاف کی جگہ ایک بڑی گزرگاہ

---

[1] معظم علی: نسیم حجازی، ص ۵۳۲۔

دیکھ رہے تھے۔''[۱]

انہی شواہد کو ناقدین کی آراء کے مقابل رکھ کر دیکھا جائے تو ہمیں نسیم حجازی بہترین منظر نگار دکھائی دیں گے کیونکہ علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

''کوئی قابل قدر ناول منظر نگاری، سماں بندی اور مرقع کشی سے خالی نہیں ہو سکتا اور اطناب و ایجاز کا خیال رکھ کر انہیں ''پس منظر'' میں پیش کرنا فن کارانہ ہوشیاری و ہنر مندی کی دلیل ہے۔

اس مقام پر یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ منظر کرداروں کے مختلف سیرتی پہلوؤں کو اجاگر کرنے لیے لکھا جاتا ہے نہ کہ محض صبح و شام، گرما و سرما کی تصویر کشی کے لیے۔''[۲]

---

[۱] معظم علی: نسیم حجازی، ص ۵۲۶۔

[۲] اردو ناول کی تاریخ و تنقید: علی عباس حسینی، ص ۶۶۔

''اورتلوار ٹوٹ گئی'' کا تنقیدی جائزہ

اورتلوار ٹوٹ گئی:

اس ناول کا خلاصہ اور واقعات کا تحقیقی جائزہ پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ اب ہم اس ناول کے پلاٹ، کردار، منظر نگاری اور مکالموں کے فنی پہلوؤں کا جائزہ لیں گے۔

پلاٹ:

''اورتلوار ٹوٹ گئی'' کا پلاٹ کہانی کے اعتبار سے انتہائی دلچسپ اور پُراثر ہے اس کی ایک وجہ واقعہ کا برصغیر سے تعلق ہے۔ ٹیپو سلطان کی شخصیت تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی حیثیت تحریک آزادی اور برصغیر سے انگریزوں کے انخلا کے حوالے سے مسلم ہے۔ نسیم حجازی نے اپنے اس ناول کو اکتیس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ان ابواب کی کوئی انفرادی حیثیت تو نہیں کیونکہ کہانی کا پلاٹ مربوط ہے ٹیپو سلطان کا دورِ عروج دکھایا گیا ہے ساتھ ہی ان مشکلات اور دشواریوں کا تذکرہ ہے جن سے اسے واسطہ پڑا۔ ناول کا اختتام ٹیپو کی شہادت اور بعد میں ہونے والی مقامی بغاوتوں پر ہوا ہے۔ کہانی انتہائی دلچسپ، پُراثر اور دلسوز ہے۔ قاری اپنا تعلق ناول سے توڑنے کے لیے کسی بھی لمحے تیار نہیں ہوتا اگر کوئی ایسا موقع آ بھی جائے کہ اسے ناول چھوڑ کر کوئی اور کام کرنا ہو تو وہ انتہائی بے دلی کے ساتھ اٹھتا ہے۔ اپنی دیگر مصروفیات کے دوران وہ ناول کے پلاٹ میں کھویا رہتا ہے کہ اب کیا ہوگا۔ یہ انہماک اس کی ذاتی خواہشات تک پروان چڑھتا ہے جب وہ کسی معجزہ ہو جانے یا باغیوں کے ختم ہو جانے کی توقع کرتا ہے چونکہ یہ ناول دو سلسلے وار ناولوں کی دوسری قسط قرار دیا جا سکتا ہے اس لیے اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ ناول معظم علی میں جن کرداروں کا تعارف ناول نگار نے کرایا تھا اس ناول کی کہانی انھی کرداروں یا مزید چند نئے کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ ناول معظم علی کا خاتمہ میسور کے جغرافیائی حالات میں ٹیپو سلطان کی فتوحات اور انگریزوں کی پسپائی کے درمیان ہوا تھا اس لیے ''اورتلوار ٹوٹ گئی'' کی کہانی اسی مقام سے شروع ہوتی ہے کہ جب معاہدہ منگلور کے ذریعے جنگ کا خاتمہ ہوا جو ٹیپو سلطان کی فتح کے مترادف تھا۔ ابھی تک فرانسیسی افواج کڈلور میں انگریزوں کے لیے تباہی کا سامان کر رہی تھیں کہ یورپ سے برطانیہ اور فرانس کے درمیان جنگ کے خاتمے کے اعلان کی خبر آئی ادھر ٹیپو سلطان نے نرگنڈ کے راجا ونکٹ راؤ سے مصالحت کے لیے اپنا ایلچی بھیجا اور پونا میں نانا فرنویس کو ان معاملات میں دخل اندازی سے منع کیا مگر دونوں اپنی ضد پر اڑے رہے۔ مجبوراً ٹیپو سلطان نے برہان الدین کو ایک فوج دے کر روانہ کیا جس نے نرگنڈ کے قریب ونکٹ راؤ کو شکست سے ہمکنار کیا۔ اس کے بعد برہان الدین نے پرس رام راؤ بھاؤ کو شکست دی۔ دوسری طرف ایک اور سپہ سالار حیدر علی کورگ کی بغاوت دبانے میں کوشاں تھا جسے ابتدا میں کامیابی ہوئی مگر بعد میں ناکامی ہوئی جس کی وجہ سے فوج کی قیادت ٹیپو سلطان نے سنبھالی اور میدان میں آیا اور نائروں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد زین العابدین مہدوی کو کورگ کا صوبیدار مقرر کیا اور خود سرنگا پٹم واپس چلا گیا کیونکہ نانا فرنویس کی فوجیں دریائے کرشنا کے کنارے جمع ہو رہی تھیں۔ اس موقع پر ناول نگار اپنے تخیلاتی کرداروں کو

ایک بار پھر ناول میں لاموجود کرتا ہے۔ اکبر خان اپنے دوست معظم علی کے خاندان سے ملنے سرنگا پٹم آتا ہے تو وہ معظم علی، صدیق علی اور مسعود علی کی شہادت پر افسوس کا اظہار اور اپنی لاعلمی پر ندامت کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ ان واقعات سے دو سال تک بے خبر رہا۔ دونوں خاندان تعلقات اور معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں اس موقع پر انور علی پانڈی چری کی بندرگاہ پر فوجی بھرتی کی غرض سے متعین تھا ایک فرانسیسی جہاز کا کپتان فرانسک لیگرانڈ کو انور علی کے حوالے کر دیتا ہے لیگرانڈ ایک انقلابی ہونے کے شبہ میں فرانسیسی پولیس کو مطلوب تھا۔ اس کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد انور علی اسے کرشناگری ایک تعارفی خط کے ہمراہ روانہ کر دیتا ہے۔ لیگرانڈ کی تلاش میں آنے والا انسپکٹر برنارڈ اپنی سرگرمیاں جاری رکھتا ہے۔

یہ وہ موقع ہے کہ جب لیگرانڈ کے بارے میں معلومات جہاں اس عہد کی تاریخی حقیقت ہے وہیں قاری کے لیے دلچسپی کا باعث بنتی ہے کیونکہ جین کی آمد اور پھر سرنگاپٹم کی طرف اس کی روانگی بظاہر انسپکٹر کی توقع کے خلاف تھی لیکن قاری کے دل کی دھڑکن اور نیک تمنائیں جین اور انور علی کے ساتھ تھیں۔ لیگرانڈ اور جین کی ملاقات انتہائی مختصر رہتی ہے اور ان کی شادی مستقبل کے لیے ٹل جاتی ہے۔ یہاں ناول نگار نے جس ہوشیاری سے کہانی کو طول دینے اور جین کو فرحت سے میل ملاپ بڑھانے کا موقع فراہم کیا وہ پلاٹ میں دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ اس موقع پر ناول نگار نے معظم علی کے بیٹے اور ان ابتدائی کرداروں کو ایک بار پھر دکھایا ہے کہ جب مراد علی اکبر خان کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے حیدر آباد جاتا ہے۔ یہ شادی کی تقریب اس عہد کے سیاسی منظر نامے کی عکاسی بھی کرتی ہے کہ جب حیدر آباد کے عوام کا ایک گروہ میسور کی حکومت سے بہتر تعلقات کا خواہش مند تھا۔ یہاں پلاٹ میں قاری کے لیے مزید انہماک اکبر خان کی دوسری بیٹی بلقیس کے ساتھ مراد علی کے دل کی دھڑکنوں کا ایک ساتھ دھڑکنے اور دلچسپی لینے سے پیدا کیا گیا ہے۔ دوسری طرف جین اور لیگرانڈ کی شادی کو حالات کی بہتری سے منسوب کر کے التوا میں ڈالا گیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ وہ دور ہے جب مرہٹے اور نظام کی افواج مشترکہ طور پر میسور کی سلطنت پر حملہ کیا چاہتی تھیں۔ نسیم حجازی نے ان تمام واقعات کو اتنے مربوط اور مستحسن انداز میں رقم کیا ہے کہ قاری کے سامنے تاریخ کا ہر پہلو آجائے ان سازشوں کا تذکرہ جو انگریز اور اتحادی افواج کے درمیان تھیں اور ان خواہشات کا اظہار جو ٹیپو سلطان کی طرف سے مرہٹوں اور نظام کو سمجھانے کی غرض سے تھیں کہ دوست اور دشمن کی تمیز کی جائے۔ اس کیفیت کو اس خوبی سے مرقوم کیا ہے کہ قاری کی تمام تر ہمدردیاں ٹیپو سلطان کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ ادھر ناول نگار نے اپنے بنیادی کرداروں کو ایک بار پھر پیش کیا ہے کہ جہاں شہباز تنویر کے سسرال سے واپسی پر اکبر خان کو حیدر آباد کی فوج میں اپنی شرکت کی اطلاع دیتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہو جاتا ہے کہ یہ فوج اسلام کے غداروں کی فوج ہے مگر اب اسے اپنے عہد کا پاس کرتے ہوئے حیدر آباد کی فوج میں شامل رہنا چاہیے۔ اس موقع پر ٹیپو نے براہِ راست اتحادی افواج کا مقابلہ کرنے کے بجائے انھیں مختلف محاذوں پر مصروف رکھا۔ یہ حکمتِ عملی خاصی کامیاب رہی اور جب سلطان کی افواج ادھونی پر حملہ آور ہوئیں تو یہاں تنویر اور بیمار حالت میں شہباز کی ملاقات مراد علی اور تنویر علی سے ہوتی ہے۔ یہ ناول نگار کی چابکدستی ہے کہ وہ تاریخی واقعات کے درمیان اپنے کرداروں کو اس طرح

پیش کرتا ہے کہ وہ بالکل حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ سلطان کی افواج نے مختلف محاذوں پر اتحادی افواج کو شکست دی اور جب مرہٹوں نے صلح کی درخواست کی تو اس نے اپنی تلوار نیام میں ڈال لی۔ ناول نگار کے اس انداز کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تمام تر تاریخی حقائق کو پیش کرتے ہوئے اس عہد کی معاشرت کو اپنے تخیلاتی کرداروں کے ذریعے اجاگر کرتا ہے اس دوران لیگرانڈ اور جین کی شادی ہو جاتی ہے۔ فرحت انتہائی قیمتی تحائف بشمول مکان اور نوکر دیتی ہے۔ اس موقع پر انگریز مرہٹوں اور نظام کے ساتھ مشترکہ طور پر میسور پر حملہ آور ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں مگر ان کے درمیان تذبذب کی کیفیت تھی۔ نظام کی افواج پہلے انگریزوں کو حملہ کرنے کی دعوت دیتی تھیں اور مرہٹے اس شرط پر جنگ میں کودنا چاہتے تھے کہ جب نظام اور انگریز جنگ میں شامل ہوں۔ ناول نگار نے ان حقائق کے ساتھ ساتھ ان کرداروں کو بھی زندہ اور جاوید حقیقت کے روپ میں پیش کیا ہے جو بظاہر تخیلاتی ہیں۔ شہباز کا نابینا ہونا، مراد علی کا بطور سفیر نظام کے دربار میں جانا، جین کو کپتان فرانسک کا یہ پیغام کہ فرانس میں انقلاب آ چکا ہے اور اگر وہ چاہیں تو ان کی جائیداد واگزار ہو سکتی ہے اس پر جین اور لیگرانڈ کا انکار وغیرہ ساتھ ہی ان تاریخی حقائق کو قاری کے لیے انتہائی دلچسپی کے ساتھ لے کر چلنا کہ کس طرح ٹیپو سلطان اس سہ فریقی اتحاد سے نبرد آزما ہے جو میسور کی سلطنت کو فتح کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے مگر جنگ کا پہلا حصہ بظاہر سلطان کی کامیابی پر ختم ہوا لیکن یہ سلسلۂ جنگ ابھی جاری تھا انگریز، مرہٹوں اور نظام کو ساتھ ملا کر مختلف محاذوں پر ٹیپو سلطان سے مقابلہ کرتے رہے۔ انہی جنگوں کے درمیان کئی قلعے سلطان کے قبضے سے جاتے رہے اس کے فوجی ہلاک و زخمی ہوتے رہے۔ انہی میں ایک لیگرانڈ تھا جو زخمی ہوا مگر علاج کی غرض سے ایک قلعے تک پہنچ گیا جہاں جین اس کی تیمارداری کرتی رہی۔ اس کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس کے مرنے کے بعد جین واپس سرنگا پٹم چلی گئی۔ یہ ایسے واقعات ہیں جو بظاہر ناول نگار کے قلم سے لکھے گئے ہیں لیکن قاری پڑھتے پڑھتے یہی کچھ سوچتا تھا کہ یوں ہو جائے اور کاش ایسا نہ ہو۔ جین اسلام قبول کر لیتی ہے۔ انگریز، مرہٹے اور نظام کی افواج میسور پر حملہ کر دیتی ہیں انگریزوں کے پاس وسائل کی کمی نہ تھی جبکہ سلطان ٹیپو محض جرأت و شجاعت کے شیدائیوں کے ساتھ میدان میں ڈٹا ہوا تھا انتہائی سخت شرائط کے ساتھ صلح نامہ عمل میں آیا تین کروڑ روپے سے زائد کی رقم اور دو شہزادے بطور زرِ ضمانت دینے پڑے۔ یہ ایسے حقائق ہیں جو تاریخی واقعات کے ساتھ ناول کے پلاٹ کو استحکام بخشنے کا باعث بھی تھے۔ ناول نگار نے دیگر کرداروں کا تذکرہ کرتے ہوئے جین کو فرانس واپسی کی دعوت، اس کا انکار، فرحت کی موت اور پھر انور علی کا منیرہ سے شادی کر لینا جیسے واقعات کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ لڑی کے دانوں کی مانند مربوط ہیں۔ مراد علی بھی اکبر خان کے گھرانے سے ملنے جاتا ہے جہاں ایک حملے کی وجہ سے اس کی غیر متوقع ملاقات ثمینہ سے ہوتی ہے جسکی زبانی اکبر خان اور شہباز کی اموات کا علم ہوتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس عہد کے آتے آتے مرہٹے اپنے اصل دشمن یعنی انگریز کو پہچان گئے تھے مگر نظام علی کبھی میسور سے الجھتا اور کبھی مرہٹوں سے شکست کھاتا اپنی عیاریوں کے ذریعے اپنی ریاست کا حدود اربع بڑھانے میں مصروف تھا۔ رچرڈ ولزلی کی آمد اور اس کی بدنیتی کہ جلد ہی میسور پر قبضہ کر لے نپولین اور زمان شاہ کی مداخلت کے خوف سے باز رکھتی ہے۔ ان تمام حالات کو جس تسلسل، روانی اور دلچسپی سے ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے کامیاب

پلاٹ کی مثال کہی جاسکتی ہے، کیونکہ ان عوامل کو بھی جمع کیا گیا ہے جو غداری کے زمرے میں آتے ہیں۔ ایک طرف سلطان تنہا ہے دوسری طرف مرہٹے غیر جانب دار اور پھر انگریز اور میر نظام علی کی مکمل فوجی تیاری، ساتھ ہی گھر کے بھیدی لنکا ڈھانے چلے اور نتیجہ شہر کی حدود میں انگریزوں کی فوجی موجودگی کے نتیجے میں سامنے آتا ہے۔ پلاٹ کا یہ حصہ کہ جب غداروں کی مدد سے انگریز فوج سرنگا پٹم میں داخل ہوگئی اور سلطان ٹیپو خود جنگ میں کود پڑا تاریخی حقائق اور دلچسپی کی معراج کو پہنچا ہوا نظر آتا ہے گو کہ بعد کے مناظر تاریخی حقائق کے باوجود اس قدر دلچسپ، رقت انگیز اور دلسوز ہیں کہ قاری اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ پاتا مثلاً ٹیپو سلطان کی لاش کی تلاش، تدفین کا منظر اور حریت پسندوں کی کاروائیاں وغیرہ غرضیکہ نسیم حجازی نے تاریخ برصغیر کے اس پہلو کو ناول کے پلاٹ میں اس خوبی سے سمویا ہے کہ نہ تو تاریخ میں تصرف ہوا اور نہ ہی ناول نگاری کے فنی تقاضے متاثر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''پلاٹ کا ارتقاء روشنی اور سائے کی آویزش سے ہی ہوتا ہے اور کرداروں کی پرورش بھی مثبت اور منفی عوامل کی کش مکش سے ہے۔''[1]

اسی طرح ناول کے خوبصورت پلاٹ کی تشکیل کا اعتراف ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''وہ قصے میں ایسے نشیب و فراز پیدا کرتے اور اس طرح اتار چڑھاؤ دکھاتے ہیں کہ تجسس اور دلچسپی میں ہر آن اضافہ ہوتا ہے۔''[2]

ان آراء اور پلاٹ کے مطالعے کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ نسیم حجازی نے تاریخی واقعات مسخ کیے بغیر ناول نگاری کے تمام تر فنی لوازمات کے ساتھ ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' کا پلاٹ مرتب کیا جو ان کی کامیاب ناول نگاری کا شاہکار ہے۔

کردار نگاری

ناول ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' کے کرداروں میں اہم ترین کردار انور علی کا ہے جسے اپنے والد اور دو بھائیوں کی شہادت کے بعد والدہ کا مطیع و فرمان بردار اور اسلام کا سچا سپاہی پیش کیا گیا ہے۔ عشق و محبت اس کے دل میں بھی جاگزیں تھا مگر جین کے معاملے میں ایثار کا ثبوت دیتے ہوئے اسے لیگرانڈ سے ملانا، شادی کرانا اور پھر زخمی لیگرانڈ کو ایسے مقام تک پہنچانا کہ جین اس کی خدمت کر سکے اس کی موت کے بعد جین کا دائرۂ اسلام میں داخل ہونا، انور علی سے اس کا عقد اور پھر تاریخ میسور کی وہ سیاہ ترین رات کہ جب لوٹ مار اور آتش زنی اپنے عروج پر تھی یہ شوہر بیوی ایک دوسرے سے جدا ہونے کو تیار نہ تھے۔ انتہائی عشق کی کیفیات تمام تر مجاہدانہ اوصاف کے ساتھ اس کردار میں موجود ہیں۔ دوسرا اہم کردار جین (منیرہ) کا ہے جو حادثاتی طور پر ہندوستان آئی۔ اپنے دوست کے ساتھ شادی کرنے میں کامیاب رہی مگر فرحت کی محبت اور خلوص نے اس موقع پر کہ جب وہ فرانس جاسکتی تھی اسے یہیں رہنے اور انور علی سے عقدِ ثانی کر لینے کے فیصلہ پر پہنچایا۔ یہ محض شادی نہیں تھی بلکہ اس کردار کی پختگی ہے جو مسلمانوں کے ساتھ رہ کر ان سے متاثر ہونے کے بعد

---

[1] نسیم حجازی کا فن مشمولہ گمشدہ قافلے، ڈاکٹر عبدالمغنی، ص ندارد

[2] اردو میں تاریخی ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۴۷۹۔

تشکیل پاتا ہے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا وہ فیصلہ جو محض زبانی ہوسکتا ہے حقیقت کے روپ میں اس کردار کا آئینہ دار ہے ایک اور کردار مراد علی کا ہے جو ان خاندانوں کی محبت کو اگلی نسل تک لے گیا جو اکبر خان اور معظم علی کے درمیان شروع ہوئی تھی۔ دریائے کاویری سے دریائے کابل تک کا سفر اس کردار کی بلندی اور عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ فرحت کا وہ کردار جو ناول کے پچھلے حصے سے جاری تھا اس ناول میں بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جاگزیں رہتا ہے۔ ڈھونڈیا داغ کا ایک متاثر کن کردار ہے ایک مرہٹہ جو بعد میں اسلام کی روشنی کا اسیر ہو گیا جرأت و شجاعت، بہادری کا انمول کردار ہے۔

تاریخی اعتبار سے اہم ترین کردار ٹیپو سلطان کا ہے۔ اس کی شخصیت سحر انگیز، رعایا سے اس کی چاہت بے مثال، نڈر، بے خوف اور شہادت کے جذبے سے سرشار مگر غداروں کی چالوں کا شکار ہو گیا۔ انتہائی بہادری کا ثبوت دیتے ہوئے جام شہادت نوش کرتا ہے۔ شہادت سے قبل ایک موقع جان بچانے کا میسر آتا ہے تو وہ جملہ جو آج ایک کہاوت بن گیا ہے اس کے لبوں سے ادا ہوتا ہے کہ:

''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

اس کردار کی عظمت کا لوہا ہر ایک نے مانا یہی وجہ ہے کہ نسیم حجازی نے اس کی شہادت اور بعد کے واقعات کو اس خوبی سے رقم کیا کہ کردار نگاری کا حق ادا ہو گیا میر قمر الدین، بدر الزماں، پورنیا اور میر صادق کے کردار بظاہر غداروں کی حیثیت سے متعارف ہوتے ہیں مگر انہیں بھی اس بات کا اندازہ تھا کہ ان کی غلطی ناقابلِ معافی ہے یہ کردار اس اعتبار سے انتہائی جاندار ہیں کہ ان کے بغیر پلاٹ مرتب نہیں کیا جا سکتا تھا اور ان کے کرداروں کو اجاگر کیے بغیر کردار نگاری مکمل نہیں ہو سکتی تھی یوں تو ناول میں اور بہت سے کردار ہیں جن میں میر نظام علی، تنویر، ہاشم بیگ اور مرہٹوں کے مختلف سردار لیکن ان کے مقابلے میں بعض انگریزوں کے کردار اس اعتبار سے کردار نگاری کے زمرے میں اپنی اہمیت منواتے ہیں کہ وہ جس مقصد کے پیشِ نظر میدانِ جنگ میں آئے تھے وہ ان کے نزدیک اہم ترین تھا لارڈ ولزلی اور لارڈ کارنوالس اور ہیرس وغیرہ ان کرداروں نے ٹیپو سلطان کو اپنے راستے کی آخری دیوار سمجھ رکھا تھا۔ جسے ڈھائے بغیر ہندوستان پر قبضہ ناممکن تھا غرضیکہ تمام ہی کردار اپنی صفات کے اعتبار سے اہم اور ضروری ہیں لیکن ناول نگار نے ان سے جس طرح کام لیا ہے وہ کامیاب کردار نگاری کی اعلیٰ مثال ہے جس کا اعتراف ڈاکٹر عبدالمغنی نے یوں کیا ہے:

''یہی وجہ ہے کہ قصے میں وفاداروں کی خدمات کے ساتھ ساتھ غداروں کی دغابازیاں بھی بہت نمایاں ہیں۔''[1]

نسیم حجازی کی کردار نگاری کی عظمت کا اعتراف ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''اور تلوار ٹوٹ گئی'' میں نواب حیدر علی اور سلطان فتح علی خان ٹیپو کے کردار عظمت کے مینار ہیں جبکہ میر صادق، پورنیا اور نواب حیدر آباد دکن کے کردار اس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ ان سے شدید نفرت ہوتی ہے۔''[2]

ان آراء کی روشنی میں یہ کہنا کہ نسیم حجازی نے کردار نگاری کا حق ادا کیا ہے ان کی عظمت اور ذلت کے معیار کو مدنظر رکھ کر کردار کو تشکیل دیا

---

[1] نسیم حجازی کا فن مشمولہ گمشدہ قافلے، ڈاکٹر عبدالمغنی، ص، ندارد

[2] اردو میں تاریخی ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۴۵۷۔

ہے یہی وجہ ہے کہ ٹیپو سلطان کا کردار عظمت کے مینار اور میر صادق کا کردار ذلت کے گڑھے میں گرا ہوا محسوس ہوتا ہے یہ کامیابی اور کامرانی کی اہم دلیل ہے کہ قاری ان کرداروں سے اس قدر مانوس ہو جائے کہ انہیں اپنے رفیق اور رقیب کی طرح محسوس کرے اور اسی طرح محبت اور نفرت اس کے دل میں جاگزیں ہو۔

مکالمے:

ناول کو دلچسپ اور پُر اثر بنانے کے لیے جہاں پلاٹ کا مربوط ہونا اہمیت کا حامل ہے وہیں کرداروں کے ذریعے اثر آفرینی پیدا کی جاتی ہے۔ لیکن جو چیز ماحول اور معاشرت کی عکاسی کرتی ہے وہ مکالمے ہیں جو شخصیت کے خدوخال واضح کرنے کے ساتھ ساتھ قاری کے لیے اس عہد کے معاشرے کو پیش کرنے کا باعث بھی ہوتے ہیں کون سا مکالمہ کس وقت اور کس لمحے ناول میں سمویا جائے ناول نگار کی کاریگری کے لیے اہمیت کا حامل ہے مثلاً ٹیپو سلطان کے منہ سے نکلا ہوا یہ جملہ کہ ''شیر کی ایک روز کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے'' یہ ناول نگار کی فنی کمال ہے کہ اس نے اس جملے کی ادائیگی کے لیے کن موزوں حالات کا انتخاب کیا مثال کے طور پر:

''جب زخموں کے باعث سلطان کی ہمت جواب دینے لگی تو باڈی گارڈ دستے کے افسر نے کہا۔'' عالی جاہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیں۔''

''نہیں'' سلطان نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔'' میرے لیے شیر کی زندگی کا ایک لمحہ گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''[۱]

ایک اور موقع پر مکالمہ نگاری کی بہترین مثال کہ جب میسور کے حالات انتہائی خراب تھے انور علی، جین کو فرانس جانے کا مشورہ دیتا ہے تو اس موقع پر جو مکالمہ منیرہ نے ادا کیا وہ تاریخی حقیقت اور انسانی محبت کے پیش نظر ادا ہونے والا مکالمہ کہا جا سکتا ہے جو یہ تھا:

''انور! اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کرب انگیز لہجے میں کہا۔'' میرا وطن فرانس نہیں سرنگاپٹم ہے اور مجھے اپنے حال یا مستقبل سے شکایت نہیں۔ مسرت کے وہ ایام جو مجھے آپ کی رفاقت میں نصیب ہوئے ہیں میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ آپ کے ساتھ مستقبل کی تاریک ترین منازل کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے میرے پاؤں نہیں ڈگمگائیں گے اگر میسور کی زمین ہمارے لیے تنگ ہوگئی تو ہم کہیں دُور چلے جائیں گے۔ وہاں بھی مجھے اس سرنگاپٹم کی یاد ہمیشہ مسرور رکھے گی جس کا پہلا منظر میں نے آپ کے ساتھ کاویری کے کنارے ایک ٹیلے کی چوٹی سے دیکھا تھا۔ خوشی کے وہ لمحات جو میں نے آپ کے ساتھ اس گھر کی چار دیواری میں گزارے ہیں میری باقی زندگی کے مہینوں اور برسوں پر حاوی رہیں گے۔''[۲]

اسی لیے ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ رقمطراز ہیں:

---

[۱] اور تلوار ٹوٹ گئی، نسیم حجازی، ص ۴۹۷۔

[۲] ایضاً، ص ۵۰۵۔

''ان کے مکالموں سے ان کے کرداروں کی انفرادیت ابھر کر سامنے آتی ہے یہ مکالمے کرداروں کی شخصیت سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مکالموں کے ذریعے کرداروں کی نفسیاتی اور داخلی کشمکش کی کیفیت کو بڑی فنی مہارت سے ابھارا ہے۔ مکالموں سے ان کے کرداروں کی شخصیت کی تصوراتی تشکیل و تعمیر میں بڑی مدد ملی ہے۔''[1]

اس رائے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مندرجہ بالا دونوں مکالمے اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ یوں تو ان کے ناول سے بہت سے مکالمے تلاش کیے جا سکتے ہیں لیکن محض منتخب مکالمے پیش کرنے کا مقصد ناول نگاری کی اپنے فن پر عبوریت کو واضح کرتا ہے کیونکہ وہ تاریخی اور تخیلاتی کردار ہر دو مقام پر دھڑکتے دلوں اور رواں زندگی کی عکاسی پیش کرتا ہے۔ اضطراب، بے چینی، کشمکش ہر موقع پر لفظوں کا خوبصورت استعمال مکالموں کی صورت میں کرداروں کی زبان سے ادا کرانا کامیابی کی دلیل ہے اور اس فن کو نسیم حجازی نے کامیابی کے ساتھ برتا ہے کیونکہ یہی وہ احساسات ہیں جو ناول نگار، قارئین کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے اور وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہیں اگر مکالموں کو ناول کی کہانی کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو اس ناول کی کہانی ہندوستان کی وہ المیہ داستان ہے جہاں محب وطن اور غداروں کے درمیان ایک کشمکش جاری ہے اور اس تمام کیفیت کو اجاگر کرنے کے لیے ناول نگار کرداروں کی زبان سے وہ مکالمے ادا کراتا ہے، جو ایک حقیقت ہیں۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریز اور غداروں کے درمیان ہونے والی گفتگو کے مکالمے دیکھیے:

''ایک افسر نے پوچھا۔ ''یہ سلطان ٹیپو ہے۔'' میر قمر الدین نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''جی ہاں۔ آپ کو فتح مبارک ہو۔''

انگریز سپاہی چلایا۔ ''یہ زندہ ہے!'' اور چند آدمیوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں۔ انگریز افسر جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور سلطان کی نبض ٹٹولنے کے بعد اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ مر چکا ہے۔''

بدر الزماں نے سلطان کی دستار کو اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے قاتل آپ نہیں ہم ہیں۔ ہم نے اسے قتل کیا ہے اور ہماری آئندہ نسلیں اس کی قبر پر پھول چڑھایا کریں گی۔''[2]

منظر نگاری:

ناول نگار کا قلم کسی آنکھ کے آنسو یا لبوں کی مسکراہٹ کو اس خوبی سے رقم کرے کہ پڑھنے والا اس کیفیت میں کھو جائے کیونکہ ناول نگار کے پاس قلم اور کاغذ ہے اور قاری کے پاس وہ الفاظ جو اس کے سامنے لکھے ہوئے ہیں۔ مناظر دکھانے کے لیے تصویریں یا نقشے نہیں محض الفاظ ہیں۔ انہی کے لکھنے کا انداز پڑھنے والے پر اس کیفیت کو محسوس کرنے میں معاون ہوتا ہے کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جائے۔ حقیقت سے قربت، موسمی کیفیات، جغرافیائی حالات، انہی سب کے ملاپ سے لفظوں کے ذریعے بننے والی تصویر ایسی منظر کشی پیش کرتی ہے کہ قاری خود کو اس کا حصہ اور عبارت کو اسٹیج پر چلتے پھرتے کرداروں کے مانند محسوس کرتا ہے ناول ''اور تلوار

---

[1] اردو میں تاریخ ناول نگاری؛ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۲۵۶۔

[2] اور تلوار ٹوٹ گئی، نسیم حجازی، ص ۵۱۴، ۵۱۵۔

ٹوٹ گئی' میں بار ہا ایسے مناظر پیش کیے گئے ہیں جو منظر نگاری کی بہترین مثال کہے جا سکتے ہیں مثلاً ٹیپو سلطان کی تدفین کے وقت موسم کی کیفیت سے جو منظر کشی پیدا کی گئی ہے وہ حقیقت کے قریب تر ہونے کے ساتھ ساتھ قاری کو لفظوں کے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے۔ مئی کی شدید گرمی، حبس اور بادلوں کا گھر آنا، بجلیوں کا چمکنا، بادلوں کا گرجنا یہ وہ عناصر ہیں جن کا سہارا لے کر ناول نگار نے اس منظر کو ترتیب دیا۔ ذرا پڑھیے:

''جنازہ اٹھا تو ہوا بند تھی اور گرمی کی شدت اور حبس کے باعث دم گھٹا جا رہا تھا۔ لوگ اُفق پر ایک خوفناک آندھی کے آثار دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر میں یہ تاریک آندھی سارے آسمان پر چھا گئی۔ جنازہ لال باغ میں پہنچا۔ شہر کے قاضی نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جب میت کو لحد میں اتارا جا رہا تھا تو فضا میں چاروں طرف بجلیوں کی مہیب کڑک سنائی دینے لگی۔ لوگوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ گورا فوج کو سلامی کا حکم دیا گیا لیکن ان کی بندوقوں کی آواز بادلوں کی خوفناک گرج میں دب کر رہ گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان پر جاہ و جلال کے اس پیکرِ مجسم کی روح کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

فضا کی تاریکی بڑھتی گئی اور بجلیوں کی چمک میں اضافہ ہوتا گیا۔ سرنگا پٹم کے در و دیوار ہل رہے تھے۔ وہ غدار جو انگریزی سنگینوں کے پہرے میں جنازے کے ساتھ آئے تھے سہمے جا رہے تھے، سلطان کی تدفین سے فارغ ہونے کی دیر تھی کہ آسمان پھٹ پڑا اور آن کی آن میں سرنگا پٹم کی گلیاں اور بازار ندیاں اور نالے نظر آنے لگے۔

کچھ دیر بعد میسور کی فوج کے چند افسر اور سپاہی دریائے کاویری کی طغیانی کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ایک بوڑھا افسر دھاڑیں مار مار کر کہہ رہا تھا۔ ''میں نے اپنی ساری عمر مئی کے پہلے ہفتے میں دریائے کاویری میں ایسا سیلاب نہیں دیکھا۔ میسور کے غدارو! کاش تم ایک دن اور صبر کر لیتے۔''[1]

ایک اور منظر ملاحظہ کیجیے کہ جب میسور لٹ رہا تھا۔ انور علی اپنی شریکِ حیات کے ساتھ اپنے گھر میں محصور ہو چکا تھا انگریز فوج نے گھر میں گھسنے کی کوشش کی ناول نگار نے اس منظر کو اس طرح لکھا ہے:

''وہ (انور علی) بیک وقت دونوں آدمیوں کو اپنے طمنچوں کا نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے صحن کی بائیں طرف کے درختوں میں کوئی آہٹ محسوس ہوئی اور وہ دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ درخت کی ایک شاخ جس کا کچھ حصہ وہ دریچے سے دیکھ سکتا تھا ہل رہی تھی۔ اس نے گردن ذرا آگے کی تو اسے پتوں کی آڑ میں ایک شاخ پر کوئی آدمی دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں بندوق کا دھماکہ سنائی دیا۔ گولی اس کے کندھے پر لگی۔ وہ اپنے زخم پر ہاتھ رکھ کر لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف ہٹا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ منیرہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ اسے سہارا دینے کے لیے اُٹھ کر آگے بڑی۔ وہ چلایا۔ ''منیرہ لیٹ جاؤ۔ منیرہ۔'' بندوق کا ایک اور دھماکہ سنائی دیا اور منیرہ اس کے قدموں پر گر پڑی۔ انور علی کے ہاتھوں سے طمنچے گر پڑے اور وہ ''منیرہ!

---

[1] اور تلوار ٹوٹ گئی، نسیم حجازی، ص ۵۲۶،۵۲۵۔

منیرہ!!'' کہتا ہوا اس کا سر گود میں لے کر بیٹھ گیا۔لیکن منیرہ کے پاس اس کی التجاؤں کا کوئی جواب نہ تھا۔اس کی پیشانی سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنی امیدوں، آرزوؤں، آنسوؤں اور مسکراہٹوں کی دنیا کو الوادع کہہ رہا تھا۔''[1]

یہ ایسے مناظر ہیں کہ جن کا احساس بہ آسانی کیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے مناظر انتہائی متاثر کن اور دلنشیں ہوتے ہیں انسانی ذہن اس کیفیت کو بہ آسانی قبول کر لیتا ہے اور تصوراتی طور پر قاری ان میں کھو جاتا ہے۔اس لیے علی عباس حسینی منظر نگاری کے لیے یہ انداز اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں:

''کوئی قابلِ قدر ناول منظر نگاری، سماں بندی اور مرقع کشی سے خالی نہیں ہو سکتا اور اطناب و ایجاز کا خیال رکھ کر انہیں ''پس منظر'' میں پیش کرنا فن کارانہ ہوشیاری و ہنرمندی کی دلیل ہے۔''[2]

ان اصولوں کو اپنا کر منظر نگاری کی انتہا تک پہنچا جا سکتا ہے نسیم حجازی نے ناول نگاری کے تمام ترفنی تقاضوں سے انصاف کیا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ کامیاب ناول نگار بن گئے۔

---

[1] اور تلوار ٹوٹ گئی، نسیم حجازی، ص ۵۳۱۔

[2] اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی عباس حسینی، ص ۶۶۔

چھٹا باب
تاریخی ناول نگاری میں نسیم حجازی کا مقام

پیش رووں سے استفادہ

نسیم حجازی نے تاریخی ناول نگاری کا آغاز حادثاتی طور پر نہیں کیا تھا۔ وہ تحریک آزادی کے ایک سپاہی کی حیثیت سے صحافت کے میدان میں اپنے جوہر دکھا چکے تھے۔ دورانِ طالب علمی ''شودر'' نامی ایک افسانہ قلم بند کر چکے تھے۔ چاہتے تھے کہ ایک ایسا افسانہ لکھیں جو اسلامی تاریخ کے کسی گوشے سے متعلق ہو اس لیے تاریخ اسلام کا مطالعہ شروع کیا۔ افسانہ تو نہ لکھ سکے، ناول کا خاکہ تیار ہو گیا اور یوں ان کا پہلا ناول داستانِ مجاہد وجود میں آیا۔ ان کے بہت سے پڑھنے والوں نے قلم کی اس روانی کو آگے بڑھانے کے لیے خطوط لکھے خود ان کے دوست احباب نے بھی انہیں مزید ناول لکھنے کا مشورہ دیا۔ یوں تاریخی ناول نگاری میں ان کی حیثیت مسلّم ہو گئی محض قارئین کی پسندیدگی یا دوست احباب کی حوصلہ افزائی انہیں ناول نگار نہیں بنا گئی بلکہ اس امر کو سمجھنے کے لیے تاریخ کے صفحات کی ورق گردانی کرنی ہو گی۔ تو پتہ چلے گا کہ تاریخ کے کیا عوامل تھے اور کن حضرات کا اثر تھا کہ نسیم حجازی تاریخی ناول نگاری کی طرف راغب ہوئے۔

۱۸۵۷ء میں نام نہاد مغلیہ حکومت کا خاتمہ ہوا اور انگریزوں کی با قاعدہ حکمرانی کا آغاز بھی یہ محض حادثاتی واقعات نہ تھے بلکہ ایک ہزار سالہ مسلمانوں کے اقتدار کا سورج ڈوب گیا تھا۔ آنے والی دو دہائیوں نے مسلمان اکابرین پر انگریز اور ہندوؤں کی اس سازش سے منکشف کر دیا نہ صرف ان کا اقتدار ختم کیا گیا ہے بلکہ تہذیب و تمدن اور زبان و ادب کے وہ اثرات جو یہاں کا ثقافتی ورثہ بن چکے تھے مٹائے جانے لگے۔ اُردو زبان کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی کوشش ہونے لگی جنگ آزادی کے قصوروار کی حیثیت سے مسلمانوں کو دار پر چڑھایا گیا۔ اس کے علاوہ سکھ بھی جو مسلمانوں سے بیزار تھے اس لیے انگریزوں سے تعاون کرنے لگے اور ہندوؤں نے ہوا کا رخ بدلنے پر انگریزوں کو اپنی وفاداری سے متاثر کرنا زیادہ مناسب سمجھا ان میں سے بیشتر نے مسلمانوں سے غداری کر کے ان کے خلاف مخبری کی چونکہ اس قسم کے عمل سے انعامات ملتے تھے جو مسلمانوں کی ضبط شدہ جائیداد سے ادا کیے جاتے، اس لیے اکثر بے اصول ہندوؤں نے اپنے مسلمان ہمسایوں کے خلاف جھوٹے الزامات لگائے۔ یہ عمل انتہائی تکلیف دہ تھا کہ ہندو اور انگریز اس نقطے پر متحد ہو گئے تھے کہ مسلمان ان کے دشمن ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کو دو محاذوں پر پسپائی اختیار کرنی پڑی جس کے نتیجے میں ایک طرف سیاسی حیثیت ختم ہوئی تو دوسری طرف معاشی ابتری پروان چڑھنے لگی۔ ان حالات میں دو نظریات ابھر کر سامنے آئے پہلے نظریے کے حامل افراد کا خیال تھا کہ جنگ آزادی کے بعد معاشی بدحالی اور سیاسی حیثیت ختم ہونے کی وجہ تعلیم اور بالخصوص انگریزی علوم سے ناواقفیت ہے اس لیے اگر انگریزی تعلیم حاصل کی جائے گی تو سرکاری محکموں میں ملازمتوں کے لیے راہ ہموار ہو گی ساتھ ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سیاسی شعور کی بدولت ایوان اقتدار تک اپنے مسائل پہنچانے کے قابل ہو سکے گا جبکہ دوسرے نظریے کے ماننے والے انگریزوں سے عدم تعاون کا رویہ اختیار کرتے رہے۔ ان کی اعلانیہ ہر ممکن کوشش یہ رہی کہ مسلمانوں میں احیائے اسلام کا جذبہ برقرار

رہے وہ انگریزوں کے سامنے وقتی طور پر ہی سہی سپر ڈالنے کے بجائے اپنے قومی وجود کو برقرار رکھنے کے لیے مسلمانوں میں ہر قسم کے ایثار کا جذبہ پیدا کرتے رہے اور ان میں اپنی تہذیب اور اپنے نظریۂ حیات سے وابستگی پیدا کرنے کے لیے انہوں نے وسیع اور ملک گیر تحریک شروع کی۔ پہلے نظریے کے حامی جدید انگریزی علوم سے واقفیت کے اصول پر کاربند رہے جس کے نتیجے میں سرکاری ملازمتوں اور مقامی انتخابات میں مسلمانوں کی نمائندگی نظر آنے لگی۔ اس گروہ کے روحِ رواں سرسید احمد خان جو اپنی روش پر چلتے رہے طعنۂ دشنہ کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ اپنی اصلاحی تحریک کو عوام الناس تک پہنچانے کے لیے ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراء کیا ساتھ ہی ان تجربات اور مشاہدات سے اپنی قوم کو روشناس کروایا جو مغرب کی ترقی کا باعث تھی اپنے اوپر ہونے والی تنقید اور نکتہ چینی کو نظر انداز کر کے اپنے کام میں لگے رہے انکے ہم راہیوں میں مولانا الطاف حسین حالی اور مولوی نذیر احمد اس حوالے سے منفرد ہیں کہ ایک طرف وہ جدید انگریزی علوم کے حامی تھے تو دوسری طرف مغربی علوم کے ساتھ آنے والی تہذیب وثقافت سے خوفزدہ بھی تھے مولوی نذیر احمد جہاں علی گڑھ کالج کے اغراض و مقاصد کا پرچار کرتے ہوئے چندوں کی اپیل کرتے وہیں اپنے ناولوں ''مراۃ العروس''، ''توبۃ النصوح''، ''بنات النعش'' اور ''فسانۂ مبتلا'' کے ذریعہ اپنے تہذیب واقدار کو بچانے میں ہمہ تن مصروف نظر آتے ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی سرسید احمد خان کی علمی وادبی تحریک سے تمام تر شغف رکھنے کے باوجود ''مسدس مدوجزر اسلام'' کے ذریعے اپنے افکار وخیالات پیش کرتے ہیں۔ مسدس کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان پیش کر کے تابناک ماضی کی یاد تازہ کی ہے نیز ان غلطیوں اور عاقبت نااندیشانہ حرکات کا تذکرہ بھی کیا ہے جو عروج کو زوال میں بدلنے کا باعث ہوئے۔ ایک اور شخصیت جس نے سرسید احمد خان کے ذاتی کتب خانے اور علی گڑھ کی درس گاہ کی بدولت اپنے علمی ذوق میں خوب خوب اضافہ کیا علامہ شبلی نعمانی کی ہے۔ مگر شبلی نے بہت جلد افکار وتصورات سے انحراف کی پالیسی اختیار کی ان کا خیال تھا کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے اس پر عمل پیرا ہو کر مسلمانوں نے فتوحات کی عظیم داستانیں رقم کیں اور اپنی راہوں پر گامزن رہ کر مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو واپس لایا جا سکتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ ایک طرف ماضی کی غلطیوں کی نشاندہی کرتا ہے تو دوسری طرف مستقبل کے امکانات کی رہنمائی۔ اسی تصور کو سامنے رکھ کر شبلی نے نثر ونظم ہر دو میدان میں طبع آزمائی کرتے ہوئے تاریخ کے سبق آموز اور رہنما اصولوں کو پیش کیا اس کا مطمع نظر خود انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

''کیونکہ فخر وترجیح کے موقعوں پر لوگ اپنے اسلاف کے کارنامے خواہ مخواہ بیان کرتے تھے۔ تفریح اور گرمی صحبت کے لیے مجالس میں پچھلی لڑائیوں اور معرکوں کا ذکر ضرور کیا جاتا تھا۔ باپ دادا کی تقلید کے لیے پرانی عادات ورسوم کی یادگاریں خواہ مخواہ قائم رکھی جاتی تھیں اور یہ چیزیں تاریخ وتذکرہ کا سرمایہ ہیں۔ اس بنا پر عرب، عجم، تاتار، ہندی، افغانی، مصری، یونانی غرض دنیا کی تمام قومیں فن تاریخ کی قابلیت میں ہمسری کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔''[1]

---

[1] الفاروق، شبلی نعمانی، ص ۳۲۔

شبلی نے جن اہم شخصیات کو موضوع بحث بنایا وہ تاریخ عالم میں منفرد و ممتاز ہیں۔ خلافت راشدہ میں حضرت عمر فاروقؓ کا دور فتوحات کے اعتبار سے منفرد نوعیت کا ہے۔ اس دور میں تیز رفتار فتوحات بیان کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی رقمطراز ہیں۔ ''مسلمانوں میں اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ کی بدولت جو جوش، عزم، استقلال، بلند حوصلگی اور دلیری پیدا ہوگئی تھی۔ جس کو حضرت عمرؓ نے اور زیادہ قوی اور تیز کر دیا تھا۔ روم اور فارس کی سلطنتیں عین عروج کے زمانے میں بھی اس کی ٹکر نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ البتہ اس کے ساتھ اور چیزیں بھی مل گئی تھیں جنھوں نے فتوحات میں نہیں بلکہ قیام حکومت میں مدد دی۔ اس میں سب سے مقدم چیز مسلمانوں کی راست بازی اور دیانتداری تھی۔ جو ملک فتح ہوجاتا تھا وہاں کے لوگ مسلمانوں کی راست بازی کے اس قدر گرویدہ ہو جاتے تھے کہ باوجود اختلاف مذہب کے ان کی سلطنت کا زوال نہیں چاہتے تھے۔ یرموک کے معرکہ میں مسلمان جب شام کے اضلاع سے نکلے تو تمام عیسائی رعایا نے پکارا کہ ''خدا تم کو پھر اس ملک میں لائے۔'' اور یہودیوں نے توریت ہاتھ میں لے کر کہا کہ ''ہمارے جیتے جی قیصر اب یہاں نہیں آ سکتا۔''

رومیوں کی حکومت جو شام و مصر میں تھی وہ بالکل جابرانہ تھی۔ اس لیے رومیوں نے جو مقابلہ کیا وہ سلطنت اور فوج کے زور سے کیا۔ رعایا ان کے ساتھ نہ تھی۔ مسلمانوں نے جب سلطنت کا زور توڑا تو آگے مطلع صاف تھا۔ یعنی رعایا کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت نہ ہوئی۔''[۱]

اس اقتباس کو پیش کرنے کا مقصد ان انسانی اوصاف کا بیان ہے جو معاشرے پر اثرات رکھتے ہیں۔ اثرات کی نوعیت ابتدائی اور بنیادی بھی ہوتی ہے اور دور رس بھی، البتہ اس کے نتائج فوری طور پر سامنے آتے ہیں لیکن اگر انہی اصولوں پر بنا ہوا معاشرہ شکست و ریخت سے دوچار ہو تو ماضی کے دھندلکوں میں ان روشنیوں کو تلاش کیا جاتا ہے جو رہنمائی اور کاروانوں کو منزل مقصود تک پہنچانے کا باعث رہی ہوں۔ شبلی نے ''المامون'' کے ذریعے بھی تابندہ ماضی کو اس کی تمام تر جلوہ انگیزیوں اور رعنائیوں کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے ''سیرت النعمان'' کے ذریعے امام ابوحنیفہ کی ہمہ جہت شخصیت، بلند خیالی اور فقہی معاملات میں ان کے عبور کو پیش کر کے ماضی کے ان روشن بنیادوں کو بطور مثال پیش کیا ہے یہ ایک انداز تھا جو شبلی نے اختیار کیا اسے، اس عہد میں پذیرائی مل رہی تھی مگر زیادہ دلچسپ طریق پر لوگوں کے شعور کو بیدار کرنے کی ضرورت تھی جس کی خاطر عبدالحلیم شررؔ نے قلم اٹھایا انہوں نے تاریخ کے بے شمار موضوعات کو ناول کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا دلچسپی اور کلائمکس کی ضرورت کے پیش نظر تخیل کا سہارا لے کر بعض تاریخی حقائق میں تصرف سے بھی کام لیا ہے۔ کسی مسلمان لڑکی کا عیسائی شہزادے پر فریفتہ ہو جانا تو کہیں کسی مسلمان شہزادے کا عیسائی لڑکی سے عشق میں مبتلا ہو جانا۔ انجام کار جنگوں کا خاتمہ دشمنیوں کی جگہ رشتہ داریوں کا قیام وغیرہ اس بات کی مزید وضاحت علی عباس حسینی کے اس تبصرے سے ہو جاتی ہے:

''آپ (عبدالحلیم شرر) نے مسلمانوں کو ان کے قدیم کارنامے یاد دلا کر موجودہ تنزل کے اسباب پر غور کرنے کی طرف مائل کرنا چاہا۔ اس لیے آپ نے کبھی صلیبی جنگوں کے معرکے ''ملک العزیز ورجینا'' اور ''شوقین ملکہ'' میں یاد دلائے۔ کبھی رومیوں پر ترکوں

---

[۱] الفاروق، شبلی نعمانی، ص ۱۷۳۔

کی فتح ''حسن انجلینا'' میں دہرائی۔ کبھی ''منصور موہنا'' میں سندھ کے انصاری خاندان کے حالات قلم بند کیے اور کبھی ''فردوس بریں'' میں فرقہ باطنیہ کی ملکی و مذہبی جنگ کے خاکے پیش کیے اور جیتے جی جنت کی سیر کرائی۔ ''عزیز مصر'' میں عہد بنی طولون کے واقعات ''فلورا فلورنڈا'' میں، ہسپانیہ کے عہد خلافت کے حالات ''فتح اندلس'' میں اسپین پر عربوں کی چڑھائی ''فلپاز'' میں ارض طرابلس پر صحابہ کا حملہ ''بابک خرمی'' میں سلطنت عباسیہ کے زمانے کی سازشیں، ''ماہ ملک'' میں غوریوں کے عروج کا واقعہ ''زوالِ بغداد'' میں مسلمانوں کی فرقہ وارانہ جنگ، ''ایام عرب'' میں دورِ جاہلیت کے عربوں کی معاشرت اور ''الفانسو'' میں سسلی یا قصلیہ کے واقعات کا بیان مولانا کے چند مشہور کارنامے ہیں۔''[۱]

یہ سب کچھ تو ان کے ناولوں کے مطالعہ سے سامنے آتا ہے۔ وہ کیا محرکات تھے جن کی بدولت شرر تاریخی ناول نگاری کی طرف راغب ہوئے یقیناً وہ حالات رہے ہوں گے۔ جن میں ان کی تربیت ہوئی وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے جہاں انگریزی کی حکمرانی موجود تھی پھر اپنے والد کی محبت میں کم عمری ہی میں مٹیا برج میں رہے واجد علی شاہ کو دیکھا تمام حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد جب لکھنؤ واپس آئے تو تاریخ کے مطالعہ کا شغف بڑھتا گیا اس دوران اسکاٹ کے ناولوں کا مطالعہ بھی کیا ہوگا اپنے لیے مستقبل کی راہوں کا تعین کرتے ہوئے قوم کی بدحالی اور اسے بہتر بنانے کے لیے اپنا کردار متعین کیا ہوگا اگر اس تمام کیفیت کو ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی نظر سے دیکھیں تو یہ وجوہات درست معلوم ہوتی ہیں:

''شرر نے جو زمانہ دیکھا وہ درحقیقت مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور علمی زوال کا زمانہ تھا اور قوم کے تمام اہلِ فکر و نظر مختلف طریقوں سے قوم کو اس کی گرتی ہوئی حالت کا احساس دلا رہے تھے۔ سرسید تحریک کے زیر اثر کہیں شبلی تاریخ کے آئینے میں قوم کو اس کی مٹی ہوئی عظمت کی جھلک دکھا رہے تھے کہیں حالی اس کی حالت زار پر نوحہ کناں تھے اور کہیں ڈپٹی نذیر احمد سماجی اور تہذیبی اصلاح کے لیے کوشاں۔ ان تمام تحریکات کے نتیجے کے طور پر خواب غفلت میں مدہوش قوم کچھ کچھ بیدار ہو چلی تھی لیکن غنودگی کی کیفیت ابھی باقی تھی جسے مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے ابھی رجز خوانی کی ضرورت تھی۔ ایسی رجز خوانی جس سے قوم کے دل میں پھر سے اپنے ماضی، اپنے اسلاف، اپنی تہذیب، اپنی روایات واقدار اور عظمتِ عہد رفتہ سے ایک اُنس پیدا ہو جائے، جس کے دوبارہ حصول کے لیے وہ نئے جوش، ولولے اور عزم لے کر اٹھے۔''[۲]

یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری ایک دوسرے مقام پر شرر کے نظریۂ فن کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ہمارے ہم وطنوں اور ہم قوموں کو اپنی زندگی کے اس حصے کے واقعات میں مزہ آ سکتا ہے جو کامیابی و عروج کا زمانہ تھی اور نصیحت و عبرت کے لیے ہم بھی انہیں ان کے اوج و عروج کے کارنامے دکھائیں تو شاید وہ زیادہ متنبہ ہوں۔''

''ہندوستان کے لیے اہل یورپ کے مذاق کے ناول نہیں چاہئیں بلکہ ''رومانس'' چاہیے جن میں انہیں انہی کے اگلے ہم وطن

---

[۱] اُردو ناول کی تاریخ اور تنقید: علی عباس حسینی، ص ۲۳۱، ۲۳۲۔

[۲] شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ: ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ص ۲۳، ۲۳۔

یا ہم مذہب کی اعلیٰ کارگزاریاں دکھائی گئی ہوں اور جن کے ذریعے انہیں اگلا علم وفضل اور اوج وعروج یاد دلایا گیا ہو۔''

''ناول میں جو واقعات بیان کیے جائیں گے، مجموعی طور پر سچے اور مطابق واقعہ ہوں گے ہاں ناول کی ضرورت سے تفصیلی صحبتوں اور صحبت کی باتوں میں تصرف اور اضافہ کرنے سے مجبوری ہے کیونکہ بغیر اس کے نہ ناول، ناول ہو سکتا ہے اور نہ قصے میں مزہ آ سکتا ہے۔''[1]

اگر شرر کو بحیثیت اردو کا پہلا تاریخی ناول نگار پرکھا جائے تو وہ ناول نگاری کے ابتدائی فن کو کچھ آگے نہ بڑھا سکے بعض ضرورتوں اور مصلحتوں کے تحت تاریخی موضوعات میں تصرف کرنے کے باوجود وہ اپنے قارئین کو محظوظ کرنے میں تو یقیناً کامیاب رہے ہیں لیکن ادبی اعتبار سے وہ سرشار کے فن کو بھی آگے بڑھانے میں ناکام رہے۔ یہ کوئی خاص بات نہیں کیونکہ انگلستان میں بھی جب اسکاٹ نے تاریخی ناول نگاری شروع کی تو وہ بھی فن ناول نگاری کو رچرڈسن، فیلڈنگ، اسمولٹ اور اسٹرن کے فن سے آگے نہ بڑھا سکے تھے بلکہ سابقہ روایات کو بھی برقرار نہ رکھ سکے۔ اسکاٹ سے پہلے انگریزی ناول کو سنجیدگی سے لیا جا رہا تھا۔ فیلڈنگ کی تنقید حیات ذہانت اور قابل اعتماد طور پر سامنے آ رہی تھی جبکہ اسکاٹ نے اس کے مقابلے میں اپنے زمانے کے گھسے پٹے اخلاقی نظریات کو پیش کیا۔ یہی کچھ اردو ناول کے ساتھ پیش آیا۔ سرشار نے فسانۂ آزاد میں کردار نگاری، لکھنوی معاشرت کے حقیقی پس منظر کی تصویر کشی اور مکالمہ نگاری کے مرحلے ایک ہی جست میں طے کر لیے تھے اگر ان کے یہاں بے جا طوالت اور داستانوی رنگ نہ ہوتا تو ان کا ناول فسانۂ آزاد کا شمار بہترین ناولوں میں ہوتا۔ اس کے باوجود شرر نے ناول نگاری کو دلچسپ اور پلاٹ دینے کی کوشش تو کی مگر کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کو فروغ نہ دے سکے اس کی وجہ ان کی افتادِ طبع ہے جس پر ان کی عالمانہ ذہنیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا مگر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اُردو کی تاریخی ناول نگاری کے امکانات شرر کی بنیادی خدمات کی بدولت پیدا ہوئے۔

محمد علی طبیب، عبدالحلیم شرر کے ہم عصر تاریخی ناول نگار ہیں انہیں اپنے عہد میں شرر کے مدمقابل ہونے کی حیثیت سے اس حلقۂ اثر میں ضرور پذیرائی ہوئی جو شرر کا رقیب تھا لوگ ان کے ناولوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اپنی بحث میں شرر سے بہتر ناول نگار تسلیم کروانے میں کوشاں رہتے۔ آج شرر کا نام تو موجود ہے لیکن محمد علی طبیب کے نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں اس کی وجہ ان کے ناولوں کے فنی نقائص تھے وہ اپنے کرداروں کو نام کے اعتبار سے تو تاریخی پیش کرتے تھے لیکن جغرافیائی محل وقوع، عادات واطوار اور دیگر خارجی عوامل کا خیال نہ رکھ پاتے تھے اس کی ایک وجہ شرر سے مسابقت میں خود کو ناول نگار منوانا تو ہو سکتی ہے وہ نقطۂ نظر اور مقصد نہیں جو شرر کے پیش نظر تھا یعنی قوموں کو دورِ زوال میں عروج کی داستانیں سنا کر خون گرمانا، جذباتی طور پر ابھارنا اور ملک وقوم کی بقا و سلامتی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے پر تیار کرنا۔ اس کے علاوہ طبیب کے ابتدائی ناول اٹلی کی معاشرت کے عکاس ہیں جس کی وجہ سے کرداروں کے نام قارئین کے لیے مشکل کا باعث رہے ہوں گے پھر بھی زبان وبیان اور انداز نشست وبرخاست لکھنوی مزاج کے

---

[1] شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ؛ ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ص ۱۲۵۔

عین مطابق ہے کم از کم یہ بات شرر اور طبیب میں مشترک ہے کہ دونوں نے رسالہ جاری کیا اور اپنے ابتدائی ناول بالا قساط ان میں شائع کیے اس طرح تاریخی ناول نگاروں کے قاری ایک ماہ میں مختلف ناولوں کا مطالعہ کر لیتے تھے۔

ایک اور نام علامہ راشد الخیری کا ہے جن کی شہرت مصورِ غم کی حیثیت سے مسلم ہے۔ اس کی ایک وجہ تو خواتین کے موضوعات اور ان میں رقت انگیزی پیدا کر کے پرسوز بنا دینے کی ہے تو دوسری وجہ مولوی نذیر احمد سے قرابت داری اور ان کے ناول ''مراۃ العروس'' سے رغبت کی ہے اس کے باوجود اُردو کی تاریخی ناول نگاری میں ان کا بھی مقام رہا ہے۔ ''شاہین و دراج'' میں زیب داستاں کے لیے بہت کچھ ہے مگر تاریخیت کے اعتبار سے یہ ناول ساقط الاعتبار ہے البتہ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ نذیر احمد کے اسلوب کی بازآفرینی ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کہ کچھ نہ کچھ تاریخی ضرور ہے جسے سلیقے سے پیش کرنے کی ان کی کوشش نذیر احمد کی نثر کو زندہ و جاوید کرتی ہے ذرا اس کی زبان و بیان ملاحظہ فرمائیں:

''ملکہ شاہین کی سواری جشن نوروز منانے کے لیے بڑے تزک و احتشام سے چلی ہر طرف فوجیں، مسلح سپاہی، گاجے باجے، خوشیاں۔ کسی باغی نے ملکہ پر گولی چلا دی۔ ایک دہقان سامنے آ گیا۔ ملکہ کو آڑ میں لے لیا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ باغی پکڑا گیا۔ لیکن ملکہ پر دہقانی نے وار کر لیا۔ اس کے دل کی حالت یہ تھی:۔

''بجائے اس کے کہ وہ نہال ہوتی بالکل افسردہ تھی۔ چپ چاپ چلی اور گم صم آئی۔ اتری تو مغموم، کھڑی ہوئی تو افسردہ، بیٹھی تو محزون اور لیٹی تو مردہ۔ ادھر دہقان دراج کا یہ حال کہ گھر میں ہے۔ چبوترے پر ٹہل رہا ہے۔ گود میں لڑکی، خیال میں شاہین، لب پر دعا، دل میں آمین۔''[۱]

یہاں انشا نگاری کا اعجاز قابل تعریف ہے انہوں نے جس طرح جذبات نگاری کی ہے اور اس کے لیے لفظوں کا جامہ پہنایا ہے ان کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ان کا ایک اور ناول جو اپنے موضوع کے اعتبار سے انتہائی تاثراتی اور منفرد ہے اندلس کی شہزادی ہے اس میں اندلس کے آخری چشم و چراغ ابو عبداللہ کے دور کا نقشہ، تمام تر درباری سازشوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے البتہ عشق کی جو کیفیت پیش کی ہے وہ محض عشق تو کہی جا سکتی ہے مگر کہانی میں اس کی شمولیت کچھ زیادہ متاثر کن نہیں۔ اس ناول کو لکھنے کا مقصد اندلس میں مسلمانوں کے دورِ زوال کی منظر کشی اور اس کہانی سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سبق آموزیت مقدم رہی ہو قرین قیاس ہے علامہ راشد الخیری نے تاریخی ناول نگاری کو فروغ دینے اور اس کی فنی حیثیت کو بڑھانے میں اتنا حصہ ضرور لیا کہ زبان و بیان انتہائی اعلیٰ استعمال کی ہے۔ منظرِ طرابلس کا ایک حصہ ملاحظہ فرمایئے:

''اچنبھا ہے، حیرت ہے، تعجب ہے، کمال ہے اس قوم پر جو آج ہر سمت در در کی بھیک مانگ رہی ہے۔ کبھی اس قابل تھی کہ ہر قوم اور ہر گروہ، ہر ملک ہر سلطنت نے اس کے آگے ناکیں رگڑیں۔ خلق و مروت، فلسفہ و حکمت، جرأت و شجاعت، خلوص و دیانت،

---

[۱] اُردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۲۷۷۔

سلطنت وحکومت، صداقت وروحانیت کو معراج کمال تک پہنچانے والے اپنی گزشتہ عظمت اور جوہر انسانیت سے اتنے بیگانہ اس قدر دور ہو جائیں تو حقیقت فسانہ اور واقعیت دھوکہ معلوم ہو۔''[1]

یقیناً ان کا اسلوبِ نگارش بہت بہتر ہے البتہ پلاٹ دُہرا اور مرکب تاریخی اور تخیلاتی موضوع کو باہم مربوط تو کیا گیا ہے لیکن ایک جان دو قالب والی کیفیت پیدا نہ ہو سکی کردار نگاری یکسانیت کا شکار ہے ان کی تمام ہیروئنیں حسن و جمال کا مرقع اور تمام ہیرو بہادری اور شجاعت کا پیکر ہیں جن کا ظاہری مقصد اپنے محبوب کی خاطر ڈٹ جانا ہے یہ یکسانیت کردار نگاری کو خاصا کمزور بناتی ہے۔ مکالمہ نگاری کے فن میں بھی راشد الخیری اپنے ہم عصروں سے آگے جانا تو کجا ہمسری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتے بلکہ نذیر احمد کے مقلد بن کر رہ گئے ہیں ان کے کرداروں کی زبان سے ادا ہونے والے مکالمے دلی کا روزمرہ اور محاورہ کہے جا سکتے ہیں اس سب کے باوجود منظر نگاری کے فن میں ان کا کام ہم عصروں سے آگے کا ہے۔ انہوں نے مصوری کی ہے حالات وواقعات کی ایسی منظر کشی کرتے ہیں کہ فنی اعتبار سے کمالِ معراج تک پہنچ جاتے ہیں۔

دلگداز کے پرنٹر اور پبلشر حکیم محمد سراج الحق نے بھی تاریخی ناول نگاری میں طبع آزمائی کی ان کے دو ناولوں ''فیروز شاہ'' اور ''ماہ طلعت'' کا تذکرہ ملتا ہے موخر الذکر حضرت عمرؓ کے عہد کی فتوحات اور کارناموں کا احاطہ کرتا ہے یہ ناول فنی اعتبار سے اُردو ادب میں کسی اضافے کا باعث نہ بن سکے۔ اسی زمانے میں موہن لال فہم نے بھی تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کی جس کی ایک وجہ موضوعات کا انتخاب ہے موہن لال نے ہندوستان کی تہذیب ومعاشرت اور تاریخی موضوعات کو اپنے اندازِ نگارش کی بنا پر مرتب کر کے مقبولِ عام بنانے کی کوشش کی انہوں نے اکبر، جہانگیر اور سراج الدولہ کے عہد اور شخصیات کو تاریخی پس منظر کے طور پر پیش کیا۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں رقمطراز ہیں:

''موہن لال کے انداز بیان اور مکالمہ نگاری میں تھیٹر کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ جا بجا اپنے ناول میں وہ پند و وعظ پر بھی اتر آتے ہیں اور مذہب اور فلسفہ کی باتیں کرنے لگتے ہیں ان کا پورا ناول ایک گورکھ دھندا معلوم ہوتا ہے۔''[2]

مسلمانوں کی تہذیب ومعاشرت سے ان کی عدم واقفیت ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جو ان کے ناولوں کے معیار پر سوالیہ نشان لگا دیتی ہے۔ خاص طور پر ناول ''پری خانہ'' میں علی وردی خان اور لطف النساء کے درمیان گفتگو اس کی مثال ہے۔

مولانا صادق سردھنوی اردو کی تاریخی ناول نگاری میں ایک اضافہ کہے جا سکتے ہیں انہوں نے عربوں کے دورِ جاہلیت سے لے کر دورِ نبویﷺ تک کے واقعات اور دیگر ایسے ہی بہت سے واقعات کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے جہاں دلچسپی، رومان میں تسلسل اور ربط موجود ہے وہیں منظر کشی یکسانیت کا شکار ہو گئی ہے جغرافیائی اور موسمی حالات کا خیال نہیں رکھ پائے اس کے باوجود ان کی نثر صاف، شگفتہ، اور پُراثر ہے۔ ان کا مطمح نظر قوم میں بیداری پیدا کرنا ہے تاکہ پستی سے عروج کی طرف گامزن ہو سکیں۔ اردو ادب میں ان کا

---

[1] اُردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۲۸۲۔

[2] اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء: ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں، ص ۱۵۰۔

مقام متعین کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید گوریجہ لکھتے ہیں:

''ان کے ناول اعلیٰ فنی مرتبہ سے محروم ہوتے تھے ان ناولوں میں زیادہ تر دلچسپ رومانی قصے ہوتے تھے۔ تاریخ کا ذکر صرف معمولی سا ہوتا اور تاریخی معلومات بھی ناقص ہوتی تھیں صدیقی صاحب فن ناول نگاری کی باریکیوں سے یا تو واقف نہ تھے یا پھر جان بوجھ کر انہیں نظر انداز کرتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح وہ ناول کے قصے پر توجہ کم دیتے تھے اور اپنے پیش نظر مقصد کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس لیے ان کے ناول فنی لحاظ سے خاصے کمزور ہیں۔''[1]

یہی وجہ ہے کہ ان کے پلاٹ میں ادھورے پن کا احساس اور کہانی کے نقطۂ عروج تک پہنچنے میں تجسس کی کمی محسوس ہوتی ہے جبکہ کردار نگاری کے زمرے میں وہ تاریخی کرداروں کو تو شان و شوکت اور اہمیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں مگر تخیلاتی کرداروں کی پیشکش کچھ نامکمل ہی ہوتی ہے حالانکہ دونوں قسم کے کرداروں کا ملاپ اس عہد کے معاشرے اور منظر کو زندہ کر دے تو ہی کامیاب کہلائے گا۔ مکالمہ نگاری کا فن بھی ترقی نہ کر سکا کیونکہ وہ مکالموں کے بجائے تقریر کروانے لگتے ہیں اور یوں مکالمے کی خوبصورتی مقصدیت کی نذر ہو جاتی ہے۔ اکثر وہ کرداروں سے ناصحانہ، عالمانہ گفتگو شروع کرا دیتے ہیں جو کئی کئی صفحات تک جاری رہتی ہے یہ محض اس لیے کہ وہ اپنے عہد کے مسلمانوں سے نالاں اور قرون اولیٰ کے اسلاف کو باعثِ تقلید جانتے ہیں۔ یہ تھا وہ ادبی اور سماجی پس منظر جس نے اردو ادب میں تاریخی ناول نگاری کو فروغ دیا اس وقت اردو میں تاریخی ناول نگاری کا ایک وقیع سرمایہ موجود تھا۔ اتنا سرمایہ کہ جس نے تاریخی ناول نگاری کو ایک رجحان کا درجہ دیا۔ یہ رجحان نسیم حجازی کے عہد میں روایت بن چکا تھا انہوں نے اس روایت سے استفادہ کیا۔

نسیم حجازی نے جس دور میں اپنے قلم کی روانی کے جوہر دکھانے شروع کیے تحریک آزادی ہند کا آخری دور تھا۔ دورِ طالب علمی میں وہ اپنے افسانوں کی بدولت مزاج اور شعور کی بھنک دے چکے تھے پھر ایک صحافی کی حیثیت سے قوم کو خواب غفلت سے جگانے میں کوشاں تھے اسی موقع پر انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ ہفتے وار کی اخبار محدود دطور پر ان کے مقاصد کی تکمیل کر رہا ہے اس لیے انہوں نے ناول نگاری کا سہارا لیا اس دور میں ملت کے نوجوانوں میں حوصلہ، ہمت و شجاعت اور ولولہ انگیزی کے ساتھ جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر سب کچھ لٹا دینے کا شعور بیدار کرنے کی ضرورت تھی اگر تاریخ کے جھروکوں میں دیکھا جائے تو شبلی نے بھی اسی مقصد کے پیش نظر تاریخی ناول نگاری شروع کی تھی ان کے بعد آنے والوں نے بھی جانتے یا نہ جانتے ہوئے اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھا ہوگا۔ نسیم حجازی کے سامنے انگریزی ادب کے بے شمار ناولوں کے علاوہ اردو زبان میں لکھے جانے والے مختلف النوع ناولوں کا ایک عظیم سرمایہ موجود تھا جس میں بہت سی خوبیاں اور بے شمار خامیاں موجود تھیں جن کا ادراک کرنے کے بعد انہوں نے اپنی منزل کا تعین کیا ہوگا شبلی کی الفاروق کے مطالعے سے تاریخی حقائق کو سمجھنے اور پیش کرنے کی صلاحیت بروئے کار آئی ہوگی تو نذیر احمد کی زبان و بیاں اور محاورہ بندی نے اردو زبان کو برتنے اور تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کا موقع فراہم کیا ہوگا۔ مرزا محمد ہادی رسوا کی تہذیب و معاشرت سے واقفیت نے

---

[1] اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۳۵۲۔

اس ضرورت کا احساس دلایا ہوگا جبکہ عبدالحلیم شرر کی تاریخی شخصیات کی اغلاط پیش نظر رکھ کر اپنے تاریخی کرداروں کو اتنے صاف، سادہ اور حقیقی انداز میں پیش کیا کہ ناقدین انگشت بدنداں رہ گئے۔موہن لال کی مذہبی اور تہذیبی ناواقفیت کو محسوس کر کے کسی بھی تہذیب و معاشرت کو پیش کرنے کے لیے مکمل معلومات حاصل کرنا ضروری خیال کیا۔مولانا صادق سردھنوی کی منظرکشی کی یکسانیت اور جغرافیائی وموسمی حالات سے عدم واقفیت کو اپنے تاریخی موضوعات کے انتخاب کے وقت سامنے رکھا ہوگا:

''میں نے مئی ۲۰۰۲ء میں لاہور جاکر پروفیسر ظفر حجازی سے ملاقات کی وہ نسیم حجازی سے ملاقات کے لیے ۱۹۶۸ء میں ایبٹ آباد ان کے مکان پر گئے تھے اور دو تین روز مقیم رہے انہوں نے بتایا کہ نسیم حجازی صاحب کے مطالعے کے کمرے میں بڑے بڑے نقشے آویزاں تھے خاص طور پر جب کوئی ناول کسی خاص علاقے سے منسوب شروع کرتے تو وہاں کے نقشے کا گہرا مشاہدہ کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں جھیل، نہر، برساتی نالے یا پہاڑی وغیرہ کا جو ذکر ملے گا وہ بالکل حقیقی ہوگا''۔[۱]

یقیناً نسیم حجازی نے فن تاریخی ناول نگاری میں اپنے پیش روؤں سے خوب خوب استفادہ کیا اور ان غلطیوں اور خامیوں کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جو ان سے پہلے کے ناول نگاروں کے یہاں موجود تھیں اگر انہیں علامہ شبلی نعمانی کی طرح انتہائی محتاط، گہرے مشاہدے، عمیق مطالعے سے متاثر قرار دیا جائے تو بے جا اور غلط نہ ہوگا کیونکہ انہوں نے شبلی، اقبال اور مودودی سے بہت کچھ سیکھا جو ان کی تحریروں میں جھلکتا بھی ہے یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''نسیم حجازی کا طرزِ تحریر اُردو کی بہترین نثر کی ان روایات کا امین ہے جو علامہ شبلی، علامہ ابوالکلام آزاد اور علامہ ابوالاعلیٰ مودودی کے عالمانہ مضامین میں ترقی پا کر اظہار و بیان کا مثالی معیار مقرر کرتی ہیں اس طرزِ تحریر میں نفاست و شوکت اور متانت و دبازت ہے جہاں تک اس میں پائے جانے والے خطابت کے عنصر کا تعلق ہے، وہ کرداروں کے مکالموں پر مشتمل ہے اور یہ مکالمے متعلقہ ہیروؤں کی عظیم شخصیت، ان کے شاندار مقاصد اور سیاق و سباق کے مطابق ہیں''۔[۲]

ان کی یہی کردار نگاری ناولوں کو فنی اعتبار سے مضبوط اور مستحکم بناتی ہے جسکا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ رقمطراز ہیں:

''نسیم کے ناولوں میں کردار نگاری کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ کرداروں اور پلاٹ میں ہم آہنگی ہوتی ہے۔تاریخی کردار مردہ اور بے جان ہوکر سامنے نہیں آتا لیکن وہ شرر کے مانند تاریخی کرداروں کے اردگرد چمک وعظمت کا ایسا رنگ نہیں جماتے کہ قاری کی چشم تخیل بھی وہاں نہ پہنچ سکے۔ان کے تاریخی کردار تو تاریخ کے صفحات ہی سے ابھرتے ہیں۔قوت تخیل کا معمولی سا استعمال ان کے کرداروں کو بڑا جاذبِ نظر بنا دیتا ہے۔ان کے ہاں غیر تاریخی کردار بھی اپنے عہد کے انسانوں سے مختلف دکھائی نہیں دیتے۔ان کے سوچنے کا طریقہ ان کی داخلی کشمکش، محبت و نفرت کا اظہار بالکل اسی طرح سامنے آتا ہے جیسا ہم چاہتے ہیں۔اس لیے ہم ان کرداروں کو اچھا سمجھتے ہیں اور ان سے دلچسپی و ہمدردی بھی محسوس کرتے ہیں''۔[۳]

۱۔ انٹرویو پروفیسر ظفر حجازی، ۱۹ مئی ۲۰۰۲ء مملوکہ راقم الحروف۔

۲۔ نسیم حجازی کا فن مشمولہ سیارہ، ڈاکٹر عبدالمغنی، ص ۴۷۔

۳۔ اُردو میں تاریخی ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۴۵۵۔

انہی خوبیوں کی بدولت نسیم حجازی کی ناول نگاری بہتر سے بہتر ہوتی گئی اور انہوں نے اپنے پیشروں سے استفادہ کر کے خامیوں کا پلڑا ہلکا کیا۔ جس کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''شرر اور سرر دھنوی کے ناولوں میں واقعہ نگاری سے زیادہ زور مبالغہ آرائی پر تھا، جبکہ ناول کے جدید فن کی حدود اور اس کی ہیئت کے عناصر ترکیبی پر انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ان کی زبان اور ان کے بیان کے اسلوب میں بھی استواری و ہمواری نمایاں نہیں۔

اس کے برخلاف نسیم حجازی نے اوّل روز سے ایک معتبر مورخ کا کردار اختیار کیا اور تفکر کے ساتھ ساتھ فن کاری کو بھی انہوں نے مطمعِ نظر بنایا۔ عقیدت میں وہ کسی سے کم نہیں اور جذبے بھی ان کے زبردست ہیں، مگر ایک تو ان کا ذہن بہت منضبط ہے دوسرے فن پر ان کو پوری قدرت ہے۔ وہ ناول کی تکنیک سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن اپنے موضوع کی نوعیت اور مقصد کی عظمت کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ اپنی اختیار کی ہوئی صنفِ ادب کی رومانیت کو حقیقت کے سانچے میں ڈھالتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقت ہی رومان انگیز بن جاتی ہے۔''[۱]

ایسی ہی رائے ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

''شرر کے بعد نسیم حجازی ہی ہیں جنہیں قارئین کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ میسر رہی ہے اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ نسیم حجازی تاریخی واقعات میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ تاریخی واقعات میں بھی بہت کم تصرف کرتے ہیں۔ جہاں کسی قصے کہانی کی مجبوری کے تحت انہیں ایسا کرنا بھی پڑا ہے تو یہ تصرف اتنا معمولی ہے کہ اس سے تاریخی حقائق مسخ نہیں ہوتے۔ انہوں نے شرر کی روایات کی پاسداری بھی کی ہے اور اپنے لیے الگ راستہ بھی اختیار کیا ہے فنی اعتبار سے نسیم حجازی کے ناول شرر کی نسبت زیادہ بہتر ہیں۔''[۲]

ڈاکٹر شفیق احمد نے نسیم حجازی کے محتاط مگر کامیاب اندازِ نگارش کا موازنہ ان کے پیشرو سے کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''نسیم حجازی نے تاریخی ناول لکھتے ہوئے کہانی اور قصہ پن کے جملہ تقاضے پورے کرنے کے باوجود نہ تو کسی تاریخی شخصیت کا دامن تار تار کیا ہے اور نہ تاریخ کے سینے کو داغدار کرنے کی غلطی کی ہے جبکہ اُردو کے معروف تاریخی ناول نگار عبدالحلیم شرر کے بہت سے ناولوں میں سے صرف ''فردوس بریں'' کو مندرجہ بالا نقص سے بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے اور غالباً وہ بھی اس لیے کہ فردوس بریں میں ایک ایسی تحریک کو موضوع بنایا گیا ہے جس کے بارے میں قارئین کافی معلومات نہیں رکھتے اور اسی بنا پر شرر کا بے لگام تخیل اس تحریک کے نقش ابھارنے میں کامل طور پر آزاد تھا۔''[۳]

جبکہ بلقیس ظفر نے نسیم حجازی کا موازنہ ان کے پیشرو سے کرتے ہوئے ناول نگاری کی فنی نوعیت کے فرق کو اس طرح تحریر کیا ہے:

۱۔ نسیم حجازی کا فن مشمولہ سیارہ: ڈاکٹر عبدالمغنی، ص ۴۳۔

۲۔ اُردو میں تاریخی ناول نگاری، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۷۶۷۔

۳۔ نسیم حجازی۔ بحیثیت تاریخی ناول نگار مشمولہ نسیم حجازی۔۔ ایک مطالعہ، ص ۸۶، ۸۷۔

''اسلامی تاریخ کو اپنے مخصوص دلآویز انداز سے لکھنے اور اس کے کرداروں کو مقبول بنانے کا سہرا یقیناً صرف نسیم حجازی کے سر ہے۔ ان کے کردار ہماری اسی دنیا کے جیتے جاگتے انسان ہیں۔ عبدالحلیم شرر کے مافوق الانسان کردار نہیں جن پر جادوگروں کا گمان ہو۔ ہاں ان کرداروں کو جنہیں نسیم حجازی کا قلم ڈھالتا ہے، ہم اصلی رنگ میں دیکھتے ہیں وہ لوگ جو غفاری وقہاری، قدوسی اور جبروت کے مجسم پیکر تھے اپنے صحیح خدوخال میں نظر آتے ہیں وہ جو حلقۂ یاراں میں ابریشم کی مانند نرم اور میدان جنگ میں مجسم برق تھے۔ نسیم حجازی ہمارا تعارف اپنے اسلاف سے کراتے ہیں اپنے خوبصورت، منفرد اور چونکا دینے والے انداز سے اپنے ذہن رسا سے قاری کے لیے وہ ایک نئی دنیا تخلیق کرتے ہیں جس میں قہر ہی نہیں مہر بھی ہے وفا ہی نہیں دغا بھی ہے۔''[1]

اس بارے میں ایک بہتر تبصرہ ڈاکٹر محمد یوسف عباسی کی اس تحریر میں دیکھا جا سکتا ہے:

''نسیم حجازی کے ناول کی امتیازی خصوصیت ان میں جذبۂ حریت واستقامت ہے۔ ان کے کردار حزن پسندی اور انفعالیت کا شکار نہیں۔ وہ فعال اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ راشد الخیری کے تاریخی ناول تکنیکی اعتبار سے کمزور اور حزن ویاس کے مارے ہوئے ہیں۔ عبدالحلیم شرر کا پسندیدہ موضوع صلیبی جنگوں کا رزمیہ دور تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے والٹر اسکاٹ کے جواب میں ناول لکھے۔ والٹر اسکاٹ نے طلسمان (Talisman) میں صلیبی جنگوں میں اسلام اور مسلمانوں کا مذاق اڑایا تھا جس کے خلاف بنگال کے مشہور لیڈر نواب بہادر عبداللطیف نے غالباً ۱۸۶۶ء میں حکومت بنگال سے احتجاج بھی کیا تھا۔ اسی طرح ''فردوس بریں'' پر والٹر اسکاٹ کے ناول Assasins کی چھاپ محسوس ہوتی ہے نسیم حجازی کسی مغربی ناول نگار سے متاثر نہیں انہوں نے اپنی راہ خود تلاش کی ہے۔ اپنی منزل خود مقرر کی ہے۔ ان کی تخلیقی عظمت سے اردو تاریخی ناول اپنے نقطۂ معراج تک پہنچا ہے۔''[2]

اس لیے یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ تخلیقی ادیب اپنے پیشرو سے سیکھتا ہے اور پھر اپنی منزل متعین کرتا ہے۔ کامیابی کے سفر پر گامزن رہنے کے لئے اُسے اپنے عصری ادب کا بخوبی ادراک ہونا چاہیے ساتھ ہی معاشرتی ضرورتیں، سیاسی حالات اور تہذیبی اقدار کو بنظرِ غائر سامنے رکھے تو کامیابی اس کے قدم چومے گی اور یہی سب کچھ نسیم حجازی نے کیا انہوں نے دنیائے ادب کے بہترین ناولوں کا مطالعہ کیا پھر تاریخی معلومات کو اکٹھا کر کے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا لیکن اس سفر میں ماضی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے کا رویہ ہمیشہ موجود رکھا تاکہ پیشرو سے استفادہ کرتے ہوئے ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو غلطیوں سے بہت حد تک مبرا ہو۔

---

[1] نسیم حجازی۔۔۔ میری نظر میں مشمولہ سیارہ، بلقیس ظفر صاحبہ، ص ۱۵۰۔

[2] نسیم حجازی۔ ایک تذکرہ روایت مشمولہ سیارہ، ڈاکٹر محمد یوسف عباسی، ص ۲۱۵۔

معاصرین میں امتیاز

یہ کہنا کہ ناول سے مقصدیت کا کام نہیں لیا جاسکتا اصولی طور پر بالکل غلط ہے چونکہ ناول کسی معاشرے کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے اور اس کے کچھ ظاہری مقاصد ضرور ہوتے ہیں جنہیں بعض اوقات منکشف کر کے قارئین کے لیے پیش کر دیا جاتا ہے اور کبھی ناول نگار اپنے مقصد کو پوشیدہ رکھ کر بھی اپنی بات کہنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں معاشرے کی اصلاح اس کے پیشِ نظر رہتی ہے۔ اردو ادب میں ناول نگاری کے مورث اعلیٰ مولوی نذیر احمد کے ناولوں میں مقصدیت، افادیت، نیچر کی عکاسی اور معقولات کی طرف توجہ دینے کے رجحانات موجود ہیں اس کی وجہ مغلیہ سلطنت کا زوال اور اُس کے نتیجے میں طوق گردن کی طرح لاحق ہو جانے والی غلامی کوئی ایسا تجربہ نہیں تھا جسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ چنانچہ برصغیر کے مسلمانوں کو ذہنی پس ماندگی سے نکالنے کا نسخہ سرسید احمد خان نے یہ تجویز کیا کہ انگریزوں کے لائے ہوئے علوم وفنون کی تحصیل کی جائے تاکہ فکر کا فکر سے اور خیال کا خیال سے مقابلہ کیا جاسکے۔ مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے جو کچھ پیش کیا اس کے پس پشت انگریزی ادب سے واقفیت اور ناول کی ہیئت سے روشناسی تھی یا نہیں کیونکہ انکے یہاں ناول نگاری کے فنی تقاضوں کو کسی حد تک برتا ہی نہیں گیا البتہ مولوی نذیر احمد کے ناولوں میں اُس عہد کے متوسط گھرانوں کے مسائل، ذہنی کیفیات، افکار وعقائد، تعلیم و تربیت کے کئی گوشے اس انداز سے در آئے ہیں کہ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں برصغیر کی مسلم معاشرت کے تجزیے میں اُن سے خاطر خواہ مدد لی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد جب اخبارات کے اجراء میں اضافہ ہوا اور انہیں پڑھنے والوں کی تعداد خاطر خواہ انداز میں بڑھنے لگی تو سلسلہ وار ناول نگاری نے جنم لیا جو اخباری ضرورت، قارئین کی دلچسپی اور موضوع کی وسعت پر مبنی ہوا کرتی تھی لیکن اس طرح ادبی شعور اجاگر کرنے اور کم علم لوگوں تک اس صنف کے اثرات تو پہنچے مگر فنی اعتبار سے ترقی کی سبیل نہ بن سکی۔ اخباروں سے آگے ماہناموں میں بھی اس تجربے کو دہرایا گیا جس کی اہم مثال عبدالحلیم شرر کے ناولوں کی دلگداز میں اشاعت سے پیش کی جاسکتی ہے۔ آخر شرر نے معاشرتی اصلاح اور تہذیب و تمدن کی بقا کے کام کو فروغ دینے کے بجائے معاشرے میں ماضی کی حسین یادوں اور تابناک عہد کو دوبارہ سے زندہ کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی اگر سیاسی منظر نامے پر غور کیا جائے تو سرسید تحریک کے اغراض و مقاصد کی بنیادی ضرورت انکے عناصر اربع نے پوری کردی تھی اور لوگوں میں آل انڈیا کانگریس کے قیام سے کچھ نہ کچھ سیاسی شعور بھی بیدار ہو چلا تھا۔ شرر نے اس لکیر کا فقیر بننے کے بجائے تابناک اور روشن ماضی کی ان یادوں کو زندہ کیا جو عظمتِ رفتہ کا سرمایہ تھیں یہ الگ بات ہے کہ فن ناول نگاری کے اس ڈھب کو اختیار نہ کر سکے جس کی توقع بعد کے آنے والوں نے ان سے کی۔ ہے ماضی سے انسان کا رشتہ کسی نہ کسی طور برقرار رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ مرزا ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا کے ذریعے لکھنؤ کی زوال پذیر تہذیب و معاشرت کو تمام تر رنگینیوں کے ساتھ زندہ و جاوید کرنے کی کوشش کی اگر اس تہذیب کے جسے رسواء پیش کر رہے تھے اور جس زمانے میں پیش کیا اس کا درمیانی عرصہ متعین کریں تو محض نصف صدی پر مشتمل ہے یہی وجہ ہے کہ رسواء کے یہاں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ ناول نگاری کے فنی تقاضوں کی بہترین جھلک ملتی ہے اس کے بعد پریم چند اور انکے معاصرین

نے فن ناول نگاری کو بام عروج تک پہنچایا۔اس کی ایک وجہ تو پریم چند کے منتخب کردہ موضوعات اور انکا نظریہ فن تھا تو دوسرے انکی حقیقت پسندی اور گہرا مشاہداتی شعور جس کی بدولت ان کے ناول معاشرتی مزاج اور سیاسی بیداری کو اجاگر کرنے کا باعث بنے۔ ترقی پسند تحریک جو اس اشترا کی نقطۂ نظر کی کارفرما تھی جس کے نزدیک معاشرے اور فرد کی ذمہ داریاں اور وظائف برابر کی بنیاد پر متعین کیے گئے تھے یہ نظریہ اور اسکا پرچار کرنے والے ہر صنفِ ادب پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے البتہ حلقہ ارباب ذوق کے قیام نے ایک متوازی تحریک کی صورت میں ادیبوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیے گئے تو دوسری جنگ عظیم کے آغاز سے قبل جرمنی میں ہٹلر کا طوطی سر چڑھ کر بول رہا تھا۔اس کے متکبرانہ مزاج نے تمام عالم کو تسخیر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو برطانیہ جس کے اقتدار کا سورج غروب نہ ہوتا تھا اپنے حواریوں کے ساتھ میدان جنگ میں نکل آیا ادھر ہندوستان کے عوام اپنی تحریک آزادی کو تیز گام چلانے اور برطانوی استعمار پر دباؤ بڑھانے میں سرگرم عمل تھے۔ان حالات میں نسیم حجازی نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد یہ محسوس کیا کہ ہندوستان کی آزادی کوئی معنی نہیں رکھتی تاوقتیکہ ہندوستان کی تقسیم کا فارمولہ عملی جامہ نہ پہن لے لیکن اس راہ میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ کچھ مسلمان بھی پیش پیش تھے جو انگریزوں سے آزادی کے خواہاں تو تھے لیکن تقسیم کے مخالف بھی تھے۔اس لیے علیحدہ وطن کی جدوجہد کرنے والوں کو دو میدانوں میں جنگ کرنا تھی اسلامی نظریہ حیات کو اجاگر کرنے اور جذبۂ جہاد کو ابھارنے کے لیے ماضی کے مسلم معاشرے کی عکاسی کرنی تھی جس کے پیش نظر نسیم حجازی نے ''داستان مجاہد'' اور ''محمد بن قاسم'' تحریر کیے ساتھ ہی خوابوں کی دنیا میں رہنے والے اس مسلم طبقے کے لیے جو آزادوطن کی راہ میں رکاوٹ بن رہا تھا ہندو ذہنیت کا اصل چہرہ دکھانے کی خاطر ''انسان اور دیوتا'' رقم کیا یہ ناول اس عہد کی ضرورت اور مسلم معاشرے میں اجتماعیت پیدا کرنے کی ایک کوشش کہے جا سکتے ہیں اول الذکر دونوں ناول مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات کا مرقع ہیں تو ساتھ ہی ان سازشی عناصر کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے جو مسلمانوں کی فتوحات سے خوف زدہ تھے اس لیے وہ اسے ہوسِ ملک گیری کہہ کر جذبۂ جہاد کی روح کو مسلم معاشرے سے جدا کرنے میں کوشاں تھے ان دونوں ناولوں کا فنی مقام انتہائی بلند، پلاٹ مربوط و مستحکم، موضوع پر مصنف کی گرفت، کردار تمام تر انسانی اوصاف کے پیکر، مکالمے، شستہ زبان و بیان میں ادبیت گویا ہر اعتبار سے کامیاب کہے جا سکتے ہیں عوامی حلقوں میں انکی پسندیدگی اس قدر تھی اور ہے کہ انکے لاتعداد ایڈیشن چھپے۔نسیم حجازی کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ناول ''محمد بن قاسم'' کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالمغنی رقم طراز ہیں:

''حالات کی نئی نئی کروٹوں نے تجسس کی کیفیت آخر تک قائم رکھی۔ جنگ کی حالت میں بھی انسانی رشتوں اور سرگرمیوں کی روداد نے ایک قابل قبول ماحول پیدا کیا، چھوٹے بڑے ہر کردار نے اپنا مخصوص رول بخوبی ادا کیا، احوال کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ شخصیات کی ترقی بھی ہوئی اور ایک ایسی فضا ابھری جس میں جیتے جاگتے حقیقی کردار سانس لیتے نظر آئے۔''[1]

---

[1] نسیم حجازی کا فن، عبدالمغنی، مشمولہ سیارہ، ص ۴۲۔

ناول کے پلاٹ کی فنی پختگی کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ لکھتے ہیں:

''سندھ کی مہمات کے واقعات کے ساتھ مصنف محبت، نفرت، بہادری اور چالاکی و مکاری کے چھوٹے چھوٹے ڈرامے دکھاتا جاتا ہے اور اس کے قلم کا کمال یہ ہے کہ اس کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑتی اور قارئین کی دلچسپی میں فرق نہیں آتا۔''[1]

ان ناولوں کی طباعت کا زمانہ قرارداد پاکستان اور قیام پاکستان کا درمیانی دور ہے اس موقع پر ملت کے اجتماعی مقاصد کو بلند تر انداز میں پیش کرنے کی ضرورت تھی ساتھ ہی نظم وضبط، اطاعت و فرمانبرداری کا سبق یاد رکھنے کی تلقین بھی دینا تھی اسی زمانے میں آخری چٹان کی اشاعت سے انکا مقصد ملت اسلامیہ کے اتحاد کو فروغ دینا اور سخت سے سخت حالات میں ڈٹے رہنے کی تلقین کرنا تھا۔ انہوں نے اس ناول میں ان سازشی عناصر کو بے نقاب کیا ہے جو خود کو ملتِ اسلامیہ کا فرد کہتے ہیں مگر ان کی منافقت کی سزا پوری قوم کو بھگتنا پڑتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مہاجرین قافلوں کے ساتھ آنے والے وہ لرزہ خیز واقعات تھے جو لاکھوں انسانوں کی خونی داستان بن گئے یہ انسانی المیہ جس پر بہت کچھ لکھا گیا خود نسیم حجازی نے ''خاک اور خون'' کے نام سے ایک ناول تحریر کیا اس کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے وقار عظیم رقم طراز ہیں:

''فسادات کے ان ناولوں کا موضوع تقسیم سے ذرا پہلے اور اس کے ذرا بعد وہ مختصر زمانہ ہے جس میں انسان نے جی بھر کے انسانی خون سے ہولی کھیلی اور اپنے لباس کے ساتھ، اپنے جسم وروح تک کو اس کی سرخی میں آلودہ کیا۔ ہمارے ناول نگاروں نے فسادات پر جتنے ناول لکھے اُن میں ''انسان مر گیا'' (رامانند ساگر)، ''رقص ابلیس'' (ایم اسلم)، ''پندرہ اگست'' (رشید اختر ندوی)، ''خاک اور خون'' (نسیم حجازی)، ''مجاہد'' (رئیس احمد جعفری) اور ''خون''، ''بے آبرو'' اور ''فردوس'' (قیسی رامپوری) اسی سلسلے کی زیادہ معروف اور مقبول کڑیاں ہیں۔ یہ ناول اس محدود اور مخصوص طبقے کے پڑھنے والوں کو چھوڑ کر جو ہر چیز کو فنی محاسن کی ترازو میں تولتے ہیں، عموماً پسند کیے گئے اور ان میں سے بعض کئی کئی مرتبہ چھپے لیکن حقیقت میں ان کی یہ مقبولیت ان کی ادبی حیثیت اور مرتبہ کی بنا پر ہرگز نہیں یہ قبول عام سراسر جذباتی وتاثراتی ہے۔ ان ناولوں میں لکھنے والوں نے واقعات کے جو نقشے کھینچے ہیں، ان میں قاری کو کبھی اپنے مشاہدات، تجربات، واحساسات کی سچی اور کبھی مبالغہ آمیز تصویر ملتی ہے اور ان انسانیت سوز واقعات میں جن سے ان ناولوں کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے اسے اپنے اخلاقی و مذہبی احساسات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے وہ انہیں دلچسپی اور بعض اوقات رقت کے ساتھ پڑھتا ہے۔ ناول نگاروں نے اپنے تخیل سے زندگی کے ان خونیں مرقعوں میں جو رنگ بھرے ہیں، انہوں نے ان ناولوں کو عام قاری کے لئے اور بھی زیادہ پرکشش بنایا ہے۔ حوادث نے عام ذہن میں اضطراب اور ہیجان کی جو کیفیت پیدا کی ہے ہمارے ناول نگار نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور ابھری ہوئی چوٹ کو اور زیادہ اُبھارا ہے۔''[2]

یہاں وقار عظیم نے کسی ایک ناول نگار کی خوبی اور کسی دوسرے کی خامی کی طرف کوئی خاص اشارہ تو نہیں کیا لیکن یہ بات بھی خاصی

---

[1] اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۲۴۰۔

[2] داستان سے افسانے تک: وقار عظیم، ص ۱۶۲، ۱۶۵۔

حوصلہ افزا ہے کہ فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے چند ناول نگاروں میں نسیم حجازی کو شامل کیا۔ فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے ناولوں کے بارے میں مقالہ نگار عطیہ سعید نے تفصیل سے نسیم حجازی کے فنی محاسن کو اجاگر کیا ہے مثال کے طور پر ان کے اسلوب نگارش کے بارے میں لکھتی ہیں:

''نسیم حجازی کی تحریر میں ایک سحر ہے۔ اس کا انداز بیان اتنا دلکش ہے کہ موضوع خواہ کیسا ہی ہو، اس میں جان ڈال دیتا ہے۔''[۱]

اُن کی کردار نگاری پر رائے زنی کرتے ہوئے موصوفہ کا خیال ہے کہ:

''نسیم حجازی اپنے ہیرو کو خاص طور سے اور عام طور پر اپنے تمام پسندیدہ کرداروں میں غیر معمولی صلاحیت اچانک دکھاتے ہیں اُن کے ان پسندیدہ کرداروں میں حد سے زیادہ خود اعتمادی بھی ہوتی ہے۔''[۲]

شعوری بیداری کے سلسلے میں عطیہ سعید ان کے اس انداز کو یوں اجاگر کرتی ہیں:

''اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح نسیم حجازی کے یہاں سیاسی، معاشرتی و معاشی شعور بڑی شدت کے ساتھ ملتا ہے۔''[۳]

یہی نہیں ایک اور مقالہ نگار سعیدہ مہتاب نے نسیم حجازی کی کردار نگاری کے بارے میں یوں رائے دی:

''نسیم حجازی کے تخلیق کردہ کردار تاریخی ناولوں کا حصہ ہونے کے باوجود تاریخ سے زیادہ روزمرہ زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔''[۴]

خاک اور خون کی منظر نگاری کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوفہ رقم طراز ہیں:

''ہجرت اور مہاجرین کے کیمپ کا ماحول نہ صرف اذیت ناکی بلکہ عبرت ناکی کی ایسی تصویر ہے جسے دیکھ کر ہر قاری لرز اٹھتا ہے۔ اس ماحول کی عکاسی میں نسیم حجازی نے سادگی و روانی کے ساتھ حقائق کو پیش کر کے فسادات کے المیے کو زندہ کر دیا ہے۔''[۵]

یعنی نسیم حجازی کی ناول نگاری حقیقت کی عکاس ہے اگر دونوں مقالہ نگاروں کی رائے کو ملحوظ رکھیں تو نسیم حجازی کے اوصاف ناول نگاری پر خوب خوب روشنی پڑتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد نسیم حجازی کی ناول نگاری مزید جوبن پر آئی انہوں نے اردگرد پھیلے ہوئے تاریخی موضوعات کا انتخاب کرتے ہوئے ایک طرف اپنے قارئین کو تاریخی حقائق سے واقفیت کرائی تو دوسری طرف اصلاحی اور مقصدیت سے بھرپور ناول پیش کیے بظاہر یہ دونوں رجحانات ایک ہی ناول میں موجود تھے مگر ان میں جس انداز کو اختیار کیا گیا وہ تاریخ اور تخیل کے اشتراک سے سامنے

۱۔ تقسیم پاکستان برصغیر کے اہم اردو ناول نگاروں کے آئینے میں، مقالہ نگار عطیہ سعید، زیر نگرانی ڈاکٹر وحید قریشی مقالہ ایم۔ اے ۱۹۷۷ء پنجاب یونیورسٹی لاہور، ص ۷۸، غیر مطبوعہ۔

۲۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۳۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۴۔ اردو ناول کا پاکستانی دور ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء، سعیدہ مہتاب، زیر نگرانی پروفیسر ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی، مقالہ برائے ایم۔ فل جامعہ پشاور، ص ۱۲۰، غیر مطبوعہ۔

۵۔ ایضاً، ص ۱۶۶۔

آ ئے ''معظم علی'' اور ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' محض ڈیڑھ سو سال پہلے کی تاریخ تھی لیکن اس ناول میں ''معظم علی'' اور اس کے خاندان کے تخیلاتی کردار نگاری کے ذریعے اس معاشرے کو زندہ و جاوید کیا گیا ہے جس کی یادیں ابھی ذہن کے کسی گوشے میں گونج رہی تھیں تو دوسری طرف نواب سراج الدولہ، احمد شاہ ابدالی، سلطان حیدر علی اور ٹیپو کے تاریخی کرداروں کے ذریعے قاری کو اُن مظلوم مگر بہادر حکمرانوں کے مقصد حیات سے آگاہ کیا ایک اور ناول ''آخری معرکہ'' میں محمود غزنوی کی فتوحات اس کے طریقہ جنگ اور اندازِ تبلیغ اسلام کو پیش کیا ہے عرب کی اس سرزمین کو جہاں اسلام کا نور اوّل اوّل فاران کی پہاڑیوں پر چمکا انکو بھی موضوع بنایا اور اسے ''قافلۂ حجاز'' اور ''قیصر و کسریٰ'' کے ذریعے پیش کیا ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کی تلخ یادوں کو ماضی کے اسپین کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی تو ''اندھیری رات کے مسافر'' اور ''کلیسا اور آگ'' جیسے موضوعات قارئین کے دلوں کو تڑپانے اور ماضی کی حقیقتوں سے واقف کرانے کے لئے سامنے آئے اس نکتہ کو مدنظر رکھنے کی اشد ضرورت ہے کہ نسیم حجازی کے موضوعات اکثر اوقات اسلام کے زریں اور تابناک دور کے بجائے انحطاط پذیر مسلم معاشرے کی عکاسی پر مشتمل ہوتے ہیں جس کی وجہ تنزلی کی وجوہات کا جائزہ لینا اور موجودہ عہد میں مستقبل کی بہترین تیاری کرنا ہوسکتا ہے یہ الگ بات کہ ان کے قارئین کا گروہ اس مقصد کو مدنظر رکھتا تھا یا نہیں۔

نسیم حجازی کے ہم عصروں میں ایک بڑا نام ایم۔اسلم کا ہے انہوں نے بے شمار ناول لکھے جن میں اکثریت تاریخی ناولوں کی ہے۔ ان کا نقطۂ نظر مشرقی تہذیب واقدار کی بالادستی، مغربی کلچر سے نفرت، مسلم معاشرے میں خواتین کے لئے پردے کو لازم کرانا ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے گزشتہ مسلمانوں کی فتوحات، دورعروج کے کارناموں، اسلامی تشخص ونظریے کو اجاگر کرنے کے لیے اپنے قلم سے خوب خوب کام لیا۔ ان کا انداز معلم اخلاق اور مبلغ اسلام کا سا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مذہبی، اصلاحی اور اخلاقی موضوعات کرداروں کی زبان سے ادا ہوتے ہیں ان کا ناول فتنۂ تاتار نسیم حجازی کے ناول ''آخری چٹان'' کے موضوع کے مماثل ہے۔ فتنۂ تاتار میں انہوں نے بغداد کے عوام کی بے حسی اور خلیفہ کی عاقبت نااندیشی کا ذکر کرتے ہوئے بغداد کی تباہی کا موجب انہی دونوں عوامل کو قرار دیا ہے ان کے ناولوں میں مقصدیت اور تبلیغ کے عنصر نے فنی نقص بیدار کر دیا ہے پھر تاریخی واقعات کے ساتھ تخیلاتی کرداروں کی کارفرمائی کا ملاپ کبھی کبھی مضحکہ خیز بن گیا ہے ان کے اکثر موضوعات مسلمانوں کے دورعروج کی داستان پر مشتمل ہیں مگر تاریخی ناول نگار کی ذمہ داریوں کا ادراک کرنے میں وہ چوک گئے ہیں انہوں نے عرق ریزی کے ساتھ مختلف مؤرخین کے اختلاف کو صحیح تناظر میں پیش کرنے کی کوشش نہیں کی اس کی وجہ ان کی بسیار نویسی رہی ہو گی لیکن سستی شہرت اور ذاتی منفعت کی خاطر ادبی قدروں کو قربان نہیں کیا جا سکتا اگر ان کے محاسن بیان کرنے والوں کی رائے دیکھی جائے تو وہ فلک کی بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔ ایک ممدوح جبرائیل کی رائے دیکھیے:

''انہوں (ایم۔اسلم) نے اپنے تخیلات کو ناولوں میں ڈھال کر عوام تک پہنچانا شروع کیا، ان کا طرز تحریر، اندازِ بیاں، منظر کشی، زبان کی شستگی اور واقعات کی ہم آہنگی کچھ ایسی بھائی کہ لوگ بہت جلد آپ کی طرف متوجہ ہونے شروع ہو گئے۔''[۱]

---

[۱] ایم۔اسلم بحیثیت نثر نگار مشمولہ ایم اسلم اور اس کا ادب ص ۲۳۶۔

اسی مضمون میں آگے جا کر لکھتے ہیں:

''ایم اسلم کی تحریر کو ایک زمانہ ہوا پختگی حاصل ہو چکی ہے۔ ان کا انداز دل آویز اور اسٹائل مخصوص ہے، وہ جس بات کو لکھتے ہیں اس التزام سے لکھتے ہیں کہ معمولی پڑھے لکھے انسان کے دل میں بھی اتر تی چلی جاتی ہے اس خصوصیت کو ان کی تحریر کا اعجاز سمجھنا چاہیے جو ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی جسے خدا دے۔

ایم اسلم کی نثر میں زندگی کی تڑپ ہے، ان کی محفل میں پرانی شمعیں اب بھی روشن نظر آتی ہیں وہ شراب کہنہ کو جام نوش کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ مے گسار جھوم جھوم جاتا ہے تاثر اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا؟ وہ ہتھوڑا، مزدور، جنسی بھوک، سڑتے ہوئے زخم اور رستے ہوئے ناسوروں تک آ کر ہی نہیں رک جاتے بلکہ زندگی کے حقائق پر بھی خامہ فرسائی بطریق احسن فرماتے چلے جاتے ہیں۔''[1]

ایم اسلم کی ناول نگاری ایک طویل عہد پر محیط ہے اُن کے ناولوں کی تعداد بے شمار اور موضوعات ہر قسم کے ان کے یہاں موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کی مدح سرائی کرتے ہوئے ڈاکٹر محی الدین رقم طراز ہیں:

''ان کے ناولوں میں پلاٹ کا دروبست اتنا نازک اور کرداروں کا ارتقا اتنا مکمل ہوتا ہے کہ پڑھنے والا کسی قسم کی الجھن محسوس کیے بغیر پورا ناول دلچسپی سے پڑھ جاتا ہے۔''[2]

ایم اسلم کا ادبی مقام متعین کرتے ہوئے ڈاکٹر محی الدین نے آگے جا کر لکھا ہے:

''وہ خواص کے لیے شاید ہی لکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقی کاوشیں فنی ابہام اور فلسفیانہ رمز و کنایہ سے پاک ہیں نہ وہ اپنی لیاقت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں اور نہ انہیں اپنی صاحب کمالی کا دعویٰ منوانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول خواص اور عوام دونوں میں مقبول ہیں جو ادیب اپنی فہم و فراست کا رعب گانٹھنا چاہتے ہیں یا اپنے علم و فضل اور فنکارانہ مہارت کے ثبوت پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی تصانیف پھول جھڑیوں کی طرح کچھ عرصہ تک اپنی بہار دکھا کر ختم ہو جاتی ہیں۔

ایم اسلم ان تمام تکلفات اور کدو کاوش سے بے نیاز ہیں وہ خواجہ حسن نظامی کی طرح سادہ اور سلیس اسلوب میں قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں اور مرزا فرحت اللہ بیگ کی طرح نہایت بے باکی اور آزادروی کے ساتھ اپنے خیالات صفحۂ قرطاس پر منقش کرتے رہتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بلا جھجک اور انتہائی خلوص کے ساتھ صاف صاف کہہ جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ''دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔''[3]

اس تعریف و توصیف کے ساتھ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی یہ رائے پڑھیے:

''اسلم کے یہ تمام ناول اخلاقی ہیں لیکن ان میں وعظ و پند کا دفتر کھولنے کی بجائے داستان کی رنگینی سے کام لیا گیا ہے اور اگر

---

[1] ایم اسلم بحیثیت نثر نگار مشمولہ ایم اسلم اور اس کا ادب، ص ۲۳۷۔

[2] ایم اسلم میری نظر میں مشمولہ ایم اسلم اور اس کا ادب، ص ۳۰۹۔

[3] ایضاً، ص ۳۰۱۔

دلچسپی، حقیقت نگاری اور زندگی کی مصوری ناول کے بنیادی عناصر تسلیم کیے جائیں تو یہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔''[۱]

مگر جب ایم اسلم کے ناولوں کو کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی گئی تو ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ کی یہ رائے سامنے آئی:

''ان کے ناولوں میں رومانی واقعات کی کثرت میں تاریخی واقعات اپنا تاثر کھو دیتے ہیں اور اس طرح ایم اسلم اپنے موضوع سے انصاف نہیں کر پاتے۔ موضوع سے عدم توجہی کی بنا پر فنی لحاظ سے ان کے تاریخی ناول معمولی اور پست سطح پر رہ جاتے ہیں۔''[۲]

اُن کے ناولوں کے فنی نقائص کو دور کرنے کے لیے ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ کی تجویز ہے:

''اگر ایم۔ اسلم زود نویسی کا مظاہرہ نہ کرتے اور جو کچھ لکھتے خوب غور و فکر کر کے لکھتے تو موضوع اور فنی لحاظ سے ممکن ہے وہ کوئی شاہکار تخلیق کر جاتے۔''[۳]

کیونکہ سہیل بخاری کے خیال میں:

''ایم۔ اسلم مثالیت پسند ہیں اور معلمین اخلاق و مبلغین اسلام کے مکتبۂ خیال سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر اول سے آخر تک مشرقی، مذہبی، اخلاقی اور اصلاحی ہے وہ اپنے خیالات و عقائد ناول کے کرداروں کی زبان سے برابر واضح کرتے رہتے ہیں۔''[۴]

انہوں نے ناولوں کے موضوعات میں موجود خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان ناولوں کی خصوصیت ان کی شدید مقصدیت ہے جس کے باعث واقعات میں علت و معلول کا رشتہ کمزور رہتا ہے۔ پلاٹ کے ارتقائی منازل کی تقسیم غیر متوازن ہوتی ہے۔ کردار مصنف کے نظریات کا برابر پرچار کرتے رہتے ہیں اور مکالمے اکثر مباحث میں تبدیل ہو جاتے ہیں تاریخی ناولوں میں جابجا خطبات و تقاریر اور مواعظ ملتے ہیں (جوئے خون، ضرب مجاہد وغیرہ) اور عشق مادی و ارضی ہونے کے بجائے روحانی و آسمانی ہوتا ہے ان خامیوں کے باوجود مصنف کی تحریر میں خلوص ہے بیشتر ناولوں میں ایک ہلکا سا حزن رچا ہوا ملتا ہے۔ مکالمے بالعموم فطری اور چست ہوتے ہیں اور زبان و بیان کی خامیوں کے باوصف منظر نگاری بڑی دلکش ہوتی ہے۔ مصنف کو صحرائی یا بدوی زندگی کا نقشہ کھینچنے میں پورا کمال حاصل ہے۔ ان کے ذاتی تجربات نے اس زندگی کے بیان میں بڑی تاثیر بھر دی ہے۔''[۵]

مگر وقار عظیم ایم۔ اسلم کے ناولوں پر ان الفاظ میں رائے زنی کرتے ہیں:

''ایم۔ اسلم کے ناول بعض اوقات عزم راسخ اور ہمتِ سربلند کے واقعات کی مصوری کرنے کے باوجود نمایاں طور پر تبلیغی

---

[۱] ایم اسلم بحیثیت نثر نگار مشمولہ ایم اسلم اور اس کا ادب، ص ۲۸۶۔

[۲] اردو میں تاریخی ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۲۰۵۔

[۳] ایضاً، ص ۲۰۶۔

[۴] اُردو ناول نگاری، سہیل بخاری، ص ۱۲۴۔

[۵] ایضاً، ص ۱۲۴۔

رنگ کے حامل ہیں اور پڑھنے والا آسانی سے محسوس کرتا ہے کہ جنگ و جدل کے مناظر بعض اوقات روح پرور ہونے پر بھی عوام کے سستے مذاق اور پسند سے زیادہ قریب ہیں۔''[۱]

ان آراء کے باوجود اتنا ضرور ہے کہ تاریخی ناول نگاری کے فنی تقاضوں کو برتنے کا ڈھنگ ایم اسلم میں زیادہ تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

''اگر ایک طرف شرر انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مسلمانوں کو ان کی درخشاں تاریخ یاد دلا کر ان کو مستقبل کی کامیاب اور باوقار و محترم قوم بنانا چاہتے تھے تو دوسری طرف ایم اسلم جیسے حساس و مذہبی فن کار اسلام کی آفاقی کے ذریعے اُن کی اصلاح کے متمنی تھے یعنی مقصد دونوں کا ایک ہی تھا۔''[۲]

اس بحث کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایم۔ اسلم نے تاریخی ناول نگاری کے فن کو شرر سے بہتر سمجھا اور اپنے عصری تقاضوں کے مطابق اسے برتنے کی کوشش بھی کی تاریخی سقم کو دور کرنے کے لیے انھوں نے مرکب پلاٹ کے انداز کو اختیار کیا جس کی بدولت تاریخ میں تصرف کرنے کے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے گئے پلاٹ کے فنی تقاضوں سے واقف تھے اس لیے ایک ڈور تاریخی واقعات کی چلتی ہے جبکہ تخیلاتی واقعات ذرا فاصلے پر رہتے ہیں ان کے ملاپ کے لیے ماحول کو سازگار کرنے کی اچھی کوشش کرتے ہیں کہانی کے اختتام، اس میں نیکی اور بدی کی جنگ کو نبھانے کی اچھی کوشش کرتے ہیں ان کا مقصد انسانی جذبات سے کام لینے کے لیے لگن، عزم، اخلاق، حوصلہ اور مذہب سے گہری وابستگی پیدا کرنا ہے اگر انہیں ناول نگار سے ہٹ کر اسلام سے محبت کرنے والا، مسلمانوں کا بھی خواہ، مشرقی روایات کا علمبردار اور اپنی اعلیٰ اقدار کا دلدادہ تسلیم کیا جائے اور اس عہد کو نظر میں رکھا جائے کہ جب ان کا تخلیقی ادب قارئین کے دل محظوظ کر رہا تھا تو اردو کے ادیبوں کی صف میں انہیں بلند مقام دیا جا سکتا ہے۔

نسیم حجازی کے ایک اور ہم عصر رئیس احمد جعفری ہیں اُن میں اور نسیم حجازی میں قدر مشترک ہے کہ دونوں صحافی بھی ہیں البتہ جعفری صاحب دیگر کئی اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے مگر جو شہرت تاریخی ناول نگاری میں حاصل کی وہ کسی اور صنف میں حاصل نہ کر سکے انہوں نے بعض ناولوں کے تراجم کیے اور بے شمار ناول خود بھی لکھے زود نویسی نے موضوع پر گرفت اور فنی اعتبار کو پروان چڑھنے کا موقع ہی نہ دیا بعض اوقات تو محض ایک ہفتے میں ناول مکمل کر لیتے تھے اُن کے قارئین کا حلقہ اس قدر وسیع تھا کہ جیسے ہی طباعت کے مرحلے سے ناول بازار میں آتا لوگوں کی نظروں کے سامنے ہوتا اس کثرت نویسی نے انہیں یہ سوچنے کا موقع ہی فراہم نہ کیا کہ وہ اپنے پیش رو سے استفادہ کرتے ہوئے مروجہ تنقیدی نظریات کے مطابق تاریخی ناول نگاری کو فروغ دے سکتے عرب سے لے کر وسط ایشیا کے تاتاریوں کی داستان ہو یا اسپین کے عروج و زوال کا قصہ یا پھر برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت کا مدوجزر تاریخی ناول نگاروں کے لیے موضوعات بکھرے پڑے ہیں۔ ضرورت سلیقے کی ہے کہ انہیں تمام تر زمانی اور جغرافیائی احتیاجوں کے ساتھ اس طرح

---

[۱] داستان سے افسانے تک، وقار عظیم، ص ۱۶۷۔

[۲] آزادی کے بعد اردو ناول، ڈاکٹر ممتاز احمد خان، ص ۱۰۱

زندہ و جاوید کیا جائے کہ قاری قصہ پارینہ کو اپنی نگاہوں کے سامنے گھومتا پھرتا دیکھ سکے تخیلاتی کرداروں کا حسین امتزاج، پلاٹ کی مضبوط تیاری، کرداروں کا موضوع کے مطابق ہونا، مکالموں کے رتبے اور حالات کے مطابق ادائیگی، منظر نگاری میں حقیقت کا گماں ایسے عناصر ہیں جو ناول نگاری کو بام عروج تک پہنچا سکتے ہیں مگر افسوس رئیس احمد جعفری نے تاریخی موضوعات کے ساتھ انہیں ناول کے قالب میں ڈھالتے ہوئے انصاف ہی نہ کیا بلکہ بعض مواقع پر وہ اس کا خون کر گئے مقبولیت اور شہرت ادب میں مقام متعین کرنے کا پیمانہ نہیں خود انسانی اوصاف کو بھی معیار نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ جعفری صاحب کا ادبی سرمایہ بیش بہا ہے ان کی عالمانہ و فاضلانہ شخصیت سے بھی انکار نہیں مگر ان کے تخلیقی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ''بالاکوٹ''، ''سومنات''، ''علاؤ الدین خلجی'' جیسے موضوعات کو بھی نہ نبھا سکے حالانکہ ان کا تعلق برصغیر کے قریب ترین ماضی سے تھا۔ واقعات تاریخ کے صفحات پر موجود تھے مشاہدے کی ضرورت تھی جو ان موضوعات کو مزین اور بہترین بنا سکتی تھی ساتھ ہی تخیل کی کارفرمائی ان معمولی موضوعات کو ادبی شاہکار بنانے میں معاون ہو سکتی تھی برصغیر سے باہر کے موضوعات کا جائزہ لیں تو ''شکست صلیب'' کی کہانی تاریخ میں رومان کی اس قدر آمیزش سے پُر ہے کہ تاریخی حقائق پس پردہ چلے گئے ہیں تو دوسری طرف ''فاتح خیبر'' میں تاریخی حقائق کو اتنی احتیاط سے پیش کیا گیا ہے کہ ناول کہنے کے بجائے تاریخ کہنے کو جی چاہتا ہے اُن کے اکثر ناولوں میں پلاٹ کی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا نہ ہی تجسس اور انہاک موجود ہے اور پھر ربط و تسلسل کی کمی نے ایک سوالیہ نشان لگا دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے:

''ان کے ناولوں میں پلاٹ کی یکسانیت اور رومانی و تاریخی واقعات میں عدم اتحاد اور انتشار ان کے ناولوں میں داخلی ترتیب و تنظیم قائم نہیں ہونے دیتے۔ رئیس جعفری تاریخی واقعات بیان کرتے کرتے اچانک رومانی واقعات بیان کرنے لگتے ہیں جس سے کہانی کا تسلسل ایک جھٹکے سے ٹوٹ جاتا ہے اگر وہ تاریخی اور رومانی واقعات کو ایک کمزور سے تعلق ہی سے مربوط کر دیتے تو اس سے ان کے ناول پلاٹ کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہو سکتے تھے رئیس جعفری کے ناولوں کے پلاٹ کو دوسرا نقصان طوالتِ بیان سے پہنچتا ہے وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی اس قدر پھیلا کر لکھتے ہیں کہ واقعات پر ان کی گرفت کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس طوالت بیان کی بنا پر ان کے ناولوں میں پلاٹ اور بھی ڈھیلا پڑ جاتا ہے واقعات میں جو انتشار پیدا ہوتا ہے وہ ان کے پلاٹ کو از حد نقصان پہنچاتا ہے۔ رئیس جعفری کہانی بیان کرتے کرتے کئی ابواب خالص تاریخی واقعات کے لکھ جاتے ہیں۔ پھر اچانک یہ سلسلہ منقطع کر کے رومانی واقعات لکھنے لگتے ہیں۔ اس طرح کہانی اور تاریخی واقعات کے درمیان ایک فاصلہ حائل ہو جاتا ہے۔''[1]

اسی پہلو کو مزید وضاحت کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں:

''رئیس جعفری اپنے ناولوں کے پلاٹ کو مختلف ابواب میں تقسیم کرتے اور ہر باب کا عنوان قائم کرتے ہیں لیکن آغاز سے انجام تک کے مراحل میں ربط قائم رکھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ کہیں تاریخ قصہ بن جاتی ہے اور کہیں قصہ تاریخ میں کھو جاتا ہے۔''[2]

---

[1] اردو میں تاریخی ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۶۵۳۔

[2] ایضاً، ص ۶۵۲۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے موضوعات پر رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں رقم طراز ہیں:

''جہاں تک تاریخی شخصیتوں کا تعلق ہے رئیس احمد جعفری نے ان کی مٹی پلید کر دی ہے۔ تاریخ کی باوقار ہستیوں کو انتہائی جذباتی اور سطحی بنا دیا ہے۔''[۱]

اس سے ملتی جلتی رائے وقار عظیم نے دی ہے جس کے مطابق:

''ان کے (رئیس احمد جعفری) تاریخی ناولوں میں محبت کے دلکش مناظر کی کثرت، ان مناظر میں کرداروں کی منطقی اور رواں گفتگو اور مجموعی حیثیت سے زبان کی صفائی ایسی چیزیں ہیں جو ہر طرح کے پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہیں لیکن ان کی تاریخی ناول نگاری کی سطح کہیں کہیں بہ مشکل صرف شرر کی نچلی سطح تک پہنچی ہے یہاں تک کہ یہ بات ان کے معروف تاریخی ناول بالا کوٹ میں بھی موجود ہے جو بعض اوقات تاریخی سے زیادہ محض عشقیہ معلوم ہونے لگتا ہے۔''[۲]

ان خامیوں کے باوجود ان کی نثر سادہ، آسان اور عام فہم ہوتی ہے جسے محاوروں کے استعمال سے شستہ بناتے ہیں عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال کر کے ندوۃ العلماء سے فارغ التحصیل اصحاب کی روایت کو زندہ کرتے ہیں۔ اسی ادارے کے دیگر نثر نگاروں کے اسلوب کی خصوصیت کی طرح رئیس صاحب کے یہاں فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ جامعیت بھی نظر آتی ہے مگر اشعار کے جا و بیجا استعمال سے مکالمہ نگاری کے فن کو متاثر کرتے ہیں تو دوسری طرف لازمی جزئیات سے دامن چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً میدان جنگ کے مناظر میں فوجوں کی تعداد ہتھیار، طریقہ کار وغیرہ کی تفصیل میں نہیں جاتے جس کی وجہ سے قاری کو تشنگی محسوس ہوتی ہے رئیس احمد جعفری نے اُردو کے تاریخی ناولوں کے ذخیرے میں تو خاصا اضافہ کیا مگر معیار کو عبدالحلیم شرر کے ابتدائی مقام تک بھی نہ لے جا سکے اس کی وجہ قارئین کی جانب سے ملنے والا خراج تحسین اور ناشرین کے مطالبے رہے ہوں گے۔

رشید اختر ندوی بھی نسیم حجازی کے ہم عصروں میں ایک اہم نام کی حیثیت سے شامل ہیں انہیں بھی قارئین کے بڑے حلقے میں شہرت و مقبولیت حاصل رہی حالانکہ موضوعات کے اعتبار سے اسی پرانی ڈگر کے راہی معلوم ہوتے ہیں جس کا نقطۂ آغاز عبدالحلیم شرر کہے جا سکتے ہیں کیونکہ موضوعات کے انتخاب میں رئیس احمد جعفری کے ''شکست صلیب'' اور شرر کے ''ملک العزیز ورجینا'' کے تاریخی عہد کو منتخب کر کے یروشلم کے نام سے ناول لکھا تو دوسری طرف نسیم حجازی کے ناول ''معظم علی'' اور ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' کے موضوع کے مطابق ''حیدر علی'' اور ''سرنگا پٹم'' کے نام سے لکھے۔ ایسے ہی بہت سے موضوعات جو پیش روؤں اور معاصرین نے اختیار کیے تھے ان کے تخلیقی ادب کا حوالہ رہے رشید اختر ندوی نے تاریخی موضوعات کے انتخاب میں خاصی باریک بینی کا مظاہرہ کیا یہی وجہ ہے کہ خامیوں کا پلڑا خاصا ہلکا رہ گیا ہے تخیل کو برتنے کا سلیقہ بھی ایم۔ اسلم اور رئیس احمد جعفری کے مقابلے میں خاصا بہتر ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے پلاٹ دلچسپی اور ربط و تسلسل کے ساتھ قاری کے انہماک کو برقرار رکھنے کا باعث بنتے ہیں وہ خیر و شر اور تصادم کی کیفیت کو کئی بار ابھارتے

۱۔ اُردو میں تاریخی ناول نگاری کا ارتقاء، ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں، ص ۱۷۷۔

۲۔ داستان سے افسانے تک، وقار عظیم، ص ۱۶۷، ۱۶۸۔

اور دباتے ہیں جو قاری کو محظوظ کرنے اور تشنگی برقرار رکھنے کا موجب ہوتا ہے۔ مختلف کہانیاں جس طرح شروع ہوتی ہیں اسی طرح برقرار رہتے ہوئے اپنے انجام سے دوچار ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر سہیل بخاری معترض ہیں کہ:

''مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ رشید اختر ندوی کے پلاٹ میں اکتا دینے والی یکسانی ملتی ہے۔ وہ کردار نگاری کے گر سے واقف نہیں ہیں ان کے ناول پر مریضانہ رومانیت اور سستی جنس پرستی چھائی ہوئی ہے۔''[۱]

لیکن ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ بخاری صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رشید اختر کے ناولوں کے پلاٹ ترتیب و تنظیم اور ربط و ضبط کی عمدہ مثال ہیں کوئی پلاٹ ڈھیلا ڈھالا نہیں ہوتا۔ واقعات میں وہ ایسا اتار چڑھاؤ پیدا کرتے ہیں کہ عام قاری بھی اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوتا ہے۔''[۲]

ان آراء کو سامنے رکھ کر ہم کسی ایک کی رائے کو دوسرے پر فوقیت دینے کے بجائے یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ تاریخی ناول نگاروں پر لگنے والا الزام کہ وہ تاریخ اور ناول کے فن کو ملحوظ نہیں رکھتے اس قدر نمایاں ہے کہ اکثر ناقدین ناول پڑھے بغیر ہی حکم صادر کر دیتے ہیں حالانکہ ایم۔ اسلم کے ناول ''شکست صلیب'' اور رشید صاحب کے ناول ''یروشلم'' کے موضوعات اور عہد ایک ہونے کے باوجود ناولوں کی قدر میں خاصا فرق ہے رشید اختر ندوی نے تاریخی حقائق اور ناول کے فنی تقاضوں، پلاٹ نگاری اور اس کے ربط و تسلسل میں اس قدر احتیاط سے کام لیا ہے کہ تاریخی ناول نگاری کا فن بلند مرتبے کی طرف گامزن نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی پلاٹ کو ابھارنے کے لئے کرداروں سے بہتر طور پر کام لیا ہے اُن کے اس انداز کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ لکھتے ہیں:

''ان کے تاریخی کردار بھی انسانی خوبیوں سے متصف ہیں۔ وہ محبت بھی کرتے ہیں۔ جنگیں بھی لڑتے ہیں اور ان سے لغزشیں بھی سرزد ہوتی ہیں۔ ان کے اندر خیر و شر کی جنگ بھی ہوتی ہے۔ وہ کہیں بھی مثالی یا ٹائپ کردار نہیں پیش کرتے ہر ناول میں ان کے کردار انفرادیت کے حامل ہوتے ہیں۔''[۳]

اسی وجہ سے ان کی کردار نگاری خاصی مضبوط اور جاندار ہے وہ تاریخی کرداروں کو محدود تعارف کے ساتھ ابھارتے مگر جلد ہی ان کا بھرپور تعارف رکھ کر قاری کی تشنگی کو دور کر دیتے ہیں وہ ان کرداروں کی ذہنی و نفسیاتی کشمکش اور داخلی و خارجی جذبات کو تمام تر انسانی اوصاف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ انہیں انسانی فطرت اور شعور حیات کو بہتر طور پر سمجھنے کا ادراک تھا اس لیے انہوں نے انسانی فطرت کے بڑے حسین مرقعے پیش کئے ہیں وہ انسان کے ذہنی تغیر کے مطابق کبھی خیر اور کبھی شر کے پیش نظر کرداروں کو استعمال کرتے ہیں انہیں پتھر کا انسان بنا کر نہیں پیش کرتے کہ ایسا لگے کہ انگلی پکڑ کر چلایا جا رہا ہے۔ پھر ان کے کردار واعظ بھی نہیں ہوتے کہ لمبی لمبی تقریریں کریں یا فن خطابت کا شائبہ ہونے لگے وہ چھوٹے مگر مؤثر مکالموں سے کام لیتے ہیں رشید اختر ندوی کے یہاں مکالمہ

۱۔ اردو ناول نگاری: سہیل بخاری، ص ۳۰۶۔

۲۔ اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۶۴۰۔

۳۔ ایضاً، ص ۶۴۱۔

نگاری کا فن معاشرے اور تہذیب کے فرق کو سمجھنے میں بھی مددگار ہوتا ہے وہ مسلم اور غیر مسلم کو اس کی گفتگو اور انداز نشست و برخاست اور معاشرتی رویوں سے ممیز کراتے ہیں۔ زبان و بیان کے استعمال میں الفاظ کی تکرار اسے بوجھل بنا دیتی ہے۔

رشید اختر ندوی منظر نگاری کو بہتر طور پر برتنے اور قاری کو محسوس اور مشاہداتی طور پر موقع کی تصویر کشی میں کامیاب نظر آتے ہیں وہ جزئیات کا سہارا لے کر موقع محل کی تصویر لفظوں کی صورت میں کاغذ پر اتارنے کا فن جانتے ہیں خاص طور پر ''حیدر علی'' اور ''سرنگا پٹم'' میں ان کی منظر نگاری انتہائی کامیاب محسوس ہوتی ہے اس کی ایک وجہ علاقے سے واقفیت اور ماضی قریب کی تاریخ بھی ہو سکتی ہے۔ الفاظ کے استعمال میں سادہ زبان اور سامنے کی تشبیہات کا سہارا لیتے ہیں جو ان کے ناولوں کی ادبیت کو بڑھانے کا باعث بنتا ہے۔

ویسے تو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے تاریخی ناول نگاری کا ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ شروع ہوا جس میں قابل ذکر اصحاب کا تذکرہ ہم اپنے اس مضمون میں کر چکے ہیں اس کے علاوہ بھی بے شمار ناول نگار ایسے ہیں جو تاریخی ناول نگاری کے زمرے میں آتے ہیں مگر ان بے شمار اصحاب نے سستی شہرت اور عوام کے مروجہ مذاق کے پیش نظر اس صنف میں طبع آزمائی کی البتہ چند ایسے نام بھی لیے جا سکتے ہیں جو تاریخی پس منظر یا تاریخی احساس کے ساتھ ناول نگاری کر چکے ہیں ان میں اہم ترین نام ڈاکٹر احسن فاروقی کا ہے جن کا ناول ''سنگم'' تقریباً نو سو سالہ تاریخی واقعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے لیکن ہم اسے تاریخی ناول اس لئے قرار نہیں دیتے کہ تاریخی ناول کی تعریف کے مطابق بادشاہوں اور ناموروں کے قصے تمام تر تہذیبی و معاشرتی حقیقتوں کے ساتھ زندہ و جاوید ہوں ''سنگم'' میں محض تاریخی عہد کو ایک ڈاکومنٹری کی طرح پیش کیا گیا ہے جن دو تخیلاتی کرداروں کے گرد کہانی گھومتی ہے وہ محدود زمانے کے عکاس تو ہیں لیکن تاریخی ناول نگاری کی ضرورتوں پر پورا نہیں اترتے البتہ ہر ناول کی طرح ڈاکٹر فاروقی اپنی شخصیت، جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرنے کے لئے اس تاریخی پس منظر کا سہارا لیتے ہیں جبھی تو ڈاکٹر عبدالسلام کا خیال ہے کہ:

''سنگم'' کا مقصد تاریخ بیان کرنا تھا۔ اس لئے اس میں انہوں نے غیر شخصی انداز برتا ہے۔ صرف اس ناول میں وہ نمایاں نہیں ہوئے ہیں البتہ آخری باب کا مسلم جس قسم کے فرسٹریشن میں مبتلا ہوتا ہے اس میں کسی حد تک ڈاکٹر فاروقی کی جھلک نظر آتی ہے۔''[۱]

اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خان رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر احسن فاروقی نے چھوٹے کینوس پر اتنی بڑی تاریخ کو تہہ داری کے ساتھ یعنی رمزیہ انداز سے پیش کر کے اپنے ایسے عملی اسلوب کا مظاہرہ کیا ہے۔ جو وضاحتوں اور تشریحات سے مملو ہونے کے باوجود دلچسپ ہے اور اول صفحے سے آخری صفحے تک قاری کی انگلی پکڑ کر لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے جو کوئی معمولی بات نہیں۔''[۲]

یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ کی یہ رائے مستند معلوم ہوتی ہے:

---

[۱] اردو ناول بیسویں صدی میں (پی۔ایچ۔ڈی۔کا مقالہ) از پروفیسر عبدالسلام ص ۵۱۳۔

[۲] آزادی کے بعد اردو ناول؛ ڈاکٹر ممتاز احمد خان ص ۸۵،۸۶۔

''سنگم'' روایتی تاریخی ناولوں کی طرح تاریخ پیش نہیں کرتا۔''[۱]

تقریباً ایسے ہی تاریخی پس منظر کو پیش کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر نے ''آگ کا دریا'' قلمبند کیا جس میں ہندوستان کی طویل عرصے پر محیط تاریخ کو منظر بہ منظر قارئین کی دلچسپی کے لئے مرتب کیا اس کے انداز پر رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ لکھتے ہیں:

''قراۃ العین حیدر کے ناول کا مرکزی موضوع وقت ہے اور انہوں نے تین ہزار سالہ تاریخ کو اس ناول کے پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔''[۲]

اسی لئے ڈاکٹر انور سدید رقمطراز ہیں:

''آگ کا دریا'' ان کا ایک ایسا نادر تجربہ تھا جس میں گم شدہ تشخص کی بازیافت کے لیے چار ہزار سالہ قدیم ماضی میں تخلیقی سفر کیا گیا۔''[۳]

تقریباً اس جیسی رائے ڈاکٹر عبدالسلام ان الفاظ میں دیتے ہیں:

''آگ کا دریا'' بظاہر بہت پھیلا ہوا نظر آتا ہے مگر اس کا بھی خاص حصہ اس کا آخری حصہ ہی ہے اور ہندوستان کی قدیم تاریخ اس کا پس منظر نظر آنے لگتی ہے۔''[۴]

اس ناول کے بارے میں ایک رائے ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے ان الفاظ میں رقم کی ہے:

''قراۃ العین حیدر کے یہاں تاریخ کا وہ بیان یا اس کو وہ برتاؤ Treatment نہیں جو عبدالحلیم شرر، ایم اسلم، رئیس احمد جعفری، نسیم حجازی وغیرہ کا ہے۔ ان کے کردار تاریخ کا حصہ ہیں وہ گوتم بدھ کے زمانے سے سو سال بعد کے عہد سے شروع ہو کر برصغیر کی تقسیم کے پہلے عشرے تک کی سیاسی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی تاریخ کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کی یہاں مجرائیت پائی جاتی ہے جس میں سے تاریخ کا خود بخود ایک تصور ابھرتا ہے جسے ہم تاریخیت کہہ سکتے ہیں۔''[۵]

اس سلسلے میں ہمارا خیال ہے کہ ان ناولوں کو تاریخی نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان کے موضوع کی بنا پر تلمیحات کے زمرے میں شامل کرنا چاہیے کیونکہ ان کے مطالعے سے یہی انداز جھلکتا ہے کہ جس طرح شاعری میں کسی تاریخی واقعہ کا اشارہ کر کے تلمیح کی سند کو استعمال کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح ان ناولوں میں موجود اشارے تاریخی شخصیات اور ادوار کی یاد دلاتے ہیں لیکن اس کے مقابلے میں خدیجہ مستور کا ناول آنگن تلمیحاتی اشاروں اور معاشرتی واقعات کی آمیزش کے ساتھ عصری ناول کہا جا سکتا ہے اس ناول کی ہیئت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم فرخی رقمطراز ہیں:

۱۔ اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۵۷۸۔

۲۔ اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۵۷۸۔

۳۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ: ڈاکٹر انور سدید، ص ۵۷۰۔

۴۔ اردو ناول بیسویں صدی میں: پروفیسر عبدالسلام، ص ۵۶۱۔

۵۔ آزادی کے بعد اردو ناول: ڈاکٹر ممتاز احمد خان، ص ۲۱۹۔

''پہلے افراد یادوں کی جنت میں زندہ رہتے تھے۔ ہماری نسل یادوں کی جنت پر یقین نہیں رکھتی اس لیے ہم نے یادوں کو فراموش کر دیا ہے لیکن ہم نئے خواب بھی نہیں دیکھتے۔۔۔۔۔۔ پرانی یادیں بھی نہیں نئے خواب بھی نہیں تو پھر ہمارا کیا بنے گا۔ اس وقت ہم خلاء میں معلق ہیں روایت کو ہم نے دھتکار دیا۔ بغاوت کی ہمت نہیں۔''[۱]

یہ ناول برصغیر کی تیس سالہ تاریخ کا عکاس ہے بالکل اسی جیسا ناول عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں'' ہے اس میں بھی تلمیحاتی انداز اختیار کرتے ہوئے تاریخی واقعات پیش کیے گئے ہیں جس کے بارے میں ڈاکٹر نزہت سمیع الزمان لکھتی ہیں:

''اس ناول میں سیاسی تاریخ کا پرتو بھی ہے اور معاشرت کی تصویر کشی بھی دہلی کا فیشن ایبل طبقہ بھی نظر آتا ہے اور دہلی کے قریب کے ایک گاؤں کے کسان بھی۔ اس ناول میں حقیقت پرستوں کی سی حقیقت پسندی بھی ہے اور وجودیت پرستوں کا سا تنہائی اور بے چارگی کا احساس بھی۔''[۲]

مذکورہ دونوں ناولوں کا موازنہ نسیم حجازی کے ناول ''خاک اور خون'' سے کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کا عہد اور واقعات کی نوعیت ایک جیسی ہے البتہ فسادات کے موضوع پر نسیم حجازی نے جس قدر وسیع النظری سے مشاہداتی واقعات پیش کیے ہیں خدیجہ مستور تو اس سے صاف دامن چھڑا گئیں وہ اپنے کرداروں کو بذریعہ ہوائی جہاز سفر کروا کے مشرقی پنجاب کے خونچکاں واقعات سے بچا کر گزر گئیں البتہ عبداللہ حسین نے اپنے کرداروں کو ہجرت کے تجربے سے دوچار ہوتے ہوئے دکھایا ہے یوں کچھ واقعات شامل ہو گئے ہیں جبکہ نسیم حجازی کے ناول کا پلاٹ پنجاب کے اس متنازعہ علاقے کے گرد گھومتا ہے جسکی پاکستان میں شمولیت ان خون ریز واقعات کو روکنے اور کشمیر کی متنازع حیثیت کو بچا سکتے تھے اگر نسیم حجازی کشمیر سے جذباتی وابستگی کی رو میں بہتے ہوئے ''اے قوم'' جیسا طویل مضمون شامل نہ کرتے تو ناول انتہائی دلچسپ اور اثر انگیز ثابت ہوتا مگر اس خامی کے باوجود ''خاک اور خون'' اپنے پلاٹ کردار اور منظر نگاری کے اعتبار سے آنگن اور اداس نسلیں سے بہت بہتر اور موثر ہے۔

نسیم حجازی اپنے معاصر تاریخی ناول نگاروں ایم۔ اسلم۔ رئیس احمد جعفری اور رشید اختر ندوی کے مقابلے میں منفرد اسلوب اور تاریخی ناول نگاری کے فنی تقاضوں پر خاصی حد تک ثابت قدم رہنے کی وجہ سے اپنی اہمیت منواتے ہیں اُن کے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید قمطراز ہیں:

''نسیم حجازی اردو کے ممتاز، نامور اور مقبول مصنف تھے لیکن ان کے نقاد نے ان کو ایم اسلم، صادق صدیقی سردھنوی، رئیس احمد جعفری کے ساتھ جگہ دی اور ان کی انفرادیت کا حقیقی تشخص نہ کیا دوسری طرف ترقی پسند نقادوں نے ان کو رجعت پسند قرار دیا اور ان کا نام حذف کر دیا۔''[۳]

۱۔ ''آنگن'' کی دنیا مشمولہ فنون: ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۱۱۵۔

۲۔ اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء: ڈاکٹر نزہت سمیع الزمان، ص ۲۱۳۔

۳۔ نسیم حجازی۔ اسلامی تاریخ کا شیدائی مشمولہ روزنامہ جسارت: ڈاکٹر انور سدید، ص ۵۔

ادبی تاریخ سے ڈاکٹر صاحب اپنے اس مضمون میں مزید لکھتے ہیں:

''نسیم حجازی نے آزادی کا اثبات کیا اور اس تجربے کو جس خوش اسلوبی سے پروان چڑھایا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہی اس فن کے بانی تھے اور اب وہی اس کے منتہی ہیں۔ وجہ یہ کہ اب ان جیسا کوئی ناول نگار منظر ادب پر نظر نہیں آتا جس کا ایمان اسلامی قدروں پر ہو، جو مسلمانوں کے تابندہ ماضی کا شناسا ہو" ان کے کارناموں پر ایقان رکھتا ہو اور ان کو تخلیقی شان سے ناول کی بنت میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو''۔[۱]

وقار عظیم نسیم حجازی کا موازنہ ان کے معاصرین سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایم اسلم اور رئیس احمد جعفری کے تاریخی ناول عوام پسندی کے نمایاں میلان کے باوجود اتنے مقبول نہیں ہوئے جتنے نسیم حجازی کے یہ بات محض اتفاقی نہیں اس پسندیدگی اور مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ نسیم حجازی نے اپنے ناولوں کے لئے تاریخ اسلام کے صرف ایسے واقعات منتخب کیے ہیں جو کسی نہ کسی طرح سبق آموز ہونے کے علاوہ ایسے امکانات کے حامل ہیں جن سے قصے میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ پھر ناول کی ترتیب و تہذیب میں انھوں نے غور و فکر کی اہمیت کو پس پشت نہیں ڈالا اور اس لیے ان کے ناولوں میں آغاز، عروج، ارتقاء اور انجام کا وہ رشتہ موجود ہے جس سے کہانی پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ان چیزوں کے علاوہ عبارت اور مکالموں کی ڈرامائی ادبیت، کرداروں کے واضح اور مؤثر نقوش ان ناولوں کی دوسری خصوصیات ہیں''۔[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی انہیں اردو کا بہترین تاریخی ناول نگار قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''انہوں نے اسلام کی عظمتِ رفتہ کو اپنے قلمی جہاد سے معاشرے کے عام انسان کے شعور کا حصہ ایسی سحر انگیزی کے ساتھ بنایا ہے کہ مولانا عبدالحلیم شرر کے بعد دوسرا ناول نگار اس سطح پر نظر نہیں آتا''۔[۳]

تاریخی ناول نگاری کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر مرزا محمد منور نے لکھا ہے:

''تاریخ دلچسپی سے زیادہ حقیقت نگاری کا تقاضا کرتی ہے۔ قدرتی امر ہے کہ تاریخ اور ناول نگاری کو یکجا کرنا نہایت مشکل کام ہے یا تو ناول کی روح مجروح ہو جائے گی یا تاریخ مسخ ہو جائے گی کیونکہ افسانویت اور حقیقت نگاری کا خوشنما لگنا، عمل میں لانا جان جوکھوں کا کام ہے۔ نسیم حجازی اس مشکل کو سمجھتے تھے۔ انہوں نے تاریخ کے بڑے بڑے واقعات اور تاریخ کے اہم رجال کو تاریخی آئینے میں دیکھا اور اس ضمن میں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہ کی۔[۴]

نسیم حجازی کی انفرادیت اور فنی اعتبار سے تاریخی ناول نگاری میں بلند مقام کو متعین کرتے ہوئے دیگر ناول نگاروں سے ڈاکٹر محمد یوسف

---

[۱] نسیم حجازی۔ اسلامی تاریخ کا شیدائی مشمولہ روزنامہ جسارت، ڈاکٹر انور سدید، ص ۵۔

[۲] داستان سے افسانے تک، وقار عظیم، ص ۱۶۸۔

[۳] نسیم حجازی مشمولہ سیارہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۱۹۸۔

[۴] نسیم حجازی کی فتوحات مشمولہ سیارہ، پروفیسر مرزا محمد منور، ص ۲۰۲، ۲۰۳۔

عباسی نے موازنہ اس طرح کیا ہے:

''نسیم حجازی کے ناول کی امتیازی خصوصیت ان میں جذبۂ حریت و استقامت ہے۔ ان کے کردار حزن پسندی اور انفعالیت کا شکار نہیں۔ وہ فعال اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ راشد الخیری کے تاریخی ناول تکنیکی اعتبار سے کمزور اور حزن و یاس کے مارے ہوئے ہیں۔ عبدالحلیم شرر کا پسندیدہ موضوع صلیبی جنگوں کا رزمیہ دور تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے والٹر اسکاٹ کے جواب میں ناول لکھے۔ والٹر اسکاٹ نے طلسمان (Talisman) میں صلیبی جنگوں میں اسلام اور مسلمانوں کا مذاق اڑایا تھا جس کے خلاف بنگال کے مشہور لیڈر نواب بہادر عبداللطیف نے غالباً ۱۸۶۶ء میں حکومت بنگال سے احتجاج بھی کیا تھا اسی طرح ''فردوس بریں'' پر والٹر اسکاٹ کے ناول کی چھاپ محسوس ہوتی ہے۔ نسیم حجازی کسی مغربی ناول نگار سے متاثر نہیں انہوں نے اپنی راہ خود تلاش کی ہے۔ اپنی منزل خود مقرر کی ہے۔ ان کی تخلیقی عظمت سے اُردو تاریخی ناول اپنے نقطۂ معراج تک پہنچا ہے۔''[۱]

نسیم حجازی کے ناولوں کے مقصد اور عوام الناس میں ان کی مقبولیت کا تذکرہ نعیم صدیقی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''نسیم حجازی نے (اور ایک حد تک ایم۔ اسلم نے بھی) محض اپنے قلم اور اپنے لفظ کی قوت سے اس دور کے عظیم ترین ادبی تعصب کو شکست دی ہے اور ایسی دی ہے کہ بس ہر ناول کی اشاعت پر کشتوں کے پشتے لگ گئے ہیں نسیم حجازی کی مخلصانہ نگارشات کو اس کی قوم کے عوام نے آگے بڑھ کر سینوں سے لگا لیا۔ فوج کے بیشتر نوجوان نسیم حجازی کے ناولوں سے اپنے شاندار ماضی کی زندگی افروز روایات اخذ کرتے ہیں اور جذبۂ شہادت کے لئے بے خود ہو کر موت کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تعلیم گاہوں کے کثیر التعداد نوجوان اس کے قلم کے قدر شناس ہیں، بے شمار طالبات (مڈل اسکولوں سے لے کر ایم۔ اے تک) نسیم حجازی کو پڑھ کر اسلام کے پیغام اور اس کی قوت سے آشنائی حاصل کرتی ہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس ملک وقوم میں اگر اسلامی جہاد اور اسلامی نظام اور اسلامی تحریک کے چرچے زور پر ہیں تو اس حالت کو پیدا کرنے میں نسیم حجازی کا بڑا حصہ ہے۔''[۲]

اسی طرح کے خیالات کا اظہار ڈاکٹر عبدالمغنی نے اپنے مضمون میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''نسیم حجازی نے اول روز سے ایک معتبر مورخ کا کردار اختیار کیا اور تفکر کے ساتھ ساتھ فن کاری کو بھی انہوں نے مطمع نظر بنایا۔ عقیدت میں وہ کسی سے کم نہیں اور جذبے بھی ان کے زبردست ہیں، مگر ایک تو ان کا ذہن بہت منضبط ہے دوسرے فن پر ان کو پوری قدرت ہے۔ وہ ناول کی تکنیک سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن اپنے موضوع کی نوعیت اور مقصد کی عظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اپنی اختیار کی ہوئی صنفِ ادب کی رومانیت کو حقیقت کے سانچے میں ڈھالتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقت ہی رومان انگیز بن جاتی ہے۔ اس طرح حجازی کے فن کا طلسم، اقبال کی شاعری کے مانند، ان کی فکر کا قائم کیا ہوا ہے، اس لئے کہ یہ فکر اخلاقیات کی بہترین قدروں کے ساتھ ساتھ جمالیات کے بھی حسین ترین عناصر پر مشتمل ہے۔ بات یہ ہے کہ حجازی نے ماضی کا تصور غالب کے

۱۔ نسیم حجازی۔۔۔ ایک زندہ روایت مشمولہ سیارہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۲۱۵۔

۲۔ نسیم حجازی مشمولہ سیارہ، نعیم صدیقی، ص ۲۲۲۔

لفظوں میں ''خیالِ حسن'' کی طرح کیا ہے جس نے ''حسنِ عمل'' کی صورت پیدا کی ہے۔ مواد و ہیئت کی اس فطری ہم آہنگی نے زبان و بیان کے اسلوب پر بھی یہ اثر ڈالا ہے کہ رنگ کی شوخی آہنگ کی سنجیدگی کے ساتھ مدغم ہو گئی ہے اور اس ادغام سے ایک ایسی نثر ابھری ہے جس میں متانت اور لطافت کے باوجود بشاشت اور شوکت بھی ہے۔ یہ وہی شانِ کلام ہے جو اقبال کی شاعری کا نشان ہے۔''[۱]

ڈاکٹر عبد المغنی نے نسیم حجازی کا موازنہ اردو کے اہم ناول نگاروں سے کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اُردو ناول نگاری میں نسیم حجازی کا نتیجہ خیز موازنہ صرف پریم چند اور قرۃ العین حیدر کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ تین ناول نگار ہیں جنہوں نے اپنا ایک نظامِ فن ترتیب دے کر اپنی افسانوی مخلوقات کی ایک نئی دنیا بسائی ہے اور ناول کی تکنیک کے لحاظ سے ان کی فن کاری بھی اعلیٰ درجے کی ہے، گرچہ ان کے موضوعات بھی مختلف ہیں اور اسالیب بھی۔ پریم چند تو ایک معاشرتی ناول نگار ہیں جب کہ قرۃ العین حیدر کا عمرانی مطالعہ نیم تاریخی، نیم فلسفیانی اور نیم صوفیانہ ہے۔ ان دونوں کے مقابلے میں نسیم حجازی خالص تاریخی ناول نگار ہیں، جن کے محرکات و مقاصد دینی اور اخلاقی ہیں۔ بہر حال اپنے پڑھنے والوں کے اجتماعی شعور کی پرورش تینوں عظیم فن کاروں کا مقصود ہے۔ ایک قسم کی مثالیت پسندی پریم چند نسیم حجازی کے درمیان مشترک ہے، اس فرق کے ساتھ کہ اول الذکر کا نصب العین قوم پرستی کی محدود تحریک ہے اور مطمع نظر اصلاحی ہے، جبکہ نسیم حجازی اسلام کے آفاقی نصب العین کے علمبردار ہیں اور اس کی روشنی میں ایک انقلاب کے نقیب قرۃ العین اور نسیم حجازی کے درمیان ماضی سے وابستگی ایک قدر مشترک ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ نسیم حجازی قرۃ العین حیدر کے برخلاف گزرے ہوئے زمانے کی شیریں یادوں سے آگے بڑھ کر حال و مستقبل کی تلخیوں اور امیدوں کا احساس بھی دلاتے ہیں، ایک شاندار ماضی کے نمونے پر ایک بہتر مستقبل کی تعمیر بھی چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے قوائے عمل کو مہمیز کرتے ہیں اس معاملے میں نسیم حجازی کے فن کا کارنامہ اُردو ادب میں وہی ہے جو اقبالؒ کی شاعری کا ہے، اگرچہ ان کی فن کاری تاریخی ناول نگاری تک محدود ہے اور قرۃ العین حیدر عمرانی سطح پر عمومی طور سے مشرق کی بازیافت کے لیے کوشاں ہیں۔''[۲]

محض تاریخی ناول نگاروں سے ان کا موازنہ مقصود ہو تو ان کی انفرادیت ڈاکٹر ایس۔ ایم زمان کی رائے میں کچھ یوں ہے:

''شررؔ اور دوسرے اسلامی تاریخی ناول لکھنے والوں کی طرح نسیم کی ناول نگاری پر بھی تنقید ہوئی ہے کہ ان کی کہانیاں حقیقت سے دور ایک ہی سانچے میں تراشے ہوئے کردار لیے ہوئے ہوتی ہیں اور لمبی جنگیں ناول کی کہانی میں غیر ضروری طوالت کا اضافہ کرتی ہیں لیکن ان کے وہ قارئین جو ان کے واعظانہ طرز تحریر سے نہ کبھی تھکتے ہیں نہ بور ہوتے ہیں نقادانِ ادب سے اتفاق نہیں کرتے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے ناولوں کی مانگ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ایڈیشن چھپ رہا ہے اور ان کے قارئین مارکیٹ میں ان کے ناول تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اس تنقید کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نقاد حضرات کی نظر سے وہ مقصد (مشن) اوجھل ہو جاتا ہے، جس کو سامنے رکھ کر نسیم حجازی نے یہ ناول لکھے ہیں وہ مسلم نوجوانوں کے سینوں میں دبی ہوئی اس چنگاری کو ہوا دے کر شعلہ بنانا چاہتے ہیں جس سے

۱۔ نسیم حجازی کا فن مشمولہ سیارہ، ص ۴۲۔
۲۔ نسیم حجازی کا فن مشمولہ سیارہ، ڈاکٹر عبد المغنی، ص ۴۹۔

اسلام کی نشاۃ ثانیہ ممکن ہوسکتی ہے ان کے ذہنوں میں وہ اسلام کی عظمت روشن کر دینا چاہتے ہیں جس سے ان کے دماغ سے احساس کمتری جاتا رہے اور وہ ایک بار پھر یہ سوچنے لگیں کہ وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں وہ ایک خدائے واحد پر ان کا یقین پختہ کر کے اپنی تقدیر خود لکھنے کی دعوت دیتے ہیں اور اس مقصد کے لئے انہیں بار بار ان کے اسلاف کے کارنامے یاد دلاتے ہیں اگر یہ بات چند لوگوں کے نزدیک ادب عالیہ کے خلاف جاتی ہے تو بھی نسیم حجازی اس پر بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔''[1]

ایسی ہی رائے ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ نے رقم کی ہے کہ:

''نسیم حجازی کو اپنے تمام ہمعصر ناول نگاروں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے بعض ناولوں کے چالیس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں بیشتر ناولوں کے غیر ملکی زبانوں میں تراجم ہوئے ہیں۔ مقبولیت اور فنی پختگی کے لحاظ سے ان کے ناول ہر عمر اور صنف کے قارئین کے پسندیدہ ناول رہے ہیں۔ نقادوں کی سخت تنقید کے باوجود ان کے ناول ہمیشہ زندہ رہیں گے۔''[2]

لیکن ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں تشکیک کے ساتھ نسیم حجازی کی اہمیت کو مانتے ہوئے لکھتی ہیں:

''رئیس احمد جعفری اور ایم۔ اسلم وغیرہ کے تاریخی ناول حسن وعشق کے سہارے اور نسیم حجازی کے ناول خطابت کے سبب سے اپنے زمانۂ تصنیف میں شرر کے ناولوں کی مانند ہی مقبولیت حاصل کر گئے۔ ایک وجہ اس کی اس زمانے میں اس طرح کے ناولوں کی کثرت ہوسکتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ حالات کے تقاضوں نے عوام کا رجحان ہی اس طرح کے ناولوں کی طرف مائل کر دیا تھا۔''[3]

یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر ممتاز احمد خان بھی نسیم حجازی کی اہمیت کے معترف نظر آتے ہیں البتہ ان کا انداز تہنیت اس طرح سے ہے:

''نسیم حجازی کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ شرر سے زیادہ معتبر ٹھہرائے گئے ہیں اگر ان کے لیے یہ طے بھی کر لیا جائے کہ ان کے ناولوں میں فنی نقائص ہیں تب بھی ایک خاص قسم کے یا ایک خاص ڈھب کے ناولوں کے حوالے سے تاریخ ادب اردو میں ان کا مقام مسلّم رہے گا۔''[4]

اتنی ساری آراء لکھنے کے بعد نسیم حجازی کی اہمیت اور ناول نگاری پر ان کے بلند مقام کے تعین میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہتی انہوں نے تاریخی حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کی معاشرتی اور سماجی حیثیت کو اپنے تخیلاتی کرداروں کے ساتھ اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ پلاٹ کے ربط وتسلسل میں کسی قسم کی کمی باقی نہیں رہتی۔ اس طرح وہ اپنے قاری کو متحیر کرنے اور منہمک رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں پلاٹ کی تنظیم وترتیب میں ان کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں کہ جب موضوع کی نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہانی کو پھیلاتے اور پھر سمیٹتے ہیں کہانی کو پھیلانے اور سمیٹنے کے عمل کو دلچسپ بنانے کے لیے جزئیات سے کام لیتے ہیں مگر ان

---

[1] نسیم حجازی کی ناول نگاری اور ''محمد بن قاسم'' کا عربی ترجمہ مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر ایس۔ ایم زمان، ص ۱۴۴، ۱۴۵۔

[2] اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۷۶۸۔

[3] اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء: ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں، ص ۱۲۵۔

[4] آزادی کے بعد اردو ناول: ڈاکٹر ممتاز احمد خان، ص ۱۵۸۔

جزئیات کو کہیں بھی فراموش نہیں کرتے کہ کسی کمی کا احساس ہو یا کہانی کا تسلسل ٹوٹ جائے بلکہ واقعات کے ربط کو لڑی میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح یکجا رکھتے ہیں ناول کا اختتام عام طور پر قاری کی ذہنی تسکین اور فکری احساس کو ابھارنے کا باعث ہوتا ہے چونکہ ان کے ناول مختلف زمانوں میں لکھے گئے اس لئے ان کی فکری سطح میں خاصا فرق نظر آتا ہے مثلاً قیام پاکستان سے قبل لکھے جانے والے ناولوں میں جذبۂ آزادی، حریت اور نظم وضبط برقرار رکھنے کی تلقین ہے مگر قیام پاکستان کے بعد فسادات کے موضوع پر ان کا نقطۂ نظر تقسیم سے پیدا ہونے والے مسائل کا ادراک کرانا اور مستقبل کے لئے راہوں کے تعین کا فکری شعور بیدار کرنا تھا جبکہ قیام پاکستان کے بعد جن تاریخی موضوعات کو اختیار کیا ان میں جذبۂ جہاد سے سرشار اُن ناموروں کا قصۂ پارینہ یاد دلانا تھا جو اپنوں کی سازشوں کا شکار ہوئے خاص طور پر ''معظم علی'' اور ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' کے ذریعے انہوں نے آستین کے سانپوں سے ہوشیار رہنے اور اپنی صفوں میں اتحاد برقرار رکھنے کی تلقین کی ہے۔ اس دور کے دیگر ناولوں میں ''قیصر وکسریٰ'' اور ''قافلہ حجاز'' کے ذریعے اُن مٹھی بھر سرفروشوں کے کارہائے نمایاں کو پیش کرنا تھا جن کی ولولہ انگیزی اور اولوالعزمی تاریخ میں ان کا مقام سنہری حروف سے متعین کر گئی۔ اور پھر جب ہمارا مشرقی بازو اُن ناپاک سازشوں کی بدولت جن کا ادراک نسیم حجازی کروانا چاہتے تھے کٹ گیا تو نسیم حجازی نے اسپین کے ان مظلوم مسلمانوں کی تاریخ یاد دلائی جنہوں نے جہاد کے بجائے مصالحت کی راہ اختیار کرنا چاہی اپنے اسلاف کے خون کی گرمی کو گرمانے کے بجائے سرد خانے کی اُس ٹھنڈی لاش کی طرح خود کو بنالیا جو عملاً زندہ نہیں ہوتی اور جذبات سے عاری ہوتی ہے اور ان لوگوں کی داستان محض تاریخ کے صفحات پر تو موجود ہے مگر حقیقت میں ان کی حمیت اور غیرت کا سودا کرنے والوں نے ان کا مذہبی تشخص بھی ان سے چھین لیا تھا۔

پلاٹ کی بندش میں نسیم حجازی ایک کامیاب وکامران فنکار ہیں ان کے پلاٹ کو مزید اجاگر کرنے میں کردار نگاری سے بھی خوب خوب کام لیا گیا ہے منصب، رتبے اور معاشرے میں کردار کا مقام اس کے مکالموں کی بدولت اجاگر ہوتا ہے جہاں زبان کی صفائی اور سادگی نمایاں ہو کر کرداروں کو مستحکم بناتی ہیں بعض مواقع پر ماحول کی عکاسی کے لئے الفاظ کے ذریعے اتنی خوبصورت منظر کشی کرتے ہیں کہ تمام منظر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ وہ ماضی کے قصے سنانے کے بجائے ماضی کی غلطیوں سے سبق سکھا کر مستقبل کی بہتر راہوں پر گامزن رہنے کے لئے اپنے قاری کی رہنمائی کرتے ہیں تو بیجا اور غلط نہ ہوگا یہی وجہ ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''اُردو زبان وادب کی ناول نگاری میں نسیم حجازی نے جو مقام پیدا کیا ہے اس میں شاید ہی کوئی دوسرا ان کا ہمسر ہو۔ ان کی کتابیں فن کے اعتبار سے اپنے انداز میں وہ تمام خوبیاں رکھتی ہیں جو کسی ناول میں ہونی چاہییں۔ ان میں دلچسپی کے وہ سارے پہلو بخوبی موجود ہوتے ہیں جن کی خاطر نوجوان اور عام ناظرین خشک علمی مباحث کی بہ نسبت قصوں، کہانیوں اور افسانوی ادب کا مطالعہ کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور ان سب خوبیوں کے ساتھ وہ کوئی ناول محض تفریح طبع کا سامان بہم پہنچانے کے لیے نہیں لکھتے بلکہ ان کی

اس مقبول عام صنف کو مسلمانوں میں اسلام اور اس کے اقدار سے گہرا لگاؤ اس کی سربلندی کے لیے مجاہدانہ روح اس کی علمبرداری کے لیے اعلیٰ درجے کے اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس غرض کے لیے انہوں نے اسلامی تاریخ کے اہم اور سبق آموز واقعات کو اپنے مقصد کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا ہے اور یہ تبلیغ ایسے انداز سے کی ہے کہ پڑھنے والا خود اس سے متاثر ہوتا چلا جاتا ہے۔ کہیں یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ ناول نہیں بلکہ کوئی درسِ تبلیغ پڑھ رہا ہے۔

میرے نزدیک نسیم صاحب نے یہ کتابیں لکھ کر ملت کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ہمارے نوجوانوں اور تعلیم یافتہ لوگوں میں ان کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہیے۔ محض عشق و محبت کے افسانے یا گمراہ کن نظریات پھیلانے والے ناول پڑھنے کے بجائے اگر لوگ ان کتابوں کو پڑھیں تو ان کو ایک درس بھی ملے گا اور وہ دلچسپی بھی حاصل ہوگی جس کے لیے ناول پڑھتے ہیں۔''[1]

نسیم حجازی کے ناولوں کی قدر و قیمت پاکستان کو دفاعی اعتبار سے ناقابلِ تسخیر بنانے والے سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی اس تحریر سے کی جاسکتی ہے کہ:

''دوسرے بچوں کی طرح بچپن میں، میں بھی جاسوسی اور رومانی ناول پڑھا کرتا تھا لیکن جب پہلی بار نسیم حجازی صاحب کا ناول ''یوسف بن تاشفین'' پڑھا تو میں نے پھر کبھی دوسری ناولوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میں ان کی تمام ناول بار بار پڑھتا تھا اور اکثر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ ان کی تحریر میں جو دل میں چبھنے والی سچائی اور درد تھا وہ کسی اور ناول نگار کی تحریر میں نہ تھا۔ ان کے ناول پڑھ کر میں ہمیشہ یہی دعا مانگتا تھا کہ اللہ مجھے بھی اس قابل بنا دے کہ میں آگے چل کر ان مجاہدین اسلام کی طرح اپنے مذہب، ملک اور مسلمانوں کی خدمت کرسکوں۔

یوں تو پاکستان کی تعمیر میں سرسید احمد خان، قائداعظمؒ، علامہ اقبالؒ، لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر، راجا صاحب محمود آباد، نواب اسمٰعیل خان، نواب بہادر یار جنگ اور دوسرے لاکھوں مسلمانانِ ہند کا بڑا ہاتھ ہے لیکن یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ نوجوانانِ اسلام کے دلوں کو گرمانے، ان کے جسم میں آگ بھرنے اور ان کو پاکستان کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرنے میں نسیم حجازی صاحب کے ناولوں نے جو کردار ادا کیا ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ ان کی تحریروں سے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ پاکستان کے وجود کے خواب و خیال یا اس کے تقاضہ سے کہیں پہلے یہ پاکستانی تھے ان کا دل پاکستان کی محبت، اسلام اور مسلمانوں کی محبت میں تڑپتا رہتا تھا۔

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ نسیم حجازی صاحب کے بعض مشہور ناول، بنگالی، سندھی اور عربی زبان میں شائع ہو چکے ہیں لیکن کاش! یہ حیات افروز لٹریچر ۲۵ سال پیشتر انگریزی اور دوسری اہم زبانوں میں شائع ہو چکا ہوتا اور پاکستان کے ذرائع ابلاغ قوم کے اس قابل فخر سرمایہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے۔۔۔۔۔ میں آج بھی ماضی کی کوتاہی کو ایک ملی فریضہ سمجھتا ہوں اور ملک کے اہل نظر حضرات کو اس جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں!

---

[1] فلیپ۔ آخری چٹان از نسیم حجازی۔

میں نوجوانانِ پاکستان سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ نسیم حجازی صاحب کے تمام ناول بالخصوص ''اور تلوار ٹوٹ گئی''، ''آخری چٹان''، ''شاہین''، ''خاک اور خون''، ''یوسف بن تاشفین''، ''محمد بن قاسم'' وغیرہ ضرور پڑھیں اور اپنی سنہری تاریخ کے سبق آموز واقعات سے واقفیت حاصل کریں اور ملک اور قوم کی صحیح خدمت کرنے کا جذبہ پیدا کریں۔۔۔۔۔۔''[1]

---

[1] فلیپ۔ آخری چٹان از نسیم حجازی۔

نئی نسل کے ناول نگاروں پر اثرات

نسیم حجازی نے جس عہد میں تاریخی ناول نگاری کی وہ چار دہائیوں پر محیط ہے یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنے پیشرو ناول نگاروں کی ایک نسل سے واسطہ پڑا تو ساتھ ہی اپنے ہمعصروں سے بھی رہا ان کا یہ تعلق کسی طور بھی مسابقت یا معاصرانہ چشمک کا دور نہیں کہا جا سکتا البتہ نسیم حجازی نے یہ کوشش ضرور کی کہ اپنے پیشرودؤں کی خامیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی تحریروں میں انہیں دور کرنے کی کوشش کی ساتھ ہی اپنے ہم عصروں کی تحریروں کے مقابلے میں اپنی نگارشات کو منفرد اور ممتاز بنایا اس کوشش میں وہ خاصی حد تک کامیاب رہے تاریخی ناول نگاری میں انہیں ایک معتبر مقام حاصل ہوا یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں بعض حضرات نے ان کے نام سے ناول نگاری کرنے کی ایک مذموم کوشش کی جو ناکامی سے دوچار ہوئی اس لئے کہ نسیم حجازی کا قاری ان کے اسلوب اور زبان و بیان کی شگفتگی سے گرویدہ ہو چکا تھا اور جب اس ڈگر سے ہٹے ہوئے فرضی نام سے لکھنے والے سامنے آئے تو انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اس کے مقابلے میں ایک گروہ ان لوگوں کا ہے کہ جنہوں نے تاریخی ناول نگاری یا تاریخی موضوعات کو اپنی کہانیوں میں سمونے کی کوشش کی جسے تاریخی موضوعات برتنے کا روایتی امین قلمکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ تقسیم برصغیر کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان کتابوں کے تبادلے کی سہولتیں میسر نہیں اور کاپی رائٹ کے قوانین کا اطلاق بھی دونوں ملکوں میں نہ ہونے کے سبب جعلی ایڈیشنوں کی اشاعت کی بھرمار ہے۔ آپ ہندوستان کی فلم پاکستان میں اور پاکستان کے اسٹیج ڈرامے ہندوستان میں بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں مگر کتابوں کا سرحدوں کے پار جانا ناممکن نہیں تو ایک مشکل عمل ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موضوع کو مکمل کرنے کے لئے بنیادی اور ابتدائی معلومات کے بجائے ثانوی درجے کی معلومات پر اکتفا کرنا پڑا ہے۔

تاریخی ناول نگاری کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے قاضی عبدالستار نے بھی طبع آزمائی کی جس میں ان کا ایک ناول ''غازی صلاح الدین'' کے نام سے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا بظاہر یہ موضوع سلطان صلاح الدین ایوبی بہ مقابلہ صلیبی جنگیں ہے اس موضوع پر عبدالحلیم شرر سے لے کر آج تک تاریخی موضوعات پر طبع آزمائی کرنے والے اپنے نقطۂ نظر سے کچھ نہ کچھ لکھتے رہے ہیں نسیم حجازی نے بھی اپنے ناول آخری چٹان کا ابتدائی حصہ بیت المقدس کی فتح سے مزین کیا ہے قاضی عبدالستار نے اس موضوع کو برتنے کی کوشش تو کی ہے اور نسیم حجازی کے مقابلے میں وسعت کے ساتھ موضوع کا احاطہ بھی کیا ہے لیکن نسیم حجازی نے جو اثر آفرینی چند صفحات میں پیدا کر دی ہے وہ کئی گنا قرطاس پر حاشیہ آرائی کے بعد بھی قائم نہ ہو سکی البتہ قاضی عبدالستار نے اپنے ناول ''داراشکوہ'' میں جس کمالِ ذہانت کا ثبوت دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اس ناول میں انہوں نے شاہجہاں کے بڑے بیٹے کی مغرورانہ اور متکبرانہ ذہنیت کا نقشہ اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ ''داراشکوہ'' کی ہندوستان کے تختِ شاہی پر بلاشرکتِ غیرے حکومت کرنے کے خواب کی تعبیر سامنے آجاتی ہے۔ ناول نگار نے داراشکوہ کی نازک مزاجی، جنگی ناتجربے کاری اور عاقبت نااندیشی کو پیش کر کے اورنگ زیب کے ہاتھوں اس کی شکست اور پھر موت کی راہیں ہموار کر دی ہیں لیکن نجانے کیوں اختتام پر یہ تاثر پیدا کرنے کی

کوشش کی ہے کہ دارا شکوہ کے ساتھ ظلم ہوا اس ناول کا پس منظر ہندوستان کی ماضی قریب کی تاریخ ناول نگار کے لیے ان تمام باتوں کو محسوس کرنے اور کرانے میں آسانی کا سبب بنی کہ تاریخی حقائق، محلات و باغات و دیگر جزئیات قاری کے ذہن میں یا تو موجود تھیں یا بہت تھوڑی سی کوشش کے بعد بیدار کر دی گئیں اگر یہ کہا جائے کہ نسیم حجازی کے ناولوں ''معظم علی'' اور ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' کی طرح اس ناول کے ماحول کی تیاری میں قدرتی طور پر بعض سہولتیں میسر تھیں تو بے جا اور غلط نہ ہوگا یقیناً قاضی عبدالستار نے اپنے پیشرووں سے استفادہ کرتے ہوئے اس ناول کو بہتر انداز میں لکھنے کی سعی تو کی ہوگی ان کے علاوہ ڈاکٹر صفدر آہ کا ناول ''لال قلعہ'' تمام تر ظاہری اور تخلیقی کاوشوں کے ساتھ منظر عام پر آیا اس ناول کا موضوع بہادر شاہ ظفر کے دور کی پیش کشی ہے اور چونکہ اس موضوع پر بیش بہا مواد موجود ہے اور برصغیر کے عوام کو اس مظلوم بادشاہ سے جذباتی وابستگی ہے اس لئے تھوڑے سے تخیل اور جزئیات کی بدولت یہ ناول اچھی کوشش میں بدل گیا اس سلسلے میں یہی کہنا کافی ہوگا کہ جس طرح نسیم حجازی نے ''خاک اور خون'' میں گورداسپور کا نقشہ بالکل اس طرح پیش کیا ہے جیسے کوئی اپنے ہاتھ کی لکیروں کو پہچانتا ہے کیونکہ ان کی پرورش اسی علاقے میں ہوئی تھی۔ اسی سہولت کا فائدہ اٹھا کر ڈاکٹر صفدر آہ نے تاریخی مواد کی موجودگی اور ''لال قلعہ'' کے مشاہدے سے تخیل کی کارفرمائی کی بدولت اپنا یہ ناول تخلیق کیا ہے۔

اگر پاکستان میں ناول نگاری کی صنف میں نسیم حجازی کے اثرات تلاش کئے جائیں تو تاریخی ناول نگاروں کے علاوہ بعض معاشرتی ناول نگاروں پر ان کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں نسیم حجازی نے اپنے ناولوں ''پردیسی درخت'' اور ''گمشدہ قافلے'' میں جہاں معاشرتی اقدار اور رسوم و روایات کے ساتھ ساتھ سچ بولنے اور اسے قبول کرنے کی ضرورت کو اجاگر کیا ہے تو اس روایت پر کاربند کئی ناول نگار نظر آتے ہیں جن میں پیش پیش عبداللہ حسین ہیں جن کا ناول ''نادار لوگ'' دور ایوبی سے دور جمہوریت تک کے عرصے کی عکاسی کرتا ہے اس ناول میں فوجی نظم و ضبط اور اس میں موجود نقائص سے پردہ اٹھانے کی کوشش موجزن ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ناول نگار نے حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کے بعض اقتباسات شامل کر کے اپنی حقیقت پسندی اور موضوع پر گرفت کو پیش کیا ہے ساتھ ہی ملک و قوم کے لئے قربانی دینے والے ان جوانوں کا تذکرہ لہوفشاں آنسوؤں سے کیا ہے کہ جو تعصب کی بھینٹ چڑھ گئے اس سلسلے میں ایک اور ناول لیفٹیننٹ کرنل عمر شبیر نے ''منزل'' کے نام سے تحریر کیا جس میں فلسطین میں ہونے والی اسرائیلی کارروائیوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے ان نام نہاد مسلمانوں کا تذکرہ کیا ہے جو فلسطین کی آزادی میں اس لیے رکاوٹ ہیں کہ انہیں اسرائیلی جاسوسی کا چسکا لگا ہوا ہے اور اس جنگ میں اسرائیلیوں کی کامیابی کی وجہ ان کے عوام کے ہر طبقے کا خود کو حالت جنگ میں محسوس کرنا ہے جبر و ظلم کرنا ان کی گھٹی میں پڑا ہے لیکن اسلام کی تعلیمات عفو و درگزر اور رحم کی صفت جب اسرائیلی جاسوسہ کو جو جنرل کا اہم کردار ہے کو قرآن کے مطالعے تک لے آئی تو اس نے پاکستان میں اپنے لئے جائے پناہ ڈھونڈی اور یہاں کے جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کی جدوجہد کرتے ہوئے عوام کے مظلوم طبقے میں شعوری بیداری پیدا کی مگر یہ کوشش ایک طرف جاگیردارانہ نظام کے علمبرداروں کو کھٹکی تو دوسری طرف موساد کو اپنی انتہائی تربیت یافتہ جاسوسہ کی تلاش کسی تیسرے ملک کے توسط سے اس لڑکی کے پاکستان سے بے دخل کئے جانے کا

موجب بنی اس ناول کے ذریعے عمر شبیر نے پاکستان کے نظام تعلیم اور سیاسی نظام پر بعض سوال اٹھائے ہیں یہ حقیقت پسندی ان کے یہاں کہاں سے آئی ''خاک اور خون'' کے آخری حصے میں ''اے قوم'' کے نام سے لکھے جانے والے موضوع ''گم شدہ قافلے'' کے آخری صفحات کا مطالعہ اس جرأت مندی کی دلیل پیش کرتا ہے۔ اسی طرح بریگیڈیئر صدیق سالک کا ناول ''پریشر ککر'' بھی انسانی شعور کی بیداری، نام ونمود اور باطنی سکون کی تلاش کا ایک بہترین رویہ کہا جا سکتا ہے اس کی کہانی پر بھی نسیم حجازی کے خاصے اثرات محسوس ہوتے ہیں پاکستان کے فوجی سراغ رساں ادارے آئی۔ ایس۔ آئی کے ایک رکن طارق اسماعیل ساگر نے اس سلسلے میں خاصی شہرت حاصل کی ہے ان کے چند ناول ''میں ایک جاسوس تھا''، ''کمانڈو'' اور ''وادی لہو رنگ'' شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں انہوں نے واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو ذاتی دلچسپی اور جذباتی لگاؤ کے خصوصی تناظر میں پیش کیا ہے حال ہی میں ان کی ایک اور کتاب ''بارہ اکتوبر کے واقعات'' منظر عام پر آئی ہے جس میں انہوں نے جنرل پرویز کے طیارے کے اندر کی کیفیت اور اسلام آباد کے مقتدر حلقوں کے ساتھ ساتھ جی۔ ایچ۔ کیو کے کردار کو بھی پیش کیا ہے ساگر کا انداز نگارش حقیقت پسندی، جستجو اور قاری کے لئے تمام تر دلچسپیوں کو مجتمع کر کے پیش کرنے کی وجہ سے ایک بڑے طبقے میں پسند کیا جاتا ہے انہوں نے خاص طور پر ہندوؤں کی معاشرتی تہذیبی زندگی، ان کے مذہبی توہمات، زبان اور اسلام دشمنی کے واقعات بڑے فنکارانہ انداز میں بیان کئے ہیں۔ ساگر کا یہ انداز نگارش نسیم حجازی کے ناولوں ''انسان اور دیوتا'' اور ''سو سال بعد'' کے موضوعات کی یاد دلانے کے علاوہ ''خاک اور خون'' میں ہندوؤں کے لگائے ہوئے زخم کی تکلیف کو ایک بار پھر شدت کے ساتھ پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی سرکاری ذمہ داریاں اور کام کی نوعیت موضوع کو حقیقت پسندانہ بنانے، حیرت واستعجاب کی کیفیت برقرار رکھنے اور قاری کو مسحور کن وادیوں میں سفر کرانے میں کامیاب رہتی ہے ان کے ناولوں کو مکمل تاریخی تو قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن بین السطور تاریخی حوالوں کی موجودگی ماضی قریب کی تاریخ کو پیش کرنے کے مترادف ہے اور یقیناً مستقبل میں یہ ناول ایک اہم اور معتبر دستاویز کی حیثیت سے اردو ادب کا سرمایہ بنے رہیں گے اور دوسری طرف ان کی بدولت سیاسی کشمکش اور فوجی حکمت عملی کے بعض ایسے راز سمجھنے میں سہولت ہوگی جو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کو دولخت کرنے کا باعث بنے۔

تاریخی ناول نگاری اور تاریخی موضوعات کے فروغ میں ایک بڑا کردار ڈائجسٹوں اور ہفت روزہ رسائل کا ہے اس سلسلے میں اہم ترین کاوش عنایت اللہ کے ماہنامہ حکایت لاہور سے وابستہ ہے جس میں ''داستان ایمان فروشوں کی'' کے عنوان سے ''التمش'' نے ایک طویل کہانی تحریر کی جس میں صلاح الدین ایوبی کی صلیبی جنگوں کا تذکرہ اور بیت المقدس کی فتح کو موضوع بنایا گیا کہانی اس قدر طویل ہوئی کہ ایک ضخیم ناول بن گئی مگر جو دلچسپی ہر ماہ ایک قسط میں پڑھنے کی وجہ سے قائم ہوتی تھی یکجا ہونے کے بعد تاثر باقی نہ رکھ سکی اس کی ایک وجہ ماہانہ قسط میں قاری کے لیے دلچسپی انہماک اور تجسس کے ساتھ ساتھ حیرت واستعجاب کی ایسی کیفیت کو پیدا کرنا ہوتا تھا کہ اگلی قسط کی اشاعت کے انتظار میں قاری متفکر رہے جبکہ ناول کو یکجا کرنے پر اس میں ایک مکمل تاثر کی ضرورت ہوتی ہے جو اس قسم کی

کیفیت میں ناپید ہو جاتا ہے اس ناول کی کامیابی کے بعد عنایت اللہ نے کئی دوسرے ناول بھی اپنے اس ماہنامے میں قسط وار شائع کیے یہ سلسلہ کافی مقبول ہوا اور تقریباً ہر ڈائجسٹ میں کچھ نہ کچھ صفحات تاریخی موضوعات کے لئے مختص کر دیے اس سلسلے میں سب سے زیادہ شہرت الیاس سیتاپوری کو حاصل ہوئی اگرچہ ان کی پیدائش شاہ جہاں پور میں ۱۹۳۴ء میں ہوئی تھی جہاں ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ میں بڑے بڑے اہلِ قلم کی صحبت سے مستفیض ہوئے جن میں نسیم امروہوی اور شوکت تھانوی کے نام قابل ذکر ہیں لکھنؤ میں قیام کے دوران ہی ان کی صلاحیتیں سامنے آنے لگیں جب انہوں نے سرحد کے پٹھانوں کو موضوع بنا کر ایک ناول مرتب کیا جسے خاصا پسند کیا گیا مگر گھریلو ضرورتیں اور خاندانی نظام کو بچانے کی خاطر اپنی تعلیم کو ترک کر کے پاکستان آ گئے یہی وجہ ہے کہ میٹرک بھی نہ کر سکے مگر مطالعے کا شوق اور موضوعات پر گرفت نے انہیں بقائے دوام بخشا کراچی میں شکیل عادل زادہ نے سب رنگ کے لیے کچھ لکھنے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے تاریخی عنوان منتخب کر کے ایک ایسا مضمون لکھا جو سب رنگ کے بورڈ کے ممبران کے لیے قابلِ قبول رہا اور یوں ڈائجسٹ میں سلسلہ وار تاریخی کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا الیاس سیتاپوری نے کوئی ضخیم سلسلہ وار تاریخی ناول لکھنے کے بجائے کسی ایک موضوع پر محدود صفحات میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے ان کا پسندیدہ موضوع ''غرناطہ'' ہے وہ متعدد موضوعات پر قلم اٹھا چکے ہیں لیکن ''محمد بن قاسم'' جیسے موضوع پر لکھنے میں ہچکچاہٹ سے دوچار ہیں۔ الیاس سیتاپوری نے بتایا[1] کہ وہ تاریخی کہانی کو اس طرح مرتب کرتے ہیں کہ قاری پڑھتے پڑھتے اس عہد میں جا پہنچے کیونکہ تاریخی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے آپ غیر جذباتی ہو جائیں تاکہ آپ پر طرفداری کا الزام نہ لگ سکے بالکل کیمرے کی مانند کیونکہ کیمرہ جو کچھ دیکھتا ہے اس کی تصویر بنا دیتا ہے اور یہی خوبی تاریخی موضوعات کو مرتب کرتے وقت برتنی چاہیے۔ الیاس سیتاپوری نے سب رنگ کے لیے سب سے پہلی کہانی لکھی تھی جو چنگیز خان کے مظالم و فتوحات کی داستان ہے۔ سب رنگ کی بے قاعدہ اشاعت کی وجہ سے آپ سسپنس سے وابستہ ہو گئے اور تاحال اس میں لکھ رہے ہیں۔ الیاس سیتاپوری کی زود نویسی اور موضوع پر گرفت انہیں فنی اعتبار سے کامیاب کہانی نویس بنا گئی ہے خود الیاس سیتاپوری اناطول فرانس کی کہانیوں سے متاثر رہے ہیں لیکن یہ کہنا قرینِ قیاس ہوگا کہ نسیم حجازی کی مقبولیت اور شہرت نے الیاس خان سیتاپوری کو تاریخی موضوعات کی طرف راغب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہمارے عہد کا ایک اور نام جس نے تاریخی موضوعات پر لکھنے میں بڑی شہرت حاصل کی ہے خان آصف کا ہے خان آصف ۱۹۴۵ء میں رامپور میں پیدا ہوئے۔ بی۔اے تک تعلیم حاصل کی مزید تعلیم کے حصول کے خواہشمند تھے مگر بعض معاشی ضرورتوں نے رکاوٹ ڈالی۔ اپنے ماضی سے جذباتی وابستگی نے تاریخی موضوعات سے جذباتی لگاؤ بیدار کیا تو یہی قلم اور تاریخ کا رشتہ روزگار کا وسیلہ بن گیا ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی میں چھپنے والے تاریخی موضوعات کے سلسلوں نے شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا جس کی وجہ موضوعات پر گرفت اور تاریخی مواد کا تحقیقی تجزیہ ہے میری معلومات کی حد تک ان کی معاون پروفیسر سلمیٰ لطیف رہی ہیں اخبار جہاں کے علاوہ روزنامہ ''ایکسپریس'' کے لیے بھی لکھ رہے ہیں انہی تاریخی موضوعات کو

۱۔ انٹرویو الیاس خان سیتاپوری مملوکہ راقم الحروف اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

جنہیں ناول کے قالب میں ڈھالنے کے خواہش مند ہیں ٹیلی ویژن پر بطور ڈرامہ پیش کر چکے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں۔ زبان و بیان پر اس قدر عبور ہے کہ بعض مکالمے انتہائی تاثراتی ہو جاتے ہیں ''شعلوں کا کفن'' کے یہ مکالمے پڑھیے:

''جب سلطان کا اضطراب حد سے بڑھا تو اس نے رام دیو کو اپنے خیمے میں طلب کرتے ہوئے کہا'' تو نے پچیس سال پہلے ہماری آمد اور فتح کی پیش گوئی کی تھی مگر آج ہم پوچھتے ہیں کہ پدمنی اور رتن سنگھ کے بارے میں تیرا علم کیا کہتا ہے؟''

رام دیو فوراً اپنی بوسیدہ کتاب لے کر حاضر ہوا۔ شکستہ اوراق میں کچھ دیکھتا رہا اور پھر کاغذ پر زائچہ کھینچنے کے بعد بولا'' فاتح عالم! ستاروں کی رفتار بتا رہی ہے کہ پدمنی آگ کے شعلوں میں جل کر دوسری دنیا کی طرف جا چکی ہے۔ رتن سنگ اپنی خفیہ پناہ گاہ میں زندہ ہے جو کل کسی وقت ایک قیدی کی حیثیت سے آپ کے سامنے حاضر ہو جائے گا۔''

''پدمنی چلی گئی؟ ہماری اجازت کے بغیر؟ علاؤالدین کا لہجہ قہرناک تھا مگر اس میں پوشیدہ شکست کے آثار کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔'' آج تک ایسا نہیں ہوا رام دیو! کیا ستاروں کی چالیں بدلی نہیں جا سکتیں۔''

''اے سنسار کے وجیتا! ستاروں کی چال کو پرماتما کے سوا کون بدل سکتا ہے؟'' رام دیو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ہاں! آسمان کے فیصلوں کو بدلا نہیں جا سکتا۔'' علاؤالدین نے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔'' پھر بھی ہم نے اس پر زندگی کے دروازے تو بند کر دیے۔ جو ہماری بارگاہ میں حاضر نہیں ہو سکتا اس سے جینے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔'' علاؤالدین کے لہجے میں دولت و اقتدار کی بڑی خوفناک آگ تھی جس کی لپٹیں دیکھ کر رام دیو لرزنے لگا۔''[1]

ان مکالموں میں جہاں ایک تاثر ہے وہیں شکست اور حیرانی کی کیفیت بھی اجاگر ہوتی ہے اس کے علاوہ خان آصف نے ناول کی کہانی کو اس قدر دلچسپ پیرائے میں پیش کیا ہے کہ قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا البتہ اس کی جذباتی ہمدردیاں علی آفریدی اور نرملا کے ساتھ ہو جاتی ہیں اور علاؤالدین کو اس تمام کیفیت کا ذمہ دار سمجھتا ہے جس سے علی آفریدی کی بہن اور ماں کو دوچار ہونا پڑا اور نرملا پر اذیت کے پہاڑ توڑے گئے۔ یہ ناول انتہائی باریک لکھائی میں ہونے کے باوجود خاصا ضخیم ہے مگر ناول کے اختتام پر قاری کے ذہن میں بہت سے سوالات جواب طلب رہ جاتے ہیں ضرورت اس بات کی تھی کہ اس ناول کا دوسرا حصہ بھی شائع ہونا چاہیے تھا تاکہ قاری کی تشنگی دور ہو جاتی۔ خود خان آصف کو یہ ناول بہت پسند ہے جبکہ اپنے ناولوں میں پیش کئے ہوئے کرداروں میں ٹیپو سلطان کو پسند کرتے ہیں خان آصف کا ادبی سفر جاری ہے قارئین کی ایک بڑی تعداد انہیں سلسلہ وار ناولوں کے ذریعے پڑھتی رہی ہے اگر کسی پبلشر نے توجہ کی تو ان کا یہ عظیم سرمایہ کتابی شکل میں مربوط طور پر منظر عام پر آ سکے گا۔

ان تاریخی موضوعات پر قلم اٹھانے والوں کے کام کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی تاریخ کے موضوعات میں اس قدر دلچسپی اور اثر آفرینی موجود ہے کہ انہیں اپنے اپنے انداز میں پیش کیا جاتا رہے یہ موضوعات تابناک ماضی کا سرمایہ ہونے کے ساتھ

---

[1] شعلوں کا کفن؛ خان آصف، ص ۴۲۲۔

ساتھ صحیح اور کامیاب مستقبل گزارنے کے لیے مشعل راہ بھی ہو سکتے ہیں۔

نسیم حجازی اس قافلے کے نہ سالار ہیں نہ آخری آدمی۔ مسلمان اپنی نشاۃ الثانیہ کے لئے ہمیشہ تاریخ کے جھروکوں میں جھانکتے رہیں گے اور تاریخی ناول یا افسانہ نگاری کی روایت زندہ رہے گی نسیم حجازی کے بعد آنے والوں میں قاضی عبدالستار، اسماعیل ساگر، الیاس سیتاپوری، خان آصف اور دیگر قلم کار تاریخ کو اپنے اپنے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا نسیم حجازی سے براہ راست متاثر ہونا ضروری نہ تھا اور نہ وہ اس طرح متاثر ہوئے مگر عبدالحلیم شرر نے جو بیج بویا تھا اور جس کی آبیاری نسیم حجازی نے کی تھی وہ پودا ان صاحبان قلم کی صورت میں برگ و بار لا رہا ہے اور یہ روایت چلتی رہے گی۔

نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں کا ادبی مقام

نسیم حجازی کے تاریخی ناول اہل نقد کی توجہ کیوں نہ پا سکے یہ ایک الگ موضوع ہے حالانکہ اس مقالے میں ناولوں کے ہر دو پہلو تحقیقی و تنقیدی کو معیار بنا کر ناولوں کی فنی حیثیت متعین کی ہے چونکہ تاریخی ناول نگاری ایک مشکل صنف ہے اور اسے پرکھنے کے لئے نقادانِ فن انہی گھسے پٹے اصولوں کو اختیار کرنا چاہتے ہیں جو مغرب نے متعین کر دیے حالانکہ ناول نگاری کا زمانہ اس عہد اور معاشرے کی ضرورتیں جب یہ ناول لکھے جا رہے ہوں اور ناول نگار کا مقصدِ فن بھی مدنظر رکھنا چاہیے جب دنیا کے ہر معاملے میں لچک کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور اسی لچک کی بدولت بڑے بڑے مسائل حل ہوتے ہیں تو ناول نگاری کے تنقیدی اصولوں کو بعض ضرورتوں کے تحت رد و بدل کے ساتھ اپنایا جائے تو تاریخی ناول نگاری کا فن اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ شاملِ ادب کیا جا سکتا ہے اس سلسلے میں تاریخی ناول نگاری کے لئے جو اصول ناقدین نے متعین کر دیے ہیں اگر انہی کو معیار بنا لیا جائے تو بھی نسیم حجازی اس معیار پر پورے اترتے ہیں اکثر ناقدین کا خیال ہے کہ تاریخی ناول نگاری کی گنجائش اس موقع پر موجود ہوتی ہے جب تاریخی صفحات خالی ہوں یا کسی تاریخی حقیقت کو بنا رد و بدل تخیل کے ساتھ اس طرح پیش کیا جائے کہ تمام تر تہذیبی اقدار زندہ و جاوید ہو جائیں اس اصول کو مدنظر رکھ کر نسیم حجازی کے کسی بھی ناول پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے فن کو متاثر یا حقیقت کو مسخ کیا ہے اس لئے نعیم صدیقی لکھتے ہیں:

''نسیم حجازی ہماری دنیائے ادب کا ایک روشن ستارہ ہے۔ اس شخص کے پاس کُل کا ایک گھوڑا ہے کہ اس پر بیٹھ کر وہ بغداد اور وہاں سے غرناطہ اور پھر وہاں سے بنارس پہنچتا ہے، کبھی وہ صلاح الدین کے ساتھ میدانِ کارزار میں صلیبی جنگ لڑ رہا ہے، کبھی تاتاریوں کے حملوں سے مجروح ہونے والے برادرانِ ملت کے سر باری باری گود میں لیتا ہے، کبھی سومناتیوں کے خداوندِ سنگ و چوب کی مصنوعی آنکھوں سے مسلم کش نگاہوں کے تیر چلتے دیکھتا ہے اور پھر تقسیم برصغیر مسلمانوں کا قتل عام کیا جو خونی سیلاب اس سرزمین پر گذرا اس میں بہتی ہوئی لاشوں کے ساتھ غوطے کھاتا ہے اور کبھی پاکستان میں اسلام، جمہوریت اور انسانیت کے پرزے اڑنے پر اپنے ناولوں کی عبارتوں کے ایک ایک لفظ کو ایسا نالہ کش بناتا ہے کہ آسمان کے تارے بھی لرز اٹھتے ہیں کہکشاں کپکپانے لگتی ہے۔

مختصر یہ کہ نسیم حجازی، نسیم حجازی ہے جو اس کی عظمت کو مانتا ہے، وہ شاید خود عظیم ہو جو نہیں مانتا نہ مانے۔''[۱]

بظاہر یہ دوٹوک انداز معلوم ہوتا ہے مگر بات سوچنے کی یہ ہے کہ یہ سخت روش کیوں اختیار کی گئی یقیناً اس کی وجہ نقادانِ ادب کا وہ سخت رویہ ہو جس نے نسیم حجازی کی حیثیت کو بحیثیت تاریخی ناول نگار سرے سے ماننے سے انکار کر دیا تھا جس کے بارے میں ڈاکٹر محمد یوسف عباسی رقمطراز ہیں:

''وہ (نسیم حجازی) ہمارے ماضی اور ہمارے مستقبل کے درمیان رشتے کاٹنے والا ادیب نہیں بلکہ ان دونوں کو مربوط رکھ کر درحقیقت ہمارے ملی ذہن کو تباہ کن خلفشار سے بچانا چاہتا ہے جسے بپا کرنا ترقی پسند ادیبوں کے پیش نظر ہے۔ اس کا گناہ کبیرہ یہ بھی ہے

۱۔ نسیم حجازی مشمولہ سیارہ، نعیم صدیقی، ص ۲۲۳۔

کہ وہ مسلم ادیب ہے اور اسلام کے دیئے روشن رکھنے کی مہم میں لگا ہوا ہے یہ حرکت ترقی پسند نقطہ نظر سے نا قابل برداشت ہے حالانکہ فی الحقیقت نسیم حجازی کا ادبی کارنامہ بڑی بھاری تعمیری قدر و قیمت رکھتا ہے وہ وقت کے حالات کو سامنے رکھ کر تاریخ کے ایسے ابواب ڈھونڈ کر لاتا ہے اور ان میں ایسے کردار چلتے پھرتے دکھاتا ہے کہ ہمارے معاشرے کا عام آدمی اس کے ناولوں کو پڑھ کر ان کو اپنے حالات پر منطبق کرنے لگتا ہے اور ان سے عملاً اثر پذیر ہوتا ہے۔ معاشرے کے ذہن پر نسیم حجازی کے مقصدی ناولوں کے اثرات عالم واقعہ میں محسوس کیے جا سکتے ہیں ہمارے۔۔۔ادیب دوست نے ان پر تاریخی حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کرنے اور ادبی بددیانتی سے کام لینے کا بہت ہی سنگین الزام لگایا ہے۔ اس سلسلے میں ہم کوئی بحث نہیں کر سکتے البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ ترقی پسند حضرات نے اب تک تاریخ عالم اور تاریخ اسلام کے ساتھ جو بدسلوکی روا رکھی ہے اس کے ہوتے ہوئے نسیم حجازی پر یہ الزام کچھ پھبتا نہیں۔''[1]

کیونکہ نسیم حجازی نے ناول کے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام تر ضرورتوں کا خیال رکھا ہے وہ قاری کی دلچسپی تاریخی حقائق اور تخیل کی کارفرمائی ہر ہر پہلو کو سامنے رکھ کر ناول رقم کرتے ہیں اس لیے نعیم صدیقی کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ:

''نسیم حجازی نے تو اپنی ملت اور معاشرے کے حالات کو سنوارنے کو مقصد بنایا ہے اور اس مقصد کے لیے تاریخ سے مواد حاصل کر کے ادب کی تخلیق کی ہے وہ شخص کسی بھی ملک اور صورت حالات کا پورا پورا جائزہ لیتا ہے، واقعات کے متعلق اہم کرداروں کے احوال کا علم حاصل کرتا ہے پھر وہ تاریخ ہی کے ایک ڈرامے کو ماحول کی ضرورت کے پیش نظر ناول میں ڈھالتا ہے اور تاریخی سلسلہ واقعات میں جہاں چھوٹے چھوٹے خلا ملتے ہیں وہاں وہ کسی صاف ستھرے رومینٹک ڈرامے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے حیاداری اور پاکیزگیٔ بیان سے پیش کرتا ہے تاکہ ناول خالص تاریخ بن کر پڑھنے والوں کے لئے بے کیف نہ ہو جائے بلکہ اس کی کچھ فنی حیثیت بھی ہو۔ پھر وہ ہر موقع کے مطابق اسلوب بیان اختیار کرتا ہے۔ وہ کردار کی ساخت کے مطابق اس کی گفتگو اور عمل کو ڈھالتا ہے اور ایک ایک لفظ زبان کے ترازو پر تول کر اور ادب کے خراد پر چھیل چھیل کر استعمال کرتا ہے۔''[2]

اس کے باوجود نسیم حجازی کی بدقسمتی یہ ہے کہ اردو کے اکثر نقاد وہ ہیں جو انگریزی حلقہ اثر کے سحر میں جکڑے ہوئے ہیں اگر وہ خود کو مشرق کا نمائندہ کہتے بھی ہیں تو بھی نقد و قدح کے لیے مغربی اصولوں پر تکیہ کرتے ہیں مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ مغرب تاریخی ناول اور بالخصوص اسلامی تاریخی ناول سے اس قدر چراغ پا کیوں ہیں۔ ان کے یہاں پندرھویں، سولہویں اور سترھویں صدی میں مذہبی تعصبات خون ریز واقعات کو جنم دینے کا باعث بنے اس کے علاوہ معاشرے میں دین کی طرف رجحان ناپید اور مادہ پرستی عام تھی کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کے دینی پیروان کے سوانحی حالات اور اخلاقی قدروں سے ناواقف رہے ان کے علماء نے عوام کے دلوں میں مذہب کی محبت اور اخلاقی رموز کو اجاگر کرنے کا فریضہ انجام نہیں دیا نتیجۃً بے راہ روی اور مذہب سے بیگانگی کی صورت میں سامنے آیا جبکہ مسلمانوں میں حضور اکرمؐ کے بارے میں ہر قسم کی معلومات خواہ ان کا تعلق خلوت سے ہو یا جلوت سے منظر عام پر آئیں یہی نہیں بلکہ صحابہ، تابعین اور

---

[1] نسیم حجازی۔ ایک زندہ روایت مشمولہ سیارہ؛ ڈاکٹر محمد یوسف عباسی، ص ۴۱۹۔

[2] نسیم حجازی مشمولہ سیارہ، نعیم صدیقی، ص ۴۲۱۔

تبع تابعین کے مکمل حالاتِ زندگی اسماء الرجال کے فن کی بدولت اظہر من الشمس ہیں اس قسم کی معلومات عیسائیوں کے یہاں موجود نہیں نہ حضرت عیسیٰؑ کے مفصل حالات ہیں اور نہ ان حواریوں کے بارے میں۔ جب وہ اپنے بزرگوں کے حالات سے خود ناواقف ہیں تو اسلامی تاریخ کے اس قسم کے حالات کیونکر ادبی موضوع بنانے اور اس پر طبع آزمائی کو درست جانتے۔ اس سلسلے میں اللہ کی آخری کتاب قرآن کریم میں بے شمار انبیاء کے واقعات مفصل طور پر پیش کیے گئے ہیں مسلمانوں کے نزدیک قرآن کریم الہامی کتاب ہے اس پر ایمان لانا لازمی شرط ہے اس لیے کتاب اللہ میں موجود واقعات جہاں اپنی ایک تاریخی اہمیت رکھتے ہیں وہیں معاشرتی طور پر ان میں ایک نصیحت کا پہلو بھی پوشیدہ ہے مثال کے طور پر جب کفار نے حضور اکرمؐ سے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی بابت جاننا چاہا تو اللہ نے وحی کے ذریعے حضرت یوسف کے تمام حالات سے حضور اکرم کو واقف کرا دیا ساتھ ہی بین السطور یہ بھی بتا دیا گیا کہ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انہیں راستے سے ہٹانے کے لئے کنویں میں پھینک دیا مگر تقدیر کے فیصلوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انہیں مصر کی حکومت پر سرفراز کیا جہاں بچپن میں دیکھے ہوئے ان کے خواب کی تعبیر پوری ہوئی کہ ان کے بھائیوں نے انہیں سجدہ کیا جب کفار حضور اکرمؐ سے یہ واقعات پوچھ رہے تھے تو کیوں فراموش کر رہے تھے کہ وہ حضرت محمدؐ کو قتل کر کے یا جلاوطن کر کے راستے سے کیسے ہٹا سکتے ہیں اور پھر تقدیر کا فیصلہ اس طرح نافذ ہوا کہ حضور اکرمؐ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے اور کفار کی تمام تدبیریں ناکام اور بے سود رہیں۔ ایک اور واقعہ حضرت موسیٰؑ کا ہے کہ ان کی ولادت کے موقع پر ان کے خاندان کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کیا جا رہا تھا مگر اللہ نے ایسے اسباب پیدا کیے کہ حضرت موسیٰؑ کی ولادت ہوئی اور وہ فرعون کے محل میں پرورش پاتے رہے اس کے بعد ان کی شادی اور پھر نبوت ملنے کا تفصیلی حال قرآن کریم میں موجود ہے اعلان نبوت کے نتیجے میں فرعون نے جادوگروں کے ذریعے مقابلے کی دعوت دی جس میں برسرِ عام فرعون کو ذلت آمیز ناکامی ہوئی انجام کار جب حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر دریائے نیل پار کر گئے اور فرعون اپنے لشکر سمیت غرقِ آب ہوا دیگر واقعات میں خطاؤں اور غلطیوں پر پکڑ لینے کے اللہ کے طریقے کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت نوحؑ کے بیٹے اور بیوی، حضرت لوطؑ کی بیوی اور حضرت ابراہیمؑ کے والد کا تذکرہ ہے کہ یہ نافرمان تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں پکڑ لیا اسی طرح حضرت مریم کے عفیفہ ہونے اور فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کے مؤمنہ ہونے کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ حضرت داؤدؑ کے پایۂ ثبات میں اس لغزش کا تذکرہ خوبصورت تمثیل کے ذریعے کیا گیا ہے کہ جب انہوں نے ایک اور خاتون کو اپنے نکاح میں لانا چاہا تو دو افراد نے ان سے اپنا مقدمہ فیصل کرنے کے لیے پیش کیا کہ اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہے یہ کہتا ہے کہ یہ بھی مجھے دے حضرت داؤدؑ کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا سجدے میں گر پڑے اور اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ ایسے بیشمار واقعات قرآن کریم میں موجود ہیں پھر نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مکمل حالاتِ زندگی ہمارے سامنے آتے ہیں کہ بحیثیت شوہر آپ کا رویہ آپ کی بیویوں کے ساتھ کیسا رہا یہاں بھی کوتاہی کا ہلکا سا شائبہ نظر آتا ہے اور حضور اکرمؐ نے بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر ایک حلال چیز کے بارے میں غلط رائے قائم کی تو سورۃ تحریم میں نبی کی بیویوں کو مخاطب کر کے ان

کی غلطی کی طرف توجہ دلائی گئی حضور اکرمؐ ایک باپ تھے ان کا رویہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ کیسا رہا کسی سے ڈھکا چھپا نہیں اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ آپ کا حسن سلوک ایک نمونہ ہے اپنے غلاموں کے ساتھ آپ کا رویہ ایسا رہا کہ دنیا میں اگر کسی مرد کو اپنے نام کے ساتھ کچھ عرصے تک ہی سہی آپ کا نام بطور ولدیت لگانے کا اتفاق رہا تو وہ آپ کے غلام حضرت زید بن حارثؓ ہیں آپ کے صحابہؓ کے مکمل حالات زندگی ہمارے سامنے آتے ہیں جب حضور اکرمؐ کا وصال ہوا تو خلافت کس کو ملے گی نبی کی وراثت کس کس کا حصہ ہوگی ایسے بے شمار معاملات صحابہؓ نے انتہائی خوش اسلوبی سے حل کیے بعض مواقع پر اختلاف بھی سامنے آیا اور یہی اختلاف مسلمانوں کے دو گروہ بنا گیا جس کے نتیجے میں حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کا المناک واقعہ ہوا چند غلط فہمیوں کی بنا پر حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان جنگِ جمل کا سانحہ رونما ہوا تاریخ اسلام نے اپنے کسی واقعہ کو پوشیدہ نہیں رکھا اگر کوئی کام غلط بھی ہوا تو بھی اسے پیش کر دیا ہے تاکہ آنے والے اپنی اصلاح کر سکیں مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی وجہ سے حجاج بن یوسف نے خانہ کعبہ پر سنگ باری کی اور فتح حاصل کرنے کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو تین روز تک سولی پر لٹکائے رکھا واقعہ کربلا کا رونما ہونا آلِ رسول ﷺ کی بے حرمتی کا باعث تو بنا مگر خلافت وملوکیت کی روایت پر اس قدر اثر انداز ہوا کہ لمحہ فکریہ بن گیا۔ سلیمان بن عبدالملک نے بعض عاقبت نااندیش دوستوں کے مشورے پر قتیبہ بن مسلم باہلی کو قتل کرایا تو دوسری طرف محمد بن قاسم نے اطاعت وفرمان برداری کا ثبوت دیتے ہوئے دربارِ خلافت کے حکم کو لبیک کہا مگر انجام کار اسے بھی قتل کرا دیا گیا سلیمان کی یہ عاقبت نااندیشی اندلس میں طارق اور موسیٰ کی فتوحات کو روکنے کا باعث بنی۔

تاتاریوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے بغداد کے خلیفہ کی مصلحت اندیشی جہاں جلال الدین خوارزم شاہ کی شکست کا باعث بنی وہیں بغداد کی تباہی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئی اورنگ زیب عالمگیر نے کس طرح اقتدار حاصل کیا اور اسے کس طرح اپنے بھائیوں کی سازشوں سے نمٹنا پڑا اس بارے میں دو رائے ہو سکتی ہیں کہ وہ ظالم تھا یا اس کے فیصلے وقت کی ضرورت تھے اس کی وفات کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہونے لگا مگر اس بجھتے ہوئے چراغ کو بنگال میں علی وردی خان، میسور میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان اور پانی پت کے مقام پر احمد شاہ ابدالی نے بجھنے سے روکنے میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو استعمال کیا اور پھر ۱۸۵۷ء میں جنرل بخت خان کی قیادت میں سرفروشوں کا ایک گروہ اس ٹمٹماتے چراغ کو جلانے کے لیے اپنا خون جگر دے گیا یہ اور ایسے بے شمار واقعات جن کا تذکرہ طویل تحریر کا متحمل ہے تاریخ اسلام کا وہ سرمایہ ہے جس پر ہم ناز کر سکتے ہیں ان میں سے جس موضوع کو اٹھائیں ایک ادبی شہ پارہ بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ یہی کام نسیم حجازی نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کیا وہ کسی بھی واقعے کے بیان میں تاریخی نامور شخصیات کے ساتھ جو گمنام افراد کی ایک تعداد تاریخ میں ملتی ہے اُسے اپنے تخیل سے مختلف نام دے کر جیتے جاگتے کردار بنا کر پیش کر دیتے ہیں جس سے ناول کی ناولیت میں اضافہ ہوتا ہے محض تاریخی بیان کی تکرار محسوس نہیں ہوتی اور یوں لگتا ہے کہ ہم محض تاریخ نہیں پڑھ رہے بلکہ ادبی فن پارہ پڑھ رہے ہیں۔ مغربی کلاسیکی ادب یونان کے دیومالائی کرداروں کو بطور اکابر پیش

کرے تو ان میں وہ انسانی اوصاف نہیں جو مسلمان فاتحین کا طرہ ہیں یہ دیومالائی کردار بہادر ہیں مگر ظالم بھی ہیں اپنے لیے ہر چیز کو جائز جانتے ہیں رعایا اور محکوموں کے حقوق غصب کرتے ہیں جبکہ مسلمان حکمران ہوں یا فاتح ان کا عمل، رہن سہن مساوات کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہے اس فرق نے اہلِ مغرب کو ہلا کر رکھ دیا اگر مسلمانوں میں کوئی غلطی کا پہلو ہے تو بھی اسے کوتاہی تصور کیا جاتا ہے اگر اس انداز کو اختیار کرتے ہوئے نسیم حجازی حجاج بن یوسف، قتیبہ بن مسلم، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، یوسف بن تاشفین، محمود غزنوی، ٹیپو سلطان جیسے کرداروں کو اولوالعزمی، اعلیٰ ظرفی اور انسانیت شناسی کا نمونہ بنا کر پیش کریں تو مغربی اصول تنقید کے معیار پر یہ کیسے پورے اتریں گے اس لئے نسیم حجازی کے ناولوں کا ادبی مقام متعین کرتے ہوئے اسلامی اقدار و روایات کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔

نسیم حجازی کے ناول داستان مجاہد کا پلاٹ مربوط ہے وہ اپنے کرداروں کا تعارف قاری کے ذہن نشین اس خوبی سے کراتے ہیں کہ کردار چلتے پھرتے معلوم ہوں پڑھتے ہوئے یہ گمان غالب رہے کہ ہم بھی اس کہانی کا حصہ ہیں خود بخود کرداروں سے محبت اور نفرت کا جذبہ جاگزیں ہو جائے ان خوبیوں کے علاوہ امید و بیم کا وہ تعلق جو تجسس اور حیرت کی انتہا پیدا کر دیتا ہے خوب خوب موجود ہے رہی مکالموں میں طوالت کی بات تو کہیں بھی بلا وجہ تقریر کا انداز پیدا نہیں ہوتا اگر بصرے کی مسجد میں حالات کے تحت تقریر ایک ضرورت ہے تو اسے خامی نہیں خوبی سمجھنا چاہیے اس کے علاوہ جہاں جہاں تبلیغ کے مواقع ملے نسیم حجازی نے اپنے کرداروں کے ذریعے زندگی کی اس حقیقت کو پیش کیا ہے جو ہمارے ماضی کا سرمایہ ہے اسی طرح ناول محمد بن قاسم کی کہانی پلاٹ کے ربط و تسلسل اور تجسس و انہماک کا ایک حسین امتزاج ہے۔ یہاں بھی کردار نگاری، مکالمہ اور منظر نگاری اپنے عروج پر ہے اس کے علاوہ ان دونوں ناولوں سے قارئین کے ایک بڑے حلقے کا متاثر ہونا مقبولیت اور ادبی معراج نہیں تو کیا ہے سندھی، عربی اور بنگالی میں ان کے تراجم ناول کے معیار پر لگنے والے سوالیہ نشان کا مناسب جواب ہیں ایسی ہی ایک تقریب کے موقع پر ڈاکٹر ایس۔ایم۔زمان نے کہا تھا:

''داستانِ مجاہد کی کہانی تاریخی واقعات کی روشنی میں آگے بڑھتی ہے اس میں مصنف نے اس اہم دور کو لیا ہے جب عرب فوجیں بیک وقت شمال میں افریقہ، مغرب میں اسپین، شمال میں وسطی ایشیا اور مشرق میں سندھ (جو ہندوستان میں داخل ہونے کے لیے صدر دروازے کا کام دیتا تھا) کی طرف اسلامی جھنڈے تلے بڑھ رہی تھیں۔ محمد بن قاسم اس داستان کا ہیرو ہے جبکہ نعیم کہانی کا مرکزی کردار اس کا ایسا جوشیلا دست راست، ہے جو اس کو دل و جان سے چاہتا ہے۔ یہ ناول اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے چالیس ایڈیشن چھپے۔ ''محمد بن قاسم'' کو ''داستانِ مجاہد'' کا تکملہ سمجھنا چاہیے۔ اس ناول میں محمد بن قاسم کے بچپن سے لے کر بصرہ میں اس کے ابتدائی کارناموں تک کا ذکر ہے جہاں کا گورنر اس کا چچا حجاج بن یوسف تھا۔ سندھ کی مہمات کے واقعات کے ساتھ مصنف انسانی محبت، نفرت، بہادری اور چالاکی و مکاری کے چھوٹے چھوٹے ڈرامے دکھاتا چلتا ہے اور اس کے قلم کا کمال یہ ہے کہ اس کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑتی، قارئین کی دلچسپی میں فرق نہیں آتا اور شاعر مشرق کی یہ آواز ان کے کانوں تک پہنچنے لگتی ہے جو انہیں جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔

کبھی اے نوجوان مُسلم تدبر بھی کیا تو نے۔۔۔

وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

قارئین کے سامنے محمد بن قاسم کا وہ خط ہو جو اس نے اپنی بیوی کے نام لکھا تھا یا اس کے وہ الفاظ جن میں اس نے راجا داہر سے فیصلہ کُن جنگ کے آغاز پر اپنے سپاہیوں کو مخاطب کیا تھا ایک لہر پڑھنے والے کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔''[1]

اس تبصرے کے بعد آخر وہ کون سی فنی خوبی ہے جس کے متلاشی ہمارے نقاد ہیں؟ کس چیز کی تلاش میں مصروف ہیں؟ کیا ڈھونڈنا چاہتے ہیں؟ اور پھر نسیم حجازی بھی ان سے ناراض کیونکر ہوں کیونکہ ان بے چاروں کا مسئلہ تو بالکل الگ ہے اس بات کی وضاحت کے لئے پروفیسر محمد منور کی یہ رائے پڑھیے:

''جہاں تک نسیم حجازی کے ناولوں کے فنی پہلوؤں کی قدر دانی کا تعلق ہے، نسیم صاحب کو اس بارے، میں شکایت لاحق ہے ویسے اس ضمن میں نسیم حاجب اکیلے نہیں، نسیم صاحب کے نیاز مندوں کو بھی ناقدین سے شکوہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ناقدین کا طرز تنقید یورپی افسانوی ادب کے طرز تنقید کے تابع ہے۔ یورپ کے افسانوی ادب کے ناقدوں نے افسانوی ادب کو جانچنے کے لئے کچھ اصول وضع کر لیے۔ پھر ان اصولوں کے ڈھانچوں میں اپنی تنقید کو فٹ کرنے لگے۔ گویا وہ اپنی اختراع اور تخلیق کے مقید ہو کر رہ گئے۔ ان کے خیال میں ناول یوں اور یوں شروع ہونا چاہیے۔ یوں اور یوں پڑھنا چاہیے۔ اس کے واقعات اس اور اس طرح ہونے چاہیے۔ انجام سے پہلے تعویق اور استعجاب کا مرحلہ اتنا اور اتنا ہونا چاہیے اور پھر انجام اس منطقی انداز اور اس قدرتی اور اس طرح طرز سے نمودار ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔۔۔''[2]

یہی وجہ ہے کہ جو کوئی ان ناولوں کے فنی خصائص تلاش کرنا چاہے تو اسے بہت کچھ ملے گا۔ پلاٹ کا ربط و تسلسل، کہانی کا ایک خاص انداز میں پھیلاؤ پھر سمیٹنا مختلف چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو ان کے منطقی انجام تک پہنچانا، کرداروں کی زبان و بیان، حسب مراتب ان کے مکالمے، مکالموں کی زبان، رہن سہن، اقدار، تہذیب کی جھلک، منظر نگاری صرف معاملہ دیکھنے اور انہیں ناول سمجھنے پر مبنی ہے۔

ناول آخری چٹان کے فنی پہلوؤں پر غور کرنے سے قبل اس کی کہانی اور موضوع کے انتخاب پر توجہ کیجیے عام طور پر دیگر تاریخی ناول نگاروں نے صلاح الدین ایوبی کی صلیبی جنگوں کو اپنا موضوع بنایا نسیم حجازی نے بھی ناول کے آغاز میں صلاح الدین ایوبی کی بیت المقدس پر یلغار اور فتح کو پیش کیا اور ناول کے مرکزی کردار طاہر بن یوسف کا تعلق اس جنگ کے فاتحین سے ثابت کیا۔ لیکن انہوں نے صلاح الدین ایوبی کے موضوع کو تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کے بجائے خوارزم شاہی اقتدار کے تنزل اور اس موقع پر بغداد کی بے حسی کو موضوع بحث بناتے ہوئے جلال الدین کو آخری چٹان کے طور پر پیش کیا ہے اگر ناول کے موضوع کے انتخاب اور اسے برتنے کے سلسلے میں نسیم حجازی کی کامیاب قلمکاری کو دیکھا جائے تو یہی ناول نگاری کے اسلوب پر تمام سوالات کا جواب ہے۔ انتہائی دانش

---

[1] نسیم حجازی کی ناول نگاری اور ''محمد بن قاسم'' کا عربی ترجمہ مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ زمان، ص ۱۴۶۔

[2] نسیم حجازی کی فتوحات مشمولہ سیارہ، پروفیسر مرزا محمد منور، ص ۲۰۵۔

مندی کے ساتھ ایسے موضوع کا انتخاب کرنا جو تاریخی حقائق کے ساتھ ساتھ کچھ تخیلاتی موضوعات کی پیش کش کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوا اس طرح خاصا مواد تاریخ سے مل گیا اور بقیہ کام ناول نگار کی فہم و فراست کے نتیجے میں ستھرے انداز میں سامنے آیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کی کردار نگاری مکالموں کی ادائیگی اور زبان و بیان اور منظر نگاری انتہائی عروج پر جا پہنچی ہے ساتھ ہی زندگی کی وہ حقیقتیں جنھیں آپ دھوکہ، فریب، بے حسی، محبت، ایثار و قربانی کہہ سکتے ہیں ناول میں جہاں ان کی ضرورت پیش آئی اتنے بہترین طریقے سے استعمال ہوئیں کہ ناول فنی شہ پارہ بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ نسیم حجازی کی ان خوبیوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''نسیم حجازی کے پلاٹ مربوط اور مبسوط، جست اور ارتقاء پذیر ہیں واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہوتی ہیں جیسے ایک زنجیر کی کڑیاں باہم مربوط ہوں اگر کہیں کوئی واقعاتی خلا پیدا بھی ہوتا ہے تو نسیم حجازی اس خلا میں تاریخ کا کوئی ورق اس خوبی سے رکھ دیتے ہیں کہ یہ خلا محسوس نہیں ہوتا۔''[۱]

یقیناً اسی وجہ سے کرنل غلام سرور نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''نسیم حجازی کے ناول ''آخری چٹان'' میں اسلوب اور فن کے اعتبار سے خطابت اور ادبیت کا امتزاج ہے۔ ناول کے واقعات آہستہ آہستہ ابھرتے اور نقطہ عروج تک پہنچتے پہنچتے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ لفظوں، فقروں، جملوں کی ترتیب بھی موزوں ہے اور بعض حصوں میں جذبات کا سیلاب قاری کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ کہانی میں تبلیغی احساس کی لہریں بھی اٹھتی ہیں لیکن ادبیت برابر ان کی عناں گیر رہتی ہے کرداروں کے نقوش واضح ہیں اور ان کی گفتگو میں اختصار، ایجاز، اور مصنوعی گہرائی ہے اور سب کچھ اس لئے ممکن ہو سکا ہے کہ مصنف نے کہانی کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے مناسب ترجیحات متعین کی ہیں۔''[۲]

یہی رائے ڈاکٹر عبدالمغنی نے پیش کی ہے:

''اس (آخری چٹان) میں ہیرو اور اس کے رفیقوں کی مؤثر کردار نگاری کے ساتھ ساتھ واقعات کا اتار چڑھاؤ اسے کمالِ فن کا ایک نمونہ بھی بنا دیتا ہے اس سلسلے میں سلطان جلال الدین کی نفسیات کا تجزیہ بھی ایک خاص چیز ہے اور اس کے مظاہر بہت پر اثر ہیں۔''[۳]

اس طرح یہ کہنا کہ فنی تقاضوں کی تکمیل میں نسیم حجازی ہمہ تن مصروف رہے انھوں نے جہاں تاریخی حقیقتوں کا خیال رکھا وہیں تخیل کے ذریعے معاشرہ کے سماجی اور تہذیبی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا مگر قاری کی دلچسپی اور شعوری طور پر اس مقصد کو بھی مدنظر رکھا جو اس ناول کو قلمبند کرتے ہوئے ان کے پیش نظر تھا یہ وہ دور ہے کہ جب تقسیم برصغیر برپا ہوئی اور تاریخ عالم نے چنگیزی ظلم و زیادتی کو فراموش کر

۱۔ اردو میں تاریخی ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۷۵۱۔

۲۔ نسیم حجازی۔ اپنی تحریروں کے آئینے میں مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۱۶۵۔

۳۔ نسیم حجازی کا فن مشمولہ سیارہ، ڈاکٹر عبدالمغنی، ص ۲۲۱۔

کے ہندو اور سکھوں کی بربریت کا وہ خونی رقص دیکھا جو شاید ہی کبھی انسانی ذہن و تصور کے کسی گوشے میں اپنے تمام تر حقیقی منظر نامے کے ساتھ ظاہر ہو سکے حالانکہ اس سے قبل نسیم حجازی اپنے ایک ناول انسان اور دیوتا میں ان مسلم رہنماؤں کی خام خیالی کا پول کھول چکے تھے جو متحدہ ہندوستان کے حامی تھے انسان اور دیوتا میں نسیم حجازی نے ذات پات کے نظام اور اس نظام کی بدولت شودر کی ذلت و رسوائی کو برسرِ عام لا کر ہندو ذہنیت کے چہرے سے نقاب ہٹایا تھا۔ جس کے تعارف میں عبدالمجید سالک رقمطراز ہیں:

''انہوں (نسیم حجازی) نے اونچی ذات والوں کے ہاتھوں اچھوتوں کی ویرانی، انسان کی طبعی شقاوت کی بیداری اور بت پرستی اور عدم مساوات کے خلاف فطرت کا جو فسانہ لکھا ہے وہ محض زمانۂ قدیم کی تاریکیوں ہی کی داستان نہیں بلکہ آج بھی وسط ہند اور جنوبی ہند میں اس کے مظاہر آئے دن نظر آتے ہیں۔''[۱]

اور پھر جب متحدہ ہندوستان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تو تقسیم کے موقع پر ہونے والے فسادات اس المیے کا منہ بولتا ثبوت ہیں جس کی پیشگی اطلاع اس ناول کے ذریعے دی گئی تھی مگر ہندو فسطائیت یہیں تک خاموش نہ ہوئی بلکہ مشرقی بازو کے باسیوں میں تعصب کی وہ آگ سلگائی جو ۱۹۷۱ء کی تقسیم پر منتج ہوئی یہی وجہ ہے کہ نسیم حجازی نے اس ناول کے دیباچے کو از سرِ نو تحریر کر کے ناول میں شامل کیا یہ ناول دو تہذیبوں کے درمیان ذہنیت کے فرق کو واضح کرتا ہے۔ اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر نزہت سمیع الزمان کی رائے خاصی مؤثر معلوم ہوتی ہے:

''اس ناول میں جہاں تک قصہ اور واقعات کا تعلق ہے رومانی اور خیالی قسم کے ہیں ان سے کسی قدیم دور کا تصور بھی ذہن میں نہیں آتا لیکن چونکہ ناول کو موضوع بہت اہمیت رکھتا ہے اور جس زمانے میں یہ ناول لکھا گیا اس وقت ہندو معاشرہ میں چھوت چھات زور شور سے جاری تھی اس لیے واقعات بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتے۔''[۲]

اس طرح موضوع پر ناول نگار کی گرفت، بیان میں حقیقت پسندی اور کہانی کا معاشرے پر اثر انداز ہونا پایا جاتا ہے۔ یہ ناول اُن کے بنیادی افسانوں میں سے ایک شودر کے موضوع پر تفصیلی انداز کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہی وہ موقع تھا جب ان کی تحریریں پسند کی گئیں جوان کے ناول نگار بننے کا سبب بنیں۔

نسیم حجازی نے ہندوستان کے جس موضوع پر انتہائی گرفت کا ثبوت دیتے ہوئے طبع آزمائی کی ہے وہ بنگال سے لے کر دہلی اور پھر سرنگاپٹم کی وہ عظیم داستان ہے، جس کی تسخیر کے بغیر انگریزی حکومت کا اقتدار مکمل نہ ہو سکتا تھا علی وردی خان سے لے کر نواب سراج الدولہ کی شکست تک کا حال اور پھر دہلی میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں مرہٹوں کی تاریخی شکست۔ مگر سرنگاپٹم میں حیدر علی کی ابتدائی فتوحات اور ٹیپو سلطان کی کامیابیوں کا انجام کار اس کی تلوار کے ٹوٹ جانے اور شہادت پا جانے تک کا تذکرہ ''معظم علی'' اور ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' میں پیش ہوا ہے یہ محض دو سو سال پرانی تاریخ ہے، جس سے لوگوں کی واقفیت بے انتہا تھی اس لیے تصرف کی

۱۔ تعارف مشمولہ انسان اور دیوتا، عبدالمجید سالک، ص ۲۲،۲۳۔

۲۔ اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء، ڈاکٹر نزہت سمیع الزمان، ص ۱۶۸۔

گنجائش تو کجا تخیلاتی کرداروں کو بھی پھونک پھونک کر استعمال کرنا پڑا۔ موضوع اور اس کی جزئیات اس قدر وسیع تھیں کہ دو ناولوں پر محیط ہونے کے باوجود دلچسپی اور تجسس کا عنصر انتہائی عروج پر رہا۔ زبان و بیان، مکالموں کی ادائیگی اور منظر نگاری کمال عروج پر پہنچ گئی ہے خاص طور پر دریا کاویری سے دریائے کابل تک کے مسافر کی مسافت ار ماضی کے دھندلکوں میں اس کا جھانکنا بہترین منظر نگاری کہی جا سکتی ہے اس کے علاوہ جا بجا پلاٹ کی بندش اور کرداروں کے بہترین استعمال کی بدولت کہانی کا مربوط ہونا ناول نگاری کی تاریخ میں ایک افسانے سے کم نہیں یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ لکھتے ہیں:

''معظم علی'' میں واقعات کا آغاز مرشد آباد کے قید خانے سے ہوتا ہے جہاں معظم علی قید ہے قاری آغاز ہی سے یہ جاننے کا خواہشمند ہوتا ہے کہ معظم علی کون ہے اور یہاں کیوں قید ہے۔ یہیں سے تاریخ قصہ بننے لگتی ہے اور قصہ کا اصل پلاٹ ابھرنے لگتا ہے۔ ''معظم علی'' کے واقعات کے پس منظر میں تاریخی واقعات پھیلنے لگتے ہیں اور پھر تاریخ اس مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگتی ہے۔''[۱]

اگر یہ ناول کی فنی ضرورت نہیں تو اور کیا چیز ناقدین کو مطلوب ہے کیونکہ دلچسپی، پلاٹ کا مربوط ہونا تاریخی کرداروں کا تمام تر حسن ان کے حسب، ونسب و مراتب کے عین مطابق ہے منظر نگاری انتہائی خوبصورت اور جاندار ہے مکالموں کی زبان و بیان سادہ اور سہل ہے الغرض ہر وہ چیز موجود ہے جو ناول کے فنی لوازمات میں شامل ہے اور پھر ان فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہترین طور پر استعمال کیا ہے۔ ہندوستان کی تہذیب سے وابستہ ایک اور ناول ''آخری معرکہ'' ہے جس کا موضوع محمود غزنوی کی فتوحات ہیں اس ناول میں ہندوستان کے تمدنی حالات اور مذہبی اعتقادات کا پول کھولنے کی کوشش ہے اس ناول میں بھی پلاٹ انتہائی چست، مستحکم اور مضبوط ہے کردار نگاری اپنے عہد اور معاشرے کی عکاس ہے مکالموں کی ادائیگی کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ حسب مراتب ہیں منظر نگاری تمام تر جغرافیائی محل وقوع کے عین مطابق ہونے کی وجہ سے انتہائی پُر اثر ہے مقصدیت کو کرداروں کی زبان سے اس خوبی سے ادا کرایا گیا ہے کہ نسیم حجازی پر لگنے والا تقاریر اور طویل مکالموں کا الزام بے اثر ہو جاتا ہے اسی طرح نسیم حجازی کا ناول ''خاک اور خون'' معاشرتی ناول کی قسم میں گنا جا سکتا ہے بظاہر اس کے موضوعات دو دہائیوں سے زیادہ کے عرصے پر پھیلے ہوئے ہیں مگر ناول کا اصل موضوع تقسیم برصغیر کے موقع پر رونما ہونے والے فسادات ہیں جس کی منظر نگاری انتہائی رقت انگیز مگر بے انتہا متاثر کن ہے اس کی ایک وجہ تو ان یا ان جیسے واقعات کا حقیقی ہونا ہے پھر نسیم حجازی کے قلم کی روانی نے انہیں چلتا پھرتا تصویری رنگ میں پیش کر کے ڈرامائی انداز میں ڈھال دیا ہے منظر خاصے طویل مگر پُر اثر ہیں قاری کسی لمحے بھی بوریت محسوس نہیں کرتا بلکہ اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے مکالمے انتہائی اثر انگیز اور برجستہ ہیں جہاں ان میں طوالت موجود ہے تو اس کی گنجائش بھی ہے کہ بلا وجہ کردار تقریر نہیں کرنے لگتا البتہ ''اے قوم'' کے نام سے جو حصہ شامل ہے چونکہ مقصدیت سے بھر پور ہے اس لئے ناول کے فن کو متاثر کرتا ہے۔ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ نے اس ناول کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

۱۔ اردو میں تاریخی ناول؛ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص: ۷۵۰۔

''ناول میں جدو جہد آزادی اور قیام پاکستان تک کے واقعات اور فسادات کی خونریز جھلک اس ناول میں ملتی ہے نسیم حجازی نے ''خاک اور خون'' میں سطحی جذباتیت کو تحریک دینے کے بجائے سوچ اور فکر کو تحریک دی ہے اور یہ سوال اٹھایا ہے کہ ہندو اور سکھ نا قابلِ اعتبار قوم ہیں ان پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس ناول کے کردار فرضی ہیں لیکن واقعات تاریخ کے اس تاریخ دور سے منتخب کیے ہیں جب مذہبی تعصب نے انسان سے اس کے انسان ہونے کا شرف چھین لیا تھا اور ہندوؤں اور سکھوں نے بلا اشتعال مسلمان مہاجرین کے قافلوں کو لوٹا، قتل و غارت گری کی، مسلمان عورتوں کو اغوا کیا اور بچوں کو اپنے نیزوں کی انیوں پر سجایا۔''[۱]

اس کے لئے جس قسم کے اسلوب بیان کی ضرورت تھی اسے انہوں نے بہترین انداز میں برتا ہے جس کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر مرزا محمد منور رقم طراز ہیں:

''نسیم حجازی کا اسلوبِ بیان بڑا زوردار ہے ادبی شان یہاں وہاں جلوہ گر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ناولوں کو دل آویز بنانے میں ان کے ادبی طرز و اسلوب کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ قدرتی امر ہے کہ کوئی کہانی سنانے والا اگر الفاظ و تراکیب اور عمومی بیان ایسا اختیار نہیں کرتا جو واقعات کے ساتھ ساتھ الفاظ کا جادو بھی جگا رہا ہو تو قارئین و سامعین کی توجہ کے لئے مسلسل کشش بحال نہیں رہتی۔ خشک اسلوب بیان بیزار کر دیتا ہے۔ زیادہ بوجھل اسلوب بیان بھی ملال انگیز ہوتا ہے۔ نسیم حجازی کا اسلوب بیان بڑا متوازن ہے یہی باعث ہے کہ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے اچھے پڑھے لکھے افراد بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور میٹرک اور ایف۔ اے کے طلبہ بھی اگر اسلوب سپاٹ ہوتا تو وہ لوگ جو اپنے آپ کو عالم سمجھتے ہیں یا سچ مچ عالم ہیں، نسیم حجازی کے ناول نہ پڑھ سکتے اسی طرح اگر اسلوب بہت زیادہ بوجھل ہوتا تو نوجوانان ذکور و اناث اور درمیانہ درجے کے تعلیم یافتہ قارئین ان ناولوں کو منہ نہ لگاتے۔''[۲]

نسیم حجازی کے انداز نگارش کی یہ خوبی کسی ایک ناول میں نہیں تمام میں بدرجہ اتم موجود ہے یہی خوبی ناول کے موضوع کو قاری کے لیے دلنشین بناتی ہے تو دوسری طرف ادبیت کے معیار کو بلند تر کر دیتی ہے موضوع پر ان کی گرفت اور طرز نگارش کا یہ ڈھنگ ان کے قاری کو نئے ناولوں کا متلاشی بناتا ہے اور جب نسیم حجازی اپنے اصل موضوع تاریخی ناول نگاری سے ہٹ کر معاشرتی موضوعات کو اختیار کرتے ہیں تو ان کا یہ کارہائے نمایاں ''پردیسی درخت'' اور ''گمشدہ قافلے'' کی کہانی میں ملتا ہے۔ ان ناولوں کا موضوع ارد گرد پھیلی ہوئی معاشرت کی عکاسی اور تہذیب و تمدن سے اپنے رشتے کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ روایات اور قدروں کی بہترین پیش کش ہے اسے آپ بیتی بھی کہہ سکتے ہیں مگر پلاٹ پر گرفت اور موضوع کا پھیلاؤ خاندانی حالات اور معاشرتی ضرورتوں کو بہترین انداز میں پیش کرنے کا فنی سلیقہ نسیم حجازی کی حیثیت کو منفرد اور ممتاز بناتا ہے اور بلاشبہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ قلم کی روانی اور موضوع پر گرفت کا جو خداداد ملکہ انہیں حاصل تھا وہ ان کے نام کو زندہ رکھنے اور ادب میں بلند مقام پر پہنچانے کا باعث ہے۔

نسیم حجازی کے موضوعات کا ایک خاص حصہ عرب کے حالات دور جاہلیت سے اسلامی فتوحات کے دور پر مبنی ہیں اس

---

[۱] اردو میں تاریخی ناول؛ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۲۴۲، ۲۴۳۔

[۲] نسیم حجازی کی فتوحات مشمولہ سیارہ؛ پروفیسر محمد منور مرزا، ص ۲۰۳، ۲۰۵۔

موضوع کو سمیٹنے کے لئے قیصر و کسریٰ اور قافلۂ حجاز کے نام سے دو ناول قلمبند کیے جن میں موضوع کی گہرائی، وسعت اور حقیقت پسندی کو برقرار رکھنے کے لئے تاریخی مطالعے پر اکتفا کرنے کے بجائے ذاتی طور پر عرب کی سرزمین پر جا پہنچے اور پھر اس موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی عرب کے دورِ جاہلیت سے لے کر خلفاءِ راشدین کے ادوار کا تذکرہ کرتے ہوئے زبان و بیان میں حدِّ ادب اور احترام کے پہلو کو خوب برتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ لکھتے ہیں:

''قیصر و کسریٰ اور قافلۂ حجاز فنی اعتبار سے نسیم حجازی کے شاہکار قرار دیے جا سکتے ہیں۔ واقعات کے بیان اور کردار نگاری میں کسی جگہ جھول محسوس نہیں ہوتا۔''[1]

محض یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب نے اس کے پلاٹ پر رائے زنی کرتے ہوئے مرقوم کیا ہے:

''قیصر و کسریٰ اور قافلۂ حجاز کے پلاٹ خاص طور پر بڑے دلچسپ اور دائرہ در دائرہ پھیلتے جاتے، سکڑتے جاتے اور پھر پھیلتے جاتے ہیں۔ اس پھیلنے سکڑنے کی بنا پر اس قدر طویل ناولوں کے پلاٹوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ 'قیصر و کسریٰ'' میں قبل از اسلام ایرانی و رومی تہذیب و ثقافت کے نقشوں سے ناولوں کا پلاٹ ابھرتا ہے۔''[2]

کیونکہ نسیم حجازی کو تاریخی ناول لکھنے کے فن پر عبور ہے اس لیے وہ اپنی اس صلاحیت کا خوب خوب اعتراف کراتے ہیں ایسا ہی ایک انکشاف ڈاکٹر عبد المغنی کی اس تحریر میں موجود ہے:

''وہ سچے واقعات کو افسانوی قالب میں ڈھال کر ماجرا سازی اور کردار نگاری کا جادو جگاتے ہیں حقائق کی مرقع نگاری حالات کے تجزیے کے ساتھ مل کر معلوم و معروف قصوں کو پُر اسرار طلسمات میں بدل دیتی ہے۔ مواد ہیئت کے سانچے میں ڈھل کر نمونۂ فن بن جاتا ہے۔ سارا کمالِ فن کارانہ ترتیب و تنظیم کا ہے۔''[3]

ان حوالوں کی روشنی میں یہ رائے قائم کرنا درست معلوم ہوتا ہے کہ نسیم حجازی فنی تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے اپنی ناول نگاری کا جادو جگا رہے تھے۔

نسیم حجازی کا ایک اور پسندیدہ موضوع اندلس کی داستان پر مشتمل ہے جسے پیش کرنے کے لیے شاہین اور یوسف بن تاشفین تحریر کیے ان ناولوں میں مسلمانوں کے انحطاط پذیر معاشروں کو روبہ زوال ہونے سے روکنے کی ایک کوشش کا بیان ہے ان ناولوں میں کردار سازی پر انہوں نے اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے یہی وجہ ہے کہ کردار جیتے جاگتے روپ میں قاری کی نظروں کے سامنے گھومتے پھرتے ہیں۔ جنگی نقشوں کا بیان اس قدر انہماک سے کیا ہے کہ پڑھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ فوجوں کی ترتیب و تنظیم آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہے۔

اسی وجہ سے کرنل غلام سرور رقم طراز ہیں:

---

[1] اردو میں تاریخی ناول: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۴۴۷۔

[2] ایضاً۔

[3] نسیم حجازی کا فن: ڈاکٹر عبد المغنی، ص ۴۰۶۔

''یوسف بن تاشفین'' کی مقبولیت اوّل تو تاریخ کے اس باب کی اہمیت کی بنا پر ہے جو اس ناول کا موضوع ہے اور دوسرے مصنف کے فنی احساس کی بنا پر اس ناول کے اسلوب میں بھی ہلکے ہلکے اشاروں میں کوئی اہم بات کہنے، منظر نگاری اور واقعہ نگاری میں ایجاز واختصار سے کام لینے اور مکالموں میں ادبیت، شوخی اور تیکھا پن برتنے کا وہ انداز برابر قائم ہے جسے نسیم حجازی نے موجودہ دور کی ناول نگاری میں عام کیا ہے۔''[۱]

کرنل غلام سرور ناول ''شاہین'' کی انفرادیت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شاہین'' میں نسیم حجازی نے کہانی کو پھیلانے کی بجائے سمیٹ کر ایک ایسا خوبصورت سانچہ بنایا ہے کہ اثر و تاثر کا جادو ہر حصہ میں جاگ اٹھا ہے۔ یہ انداز شروع سے آخر تک یکساں طور پر قائم رہتا ہے۔ انہوں نے اظہار بیان اتنا سادہ، بے ساختہ اور رواں رکھا ہے کہ پڑھنے والا، کرداروں کی طویل تقریروں سے گھبراتا نہیں جاتا، بلکہ یہ تقریریں اور وعظ، خود کہانی کے عمل کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس ناول میں رومان کی دلکشی اور محبت کی آگ دھیمے دھیمے سلگتی رہتی ہے۔ انہوں نے کہانی کے بیان میں وہی روانی اور تیزی رکھی ہے جو تاریخی ناولوں کے لیے ضروری ہے۔ ساری کہانی فطری انداز میں آگے بڑھتی ہے۔ کردار سب کے سب موقع و محل کے مطابق نہ صرف جاندار ہیں بلکہ کہانی کے مزاج میں رچ بس کر پورے طور پر ابھرتے ہیں۔

''شاہین'' کی تاثیر میں جہاں ایک طرف اس کے موضوع کو دخل ہے وہاں دوسری طرف مصنف کے شاعرانہ وایمائی اسلوب، اختصار وایجاز سے مملو حقیقت نگاری اور تخیل کی رنگ آمیزی کے امتزاج کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ منظر نگاری میں مبالغے کی ہلکی سی جھلک، کرداروں کی مصوری اور خاص کر ان کے جذبۂ محبت کے اظہار میں جذباتیت سے احتراز، اصلاحی اور تبلیغی مقصد کے اظہار میں ولولہ اور جوش کے باوجود توازن اور اعتدال۔۔۔۔۔ اس عظیم ناول کی نمایاں صفات ہیں۔''[۲]

ایسے ہی خیالات کا اظہار ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ کرتے ہیں:

''شاہین'' ان کا ایک ایسا ناول ہے جسے نقادوں نے ان کا شاہکار ناول قرار دیا ہے۔ ''شاہین'' اپنے پلاٹ کی ترتیب و تنظیم کی بنا پر ان کے دوسرے ناولوں سے مختلف نہیں ہے لیکن اس ناول میں واقعات کی رفتار بہت تیز ہے اور ڈرامائی لمحات بار بار قاری کو تجسس کی خلش میں مبتلا کرتے چلے جاتے ہیں۔''[۳]

ڈاکٹر عبدالمغنی نے بھی ناول کے فنی پہلوؤں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شاہین'' اس قصے میں حق و باطل اور خیر و شر کی کشمکش بڑے ولولہ انگیز انداز سے سامنے آئی ہے جس کی روداد پڑھ کر مصائب کے باوجود اہلِ ایمان کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ یہ فکری عنصر ایک کمالِ فن کی بنیاد پر ابھرتا ہے اور وہ ہے تجسس سے بھرپور

۱۔ نسیم حجازی۔ اپنی تحریروں کے آئینے میں مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ؛ ڈاکٹر غلام سرور ستارہ امتیاز، ص ۱۶۹، ۱۶۷۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۶۲، ۱۶۳۔

۳۔ اردو میں تاریخی ناول؛ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۵۰۷۔

ماجرا کی تعمیر جس میں واقعات، کردار اور مکالمات ایک تناسب اور توازن کے ساتھ حقائق کی چلتی پھرتی تصویریں بھی دکھاتے ہیں اور اس کے پیچھے کارفرما تصورات کی آگہی بھی بخشتے ہیں۔''[1]

اسی طرح ان کے ناول ''یوسف بن تاشفین'' کے بارے میں ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ نے تحریر کیا ہے:

''یوسف بن تاشفین'' میں بھی ان کی گرفت پلاٹ پر بڑی مضبوط ہے۔ کوئی واقعہ فالتو نظر نہیں آتا۔ ہر واقعہ دوسرے واقعہ کا منطقی ردِعمل نظر آتا ہے واقعات میں خواہ مخواہ کا پھیلاؤ تو نہیں نہ وہ اِدھر اُدھر کی باتوں اور فضول جزئیات میں وقت ضائع کرتے ہیں۔''[2]

اِن آراء کی روشنی میں یہ بات طے ہو جانی چاہیے کہ نسیم حجازی نے ناول نگاری کے فنی لوازمات اور قارئین کی پسند ہر دو انداز کو ملحوظ رکھتے ہوئے ناول نگاری کی ہے وہ واقعات کو دلچسپ طریق پر لکھنے کا فن جانتے ہیں اس خداداد صلاحیت کی بدولت وہ موضوعات میں انتہا درجے کی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں تاکہ قاری محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں منہمک بھی رہے۔

اسپین کے زوال پذیر معاشرے کو کہ جب اسپین کا جغرافیائی حدود اربع مسلمانوں کے لیے تاریخ بن رہا تھا المناک اور رقت انگیز موضوع کو ناول کے قالب میں اس خوبی سے ڈھالا کلیسا کی کارفرمائیاں دردناک سہی مگر حقیقی طور پر پڑھنے والوں کے سامنے آ گئی ہیں۔ یہ ایک طویل موضوع ہے پہلے غرناطہ سے مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ پھر ظلم و ستم کی وہ داستان جس نے مسلمان پر زمین تنگ کر دی یہاں تک کہ اسلام کے نام لیوا ہسپانیہ کی سرزمین میں ناپید ہو گئے۔ ''کلیسا اور آگ'' اور پھر ''اندھیری رات کے مسافر'' میں اس موضوع کو سمیٹنے کی جو کوشش نسیم حجازی نے کی ہے وہ ناول نگاری کے فن میں ایک اضافے سے کم نہیں حالات و واقعات تمام تر تاریخی حقائق کے ساتھ قاری کو اپنی جانب متوجہ رکھتے اور اس کی تمام تر ہمدردیوں کو اپنی طرف مرکوز رکھتے ہیں اس فنی خوبی کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ رقمطراز ہیں:

''اندھیری رات کے مسافر'' اور ''کلیسا اور آگ'' میں واقعات بتدریج نشوونما پاتے ہیں اور نقطۂ عروج تک پہنچتے پہنچتے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔''[3]

نسیم حجازی کی انہی فنی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر شفیق احمد لکھتے ہیں:

''نسیم حجازی نے اُردو میں تاریخی ناول نگاری کی روایت میں نہایت اہم اضافہ کیا ہے اور آج ناول کی یہ قسم اُس مقام سے بہت آگے ہے جہاں شرر نے اسے چھوڑا تھا۔ فنی نقطۂ نظر کے علاوہ یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ اردو کے کسی دوسرے ناول نگار کو قارئین میں وہ شہرت و مقبولیت نہیں ملی جو نسیم حجازی کے حصے میں آئی ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا

---

[1] نسیم حجازی کا فن مشمولہ سیارہ، ڈاکٹر عبدالمغنی، ص ۴۳۵۔

[2] اردو میں تاریخی ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۷۵۰، ۷۵۱۔

[3] ایضاً، ص ۷۵۰۔

سکتا۔''[1]

اسی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ نسیم حجازی نے چودہ سو سال کی تاریخ کو ایک مورخ کے انداز سے لکھنے کے بجائے ناول نگار کے نرم و نازک انداز، دلنشین پیرائے بیان اور زبان و بیان کی مٹھاس کے مطابق لکھا ہے جس کی وجہ سے ان کے پلاٹ مضبوط و مستحکم، کردار زندہ و جاندار، مکالمے چست اور منظر نگاری دلنشین اور قاری پر اثر انداز ہوتی ہے حالانکہ ڈاکٹر شفیق احمد کا خیال ہے:

''ان (نسیم حجازی) کے ناولوں کے اکثر پلاٹ ایک حد تک یکساں نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان کے کردار عام طور پر کسی ابھری ہوئی انفرادیت کے حامل نہیں ہوتے اور اپنے افعال و اعمال کی یکسانی کی وجہ سے ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے ممیز کرنا دشوار نظر آتا ہے۔ نسیم حجازی کے کردار بعض اوقات ایک جیسے مکالمے بولتے ہیں اور ان کے مکالموں میں اختصار کا حسن نہیں پایا جاتا اور مکالمے اکثر تقریروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں مزید یہ کہ نسیم حجازی کے ناول فنی حسن سے یکسر تہی نہیں ہیں مثلاً کردار نگاری کے ضمن میں ان کے تاریخی ناول ''شاہین'' کا کردار ابوداؤد، اردو ناول کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے اسی طرح ''آخری چٹان'' میں نسیم حجازی نے بغداد کے گلی کوچوں میں مناظرہ بازی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ منظر نگاری کی انتہا پر پہنچا ہوا ہے جبکہ اس کے پس منظر میں واقعاتی مزاح کی جو تصویر نسیم حجازی نے بنائی ہے وہ بھی لاجواب ہے۔''[2]

اس طرح ان کا اسلوب نگارش منفرد اور یکتا ہے وہ زبان و بیان پر قدرت رکھتے ہیں اس بارے میں پروفیسر مرزا محمد منور رقمطراز ہیں:

''نسیم حجازی کا اسلوب بیان بڑا زوردار ہے ادبی شان یہاں وہاں جلوہ گر ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ناولوں کو دل آویز بنانے میں ان کے ادبی طرز و اسلوب کا بھی بڑا ہاتھ ہے قدرتی امر ہے کہ کوئی کہانی سنانے والا اگر الفاظ و تراکیب اور عمومی بیان ایسا اختیار نہیں کرتا جو واقعات کے ساتھ ساتھ الفاظ کا جادو بھی جگا رہا ہو تو قارئین و سامعین کی توجہ کے لئے مسلسل کشش بحال نہیں رہتی۔ خشک اسلوب بیان بیزار کر دیتا ہے۔ زیادہ بوجھل اسلوب بیان بھی ملال انگیز ہوتا ہے۔ نسیم حجازی کا اسلوب بیان بڑا متوازن ہے یہی باعث ہے کہ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے، اچھے پڑھے لکھے افراد بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔''[3]

ان کے اس اسلوب بیان کے معترف کرنل غلام سرور بھی ہیں وہ لکھتے ہیں:

''موصوف (نسیم حجازی) کے قلم میں بلا کی تاثیر ہے وہ قاری کو اپنے خلوص اور زور بیان کے بل بوتے پر اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اس کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ نوجوان نسل خاص طور پر ان کے افکار اور ان کے اسلوب سے متاثر ہے۔ ان کی تحریریں پڑھ کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آنکھیں موتی چن رہی ہوں۔''[4]

---

[1] نسیم حجازی بحیثیت تاریخی ناول نگار مشمولہ سیارہ، ڈاکٹر شفیق احمد، ۱۰۹۔

[2] ایضاً، ص ۱۰۰۔

[3] نسیم حجازی کی فتوحات مشمولہ سیارہ، پروفیسر مرزا محمد منور، ص ۲۰۵۔

[4] نسیم حجازی۔ اپنی تحریروں کے آئینے میں مشمولہ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ، کرنل غلام سرور، ص ۱۶۹۔

نسیم حجازی پر ایک الزام یہ ہے کہ ان کے کردار گفتگو کرنے کے بجائے تقریر کرتے ہیں حالانکہ ناولوں کے مطالعہ سے، جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بلاوجہ تقریر نہیں کی جاتی موقع ومحل کی مناسبت سے جہاں تقریر کی ضرورت ہو صرف وہیں تقریر ہوتی ہے اس کی طوالت پر اعتراض بجا لیکن اگر صاحبانِ نقد ونظر غور سے دیکھیں تو اس موقع پر اس کی ضرورت ہوتی ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالمغنی کی رائے دیکھیے:

''وہ (نسیم حجازی) حسب موقع ومحل جدوجہد کے عزائم اور ایثار وقربانی کے جذبات فطری طور پر ابھارنا چاہتے ہیں اور وقتی تقاضوں کے لحاظ سے ان کی خطابت پر اثر ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے سنگین حقائق کے راز کھول کر دانائی بصیرت کا سبق بھی دیتی ہے۔ اس طرح بہادرانِ اسلام شجاعت کے معرکوں میں تلوار کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی کام لیتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ بہترین تہذیبی اقدار کے حوالے دے کر لوگوں کی دینی وملی حمیت اور انسانی غیرت کو ابھارتے ہیں۔ اس طریقے سے شعور وکردار کی اس تعلیم وتربیت کا سامان بھی ہوتا ہے جو ناولوں کا محرک تخلیق اور ان کے خاص کرداروں کا مقصدِ حیات ہے اخلاقیات کا یہ درس بہر حال ارتقائے ماجرا کے ان مرحلوں پر ہوتا ہے جن سے گزرے بغیر قصہ اپنے متوقع انجام تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس اعتبار سے خطابت بالکل واقعات سے وابستہ ہوتی ہے اور اس سے کرداروں کی شناخت بھی قائم ہوتی ہے چنانچہ اس انداز سے ناول نگاری کے بعض فنی تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے۔''[۱]

لیکن وقار عظیم کا تبصرہ کچھ مدح سرائی اور بقیہ معترضانہ ہے جس کے مطابق:

''ان (نسیم حجازی) کے ناولوں پر علیحدہ علیحدہ نظر ڈالی جائے تو آخری چٹان کی خطابت اور ادبیت، شاہین کا شاعرانہ اور ایمائی اسلوب اور حقیقت میں تخیل کی رنگ آمیزی، یوسف بن تاشفین میں واقعات اور مناظر کے پیش کرنے میں شوخی، ادبی ایجاز و اختصار کا ڈرامائی صرف اور آخری معرکہ کے مکالموں کی قدرت بیان میں ناولوں کی کامیابی اور تاثیر کا راز پوشیدہ نظر آتا ہے لیکن فنی کامیابی کے ان ظاہری وسائل کے پس پردہ اسے ہر جگہ قاری کی خوشنودی حاصل کرنے کا سستا جذبہ بھی کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ بیان کی اس قدرت اور اسالیبِ فن کے استعمال کی سہولت کے باوجود ناولوں پر شروع سے آخر تک چھایا ہوا تبلیغی رنگ اور سستے قسم کی روحانی فضا ان کے ادبی وقار کو کم کر دیتی ہے۔''[۲]

اس سے ملتی جلتی رائے سہیل بخاری نے ان الفاظ میں رقم کی ہے:

''شدت جذبات ان کی ایسی خصوصیت ہے جو دوسری جگہ مشکل سے ملے گی۔ ان کا مطالعہ غیر مسلموں کے لئے دل آزار ہے۔ ان کے مکالمے غیر معمولی طور پر طویل اور غیر فطری ہوتے ہیں مثالیت پسندی ان کا طرۂ امتیاز ہے اور روز مرہ اور محاورے کی غلطیاں اس پر مستزاد۔''[۳]

---

[۱] نسیم حجازی کا فن مشمولہ سیارہ، ڈاکٹر عبدالمغنی، ص ۴۷۔

[۲] داستان سے افسانے تک، وقار عظیم، ص ۲۶۸۔

[۳] اردو ناول نگاری، سہیل بخاری، ص ۱۲۸۔

جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی نسیم حجازی کے موضوعات اور کردار نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''نسیم حجازی کے کردار بدر بن مغیرہ، عاصم، انور علی، ثمینہ، نرگس، نعیم، ابوالحسن، خالد، سلمٰی اور ناہید جیسے با کردار نوجوان اب معاشرے میں کم کم نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ نئی نسل کے اہلِ علم وادب نسیم حجازی کے ناولوں کو اردو ناول کی اصل تاریخ کا حصہ نہیں سمجھتے۔ جنگ ویتنام ہوتی ہے تو اس پر نظمیں لکھتے ہیں۔ اجتماعی جلوس نکالتے ہیں اور قراردادیں پاس کرتے ہیں لیکن جب مجاہدین اسلام افغانستان میں اپنی آزادی اور عظمتِ اسلام کے لئے جہاد کرتے ہیں تو ان کے قلم کی سیاہی خشک ہو جاتی ہے اور ان کے ذہنوں کے رنگ متغیر ہو جاتے ہیں یہ وہ فرق ہے جو گزشتہ چالیس سال کے عرصے میں پیدا ہوا ہے۔ شبلی جنگِ طرابلس اور جنگ بلقان پر ایسی نظمیں لکھتے ہیں کہ سارے برصغیر کے مسلمانوں کا لہو گرم ہو جاتا ہے۔''[۱]

اس مدلل تبصرے کے بعد اس مقصد کو بھی مدِ نظر رکھتے ہوئے نقادانِ فن کی آراء سامنے آئیں تو سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے قبول ہوگی کیونکہ تخلیقی عمل کو جانچتے ہوئے تخلیق کار کے ذہنی شعور، معاشرتی ضرورتوں اور معاشرے کی اقدار وروایات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے ادب زندگی کا عکاس ہے اور زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں لگے بندھے اصولوں اور مغرب سے آنے والی ہدایات کے مطابق مرتب نہیں کی جا سکتیں اس کے لئے اپنی مٹی سے پیار کرنے کا سلیقہ آنا چاہیے اس لئے ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ:

''نسیم حجازی ایک مقصد کے تحت ناول لکھتے رہے ہیں لیکن وہ اپنا مقصد کبھی بھی فن پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ نوجوانانِ ملت کے دل میں اپنے ماضی سے محبت پیدا کی جائے اور ماضی کی تابندہ اور درخشاں روایات کو از سرِ نو زندہ کیا جائے۔ دوسری طرف وہ نوجوانوں کو اپنے ماضی کے وہ مرقعے دکھانا چاہتے ہیں جس سے انہیں یہ احساس ہو کہ انتشار، بغاوت اور غداری قومی تاریخ کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہوتے ہیں۔''[۲]

ماضی کی یہ تصویر دکھانے کے لئے نسیم حجازی کا ذہنی شعور ماضی کے دھندلکوں سے چلتے پھرتے کرداروں کو لفظوں کی صورت میں قرطاس پر اس طرح مرتب کرتے ہیں کہ الفاظ نہیں سامنے جیتی جاگتی زندگی موجزن ہو جاتی ہے اور قاری خود کو اس کا ایک حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس سحر آفرین تحریر کے باوجود اگر معترضین چیں بہ جبیں کرتے ہیں تو یہ ان کا کردار ہے جو حق گوئی پر مبنی تو نہیں البتہ اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی ذمہ داری ضرور پوری کر رہا ہے بعض اعتراضات اگر نسیم حجازی کی شخصیت میں جھانک کر دیکھے جائیں تو بے جا معلوم ہوں گے مثلاً موضوع کو پھیلا کر لکھنے کی وجہ اُن کا صحافتی قلم ہے، جس نے اُن میں یہ دطیرہ پیدا کر دیا کہ وضاحت اور بات کو کھول کھول کر بیان کرنے کی جبلت اُن کے اندر سرایت کر گئی لیکن موضوعات پر گرفت اور دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ یہ سب وہ دلائل ہیں جن کی روشنی میں نسیم حجازی کی ناول نگاری اور ان کی فنی گرفت کے بارے میں ایک بدلی ہوئی رائے سامنے آئے گی اور ناقدینِ فن اس بارے میں اپنی رائے پر نظر ثانی بھی کر سکیں گے۔

---

[۱] نسیم حجازی مشمولہ سیارہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۱۹۹۔

[۲] اردو میں تاریخی ناول، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، ص ۲۰۷۔

کتابیات

نسیم حجازی	داستانِ مجاہد	قومی کتب خانہ ۱۹۴۳ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	انسان اور دیوتا	قومی کتب خانہ ۱۹۴۴ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	محمد بن قاسم	قومی کتب خانہ ۱۹۴۵ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	سو سال بعد	قومی کتب خانہ ۱۹۴۶ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	آخری چٹان	قومی کتب خانہ ۱۹۴۷ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	شاہین	قومی کتب خانہ ۱۹۴۸ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	خاک اور خون	قومی کتب خانہ ۱۹۴۹ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	یوسف بن تاشفین	قومی کتب خانہ ۱۹۵۱ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	آخری معرکہ	قومی کتب خانہ ۱۹۵۳ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	معظم علی	قومی کتب خانہ ۱۹۵۷ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	اور تلوار ٹوٹ گئی	قومی کتب خانہ ۱۹۵۸ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	سفید جزیرہ	قومی کتب خانہ ۱۹۵۸ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	ثقافت کی تلاش	قومی کتب خانہ ۱۹۵۹ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	پاکستان سے دیارِ حرم تک	قومی کتب خانہ ۱۹۶۰ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	قیصر و کسریٰ	قومی کتب خانہ ۱۹۶۴ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	پورس کے ہاتھی	قومی کتب خانہ ۱۹۶۵ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	قافلۂ حجاز	قومی کتب خانہ ۱۹۶۸ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	اندھیری رات کے مسافر	قومی کتب خانہ ۱۹۷۴ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	کلیسا اور آگ	قومی کتب خانہ ۱۹۴۴ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	پردیسی درخت	قومی کتب خانہ ۱۹۷۸ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)
نسیم حجازی	گم شدہ قافلے	قومی کتب خانہ ۱۹۹۱ء	پبلشنگ کلب گوجرانوالہ (ندارد)

آزاد، ابوالکلام / محمد مجیب	ہماری آزادی	اورینٹ لانگ مین لمیٹڈ، کلکتہ ۱۹۷۶ء
ابنِ خلدون، عبدالرحمٰن / علامہ کلیم احمد حسین الہ آبادی	تاریخ ابنِ خلدون (جلد اول تا ہفتم)	نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۸۶ء
اکرام، شیخ محمد	آبِ کوثر	ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور ۱۹۹۴ء
انتظار حسین	بستی	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۴ء
انور سدید، ڈاکٹر	اردو ادب کی مختصر تاریخ	عزیز بک ڈپو، اردو بازار لاہور ۱۹۹۸ء
ایم اسلم	شبِ غم	اردو اکیڈمی، لاہور ۱۹۵۵ء
باری	کمپنی کی حکومت	نیشنل بک فاؤنڈیشن، شرکت پرنٹنگ پریس نسبت روڈ لاہور ۱۹۷۶ء
بخاری، سہیل	اردو ناول نگاری	فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۵ء
بریلوی، شفیق	محمد بن قاسم سے محمد علی جناح تک	نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۸۰ء
بلوچ، اختر علی خان	بلوچستان کی نامور شخصیات	رائل بک کمپنی، کراچی ۱۹۹۴ء
جالبی، ڈاکٹر جمیل	قومی انگریزی اردو لغت	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۴ء
جانسن، ایلن کیمبل / محمد یونس احمد	عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن	نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۶ء
جعفری، رئیس احمد	مجاہد	کتاب منزل، کشمیری بازار لاہور ۱۹۵۸ء
جعفری، رئیس احمد	حجاج بن یوسف	نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۰ء
جعفری، رئیس احمد	بالاکوٹ	شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور ۱۹۶۲ء
جعفری، رئیس احمد	علاؤالدین خلجی	بساطِ ادب، چوک انارکلی، لاہور ۱۹۶۵ء
جعفری، رئیس احمد	سلطانہ	شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور ۱۹۶۸ء
جمعہ، محمد بشیر	شاہراہِ زندگی پر کامیابی کا سفر	ناشر میلاد پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۹۲ء
چراغ، محمد علی	پاکستان منزل بہ منزل	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۴ء
حالی، الطاف حسین	حیاتِ جاوید	آئینہ ادب، لاہور ۱۹۲۳ء
حامد علی، مولانا	اردو جامع انسائیکلوپیڈیا	فریدی بک سینٹر، اردو بازار، کراچی ۱۹۸۸ء

حسن ریاض، سید	پاکستان ناگزیر تھا	شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی کراچی ۱۹۸۷ء
حسینی، علی عباس	ناول اور ناول نگار	کاروان ادب، ملتان ۱۹۹۰ء
حسینی، علی عباس	اردو ناول کی تاریخ اور تنقید	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۴ء
حمید الدین، ڈاکٹر	تاریخ اسلام	فیروزسنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۷۴ء
خان آصف	شعلوں کا کفن	اخبارِ جہاں پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۹۱ء
خدیجہ مستور	آنگن	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۵ء
دمشقی، ابوالفدا عمادالدین ابنِ کثیر / حافظ سید عبدالرشید مدوی، مولانا اختر فتحپوری	تاریخ ابن کثیر (جلد دہم تا چہاردہم)	نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی ۱۹۸۹ء
ڈوزی، پروفیسر رائن ہارٹ / مولوی عنایت اللہ دھلوی	عبرت نامہ اندلس	مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۲ء
راجا، تصدق حسین	نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ	قومی کتب خانہ لاہور ۱۹۸۷ء
راشد الخیری، مصورِ غم، علامہ	صبحِ زندگی	عصمت بک ڈپو، کراچی ۱۹۶۵ء
راشد الخیری، مصورِ غم، علامہ	آفتابِ دمشق	علامہ راشد الخیری اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۹ء
راشد الخیری، مصورِ غم، علامہ	شاہین ودراج	علامہ راشد الخیری اکیڈمی، کراچی ۱۹۷۲ء
رسوا، مرزا محمد ہادی	امراؤ جان ادا	جہانگیر سنز، اردو بازار، لاہور ۱۹۸۷ء
رسوا، مرزا محمد ہادی	اختری بیگم	لاہور اکیڈمی، لاہور (ندارد)
رسوا، مرزا محمد ہادی	شریف زادہ	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۹۰ء
رضا خان، پروفیسر محمد رفیع انور، محمد	تاریخ مسلمانانِ عالم	علمی کتاب خانہ، لاہور ۱۹۸۷ء
رضوی، حسن عسکری، پروفیسر	تحریکِ قیامِ پاکستان	علمی کتاب خانہ، لاہور ۱۹۸۰ء
زاہد چودھری	پاکستان کی سیاسی تاریخ (جلد اوّل ودوم)	ادارہ مطالعہ تاریخ ۱۹۹۳ء
ساگر، طارق اسمٰعیل	میں ایک جاسوس تھا	قومی کتب خانہ، لاہور ۱۹۹۶ء
سجاد، مفتی زین العابدین میرٹھی	بارہ اکتوبر کی کہانی	ساگر پبلشرز، لاہور (ندارد)
سجاد، مفتی زین العابدین میرٹھی	تاریخِ ملت	ادارہ اسلامیات لاہور ۱۹۹۱ء

سردھنوی، صادق حسین — ماہِ عرب — ہمالیہ بک ہاؤس، دہلی ۱۹۸۷ء

سرفراز حسین، مرزا — تحریکِ پاکستان — پاکستان اسٹڈی سینٹر پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۸۷ء

سرور، آل احمد — تنقیدی اشارے — اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۶۳ء

سکسینہ، رام بابو/ مرزا محمد عسکری — تاریخ ادب اردو — گلوب پبلشرز لاہور ۱۹۸۶ء

ڈاکٹر اعجاز حسین، قیوم نظامی

سنہا، نریندر کرشن/ اقتدار حسین صدیقی — حیدر علی — مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۸۷ء

سیموئیل، ڈاکٹر سمائلز/ اظہر تابش — خوشحال زندگی — دارالشعور، لاہور ۲۰۰۲ء

شرر، مولانا عبدالحلیم لکھنوی — فردوسِ بریں — سلطان حسین اینڈ سنز، کراچی ۱۹۵۹ء

شرر، مولانا عبدالحلیم لکھنوی — یوسف نجمہ — سلطان حسین اینڈ سنز، کراچی ۱۹۶۲ء

شرر، مولانا عبدالحلیم لکھنوی — حسن انجلینا — مکتبہ القریش، لاہور ۱۹۸۷ء

شرر، مولانا عبدالحلیم لکھنوی — ملک العزیز ورجنا — سیٹھ آدم جی عبداللہ پبلشرز، لاہور (ندارد)

شرر، مولانا عبدالحلیم لکھنوی — عزیزۂ مصر — سلطان حسین اینڈ سنز، کراچی (ندارد)

شرر، مولانا عبدالحلیم لکھنوی — فتح اندلس — مکتبہ القریش، لاہور ۱۹۹۱ء

صدیق سالک — پریشر ککر — مکتبہ سرمد، راولپنڈی ۱۹۸۹ء

صدیق سالک — میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا — فیصل ناشران وتاجران کتب لاہور ۱۹۹۷ء

صدیقی، ابواللیث — آج کا اردو ادب — فیروز سنز لاہور (ندارد)

صدیقی، ادریس — اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ — شیخ اردو منزل کراچی ۱۹۸۵ء

صدیقی، فیض عالم — اسلام کے نامور سپہ سالار — اسلامک بک بینک، لاہور (ندارد)

صفدر محمود، ڈاکٹر — پاکستان تاریخ وسیاست — جنگ پبلشرز، لاہور ۱۹۹۲ء

ضیاء، شکیل احمد — تاریخ پاکستان وہند — علی بک ڈپو، کراچی ۱۹۶۶ء

عبدالسلام، پروفیسر — اردو ناول بیسوی صدی میں — اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۷۳ء

عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر — صحافت پاکستان وہند میں — مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۳ء

عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر — داستانِ صحافت — مکتبہ کاروان، لاہور ۱۹۸۹ء

عبدالرسول، صاحبزادہ	تاریخ پاک و ہند	ایم۔آر برادرز لاہور ۱۹۶۶ء
عبدالستار، قاضی	حضرت جان	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۰ء
عبداللہ حسین	اُداس نسلیں	سویرا آرٹ پریس لاہور ۱۹۶۳ء
عبداللہ حسین	نادار لوگ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۷ء
عزیز احمد	ترقی پسند ادب	اشاعتِ اردو حیدرآباد دکن ۱۹۴۵ء
عقیل احمد، قاضی	تاریخ ملت مسلمہ	ایم۔آر برادرز، لاہور ۱۹۶۶ء
عقیل، ڈاکٹر معین الدین	مسلمانوں کی جدوجہد آزادی	مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور ۱۹۸۲ء
علی اصغر، چودھری	تاریخ ارائیں	علمی کتاب خانہ، لاہور ۱۹۶۳ء
علی کوفی/اختر رضوی	فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ	سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد ۱۹۶۳ء
غلام رضا، چوھدری	ارائیں	حیدر حیات پریس۔ جھنگ ۱۹۹۹ء
فاروقی، ڈاکٹر محمد احسن	تاریخ ادب انگریزی	کراچی یونیورسٹی بہ اشتراک مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء
فاروقی، ڈاکٹر محمد احسن	ناول کیا ہے	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۶۴ء
فاروقی، ڈاکٹر محمد احسن	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	سندھ ساگر اکادمی، لاہور ۱۹۶۸ء
فاروقی، ڈاکٹر محمد احسن	ادبی تخلیق اور ناول	مکتبۂ اسلوب، کراچی ۱۹۶۳ء
فاروقی، ڈاکٹر محمد احسن	شام اودھ	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۵۷ء
فاروقی، ڈاکٹر محمد احسن	سنگم	دی بک فاؤنڈیشن، کراچی ۱۹۶۱ء
فتح پوری، ڈاکٹر فرمان	ہندی اردو تنازعہ	نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد ۱۹۸۸ء
فروغی، خواجہ بدرالاسلام	ایم اسلم اور ان کا ادب	دارالبلاغ لاہور ۱۹۵۱ء
فضل الرحمان، پروفیسر	اردو انسائیکلوپیڈیا	قومی کونسل برائے قومی ترقی اردو نئی دہلی ۱۹۹۶ء
قانع، سید علی شیر	تحفۃ الکرام	سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد (ندارد)
قدوسی، اعجاز الحق	تاریخ سندھ (جلد اول)	اردو سائنس بورڈ، لاہور ۱۹۸۵ء
قریشی، ڈاکٹر اشتیاق حسین/بلال احمد زبیری	جدوجہد پاکستان	شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی

مصنف	کتاب	ناشر
		کراچی ۱۹۹۰ء
قمر تسکین	فاتح اندلس	رابعہ بک ہاؤس لاہور (ندارد)
قیسی، رامپوری	سزا	نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۵۹ء
قیسی، رامپوری	خطا	نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۵۹ء
قیسی، رامپوری	خون	کتاب منزل، لاہور ۱۹۵۹ء
کوثر، پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق	میر جعفر خان جمالی کی ڈائری کے چند اوراق	مکتبہ شالی کوئٹہ ۱۹۹۷ء
کیانی، پروفیسر محمد ارشد	جدید قصہ نگاری کا ارتقا	علمی کتاب خانہ لاہور (ندارد)
گوریجہ، ڈاکٹر رشید احمد	اردو میں تاریخی ناول	ابلاغ، اردو بازار، لاہور ۱۹۹۴ء
مبارک علی	تاریخ کے بدلتے نظریات	فکشن ہاؤس، لاہور ۱۹۹۷ء
محب الحسن / حامد اللہ پروفیسر عتیق صدیقی	تاریخ ٹیپو سلطان	ارشد بک سیلرز، میر پور، آزاد کشمیر ۱۹۹۶ء
ممتاز احمد خان، ڈاکٹر	آزادی کے بعد اردو ناول	انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۹۷ء
منگلوری، ڈاکٹر ممتاز	شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ	مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور ۱۹۷۸ء
منہاج سراج / غلام رسول مہر	طبقات ناصری (جلد دوم)	اردو سائنس بورڈ، لاہور ۱۹۸۵ء
مودودی، سید ابوالاعلیٰ	قرآن مجید	ادارہ ترجمان القرآن پرائیویٹ لمیٹڈ لاہور ۱۹۹۵ء
مودودی، سید ابوالاعلیٰ	تحریک آزادی ہند اور مسلمان (حصہ دوم)	اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۷۶ء
مودودی، سید ابوالاعلیٰ	تفہیم القرآن (جلد دوم)	ادارہ ترجمان القرآن لاہور ۱۹۹۱ء
ناز، ایم۔ ایس	اخبار نویسی کی مختصر ترین تاریخ	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۰ء
ناصر، ڈاکٹر نصیر احمد	تاریخ ہسپانیہ	علمی کتب خانہ، لاہور ۱۹۴۹ء
نجیب آبادی، اکبر شاہ خان	تاریخ اسلام (حصہ سوئم)	نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۸۶ء
ندوی، رشید اختر	محمد بن ابی عامر	احسن برادرز لاہور ۱۹۶۵ء

ندوی، رشید اختر	غرناطہ	احسن برادرز لاہور ۱۹۶۵ء
ندوی، رشید اختر	سرنگاپٹم	احسن برادرز لاہور ۱۹۵۴ء
ندوی، سید سلیمان	عربوں کی جہاز رانی	اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۸۱ء
ندوی، شاہ معین الدین احمد	تاریخ اسلام (جلد دوئم)	غضنفر اکیڈمی کراچی ۱۹۷۵ء
ندوی، شاہ معین الدین احمد	تاریخ اسلام (جلد چہارم)	نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد ۱۹۹۸ء
نذیر احمد، شمس العلما مولوی ڈپٹی	ابن الوقت	الفیصل ناشران و تاجران کتب لاہور ۲۰۰۰ء
نذیر احمد، شمس العلما مولوی ڈپٹی	مراۃ العروس	سلطان حسین اینڈ سنز کراچی ۱۹۶۳ء
نذیر احمد، شمس العلما مولوی ڈپٹی	فسانۂ مبتلا	مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی (ندارد)
نذیر احمد، شمس العلما مولوی ڈپٹی	توبۃ النصوح	اردو اکیڈمی سندھ کراچی (ندارد)
نزہت، سمیع الزماں، ڈاکٹر	اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقا	دانش محل امین آباد لکھنؤ ۱۹۸۲ء
نعمانی، شبلی	الفاروق	دارالاشاعت کراچی ۱۹۹۱ء
نور احمد، سید	مارشل لاء سے مارشل لاء تک	مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۹۳ء
وقار عظیم، سید	داستان سے افسانے تک	اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۶۱ء
وقار عظیم، سید	فن اور فنکار	اردو مرکز لاہور ۱۹۶۶ء
ویمبرے آرمینس / نفیس الدین احمد	تاریخ بخارا	مجلس ترقی ادب لاہور (ندارد)
ہاشمی، انوار	تاریخ پاک و ہند	کراچی بک سینٹر کراچی ۱۹۷۴ء
ہاشمی، رفیع الدین	اقبال کی طویل نظمیں	گلوب پبلشرز لاہور ۱۹۷۰ء
یوسفی، مشتاق احمد	زرگزشت	مکتبۂ دانیال کراچی ۱۹۹۶ء

Arnold, Hottinger	The Arabs, their history, culture & place in the modern world	Thomson & Hudson, London, 1963.
Aziz,Dr. M.A	A History of Pakistan	Sang-e-meel Publications Lahore, 1979.
Bress, Paul	Language, relegion & Politics	Cambridge University

	in North India	Press 1974.
Shappard, Alfred Tressider.	The Art & Practice of Historical Fiction	London 1930.

رسائل واخبارات

اعراف انٹرنیشنل، ماہنامہ	مدیراعلیٰ:نصیرالدین	کراچی ستمبر ۲۰۰۰ء
برگِ گل (قائداعظم کی صدی) مجلّہ	مدیراعلیٰ:پروفیسر امتیاز حسین مفتی	وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی ۱۹۷۶ء
بصائر ٹیپو سلطان نمبر	مرتبہ:ڈاکٹر سید معین الحق	اردو اکیڈمی سندھ کراچی، جنوری، اپریل، جولائی۔شمارہ ۱، ۲، ۳، جلد ۳ ۱۹۶۴ء
سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ	مدیر:معراج رسول	کراچی مئی ۲۰۰۲ء
سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ	مدیر:معراج رسول	کراچی جون ۲۰۰۲ء
سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ	مدیر:معراج رسول	کراچی ستمبر ۲۰۰۲ء
سیارہ، ماہنامہ	مدیر:نعیم صدیقی	لاہور ماہ ستمبر۔جلد ۳۵ شمارہ ۳، ۱۹۷۸ء
سیارہ، ماہنامہ	مدیر:نعیم صدیقی	لاہور ماہ ستمبر۔اکتوبر۔جلد ۵۱۔شمارہ ۱، ۲، ۱۹۸۶ء
سیارہ، ماہنامہ (اشاعت خاص)	مدیر:نعیم صدیقی	لاہور ماہ جون۔جلد ۵۶۔شمارہ ۳، ۱۹۸۹ء
فنون خدیجہ مستور نمبر	مدیر:احمد ندیم قاسمی	لاہور ماہ جنوری، فروری ۱۹۸۳ء
جسارت، روزنامہ	مدیر:حافظ محمود احمد مدنی	کراچی ۹ مارچ ۱۹۹۶ء
جنگ، روزنامہ	مدیر:محمود شام	کراچی ۱۴ مارچ ۱۹۹۶ء
نوائے وقت، روزنامہ	مدیر:سجاد میر	کراچی ۱۴ اگست ۱۹۹۷ء

غیر مطبوعہ

بشریٰ یوسف	''خاک اور خون'' اور ''آخری چٹان'' کا تحقیقی جائزہ برائے ایم۔اے۔شعبہ اردو۔بہاولپور یونیورسٹی، بہاولپور ۱۹۸۳ء
سعیدہ مہتاب	اردو ناول کا پاکستانی دور ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء، مقالہ برائے Ph.D. جامعہ پشاور، پشاور (سن ندارد)
عطیہ سعید	تقسیم برصغیر۔اہم اردو ناول نگاروں کے آئینے میں، مقالہ برائے ایم۔اے جامعہ پنجاب لاہور ۱۹۷۷ء

عقیرہ حامد علی، ڈاکٹر	اردو زبان و ادب کی ترقی میں صحافت کا کردار، مقالہ برائے Ph.D. شعبۂ صحافت پنجاب لاہور	

آڈیو ریکارڈنگ

عمر شبیر، لیفٹیننٹ کرنل	منزل	مملوکہ۔ آڈیو ورلڈ پی۔ ایف۔ ایف۔ بی پوسٹ بکس نمبر ۱۶۵۲ اسلام آباد
قرۃ العین حیدر	آگ کا دریا	مملوکہ۔ آڈیو ورلڈ پی۔ ایف۔ ایف۔ بی پوسٹ بکس نمبر ۱۶۵۲ اسلام آباد
ممتاز مفتی	لبیک	مملوکہ حاتم علوی میموریل لائبریری۔ آئی ڈار یو ویلفیئر ایسوسی ایشن۔ کراچی
یوسفی، مشتاق احمد	آب گم	مملوکہ۔ آڈیو ورلڈ پی۔ ایف۔ ایف۔ بی پوسٹ بکس نمبر ۱۶۵۲ اسلام آباد
انٹرویو نسیم حجازی، میزبان: اختر مرزا	پروگرام: کاروانِ آزادی کے راہ رو	مملوکہ، ریڈیو پاکستان اسلام آباد، اگست ۱۹۹۵ء
انٹرویو نسیم حجازی: پانچ کیسٹس پر مشتمل		مملوکہ ممتاز عمر، کراچی، جولائی ۱۹۹۲ء
انٹرویو خالد نسیم حجازی، بیگم شہناز خالد		مملوکہ ممتاز عمر، کراچی، مئی ۲۰۰۲ء
انٹرویو پروفیسر ظفر حجازی		مملوکہ ممتاز عمر کراچی، مئی ۲۰۰۲ء
پروگرام	قلمکار، رنگ سخن، سخنور، ہندو پانی مسلم پانی (بی بی سی سے نشر ہوئے)	مملوکہ ممتاز عمر، کراچی ۹۸۔۱۹۹۷ء
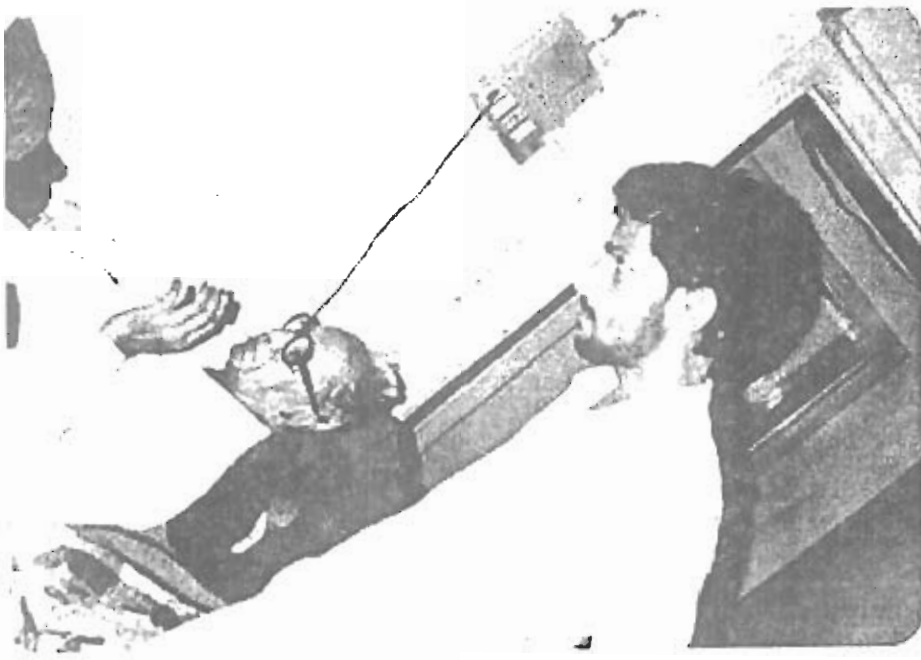
نسیم حجازی اور مصنف ۔، جولائی ۱۹۹۳ء کی ایک یادگار تصویر

اظہارِ تشکّر

سب سے بڑھ کر اللہ رب العزت کا مجھ پر کرم اور احسان کہ اس نے مجھ حقیر پُر تقصیر کی اس علمی کاوش کی نمو کے لیے ماحول ساز گار کیا۔ میں مقدمے کو قلمبند کرتے ہوئے سپاس گزاری کے طور پر جن ہستیوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ میرے والدین کی ہیں۔ جنھوں نے زندگی کے ہر مرحلے اور ہر موڑ پر مجھے حوصلہ فراہم کیا۔

سورۂ بنی اسرآئیل کی آیت نمبر ۲۳ تا ۲۷ کی پاسداری تو مجھ پُر تقصیر سے ممکن نہ ہو سکی۔ مگر میں اپنے والد ڈاکٹر عبدالقدیر اصغر (مرحوم) اور والدہ سکینہ بیگم کا از حد ممنون و مشکور ہوں کہ بصارت سے محرومی کے باوجود میری تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی اور مجھ میں مشکلات کا بہادری سے سامنا کرنے کی صلاحیت اور آگے بڑھنے کا جو جذبہ پروان چڑھایا۔ اسی کی بدولت تعلیم کے حصول اور .Ph.D کی یہ کوشش نتیجہ خیز ثابت ہو سکی۔ مگر افسوس کہ اس پُر مسرت موقع پر خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے والد صاحب تو ہمارے درمیان موجود نہیں۔ وہ ۱۴ نومبر ۲۰۰۱ء کو داغ مفارقت دے گئے۔ البتہ اللہ رب العزت والدہ صاحبہ کا شجر سایہ دار ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ (آمین)

والدین کے علاوہ بے شمار دوست احباب کا تعاون مجھے حاصل رہا۔ جن کی بدولت مقالے کی تکمیل ممکن ہو سکی۔ کتابوں کے مطالعے، بعض مواقع پر مواد کی ریکارڈنگ کے لیے، جن لائبریریوں سے کتابیں جاری نہیں ہوتیں وہاں سے اپنی ضرورت کی چیزیں لکھوا کر لانے کے لیے، نگران محترم پروفیسر سید محمد یونس حُسنی صاحب کو مقالہ دکھانے کے لیے جانے کے لیے، گویا بے شمار مواقع ایسے تھے کہ مختلف النوع افراد سے تعاون حاصل کرنا پڑا۔ ان تمام احباب کے نام اظہارِ تشکر کے طور پر سپرد قلم کر رہا ہوں۔ اگر کسی صاحب کا نام تحریر میں آنے سے رہ جائے تو اسے عمداً غلطی نہ سمجھا جائے بلکہ اتفاقیہ لغزش جانتے ہوئے معاف فرمائیں۔

پروفیسر سید اظہار حسین، پروفیسر الیاس رہبر صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر محمد سعید، پروفیسر ڈاکٹر وسیم اکبر شیخ، پروفیسر ذوالفقار علی شیخ پروفیسر محمد سلیم شیخ، پروفیسر رفیق احمد نقش، پروفیسر خالد اقبال جیلانی، پروفیسر سید زاہد علی، پروفیسر عبدالرحمٰن، پروفیسر علی مرتضٰی پروفیسر نذیر محمد صدیقی، پروفیسر محمد طارق صدیقی، پروفیسر صلاح الدین ظہیر، پروفیسر عبدالحمید مجاہد، پروفیسر مرزا طاہر بیگ پروفیسر محمد اشتیاق، ڈاکٹر ایاز احمد، ڈاکٹر محمد شفیع، لیاقت علی، راؤ شمشاد علی خان، اسداللہ، محمود احمد قریشی، محمد فاروق لودھی محمد امین خان، نسیم احمد، طارق بن حسیب، طاہر بن حسیب، طلحہ عمار، سرفراز ملک، انور نواب، محمد شریف، محمد اسلم مجاہد، محمد عمران آصف محمود میؤ، جنید نور صدیقی، اشتیاق احمد ہاشمی، عثمان ادریس شہاب قدوائی، سید محمد اکبر، مرتضٰی علی، مجب خان، محمد یحیٰی، محمد معروف پروفیسر عذرا جعفری، پروفیسر حمیرا تطہیر، پروفیسر بشریٰ لطیف، محترمہ آمنہ قادری، محترمہ شمسہ حماد، محترمہ آمنہ حماد، محترمہ شاہانہ لطیف محترمہ نبیلہ تبسم، محترمہ یاسمین صدیقی اور سلمٰی ناہید۔

میں ڈائیریکٹر جنرل ہمدرد فاؤنڈیشن محترم فرقان احمد شمسی اور اراکین مجلس عاملہ انفاق فاؤنڈیشن کا بے حد مشکور ہوں کہ جنھوں نے مجھ سے مالی تعاون کیا۔